ترمیم شدہ ایڈیشن
ہوتا ہے کوہ و دشت میں پیدا کبھی کبھی!
احوال و آثار
حضرت مولانا
محمد امین اورکزئی شہید
جلد اول
تالیف
محمد طفیل کوہاٹی
مدیر ندوۃ التحقیق الاسلامی کوہاٹ
دار التحقیق جامعہ یوسفیہ ہنگو

محقق کبیر، تلمیذ حضرت محدث العصر مولانا یوسف بنوریؒ کی مبسوط سوانح

ہوتا ہے کوہ ودشت میں پیدا کبھی کبھی!

احوال وآثار

مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ

تالیف

محمد طفیل کوہاٹی

مدیر ندوۃ التحقیق الاسلامی کوہاٹ

ناشر

جامعہ یوسفیہ شاہو وام ہنگو

عرض مؤلف

محقق العصر، محدث دوراں، عارف باللہ حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہید رحمہ اللہ کے احوال وآثار، علمی افادات اور منتخب مکاتیب پر مشتمل تالیف پیش خدمت ہے۔ علم وتحقیق کے اس بحر بے کنار کے درخشاں موتی اور تقویٰ وطہارت کے اس تابندہ آفتاب کی ضیاء پاشیاں محدود صفحات کے سینوں میں سمیٹنا ممکن نہیں۔ آپ کی حیات طیبہ کے متنوع گوشے جوں جوں کھلتے گئے، اندازہ ہوتا گیا کہ ان کی کماحقہ تصویر کشی اور احاطہ بس سے باہر ہے، یہ صرف میرا ہی تاثر نہیں بلکہ آپ کے ممتاز تلامذہ اور سال ہا سال دامن فیض سے وابستہ رہنے والے متعلقین نے اس اعتراف کے ساتھ قلم اٹھایا ہے کہ

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایہ

تاہم مختلف اصحاب قلم کے مشاہداتی وتاثراتی نقوش قارئین کو آپؒ کے اوصاف ومزایا کی ایک گونہ جھلک ضرور دکھائیں گے۔

یہ ۲۰۰۱ء کی بات ہے جب بندہ اپنے سکول کے بعض اساتذۂ کرام کی برکت سے علم دین کی تحصیل کی طرف مائل ہوا اور اپنے اسلامیات کے استاذ حضرت مولانا محمد زاہد صاحب مدظلہم کی رہنمائی اور ایما پر جامعہ یوسفیہ ہنگو میں درجہ اولیٰ کے لیے داخلہ لیا، جامعہ میں ایک نورانی شکل کے بزرگ کو ہر خورد وکلاں کی محبت کا محور ومرکز اور ادب واحترام کا مرجع دیکھا، سب ہی انہیں محبت و وارفتگی میں ڈوبے لقب ''مشر استاد صاحب'' کے نام سے یاد کرتے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہی ہستی حضرت مولانا محمد امین اورکزئی ہیں، جن کے علم وفن اور تقویٰ وطہارت کا چرچا اہل علم کیا ناخواندہ عوام میں بھی زبان زد تھا۔

استاد گرامی مولانا ظفر احمد مدظلہم ہمیں حضرت مولانا عبدالشکور لکھنویؒ کی کتاب ''خلفائے راشدین'' پڑھاتے تھے۔ آپ کا احسان تھا کہ اس کتاب کے عقائد کا حصہ پڑھانے کے لیے انہوں نے حضرت الاستاد مولانا اورکزئی سے درخواست کی، یوں ہمیں حضرت الاستاد رحمہ اللہ سے شرف تلمذ نصیب ہوا۔ آپ نے حضرت لکھنویؒ سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو مسئلہ مشاجرات میں باغی وخاطی لکھنے پر اختلاف کیا لیکن اختلاف کے ذکر سے قبل حضرت لکھنویؒ کے اتنے مناقب سنائے کہ ہمارے ذہنوں میں ان کا مقام خوب راسخ کر دیا، پھر آخر میں ان کے لیے ہاتھ

اٹھا کر دعا فرمائی ، آپ کے اس طرز عمل سے اکابر کے مابین علمی مسائل میں اختلاف کی نوعیت سمجھنے میں مدد ملی ۔ آپ کی آغوش تربیت میں گزرا زندگی کا یہ سال میرے لیے ہر حوالے سے یادگار رہا اور جو دینی مزاج اور ذوق آپ کے یہاں پیدا ہوا اس کا اثر آج بھی محسوس ہوتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ آپ پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے ۔

حضرت الاستاذ کی ناگہانی شہادت سے ایسا محسوس ہوا جیسے ایک ٹھنڈا سائبان سر سے اٹھ گیا ہو اور ہم تپتے صحرا میں بے سہارا و بے آسرا رہ گئے ہوں ۔ اس وقت سے تمنا تھی کہ حضرت الاستاذ سے وابستہ اپنی یادیں تفصیل سے لکھ لوں ، اسی کوشش میں ایک دو مضامین لکھ کر ایک ہفت روزہ اخبار میں شائع بھی کروائے ، لیکن تفصیلی تحریر کی نوبت نہ آئی ، ۲۰۱۱ء میں برادرم مولانا محمد یوسف مدظلہ کے پاس حضرت الاستاذ کے احوال کا خاکہ لینے کے لیے حاضری ہوئی ، مولانا نے جو مواد مہیا کیا اس سے ایک دفعہ پھر یہ داعیہ اٹھا کہ اس کو بنیاد بنا کر مختصر سوانح تیار کر لینی چاہیے ، لیکن زندگی کچھ ایسے حادثات کا شکار ہوئی کہ سنبھلتے سنبھلتے تین چار سال کا عرصہ بیت گیا ، اس دوران ندوۃ التحقیق الاسلامی کی بنیاد پڑ گئی اور ہلکے پھلکے تالیفی اور تدریسی کاموں کا سلسلہ چل پڑا ، اسی سے اس دیرینہ خواہش کی تکمیل کی سبیل بھی پیدا ہوئی ۔ کام مشکل تھا اور مدرسہ کی تدریس ، مسجد کی امامت ، گھریلو ذمہ داریوں اور اپنے اصلاحی ادارہ کے معمولات سمیت اسے انجام دینا بظاہر ناممکن تھا لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال رہا ۔ میرے شیخ حضرت ڈاکٹر فدا محمد صاحب مدظلہم کی دعا و توجہ ، حضرت الاستاذ کے اجل تلامذہ مولانا محمد یاسین مدظلہ ، مولانا جمیل قریشی مدظلہ ، مولانا قاری محمد قاسم مدظلہ اور مولانا قاری اسد اللہ مدظلہ کی مشفقانہ سرپرستی اور برادر کبیر مولانا محمد یوسف اورکزئی مدظلہ کا قدم قدم پر ساتھ بندہ کی ڈھارس بندھاتا رہا اور یوں چند ماہ کی کوشش سے یہ طویل منصوبہ پایہ تکمیل تک پہنچ گیا ۔

اس کام کے لیے اواز مہ اکٹھا کرنے کے دوران ذاتی طور پر بندہ کو حضرت الاستاذؒ کے جس کمال نے ورطۂ حیرت میں ڈالا اور جس کو کماحقہ تعبیر کرنے سے اپنے قلم کی بے بضاعتی اور علمی کم مائیگی کے باعث مکمل طور پر قاصر رہا ، وہ آپ کی محیر العقول جامعیت تھی ۔

مشاہدہ یہی ہے کہ جو شخص فلسفہ و معقولات کا خوگر ہو اور اس فن میں '' أنا ولا غیری '' کی شان رکھتا ہو ، وہ عموماً نالہ نیم ہائے شب کے سوز و ساز اور عشق و مستی کے کیف و سرور سے طبعاً توحش رکھتا ہے کیونکہ عقل کے راہی اکثر عشق کی گرمی کا مذاق ہی اڑاتے دیکھے گئے ہیں ۔

پھر جو سلوک میں اس درجہ راہ نوردی شروع کر دے کہ سر تکوین کا محرم راز بن جائے اور اس کی عبادت اور ذکر و فکر کے احوال چھٹی صدی کے صوفیا کی یاد دلائیں تو عموماً ایسے لوگ تحریکی مشغولیت اور خدمت خلق کے لئے

عامۃ الناس سے ربط وتعلق میں دلچسپی نہیں دکھا پاتے اور اپنے تحمل واستغنا کے باعث اجتماع وجلوت سے دور بھاگتے ہیں۔

پھر جو لوگ مصروف تحریکی، سماجی اور رفاہی زندگی گزاریں اور یہی ان کے شب وروز کا مشغلہ دکھائی دے تو وہ علم وفن خصوصاً علم حدیث کی موشگافیوں سے اس درجہ مناسبت نہیں بنا پاتے کہ اس فن میں درجہ امامت پر فائز ہوں۔

پھر جو علم کو اس درجہ اوڑھنا بچھونا بنادیں کہ ہزاروں صفحات کا مطالعہ ایک مجلس میں کرلیں اور پوری رات کھڑے کھڑے کتب کی ورق گردانی میں گزاردیں تو وہ اشتغال بالعلم کے باعث عموماً خاندان ومعاشرت کے تقاضوں کو پورا نہیں کر پاتے اور ان کی خاندانی ومعاشرتی زندگی انتہائی محدود رہ جاتی ہے۔ لیکن حضرت الاستاذ نے حیرت انگیز طور پر ان تمام دریاؤں کو پورے کمال سے پاٹا، ان سب میادین میں جامعیت کی شان پائی اور کسی میدان میں یہ تصور کرنا مشکل ہوتا کہ یہ دراصل کسی اور میدان کے آدمی ہیں۔ آپ کی یہی متنوع خصوصیات ایک لکھنے والے کو مشکل میں ڈال دیتی ہیں، وہ جس پہلو پر قلم اٹھاتا ہے ذہن کی باگ دوسرا پہلو اچک لیتا ہے اور اشہب قلم اکھڑتی سانسوں میں اس بات کا اعتراف کر کے میدان کا غذ چھوڑ دیتا ہے کہ ورق تمام ہوئے اور مدح باقی ہے

یہ مجموعہ حضرت کی زندگی پر نقش اول کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان شاء اللہ مستقبل میں آپ کی زندگی کی مختلف جہات پر لکھا جائے گا۔ چند منصوبوں کا تعارف حسب ذیل ہے:

۱۔ مقالات امین:

حضرت الاستاذ زمانہ طالب علمی سے مختلف سیاسی، تاریخی اور ٹھوس علمی موضوعات پر مختصر مقالات ومضامین لکھتے رہے ہیں، ان کا مجموعہ بندہ نے ترتیب دے دیا ہے، جو الحمد للہ چھپ کر منظر عام پر آ گیا ہے۔

۲۔ مکاتیب امین:

حضرت کے علمی تراث میں مکاتیب کا گراں قدر ذخیرہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ان میں نجی، مذہبی، سماجی، علمی، فکری اور سیاسی نوعیت کے اصناف پر سینکڑوں خطوط شامل ہیں۔ اس تالیف میں چند اہم خطوط کا انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔ تاہم سارے خطوط کو مروجہ فنی تقاضوں کی رعایت رکھ کر ترتیب دینا ایک طویل اور محنت طلب کام ہے۔ ان شاء اللہ ان خطوط کی اشاعت مکاتیبی ادب میں ایک نمایاں اضافہ ہوگا اور ان سے ایک عہد کے علمی، سیاسی اور سماجی رجحانات کا بخوبی پتہ چلے گا۔

۳۔ تعلیقات علی شرح النقایۃ:

حضرت الاستاذ کے مرتب کردہ نصاب میں ملا علی قاریؒ کی شرح النقایۃ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یہ کتاب حنفی

فقہ کے مستدلات حدیث کا بہترین شاہکار ہے۔حضرت اسے کئی حوالوں سے شرح الوقایہ پر ترجیح دیتے تھے۔آپ کا درس شرح النقایہ آپ کی فقہی بصیرت اور محدثانہ شان کا عکاس تھا۔کئی طلبہ نے آپ کی تقریر کو قلم بند کیا ہے۔آپ نے درسی مطالعہ کے دوران شرح النقایہ کی اغلاط درست کرنے کے ساتھ ساتھ اس پر ایک بہترین تعلیق بھی کی ہے۔اس تالیف میں ان تعلیقات کا تعارف اور چند نمونے برادرم مولانا سمیع اللہ سعدی کے قلم سے پیش کیے گئے ہیں،ان شاء اللہ ان کی ترتیب وتدوین اور اشاعت بھی ہماری سرفہرست ترجیحات میں شامل ہے۔

۴۔تنقیدات امین:

جامعہ یوسفیہ کی لائبریری میں ایسی بیسیوں کتابیں موجود ہیں جن پر دوران مطالعہ حضرت الاستاذ نے اپنے قلم سے علمی نقد لکھا ہے۔یہ تنقیدات تفاسیر،احادیث،رجال،تاریخ،فقہ اور کلام کی مختلف کتابوں کی سینکڑوں عبارات پر کی گئی ہیں،جو نایاب علمی مباحث پر مشتمل ہیں۔بندہ نے مولانا ضیاء الدین سلمہ سے صرف تاریخ الاسلام للذہبی کی ۵۲ جلدوں والے نسخے پر درج تنقیدات اکٹھی کروائیں تو بڑے سائز کے تقریباً ۱۰۰ صفحات ہو گئے۔یہ نقد علم رجال پر حضرت کی گہری نظر اور کامل درک کا آئینہ دار ہے۔ان شاء اللہ ایسی تمام تنقیدات کو جمع کر کے ضروری وضاحت اور ترتیب کے ساتھ اہل علم کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔

۵۔امالی دروس:

حضرت الاستاذ ایک مثالی مدرس تھے،آپ کا سبق سہل،جامع،مرتب اور تحقیقی ہوتا تھا۔حدیث کے علاوہ تفسیر،منطق اور علم نحو آپ کے اختصاصی فنون تھے۔آپ کے درس سلم،شرح النقایہ اور اوضح المسالک کی مکمل امالی دستیاب ہیں جب کہ درسِ مشکاۃ کا بھی ایک بڑا حصہ محفوظ ہے۔ان شاء اللہ ان تمام امالی کی ترتیب وتدوین اور ضروری خدمت کے بعد ان کی اشاعت کی کوشش کی جائے گی۔

۶۔تفسیر امین:

حضرت الاستاذ نے دوبار حضرت درخواستیؒ سے ترجمہ قرآن پڑھا تھا اور حضرت کے تفسیری افادات بیاض میں محفوظ کیے تھے۔بعد میں اپنے تفسیری مطالعہ کا نچوڑ بھی اس میں بالاختصار لکھتے رہے۔یہ بیاض مختصر تفسیری نکات کا بیش بہا خزینہ ہے۔ان شاء اللہ اس کی ترتیب واشاعت بھی پیش نظر ہے۔

۷۔مجموعہ آثار صحابہ:

حضرت الاستاذ نے نثر الازہار کی تالیف کے واسطے مشہور ماخذ کے علاوہ مندرجہ ذیل دفاتر کا بالاستیعاب مطالعہ کر کے ان سے آثار صحابہ اکھٹے کیے۔

۱۔ تاریخ بغداد: خطیب بغدادی ... ۲۔ حلیۃ الاولیاء: ابونعیم اصفہانی ... ۳۔ طبقات: ابن سعد ... ۴۔ تاریخ کبیر: امام بخاری...... ۵۔ الکنیٰ: ابوبشر دولابی...... ۶۔ معجم صغیر: طبرانی ... ۷۔ تاریخ جرجان: حمزہ سہمی

اور پھران سات رے کتابوں کی تمام احادیث وآثار کو کتب حدیث وفقہ کی ترتیب پر مرتب کیا، اس کا کچھ حصہ تو بمباری میں ضائع ہوگیا ہے۔ تاہم کچھ کتابوں کے جمع کردہ آثار کی فہرستیں بندہ کے پاس محفوظ ہیں، ان شاء اللہ حضرت ہی کے منہج پر ان کی تکمیل کر کے انہیں شائع کرنے کا عزم ہے۔

۸۔ حاصل مطالعہ:

حضرت کے وسیع مکتبہ میں شاید ہی کوئی کتاب ایسی ہو جو آپ کی نظر سے نہ گزری ہو، آپ کی عادت تھی کہ دوران مطالعہ اہم علمی نکتوں، تاریخی واقعات، مسائل، ادبی چٹکلوں اور مفید عام باتوں کو کتاب کے استر پر بقید صفحہ وعنوان اشاراتی صورت میں لکھتے جاتے۔ آپ کے اس مطالعاتی مغز کو اکٹھا کیا جائے تو کئی مجلدات تیار ہو سکتی ہیں۔ آج کل حاصل مطالعہ کے نام سے نامور کتابی شخصیات کی منتخبات سامنے آرہی ہیں۔ ان شاء اللہ حضرت الاستاذ کے ہزاروں صفحات سے منتخب یہ شذرات اہل علم کے لئے مشام جان ثابت ہوں گے۔

۹۔ مطبوعہ کتب کی از سرنو اشاعت:

مختصر رسائل کے علاوہ حضرت کی دو عربی کتابیں نثر الازہار نامکمل (۲ جلدیں) اور مسانید الامام ابی حنیفہ مطبوعہ شکل میں دستیاب ہیں۔ الحمد للہ نثر الازہار کا ایک بڑا حصہ حضرت نے خود ہی لکھ لیا تھا، کچھ ابواب باقی رہ گئے تھے، جو بصورت تکملہ لکھے جا رہے ہیں۔ ان کی تکمیل پر ان شاء اللہ یہ کتاب جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی سے شائع ہوگی۔

''مسانید الامام ابی حنیفہ'' کی موجودہ طباعت میں کتابت کی کافی اغلاط رہ گئی ہیں، یہ مجالہ متعلقہ موضوع پر اپنی جامعیت کی مثال آپ ہے۔ ان شاء اللہ اس کو فنی تقاضوں کے مطابق شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

پیش نظر مواد بندہ کے ادارہ ندوۃ التحقیق الاسلامی کوہاٹ کے زیر اہتمام مولانا محمد یوسف صاحب مدظلہم کی نگرانی میں جمع کیا گیا۔ اسے پہلے حضرت الاستاذ کے تلامذہ ومتعلقین سے انٹرویوز اور تاثراتی تحریرات کی شکل میں حاصل کیا گیا۔ پھر اسے مرتب کر کے ان کے ملاحظہ ونظر ثانی کے بعد شامل اشاعت کیا گیا۔ چونکہ تب بندہ سہ ماہی مجلہ المظاہر کی ادارت سے وابستہ تھا، لہٰذا یہ سارا ذخیرہ پہلی بار مجلہ کی ایک خصوصی اشاعت کی شکل میں سامنے لایا گیا، جو ہاتھوں ہاتھ نکلا اور ملک کے نامور اہل علم، اکابر علما اور حضرت الاستاذ کے تلامذہ ومتعلقین نے اس کے نئے ایڈیشن کا پرزور اصرار شروع فرمایا۔ کافی تاخیر سے اس کا دوسرا ایڈیشن حک وترمیم کے ساتھ پیش خدمت ہے۔ حضرت الاستاذ کے چند مقالات جو گزشتہ طبع کا حصہ تھے، اس ایڈیشن سے حذف کر کے ''مقالات امین'' کے مجموعہ میں شامل کر دیئے

گئے ہیں تاکہ قارئین تکرار کی اکتاہٹ اور اضافی بوجھ سے محفوظ رہیں۔

بندہ اتنی کم مدت میں اس تاریخی دستاویز کی تیاری کو حضرت الاستاذؒ کی کرامت اور اپنے شیخ مکرم حضرت ڈاکٹر فدا محمد صاحب مدظلہم کی دعا و توجہ کا ثمرہ سمجھتا ہے۔ اس مبارک کام کے آغاز سے قبل بندہ نے اپنے بعض اکابر کے نام دعا اور تائید و توثیق کے حصول کے لئے خطوط لکھے، ان کے جوابات اس اشاعت کے آغاز میں ''تاثرات وتقریظات'' کے عنوان سے شامل ہیں۔

پہلے باب میں حضرت الاستاذ کی سوانح سے متعلق مضامین کو بعنوان ''احوال امین'' شامل کیا گیا ہے۔

دوسرا باب ''آثار امین'' کے نام سے حضرت کے علمی کارناموں کے تذکرہ، تصانیف کے تعارف اور بعض منتخب افادات کے لئے مختص کیا گیا ہے۔

تیسرے باب ''تذکار امین'' میں اہل علم احباب، تلامذہ، منتسبین اور سیاسی وسماجی رہنماؤں کے تاثراتی مضامین شامل ہیں۔

چوتھے باب ''مکاتیب امین'' میں آپ کے بعض اہم علمی، اصلاحی اور سماجی مکاتیب کا گراں قدر ذخیرہ پیش کیا گیا ہے۔ اس باب میں آپ کے نام بعض مشاہیر کے مکاتیب بھی شامل ہیں۔

پانچویں باب ''یاد امین'' میں منظوم تاثرات ہیں۔

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ حضرت الاستاذ کے علمی وعملی مقام کے پیش نظر یہ ساری کوشش ذرا بھر حیثیت نہیں رکھتی، اس لئے غالب امکان ہے کہ اس میں بعض باتیں یا تعبیرات حضرت الاستاذ کی شان کا درست نقشہ پیش کرنے میں ناکام ہوں۔ مجھے حضرت کے تلامذہ اور متعلقین سے پوری امید ہے کہ وہ قابل اصلاح امور کی طرف متوجہ فرمائیں گے، ان شاء اللہ ایسی ہر تنبیہ شکریہ اور بشاشت سے قبول کی جائے گی۔

اس اہم کام کا اصل سہرا برادرم مولانا محمد یوسف مدظلہ کے سر ہے۔ بندہ کی گمنامی حضرت الاستاذ کے متعلقین سے لوازمہ کے حصول میں بہت بڑی آڑ تھی۔ مولانا کی وجاہت، مسلسل تعاون، سرپرستی اور طویل اسفار میں رفاقت نے میری کئی مشکلیں آسان کیں۔ اگر مولانا اس میں ذاتی دلچسپی نہ لیتے تو شاید یہ کام اتنا جلد پایہ تکمیل تک نہ پہنچتا۔ اللہ تعالیٰ اس کاوش کو ہم دونوں اور دیگر تمام معاونین کے لئے ذخیرہ آخرت بنائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین

اخوکم فی اللہ

محمد طفیل کوہاٹی

اصفر المظفر ۱۴۳۰ھ

مشمولات

تاثرات وتقریظات

اکابر کے تاثراتی، تبریکی اور دعائیہ کلمات

میں نے جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کے اساتذہ میں دو ہی استاذ ایسے دیکھے جو فجر کی نماز کے بعد اپنی جگہ پر بیٹھ کر رات کے بارہ بجے تک برابر اپنے کام میں مصروف رہتے تھے، ان میں ایک مولانا حبیب اللہ مختار صاحب شہیدؒ اور دوسرے مولانا محمد امین اورکزئی صاحب شہیدؒ تھے۔ یہی دو لوگ برابر سرگرم عمل رہتے تھے۔ مولانا حبیب اللہ صاحب کے پاس تو لوگ آتے رہتے تھے، وہ باتیں بھی کرتے رہتے اور اپنا کام بھی کرتے رہتے تھے۔ مولانا امین صاحبؒ کا حلقہ بہت محدود تھا، ان کے پاس شاذ و نادر ہی کوئی آتا تھا، وہ اپنا کام تندہی سے برابر کرتے رہتے تھے، جو اوقات گھنٹے پڑھانے کے ہوتے تھے ان میں چلے جاتے تھے، پڑھا کے اپنی جگہ آتے اور اپنا کام مسلسل کرتے رہتے تھے، ان کے کام بڑے لمبے ہوتے تھے، اس لئے ان کا سلسلہ برابر قائم رہا، چنانچہ وہ اپنا کام زندگی بھر کرتے رہے، کام پورا نہیں ہوا زندگی پوری ہوگئی، اس لئے ان کی زندگی ہمہ وقت علم کی خدمت میں لگی رہی، ایسی محنت کرنے والے کم ہی زندگی میں اپنا کام پورا کر سکتے ہیں، یوں ان کی زندگی اللہ تعالیٰ کی یاد اور علمی کام میں بسر ہوتی گئی، کام پھر بھی پورا نہیں ہوا۔

تاثرات

رئیس المحدثین مولانا سلیم اللہ خان رحمہ اللہ تعالیٰ

صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان

حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہید برد اللہ مضجعہ و رفع درجاتہ ذی استعداد اور نمایاں شان کے عالم باعمل تھے۔ حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے اخص تلامذہ میں سے تھے۔ انھوں نے طالب علمی کا زمانہ اس اخلاص، محنت اور لگن سے گزارا کہ وفاق المدارس کے تحت سالانہ امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی اور اپنے محبوب استاذ کی نگاہ میں ٹھہر گئے۔ مولانا بنوریؒ کی تربیت نے ان میں پوشیدہ صفات و کمالات کو جلا بخشی اور ان کے کئی علمی، عملی اور معاشرتی اوصاف منظر عام پر آئے۔ مولانا موصوف کی طبیعت میں اخفائے حال، عاجزی اور انکساری کا بہت غلبہ تھا، تاہم ان کے تین، چار کمالات ایسے ہیں جو ظاہر بینوں کو بھی نظر آجاتے ہیں۔

پہلا کمال تو یہی ہے کہ مولانا بنوریؒ نے امام ابوجعفر الطحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی شہرۂ آفاق کتاب "شرح معانی الآثار" کے رجال و اسناد کی تحقیق اور متن کی پڑتال جیسے اہم کام کے لیے مولانا امین اورکزئیؒ کا انتخاب فرمایا۔ مولانا اورکزئی نے اس پر جو تحقیقی کام کیا ہے اس کی اب تک دو جلدیں "نثر الازھار" کے نام سے منظر عام پر آئی ہیں اور بقیہ جلدیں تا حال غیر مطبوعہ ہیں۔ اسی طرح تخصص فی الحدیث کے لیے آپ کا تحریر فرمودہ مقالہ "مسانید الامام ابی حنیفة" مولانا بنوریؒ نے مصر سے طبع کرایا تھا۔

دوسرا کمال یہ تھا کہ مولانا اورکزئیؒ اچھے مدرس تھے، طلبا کا آپ کی رجوع تھا، خصوصاً تخصص فی الحدیث کے لیے ملک و بیرون ملک سے طلبا آپ کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔

تیسرا کمال، جو عام طور پر علمی اور تدریسی سرگرمیوں میں مشغول افراد میں نایاب ہے، یہ تھا کہ مولانا موصوف کی

اپنے علاقے کے معاشرتی اور سماجی حالات پر نہ صرف گہری نظر تھی، بلکہ اس میں ایک نوع کا قائدانہ کردار بھی انھوں نے ادا کیا تھا۔ جن میں علاقائی سطح پر جرگوں میں ثالثی اور ہنگو میں شیعہ سنی تصادم کا سد باب اور عالمی سطح پر افغان طالبان اور احمد شاہ مسعود میں صلح کے لیے ایک طویل اور جاں گسل جدوجہد، گیارہ ستمبر کے بعد پاکستانی طالبان اور حکومت کے درمیان مفاہمت کے لیے ثالثی وغیرہ شامل ہیں۔ عالم کفر وطاغوت کو مولانا امین اورکزئی شہیدؒ کی یہ تمام سرگرمیاں اور امن عامہ کے قیام کے لیے یہ تعاون بالکل پسند نہیں تھا، اس لیے انھوں نے باقاعدہ حملہ کر کے آپ کو شہید کر دیا۔ یہ حملہ چونکہ وقت کے سب سے بڑے طاغوت کے ایما پر ہوا تھا اس لیے آپ کی شہادت کی مقبولیت، ان شاء اللہ، یقینی ہے۔

چوتھا کمال یہ تھا کہ مولانا اورکزئی شہید محض اپنے علمی کمال کے اسیر نہیں بنے بلکہ وہ روحانی تزکیے اور باطنی اوصاف کو نکھارنے کے لیے اللہ والوں سے ربط وتعلق میں بھی بڑے مستعد واقع ہوئے تھے۔ یوں تو وہ طبعاً اور مزاجاً نہایت باادب اور منکسر المزاج تھے ہی، لیکن باقاعدہ منازل سلوک طے کرنے کے لیے انھوں نے وقت کے بڑے مشائخ کی طرف رجوع کیا جن میں مولانا عبدالعزیز رائے پوری، خلیفہ غلام رسول اور مولانا سید محمود صندل بابا رحمہم اللہ وغیرہ معروف نام ہیں، ان میں سے اکثر مشائخ نے انھیں اجازت وخلافت سے بھی نوازا۔

احقر اور شہید اورکزئی کے درمیان عقیدت ومحبت کا تعلق اس وقت سے قائم ہے جب وہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن میں تشریف فرما تھے۔ مرحوم ومغفور نے اپنے صاحبزادے اور تلامذہ کے واسطے دورۂ حدیث کی تعلیم کے لیے جامعہ فاروقیہ کراچی کا انتخاب فرما کر ذرہ نوازی فرمائی تھی۔ حضرت مولانا سید محمود صندل بابا رحمۃ اللہ علیہ کو بھی کراچی لانے کا ذریعہ شہید مولانا اورکزئی ہی بنے تھے۔ اس کے علاوہ بھی وہ اپنے نجی معاملات، مسلکی امور اور وفاق سے متعلق مسائل میں مشوروں کے سلسلے میں مکاتبت کے ذریعے مسلسل رابطے میں رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ مولانا اورکزئی شہید کے درجات بلند فرمائے اور ان کے اخلاف کو ان کا سچا جانشین بنائے، آمین۔

سلیم اللہ خان

جامعہ فاروقیہ کراچی

۵/۷/۱۴۳۷ھ

۱۳/۴/۲۰۱۶ء

دعائیہ

شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

نائب صدر دارالعلوم کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

گرامی قدر مکرم جناب مولانا محمد طفیل صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ وبرکاتہ

آپ کے گرامی نامے سے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ سہ ماہی ''المظاہر'' حضرت مولانا محمد امین اورکزئی صاحب قدس سرہ پر اپنا ایک خصوصی شمارہ شائع کر رہا ہے۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے بندہ کو براہ راست کوئی ملاقات یاد نہیں ہے، لیکن ان کے حالات وخدمات سے بفضلہٖ تعالیٰ واقفیت بھی رہی، اور قدردانی بھی۔ یقیناً ان کی شخصیت کے علمی، عملی اور روحانی پہلوؤں کو اجاگر کرنا ان شاء اللہ بہت مفید ہوگا۔ میں دل سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس خصوصی شمارے کو حسن وخوبی کے ساتھ تکمیل تک پہنچائیں۔ اور وہ نافع ومقبول ہو۔ آمین۔ والسلام

بندہ محمد تقی

۳/۷/۷۳ھ

دعائیہ

عالم نبیل حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی مدظلہم

مہتمم دارالعلوم دیوبند

یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ تحقیقی مجلہ' سہ ماہی المظاہر' کے ذمہ داران نے بزرگ عالم دین حضرت مولانا محمد امین صاحب اورکزئی رحمۃ اللہ علیہ کے احوال وآثار پر مشتمل ''المظاہر'' کا ایک خصوصی شمارہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ بندہ حضرت مولانا محمد امین صاحب رحمہ اللہ سے براہ راست واقف تو نہیں ہے؛ لیکن مولانا محمد طفیل قاسمی صاحب کے ارسال کردہ سوانحی خاکہ سے محسوس ہوتا ہے کہ مولانا مرحوم ایک بلند پایہ عالم دین، محدث اور مصنف تھے۔ تعلیم، تدریس، تصنیف اور دفاع عن الحق کے ذریعے عظیم خدمات کا ایک سلسلہ ان کے ذریعہ جاری رہا ہے۔

امید ہے کہ اس خصوصی شمارہ کے ذریعے حضرت مولانا مرحوم کی تابندہ حیات کے مختلف گوشوں پر روشنی پڑے گی اور پس آئندگان کو ان کے نقوش پا سے شاہراہ حیات میں رہنمائی حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس اشاعت کو قبول فرمائے اور زیادہ سے زیادہ مفید بنائے۔

ابوالقاسم نعمانی غفرلہ
مہتمم دارالعلوم دیوبند

۲۶/ذی الحجہ ۱۴۳۷ھ=۲۹/ستمبر ۲۰۱۶ء

تاثرات

حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر مدظلہم

رئیس جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی

ہمارے شیخ محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ کو اللہ تعالیٰ نے بے پناہ اور مافوق الفطرت خوبیوں سے نوازا رکھا تھا، آپ کی ایک خوبی یہ بھی تھی، کہ آپ مرجع خواص تھے، بڑے بڑے اہل علم آپ کے گرد جمع ہونے میں سرور وسکون محسوس فرماتے تھے، حضرت مفتی ولی حسن ٹونکیؒ، حضرت مولانا ادریس میرٹھی صاحبؒ اور حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی صاحبؒ جیسے جبال علم آپ کے ساتھ شیخ واستاد کی مانند احترام سے پیش آتے تھے، یہ ہستیاں مختلف اداروں سے آپ کے ہاں تشریف لائیں تھیں، اسی طرح آپ کے حلقہ درس میں شامل ہونا بھی ہر مستعد طالب علم کی کوشش اور حسرت رہتی تھی، وسائل کی قلت کے دور میں کثیر تعداد میں لائق وفائق تلامذہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اپنے وہبی کمال کو حضرت بنوریؒ کے علمی صیقل سے دو چند کیا اور ہر ہر فرد افق علم اور جماعت بن کر نکلا، آپ کے ایسے نامور تلامذہ میں سے ایک نامور شاگرد خاص، راسخ عالم، پختہ کار محقق، اور ٹھوس علمی استعداد کے حامل برادر مکرم حضرت مولانا امین اورکزئی شہید رحمہ اللہ بھی تھے، جو اپنے دور کے راسخ فنی ماہرین سے استفادہ کے بعد حضرت بنوریؒ کے چشمہ فیض سے سیراب ہونے کے لئے مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن کراچی (حال جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی) تشریف لائے، حضرت بنوریؒ کی محدثانہ حیثیت سے بھرپور استفادہ کو اپنا مشغلہ بنایا اور حضرت بنوریؒ کے شغف حدیث سے صرف مستفید ہی نہیں ہوئے، بلکہ آپ کے حدیثی کاموں میں آپ کے معاون وشریک کا سعادت سے ہمکنار بھی ہوئے۔

حضرت بنوریؒ کو اللہ تعالیٰ نے مردم شناسی کا خاص ملکہ بھی عطا کیا تھا، چنانچہ انہوں نے مولانا امین اورکزئی شہیدؒ کو ان کی علمی استعداد اور ان کے شغف حدیث کو اپنے اندر جذب کر لینے کی بنیاد پر حضرت شہیدؒ کو دارالتصنیف کے لئے اپنا مساعد مقرر فرمایا۔ مولانا اورکزئی شہید ایک عرصہ تک حضرت شیخ کی امنگوں کے مطابق دارالتصنیف میں علوم حدیث کی متنوع خدمات سے وابستہ رہے، اور ''نثر الازھار'' کے نام سے ''شرح معانی الآثار'' پر مستقل کام کرتے رہے، بعد ازاں اپنے علاقائی مسائل اور دیگر بعض مجبوریوں کی بنا پر وہ جامعہ سے ظاہری طور پر دور اپنے علاقے میں چلے گئے، مگر قلبی وروحانی طور پر وہ اپنے شیخ کے شریک کار بنے رہے، اور ''نثر الازھار'' کا کام انہوں نے مکمل فرمایا، جس کا کچھ حصہ اب چھپ چکا ہے، اس کے علاوہ ان کے متعدد علمی شاہ کار منظر پر آچکے اور بعض منصۂ شہود پر آنے والے ہیں۔

اس کے علاوہ دین اسلام کی نشر واشاعت، قرآن وسنت کی تبلیغ وتعلیم اور قافلہ حق کے دفاع وتحفظ کے لئے ان کی بے پناہ خدمات ہیں اور ان کے صدقہ جاریہ کے طور پر ان کے ہزاروں تلامذہ کے علاوہ ان کا قائم کردہ ادارہ ''جامعہ یوسفیہ شاہو وام ہنگو'' بھی ہے۔

آپ کے پس ماندگان اور متوسلین نے آپ کی شخصیت کے تعارف اور علمی کارنامہ کو اگلی نسل میں منتقل کرنے کے لئے اشاعت خاص کا اہتمام فرمایا ہے، جو پس ماندگان کا فرض اور اگلی نسل کا قرض تھا، خیر اللہ تعالیٰ ''مجلہ المظاہر'' کے جملہ کارپردازان کو بالخصوص آپ کے صاحبزادے گرامی عزیزم مولانا محمد یوسف حفظہ اللہ کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ انہوں نے نہایت فکرمندی، خوب مستعدی اور انتہائی لگن سے اس خاص اشاعت کو اپنے اختتامی مراحل تک پہنچایا۔ اللہ تعالیٰ اسے مولانا رحمہ اللہ کے علوم ومعارف کی اشاعت کا ذریعہ بنائے۔

فجزاھم اللہ عنی وعن الامۃ الاسلامیہ خیر الجزاء۔

عبدالرزاق اسکندر

مہتمم جامعہ اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

تاثرات

حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحلیم چشتی مدظلہم

رئیس قسم التخصص فی الحدیث، جامعہ بنوری ٹاؤن، کراچی

میں نے جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کے اساتذہ میں دو ہی استاذ ایسے دیکھے جو فجر کی نماز کے بعد اپنی جگہ پر بیٹھ کر رات کے بارہ بجے تک برابر اپنے کام میں مصروف رہتے تھے، ان میں ایک مولانا حبیب اللہ مختار صاحب شہیدؒ اور دوسرے مولانا محمد امین اورکزئی صاحب شہیدؒ تھے۔ یہی دو لوگ برابر سرگرم عمل رہتے تھے۔ مولانا حبیب اللہ صاحب کے پاس تو لوگ آتے رہتے تھے، وہ باتیں بھی کرتے رہتے اور اپنا کام بھی کرتے رہتے تھے۔ مولانا امین صاحبؒ کا حلقہ بہت محدود تھا، ان کے پاس شاذ و نادر ہی کوئی آتا تھا، وہ اپنا کام تندہی سے برابر کرتے رہتے تھے، جو اوقات گھنٹے پڑھانے کے ہوتے تھے ان میں چلے جاتے تھے، پڑھا کے اپنی جگہ آتے اور اپنا کام مسلسل کرتے رہتے تھے، ان کے کام بڑے لمبے ہوتے تھے، اس لئے ان کا سلسلہ برابر قائم رہا، چنانچہ وہ اپنا کام زندگی بھر کرتے رہے، کام پورا نہیں ہوا زندگی پوری ہوگئی، اس لئے ان کی زندگی ہمہ وقت علم کی خدمت میں لگی رہی، ایسی محنت کرنے والے کم ہی زندگی میں اپنا کام پورا کر سکتے ہیں، یوں ان کی زندگی اللہ تعالیٰ کی یاد اور علمی کام میں بسر ہوتی گئی، کام پھر بھی پورا نہیں ہوا۔

پہلی کتاب ''مسانید ابی حنیفہ ومرویاتہ من المرفوعات والآثار'' ان کے فضل وکمال کی شہادت اور ان کی یادگار ہے۔ یہ مولانا کے تخصص فی الحدیث کا مقالہ تھا جو عربی زبان میں حضرت مولانا ادریس میرٹھیؒ کی نگرانی میں لکھا۔

مولانا نے ''نثر الازہار'' کے نام سے طحاوی کی مبسوط شرح لکھنی شروع کی مگر اتمام کو نہیں پہنچی، یہ شرح مولانا محمد

امینؒ کے کام اور اعلیٰ پایے کی عمدہ تحقیق کا مظہر ہے۔ ہمارے مشائخ خصوصاً حضرت مولانا محمد یوسف بنوری قدس سرہ ایک عرصہ سے طحاوی پر ایک خاص طرز سے کام کے خواہش مند تھے۔ خودتو انتہائی مصروف زندگی تھی، انہیں کسی گوہر نایاب کی تلاش تھی جوان کے خواب کوشرمندہ تعبیر کر سکے، اس کے لئے ان کی جوہر شناس نگاہ نے مولانا محمد امین صاحبؒ کا انتخاب کیا۔

امام طحاوی صحاح ستہ کے مصنفین میں سے نسائی کے ہم عصر ہیں، لیکن حدیث میں ان کی دو اہم خصوصیات ہیں:

[۱] ان کے پاس ایسی احادیث کے متون اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ ہیں جن سے مجتہدین استدلال کرتے ہیں۔

[۲] اسانید بھی ان کے پاس سب سے زیادہ ہیں، یہ خصوصیت صحاح ستہ میں کسی کو حاصل نہیں۔

لیکن افسوس ہے کہ حنفیہ کے ہاں ہی اس سے اعتناء کم ہے اور اس کا رواج اور قدر کم ہے اور جو روایت بالمعنیٰ کرتے ہیں اس کی کتاب سے اعتناء سب سے زیادہ پایا جاتا ہے، مولاناؒ کا یہی کارنامہ ہے کہ اس کتاب کی شرح لکھتے ہوئے جام شہادت نوش فرمایا، کاش وہ خود اس کی شرح پوری کر جاتے تو یہ ایسا عظیم کارنامہ تھا جس سے علمی دنیا عرصے تک فائدہ اٹھاتی رہتی، اللہ سے دعا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ ان کو آخرت میں بلند ترین مقام نصیب فرمائے۔

مولانا کا دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ مولانا بنوری کی وفات کے بعد اپنے علاقہ ضلع ہنگو میں ایک دینی مدرسہ قائم کیا، میں بھی ان سے ملنے گیا تھا، مدرسہ بھی اچھا بنایا ہے، خوشگوار مقام پر ہے، وہیں ان کا کتب خانہ بھی ہے لیکن افسوس کہ بمباری نے انہیں بھی نقصان پہنچایا اور وہیں جام شہادت نوش کر گئے۔

مولانا نہایت خوش اخلاق، باوقار اور بہت ملنسار تھے۔ علم کے قدردان اور علم دوست تھے۔ ان کی خصوصیات کے حامل پاکستان میں ان کے معاصرین میں بہت کم لوگ ہیں۔ جگر نے سچ کہا ہے:

جان کر من جملہ خاصان میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

میں ان کی قدر تو نہیں کر سکا لیکن اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کے مدرسے کو آباد رکھے۔

عبدالحلیم چشتی
جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

تاثرات

فقیہ ہند حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہم

ناظم اعلیٰ: اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا و آل انڈیا مسلم پرسنل لاء

گزرے ہوئے بزرگوں کے کارناموں اور اکابر کی خدمات کو محفوظ کرنا ایک سعادت ہے؛ کیونکہ روشن ماضی کی روشنی میں ہی حال کی تعمیر اور مستقبل کا لائحہ عمل تیار ہوتا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے پاس بزرگوں کے روشن کارناموں کا ایسا اثاثہ ہے کہ ماضی قریب میں کہیں اور اس کی مثال نہیں ملتی، اور اس وقت برصغیر میں جو کچھ دینی فضا قائم ہے وہ انہی کی جدوجہد کا ثمرہ ہے۔

محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری نوراللہ مرقدہ کو اللہ تعالیٰ نے گوناگوں صلاحیتوں اور صفات سے نوازا تھا، ان میں ایک بڑی صفت یہ تھی کہ وہ خود بھی کام کرتے تھے اور اپنے ساتھ رہنے والوں کو بھی کام میں لگائے رکھتے تھے، وہ مردم کار بھی تھے اور مردم ساز بھی، اس لیے جو بھی ان سے مس ہوا، کندن بن گیا اور جس نے بھی ان سے روشنی کا اکتساب کیا، وہ خود ایک چراغ گہر بار بن گیا۔

مولانا محمد امین اورکزئی سے اس حقیر کو ملاقات کی سعادت حاصل نہیں ہوئی؛ کیونکہ برصغیر کے دونوں ملکوں (ہند و پاک) کی سرحدوں نے تعلقات کی بھی سرحدیں قائم کر دی ہیں جو دونوں طرف کے اہل علم کے لیے محرومی کا باعث ہیں؛ لیکن اس کے باوجود ان کی جو خدمات علم اور دین کے میدان میں سامنے آئی ہیں، وہ نہایت گراں قدر ہیں، آپ کے علمی استناد کے لیے یہی کافی ہے کہ حضرت بنوریؒ نے ''معارف السنن'' جیسی

مایہ ناز تالیف میں آپ کو اپنا معاون بنایا تھا، اس کے علاوہ آپ نے ''مسانید الامام ابی حنیفہ'' شرح معانی الآثار کی شرح کی صورت میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ نہایت قابل قدر ہیں، ضرورت ہے کہ آپ کے ان علمی کاموں بلکہ کارناموں کو دنیا کے سامنے لایا جائے اور آپ کے اخلاق وکردار، علم دین کی نشر واشاعت میں محنت ومجاہدہ اور دعوت واصلاح کی جد وجہد کو بھی اوراق کے سفینہ میں محفوظ کر دیا جائے تاکہ موجودہ نسل کے لیے نصیحت کا سامان ہو۔

چنانچہ خوشی ہوئی کہ تحقیقی سہ ماہی مجلہ ''المظاہر'' نے آپ کی سیرت وسوانح اور خدمات ومجاہدات پر ایک ضخیم نمبر نکالنے کا ارادہ کیا ہے، یہ حقیر اس سلسلے میں ذمہ داروں کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتا ہے، نیز دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجلہ کے مرتبین اور ان کے رفقاء کو اپنے مقصد میں کامیاب اور بامراد کرے۔

۲۷ر محرم الحرام ۱۴۳۸ھ

۲۹ر اکتوبر ۲۰۱۶ء

خالد سیف اللہ رحمانی

جنرل سکریٹری: اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا

بانی وناظم: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

کلمات تبریک

حضرت مولانا عبدالحفیظ مکی رحمہ اللہ تعالیٰ

خلیفہ مجاز حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ

الحمد للہ وحدہ والصلاۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

امابعد کہ یہ سیاہ کار مکہ معظمہ سے جب ''انٹرنیشنل ختم نبوت کانفرس'' منعقدہ بروز اتوار اگست ۲۰۱۶ء کو نشتر ہال پشاور میں شرکت کے لئے حاضر ہوا، تو اسی دن پشاور میں محب مکرم گرامی قدر ومنزلت مولانا محمد یوسف اورکزئی فرزندار جمند حضرت اقدس مولانا محمد امین اورکزئی ملے ان کے ساتھ (سہ ماہی مجلہ ''المظاہر'' جوک'' جامعہ مظاہر علوم'' پنڈی روڈ بابری بانڈہ کوہاٹ (پاکستان) کا ترجمان، علمی، تحقیقی اور دعوتی مجلہ ہے) کے ذمہ دار مولانا طفیل صاحب مدظلہ جوک'' المظاہر'' کے مدیر موقر ہیں بھی ملے، جامعہ مظاہر علوم اور مجلہ'' المظاہر'' کا تعارف بھی کرایا اور یہ مژدہ بھی سنایا کہ ادارہ'' المظاہر'' علامہ جلیل ومحقق کبیر امین الملۃ والدین حضرت اقدس مولانا محمد امین اورکزئی شہید قدس اللہ سرہ العزیز کے علمی افادات اور احوال وآثار پر ایک خصوصی اشاعت کا اہتمام کر رہا ہے، اور ان شاء اللہ سال ۱۴۳۸ھ کا دوسرا شمارہ ''محقق کبیر'' نمبر ہوگا، ساتھ یہ تفصیل بھی بتائی کہ ان شاء اللہ اس میں:

باب اول: 'احوال امین' سے متعلق ہوگا، جس میں حضرت اقدس کے نجی، تعلیمی، سماجی، معاشرتی اور خاندانی احوال ہوں گے۔

باب دوم: 'آثار امین' جس میں حضرت اقدس کے علمی افادات، تحقیقات، کتابوں کا تعارف ودیگر علمی خدمات کا تذکرہ ہوگا۔

باب سوم: "تذکار امین" جس میں حضرت اقدس کے تلامذہ، منتسبین، متعلقین اور احباب کے تاثراتی ومشاہداتی مضامین ومقالات ہوں گے۔

باب چہارم: "نقش امین" جس میں حضرت اقدس کی خودنوشت علمی، تحقیقی مضامین ہوں گے۔

باب پنجم: "مکاتیب امین" جس میں حضرت اقدس کے علمی وتربیتی مکاتیب کا ذخیرہ مبارکہ ہوگا۔

باب ششم: "یادامین" جس میں حضرت اقدس کی یاد میں لکھے گئے قصائد اور مرثیے، نیز آپ کی موجود تبرکات کی تصاویر ونقوش کا ذخیرہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ ادارہ المظاہر کو اپنی شایان شان جزاء خیر عطا فرمائے کہ انہوں نے بہت عظیم کام کی ذمہ داری اٹھائی، حضرت اقدس مولانا محمد امین صاحب قدس سرہ العزیز کی عظیم الشان مبارک شخصیت کا بھی یہ حق تھا کہ مخلوق خدا اُن کی صفات عظیمہ وکریمہ سے کما حقہ متعارف ہوں کہ ایسے ہی حضرات فی الحقیقت عام مسلمانوں کے لئے بہترین قدوہ اور اُسوہ حسنہ ہوتے ہیں، اور ایسے ہی حضرات کے بارے میں ائمہ سلف کا ارشاد ہے کہ "عند ذکر الصالحین تنزل الرحمات" صالحین کے تذکرے سے اللہ کی رحمتوں کا نزول ہوتا ہے۔

دعا ہے کہ باری تعالیٰ اس خصوصی نمبر کی تیاری میں جو جو حضرات لگے ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ قدم قدم پر ان میں سے ہر ایک کی دستگیری فرمادیں اور ہر مرحلے پر اپنی رحمتیں ونصرتیں شامل حال فرمادیں اور عامۃ المسلمین اور خصوصاً علماوطلبہ کو اس مبارک شمارہ سے مستفید ومستفیض ہونے کی توفیق عطا فرمادیں اور اپنی بارگاہ میں قبولیت سے سرفراز فرمادیں۔ آمین

وصلی اللہ تعالی علی خیر خلقہ وسید رسلہ وخاتم انبیائہ سیدنا وحبینا وقرۃ أعیننا ونبینا ومولانا محمد النبی الأمی الکریم وعلی الہ وأصحابہ وأزواجہ وأتباعہ اجمعین وبارک وسلم تسلیما کثیرا کثیرا والحمدللہ أولا وآخرا۔

کتبہ الفقیر الی رحمۃ ربہ الکریم

عبدالحفیظ المکی (وارد حال راولپنڈی)

شب اتوار ۱۰ ذیقعدہ ۱۴۳۷ھ، مطابق ۱۴ اگست ۲۰۱۶ء

تقریظ

حضرت ڈاکٹر حاجی فدا محمد مدظلہم

خلیفہ مجاز مولانا اشرف خان سلیمانیؒ

حضرت مولانا محمد طفیل صاحب کوہاٹی سے بندہ بہت خوش ہے کہ تدریس کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کے ذریعے اشاعتِ دین کا کام کر رہے ہیں۔ قلم کے ذریعے کام بہت مشکل ہوتا ہے کیونکہ اس کے لئے پختہ علمی استعداد اور اردو زبان یا جس زبان میں بھی کام کرتا ہو اس پر مکمل عبور کی ضرورت ہوتی ہے۔ بولنا تو آسان ہے، جو بول لیا، بول لیا، جبکہ تحریر سب کے سامنے آتی ہے اور ہر کوئی اسے پرکھتا ہے۔

تھوڑے عرصے میں ''المظاہر'' رسالہ شروع کیا جو پاکستان کے صف اول کے رسالوں میں شمار ہونے لگا۔ اب انھوں نے ہمت کر کے اپنے استاد جناب حضرت مولانا محمد امین صاحب اورکزئی شہید کی سوانح مکمل کر لی۔ سوانح ایک ایسا موضوع ہے جس کا مطالعہ انسان کی شخصیت پر گہرا اثر ڈالتا ہے۔ چنانچہ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حکایتیں اللہ کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے جس سے مریدین کے دلوں کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ کسی نے دریافت کیا کہ اس کی کوئی دلیل بھی ہے۔ فرمایا: ہاں اللہ جل شانہٗ کا ارشاد ہے وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ وَجَاءَكَ فِي هَٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَ □ ى لِلْمُؤْمِنِينَ □۔ (ترجمہ) اور پیغمبروں کے قصوں میں سے ہم یہ سارے قصے آپ سے بیان کرتے ہیں جن کے ذریعہ سے ہم آپ کے دل کو تقویت دیتے ہیں (ایک فائدہ تو یہ ہوا) اور ان قصوں میں آپ کے پاس ایسا مضمون پہنچتا ہے جو خود بھی راست اور واقعی ہے اور مسلمانوں کے لئے نصیحت ہے (اور اچھے کام کرنے کی) یاددہانی ہے۔'' (بیان القرآن) انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے قصوں کی طرح ان کے تابعین صحابہ کرام، اولیائے عظام، علمائے کرام اور مجاہدین کے قصے بھی ہیں جو اپنی تاثیر

سے دلوں کو متاثر اور منور کرتے ہیں۔ سوانح کے چار مضامین، ایک ان کا اپنا لکھا ہوا، ایک حضرت مولانا عزیز الرحمان صاحب مروت کا، ایک اعظم خان صاحب کا اور ایک حضرت اورکزئی صاحب کی اہلیہ مبارکہ کا بندہ کو مطالعہ کے لئے بھیجے۔ بندہ نے چاروں مضامین حرف بحرف پڑھے۔ طفیل صاحب اور عزیز الرحمان صاحب کے مضامین نے آنکھیں جاری کردیں۔ واقعی دونوں شاگردوں کو اپنے استاد کے ساتھ سچی محبت حاصل ہے اور جذبے میں ڈوب کر حالات لکھے گئے ہیں۔ اعظم خان صاحب کا مضمون تو تکوینی امور اور مجذوبوں کے متعلق ہے اس لئے پورا حیرت انگیز ہے۔ تکوینی مجاذیب، تشریعی اولیاء اللہ کے پاس آتے رہتے ہیں۔ چنانچہ بندہ کے شیخ حضرت مولانا محمد اشرف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں ایسے لوگ آتے تھے اور بندہ ان کا عینی گواہ ہے۔ اور جو مضمون اہلیہ مبارکہ کا ہے اس نے تو تڑپا کر رکھ دیا۔ یہ مضمون صرف ان کا بولا ہوا ہے، لکھا طفیل صاحب نے ہے۔ اگر موصوفہ خود صاحب قلم ہوتیں تو دلوں کو چیر کے رکھ دیتیں۔ بندہ نے فوراً طفیل صاحب سے درخواست کی کہ اس مضمون کو رسالہ ''غزالی'' کی زینت بننے کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ ان کی اجازت سے ہم نے شائع کیا۔ مضمون کے شائع ہوتے ہی ضرب مؤمن والوں نے رابطہ کیا کہ اس مضمون کو ہم اپنی اشاعت میں چھاپنا چاہتے ہیں جس کی اجازت دے دی گئی۔

طفیل صاحب کا مضمون حضرت کی اصلاح معاشرہ کی سرگرمیوں پر مشتمل ہے۔ مضمون کو پڑھ کر بے ساختہ زبان سے نکلا ان بنی اسرائیل کانت تسوسھم الانبیاء کہ بنی اسرائیل کی سیاست کو ان کے انبیاء علیہم السلام سنبھالا کرتے تھے۔ نبوی سیاست کا فہم یتلوا علیھم ایٰتہ و یزکیھم و یعلمھم الکتٰب و الحکمۃ کی چاروں محنتوں سے گزرنے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ قرآن وحدیث کو پڑھانے والے اساتذہ تو کئی ہیں اور تربیت کرنے والے مشائخ بھی ہیں لیکن آگے بڑھ کر معاشرے کے سلگتے ہوئے اور الجھے ہوئے مسائل میں ہاتھ ڈالنا اور ان کو سلجھانا اور فتنہ و فساد کی آگ کو بجھانا اور اس میں کامیاب ہوجانا، یہ وہی کرسکتا ہے جس کو اللہ نے مذکورہ بالا چار محنتوں کے نتیجے میں نبوی فراست سے حصہ نصیب فرمایا ہو۔ حضرت نے پھر ہنگو کے ایسے علاقے میں کام کیا جس میں شیعہ سنی اختلاف بھٹی کی آگ کی طرح گرم تھا، اور اس کامیابی سے کیا کہ باید و شاید۔ اتنی بڑی کامیابی کی بنیاد یہ بات بنی کہ حضرت کی دینی وجاہت، اخلاص اور خدمت خلق نے ان کو عوام کے دلوں پر حکمرانی نصیب فرمائی ہوئی تھی۔

اللہ تعالیٰ محمد طفیل صاحب کی مساعی کو شرف قبولیت نصیب فرما کر آخرت کا سرمایہ بنائے۔ (آمین)

تاثرات

مختار الامۃ حضرت مفتی مختار الدین مدظلہم

خلیفہ مجاز حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمہ اللہ

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم، امابعد، بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ سے بندہ کے مراسم کی ابتدا کچھ یوں ہوئی، کہ جب آپ کراچی سے مستقل ہنگو تشریف لائے تو کچھ حضرات نے جو غالباً کسی غلط فہمی کا شکار تھے، حضرت مولانا سے بندہ کے بارے میں یہ عرض کردیا کہ یہ تبلیغی جماعت کا مخالف ہے، حضرت مولانا محمد امین صاحب چونکہ اتحاد امت کے بڑے داعی تھے، اور انہیں یہ بات قطعاً گوارا نہ تھی کہ علاقہ میں دینی تحریکات یا مدارس و خانقاہوں کے مابین تناؤ یا ٹکراؤ کی کوئی ایسی فضا موجود ہو، نیز آپ کسی کے بارے میں ناقص معلومات سنی سنائی یا مفروضات کی بنیاد پر کوئی موقف ہرگز قائم نہیں کرتے تھے، جب تک صاحب معاملہ کے بارے میں مکمل تحقیق نہ فرمالیں، اسی وجہ سے کربوغہ شریف آوری ہوئی، جب بندہ کے ساتھ ملاقات ہوئی اور بندہ نے دینی اداروں اور تحریکات کے مابین تحابب وتوافق اور تقارب وتناصر کی فضا پیدا کرنے اور اتحاد کے ساتھ چلنے کے متعلق اپنے اصول ذکر کئے تو از حد خوش ہوئے، اور آپ کی تشویش بھی دور ہوئی۔ اس کے بعد یہ تعلق باہمی اعتماد و مؤدت کی ایسی مضبوط عمارت میں تبدیل ہوا جس کی ہر اینٹ دوسری سے جڑی اور ایک دوسرے کا سہارا ہوتی ہے، کوئی بھی اہم قومی، ملی اور دینی معاملہ ایسا نہ تھا جو آپ کے متعلق ہو، اور بندہ سے اس میں مشورہ نہ فرمایا ہو، بندہ کی طرف سے بھی یہی صورتحال تھی، کہ ایسے معاملات میں ہمیشہ باہمی اتفاق رائے سے ہی مسائل کے حل تجویز کرتے، اس سلسلے میں چند اہم قومی اور ملکی معاملات کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔

ہماری ملکی تاریخ میں لال مسجد کا جانکاہ وخونچکاں حادثہ ہر مخلص پاکستانی کے لئے ذاتی حادثہ کی حیثیت رکھتا ہے، جب لال مسجد کی انتظامیہ اور حکومت کے مابین کشمکش جاری تھی تو مختلف اکابر اہل علم اس مسئلہ کو افہام وتفہیم سے سلجھانے کے لئے پریشان اور متحرک تھے۔ حضرت مولانا بھی اس حوالے سے کافی پریشان تھے۔ آپ نے بندہ سے بھی اس سلسلے میں مشاورت کی اور فرمایا کہ حضرت مولانا عبدالحفیظ مکی صاحبؒ کو بلالیں، حضرت کو بھی اسلام آباد بلالیا پھر ہم سب وہاں سے حاضر ہوئے اور بساط بھر جتنی کوشش ہو سکتی تھی وہ کی۔ حضرت مولانا شہیدؒ اسلام آباد میں ٹھہرے رہے، عجیب بات یہ ہے کہ آپ نے اس کا اظہار نہیں فرمایا کہ مولانا عبدالعزیز میرے شاگرد ہیں، مجھے بعد میں اس بات کا علم ہوا۔

بہر حال اس مسئلے کا سلجھاؤ مقدر نہ تھا، وہ نہ ہو سکا لیکن اس کے پرامن حل کے لئے آپ کی تڑپ، بھاگ دوڑ محنت وکوشش سب سے بڑھ کر تھی حتی کہ حکومتی فریق کو بڑی حد تک راضی بھی کرلیا تھا۔ یہ بات بھی کسی پر مخفی نہ ہوگی کہ اس وقت جو کوششیں ہوتی رہیں ان کا ذکر وتذکرہ براہ راست میڈیا کی زینت بنتا رہا لیکن آپ کی مساعی اس قدر اخفا میں تھیں اور یہی آپ کا مزاج بھی تھا کہ بھرپور کوششوں کو ذرا بھر بھی نمایاں نہیں ہونے دیا۔

ملکی سطح کی مصالحتی کوششوں میں آپ کا دوسرا بڑا کارنامہ قبائل میں اٹھنے والی مسلح تحریکوں اور حکومتی اداروں کے درمیان مفاہمت کے قیام اور خانہ جنگی کے انسداد کے لئے مساعی تھیں۔ مولانا فطرتاً امن پسند اور صلح جو انسان تھے، ملکی اور قومی ترقی کے پرزور حامی اور اہل وطن میں فکری وحدت کے لئے ہمہ وقت کوشاں رہتے، قبائل میں اٹھنے والی بدامنی کی لہر دیگر اہل وطن کی طرح آپ کے لئے بھی سخت پریشان کن تھی، اس سلسلہ میں بندہ کے ساتھ بارہا مشاورت کی نوبت آئی آپ کی فکر یہ تھی کہ سکیورٹی اداروں اور قبائلی تحریکوں میں جانبین کی افرادی ومالی وسائل بچائیں جائیں۔ ان کی غلط فہمیاں دور ہوں، اور اسلام اور وطن دشمن بیانیوں اور حکمت عملیوں میں اگر کوئی فریق فی الواقع مبتلا ہے تو اسے خیر خواہی اور افہام وتفہیم سے واپس لایا جائے، اور اگر محض غلط فہمیوں کی بنیاد پر باہم دوریاں ہیں تو انہیں اتفاقی نکات کو فروغ دے کر دور کیا جائے۔ آپ چاہتے تھے کہ قبائل میں مسلح قوتیں اپنی حکومتوں سے ٹکرانے کے بجائے اسلام اور وطن دشمن عناصر کی سرکوبی میں ملکی سرحدات سے باہر استعمال ہوں اور فوج کے شانہ بشانہ ملی وقومی دفاع کا فریضہ انجام دیں۔ اسی تناظر میں شمالی وزیرستان میں مسلح قوتوں اور حکومت کے مابین صلح میں بنیادی کردار ادا کیا، آپ کا طرز ہمیشہ ایسے کاموں میں یہ رہا ہے کہ خود کو پیچھے رکھتے اور اپنے متعلقین کو عملی میدان میں استعمال کرتے، اس کی وجہ نام ونمود اور شہرت سے آپ کا طبعی تنفر تھا۔ اس معاملہ میں بھی گورنر صوبہ سرحد علی محمد جان اورکزئی کی درخواست بلکہ پرزور اصرار آپ نے اس کام کا بیڑا اٹھایا، ہمیں آگے رکھا خود پیچھے رہے، لیکن تدبیر

ساری آپ کی استعمال ہوتی رہی۔آپ کے اخلاص کا عالم دیکھیں کہ جب صلح اختتام کو پہنچی حتی کہ شرائط بھی آپ کے ہاتھ سے لکھی گئیں لیکن اس کی خبر منظر عام پر آنے کے وقت ہم سب احباب سے یہ کہہ دیا کہ اصل مقصد اللہ تعالی کی رضا ہے، ہماری کوشش اسی کی خاطر تھی، الحمد للہ صلح ہوگئی۔اب آگے کا مرحلہ میڈیا کے سامنے اور منظر عام پر آنے کا ہے، اگر آپ چاہیں تو یہ مرحلہ مولانا فضل الرحمن صاحب کو سپرد کردیا جائے،جس پر ہم نے بھی حامی بھر لی، اس طرح اس صلح کے منظر عام پر آنے اور میڈیا پر اس کی تشہیر دیگر افراد کے ذریعے ہوئی، اگر خود آپ کے ذریعے سے اس کی تفصیلات منظر عام پر آتیں تو شاید یہ قوم آپ کو خصوصی ایوارڈ سے نوازتی۔

ملکی معاملات میں صلح اور آشتی کے لئے شیعہ سنی فسادات کا انسداد بھی آپ کا بہت بڑا کارنامہ تھا، آپ نے ہمیشہ یہ کوشش رکھی کہ اہل تسنن اور اہل تشیع کے طبقات مذہبی اور فکری اختلاف کے ساتھ عملی طور پر پرامن رہیں، اور صلح تصادم کی نوبت نہ آئے، جب کرم ایجنسی میں تاریخ کے بدترین فسادات ہوئے جس کے نتیجے میں اہل سنت کی کثیر آبادی کو اپنے علاقوں سے ہجرت کرنی پڑی اور زبردست مالی وجانی نقصان رونما ہوا، تو آپ نے بندہ سے مشاورت کرکے اس معاملے کو نمٹانے اور سلجھانے کی فکر کی بندہ ابتداء تیار نہ تھا لیکن آپ کے اصرار پر اللہ کا نام لیا، کئی سال مسلسل کام کرنے کے بعد اس معاملہ کو ہم '' مری معاہدہ'' تک لانے میں کامیاب ہوئے، ''مری معاہدہ'' کی تفصیلات ملکی میڈیا پر میسر ہیں، آج بھی فریقین اس معاہدہ کے پابند ہیں، اور علاقہ میں عملی طور پر امن قائم ہے، جو حضرت شہید کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔

ملکی سطح پر امن والامان کے قیام کے ساتھ ساتھ قومی وعلاقائی سطح پر بھی قومی جھگڑوں میں امن کے لئے آپ کا کردار مثالی رہا۔قوم شیخان اور مشتی کے درمیان کوئلہ کے کانوں پر ایک طویل جنگ ہوئی، آپ اس کے لئے ہمہ وقت متفکر رہتے زمین پر قتل وقتال، مسلمانوں کے باہمی لڑائیاں، کشت وخون اور جانوں کا ضیاع آپ کے لئے ناقابل برداشت ہوتا تھا۔اس لئے خود بھی تعلیمی وتحقیقی مزاج کی قربانی دے کر بے چینی کے عالم میں صلح وآشتی کے لئے میدان میں اتر آتے اور ہمیں بھی آمادہ کر لیتے۔

اسی طرح قوم ماموں زئی اور علی خیل کا قومی راستہ کی تعیین پر ایک زبردست اختلاف رونما ہوا اور لوگ جانبین سے مورچہ زن ہوئے، قومی مشران اور سیاسی لیڈران تھک ہار گئے، لیکن صلح نہ کرواسکے۔ان دونوں معاملات میں آپ آخر تک جمے رہے، رکاوٹوں کے باوجود آپ نے بھرپور کوشش جاری رکھی اور آپ کے پائے استقامت میں لغزش پیدا نہ ہوئی، اس طرح اللہ تعالی نے آپ کے ذریعہ ان دو قومی مسائل میں طویل جنگ کے بعد صلح کے حالات پیدا کئے۔

قومی سطح پر سیاسی معاملات میں فسادات کے انسداد کے ساتھ ساتھ علاقہ میں جہاں کہیں علمی وفکری تشدد پایا جاتا اور اس کے نتیجے میں خون ریزی کا خطرہ ہوتا تو آپ اس میں اپنا کردار ادا کرتے، اس کی دو مثالیں دوں گا۔

سپری کوٹ اورکزئی ایجنسی میں اہل علم کا فروعی مسائل میں اختلاف اتنا بڑھا کہ قومی خانہ جنگی کے حالات بن گئے، اسی طرح مشتی میلہ اورکزئی ایجنسی میں فروعی مسائل پر پرتشدد اختلاف رونما ہوا، دونوں جگہوں پر آپ نے اپنا بھرپور کردار ادا کر کے معاہدات کئے، اگر یہ معاہدات نہ ہوتے اور فریقین کے مسائل میں معتدل علمی موقف کے ذریعے اتفاق رائے پیدا نہ کرتے تو کئی جانوں کا ضیاع اور خاندانی دشمنیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا۔

حضرت مولانا شہیدؒ میرے لئے ایک کھلی کتاب کے مانند تھے، جہاں کہیں مسئلہ درپیش ہوتا یا الجھن ہوتی تو آپ مجھے پوری طرح مطمئن کر دیتے، یہاں تک کہ شرح صدر ہو جاتا۔ جنرل مشرف کی ملک دشمن پالیسیوں سے ایک بار میں اتنا دلبرداشتہ ہوا کہ ایک کھلا خط جنرل صاحب کو لکھنے کا ارادہ کیا، لیکن آپ کے ساتھ مشاورت پر آپ نے مجھے اسے منع فرمایا اور فرمایا کہ یہ آپ کا میدان نہیں، آپ کام کے آدمی ہیں، اپنے شعبہ پر بھرپور توجہ دیں، اس سے آپ کے لئے مشکلات کھڑی ہوں گی۔

جب ہمارے اپنے طبقہ میں میرے استاذ گرامی شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی مدظلہم کے خلاف بلاسود بینکاری کے حوالہ سے ایک ''متفقہ فتویٰ'' کے نام سے تحریر منظر عام پر آئی، جس میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی تھی کہ حضرت شیخ کی یہ ساری کاوش غلط محض ہے اور اس پر سارے اہل علم کا اتفاق ہے۔ تو بندہ نے اس فتویٰ کے منفی اثرات کے انسداد کے لیے کوشش کی، اور اس سلسلہ میں ایک کتاب بھی لکھی، کیونکہ ہماری رائے میں یہ امت کے اندر افتراق و انتشار کی کوشش تھی نیز دشمنان اسلام کو اس بات کا موقع فراہم کرنا تھا کہ اسلامی تعلیمات میں معاشی نظام کی اصلاح اور بہتری یا عالمی سطح پر طاغوتی معاشی نظام کی مقاومت کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس سلسلہ میں حضرت مولانا امین شہید نے بھی اہل علم کے نام حضرت شیخ الاسلام کے حق میں خطوط لکھے اور بندہ کی پوری پشت پناہی اور تعاون کیا جس کے نتیجے میں باہمی اختلاف کا طوفان کچھ ٹھنڈا ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک وقت میں بڑی خوبیوں سے نوازا تھا، تبحر علمی کے ساتھ فنائیت وگمنامی، تقویٰ وللٰہیت، توکل واستغنا، خودداری اور دینی وملی بیداری چھوٹوں وکمزوروں پر شفقت ومہربانی جیسی عمدہ صفات سے اللہ تعالیٰ ان کو خوب نوازا تھا۔ ان کے علمی مقام کا اندازہ ان کی کتاب نثر الازہار (جو امام طحاوی کی مشہور کتاب شرح معانی الآثار کی وقیع شرح ہے) سے لگایا جا سکتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو کتاب بینی کا خاص ملکہ عطا فرمایا تھا، نقد رجال پر پوری نظر رکھتے تھے۔ آپ کے علمی تبحر اور جامعیت کے پیش نظر جب آپ کے لیے مروجہ القابات کا استعمال دیکھتا ہوں تو

یہ تنگ دامنی کا شکار نظر آتے ہیں۔ اور ایسی حیرت ہوتی ہے جیسے قرون اولیٰ کی کسی جامع ہستی کے لیے شیخ الحدیث یا مفتی اعظم کے لقب کے استعمال پر حیرت ہوا کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو غم خواری اور ہمدردی کے وصف سے مالا مال فرمایا تھا۔ لوگوں کو تنگ دستی اور فقر وفاقہ کی حالت میں دیکھتے تو افسردگی اور حزن وملال چہرے سے نمایاں ہوتا۔ ایک دفعہ غالباً راولپنڈی سفر میں جبکہ میں بھی ہمراہ تھا، کسی فقیر کو دیکھا تو اس کی اعانت کر کے فرمایا: ان تنگ دستوں کے لئے معاش کا کوئی ایسا مستقل نظم ہونا چاہئے، جس سے ان کی پائیدار اعانت ہو سکے۔

اپنے رب سے عجز ونیاز اور شب بیداری کا یہ عالم تھا کہ دوران سفر جب بھی میں ساتھ ہوتا یا پھر آپ کہیں کر بوغہ شریف تشریف لائے ہوتے تو رات کو اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے اور اپنے رب کو منانے کے لئے دوسروں سے پہلے اٹھنے والوں میں سے پایا۔ گمنامی اور فنائیت کی یہ حالت تھی کہ کسی مجمع یا اجتماع کے موقع پر عوام میں گھل مل کر بیٹھے رہتے اور آگے علماء کے لئے مخصوص جگہ میں نہ بیٹھتے، پہچانے ہی نہیں جاتے تھے کہ کہاں ہیں لیکن جو جتنا اپنے آپ کو چھپاتا ہے اور مٹاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی عادت کریمہ کچھ ایسی ہے کہ وہ اتنا ہی ابھارتا ہے۔

ان کی گمنامی دیکھیں جنہیں شہرت دوام ہوئی
لاکھ بند تھی پھر بھی مشک وعنبر کی موج عام ہوئی

حضرت شہیدؒ کو بندے سے بڑی محبت تھی، آپ بڑی شفقت فرماتے تھے، اور میں بھی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے جب تصنیف وتالیف کے حوالے سے کوئی کتاب لکھتا تو حضرت سے علاقائی، ماحولیاتی اور علمی تعلق کی بنیاد پر تصویب وتائید کے لئے ان کے سامنے پیش کرتا۔ حضرت تائید فرماتے تو ایک قلبی سکون حاصل ہوتا اور اپنی محنت پر ایک سند مل جاتی، چنانچہ ذکر بالجہر کا مسئلہ جب بعض نارسیدہ فہم لوگوں نے اٹھایا جو ایک واضح چیز تھی، تو بندہ نے ذکر کے دوسرے فضائل ومسائل کے ساتھ ساتھ اس مسئلہ پر لکھا جو کتابی شکل میں ''ذکر اللہ کے فضائل ومسائل'' کے نام سے دستیاب ہے، تو حضرت نے ذکر جہری پر نہ صرف زبانی تائید فرمائی بلکہ تحریری طور پر بھی اس پر لکھا جس کا نمونہ ان سطور میں ملاحظہ ہو:

''مندرجہ بالا تفصیل وشروط کے ساتھ ذکر بالجہر کو حرام یا بدعت کہنے والا جاہل ہے یا مفسد، حضرت امام ابوحنیفہ اور دیگر اہل علم نے ایسے ذکر بالجہر کو مکروہ وبدعت قرار دیا ہے جو صاحب شریعت سے بلا جہر ثابت ہو یعنی کسی موقع پر ذکر تو منقول ہو لیکن جہر منقول نہ ہو ایسے موقع پر باعتقاد قربت جہر کو مکروہ فرمایا جبکہ صاحبین اور دوسرے ائمہ کرام کے نزدیک یہ جہر بھی بلا کراہت جائز ہے اور مفتی بہ حنفیہ کے نزدیک یہی قول ہے۔''

اس سلسلے میں ایک اور جواب بھی دیا ہے اس کے اخری الفاظ یہ ہیں:

''بہرحال جو شخص ذکر جہری کو مطلقا بدعت قرار دیتا ہے وہ بھی لاؤڈ سپیکر پر یقیناً وہ خود مبتدع ہے واللہ سبحانہ اعلم،

محمد امین عفا اللہ عنہ خادم جامعہ یوسفیہ شاہو وام، یکم ذوالحجہ ۱۴۱۵ھ (دیکھئے: ذکر اللہ کے فضائل ومسائل)

اسی طرح جب بندہ نے امت کے اندر فرقہ بندی اور مسلکی شدت پسندی سے پریشان ہوکر قلم اٹھایا اور ''مسلک اعتدال'' تحریر کی، تو حضرت شہید نے اس پر بڑا شاندار پیش لفظ لکھا جو آپ کی امت کے لئے فکرمندی کا مظہر ہے، اور جس کے لفظ لفظ سے اخلاص جھلکتا ہے، آپ نے تحریر فرمایا:

''تحریف فی الاصطلاح کا فتنہ جو کہ الحاد کا صدر ہے اور بے دین اور بد دین عناصر کا سب سے بڑا ابلیسی حربہ ہے جس کی کوکھ سے ماضی بعید کے بے شمار فرقے پیدا ہوئے، اور جن سے ماضی قریب میں قادیانیت، پرویزیت وغیرہما جیسی کافرانہ وملحدانہ تحریکات کو جنم دیا گیا، حضرت مؤلف مدظلہم نے اس عظیم فتنہ کی طرف مؤثر انداز میں توجہ دلائی ہے سلف سے متوارث فہم سے ہٹ کر دینی مصطلحات کی خود ساختہ تاویلات کے سہارے بہت سے اہل کفر وضلال اسلام کا لیبل لگا کر زندہ ہیں،'' باطنیت کا یہ جرثومہ افسوس ہے کہ بعض مفید دینی وتجدیدی تحریکات کے خون میں بھی شامل ہونے لگا ہے، اسلام یقیناً راہ اعتدال ہے اور سنیت اس کی صحیح صورت ہے، قرون ثلاثہ میں سمجھے گئے دینی حقائق اور معمول طریقے اپنا کر ہی گوہر مقصود کو پایا جاتا ہے اور اس سے انحراف افتراق کا بنیادی پتھر ہے اختلاف کو افتراق سمجھ کر قرون ثلاثہ کے فہم سے آزاد ہوکر کتاب وسنت پر عمل کرنے کا دعوی بھی ایک سراب ہے اور امت کو گمراہی کے تباہ کن دلدل میں پھنساتا ہے۔'' (حضرت مولانا) محمد امین عفا اللہ تعالی عنہ، خادم جامعہ یوسفیہ (دیکھئے مسلک اعتدال)

امت کی جو حالت فی زمانہ خراب ہے اس کی بنیادی وجہ ان سے اس ایمان ویقین کے احوال کا اٹھ جانا ہے جس ایمان ویقین پر خداوند کی طرف سے عطاؤں کے وعدے ہیں۔ بندہ نے اسی فکر کے تحت آئینہ ایمان لکھی، حضرت نے اس کو بہت ہی بہترین تقریظ لکھی، جس میں یہ بھی لکھا: ''اللہ جل شانہ ہمارے مخدوم ومکرم، شیخ اور عالم محقق حضرت مولانا مفتی مختار الدین صاحب دامت برکاتہم کو جزائے خیر سے نوازے اور آپ کی عمر میں برکت عطا فرمائے اور آپ کے علوم ومعارف سے امت کو بیش از بیش نفع پہنچائے۔ آپ نے اپنے دلکش پیرایہ سلیس اور عام فہم انداز تعبیر کے ساتھ ''آئینہ ایمان'' نام کی کتاب نہایت مفید تالیف فرما کر وقت کی بڑی ضرورت کو پورا کیا۔'' (حضرت مولانا) محمد امین عفا اللہ تعالی عنہ، خادم جامعہ یوسفیہ، شاہو وام (دیکھئے: آئینہ ایمان)

امت کے اندر باہمی تشتت ختم ہوجائے، یہ ایسا خواب ہے جسے ہر صاحب دل دیکھتا ہے۔ حضرت شہیدؒ اس سلسلے

میں کتنے فکرمند تھے؟ اس کا اندازہ ذیل کی تحریر سے ہوسکتا ہے: ''مسلمانوں کی زبوں حالی کے یقیناً متعدد اسباب ہیں، جن کی تفصیل ہر دور میں اہل فکر حضرات کرتے چلے آئے ہیں۔ ان اسباب میں سب سے نمایاں سبب، ان کا تشتت وانتشار ہے، باہمی مخالفت ومخاصمت ہے اور آپس میں الفت وجذبہ اخوت کا فقدان ہے، جبکہ ان کی راہنما کتاب نے انتہائی واضح اور حصر کے انداز میں انہیں ''انما المؤمنون اخوۃ'' قرار دیا اور ''رحماء بینھم'' ان کی علامت بتلائی تھی اور ان کے ہادی اعظم، معلم حکمت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ''کونوا عباد اللہ اخوانا'' کی ہدایت فرمائی تھی، کبھی فرمایا ''مثل المؤمنین فی توادھم وتراحمھم وتواصلھم کمثل الجسد الواحد''۔ اور کبھی فرمایا: ''المؤمن للمؤمن کالبنیان یشد بعضہ بعضا''۔

کچھ آگے تحریر میں لکھتے ہیں: ''ہر دور میں اللہ جل شانہ کے کچھ مخلص اور مقرب بندے یہ دعوت لے کر اٹھے ہیں اور الحمدللہ ان کے مساعی مشکورہ کافی حد تک بارآور ثابت ہوئی ہیں۔ پوری امت بالخصوص پاکستانی اور بالاخص سرحد کے مسلمان آج جس انتشار کا شکار ہیں اور اس برے نتائج بھگت رہے ہیں یا بھگتنے والے ہیں اس کا احساس فرماتے ہوئے ہمارے کرم فرما حضرت مولانا مفتی مختار الدین صاحب کربوغہ شریف دامت برکاتہم جو کہ اخلاص، ہمت، جرأت اور استقامت کی مثالی صفات کے حامل ہیں، انہوں نے کمر ہمت باندھ لی ہے، کہ کسی طرح آپس میں باہمی نفرتیں ختم ہوں یا کم از کم ان میں یہ شدت نہ رہے اور اتفاق واتحاد کی بیش از بیش صورتیں ظہور میں آجائیں۔''

(حضرت مولانا) محمد امین عفا اللہ تعالیٰ عنہ، خادم جامعہ یوسفیہ شاہو وام (دیکھئے: راہ محبت)

اس کے علاوہ بھی میرے تصانیف پر حضرت شہیدؒ کی تقاریظ موجود ہیں، جو ان کتابوں پر دیکھی جاسکتی ہیں۔ اور خود مجھے بھی حضرت مولاناؒ کی امانت ودیانت اور علمی مقام واصابت رائے پر اس طرح اعتماد تھا کہ جب میں نے اپنی بعض تالیفات (جو خالص علمی نوعیت کی تھیں) کو ان کے سامنے پیش کیا، لیکن انہوں نے مجھے ان مسودات کو وقتی طور پر منظر عام پر لانے سے منع فرمایا تو میں نے وہ تحریرات'' باوجودیکہ وہ درست تھیں، اور بڑی تحقیق اور محنت سے لکھی گئی تھیں'' کو شائع نہیں کیا اور حضرتؒ نے اس بناء پر شائع کرنے سے منع فرمایا کہ وہ لوگ جو تحریک ایمان وتقویٰ کے کاموں میں اپنے متعصبانہ رویہ کی بنیاد پر روڑے اٹکا رہے تھے، ان دقیق تحقیقات، مشکل موضوعات اور باریک مسائل کو بدفہمی کی بنیاد پر ایسے معانی پر حمل کریں گے، جو آپ کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوں گے۔

حضرت مولانا شہیدؒ ملک پاکستان اور اس کی حفاظت کرنے والے اداروں کے بھی بڑے مخلص اور خیرخواہ تھے، وہ جانتے تھے کہ دشمن کسی طرح ہمارے اس ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتا ہے، اسی وجہ سے وہ قانون کرنے والے اداروں کے لئے بھی دل میں ہمدردانہ جذبات رکھتے تھے۔ وہ ملک میں کسی قسم کی خانہ جنگی یا باہمی جنگ وجدال کے

ہرگز قائل نہ تھے اور اس ناخوشگوار صورتحال پر سخت مضطرب اور بے چین تھے۔

حضرت مولانا کی ان قابل قدر قومی خدمات اور ملی ہمدردی کا جو حد درجہ افسوسناک اور وحشت ناک صلہ ان کو دیا گیا، وہ اس ملک کی تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔ ایسے ربانی علماء، ملک وملت کے بہی خواہوں اور تابناک اور اجلا کردار رکھنے والے قومی رہنماؤں کو چند بدخواہوں کی بدنیتی پر مشتمل رپورٹوں کی بنیاد پر شہید کر دینا کہاں کا اصول، کون سا طریقہ اور کیسا قانون ہے؟؟؟ اس افسوسناک واقعہ کا ایک بہت بڑا نقصان ملک کو یہ ہوا کہ اب ملک وملت سے مخلص علمائے کرام قومی معاملات میں کسی قسم کی ذمہ داری اٹھانے اور آگے آنے سے گریز کریں گے جس کا امن قائم کرنے کی کوششوں کو ہی نقصان ہوگا۔

اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کے درجات بلند فرمائے اور ان کے جاری وساری تمام دینی کاموں بشمول ان کے ادارہ جامعہ یوسفیہ کو ان کے ہی طریق واسلوب پر قائم ودائم رکھے۔ اس موقع پر سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے وہ الفاظ یاد آتے ہیں، جو انہوں نے سرور کائنات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال پر ادا کیے: طبت حیا و طبت میتا۔

بندہ

مختار الدین

کربوغہ شریف

تاثرات

حضرت مولانا پیر عزیز الرحمن ہزاروی مدظلہم

خلیفہ مجاز حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم، امابعد:

فقیر کو مخدوم زادہ مولانا محمد یوسف سلمہ نے اپنے عظیم والد حضرت والد مولانا مفتی محمد امین شہیدؒ کی سوانح کے حوالے سے تحریر کرنے کے لئے فرمایا ہے، اس عظیم ہستی پر بہت سے حضرات نے بہت کچھ لکھا ہے، ناچیز کو ان کی نابغہ روزگار شخصیت پر لکھنے کی ہمت نہیں بار بار اصرار پر تعمیل ارشاد میں مختصر لکھنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

حضرت شہیدؒ سے احقر کی شناسائی اور قرب کا ایک طویل عرصہ ہے، وہ ہمارے محبوب بزرگ محدث العصر حضرت اقدس مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کے خاص تلامذہ میں سے تھے، حضرت بنوریؒ ان سے بہت ہی شفقت کا معاملہ فرمایا کرتے تھے، آپ کو بھی اپنے عظیم محسن استاد سے والہانہ عقیدت ومحبت تھی، یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنے صاحبزادے کا نام محمد یوسف رکھا حضرت شہیدؒ کو اللہ تعالی نے مضبوط علمی استعداد عطا فرمائی تھی، آپ کو فن حدیث اور فقہ سے خاص شغف تھا، آپ تخصص فی الحدیث کے ماہر سمجھے جاتے تھے، اس فن کے حصول کے لئے آپ کے ہاں ملک وبیرون سے علما وطلبا کی ایک کثیر تعداد موجود رہتی تھی، اس کے ساتھ ساتھ آپؒ دفاع دین کے سلسلہ میں بھی پیش پیش رہا کرتے تھے۔

مسئلہ تحفظ ختم نبوت ہو یا حضرات صحابہ کرام واہل بیت اطہار کی ناموس کا مسئلہ ہو، یا پھر دین کے کسی بھی شعبے کا مسئلہ ہو اس کے دفاع کے لئے آپ کا کردار ہمیشہ قائدانہ رہا، آپ علاقائی معاملات اور صلح وصفائی میں اللہ تعالی کی مخلوق کے غمخوار تھے۔ آپ کی ذات ایک انجمن تھی، جہاں آپ شرک وبدعت سے بیزار، توحید وسنت کے داعی تھے، وہاں شعائر اللہ کی حد درجہ تعظیم اور توحید کے نام سے بے ادبی اور گستاخی کے بھی مخالف تھے۔ ان تمام تر

خوبیوں کے باوجود اپنے اکابر واسلاف کی طرح بہت متواضع شخصیت کے مالک تھے۔ اللہ تعالیٰ جل شانہ اور ان کے مبارک ذکر سے آپ کو بے پناہ محبت تھی، خود بھی ذاکر وشاغل تھے اور دوسروں کو بھی ترغیب دیا کرتے تھے۔

آپ عشق حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بھی سرشار تھے، آقا صلی اللہ علیہ وسلم فداہ روحی وابی وامی کے سچے عاشق تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر عمل کا اہتمام کرنا آپ کی امتیازی شان تھی، درود شریف کے بارے میں آپ کا ذوق بہت نرالا تھا۔ آپ اپنے شیخ ومرشد کامل حضرت مولانا فضل محمد صاحبؒ کا عکس جمیل تھے، شیخ کامل کی صحبت اور استاکامل حضرت بنوریؒ کی شفقت کا اثر تھا کہ مجالس ذکر اور صلحا کی محفلوں میں شرکت کا خصوصی اہتمام فرماتے تھے۔

فقیر کی اکثر ملاقاتیں ہمارے پیر بھائی مخدوم ومکرم حضرت مولانا مفتی مختار الدین شاہ صاحب دامت برکاتہم کے روحانی اجتماعات کربوغہ شریف میں شرکت کے مواقع پر ہوا کرتی تھیں، جہاں آپ اہتمام کے ساتھ شرکت فرمایا کرتے تھے، فقیر اور حضرت مفتی صاحب سے آپ بے حد محبت فرماتے تھے۔ جب بھی راولپنڈی، اسلام آباد تشریف لاتے تو از خود فقیر کو میزبانی کا شرف بخشتے، آپ کے ساتھ اکثر عظیم رفیق حضرت مولانا عبداللہ صاحبؒ بھی ہوا کرتے تھے۔ حضرت شہیدؒ حقیقتاً جامع الصفات والکمالات تھے، ایسی ہی ہستیوں کے بارے میں شاعر نے کہا:

خدا یاد آئے جن کو دیکھ کر وہ نور کے پتلے
نبوت کے یہ وارث ہیں یہی ہیں ظل رحمانی
یہی ہیں جن کے سونے کو فضیلت ہے عبادت پر
انہیں کے اتقا پر ناز کرتی ہے مسلمانی
انہیں کی شان کو زیبا نبوت کی وراثت ہے
انہیں کا کام ہے دینی مراسم کی نگہبانی
رہیں دنیا میں اور دنیا سے بالکل بے تعلق ہوں
پھریں دریا میں اور ہرگز نہ کپڑوں کو لگے پانی
اگر خلوت میں بیٹھے ہوں تو جلوت کا مزہ آئے
اور آئیں جلوت میں تو ساکت ہو سخن دانی

آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرب بندوں والی موت، جس کی آپ تمنا بھی رکھتے تھے، "شہادت" نصیب فرمائی۔

آپ نے باقیات صالحات میں سے ایک حسین گلشن چھوڑا، جو اپنے استاد ومربی محدث کبیر حضرت مولانا محمد

یوسف بنوریؒ کے نام سے منسوب کیا۔ اللہ تعالیٰ کروڑوں شکر اس پر کہ آپ کے علمی جانشین حضرت مولانا محمد یوسف صاحب سلمہ جانشینی کا حق ادا کر رہے ہیں، اسی طرح دوسرے صاحبزادگان بھی نیک وصالح ہیں۔

خداوند قدوس اپنے خاص فضل وکرم اور اپنے حبیب ومحبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل وصدقہ حضرت شہیدؒ کے درجات کو بلند فرمائیں اور آپ کی تمام اولاد، جملہ تلامذہ، تمام دینی خدمات اور آپ کے لگائے ہوئے باغ کو تا قیامت شاد وآباد رکھیں۔ آمین بجاہ النبی الکریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ اجمعین۔

بندہ

عزیز الرحمن ہزاروی

راولپنڈی

تقریظ

شیخ الحدیث حضرت مولانا سمیع الحق مدظلہم

مہتمم جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم، امابعد:

مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ ہمارے ملک کے ان نابغہ روزگار علماء میں سے تھے جن کی مثالیں ہر دور میں گنی چنی ہوا کرتی ہیں۔ آپ نے جامعہ بنوری ٹاؤن میں اپنے وقت کے بڑے جبال علم سے کسب فیض حاصل کیا، اساتذہ کے علم وتقوی کو جذب کرنے کے ساتھ ساتھ ان کا بھرپور اعتماد پایا اور محدث العصر حضرت بنوریؒ کے مساعد ومعاون کی حیثیت سے ایک عرصہ تک علمی، تدریسی وتصنیفی خدمات انجام دیں۔

بارگاہ ایزدی سے آپ کو کئی خصوصیات ودیعت ہوئیں، جن میں آپ اپنے ہم عصروں سے بلاشبہ ممتاز رہے، انہیں سعادت کی زندگی اور شہادت کی بہترین دولت نصیب ہوئی۔ آپ کے کمالات ومزایا کا احاطہ ممکن نہیں تاہم میرے علم میں جو چیدہ چیدہ امتیازات وخصوصیات آئی ہیں، ان کا مختصر ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔

آپ کی نمایاں ترین خصوصیت آپ کا تبحر علمی تھا، علم حدیث پر کامل دسترس اور مجتہدانہ بصیرت نصیب ہوئی تھی، آپ نے وقت کے ممتاز محدثین حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ اور مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ سے بھرپور استفادہ کیا، اور اس علم وفن میں خود کو مرجع وامام کی حیثیت سے منوایا۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ علم حدیث کی معروف کتاب ''شرح معانی الآثار'' للطحاوی کی عربی شرح نثر الازھار ہے، جو علمی مباحث، ندرت وجودت اور اسلوب بیان میں اپنی مثال آپ ہے۔ نیز حضرت امام اعظمؒ کے مسانید ومرویات پر آپ کا تحقیقی مقالہ ''مسانید الامام أبي حنیفۃ'' بھی آپ کے علمی کمال کا شاہد عدل ہے۔ یہ مقالہ بقامت کہتر بقیمت بہتر کا مصداق کئی مجلدات پر بھاری ہے، حضرت مولانا بنوریؒ نے اس کی قدر وقیمت کا صحیح اندازہ کیا، اور اسے مصر سے طبع کروایا۔

آپ ایک اور خصوصیت علمی جامعیت تھی، بنیادی طور پر محدث ہونے کے باوجود فقہی اور معقولی علوم میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے، جن کا ثبوت آپ کے لکھے ہوئے فقہی اور کلامی مقالات بہم پہنچاتے ہیں۔ نیز مناظراتی ادب پر بھی پوری گرفت تھی، اور دیگر مکاتب فکر کے اہل علم سے کئی کامیاب ومؤثر مکالمے کیے۔ آپ کے تفسیری افادات پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن فہمی میں بھی آپ کا مقام انتہائی بلند تھا اور اس میدان میں من جانب اللہ خاص وہبی علوم اور کسبی ذوق سے بہرہ ور تھے۔

آپ کی دوسری بڑی خصوصیت اپنے گہرے علم کے ساتھ عمل کی کامل مطابقت تھی، علم وعمل کی اس مطابقت نے آپ کو معرفت وحقیقت کے اونچے مقامات پر فائز کیا، تعلق مع اللہ کی مثالی کیفیات نصیب ہوئیں اور روحانی وعرفانی احوال میں اسلاف امت کے ہم نشین ثابت ہوئے۔ وقت کے کئی اجل عارفین سے یکے بعد دیگرے بیعت و ارادت کا تعلق رکھا اور خرقہ خلافت سے سرفراز ہوئے۔ آپ کی کئی کرامات بھی مشہور ہوئیں، خصوصاً شہادت سے قبل ایسے اقدامات اور پیش گوئیاں جو حرف بہ حرف صادق آئیں، آپ کی مقبولیت وصدق کی دلیل ہیں۔

آپ کی تیسری اہم خصوصیت تصنیف وتالیف اور درس وتدریس کا عمدہ ذوق تھا، محدث العصر مولانا بنوریؒ کی تعلیم وتربیت سے عربی انشاء پر خوب قدرت پائی تھی، اردو تحریر انتہائی شستہ، ادبی اور ٹھوس ہوتی تھی، آپ نے کم لکھا لیکن جو لکھا مدلل وٹھوس لکھا۔ درس وتدریس کا ملکہ بھی مثالی نوعیت کا تھا، آپ اپنے عصر کے بڑے اور باکمال مدرسین میں سے تھے۔ علوم عقلیہ ونقلیہ میں یکساں طلبہ کا مرجع رہے اور ایک خلق کثیر نے آپ کے علمی جواہر سمیٹے۔

آپ کی چوتھی خصوصیت ملک وملت کی فلاح وبہبود کے لئے تڑپ اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں تن من دھن کی قربانی کا جذبہ اور سماجی ومعاشرتی سطح پر رفاہی وسیاسی جدوجہد کے ذریعے عامۃ الناس کی خدمت تھی۔ اہم ملکی وملی مسائل میں آپ کا درد، کڑھن اور تڑپ دیکھنے کی ہوتی۔ اتحاد کے داعی تھے، اس حوالے سے بندہ کے نام بھی خطوط لکھے، ہمیشہ سے اس بات کی فکر رہتی کہ دینی حلقے متحد ہوکر مملکت خداداد میں دین اسلام کے کامل نفاذ کے لئے سیاسی و پُرامن جدوجہد کا حصہ بنیں اور اپنا متحرک وفعال کردار یقینی بنائیں۔

ہمارے خطہ میں بزرگوں کے احوال وآثار کو محفوظ رکھنے اور انہیں فروغ دینے کی روایت انتہائی قابل رحم ہے، ہمارے دیار میں حضرت مارتونگ باباجیؒ علوم عقلیہ ونقلیہ کے بحر ذخار ومجتہد تھے، فن تدریس کے امام تھے، لیکن ان کے بنیادی نوعیت کے حالات بھی لوگوں کے سامنے نہ تھے، بندہ نے حضرت مولانا فضل مولیٰ صاحبؒ کو ان کے ہاں بھیجا تھا، جنہوں نے وہاں کئی دن قیام کرکے ایک کاپی میں ان کے احوال وآثار جمع کیے۔ مولانا محمد طفیل کوہاٹی سلمہ اس حوالے سے خوش قسمت ہیں کہ ان کے حصے میں اتنی عظیم شخصیت کی سوانح مرتب کرنا آئی، اللہ تعالیٰ ان کی اس کوشش کو قبولیت عامہ وتامہ بخشے اور ان کے ذوق علم وتحقیق کو مزید بڑھائے۔ آمین

آپ کی شہادت اہل خاندان، تلامذہ اور متعلقین کے ساتھ ساتھ پورے ملک وملت کے لئے ذاتی سانحہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ بلاشبہ مظلوم تھے، آپ کی شہادت دین اور وطن دشمنوں کے اس طویل سازش کی کڑی ہے جس کے تحت دوسواسی (۲۸۰) مدارس کی فہرست بمباری کے لئے تیار کروائی گئی تھی۔ آپ کی شہادت کے بعد علماء کا ایک وفد مجھ سے ملا اور اس بارے میں آگاہی دی، جس کے بعد بندہ نے بذات خود اسلام آباد جاکر اس حوالہ سے کافی جدوجہد کی، حکام بالا تک درست اور صحیح معلومات پہنچا کر انہیں اس بات پر آمادہ کیا گیا کہ اس طرح کے اقدامات خانہ جنگی اور بدامنی کو مزید فروغ دیں گے اور عالمی ایجنڈے کی تکمیل میں معاون بنیں گے، لہٰذا اس روش کو یکسر ترک کیا جائے اور ان افراد سے سخت باز پرس کر کے کڑا احتساب کا کی جائے جو مدارس اور پرامن اہل علم کے بارے میں ناقص اور کمزور معلومات کی بنیاد پر رپوٹیں بنا کر آگے پیش کرتے ہیں۔ الحمدللہ یہ کوششیں رنگ لائیں اور باقی مدارس اور شخصیات اس طرح کے حادثوں سے بفضل اللہ تعالیٰ محفوظ ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی شہادت قبول فرمائے اور آپ کے علمی، تدریسی، تصنیفی اور عملی جدوجہد کے سلسلہ کو پسماندگان ومتعلقین کے ذریعے جاری رکھے۔ آمین

از

سمیع الحق

باب اول

احوال امین

تذکرہ وسوانح

حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ کے تلمیذ رشید حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ کا قول آپ کے بارے میں فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے، آپ کے تلامذہ اور متعلقین کا اس پر اتفاق ہے کہ سچی بات وہی ہے جو مولاناؒ آپ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ

''استاذ صاحب وہ عظیم انسان ہیں اگر واقفین حال کی موجودگی میں ان کی تعریف وتوصیف کریں تو وہ کہیں گے کہ تم نے حضرت کی شان میں حق تلفی کی، کما حقہ تعریف کا حق ادا نہیں کیا، اگر نہ جاننے والوں کی مجلس میں تذکرہ کریں تو وہ سوچیں گے کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے، موجودہ زمانے میں ان صفات کے حامل انسان کا ملنا بڑی مشکل اور ذہن سے بالاتر بات ہے، ایسی صفات والی شخصیات تو قدیم زمانے میں گزری ہیں، شاید یہ کسی بزرگ کے قدیم تاریخی واقعات ہوں، حالانکہ قریب سے دیکھنے والا قسم اٹھا کر کہے گا کہ حضرت کی شخصیت ان خصائص وفضائل اور صفات وکمالات کی سرحدوں کو پار کر کے بہت آگے نکل گئی ہے۔''

حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ کا سوانحی خاکہ

پیدائش ۱۹۴۶ء میں سرہ تاکہ نامی گاؤں اورکزئی ایجنسی میں پیدا ہوئے، بعدازاں شاہو وام ضلع ہنگو میں اپنی زرعی زمینوں پر گھر اور مدرسہ یوسفیہ بنا کر رہائش اختیار کی۔

نام ونسب...... محمد امین بن تاج الدین، آپ تقریباً ساڑھے چھ یا سات سال کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، جب کہ تقریباً گیارہ سال کی عمر تھی تو والدہ انتقال کر گئیں۔

شادی واولاد...... آپ کی شادی اپنے خاندان میں ۱۹۶۸ء میں ہوئی، آپ کے دو بیٹے اور چار بیٹیاں حیات ہیں جب کہ ایک بیٹا بچپن میں وفات پا گیا تھا۔

تعلیم...... پانچویں تک عصری تعلیم کے بعد جامعہ عربیہ ٹل سے دینی تعلیم کا آغاز کیا، علمی استعداد کی بڑھوتری میں مولانا عبدالغفار کوہاٹی کا بنیادی کردار تھا جو جامعہ امینیہ دہلی کے فاضل، جامعہ تعلیم القرآن کوہاٹ کے صدر مدرس اور امام المعقولات والمنقولات تھے۔ دورۂ حدیث حضرت بنوریؒ کے پاس جامعہ بنوری ٹاؤن سے کیا، وفاق المدارس کے تحت سالانہ امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ حضرت بنوریؒ نے صلاحیتیں جانچ کر تخصص فی الحدیث اور پھر معارف السنن کی تصنیفی معاونت کے لیے روکا۔ بعدازاں جامعہ کی تدریس ونظامت سپرد کی، اور طحاوی پر تحقیقی کام حوالے کیا جس کی دو جلدیں ''نثر الازہار'' کے نام سے چھپیں، بقیہ پر کام جاری ہے۔ حضرت بنوریؒ نے آپ کا مقالہ ''مسانید الامام ابی حنیفہ'' جو تخصص میں لکھا تھا مصر سے طبع کرایا۔

تدریس ونصاب تعلیم...... آپ نے بجز صحاح ستہ کے درس نظامی کی تقریباً تمام کتابیں پڑھائیں، وفاق المدارس کے نصاب سے ہٹ کر اپنا علیحدہ نصاب تجویز کر کے پڑھاتے رہے، آپ کافیہ کی جگہ اوضح المسالک، ہدایۃ النحو کی جگہ شرح شذور الذہب، شرح الوقایہ کی جگہ ملا علی قاریؒ کی شرح النقایہ، جلالین کی جگہ مدارک، بیضاوی کی جگہ ابو سعود اور عقائد وکلام میں قصیدہ بدء الامالی اور امام ابوحنیفہ کے کلامی رسائل سے مرتبہ متن ''اشارات المرام'' (علامہ بیاضی) کو ترجیح دیتے تھے۔ اور اسی کو تادم شہادت اپنے مدرسہ جامعہ یوسفیہ میں پڑھاتے رہے۔

سماجی وسیاسی خدمات۔۔ شیعہ سنی فسادات کے انسداد کے لئے گراں قدر خدمات انجام دیں اور باہمی معاہدات اور قومی جرگوں کے ذریعے فسادات میں کمی لائی۔

افغان طالبان اور احمد شاہ مسعود میں صلح کے لئے طویل جدوجہد کی۔ ۹۴ء میں صوفی محمد کی تحریک اور حکومت کے ممکنہ تصادم کو روکنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔

نائن الیون کے بعد حکومت اور پاکستانی طالبان میں مصالحت کے لئے ثالث کا کردار ادا کیا۔ شمالی وزیرستان کا معاہدہ آپ ہی کی کوششوں سے ممکن ہوا اور آپ نے اپنے ہاتھ سے لکھا۔ لال مسجد تنازعہ میں بنیادی کردار ادا کرنے کی بھر پور کوشش کی۔ عوام الناس کے لیے رفاہی وفلاحی کاموں میں دلچسپی لی۔ ہنگو میں گیس، بجلی گریڈ سٹیشن، ہسپتال اور مرکزی شاہراہ کی تعمیر آپ کے مرہون منت ہیں۔

ممتاز اساتذہ۔۔۔۔ حضرت بنوری، مولانا ادریس میرٹھی، مفتی ولی حسن ٹونکی، مولانا عبدالغفار کوہاٹی، مولانا عبداللہ درخواستی اور مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہم اللہ تعالی

تصانیف۔۔۔۔ نثر الازہار علی شرح معانی الآثار (۲) مسانید الامام ابی حنیفہ (۳) ارشاد الحلیم الی آداب التعلیم (۴) ووٹ کی شرعی حیثیت (۵) مقالات امین (غیر مطبوع) (۶) التعلیقات علی شرح النقایہ (غیر مطبوع) (۷) مکاتیب امین (غیر مطبوع) (۸) مکاتیب ہدایت، مودودی فکر علما سے تحریری مکالمہ (غیر مطبوع) (۹) منتخبات امین (غیر مطبوع) (۱۰) آثار الصحابہ فی الکتب السبعہ (غیر مطبوع)

تصوف وسلوک مولانا عبدالعزیز رائے پوریؒ، خلیفہ غلام رسولؒ، مولانا سراج الیوم سواتی، مولانا فضل محمد سواتیؒ اور مولانا محمود صندلی، صندل بابا رحمہم اللہ سے خلافت حاصل تھی۔

شہادت۔۔۔۔ ۱۱ جون ۲۰۰۹ء، بمطابق ۱۷ جمادی الثانیہ ۱۴۳۰ھ بروز جمعرات کو ایک گہری سازش کے تحت آپ کو بے گناہ شہید کر دیا گیا کیونکہ آپ قبائل میں امن کی آخری بڑی علامت اور ملک دشمن عناصر کے مفادات کے لئے بڑی رکاوٹ تھے۔

شہید اسلام حضرت والد گرامی کے

احوال وآثار

مولانا محمد یوسف اورکزئی

والد گرامی حضرت مولانا محمد امین شہید رحمہ اللہ تعالیٰ کی ولادت سے شہادت تک پوری زندگی انوکھی اور نرالی ہے، حضرت کی شخصیت جامع اور عالمگیر تھی، اس پر کچھ لکھنا بہت مشکل کام ہے، بسا اوقات کچھ لکھنے کا ارادہ کرتا ہوں مگر عقل اور فہم ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، دل ودماغ ماؤف اور سوچوں پر تالے لگ جاتے ہیں، بالکل سمجھ نہیں آتا کہ کس طرح لکھوں؟ کہاں سے شروع کروں؟ کیا چھوڑوں اور کیا لکھوں؟ اور ان کی زندگی کے کس گوشے کو اجاگر کروں؟ اللہ تعالیٰ نے حضرت کو بہت سے اوصاف وکمالات اور علوم ظاہری اور باطنی سے نوازا تھا۔ ایمان کی اونچی کیفیات نصیب تھیں۔ اعمال حسنہ، اخلاق حمیدہ سے مزین تھے۔ بیک وقت مفسر، محدث، مورخ، مصنف، علوم عقلیہ ونقلیہ کے قابل قدر مدرس اور فقہ وتصوف کے عظیم امام تھے۔ ایسے منکسر المزاج اور متواضع عالم ربانی کہ دیکھنے والے رشک کریں، تعلق مع اللہ، انابت الی اللہ، توکل علی اللہ، خشیت خداوندی، عشق نبوی، حب صحابہؓ علم وتقویٰ، اخلاص وللہیت فکر آخرت، صبر واستقامت، غیرت ومروت، حکمت وبصیرت، جود وسخاوت، محبت وشفقت، اتباع سنت وذوق عبادت، مہمان نوازی، دنیا سے لاتعلقی، رفقا وتلامذہ کی خبر گیری، انسان دوستی، بے نفسی وخلوت نشینی، عہد ووفا کی پاسداری، شریعت وطریقت کی پابندی، قال اور حال میں یکسانیت جیسے عظیم اوصاف میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔ یہ عظیم صفات خاص خاص افراد کو نصیب ہوتی ہیں، حضرت نے ان صفات قدسیہ کو ایسا اپنایا، بلکہ حرز جان بنایا کہ قرن حاضر میں اپنے اکابر واسلاف کے زندگیوں کی عملی تفسیر اور نمونہ بن کر سامنے آئے۔

آپ کا شمار برصغیر کے بالغ النظر اور محقق علما میں ہوتا تھا، عرب وعجم کے محقق اکابر علما حضرت کی خداداد قابلیت اور علمیت کے معترف اور ثنا خواں تھے، حضرت کی شہادت سے اہل علم ایک عظیم علمی شخصیت اور اہل اسلام ایک مدبر

کی قیادت سے محروم ہو گئے۔آپؒ تمام علوم وفنون کے ان ماہرین میں سے تھے جن کی نظیر ناممکن تونہیں مشکل ضرور ہے،آپ قحط الرجال کے اس دور میں علوم عقلیہ ونقلیہ خصوصاً علوم حدیث میں ایک سند کا درجہ رکھتے تھے،آپ کے وسعت مطالعہ وشغف علم کا منہ بولتا ثبوت آپ کا نایاب اور بیش قیمت کتب پر مشتمل مکتبہ ہے جو چالیس سال کی محنتوں اور مجاہدوں سے وجود میں آیا ہے۔

حضرت کی شخصیت پر جس جہت سے بھی لکھا جائے تو آپ کی عبقریت کی کامل تصویر پیش کرنا ناممکن ہے۔آپ کے بارے میں آپ کے تلمیذ رشید حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ کا قول فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے،آپ کے تلامذہ اور متعلقین کا اس پر اتفاق ہے کہ سچی بات وہی ہے جو مولاناؒ آپ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ

''استاذ صاحب وہ عظیم انسان ہیں اگر واقفین حال کی موجودگی میں ان کی تعریف وتوصیف کریں تو وہ کہیں گے کہ تم نے حضرت کی شان میں حق تلفی کی،کما حقہ تعریف کا حق ادا نہیں کیا،اگر نہ جاننے والوں کی مجلس میں تذکرہ کریں تو وہ سوچیں گے کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے،موجودہ زمانے میں ان صفات کے حامل انسان کا ملنا بڑی مشکل اور ذہن سے بالاتر بات ہے،ایسی صفات والی شخصیات تو قدیم زمانے میں گزری ہیں،شاید یہ کسی بزرگ کے قدیم تاریخی واقعات ہوں،حالانکہ قریب سے دیکھنے والا قسم اٹھا کر کہے گا کہ حضرت کی شخصیت ان خصائص وفضائل اور صفات وکمالات کی سرحدوں کو پار کرکے بہت آگے نکل گئی ہے۔''

ذیل میں حضرت کی زندگی کا کسی قدر خاکہ پیش خدمت ہے،ان میں سے اکثر واقعات بندہ نے حضرت سے براہ راست سنے ہیں جو آپؒ ہمیں ہر سال رمضان میں اعتکاف کے موقع پر بیان فرمایا کرتے تھے۔

نام ونسب،مولد ومسکن اور آباواجداد

آپؒ کا پورا نام محمد امین بن تاج الدین بن امیر خان بن اللہ نور بن نور بن سلطان بابا' جو قلعہ بالا حصار میں مدفون ہے' ہے،آپ کا سلسلۂ نسب شیخ روحانی بابا' جو افغانستان گردیز میں مدفون ہیں' سے ہوتا ہوا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ تک پہنچتا ہے،آپ کا تعلق اورکزئی ایجنسی میں آباد قوم شیخان سے ہے،اورکزئی ایجنسی میں کل اٹھارہ اقوام آباد ہیں،ان میں''شیخان''ایک بڑا قبیلہ ہے۔ان کی صداقت اور دوستی میں پختگی ضرب المثل ہے۔شیخان کے سلسلۂ نسب میں بہت سے اللہ والے بزرگ گزرے ہیں۔ان اولیاء کی وجہ سے اس قبیلہ کو''شیخان''سے موسوم کیا گیا جو لفظ ''شیخ'' کی طرف منسوب ہے اور اللہ والوں کے لیے عام طور پر مستعمل ہے۔

تحریک آزادی اور انگریز کے خلاف جہاد میں ان کی قربانیوں پر تاریخ گواہ ہے۔۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے قبل ۱۸۵۵ء میں ان کے علماء نے انگریز کے خلاف جہاد کا فتویٰ دے کر عملی جہاد کیا تھا۔جس کی تفصیل ۱۸۹۷ء

میں کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر ایل وائٹ کنگ نے اپنی کتاب ''واکنٹری اورکزئی اینڈ کلینز'' میں لکھی ہے۔

قوم شیخان کے تین شاخیں ہیں، ان میں سے آپ کا تعلق شاخ سلطان خیل سے ہے جو سلطان بابا کی طرف منسوب ہے، یہ شاخ بھی بہادری اور شجاعت میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

آپ کی ولادت پاکستان کی آزادی سے تقریباً ایک سال قبل ۱۹۴۶ء کو اورکزئی ایجنسی وادئ تیراہ کے ایک گاؤں ''سروناکہ'' کے ایک دیندار گھرانے میں ہوئی۔ ولادت کی متعین تاریخ معلوم نہیں، تاہم سن پیدائش یقینی ہے۔

حضرتؒ کے دادا امیر خان کے چار بیٹے تھے، ان میں سے ایک کا نام تاج الدین رکھا گیا، پھر تاج الدین کے ہاں چار بیٹے پیدا ہوئے۔ سب سے بڑے بیٹے کا نام مسلم الدین، دوسرے کا نام عین الدین تیسرے کا نام محمد امین اور چوتھے کا نام حسین الدین رکھا گیا، حسین الدین کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔

آپؒ کے والد ماجد تاج الدین اپنے علاقہ میں ایک امانت دار و دیانت دار تاجر، نیک وصالح اور مہمان نواز شخصیت کے طور پر مشہور تھے۔ باقاعدہ عالم دین تو نہیں تھے لیکن علما صلحا اور اولیاء اللہ کے عقیدت مند اور صحبت یافتہ ضرور تھے۔ شیخ العرب والعجم مولانا حسین احمد مدنی صاحبؒ اور مولانا غور غشتویؒ کے ساتھ دلی محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔ مشہور عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم حاجی محمد امین صاحب (چارسدہ) کے ساتھ قلبی عقیدت تھی، انہی کی محبت میں والد گرامی کا نام 'محمد امین' رکھا۔ اہل اللہ کی صحبت اور تعلق کے ناطے دینی فہم اور معلومات قابل رشک تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ پورے علاقے میں ایک عالم دین کی حیثیت سے جانے جاتے تھے اور لوگوں کے نکاح اور نماز جنازہ وغیرہ پڑھانے کی ذمہ داری ان کے سپرد تھی۔

ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا، ان میں سے ایک حاجی احمد صاحب آفریدی بھی تھے جو درہ آدم خیل سے تعلق رکھتے تھے اور چند ماہ پہلے انتقال فرما گئے۔ بندہ ایک دفعہ معلومات کی غرض سے ان کے ہاں حاضر خدمت ہوا تو نہایت ہی پیار و محبت سے نوازا، جب بندہ نے داداجی کے متعلق گفتگو شروع کی تو بہت زیادہ روئے، پھر کہنے لگے کہ

> '' مجھے اپنے والدین اور بہت سارے رشتہ دار داغ مفارقت دے چکے ہیں اور سب کو بھول چکا ہوں مگر تاج الدین صاحب کو نہیں بھول پاتا، ان جیسا دوست پھر نہیں ملا۔ پھر داڑھی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ ان کی وجہ سے ہے۔ کہا کہ وہ ایک دیانت دار اور معتمد انسان تھے، تجارتی دوستی کی وجہ سے ہمارا مال کئی کئی مہینے ان کے گھر پڑا رہتا تھا، جب ہم تجارتی سفر کی وجہ سے ان کے ہاں حاضر ہوتے تو وہ صرف ہماری مہمان نوازی ہی نہیں بلکہ ہمارے گھوڑوں کی بھی ایسی دیکھ بھال کرتے جیسے وہ ان کے اپنے گھوڑے ہوں۔ ان کے ساتھ

سفر کے دوران اگر کوئی خدمت درپیش ہوتی تو خود ہی سرانجام دیتے۔ عبادت، ذکر وفکر خصوصاً نوافل کا بہت اہتمام کیا کرتے تھے۔''

۵۲ء میں آزاد قبائل نے اپنی سرحدات کی حفاظت کے لیے ایک لشکر تیار کر کے یہ اعلان کیا کہ ہم انگریز کے کالے قانون ۱۶/۱/ایف سی آر کو تسلیم نہیں کرتے، ہم اپنی آزادی برقرار رکھیں گے اور اس پر کسی قسم کی سودا بازی نہیں کریں گے۔ چنانچہ جناب تاج الدین بھی اس کاروان کے رفیق کار بن کر چل پڑے جب یہ لشکر احتجاجی جلوس کی شکل میں اپنی سرحدات سے ہوتا ہوا اُبلن (کوہاٹ کے قریب ایک مقام پر) پہنچا تو فضائی طیاروں نے بمباری کی جس میں جناب تاج الدین سمیت کئی افراد شہید ہوئے۔ دادا حضور کی شہادت کے وقت ہمارے والد گرامی مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ کی عمر تقریباً چھ برس تھی۔

دادا کی شہادت کے بعد آپ بڑا عرصہ 'سرہ تا کہ' اور 'شکر تنگی' (اورکزئی ایجنسی) میں اپنے چچاؤں کے ساتھ رہے، پھر ۱۹۵۴ء میں سکول کی تعلیم کی غرض سے ہنگو آئے، یہی سے آپ کے سفر کا آغاز ہوا۔ ۱۹۶۲ء میں آپ کے چچا اور بڑے بھائی بھی مستقل ہنگو آ گئے، اور شاہو وام میں اپنی آبائی زمینوں پر آباد ہوئے۔

بچپن اور عصری تعلیم

آپ بچپن ہی سے انتہائی عجیب وغریب عادات واطوار کے مالک تھے۔ حسین وجمیل ہونے کے ساتھ ساتھ معصومیت آپ کے چہرے سے عیاں رہتی۔ شرافت اور عمدہ اخلاق کی بنا پر ہر ایک کے منظورِ نظر تھے۔ غیرت و حمیت، اہتمام نماز اور گناہوں سے نفرت جیسی صفات سے بچپن ہی میں مزین تھے۔ کسی کو کیا معلوم تھا کہ کل مستقبل میں یہی یتیم بچہ علم وعمل کا پیکر اور منبع عرفان ودانش بنے گا اور اس کا فیض چاردانگ عالم پھیلے گا۔

علاقے میں علمی پسماندگی کی وجہ سے والدین نے آپ کی دینی وعصری تعلیم وتربیت کے لیے ایک معلم کا انتظام کیا جو چشمہ مسجد ہنگو کے امام مولوی محمد بلال صاحب کے شاگرد تھے اور خانی ملا کے نام سے مشہور تھے، دادا حضور نے ان کو اپنے بچوں کی تعلیم کے ساتھ امامت کی ذمہ داری بھی سونپی تھی۔ خانی ملا سے ابتدائی دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم بھی حاصل کرنا شروع کی۔ اس کے ساتھ ساتھ اورکزئی ایجنسی کے ایک گورنمنٹ پرائمری سکول میں بھی داخلہ لیا، ہمارے تایا حاجی مسلم الدین اس سکول کا حال سناتے ہیں کہ اس کی کوئی عمارت وغیرہ نہ تھی، بلکہ کھلے میدان میں ایک جگہ مقرر تھی، جہاں سردیوں میں کھلے میدان اور گرمیوں میں درختوں کے سایے میں بیٹھ کر تعلیم دی جاتی۔ آپ نے چوتھی جماعت پاس کی، تو آپ کو ہنگو کے مضافاتی قصبہ ابراہیم زئی کے ایک سکول میں داخلہ کرایا گیا، پانچویں جماعت یہیں پاس کی، قابلیت کا یہ عالم تھا کہ ہر کلاس میں پہلی پوزیشن لیتے رہے۔

تحصیل علم دین کے محرکات

پرائمری کے بعد آپ کو دینی تعلیم حاصل کرنے کا شوق ہوا۔آپ نے تہیہ کیا کہ سکول کی تعلیم چھوڑ کر کسی دینی مدرسے میں داخلہ لینا ہے۔سکول کی تعلیم چھوڑنے میں کئی رکاوٹیں تھیں۔آپ کی خداداد قابلیت اور ذہانت کے پیش نظر سکول کے اساتذہ اور گھر کے تمام افراد آپ کی بہترین عصری تعلیم کے خواہش مند تھے۔انہوں نے آپ کے ارادے کی سخت مخالفت کی۔آپ کے چچا اور ماموں خفیہ طریقے سے سکول انتظامیہ کے ذریعہ عصری تعلیم کے حصول پر زور دیتے رہے۔بقول حضرت اقدسؒ کے کہ اس وقت تک مجھے پیار اور محبت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، میرے اس ارادے کے بعد پیار کے بجائے مار پڑنے لگی۔کوئی میرے جذبات کی قدر کرنے والا اور تسلی دینے والا نہیں تھا، بلکہ ہرایک کا رویہ سختی کا ہو گیا۔اس رویے کی وجہ سے رفتہ رفتہ دنیاوی تعلیم سے مزید دل اچاٹ اور دینی تعلیم کے حصول کے جذبہ میں اضافہ ہوتا گیا۔

دینی تعلیم کے حصول کے اس حد درجہ شوق کے پیچھے کچھ مبشرات تھے جو حضرت بتلایا کرتے تھے۔ان داعیوں میں ایک خواب بھی تھا، حضرت فرماتے تھے کہ ایک دفعہ ایک رسالہ میں ایک وظیفہ برائے زیارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیکھا، ہدایات کے مطابق میں نے مذکورہ درود شریف شب جمعہ کو ایک ہزار مرتبہ پڑھا تو اسی رات خواب میں ایک خوبصورت اور نورانی شخص کو دیکھا کہ اس نے میرے انگوٹھے پر چراغ کی طرح ایک شمع رکھ دی جس سے تاحد نگاہ روشنی پھیل گئی۔بیدار ہونے کے بعد میں نے یہ خواب اپنی والدہ سے بیان کیا تو والدہ نے خانی ملا صاحب سے بیان کرنے کو کہا، میں اپنے استاذ خانی ملا کے پاس حاضر ہوا اور انہیں اپنا خواب سنایا۔میرا خواب سننے کے بعد ان کے چہرے پر ایک عجیب قسم کا اثر نمودار ہوا اور فرمانے لگے کہ رات کے وقت کچھ پڑھا تو نہیں تھا؟ میں نے کہا کہ فلاں درود شریف پڑھا تھا۔تو فرمانے لگے کہ یہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، ان شاء اللہ آپ کی وجہ سے علاقے میں روشنی پھیلے گی۔بچپن کے باعث میں اس تعبیر کو پوری طرح نہ سمجھ سکا اور حیران ہوا کہ مجھ سے کس طرح کی روشنی پھیلے گی؟ پھر دنیا نے دیکھا کہ علم وعمل کے اس چراغ سے نور کے کہکشاں اٹھے اور ایک عالم کو منور کر گئے۔

دوسرا داعیہ حضرت یہ بتلایا کرتے تھے کہ جب میں نے مدرسہ جانے کا پختہ عزم کر لیا اور گھر والوں کو اجازت دینے پر مجبور کر دیا تو شدید ناراضگی کی حالت میں اجازت ملی اور سکول کی خریدی ہوئی کتابیں دکاندار کو واپس کر دی گئیں، کتابیں واپس کر کے میں چچا کے ہمراہ گھر واپس آ رہا تھا کہ راستہ میں پوخ (پکی) مسجد ہنگو شہر کے قریب

سفید لباس میں ملبوس ایک آدمی سامنے سے آیا، سلام کرنے کے بعد اس نے مجھ سے کہا کہ ''بیٹا! پریشان نہ ہونا جس چیز کا آپ نے ارادہ کیا ہے، اس پر ثابت قدم رہنا، دینی کاموں میں اللہ پر توکل ہونا چاہیے۔'' پھر اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور چلا گیا۔ میں نے چچا سے دریافت کیا کہ یہ کون تھے؟ کہنے لگے کہ میں نے اس سے پہلے اس کو کبھی نہیں دیکھا۔ ہم نے واپس مڑ کر دیکھا تو وہ شخص غائب تھا اور دور دور تک کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ حضرت فرماتے تھے کہ میرے خیال میں وہ جناب سیدنا خضر علیہ السلام تھے کیونکہ ایسا نورانی شخص میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا، ان کی گفتگو سے مجھے کافی تسلی ہوئی۔ بعد میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ میرے بارے میں والد صاحب نے بھی وصیت کی تھی کہ انہیں دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجنا، اس وجہ سے عزم میں استقلال اور جذبہ میں مزید اضافہ ہوا۔

دینی تعلیم اور اس راہ کے شدائد

حضرت فرماتے تھے کہ اس کے چند ہی دن بعد چچا نے مجھے دار العلوم عربیہ ٹل ضلع ہنگو میں داخل کرایا۔ حضرت کی نجی ڈائری کے مطابق یہ ۱۹۵۷ء کی بات ہے۔ اس وقت ہمارے خطے کے مدارس میں نصاب تعلیم کی درجہ بندی نہ تھی، طلبا اپنی مرضی کے مطابق ایک فن کی کتابیں منتخب کر کے پڑھتے تھے اور یومیہ خواندگی طالب علم کی اپنی استعداد اور شوق پر موقوف تھی، میں نے اپنے لئے پہلے سال صرف ونحو کی ابتدائی فارسی کتابیں مثلاً نحو میر، صرف میر اور علم الصیغہ وغیرہ کا انتخاب کیا۔ الحمد للہ سال کے اختتام پر صرف میں نے تمام کتابیں ختم کی تھیں، ہمارے اکثر ساتھیوں کی کتابیں رہ گئیں تھیں۔

حضرت چونکہ یتیم تھے اور طبیعت میں حد درجہ خودداری تھی اس لیے طالب علمی کا یہ ابتدائی زمانہ انتہائی عسرت اور تنگی کی حالت میں گزرا۔ فرماتے تھے کہ طالب علمی کے پہلے سال سالانہ امتحان کے بعد جب ہم نے گھر جانے کا ارادہ کیا تو ہم علاقے کے سات/۷ ساتھی ایسے تھے جن کے پاس جیب کا خرچ تو کیا کرایہ کے پیسے بھی نہ تھے۔ لہٰذا ہم نے ارادہ کیا کہ گھر پیدل چلتے ہیں۔ دوپہر کے قریب روانہ ہوئے۔ شام کو اورکزئی ایجنسی کے علاقہ غلجو سے آگے ''غنڈکی'' نامی گاؤں پہنچ گئے۔ موسم سخت خراب تھا، اس لیے رات کو آگے سفر خطرے سے خالی نہ تھا کیونکہ طویل پہاڑی سلسلے تھے، جن میں زہریلے حشرات اور بعض اوقات خطرناک درندوں کا سامنا ہو جاتا تھا، اس لیے رات وہیں ایک مسجد میں گزاری، پوری رات سخت بارش ہوتی رہی۔ سردیوں کی یخ بستہ شدید ہواؤں اور طوفانی بارش نے شدید ٹھنڈک پیدا کر دی تھی۔ فجر کی نماز پڑھتے ہی ہم دوبارہ اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے، شدید برفباری ہو

رہی تھی، جس کی وجہ سے پیدل چلنا بہت دشوار ہوگیا تھا، حتی الوسع ہم نے برف پر چلنے کی کوشش کی، راستہ سارا اترائی کا تھا، لیکن بالآخر پاؤں ساتھ چھوڑ گئے۔ اس برف پر پڑے رہنا تو ممکن نہ تھا اس لیے آگے بڑھنے کی ترکیب یہ سوچی کہ جن پلاسٹکی تھیلوں میں سامان باندھا ہوا تھا انہیں کھول کر ان تھیلوں پر بیٹھ گئے اور اپنے آپ کو اس اترائی پر پھسلانا شروع کر دیا، میلوں پہاڑی فاصلہ یونہی پھسلتے پھسلتے طے کرنے کے بعد بالآخر گاؤں کے آثار نظر آئے تو ہماری جان میں جان آئی۔

اس موقع پر حضرت اقدسؒ نے فرمایا کہ وہ حدیث شریف بار بار میرے ذہن میں گردش کر رہی تھی کہ ''جب طالبعلم علم کی طلب میں جاتا ہے تو فرشتے اپنے پر اس کے قدموں کے نیچے بچھاتے ہیں۔'' لہٰذا جب بھی میں گھر سے مدرسہ کو جاتا تو سفر اتنا آسان ہوتا کہ بالکل تھکاوٹ محسوس نہ کرتا، لیکن مدرسہ سے گھر آتے ہوئے مسافت بھی لمبی محسوس ہوتی اور بدن پر تھکاوٹ کے اثرات بھی آتے۔

الغرض سفر کی سختی اور راستوں کی دشواری کا سامنا کرتے کرتے جب میں اپنے گاؤں میں داخل ہوا تو دور سے گھر کے قریب لوگوں کا ہجوم دیکھا، ذہن میں مختلف خیالات آنے لگے، وسوسوں نے گھیر لیا کہ یہ کیا ماجرا ہے جو اتنے لوگ گھر کے پاس اکٹھے ہیں۔ میں کسی سے کچھ پوچھے کہے بغیر جلدی سے گھر میں داخل ہوا۔ میری ایک پھوپھی تیزی سے روتے ہوئے میری طرف بڑھی اور مجھے اپنے سینے سے لگایا، پھر چلا کر کہنے لگی کہ بیٹا گھبرانا نہیں اور پریشان نہ ہونا آپ کی والدہ فوت ہو چکی ہے اور لوگ اس کو قبرستان کی طرف لے جا چکے ہیں، آپ بھی جلدی جائیں کم از کم دیدار تو کر سکیں گے۔

حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ محبوب از جان والدہ کی موت کی خبر میرے لئے بندوق کی گولی سے کم نہ تھی، اس لمحے میری جو حالت ہوئی اس کی حقیقی کیفیت بیان کر سکتا ہوں نہ قلم بند۔ ذہن معطل اور جسم مفلوج ہو گیا تھا۔ بھوک، تھکاوٹ اور سردی سب کچھ بھول گیا تھا۔ بس پھٹی پھٹی نگاہوں سے گھر کے دیواروں کو دیکھ رہا تھا، خاموش آنسو اور دل میں امڈتے ہوئے غم کے طوفان کے سوا کچھ نہ تھا۔ خاندان کے لوگوں کو بھی میری معصومیت پر ترس آ رہی تھی لیکن کسی کو وہ الفاظ نہیں سوجھ رہے تھے جن سے مجھے تسلی دیں۔ خاندان والوں کے لئے یہ حادثہ عظیم تو ویسے بھی تھا مگر میرے آنے سے تو پوری طرح ماتم بن گیا۔

حضرتؒ فرماتے تھے کہ اس وقت اللہ رب العزت نے دل میں یہ بات ڈالی کہ مسجد میں بیٹھ کر تلاوت شروع کروں، میں سیدھا مسجد پہنچا اور تلاوت شروع کی۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے تلاوت سے بہت ہی اطمینان نصیب ہوا، میں تلاوت میں ایسا مشغول ہوا کہ لوگ آ آ کر اور اصرار کر کر کے مجھے قبرستان لے جانے کی کوشش کرتے رہے کہ

والدہ کی آخری زیارت کرلو لیکن میں اپنی جگہ سے نہ اٹھا اور مسلسل قرآن پڑھتا رہا اور انہیں یہ جواب دے کرٹال دیا کہ جن آنکھوں سے زندہ حالت میں دیکھی تھی بس وہی کافی ہے۔ حضرتؒ کی عمر اس وقت ساڑھے گیارہ سال تھی، آپ جب بھی یہ واقعہ بیان کرتے تو آبدیدہ ہوجاتے۔

حضرتؒ کی ابتدائی زندگی نہایت ہی کٹھن اور غمناک تھی، امتحانات اور آزمائشوں سے بھرپور تھی۔ ہمارے دادا نے ہمارے والد صاحبؒ سمیت اپنے تمام بچوں کے لئے مختلف مقامات پر زمینیں خریدیں تھیں، مگر نقدی اکثر فقراو مساکین کو دیتے تھے، اس لئے ان کی شہادت کے بعد ان کے بچے بہت سخت حالات سے دوچار ہوئے، پھر حضرت والد صاحبؒ کو دوران تعلیم جیب خرچ دینے کے لئے چچا وغیرہ ذہنا تیار نہیں تھے۔ کیونکہ والد صاحب ان کے منشا کے بغیر پڑھ رہے تھے اور ان کی نظر میں دینی تعلیم کوئی زیادہ اہم چیز نہ تھی۔ حضرت فرماتے کہ میں جب مدرسہ جاتا تو گھر سے بہت ہی کم رقم ملتی لیکن والدہ بے چاری میری ضروریات کا بہت ہی خیال رکھتی تھیں۔ جب انہیں میرے چچاؤں، میرے بڑے بھائیوں یا ماموؤں کے گھرانے کی طرف سے کچھ رقم وغیرہ ملتی تو وہ اس کو میرے لئے محفوظ کرلیتی اور جب میں گھر آتا تو مجھے دیتیں۔ لیکن جب وہ دنیا سے رحلت فرما گئیں تو اب تو کوئی غم گسار نہ رہا اس لئے میری مالی مشکلات میں مزید اضافہ ہوگیا۔

حضرتؒ نے تین سال دارالعلوم ٹل میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہنگو شہر پٹ بازار کی جامع مسجد میں قائم ایک مدرسہ میں داخلہ لیا۔ یہ مدرسہ فاضل دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا حافظ فخر الاسلامؒ نے قائم کیا تھا، مولانا محمد کریم کاکاخیل صاحبؒ فاضل دارالعلوم دیوبند اس کے صدر مدرس تھے، انتہائی پختہ اور گہرا علم رکھنے والے بزرگ تھے، طلبہ پر شفقت میں کمال حاصل تھا، تعلیم کے ساتھ تربیت پر بھرپور توجہ دیتے تھے۔ بعد میں یہ مدرسہ مفتاح العلوم کے نام سے مشہور ہوا اور اس کی جگہ بھی یہاں سے تبدیل کردی گئی۔

یہاں دو سال گزارنے کے بعد حضرتؒ نے ۱۹۶۲ء میں کوہاٹ کے قدیم مدرسہ انجمن تعلیم القرآن میں داخلہ لیا۔ یہ مدرسہ کوہاٹ کے پراچہ خاندان نے ۱۹۳۳ء میں قائم کیا تھا اور اس وقت ہمارے خطے کے اہم مدارس میں شمار ہوتا تھا۔ مولانا عبدالغنی رحمہ اللہ فاضل دارالعلوم دیوبند جو حضرت شیخ الہندؒ اور علامہ کشمیریؒ کے شاگرد تھے، نے یہاں دورۂ حدیث شریف شروع کیا تھا، لیکن اس مدرسہ کا اصل علمی غلغلہ استاذ الکل حضرت مولانا عبدالغفار صاحبؒ کے مرہون منت تھا، مولانا عبدالغفار رحمہ اللہ کوہاٹ کے قصبہ کمبٹ کے رہائشی تھے۔ پایہ کے معقولی، تفسیر کے امام، نکتہ رس فقیہ، اجل محدث اور سب سے بڑھ کر اجتہادی شان کے مدرس تھے۔ آپ مدرسہ میں صدر مدرس کے عہدہ پر فائز تھے اور علمی حلقوں میں 'صدر صاحب' کے نام سے جانے جاتے تھے۔ آپ نے حضرت شیخ الہندؒ اور علامہ

انور شاہؒ سے کسب فیض کرنے کے ساتھ ساتھ فقیہ ہند مفتی کفایت اللہ دہلویؒ سے بھی پڑھا تھا اور جامعہ امینیہ دہلی کے نامور فضلا میں سے تھے۔ ساری عمر علمی مشغلہ کے لیے وقف کی اور اسی شوق میں شادی بھی نہ کی۔ حضرت والد صاحبؒ کو ہمیشہ اپنے استاذ کے تذکرہ میں رطب اللسان پایا، والد صاحب کی ٹھوس علمی استعداد میں دراصل حضرت مولانا عبدالغفارؒ ہی کی تربیت کا دخل تھا۔ آپؒ ان کے علمی وعملی کمالات کے حیرت انگیز حالات سنایا کرتے تھے۔ بندہ نے والد صاحبؒ کو حضرت مولانا یوسف بنوریؒ اور مولانا عبدالغفارؒ سے بڑھ کر کسی اور سے اس درجے متاثر نہیں پایا۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ ہدایہ اول پڑھنے کے بعد میں دورہ تفسیر کے لئے خانپور چلا گیا۔ چونکہ والد صاحب اپنے خداداد حافظے، علمی کمال اور غایت ادب کے باعث جلد ہی اساتذہ کے منظور نظر بن جاتے اس لیے حضرت مولانا عبداللہ درخواستی صاحبؒ کے ساتھ خصوصی تعلق بن گیا۔ دورے کے بعد حضرت درخواستی نے اصرار فرمایا کہ باقی کتابیں ہمارے ہاں پڑھیں۔ حضرت فرماتے تھے کہ میں نے اجازت لینے کی بھرپور کوشش کی اور ساتھ عرض کیا کہ حضرت! میرا تعلق ایک ایسے علاقے سے ہے جہاں موسم ٹھنڈا ہوتا ہے اور یہاں کی گرمی میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔ تو اس پر حضرت درخواستی نے قرآن مجید کی یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی:

وَقَالُوا لَا تَنْفِرُوا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوا يَفْقَهُوْنَ۔

پھر میں نے حقیقت حال عرض کی کہ حضرت! میں اکثر فنون مولانا عبدالغفار صاحبؒ سے پڑھ چکا ہوں، اور کوئی کام ان کے مشورے کے بغیر نہیں کرتا، اگر حضرت نے اجازت دے دی تو ضرور آؤں گا۔ چنانچہ حضرت درخواستی نے قبول فرمایا، پھر اپنے پاس کچھ دن قیام کے لئے روک لیا، عید الفطر حضرت کے ساتھ گزاری، عید کے بعد واپس آیا اور مولانا عبدالغفار صاحبؒ کو پوری روئیداد سنائی۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ میں آپ کی خواہش پر جلالین شریف لے چکا ہوں، اب آپ کی مرضی۔ یہ دوسرا امتحان کھڑا ہوگیا، اس پر میں نے مولانا درخواستی صاحب کو خط لکھا اور آنے سے معذرت کی۔ حضرت نے اس شرط پر معذرت قبول فرمائی کہ آئندہ سال پھر دورۂ تفسیر کے لئے آنا ہوگا۔ میں نے دورۂ تفسیر میں حاضری کا وعدہ کیا اور اس پر مجھے کافی خوشی بھی ہوئی کہ دونوں اساتذہ راضی رہے۔

حضرت فرماتے تھے کہ سال کے اختتام پر میں دورۂ تفسیر کے لئے دوبارہ حاضر ہوا تو حضرت درخواستی نے اپنے سامنے پہلی صف میں بٹھایا، اس سال حضرتؒ کی خدمت کا خوب موقع ملا اور علمی استفادہ بھی خوب کیا۔ حضرت درخواستیؒ بے پناہ محبت وشفقت سے نوازتے رہے۔ آخر میں اپنی ساری سندات کی اجازت بھی مرحمت فرمائی۔

دوران درس حضرت والد صاحب نے حضرت درخواستیؒ کے تمام افادات بھی قلم بند فرمائے، یہ بیاض بندہ کے

پاس محفوظ ہے جس میں حضرت درخواستیؒ کے افادات کے ساتھ ساتھ والد صاحب کے ذاتی مطالعہ کا نچوڑ بھی شامل ہے، ان شاء اللہ اس کی ضروری خدمت کے بعد اس کی طباعت کی کوشش کی جائے گی۔

حضرت فرماتے تھے کہ گزشتہ سال کی طرح اس سال بھی حضرت درخواستیؒ نے عید الفطر پر اپنے پاس روکا اور دوبارہ خواہش ظاہر کی کہ موقوف علیہ ہمارے پاس پڑھ لے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! صدر صاحب میرے بہت مشفق اور مہربان استاذ ہیں، کئی سالوں سے ان کے زیر سایہ پڑھ رہا ہوں اور ہر کام میں ان سے مشاورت ضروری سمجھتا ہوں، اگر صدر صاحب اجازت دیں تو میں ضرور حاضر خدمت ہوں گا۔ اس پر حضرت درخواستیؒ اپنے استاذ سے میرے اس پختہ تعلق پر بہت خوش ہوئے۔ اپنا رومال اور کچھ دیگر تحائف دیئے اور فرمایا کہ مولانا عبد الغفار صاحب کا بڑا احترام کیا کرو، وہ ایک قابل مدرس ہونے کے ساتھ عارف باللہ بھی ہیں۔ فرماتے: اس وقت جتنی خوشی ہوئی، مسرت کے وہ لمحات میرے لئے ناقابل فراموش ہیں۔

اس دوران ایک سال آپ نے فنون کی بعض ٹھوس کتابیں مولانا عبد الحلیم زروبوی رحمہ اللہ سے بھی پڑھیں، جو بعد میں جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک کے اجل مشائخ میں شمار ہونے اور عرصہ تک وہاں صدر مدرس کے عہدہ پر فائز رہے، ان کی مبسوط سوانح ان کے صاحبزادے مولانا ابراہیم فانی نے لکھی ہے۔ اس دور میں وہ کوہاٹ کے آس پاس کہیں پڑھایا کرتے تھے، حضرت والد صاحب نے بھی ان سے وہیں استفادہ کیا۔

موقوف علیہ تک حضرت مولانا عبد الغفار صاحبؒ کی تربیت میں رہنے کے بعد آپ اپنے استاذ کے حکم پر دورۂ حدیث کے لئے جامعہ اشرفیہ لاہور چلے گئے۔ یہ ۶۷ء کی بات ہے۔ اس وقت حضرت مولانا رسول خانؒ، حضرت مولانا ادریس کاندھلویؒ اور دیگر اکابر کی وجہ سے جامعہ اشرفیہ کی بڑی شہرت تھی۔ حضرت فرماتے تھے کہ وہاں ۲۸ روز ان اکابر سے شرف تلمذ پایا لیکن مقدر کی بات تھی کہ دورۂ حدیث کے طلبا میں سب سے کمسن طالب علم میں تھا، اس وقت وہاں کی ترتیب یہ تھی کہ طلبا کھانا پکانے کا انتظام خود کرتے تھے، درسگاہ اور کمرے کی خدمت چھوٹا ہونے کی وجہ سے اکثر میرے ذمے ہوتی جس کی وجہ سے پڑھائی متأثر ہونے کا قوی خدشہ ہونے لگا، اس پریشانی اور خدشے کو مدنظر رکھ کر میں نے محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کو ایک تفصیلی خط لکھا، جس میں پوری تفصیل بیان کی اور جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن میں داخلہ کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس وقت دورۂ حدیث کے لئے تین جگہوں کی بے حد شہرت تھی، سرحد میں جامعہ حقانیہ، پنجاب میں جامعہ اشرفیہ اور کراچی میں بنوری ٹاؤن، لہٰذا اکثر طلبا انہی کی طرف رجوع کرتے۔

چند دن کے بعد علامہ بنوریؒ کا جوابی خط ملا کہ آپ کا داخلہ امتحان کے ساتھ مشروط ہوگا۔ میں نے اساتذہ سے

عذر بیان کر کے اجازت لی اور کراچی کا رخت سفر باندھنے کا عزم کرلیا، میرے ساتھ میرے بچپن کے ہم سبق ساتھی حافظ عبدالحمید کوہاٹی بھی تھے، جب ہم دونوں بنوری ٹاؤن پہنچے اور داخلہ کے لیے رجوع کیا تو پتہ چلا کہ ہمارا داخلہ امتحان حضرت مولانا فضل محمد سواتی فاضل دارالعلوم دیوبند کے ذمہ لگایا گیا ہے۔ حضرت مولانا مشکل امتحان لینے میں مشہور تھے۔ الحمدللہ ہم دونوں ساتھی امتحان میں صرف کامیاب ہی نہیں ہوئے بلکہ یہ امتحان ہمارے لئے ان اکابر کے ساتھ ذریعہ قرب اور باعث فخر بن گیا کیونکہ اس سخت امتحان میں ہم سو فیصد کامیابی کے ساتھ ساتھ اساتذہ کی خاص توجہ کا مرکز بھی بن گئے تھے۔

وفاق المدارس کے سالانہ امتحان میں اساتذۂ کرام کی توجہات کی بدولت حضرت والد صاحبؒ نے پاکستان بھر میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی، غالباً اساتذہ سے تعلق اور قرب کا یہ بھی ذریعہ بنی۔

حضرت بنوریؒ کی توجہات وعنایات اور ان سے تعلق عشق

حضرتؒ فرماتے تھے کہ دورۂ حدیث کے بعد سالانہ چھٹیوں میں جب میں گھر آیا تو کوہاٹ میں ایک جگہ تدریس شروع کردی، عیدالاضحیٰ کے بعد حضرت بنوریؒ کا مکتوب مبارک ملا کہ فی الفور کراچی آجائیں، میں تعمیل حکم میں کراچی روانہ ہوا، حضرت علامہ بنوریؒ سے ملاقات ہوئی، تو آپ نے آئندہ سال کے بارے میں پوچھا کہ کیا ارادہ ہے؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت! جیسے آپ حکم فرمائیں گے۔ حضرت نے تخصص فی الحدیث میں شرکت کا حکم دیا۔ اس وقت حضرت مولانا ادریس میرٹھی تخصص فی الحدیث کے نگران تھے۔ تخصص کے امتحان میں ممتاز نمبروں سے کامیابی ملی۔ اساتذہ کی طرف سے تحقیق کے لئے ''مسانید الامام ابی حنیفہؒ'' پر کام ملا جو بحمداللہ حضرات اساتذۂ کرام کو بہت پسند آیا اور مصر سے حضرت بنوریؒ کی خواہش پر طبع بھی ہوا۔

حضرت بنوریؒ نے حضرت والد صاحبؒ کو چند نمایاں امتیازات سے نوازا تھا، جب کہ والد صاحب کی طرف سے عشق ومحبت اور شدت تعلق کے چند مثالی پہلو بندہ نے بھی ایسے دیکھے، جو استاذ وشاگرد کی باہمی محبت کا ایک عجیب نقشہ پیش کرتے ہیں اور شاید تاریخ میں اس کی مثالیں خال خال ہی ملیں، ذیل میں ان کا کچھ تذکرہ پیش خدمت ہے:

(۱)......درمیان سال میں داخلہ دیا جس کی تفصیل ماقبل میں گزر چکی ہے۔

(۲)......حضرت فرماتے تھے کہ ہمارے فراغت کے سال دستار بندی نہیں ہوئی تھی، میں نے درسگاہ میں مزاحاً عرض کیا کہ حضرت! ہمارے علاقے میں لوگ دستار بندی کے بارے میں پوچھتے ہیں، فراغت کے بارے میں نہیں پوچھتے، تو حضرتؒ نے فرمایا کہ آپ کے پاس دستار بندی کے لئے کوئی چیز ہے؟ میں نے اپنا رومال پیش کیا تو حضرتؒ

نے وہی میرے سر پر باندھ کر دستار بندی فرمادی۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ کے ایک دوسرے ہم سبق ساتھی بھی کھڑے ہوئے، اپنا رومال ہاتھ میں پکڑا کہ دستار بندی ہو تو حضرت بنوریؒ نے فرمایا کہ ان کی تو مجبوری تھی آپ کی کیا مجبوری ہے؟ بیٹھ جاؤ۔ غرض صرف میری ہی دستار بندی فرمائی۔

(۳) ..... ایک دن حضرت بنوریؒ نے مجھے اپنے گھر پر بلایا، حضرت مولانا فضل محمد سواتیؒ بھی تشریف فرما تھے۔ ان کی موجودگی میں حضرتؒ فرمانے لگے کہ میں اپنی بیٹی کا آپ سے رشتہ کروانا چاہتا ہوں۔ آپ کا کیا ارادہ ہے؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت! میرا تو علاقہ میں انتظام ہو چکا ہے اور نسبت طے ہوگئی ہے۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ دو شادیوں میں کوئی قباحت تو نہیں۔ وہ وہاں رہے گی اور یہ یہاں رہے گی۔ اب میرے پاس خاموشی کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا۔ دوبارہ عرض کیا کہ حضرت! میں اپنے بھائیوں سے مشاورت کے بعد جواب دوں گا۔

والد صاحب فرماتے تھے کہ اس کے بعد میرا جو حال ہوا وہ ناگفتہ بہ تھا۔ سخت پریشانی تھی کہ آخر کیا کروں؟ اسی پریشانی کے عالم میں میں نے حضرت بنوریؒ کے نام معذرت کا ایک تفصیلی خط لکھا اور اپنے عزیز اور مشفق استاذ حضرت مولانا فضل محمد سواتیؒ کے پاس حاضر خدمت ہوا۔ حضرتؒ نے میری حالت دیکھی تو پوچھنے لگے کہ بھائی کیا ہو گیا ہے؟ میں نے وہ خط ان کو دکھایا، حضرت سواتیؒ نے خط پڑھتے پڑھتے تقریباً درمیان ہی میں میرا ہاتھ پکڑ کر اس کو بوسہ دیا اور فرمایا کہ آپ بے فکر رہیں، میں حضرت کے پاس آپ کا خط بھی پہنچا دوں گا اور اس بارے میں ان سے بات بھی کرلوں گا۔ پھر حضرت سواتیؒ نے خط پہنچا دیا اور غالباً کچھ بات بھی کی ہوگی۔ اگلے دن نماز فجر سے پہلے حضرت بنوریؒ نے مجھے دیکھا تو اپنے حجرے پر ناشتہ کے لیے آنے کو فرمایا۔ میں ناشتہ پر حاضر ہوا، تو حضرت نے مجھے پیار سے اپنے ساتھ لپیٹ لیا اور کافی دیر تک اپنے سینے سے لگائے رکھا، اس دوران میں اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکا اور زار و قطار ہچکیاں لے کر روتا رہا، حضرت نے میری پیشانی کا بوسہ لیا اور فرمایا کہ آج کے دن تم میرے دل کے مالک ہو چکے ہو۔ بعد میں میں نے مشورۃً عرض کیا کہ حضرت اگر یہ عقد مولانا حبیب اللہ مختار صاحبؒ سے ہو جائے تو بہتر ہوگا اور پھر یہی ہوا۔

ایک موقع پر بندہ نے حضرت والد صاحبؒ سے اس مکتوب کے بارے میں پوچھا کہ اس میں آخر کیا لکھا تھا کہ دونوں اساتذہ اس قدر متاثر ہوئے؟ اور آپ کا عذر بھی قبول کرلیا گیا، حضرتؒ نے فرمایا کہ میں نے اس کو جس حالت میں اور جس انداز سے لکھا تھا وہ عاشقانہ تو نہیں تھا مگر اپنے قبائلی مزاج کی جنونی حالت ضرور تھی۔ حضرتؒ نے اس کے کچھ مندرجات سنائے بھی، جو بحمد اللہ مجھے یاد رہ گئے۔

اولاً: یہ شادی میرے لئے قابل رشک ضرور ہے اور شریعت کی رو سے جائز بھی ہے مگر مجھے اپنی غیرت اور

مروت اس کی اجازت نہیں دیتی۔

ثانیاً: میں آپ سے علمی اور روحانی تعلق کے مابین کسی اور چیز کو حائل نہیں بنانا چاہتا۔

ثالثاً: میں اپنے والد ماجد کے پیار اور محبت سے بچپن ہی میں محروم ہو گیا تھا، آپ کی محبت وشفقت کی وجہ سے میں آپ کو ایک روحانی والد سمجھتا ہوں، اس حقیقت سے علام الغیوب ذات واقف ہے، براہِ کرم اگر آپ مجھے یہ ذمہ داری اٹھانے سے معذور سمجھیں تو قیامت تک احسان مند رہوں گا۔

حضرت فرماتے تھے کہ کافی زمانہ بیت گیا بس جو کچھ بیان کیا یہی یاد ہے۔

(۴)۔۔۔۔۔فرماتے: حضرت بنوریؒ نے مجھے اپنی تمام اسانید کی اجازت عنایت فرمائی، ان اسانید کے بارے میں حضرت کبھی کبھار فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ علامہ بنوریؒ کو اعلیٰ سے اعلیٰ درجات نصیب فرمائے کہ حضرت نے ہماری تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، ورنہ ان میں چند ایسی اسانید ہیں جو عصر حاضر میں میرے علاوہ کسی کے پاس نہیں، بیٹا! ان میں سے اگر ایک کو بھی میں ظاہر کردوں تو اہل علم کا میلہ لگ جائے گا۔ مگر حضرت بنوریؒ کی تربیت وصحبت کی برکت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان نمائشات سے محفوظ کر رکھا ہے۔

(۵)۔۔۔۔۔فرماتے: معارف السنن کی تالیف میں حضرت بنوریؒ نے مجھے اپنا خصوصی معاون منتخب فرمایا، یہ میری خوش قسمتی تھی۔ ان ایام میں تحریک ناموس رسالت انتہائی تیزی کے ساتھ جاری تھی، چونکہ حضرتؒ تحریک ختم نبوت کے امیر تھے اس لئے شب وروز ایک کر کے اس کاروان کی سالاری میں بے حد معروف ومتحرک رہتے مزید یہ کہ حضرت کو سفر در سفر اور بے پنا مصروفیات کی وجہ سے مطالعہ کرنے کی فرصت نہیں تھی لہٰذا میں اور مولانا حبیب اللہ مختارؒ متفرق کتابوں سے متعلقہ مواد جمع کر کے حضرت کی مسند کے سامنے رکھتے، حضرت مختصر وقت کے لیے دار التصنیف تشریف لاکر مطلوبہ مواد انتہائی مہارت کے ساتھ معارف السنن کے لیے منتخب فرما لیتے۔ کبھی کبھار حضرت فرماتے کہ مشکل کام تو آپ کرتے ہیں اگر یہ بقیہ کام بھی کر لیتے تو بہتر ہوتا۔

ایک دفعہ کتاب الحج پر کام کرنے کا حکم فرمایا تو میں نے قصداً ایک ایسی تحریر مرتب کی جو حضرت کے مزاج کے خلاف تھی اور مجھے رفیق محترم مولانا محمد حبیب اللہ مختارؒ نے بھی کہا کہ حضرت اس تحریر کو پسند نہیں فرمائیں گے۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے بھی اس کا علم ہے کہ حضرت اور میری تحریر میں وہ مماثلت نہیں جو ہونی چاہیے۔ لیکن اگر یہ تحریر منظور ہوئی تو سارا کام ہمارے سپرد ہو جائے گا اور اس معاونت کی برکت سے حضرت کی جو صحبت اور دعائیں مل رہی ہیں اس سے محروم ہو جائیں گے۔ جب کہ ہم دونوں چاہتے تھے کہ ہمیں حضرت کی تمام توجہات حاصل ہوں، جب حضرت دار التصنیف میں اپنی مسند پر تشریف فرما ہو جاتے تو ہم بہت ساری حوالہ کی کتابوں کو جمع کر کے سامنے رکھ

دیتے۔ حضرتؒ دیکھتے تو چہرے پر مسرت کے اثرات نمایاں ہوتے۔ ہمیں عجیب قسم کی دعاؤں کے علاوہ جس پیار اور محبت سے نوازتے، میرے پاس اس کی تعبیر کے لیے الفاظ نہیں۔ اس کے ساتھ ہماری جو حوصلہ افزائی فرماتے، اس سے ہماری محنت میں مزید اضافہ ہوتا، اور اچھی کارکردگی پر جو داد ملتی اس کا نظارہ پھر کبھی نہیں کر پائے۔ یقیناً حضرت بنوریؒ کا وجود مسعود ہمارے لئے مشعل راہ تھا۔ فرماتے: حضرت بنوریؒ کی صحبت و تربیت کی بدولت ہمیں انسانیت نصیب ہوئی، حضرت بنوریؒ فرمایا کرتے تھے کہ مولوی بننا آسان ہے لیکن انسان بننا بہت مشکل ہے۔

(۶)...... والد صاحب کے عقیدت واحترام اور غایت ادب کی یہ حالت تھی کہ کبھی حضرت بنوریؒ کا نام ہم نے آپ کی زبان سے نہیں سنا، بلکہ ہمیشہ القاب سے ذکر فرماتے تھے۔

(۷)...... ایک بار فرمایا کہ علم حدیث سے اللہ تعالیٰ نے جو تھوڑا بہت شغف عطا فرمایا ہے یہ حضرت بنوریؒ کا صدقہ ہے، ورنہ ہم تو سرحد کے دیہاتوں میں تمام عمر معقولی استادوں سے پڑھتے رہے، جس کی وجہ سے فلسفہ، منطق، نحو اور فقہ طبیعت میں ایسی رچ بس گئی تھیں کہ ان کے علاوہ کسی شے کا ذوق ہی نہ رہا تھا۔

(۸)...... اسی طرح حضرت بنوریؒ کا ایک بہت بڑا احسان میری اردو عربی تحریر سے ممارست اور تصنیف وتالیف کا ذوق ہے۔ ورگرنہ ہمارے علاقے میں تو ان چیزوں کا سرے سے کوئی رجحان ہی نہ تھا، عوامی حلقوں میں عالم اسے سمجھا جاتا جو عملیات کا ماہر ہوتا یا اچھی تقریر کرسکتا اور علمی حلقوں میں ماہر عالم کی پہچان یہ تھی کہ اسے فقہی جزئیات یاد ہوں یا کتاب کی اچھی تدریس کرسکتا ہو۔ تصنیف وتالیف یا تحریر علمی دائرۂ کار سے باہر کی چیز سمجھی جاتی تھی اور اس کے علمی ضرورت ہونے کا شعور ہی نہیں تھا۔

(۹)...... جب مجھے دورۂ حدیث کیلئے کراچی بھیجا تو فرمایا کہ حدیث کے لیے تین چیزیں اہم ترین ہیں: طہارت برکت اور علوسند۔ دو چیزیں یعنی طہارت وبرکت تو میرے مادر علمی جامعہ بنوری ٹاؤن میں سب سے بڑھ کر ہے لیکن علوسند مولانا سلیم اللہ خان صاحب کو حاصل ہے، اس لیے آپ دورہ تو وہاں کریں گے لیکن ہر ہفتے جامعہ بنوری ٹاؤن حاضری دے کر حضرت بنوریؒ کی قبر پر سورۃ یٰسین پڑھ کر ایصال ثواب ودعا کریں گے۔ آپ کے ایصال ثواب کی حضرت کو تو کوئی ضرورت نہیں، خود آپ کو ضرورت ہے، اس سے آپ کو جامعہ کی برکات نصیب ہوں گی۔

(۱۰)...... ایک بار میں نے والدہ صاحبہ سے پوچھا کہ حضرت والد صاحب کو آپ نے سب سے زیادہ کس دن خوش دیکھا ہے؟ والدہ صاحبہ نے فرمایا کہ جس دن حضرت اقدس بنوری قدس سرہ کی صاحبزادی یعنی مولانا حبیب اللہ مختار شہیدؒ کی اہلیہ ہمارے گھر آئی تھیں تو حضرت کی خوشی دیدنی تھی، آپ دیوانہ وار خوشی میں انتظامات فرمارہے

تھے، بالکل نئے بستر ے بنوائے، نئے تکیے اور چادریں منگوائیں، حتیٰ کہ اُس دن میں نے خوشی سے آپ کے آنسو بہتے ہوئے دیکھے۔ بار بار فرماتے تھے کہ میرے اُستاذ کی صاحبزادی تشریف لائی ہے، اُس کی خدمت میں کسی قسم کی کوتاہی نہ ہو۔

(۱۱)...... جب حضرت مولانا سید سلیمان بنوری مدظلہ دورۂ حدیث شریف سے فارغ ہوئے تو اُس دن بھی حضرت کی خوشی دیدنی تھی، مجھے بلاکر ۳۳ ہزار روپے دیئے اور فرمایا کہ" شکرتنگی" (اورکزئی ایجنسی) جا کر ایک بیل خرید لاؤ، میں نے ۳۷ ہزار کا بیل خریدا، حضرت نے خوشی میں ذبح کر کے طلبا کے لیے پکایا اور کچھ فقراء ومساکین میں تقسیم کیا گیا۔ فرماتے تھے کہ الحمد للہ آج حضرت بنوری قدس سرہ کا علمی وارث پیدا ہو گیا ہے۔ مولانا عطاء الرحمن صاحبؒ سے ایک دن فون پر فرمایا کہ حضرت اقدس ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب کی آمد کے بعد آج کل دل میں ایک داعیہ ہے کہ حضرت مولانا سید سلیمان بنوری کب ہمارے ہاں تشریف لاکر مجھے خدمت کا موقع دیں گے۔

(۱۲)...... بندہ نے حضرت والد صاحب کے پاس ایک بار کٹے ہوئے ناخن، بال وغیرہ دیکھے، پوچھنے پر فرمایا کہ یہ حضرت بنوریؒ کے ناخن اور بال ہے۔ جو شخص اپنے استاذ کے ناخن اور بال تک عقیدت واحترام سے سنبھال کر رکھے، تو استاذ کے علوم وآثار کے ساتھ اس کے تعلق عشق کا کیا حال ہوگا۔ اس کے علاوہ حضرت بنوریؒ کا قلم اور دیگر تبرکات بھی آپ نے احتیاط واہتمام سے محفوظ فرمائے تھے۔

والدگرامی کے اساتذۂ کرام

والد صاحب نے زمانہ طالب علمی میں پڑھا نہیں بلکہ گھول کر پیا تھا، زمانہ طالبعلمی میں اساتذہ کے سنے ہوئے بعض افادات بلفظہٖ یاد تھے اور کتابوں پر عبور بتلاتا تھا کہ آج کل کی طرح سرسری انداز سے نہیں پڑھی تھیں بلکہ ہر کتاب کو مستقل اہمیت اور توجہ دے کر پڑھا تھا۔ چونکہ اس دور میں ہر کتاب ماہرفن سے پڑھنے کی کوشش کی جاتی، اس لئے اگر کسی کتاب میں قدرے کمزوری رہ جاتی یا اس بات کا پتہ چلتا کہ فلاں جگہ کوئی ماہرفن اسے مزید بہتر پڑھا سکتا ہے تو وہ دوبارہ پڑھی جاتی۔ اس لئے حضرت والد صاحب نے بھی بعض فنی کتابیں دوبار پڑھی ہیں۔

حضرت کا ہر اہم کتاب کی تقریر لکھنے کا معمول تھا، حضرت بنوریؒ کے افادات بخاری کو بڑے اہتمام سے قلمبند کیا، جس کا مخطوط بحمداللہ بندہ کے پاس محفوظ ہے۔ اسی طرح مفتی ولی حسن ٹونکیؒ کی تقریر ترمذی بھی اول تا آخر لکھی اور بڑی ہی منضبط لکھی، شروع کے کچھ ابواب کے بجز یہ بھی مکمل بندہ کے پاس محفوظ ہے۔ ان شاء اللہ ضروری خدمت کے بعد ان کی اشاعت کی کوشش کی جائے گی۔ مولانا عبدالغفار کوہاٹی کی تقریر بیضاوی، قاضی مبارک اور اقلیدس کی

ناتمام کاپیاں اوراوراق بھی حضرت کے تحریری ذخیرے میں محفوظ ہیں۔ والد صاحب کے ضابطے کا تعلیمی دورانیہ ۵۷ء سے شروع ہو کر ۶۹ء میں تخصص فی الحدیث کے سال دوم پر ختم ہوا، جو تقریباً ۱۳ سال بنتے ہیں۔ ذیل میں آپ کے اساتذہ کرام اور پڑھی ہوئی کتابوں کا مختصر تذکرہ پیش خدمت ہے:

آپ اپنے تمام اساتذہ کے انتہائی قدردان تھے، حضرت بنوریؒ کے علوم معارف سے آپ کی سیرابی وشناسائی محتاج تعارف نہیں، حضرت مولانا فضل محمد صاحبؒ سے بھی قلبی لگاؤ تھا۔ مولانا عبدالغفارؒ اور مفتی ولی حسن ٹونکیؒ کے بارے میں فرماتے تھے کہ ان کے ہدایہ پڑھانے کا انداز برصغیر میں سب سے نرالا تھا اور ان سے بڑھ کر اس کتاب پر گرفت کسی اور کے بارے میں نہ سنی نہ دیکھی۔ آپ کے جن اساتذہ کی زیارت وملاقات کا شرف بندہ کو ملا وہ سب آپ کے دو اوصاف کے انتہائی معترف نظر آئے: ایک پایے کی ذہانت اور دوسرا غایت درجہ استاذ کا ادب۔

بندہ کی طلب پر ایک بار والد صاحبؒ نے اپنے سکول ومدرسہ کے اساتذہ کرام اور روحانی مشائخ کی فہرست بنا کر دی تھی، جو بحمد اللہ حوادث زمانہ سے محفوظ رہ گئی ان میں سے غیر معروف اساتذہ کے مختصر حالات' جو مجھے معلوم ہو سکے' ساتھ ذکر کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ ان سب حضرات پر کروڑہا رحمتیں نازل فرمائے۔

۱۔ مولانا عبداللہ جان المعروف خانی ملاؒ: ان سے حضرتؒ نے ناظرہ قرآن پاک پڑھا اور عصری تعلیم حاصل کی، انہیں ہمارے دادا نے اپنے بچوں کی تعلیم اور مسجد کی امامت کے لئے ہنگو سے اورکزئی ایجنسی بلایا تھا۔

۲۔ مولانا محمد اسحاق ملاخیلؒ: یہ ہمارے علاقائی عالم تھے، حضرت کے آبائی علاقہ 'سرہ ناکہ' کی مسجد میں امام تھے۔ وہیں درس وتدریس کا حلقہ قائم کیا تھا، صوفی مزاج اور انتہائی مروت کے حامل انسان تھے۔ حضرتؒ نے ان سے گلستان سعدی پڑھی۔

۳۔ مولانا گل رحیمؒ (المعروف ننگرانی استاذ): یہ بھی ہمارے علاقائی عالم تھے، اورکزئی ایجنسی کے قوم فیروزخیل سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۹۴ء میں تقریباً ۱۱۵ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ دارالعلوم دیوبند سے دورۂ حدیث کیا تھا۔ اس کے بعد دس سال مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کے پاس گزارے تھے، شکار کے ماہر تھے، فرماتے تھے کہ جب حضرت مفتی صاحبؒ کو گوشت کھانے کی طلب ہوتی تو مجھے شکار کا حکم دیتے، میں کھیتوں سے تازہ شکار کر کے لایا کرتا تھا۔ علاقہ کے معتبر اہل علم اور حاذق حکما میں شمار ہوتے تھے۔ انتہائی خوش الحان تھے، آپ کی اذان کا دور دور تک شہرہ تھا۔ پہلے پہل ہنگو میں رہے لیکن انگریزوں کے خلاف جدوجہد کی وجہ سے قبائل کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ شرک وبدعات کے سخت مخالف تھے، اسی پاداش میں اپنے علاقے فیروزخیل اورکزئی ایجنسی سے جلاوطن کیے گئے اور قوم شیخان نے انہیں اپنے علاقہ شکر تنگی میں بطور امام اور مدرس اپنی مسجد میں

مقرر کیا تھا۔ انگریزوں کے خلاف قبائلی جہاد میں شریک رہے۔ حضرت والد صاحب نے یہیں آپ سے فقہ کی ابتدائی کتابیں اور تجوید پڑھی۔

۴۔ مولانا خیال محمدؒ: ان سے والد گرامی نے شمہ، صرف بہائی اور قدوری پڑھی، یہ دارالعلوم ٹل میں ابتدائی کتب کے مدرس تھے۔ 'سرو ناکہ' اورکزئی ایجنسی کے قریب 'کنگانی' کے رہنے والے تھے۔

۵۔ مولانا حافظ عبدالہادیؒ: یہ حضرتؒ کے ایام طالب علمی کے ساتھی تھے، لیکن عمر اور درجے میں بڑے تھے، بلا کے حاذق اور ذہین تھے، زمانہ طالب علمی ہی میں مختلف کتابوں کی تدریس کرتے تھے، حضرتؒ نے بھی ان کے زمانہ طالب علمی میں ان سے زرادی، زنجانی، ہدایۃ النحو، دستور المبتدی، قانون اور مراح الارواح پڑھی۔

۶۔ مولانا فضل معبودؒ: آپ دارالعلوم ٹل میں مدرس تھے۔ ضلع دیر کے گاؤں ''زار منڈی'' کے رہنے والے تھے۔ تفسیر قرآن میں ان کی مہارت مشہور تھی، درس نظامی سے کامل ممارست تھی، انتہائی عابد اور زاہد صوفی تھے۔ حضرتؒ نے ان سے میزان الصرف اور نحو میر پڑھی۔

۷۔ مولانا ڈاکٹر قاضی محمد مبارکؒ: آپ دارالعلوم ٹل میں مدرس تھے اور فنون کے اچھے اساتذہ میں شمار ہوتے تھے، ہزارہ کے رہنے والے تھے۔ عربی ادب میں کمال مہارت رکھتے تھے۔ ایک دفعہ پشاور یونیورسٹی میں عربی اور اسلامیات پڑھانے والوں کے لئے آسامیاں آئیں، آپ نے بھی درخواست جمع کردی، چونکہ عربی میں مہارت تھی اس لئے منتخب ہوئے، محنتی مزاج اور علمی شغف رکھتے تھے۔ پشاور یونیورسٹی ہی سے پی، ایچ، ڈی کی اور ترقی کرتے کرتے شعبہ عربی کے رئیس ہوئے، چند سال قبل آپ کا انتقال ہوا۔ حضرتؒ نے آپ سے مراح الارواح، ہدایۃ النحو، نفحۃ الیمن، مقامات حریری اور قصیدۂ بردہ شریف پڑھی۔

۸۔ مولانا محمد کریم کاکاخیلؒ: ہنگو شہر میں فروغ علم دین اور علم وتفقہ کے فیضان میں حضرت مولانا کاکاخیلؒ کا نام سرفہرست اکابر میں ہے۔ آپ ''جنگی استاذ'' کے نام سے مشہور تھے۔ حضرتؒ نے آپ کے ہاں مفتاح العلوم میں دو سال تعلیم حاصل کی اور آپ سے اصول فقہ کی مشہور کتابیں نورالانوار اور حسامی پڑھیں۔

۹۔ مولانا غلام محمد غزنویؒ: آپ افغانستان کے شہر غزنی کے رہنے والے تھے۔ بڑے ظریف، بذلہ سنج اور محقق عالم تھے اور بڑے جوش وخروش سے پڑھایا کرتے تھے۔ مفتاح العلوم ہنگو میں مدرس تھے۔ حضرت فرماتے کہ اپنے معقولی مزاج کے باعث کبھی کبھار جوش میں آکر فرماتے کہ مولوی تو صرف تفتازانی ہے، باقیوں نے تو ویسے وقت پاس کیا ہے۔ کبھی مشکل اور دقیق مقام کو حل کرتے تو فرماتے: جاؤ! کاکاخیل صاحب سے پوچھو، وہ بھی اس مقام کو ایسا نہیں حل کرسکیں گے۔ جب کہ کاکاخیلؒ صاحب باہر برآمدے میں یہ سب سن کر محظوظ ہو رہے ہوتے۔

۱۰۔ حضرت مولانا عبد اللہؒ: ہنگو کی علمی، سیاسی اور سماجی تاریخ مولانا عبداللہ صاحبؒ کے تذکرے کے بغیر نامکمل سمجھی جائے گی۔ آپ کا تقویٰ، للہیت اور شجاعت ضرب المثل تھی۔ آپ جامعہ اسلامیہ اکوڑہ خٹک کے فاضل تھے اور مولانا عبدالرحمن کامل پوریؒ سے حدیث پڑھی تھی۔ حضرت والد صاحبؒ کے استاذ تھے لیکن زندگی بھر ایک دوست کی طرح رہے۔ تمام علمی، دینی، قومی مسائل میں ان دو حضرات کی رائے حرف آخر سمجھی جاتی۔ حضرتؒ نے مولانا عبداللہ صاحبؒ سے مفتاح العلوم میں ہدایہ ثانی اور شرح ملا جامی (بحث) پڑھی تھی۔ حضرت والد صاحبؒ ان کی فقہی مہارت اور جزئیات فقہیہ پر دسترس کے مداح تھے، آخر میں جامعہ مفتاح العلوم ہنگو کے صدر مدرس تھے، سالہا سال تک مختلف علوم وفنون، تفسیر، حدیث اور فقہ کا درس دیا اور عمر کا اکثر حصہ حسبۃً للہ پڑھایا۔ ہنگو کی پوخ (پکی) مسجد میں ۳۶ سال خطابت کے فرائض سرانجام دیئے۔ جب کہ اپنے گاؤں 'وچ بازار' کی مسجد میں ۴۸ سال امامت کرتے رہے۔

۱۱۔ مولانا محمد رازق (المعروف ملیز واستاذ): آپ ضلع دیر کے ایک گاؤں 'رانی، تیمرگرہ' کے رہنے والے تھے، مولانا غلام رسول (المعروف ڈھوڈہ استاذ، کوہاٹ) کے اخص تلامذہ میں سے تھے۔ جامعہ مفتاح العلوم میں عمر بھر تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے اور ہنگو کے مضافاتی گاؤں 'درستہ' میں سال ہا سال امامت کرتے رہے۔ عامۃ الناس اور علمی حلقوں میں ایک مقبول شخصیت کے طور پر مشہور تھے۔ حضرتؒ نے آپ سے کنز الدقائق کتاب النکاح سے آخر تک پڑھی تھی۔

۱۲۔ مولانا عبداللہ خانؒ: حضرت والد صاحب نے آپ سے فصول اکبری، اصول شاشی اور کافیہ پڑھی، بندہ کو تلاش بسیار کے باوجود آپ کے حالات نہ مل سکے۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً

۱۳۔ مولانا معصوم خانؒ (المعروف مینگل استاذ): آپ کرم ایجنسی مینگل قوم کے مشہور عالم دین تھے، منطق کے شہرۂ آفاق مدرس تھے۔ دار العلوم تل میں استاذ تھے۔ حضرتؒ نے آپ سے مرقاۃ اور شرح تہذیب پڑھی تھی۔

۱۴۔ مولانا عبد الغفار کوہائیؒ: کوہاٹ کی علمی وعرفانی تاریخ کا ایک روشن ستارہ جسے تمام علوم وفنون میں خداداد مجتہدانہ بصیرت حاصل تھی، اس کے ساتھ صاحب دل، عابد وزاہد اور مرتاض صوفی تھے۔ علم اتنا پختہ تھا کہ آپ کی ذات اس حوالے سے سند کا درجہ رکھتی تھی۔ اس مضمون میں جابجا ان کے حالات کا تذکرہ بکھرا ہے۔ والد صاحب کے ساتھ انتہائی شفقت ومحبت کا تعلق تھا اور ان کی ٹھوس استعداد کے قدردان اور معترف تھے، والد صاحب نے فرمایا کہ ایک دن ہدایہ کے سبق میں ایک استاذ نے صاحب ہدایہ کے حوالے سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو باغی کہا، میں نے اس پر کچھ سوال وجواب کیا تو سخت غصہ ہوئے اور مجھے ناصبی کہہ کر درسگاہ سے نکال دیا، مجھے سخت

پریشانی ہوئی کہ سوال نہیں کرنا چاہیے تھا، استاذ ناراض ہو گئے ہیں۔ اسی اثنا مولانا عبدالغفارتشریف لائے، مجھے درسگاہ سے باہر کھڑا دیکھ کر فرمایا کہ کیا ہوا؟ میں نے واقعہ عرض کیا تو ہاتھ سے پکڑ کر اندر لے گئے اور استاذ کو (جوان کے شاگرد تھے) مخاطب کر کے فرمایا کہ جب طالب علم کو مطمئن نہیں کر سکتے تو ناصبی کہہ کر درسگاہ سے نکالنے کی کیا تک بنتی ہے؟ یہ کہہ کر مجھے بٹھلا دیا۔ والدصاحبؒ نے جامعہ تعلیم القرآن میں طالب علمی کا سارا زمانہ آپ کی سرپرستی اورنگرانی میں گزارا اورآپ سے جلالین شریف، بیضاوی، خیالی، حمداللہ، قاضی مبارک، صدرا، شمس بازغہ، میر زاہداورشافیہ پڑھی۔

۱۵۔شیخ الحدیث مولانا نعمت اللہؒ: ضلع کوہاٹ کے نامور علما میں ایک نام شیخ الحدیث مولانا نعمت اللہ صاحبؒ کا ہے۔حضرت والدصاحبؒ نے آپ سے مشکاۃ، ہدایہ اخیرین، تلویح اور مسلم الثبوت پڑھیں۔خواص وعوام میں یکساں مقبول تھے۔شیخ صاحب کو بیک وقت فقیہ ومحدث ہونے کا شرف حاصل تھا۔اکثر علما سے سنا ہے کہ حضرت شیخ الحدیث شامی کے حافظ تھے۔آپ نے دورۂ حدیث جامعہ امینیہ دہلی سے کیا، اس وقت وہاں شیخ الحدیث حضرت مولانا سلطان محمودؒ تھے۔بقول حضرت شیخ کے حضرت مولانا سلطان محمود شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ کے پایہ کے محدث تھے، کفایت المفتی میں ان کا ذکر موجود ہے۔آپ نے تدریس کا آغاز لکی مروت کے قریب واقع گاؤں عیسیٰ خیل کے ایک مدرسہ سے فرمایا۔پھر انجمن تعلیم القرآن تشریف لائے اور تادم آخر یہاں ابتدائی کتب سے لے کر بخاری تک کا درس دیا۔اپنے استاذ مولانا عبدالغنی صاحب کی وفات کے بعد آپ کو شیخ الحدیث مقرر کیا گیا۔تین دفعہ MNA بننے والا وہ مرد نفس کش مرد قلندر ہی رہا۔وضع قطع، لباس، خستہ مکان جوں کے توں رہے۔تحریک ختم نبوت میں اسمبلی کے اندر بھی آپ نے مثالی کردار ادا کیا۔

۱۶۔مولانا احمد گلؒ: دارالعلوم انجمن تعلیم القرآن کوہاٹ کے کبار اور اجل اساتذہ میں سے تھے، کرک کے گاؤں لتمبر کے رہنے والے تھے اور علمی حلقوں میں 'لتمبر استاذ' کے نام سے معروف تھے، آپ کی شرح جامی کا دور دور تک شہرہ تھا، والدصاحب نے آپ سے شرح جامی اور ہدایہ ثالث پڑھی۔

۱۷۔مولانا فضل الرحمن سوریزئی: دارالعلوم انجمن تعلیم القرآن کوہاٹ کے اجل مشائخ میں سے تھے، ہنگو کے قریب ایک گاؤں سوریزئی کے رہنے والے تھے، زندگی کا بڑا حصہ قطر میں امامت کرتے ہوئے گزارا، بعدازاں اپنے گاؤں میں تادم وفات امامت وخطابت کی ذمہ داری نبھاتے رہے۔حضرت والدصاحبؒ نے آپ سے شرح جامی، دیوان متنبی اور مولوی یعقوب پڑھی۔

۱۸۔شیخ الحدیث مولانا عبدالمنان مدظلہم: آپ ۲۳ اکتوبر ۱۹۴۰ء کو اولنی لاچی ضلع کوہاٹ میں پیدا ہوئے

۔آپ کے والد محترم نے آپ کو مولانا رسول شاہ المعروف ڈھوڈہ صاحب کے پاس بھیجا۔حضرت فرماتے ہیں کہ میں نے ان سے منیۃ المصلی شروع کی اور اس کے پہلے دن کا سبق یہ تھا کہ وضو میں اسراف جائز نہیں (ولو علی شط نہر) اور یہ سبق مجھے آج بھی اسی طرح یاد ہے۔اس کے بعد کوہاٹ شہر تشریف لائے اور مولانا شیر خان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیے۔مولانا نے آپ کو بوقت تہجد دو رکعت پڑھانے کے بعد صرف میر کی ابتدا کرائی، یوں آپ کی طالب علمی کی زندگی کا روحانی اور مبارک آغاز ہوا۔اعلیٰ تعلیم آپ نے دار العلوم انجمن تعلیم القرآن کوہاٹ میں پائی اور ۱۹۵۴ء میں اپنے مرشد شیخ الحدیث نصیر الدین غور غشتوئی سے سند حدیث حاصل کی۔

۱۹۵۵ء میں بحیثیت ابتدائی مدرس ۱۵ روپے مشاہرے پر انجمن تعلیم القرآن کوہاٹ میں تقرری ہوئی اور اس وقت سے تا حال تقریباً ۶۲ سال سے دار العلوم میں درسی فرائض انجام دے رہے ہیں ۱۹۷۱ء تک فنون اور حدیث کی مختلف کتابیں پڑھاتے رہے اور ۱۹۷۱ء کے الیکشن میں شیخ الحدیث مولانا نعمت اللہ نور اللہ مضجعہ کے قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہونے کے بعد آپ شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے اور تا حال یہ خدمت سر انجام دے رہے ہیں۔ حضرت والد صاحب نے ۱۹۶۳ء، ۱۹۶۴ء میں آپ سے ہدایہ اولین، مختصر المعانی، سلم، کافیہ اور فصول اکبری پڑھی۔ اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ تا دیر قائم رکھے۔

۱۹۔مفتی محمد جنان صاحبؒ: ہنگو کے رہنے والے تھے، انجمن تعلیم القرآن میں قریباً نصف صدی مختلف علوم وفنون کی کتابیں پڑھاتے رہے اور تقریباً ۴۰ سال فتویٰ کی خدمت سپرد رہی، اتنا ہی عرصہ کوہاٹ شہر میں امامت وخطابت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے، آپ کا فتویٰ اس پورے علاقہ میں سند شمار ہوتا تھا، اسی لیے عوامی مقبولیت بھی خوب حاصل تھی، حضرت والد صاحب نے آپ سے فلسفہ کی مشہور کتاب میبذی پڑھی۔

۲۰۔مولانا نادر خان مدظلہم: آپ ۱۹۳۰ء میں اورکزئی ایجنسی میں پیدا ہوئے، ۱۶ سال تحصیل علم میں صرف کیے، ۱۹۵۳ء میں حضرت غور غشتوئی سے دورۂ حدیث کیا، ۱۹۵۵ء میں انجمن تعلیم القرآن کوہاٹ میں دس روپے مشاہرے پر بحیثیت ابتدائی مدرس تقرری ہوئی، ابھی صاحب فراش ہیں، بندہ نے جب حضرت والد صاحب پر کچھ تاثرات سننے حاضری دی، تو بخاری شریف اور جلالین شریف کا نسخہ پاس رکھا ہوا تھا، فرمایا کہ اب بھی یومیہ کچھ مقدار تفسیر کا مطالعہ اور بخاری شریف کی تلاوت کرتا ہوں۔والد صاحب نے آپ سے انجمن تعلیم القرآن میں 'قال اقول' پڑھی۔

۲۱۔مولانا سید عبد العزیزؒ: آپ افغانستان کے شہر بدخشان کے رہنے والے تھے۔چشمہ مسجد کوہاٹ میں امام تھے اور انجمن تعلیم القرآن کوہاٹ میں مدرس تھے۔نہایت منکسر المزاج شخصیت تھے، حضرت نے آپ سے قطبی

پڑھی تھی۔ جب جامعہ یوسفیہ قائم ہوا تو حضرت نے آپ کو تدریس کے لئے دعوت دی، آپ نے قبول فرمائی اور کئی سال تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔

۲۲۔ مولانا سید عبد المصورؒ: آپ کوہاٹ میں مدرس تھے، والد صاحب نے آپ سے 'ہدایۃ الحکمۃ' پڑھی، لیکن افسوس کہ آپ کے حالات کا علم نہ ہوسکا۔

۲۳۔ مولانا عبد الحلیم صاحب زروبویؒ: دار العلوم اکوڑہ خٹک کے صدر مدرس حضرت زروبویؒ مشہور شاعر و مدرس مولانا ابراہیم فانیؒ کے والد تھے، صوابی کے گاؤں زروبی کے رہائشی تھے۔ والد صاحب نے ان سے کوہاٹ کے مضافات میں بیضاوی، تلویح، خیالی اور شرح عقائد پڑھی۔

۲۵۔ مولانا محمد علیؒ: آپ تعلیم القرآن کوہاٹ میں مدرس تھے، لیکن آپ کے حالات کا تفصیلی علم نہ ہوسکا، والد صاحب نے آپ سے مطول پڑھی۔

۲۶۔ مولانا معین الدینؒ: بخاری کے شارح اور معروف شخصیت ہیں، ضلع کرک کے رہائشی تھے، فضلائے دیوبند میں سے ان لوگوں میں شمار ہوتے تھے جو آخری وقت تک جماعت اسلامی کے فکر سے وابستہ رہے، والد صاحب نے زمانہ طالب علمی میں ان کی بعض تحریرات پر نقد بھی کیا، جو اس نمبر کا حصہ ہے، آپ آغاز میں تعلیم القرآن کوہاٹ میں مدرس تھے، والد صاحب نے یہیں آپ سے حمد اللہ پڑھی۔

۲۷۔ مولانا عبد الحلیم کوہستانیؒ: آپ بھی کوہاٹ میں مدرس تھے، حضرت والد صاحب نے آپ سے 'امور عامہ' پڑھی، آپ کا انتقال ۱۱۵ سال کی عمر میں ہوا۔

۲۸۔ مولانا عبد الحلیم دیروی مدظلہم: حضرت 'دیر باباجیؒ' کے نام سے معروف ہے، جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک میں عرصہ دراز سے حدیث کی کتابیں پڑھاتے ہیں، حضرت لاہوریؒ کے خلفا میں سے ہیں، کوہاٹ میں سالانہ تعطیلات کے دوران ایک عرصہ تک حضرت لاہوریؒ کے منہج پر تفسیر و ترجمہ قرآن کا درس دیتے رہے، والد صاحب نے شعبان رمضان کی تعطیلات میں زمانہ طالب میں آپ سے ترجمۂ قرآن پڑھا، اللہ تعالیٰ آپ کا سایہ تادیر سلامت رکھے۔

۲۹۔ مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ سے جامعہ اشرفیہ لاہور میں ۲۸ دن بخاری شریف پڑھی۔

۳۰۔ مولانا جمیل احمد تھانویؒ سے اتنی ہی مدت ابوداؤد شریف پڑھی۔

۳۱۔ مولانا عبید الرحمن اشرفیؒ سے مسلم شریف کا ابتدائی حصہ پڑھا۔

۳۲۔ مولانا عبد اللہ درخواستیؒ سے دوبار ترجمۃ القرآن پڑھا اور دلائل الخیرات کی اجازت بھی حاصل کی۔

۳۳۔ محدث العصر مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ سے صحیح بخاری پڑھنے کے علاوہ، الحزب الاعظم، دلائل الخیرات،

حصن حصین اور قصیدۂ بردہ شریف کی اجازت حاصل کی، نیز سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت بھی کی۔

۳۴۔ مولانا فضل محمد سواتیؒ سے سنن ابی داؤد پڑھی جب کہ دلائل الخیرات، حزب البحر اور چہل قاف کی اجازت بھی حاصل کی۔ حضرت سواتی دارالعلوم دیوبند کے نامور فاضل تھے، دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم کراچی، جامعہ بنوری ٹاؤن اور بعدازاں مظہرالعلوم سوات میں استاذ رہے۔ ۶ فروری ۱۹۱۴ء تاریخ پیدائش ہے، جبکہ ۹ نومبر ۱۹۹۶ء کو انتہائی قابل رشک حالت میں وفات پائی کہ عین حالت نزع میں وضو کر کے قبلہ رخ لیٹے، سورۂ یٰسین کی تلاوت شروع کی۔ ساتھ ساتھ حاضرین کو بتاتے جاتے کہ روح ابھی پاؤں سے پرواز کر گئی، ابھی نچلے دھڑ سے نکل گئی، ابھی سینے سے اٹھ گئی، اسی کیفیت میں جیسے ہی سورۂ یٰسین مکمل کی تو ایسے پرسکون اور خاموش ہو گئے جیسے گہری نیند میں چلے گئے ہوں، نہ تکلیف، نہ جزع فزع کچھ بھی اثر ایسا ظاہر نہ ہوا۔ والد صاحب فرماتے تھے کہ اب صدیاں ایسی اموات سے خالی ہو گئیں۔

حضرت مولانا فضل محمد صاحب کی حضرت والد صاحب سے حد درجہ محبت تھی، اس محبت کے بیسیوں مظاہر کا تذکرہ ان شاء اللہ اس نمبر میں جا بجا ملے گا، فی الوقت ایک واقعہ لکھنا چاہوں گا:

ایک بار جب میں مظہرالعلوم سوات میں حضرت کے ہاں پڑھتا تھا، کوہاٹ سے دو میاں بیوی مولانا فضل محمد صاحب کے ہاں آئے، حضرت نے کوہاٹ کی نسبت سے کافی اکرام کیا، جب آنے کا مدعا پوچھا تو انہوں نے کہا کہ جی ہمیں کچھ روحانی مسائل ہیں اُس سلسلے میں حاضر ہوئے ہیں، حضرت نے فرمایا کہ ہنگو میں مولانا محمد امین صاحب جیسی شخصیت موجود ہے، تو میرے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی، اُنہوں نے کہا کہ حضرت! مسئلہ تو سارا اُنہی نے خراب کیا ہے۔ فرمایا: کیسے؟ اُنہوں نے کہا: جی! مولوی امین صاحب نے ہم پر جادو کیا ہے۔ یہ کہنا تھا کہ حضرت جلال میں آئے اور اُنہیں ڈانٹ کر گھر سے اُسی وقت نکال دیا کہ تم میرے گھر میں بیٹھ کر مولانا امین صاحب کے بارے ایسی بات کرتے ہو، تمہیں معلوم بھی ہے کہ وہ کون ہے؟ اُن کی شہر کے ساتھ نسبت کی وجہ سے تو میں نے تمہیں یہاں بیٹھنے دیا ہے، صبح مجھ سے فرمایا کہ رات کو میں نے کام تو خلاف مروت کیا ہے، لیکن آپ کے والد کی محبت نے مغلوب کر دیا۔ دراصل اُن بے چاروں کو کسی نے یہ یقین دہانی کروائی تھی کہ آپ پر مولانا امین صاحب نے جادو کر رکھا ہے اور آپ کی ساری بیماریاں اور مسائل اسی وجہ سے ہیں۔

حضرت والد صاحب بھی حضرت مولانا فضل محمد صاحب کا حد درجہ احترام فرماتے، جب حضرت ہمارے ہاں تشریف لاتے تو فجر کی نماز سے قبل میری چائے لانے کی ذمہ داری ہوتی کیونکہ حضرت کا اُس وقت چائے پینے کا معمول تھا، والد صاحب مجھے اُن سے دم کرواتے، میں دیکھتا کہ والد صاحب اپنے ہاتھ سے اُنہیں جرابیں پہناتے،

واسکٹ پہناتے اور خوشی خوشی خدمت کرتے۔

بندہ ناچیز نے تعلیم کی ابتدا حضرت ہی کے ہاں مظہر العلوم مینگورہ سوات سے کی، حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا کہ یوسف! میں نے آپ کو یہاں پڑھنے کے لئے نہیں بھیجا، بلکہ حضرت کی صحبت اور خدمت کے لئے بھیجا ہے، تم یہ کوشش کرو کہ حضرت جن نمازوں کی امامت کرتے ہیں ان میں ضرور شرکت کیا کرو، ہماری رہائش تو ایک دوسری مسجد میں تھی، لیکن الحمد للہ ثم الحمد للہ ہم اکثر نمازوں کے لئے حضرت کے ہاں آتے تھے۔

۳۵۔ مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ سے صحیح مسلم شریف پڑھی اور آپ ہی کی نگرانی میں تخصص فی الحدیث بھی کیا۔

۳۶۔ مفتی ولی حسن ٹونکیؒ سے جامع ترمذی مکمل پڑھی۔

۳۷۔ مولانا مصباح اللہ شاہؒ سے مؤطا امام محمد، مؤطا امام مالک، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ پڑھی۔

۳۸۔ مولانا بدیع الزمانؒ سے شرح معانی الآثار پڑھی۔

۳۹۔ مولانا مفتی رشید احمد لدھیانویؒ سے تخصص کے زمانہ میں حساب ومیراث کی تعلیم حاصل کی۔

راہ سلوک کا سفر اور روحانی مشائخ

خیر القرون سے اسلاف امت کا یہ دستور رہا ہے کہ تزکیہ نفس کے لیے اہل اللہ کی صحبت اختیار کرتے اور ان کی تربیت میں زندگی گزارتے، ہمارے اکابر دیوبند کے ہاں مشہور سلاسل تصوف میں بیعت وارشاد کا سلسلہ ہمیشہ سے جاری وساری رہا ہے اور اہل علم کے لیے بیعت ہو کر کسی کامل شیخ کی نگرانی میں منازل سلوک طے کرنا لازمی وضروری سمجھا گیا ہے۔ حضرت والد صاحب بھی زمانہ طالب علمی ہی سے مشائخ کے ساتھ وابستہ رہے۔ گو کہ ہمارے اکابر کا طلبہ کو بیعت کرنے کا رجحان نہ تھا لیکن آپ کی خصوصیت تھی کہ آپ کو اویس زمانہ حضرت مولانا نصیر الدین غورغشتویؒ نے زمانہ طالب علمی میں اپنے حلقہ ارادت میں شامل فرمایا۔ غالباً ۶۹ء میں حضرت غورغشتویؒ کا انتقال ہوا، تو آپ حضرت بنوریؒ سے بیعت ہو گئے، اور سلوک کے باقاعدہ منازل اور تربیت کی تکمیل حضرت بنوریؒ ہی سے ہوئی۔ حضرت بنوریؒ کے انتقال پر ملال کے بعد بھی آپ نے کامل اصلاح ہو جانے کے باوجود اپنے آپ کو شیخ کی نگرانی سے مستغنی نہیں سمجھا اور کامل شیخ کی تلاش میں رہے، اس دور کے مکاتیب سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے کافی عرصہ استشارہ واستخارہ کیا اور بزرگوں کی مجالست اختیار کی، مولانا عبد العزیز رائے پوریؒ کے ہاں کافی آنا جانا رکھا، حیدر آباد کے ایک تکوینی امور کے بزرگ سے بھی تعلق رہا لیکن باقاعدہ بیعت پر انشراح قلبی نہ ہو سکا، جب آپ ۸۰ء میں کراچی سے مستقل ہنگو تشریف لائے، تو اپنے استاذ حضرت مولانا فضل محمد صاحب سے اصلاحی تعلق قائم

کرنے کی خواہش ظاہر کی، حضرت نے خود تو بیعت نہیں فرمایا اور وجہ یہ ارشاد فرمائی کہ بیعت کے بعد تربیت کے لئے بسا اوقات سختی کی ضرورت ہوتی ہے اور آپ کے ساتھ نسبی بیٹوں کی طرح محبت کی وجہ سے وہ نہ ہو سکے گی۔ لیکن اپنے علاقہ سوات کے دو بڑے اولیا کی طرف رہنمائی فرمائی، ان میں سے ایک حضرت مولانا اکرم جنگی خیل بابا تھے جب کہ دوسرے جنید وقت حضرت مولانا سراج الیوم المعروف گڑھی باباجیؒ تھے۔ حضرت والد صاحب نے پہلے جنگی خیل بابا کی طرف رجوع کیا لیکن انہوں نے فرمایا کہ اس دیار کی مسند ولایت گڑھی باباجی کے حوالے ہو چکی ہے، میں ان کی موجودگی میں آپ کو بیعت نہیں کر سکتا، آپ کا گوہر مقصود ان کے پاس ہے، میں خود آپ کو ان کے پاس لے جاؤں گا، حضرت والد صاحب نے ان بزرگوں کی ایما پر حضرت گڑھی باباجی کے دست بابرکت میں ہاتھ دیا، اور ایک طویل عرصہ تک سلوک کے منازل طے کرتے رہے، آپ کا اپنے شیخ کے پاس کثرت سے آنا جانا رہتا اور رمضان کا مہینہ شیخ کے ہاں قیام کرتے، آپ کی وجہ سے حضرت گڑھی باباجی کا سلسلہ ہمارے علاقوں اور قبائل میں پھیلا، اور اہل علم اور عامۃ الناس کی بڑی تعداد حضرت باباجی سے وابستہ ہوئی۔

مولانا سراج الیوم صاحبؒ مولانا عبداللطیف صاحب کے خلیفہ تھے، علوم ظاہریہ و باطنیہ دونوں کی تکمیل اپنے شیخ سے کی تھی، مولانا عبداللطیف رحمہ اللہ دیر کے علاقہ ''بیارے'' کے رہنے والے تھے، اور ''بیارے باباجی'' کے نام سے معروف تھے، آپؒ نے کربوغہ شریف میں مفتی مختار الدین صاحب کے پردادا حضرت سید عمر صاحبؒ سے سلوک کی تکمیل کی تھی اور انہی سے خرقۂ خلافت حاصل کیا تھا، اور اس کے لیے بارہ سال کربوغہ شریف میں گزارے تھے۔ مولانا سید عمر صاحبؒ کربوغوی، مولانا عبدالغفور صاحب المعروف سیدو باباؒ کے اجل خلفا میں سے تھے، اور ہمارا خطہ ان کے فیوض و برکات سے آج بھی منور ہے۔

بیارے باباجی کا انتقال ۱۹۴۶ء میں ہوا، چونکہ آپ والد صاحبؒ کے شیخ الشیخ تھے، اس لیے آپ کی قبر پر اکثر والد صاحب حاضری دیا کرتے تھے۔ حضرت گڑھی باباجی انتہائی خوبصورت اور فصیح اللسان بزرگ تھے، علوم تصوف کے گہرے شناور تھے، والد صاحب فرماتے کہ اتنا ضعف تھا کہ دو بندوں کے سہارے نماز کے لیے لائے جاتے، لیکن جیسے ہی صف میں پہنچتے تو ایسے جم کر کھڑے ہو جاتے جیسے جسم میں بجلی دوڑ گئی ہو، اور پورے تیقظ و نشاط کے ساتھ طویل نوافل ادا کرتے، دیکھنے والا محسوس ہی نہ کرتا کہ یہ وہی شخص ہے جسے ابھی سہارا دے کر لایا گیا ہے۔ آپ کا انتقال ۱۹۸۷ء میں ہوا۔

گڑھی باباجی کی وفات کے بعد والد گرامی کا رجوع حضرت مولانا بہاء الحق صاحب فاضل دارالعلوم دیوبند کی طرف ہو گیا۔ حضرت اورکزئی ایجنسی کے معروف روحانی خاندان ''خواصاحبان'' سے تعلق رکھتے تھے، اور اپنے

وقت کے اقطاب میں سے تھے، صاحب کشف وکرامات تھے، لیکن کرامات کا افشا نہیں فرماتے تھے۔' خوا' دراصل علاقہ کا نام ہے اور' صاحبان' عزت واحترام کا لقب ہے کیونکہ اس خاندان میں برسوں سے اونچے درجہ کے اولیا کا سلسلہ چلا آرہا ہے اور اس گدی پر کئی نامور اہل اللہ ہو گزرے ہیں۔

حضرت مولانا بہاء الحق کی رحلت کے بعد حضرت والد صاحب حضرت لاہوریؒ کے خلیفہ حضرت غلام رسول صاحب کے پاس آنا جانا شروع ہوئے، ان سے باقاعدہ بیعت تو نہیں کی، لیکن آنا جانا کافی رہا۔ والد صاحب کی آخری بیعت معروف بزرگ حضرت مولانا محمود صاحب صندل بابا جی سے تھی۔

والد صاحب کو حضرت مولانا سراج الیومؒ سے نقشبندیہ وقادریہ، مولانا فضل محمد سواتیؒ سے قادریہ، مولانا عبدالعزیز رائے پوریؒ سے سلاسل اربعہ، مولانا بہاء الحق صاحبؒ سے چشتیہ، خلیفہ غلام رسول صاحبؒ سے سلاسل اربعہ اور صندل بابا جی سے قادریہ میں خلافت حاصل تھی۔ خلیفہ غلام رسول رحمہ اللہ نے بالخصوص سلسلہ سہروردیہ کے اذکار آگے تلقین کرنے کا فرمایا، کیونکہ یہ سلسلہ اور اس کا طریق تربیت ہمارے خطوں میں تقریباً متروک ہو چکا ہے۔ ان سب بزرگوں سمیت حضرت بنوریؒ اور حضرت غورغشتویؒ سے دلائل الخیرات کی اجازت بھی حاصل تھی۔

تصوف وسلوک اور حضرت کے بعض رجحانات

والد گرامی طویل عرصہ تک زمانہ کے اونچے اولیا کی صحبت کے باعث اپنے آپ کو صیقل کر چکے تھے، آپ کی مثال سنگ پارس کی تھی، جو اخلاص کے ساتھ آپ کی صحبت اٹھاتا، سونا بن جاتا۔ تصوف وسلوک کا تعلق عمل سے ہے، اور علم شریعت کی عملِ انسانی کے ساتھ کامل مطابقت پیدا کرنا ہی تصوف کا مقصد ہے۔ والد گرامی کی ساری زندگی ان اعمال حسنہ اور اخلاق فاضلہ کی عملی تصویر تھی جن سے تصوف کی کتابیں لبریز ہیں۔ آپ کی ان صفات کا ذکر تو ذیل میں تفصیل سے آئے گا، فی الوقت میدانِ تصوف میں آپ کے چند افکار ورجحانات کی تفصیل پیش کرنی ہے۔

والد گرامی فرماتے تھے کہ مجھے متقدمین یعنی خیر القرون کا طریق تصوف اور طرز تزکیہ بہت پسند ہے، کیونکہ اس طریق میں تزکیہ نفس کو نصب العین کی حیثیت حاصل تھی اور اس کے لیے قرآن وحدیث میں اخلاقیات کے ذخیرے سے استفادہ کیا جاتا تھا، بعد میں شطحیات، تکلفات اور فلسفیانہ اثرات کی وجہ سے طرق تصوف میں بہت کچھ آمیزش ہوئی اور مقاصد کی بجائے وسائل وزوائد کو ترجیح دی گئی گو کہ ہر دور میں مخلص اور محقق اولیاء اللہ مقاصد وذرائع کی وضاحت کر کے ان زوائد وتکلفات سے لوگوں کو روکتے رہے، جیسا کہ ماضی قریب میں حکیم الامۃ حضرت تھانویؒ کی مثال دی جاسکتی ہے، لیکن امت کا ایک بڑا طبقہ ان شطحیات وتکلفات کا شکار ضرور ہوا۔

حضرت والد صاحبؒ نے اپنے قریبی متعلقین واحباب کو خانقاہوں میں ایسے معمولات کے اجرا سے بھی روکا، جن میں دوام کی وجہ سے بدعت کی صورت پیدا ہوسکتی تھی۔ خصوصاً ماہ رمضان کے آخری عشرہ میں بعض مخصوص ایام پر مخصوص اعمال اور ختم القرآن وغیرہ اہل حق صوفیا کے ہاں بھی مروج تھیں، جن کا انتہائی اہتمام کیا جاتا تھا، حضرت کی کوششوں سے ان کا انسداد ہوا۔

والدگرامی کے ہاں تربیت واصلاح کا آغاز اعمال کے بجائے ایمانیات کی تصحیح سے ہوتا تھا، آپ ہمیشہ عقیدہ وعمل کو شرک وبدعت سے پاک کرنے پر زور دیتے تھے، اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل یقین، تسلیم ورضا، غیرت وحمیت اور اخلاص وللٰہیت کی تعلیم کو اولین درجہ دیتے، فرماتے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے مخلص ہوجائیں، پھر ہر فکر چھوڑ دیں، اللہ تعالیٰ ہر چیز کے لیے کافی ہوجائیں گے۔ بظاہر اعمال میں کمزور لیکن غیرت وحمیت سے معمور افراد کو ہمیشہ ایسے لوگوں پر ترجیح دیتے تھے، جو اعمال کے تو بڑے پابند ہوں لیکن دیانت وامانت اور غیرت وحمیت میں ناقص ہوں۔

ایمانیات کے بعد آپ کی ترجیح معاملات کی اصلاح پر ہوتی تھی، معاملات میں معمولی کوتاہی برداشت نہیں فرماتے تھے۔ جھوٹ، بددیانتی، بے وفائی آپ کی لغت سے خارج چیزیں تھیں، اپنے متعلقین کو بھی اس کی خاص تاکید فرمایا کرتے تھے، کہ معاملات ہمیشہ صاف رکھنے چاہئیں۔

کشف وکرامات وغیرہ چیزوں کے افشا کو پسند نہیں کرتے تھے اور فرماتے کہ یہ ولایت کے لیے ضروری نہیں، ایک بار ہمارے ایک دوست ڈاکٹر قیوم خان صاحب آپ کو ایک کشف وتصرف والے شیخ کے پاس لے گئے، وہاں ڈاکٹر صاحب کو ان بزرگوں نے کمرے سے نکال دیا۔ بعد میں ڈاکٹر صاحب نے والد صاحب سے پوچھا کہ حضرت یہ کیسے آدمی ہے؟ والد صاحب نے فرمایا کہ اچھے آدمی ہیں، بس بے چارے کرامات کا افشا کرتے ہیں۔ والد صاحب کی شہادت کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ان بزرگوں سے یہ بات نقل کی کہ استاذ صاحب نے یہ فرمایا تھا۔ انہوں نے کہا کہ بھئی یہ کیا کرامت ہے کہ میں نے پنکھے کو کہا کہ چلو تو وہ چل پڑا اور کرسی کو اشارہ کیا کہ آجاؤ تو وہ قریب آگئی۔ اس پر میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ والد صاحب نے بھی یہ واقعہ مجھے سنایا تھا اور ساتھ یہ بھی فرمایا تھا کہ جب وہ بزرگ اس طرح تصرفات کرتے رہے تو میں نے کافی غور کیا وہاں کمرے میں ایک اینٹ رکھی تھی، میں نے کہا کہ اسے اٹھائیں، انہوں نے اٹھائی تو وہ مکمل سونا ہوگئی، اس پر وہ دھک رہ گئے۔ پھر میں نے عرض کیا کہ یہ کشف وکرامات اور تصرفات ایسی چیزیں نہیں کہ ان کو یوں نمائشی انداز میں پیش کیا جائے اور نہ ہی یہ کوئی بزرگی یا ولایت کی علامت ہے، یہ تصرفات تو بغیر ایمان کے بھی لوگ کرسکتے ہیں۔

آپ شیخ کامل کی ایک علامت یہ بتلایا کرتے تھے کہ جو تمام دینی شعبوں کے ساتھ مخلص ہو، ان کا تعاون یا کم از

کم ان کے لیے دعا کرے اور گناہ گاروں پر شفقت کرے۔ بندہ نے والد گرامی میں چشم پوشی، پردہ پوشی اور گناہ گاروں پر شفقت کا خوب نظارہ کیا ہے۔ ایک دفعہ ادارہ سے متعلق ایک شخص کے بارے میں بندہ نے کسی کوتاہی کی نشاندہی کی، تو ڈانٹ کر فرمایا کہ آپ نے خود کو بھی گناہگار کیا اور مجھے بھی گناہ میں ملوث کیا۔ اس شخص کی یہ کوتاہی مجھے عرصہ سے معلوم ہے اور ان کو اس طریقے سے سمجھایا بھی ہے کہ انہیں علم نہ ہو کہ میں آگاہ ہوں۔ کئی بار ان کے لئے دعا بھی کر چکا ہوں۔ بیٹا! مؤمن کی پردہ پوشی کرنی چاہیے، گناہ سے تو حد درجہ نفرت ہونی چاہیے لیکن گناہگار سے نہیں۔ ہم سے یہی مطلوب ہے، اس کے برعکس اکثر لوگ گناہ سے تو نفرت نہیں کرتے لیکن گناہگار کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، پھر خود بھی اس گناہ میں ملوث ہوتے ہیں۔

آپ بیعت میں عجلت کو پسند نہیں کرتے تھے، بلکہ فرماتے کہ محقق و متبع سنت شیخ کی ایسی تحقیق سے تلاش کرنی چاہیے، جیسے بندہ اپنے بچے یا بچی کے رشتے کے لیے تحقیق کرتا ہے۔ ایک دفعہ بندہ کا ایک ساتھی مانسہرہ سے حضرت کے ساتھ اصلاحی تعلق قائم کرنے کی غرض سے آیا۔ رات کو میں نے اس کا مدعا حضرت سے بیان کیا۔ ان کے ساتھ جو قیمتی گفتگو ہوئی وہ پیش خدمت ہے:

> ''حضرت نے ان سے پوچھا کہ آج کل کہاں ہیں؟ بتایا کہ کراچی میں دارالعلوم کورنگی کے قریب ایک مسجد میں امامت کرتا ہوں۔ استاذ صاحب نے فرمایا کہ آج کل لوگوں نے تصوف وسلوک سے گپ شپ بنادی ہے، صرف رسمی طور پر ہاتھ میں ہاتھ دے دیتے ہیں، نہ مرید کو کچھ کرنا پڑتا ہے، نہ کرنے کا ارادہ ہوتا ہے اور معمولی اعمال یا استعداد پر خلافتیں تک دے دی جاتی ہیں۔ پہلے زمانے میں مرشد کے لئے رشتہ تلاش کرنے کے برابر جستجو ہوتی تھی۔ میں نے مولانا غورغشتویؒ کی وفات کے بعد علامہ بنوری صاحبؒ سے بیعت کی درخواست کی تو حضرت نے پچاس ہزار مرتبہ درود شریف، پچاس ہزار مرتبہ استغفار اور ہر جمعرات کو استخارہ کا حکم دیا، میں نے استخارہ کیا تو خواب دیکھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا لعاب دہن منہ میں دے دیا۔ جب یہ خواب حضرت کو سنایا تو اس کے بعد بیعت فرمایا۔ علامہ بنوریؒ کی وفات کے بعد تلاش شیخ میں کافی پریشانی اٹھائی۔ کافی سوچ بچار اور اساتذہ سے طویل مشوروں کے بعد ایک بزرگ کے بارے اطمینان قلب ہوا، جب ان کے پاس حاضری دی تو انہوں نے ایک مہینے میں ایک لاکھ ستائیس مرتبہ استغفار کا فرمایا اور ساتھ ہی استخارہ کی تلقین بھی کی۔ پھر خود بیعت نہیں فرمایا بلکہ استخارہ کی روشنی میں ایک دوسری جگہ رہنمائی کی۔ بہرحال پہلے زمانے میں بیعت ہونے کے لیے سخت مجاہدات کرنے پڑتے تھے، تب جا کر کہیں اللہ والوں کے قدموں میں بیٹھنا نصیب ہوتا تھا، پھر مسلسل صحبت میں جانا ہوتا تھا، آج کل پیر حضرات اپنے

مریدوں کے ہاں جاتے ہیں، مرید کو زیادہ زحمت نہیں کرنی پڑتی، لوگوں کو مختلف حیلے بہانوں سے بیعت کے لیے راغب کیا جاتا ہے، مشائخ میں استغنا نہیں رہا اور سالکین میں طلب۔ حالانکہ شیخ کامل تو اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کے احساس سے ہر وقت ایسا سہا ہوتا ہے کہ وہ کہاں خود سے بیعت ہونے کی دعوت دے سکتا ہے۔

دوسری اہم بات یہ کہ ہمارے اکابر صوفیا کے ہاں خدا پرستی کی دولت ہوتی تھی، آج کل ہمارے ہاں پیر پرستی ہے، وہ حضرات سنت کی طرف متوجہ کرتے تھے، اب اپنے جیسی ٹوپی، اپنے جیسی پگڑی اور کرتے کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے، تاکہ مستقل پہچان رہے کہ یہ فلاں بزرگ کا مرید ہے۔

بہر حال آپ استخارہ کریں، میں تو اکثر ساتھیوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ مرشد کے بارے میں خوب معلومات حاصل کیا کریں کہ یہ بہت حساس مسئلہ ہے۔ خاص کر اس بات کی تحقیق ضروری ہے کہ شیخ متبع سنت ہیں یا نہیں؟ مرشد کے لیے متبع سنت وشریعت ہونا از حد ضروری ہے۔ دوسری بات ان سے طبعی مناسبت بھی ضروری چیز ہے، تیسری بات قرب مکانی بھی ضروری ہے، تاکہ صحبت کا موقعہ زیادہ سے زیادہ میسر ہو، میں اپنے علاقے والوں کو یہاں کے قریبی مشائخ کا مشورہ دیتا ہوں۔ آپ کے لئے مناسب تو دار العلوم کراچی کے کسی بڑے استاذ سے بیعت کرنا ہے کہ وہ آپ کے قریب ہیں، یا کراچی میں ہمارے ایک ساتھی مولانا محمد یوسف افشانی صاحب کے بارے میں سنا ہے کہ وہ بھی بیعت کرواتے ہیں، ان کی طرف رجوع کریں۔

صبح ناشتے پر والد صاحب نے فرمایا کہ بیعت کے بارے میں استخارہ کرتے رہو، میں دلائل الخیرات اور حزب الاعظم کی اجازت دوں گا۔ استخارہ کے بعد جس کے بارے میں اطمینان ہو جائے، وہاں بیعت ہو جائیں۔''

والد گرامی کسی کو بیعت نہیں کیا کرتے تھے، جو درخواست کرتا تو جواب میں اپنے بارے میں ایسے کلمات ارشاد فرماتے کہ درخواست کرنے والا نادم ہو جاتا کہ یہ کیا غلطی کی ہے۔ فرماتے کہ مشیخت کے نازک منصب کے تقاضے مجھ سے پورے نہیں ہو سکتے، میں اس کا اہل نہیں ہوں؛ لیکن بعد میں ہمیں علم ہوا کہ ایسے شخص کو بیعت فرما لیتے جس کے بارے خواب میں دربار رسالت سے سفارش ہوتی۔ اس پر ایک دو واقعات پیش کرتا ہوں:

ایک مرتبہ ایک شخص بیعت ہونے کی غرض سے آیا اور یہ کہا کہ مجھے خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بشارت ہوئی کہ آپ جا کر مولانا محمد امین صاحب سے بیعت ہو جائیں، والد صاحب نے اسے کوئی توجہ نہیں دی، وہ تین دن تک مدرسہ میں رہا، تیسرے دن والد صاحب نے مجھے بلا کر فرمایا کہ فلاں بندہ جو آیا ہے، اس کو رخصت کر دو، میں جا کر ان کو حکمت سے رخصت کرنا چاہا، مگر اس نے اپنا وہ خواب مجھے بھی سنایا۔ میں نے والد صاحب سے سفارش کے انداز میں کچھ عرض کرنا چاہا تو غصہ کی حالت میں میری بات کاٹ کر فرمایا کہ ان کو کہہ دو کہ چلے جائیں،

جھوٹ کیوں بولتا ہے؟ جب بھی کسی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں یہاں آنے کا حکم دیتے ہیں تو مجھے اس سے پہلے خواب میں بتا دیا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں مجھے کوئی اشارہ نہیں ملا۔ اسے صاف بتادو کہ اس جھوٹے خواب کی وجہ کہیں ارتداد کا شکار نہ ہو جائے، اسے توبہ اور استغفار کرنا چاہیے۔

اسی طرح بریلوی مسلک کے ایک آدمی کو پنڈی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی، اسے علماء دیوبند کے بارے میں کچھ اعتراضات تھے، اسے ہدایت کی گئی کہ آپ ہنگو مولانا امین صاحب کے پاس جائیں۔ وہ مولانا عدنان کاکاخیل مدظلہ کے ذریعے والد صاحب تک پہنچا۔ والد صاحب نے اس کا مثالی اکرام کیا، اسے 'روضہ پاک کی مٹی کو بیر زمزم اور بیر شفا کے پانی میں گوندھ کر بنائے گئے' کٹورے میں زمزم پلایا۔ یہ مٹی کا برتن حضرت بڑے احتیاط سے سنبھال کر رکھتے، غالباً یہ آپ کو اپنے استاذ مولانا فضل محمد سواتیؒ کی طرف سے ملا تھا، ان کے پاس روضہ پاک کی مٹی تھی، جو انہیں حضرت مدنیؒ نے دی تھی اور بوقت وفات انہوں نے اسے کفن اور ہونٹوں پر لگانے کی وصیت کی تھی۔ والد گرامی خود تو اس برتن کو استعمال نہیں کرتے تھے، بلکہ ہاتھ میں لیتے ہی حالت غیر ہو جاتی لیکن ان صاحب کو اسی میں پانی پلایا، ہم اس پر بڑے حیران تھے کیونکہ ہمیں تو واقعی صورت حال کا علم بعد میں ہوا، وہ تین دن ہمارے ہاں رہے۔ والد صاحب نے مجھے بلایا کہ اسے سیر و تفریح کے لیے ہمارے آبائی گاؤں شکر تنگی لے جاؤ، اور وہاں خصوصی اکرام کے بارے میں فرمایا۔ آخر میں اپنے وہ خاص الفاظ دہرانے کہ گناہ سے نفرت اور گناہ گار سے محبت اسلامی تعلیمات میں سے ہے۔ فرمایا: یہ اصلاً بریلوی نہیں، بے چارہ غلط فہمی کا شکار ہے، اور اسے ان غلط فہمیوں کے اصلاح کے لیے بھجوایا گیا ہے۔ یہ کہہ کر حضرت پر سکتہ طاری ہوا۔ بندہ نے عرض کیا کہ جی! کس نے بھجوایا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم اپنے عقیدے کی اصلاح کے لئے میرے بیٹے محمد امین کے پاس جاؤ۔ اس وجہ سے ان کی اچھی طرح مہمان نوازی کرو۔ میں نے ان صاحب کی زبان سے کئی بار سنا کہ کاش مولانا صاحب اتنی گمنامی اختیار نہ کرتے۔ ماشاء اللہ حضرت صحیح عقائد و اعمال کتابوں سے نہیں بلکہ اپنے عمل سے بتاتے ہیں۔ ان صاحب کے ساتھ والد گرامی کے رویے اور معاملے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کے بارے میں والد صاحب کو بھی تاکید کی گئی تھی۔

حضرت والد گرامی کے ساتھ جن احباب کا اصلاحی تعلق رہا ہے وہ اس سے واقف ہیں کہ آپ سالک کو اذکار دینے میں سلاسل کے مروجہ اسباق کے علاوہ اس کے خاص مزاج کا بھی لحاظ رکھتے، ایک ساتھی پر توحید و سنت کے مزاج کا غلبہ تھا تو حضرت نے ان کو سارے وہ اذکار تعلیم فرمائے تھے، جو صحیح احادیث میں وارد ہیں، اور 'شغل' کے بغیر بتلائے تھے کیونکہ 'شغل' صوفیائے کرام میں تجرباتی چیز رہی ہے۔

والد گرامی مسنون دعاؤں کا خود بھی انتہائی اہتمام کرتے تھے اور تمام متعلقین کو الحزب الاعظم کی اجازت دے کر پڑھنے کی تلقین فرماتے تھے، خود حزب' چھپوانے کا بھی اہتمام کیا اور وسیع پیانے پر اسے تقسیم کرایا۔ جب مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ نے الحزب الاعظم کی معیاری طباعت کا عزم کیا، تو اس پر مندرجہ ذیل کلمات کی تقریظ رقم فرمائی، جس سے 'دعا' کے ساتھ آپ کے والہانہ لگاؤ اور مسنون ادعیہ کی اشاعت میں دلچسپی کا بخوبی اظہار ہوتا ہے، آپ لکھتے ہیں:

''تمام مسلمانوں کے نزدیک یہ مسلمات میں سے ہے، کہ انسان کا مقصد تخلیق یہ ہے کہ وہ حق تعالی کا بندہ بن کر اس کی بندگی کرتا رہے، اس لئے انسان کے ارتقائی مقامات میں سب سے ارفع مقام' عبدیت' قرار پایا اور اس کا اہم ترین وظیفہ' عبادت' ٹھہرا یعنی اپنے آپ کو مخلوق، مملوک، محکوم اور محتاج سمجھ کر اپنے خالق ومالک، بااختیار، باجبروت حاکم کے سامنے انتہائی تذلل ورغبت کی ساتھ اس کی رضا جوئی، تشکر کے لیے اس کے تمام احکام کی تعمیل کی کوشش کرے، نوع انسانی میں عبادت وعبدیت میں سب سے اعلی وارفع مقام افضل الکائنات حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کو نصیب ہوا اور حضرت اقدس کی سیرت طیبہ میں نمایاں مقام آپ کی اذکار و دعوات کا نظر آتا ہے جس میں وہ ہمہ وقت مصروف رہے۔

دعا کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو تمام کائنات کے وجود وبقا اور اسباب بقا میں بے بس ومحتاج جان کر قادر مطلق، مختار کل، سب کے پالنہار، مالک الملک کے سامنے انتہائی ادب وتضرع کی ساتھ اپنی حاجت برآری کی درخواست کرے، اپنی لاچاری وعجز وفقر اور حق تعالی کی مالکیت تامہ، قدرت کاملہ کو وسیلہ بنائے۔ دعا جب ایسی ہو تو اس میں حق تعالی کی صفات کمال وجود، حیات، علم، قدرت، ارادہ واختیار، جود ورحمت وغیرھا کا اور مخلوق کی بے چارگی واحتیاج وغیرہ اوصاف کا نہ صرف اعتقاد ہوتا ہے بلکہ اس کا استحضار بھی ہوتا ہے جو کہ ایمانیات کی جان ہے، اس لیے دعا ایمانیات کے استحکام کا ایک قوی الاثر ذریعہ ہے، پھر مکارم اخلاق کے زمرہ میں سب سے پسندیدہ خلق عبدیت وتواضع ہے، اخلاق ذمیمہ میں ناپسندیدہ وصف تکبر وتعلی ہے، دعا جب حقیقی ہو تو وہ تواضع کے حصول اور تکبر کے دفعیہ کا انتہائی مؤثر طریقہ ہے، دعا ذکر اللہ کی ایک عمدہ صورت ہے، استغفار، استغاثہ، حوقلہ وحسبلہ، صلاۃ وسلام وغیرہا دعا ہی کی شعبے ہیں، جن کے فضائل وفوائد محتاج بیان نہیں، حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تحقیق کے مطابق شریعت اسلامیہ کے مقاصد اربعہ میں دوسرا درجہ اخبات کا ہے جو کہ ذکر وتلاوت کی طرح دعا کے ذریعہ بدرجہ اتم حاصل ہوتا ہے اور حضرت شاہ صاحبؒ کے فرمان کے مطابق اذکار اور ادعیہ مسنونہ کا اہتمام حصول نسبت کا بہترین وسیلہ ہے، جو سلوک وتصوف کا منتہی ہے۔ دعا معرفت الہیہ اور عرفان نفس کا دروازہ ہے۔ الغرض حق یہ ہے کہ دعا تمام عبادات کی

جان وجو ہر ہے، شاید اسی لئے قرآن حکیم نے کئی جگہ عبادت کیلئے دعا کی تعبیر کو اختیار فرمایا اور اس کا فاتحہ وخاتمہ بھی دعا سے ہوا، اسلام کے رکن اعظم نماز کا نام بھی "صلاۃ" رکھا گیا اور حق جل شانہ نے جلال وجمال کی ملے جلے انداز میں تمام انسانوں کو مخاطب فرمایا !"وقال ربكم ادعوني استجب لكم ان الذين يستكبرون عن عبادتي سيدخلون جهنم داخرين "حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے "الدعاهو العبادة" فرما کر بطور سند یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی، اور "الدعاء مخ العبادة" "الدعاء سلاح المؤمن" اور "من فتحت له منكم باب الدعاء فتحت له ابواب الرحمة" جیسی ارشادات کا ہر اس میں دکھائی دیتا ہے، دعا کی اسی اہمیت کی وجہ سے حق تعالی نے اپنی کتاب میں خود بھی دعائیہ کلمات تعلیم فرمائے اور اپنے محبوبین کے قلوب میں اوران کی مبارک زبانوں پر جن اُدعیہ کا القاواجرا فرما چکے تھے ان کا بھی موقع بموقع ذکر فرمایا ۔محبوبان درقدس میں جوامع الکلم کے تاجدار صلی اللہ علیہ وسلم کو جوامع الدعوات سے نوازا گیا اور اس میں تو کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں، کہ دعا کیلئے سب سے اکمل اور سب سے افضل تعبیر وہی ہوسکتی ہے، جو حق تعالی نے خود پسند فرمائی، اس لیے ہمارے بیشتر علماء سلف وخلف نے ماثور ادعیہ واذکار کیلئے اپنی تالیفات میں مستقل ابواب قائم کیے۔ جوامع وسنن کی کوئی کتاب اس باب سے خالی نہیں اور مسانید ومعاجم میں اس سلسلہ کی احادیث کا بڑا ذخیرہ پایا جاتا ہے بلکہ بہت سے افاضل محدثین واہل علم نے اس موضوع پر چھوٹی بڑی درجنوں مستقل کتابیں لکھیں۔" کتاب الدعاء" کی نام سے :ابن فضیل ۱۹۵ھ، ابو داؤد سجستانی ۲۷۵ھ، ابن أبي الدنيا ۲۸۱ھ، ابن أبي عاصم ۲۸۷ھ، ابن فطیس ۳۱۹ھ، امام طبرانی ۳۶۰ھ، ابن ابی زید قیروانی ۳۸۹ھ، امام ابو ذر هروي ۴۳۴ھ کی کتاب اور "عمل اليوم والليلة" نامی امام نسائی ۳۰۳ھ، ابن السنی ۳۶۴ھ، علی بن حسن المعري ۲۹۵ھ، ابو نعيم اصفهانی ۴۳۰ھ، عبد العظیم منذري ۶۵۶ھ کی تالیفات اور انواع الاستعاذات ،لابن المناري ۳۳۴ھ كتاب الادعية لابن مردويه ۴۱۰ھ ،كتاب الدعوات للمستغفري ۴۳۲ھ، الدعوات الكبير للبيهقي ۴۵۸ھ، دعوات المستغفرين لابی حفص النسفي ۵۳۷ھ، الدعوات النبوية للسمعاني ۵۶۲ھ، الكلم الطيب لابن تيمية ۷۲۸ھ ،الدعوات والاذكار لابی القاسم الغرناطي ۷۴۱ھ، الدعوة المستجابة للقاضی شهاب العدوي ۷۴۹ھ، الحصن الحصين لابن الجزري ۸۳۳ھ، الدعوات المأثور للفخر الرومی ۸۶۴ھ، اور القول المختار للسيوطي ۹۱۱ھ ،وغیرہ مؤلفات اسی مبارک سلسلہ کی نمایاں کڑیاں ہیں اور گیارہویں صدی کے مایہ ناز محقق ومجدد حضرت علامہ علی قاری ہروی ۱۰۱۴ھ کی نفیس اور جامع تصنیف الحزب الاعظم اس کا مسک الختام ہے، جسے حق تعالی نے قبولیت عامہ سے نوازا اور اکثر مشائخ کا معمول ہے۔ ہمارے شیخ اکبر محدث العصر حضرت بنوریؒ بھی اس کی اجازت مرحمت فرماتے تھے، آج کے پرفتن وظلمانی مادیت زدہ دور میں جب کہ متبع سنت مرشدین

وشیوخ کا وجود عنقا بنتا جا رہا ہے، اس قسم کی اوراد کا اہتمام اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔ احادیث میں وارد مواقع پر ان اذکار وادعیہ کا پڑھنا تو نورعلیٰ نور ہے، ہم جیسے کوتاہ ہمت اگر ان مجموعوں کا وردا پنالیں، تو یہ بھی سعادت کبریٰ ہے، بشرطیکہ دعا کی حقیقت سامنے ہو، ماثور الفاظ کا صحیح تلفظ ہو، دل میں ان کی معانی کا استحضار ہو منجیات کے ذکر کے ساتھ انہیں اپنانے کا اور مہلکات کے ذکر کے وقت ان سے بچنے کا عزم اور سعی ہو، رجاء و خوف کی کیفیت حاوی ہو، دعا کی شروط کا التزام اور آداب کا اہتمام ہو، دعا کو قضا کا حصہ جان کر تسلیم ورضا کے جذبہ کے ساتھ ہو۔ حق تعالیٰ ہمیں اس عظیم نعمت سے نوازے، حرمان سے بچائے۔"

دعا کے ساتھ ساتھ والد گرامی درود پاک کے عاشق تھے، یومیہ پانچ ہزار بار درود پاک پڑھنے کا معمول تھا، آپ الحزب الاعظم کی طرح درود شریف کے صیغ پر مشتمل 'دلائل الخیرات' کا بھی یومیہ بچپن ہی سے ورد رکھتے تھے۔ اور ہر متمنی کو بڑی بشاشت سے اس کی اجازت مرحمت فرماتے تھے، دلائل الخیرات بھی آپ نے کثیر تعداد میں چھپوا کر تقسیم فرمائی، فرماتے تھے کہ مجھے اور حضرت مولانا حبیب اللہ مختار شہیدؒ کو حضرت بنوریؒ نے بڑے شوق سے دلائل الخیرات اور الحزب الاعظم کی اجازت عنایت فرمائی تھی، اور فرمایا تھا کہ میں آپ دونوں کو بھی اجازت دیتا ہوں اور ان کو بھی جن کو آپ دونوں اجازت دیں۔ مولانا مختار شہید دنیا سے رخصت ہو گئے، اور میں اکیلا رہ گیا، میری کوشش ہے کہ حضرت بنوریؒ کے اس فیض کو زیادہ سے زیادہ عام کروں۔ دلائل الخیرات پڑھنے میں آپ کا ایک خاص طریقہ وذوق تھا جو آپ کو اپنے مشائخ سے ورثہ میں ملا تھا، اپنے سلسلہ دلائل اور اس کے طریق ورد کے بارے میں لکھتے ہیں:

حضرت مولانا افضل محمد صاحبؒ کو دلائل شریف کی اجازت اپنے مرشد کامل حضرت مولانا محمد قمر صاحبؒ جورہ شریف سے حاصل تھی جو کہ اپنے باطنی کمال کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ تھے اور کامل درجے کے متبع سنت شیخ طریقت تھے جن کے مزار سے بعد از دفن دور تک خوشبو پھیلتی رہی اور جن سے دلائل شریف کی اجازت لینے کے لئے حجاز مقدس سے بعض شیوخ اس لئے حاضر ہوئے کہ انہیں منامی ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بتلایا گیا کہ ان کے پڑھنے کا طریقہ سب سے بہتر ہے، حضرت مولانا محمد قمرؒ کو دلائل شریف کی اجازت اپنے مرشد مکرم آفتاب معرفت اشدفی امراللہ حضرت مولانا ولی احمد صاحب المعروف بہ سنڈاکی باباجیؒ سے حاصل تھی جو کہ مجاہد فی سبیل اللہ ولی کامل معروف بہ اڈے ملا صاحبؒ کے خلیفہ اور قطب وقت تھے اور دلائل میں آپ شیخ الدلائل حضرت مولانا عبد الحق صاحبؒ کے مجاز تھے اور حضرت شیخ عبد الحقؒ سے لے کر مؤلف امام تک سلسلہ سند یہ ہے: الشیخ عبدالحق عن الشیخ علی بن یوسف الباشلی المدنی عن الشیخ احمد بن محمد المدغری عن الشیخ محمد بن احمد المنی عن الشیخ احمد بن الحاج عن الشیخ احمد

المقری عن الشیخ عبدالقادر الفاسی عن الشیخ احمد بن ابی العباس عن الشیخ السملالی عن الشیخ عبدالعزیز الدباغ عن الشیخ الامام المؤلف محمد بن سلیمن الجزولی الشاذلی رحمھم اللہ تعالی۔

چند ضروری ہدایات

۱...... دلائل شریف کا ورد کرنے میں وہی نیت ہو جو کہ دعاء النیۃ میں مذکور ہے صرف کتاب کی تلاوت مقصد نہ بنائیں بلکہ مقصد تو درود شریف ہو یہ کتاب اس کے لئے ذریعہ سمجھیں۔

۲...... درود شریف کی فضیلت میں قرآن حکیم اور صحیح احادیث میں وارد نصوص پیش نظر رکھیں، پڑھتے وقت اخلاص وادب کے ساتھ ان فضائل کا شعور واحساس بے حد مفید ہے۔

۳ دلائل کا ورد دوسرے اکابر کے ساتھ ساتھ ہمارے دیوبند مشائخ کا معمول رہا ہے بلکہ شیخ الطائفۃ حضرت حاجی امداداللہ صاحبؒ مہاجر مکی کے بارے میں معروف ہے کہ آپ سفر وحضر میں تین کتابیں ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے، قرآن مجید، مثنوی شریف اور دلائل الخیرات اور حضرت مولانا بنوریؒ فرمایا کرتے تھے کہ اس کا ورد ایک کامل متبع سنت مرشد کے ہاتھ پر بیعت کا کام دیتا ہے حضرت والا کے اس ارشاد کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ صحیح حدیث میں وارد ہے: "من صلی علی مرۃ صلی اللہ علیہ عشراً" وفی روایۃ عند الدارمی "صلی اللہ وملائکتہ علیہ سبعین مرۃ" اور قرآن حکیم میں ہے: "ھو الذی یصلی علیکم وملائکتہ لیخرجکم من الظلمات الی النور" اور ارشاد ہے: "اللہ ولی الذین آمنوا یخرجھم من الظلمات" بمقتضائے حدیث درود شریف پڑھنے والے پر حق تعالی اور فرشتوں کی طرف سے صلوۃ کا نزول ہوتا ہے، قرآن حکیم نے بتلایا کہ جس پر حق تعالی، فرشتوں کی طرف سے صلاۃ کا نزول ہوتا ہے وہ ہر قسم کے ظلمت شرک، ظلمت کفر، ظلمت فسق، ظلمت شک ونفاق اور ظلمت غفلت وغیرہ سے نکل کر نور ایمان، نور توحید، نور اخلاص، نور طاعت اور نور ذکر میں داخل کرایا جاتا ہے اور یہی صحیح شرعی بیعت کا مقصد ہے۔

۴ کوئی بھی ذکر ہو اس پر مداومت بہت مفید ہوتی ہے خصوصاً درود شریف کا ورد پابندی کے ساتھ کیا جائے ناغہ کی صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اقدس کی پریشانی کا احتمال ہے (والعیاذ باللہ) اور حدیث میں آیا ہے کہ درود وسلام پڑھتے وقت حضور محبوب کبریا کی روح طیب واقدس پڑھنے والے کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور شرف جواب سے سرفراز فرماتی ہے، یہ نعمت عظمی جس کے مقابلے میں ایک عاشق کی نظر میں ہفت اقلیم تو کیا ہشت بہشت بھی ہیچ ہیں چھوٹ جانا اور معدن مروت وکرم بالمؤمنین رؤف رحیم آقا کو اپنے جس حقیر ہدیہ کا عادی بنایا تھا اس کے پیش کرنے میں کوتاہی کرنا نگاہ عشق وقانون محبت میں کتنا خسارہ ہے اور کتنا جرم، بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے۔

۵...... کتاب میں جہاں کسی پیغمبر یا فرشتہ یا صحابی یا مقدس شخصیات کا ذکر آئے تو قاری اس سے پہلے سیدنا اور

اگر مستورات میں سے ہو تو سیدتنا کا اضافہ کرے۔

۶ ... اس سلسلہ کے مطابق ورد کرنے والے حضرات پہلے کسی ایسے صاحب کو یہ کتاب سنائیں یا ان سے سن لیں جو اسی طریقہ میں مجاز ورد کرنے والا ہو۔

۷ ...... دلائل الخیرات کے بعض الفاظ میں کچھ احباب کو شاید تردد ہو اس لئے چند وضاحتی جملے عرض خدمت ہیں:

(الف) اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں رحمت یا غیاث یا کاشف الکرب قسم کے الفاظ جو آئے ہیں اگر خلجان ہو تو ان کو حضرت کی دنیا میں حیات طیبہ اور حشر میں آنے والی حالت پر حمل کریں۔

(ب) "ونور اعلی نورہ الذی منہ خلقتہ" کو عالم ارواح میں خلق پر حمل کیجئے عالم ناسوت میں خلق مراد نہ لیں یا اس کا تعلق خلق روح سے جوڑ دیں جسم اطہر سے نہیں۔

(ج) خطاب ندا کا ذکر جہاں ہو رہا ہو وہاں یہ تصور کیجئے کہ میری آواز فرشتے خدمت اقدس میں پہنچا رہے ہیں یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ذہن میں اپنے تصور میں لا کر خطاب کریں یا اپنے آپ کو روضہ اقدس پر ذہنا حاضر تصور کر کے پڑھیں اور وہاں تو جمہور اہل سنت کے نزدیک سماع مسلم ہے۔

(د) توسل کا ذکر جہاں آیا ہے تو یہ جمہور اہل علم کے متفقہ مسلک کے مطابق ہے اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ بھی تاویل کے ساتھ توسل بالذوات کے جواز کے قائل ہیں۔" کما ھو مصرح فی کتابہ اقتضاء الصراط المستقیم"

(ھ) حتی لا یبقی من الرحمۃ شیٔ وغیرہ میں صفات خداوندی کی محدودیت کا جو شبہ پیدا ہوتا ہے اس کے کئی جواب ہیں: اولاً: یہ الفاظ ماثور ہیں سمجھ میں نہ آئیں تو متشابہات میں سے سمجھیں۔ ثانیاً: ان الفاظ سے حقیقی معنی مراد نہیں بلکہ یہ کنایہ ہیں، کثرت سے جیسا سبعین وغیرہ محدود عدد کے الفاظ کثرت سے کنایہ کے لئے آتے ہیں۔ ثالثاً: رحمت، برکت، سلام وغیرہ صفات کے افراد تو لامتناہی ہیں لیکن انواع متناہی ہیں، یہاں تناہی انواع مراد ہے نہ کہ تناہی افراد اور پھر بھی اگر خلجان ہے تو ہمارے بعض مشائخ نے اس کے بجائے متبادل غیر موہم الفاظ استعمال فرمائے ہیں وہ استعمال کریں۔

سلاسل تصوف کے اذکار کی بھی تلقین فرماتے اور خود بھی زندگی بھر ان کا اہتمام رہا، شروع میں خفیف جہر کے ساتھ ذکر کرتے، لیکن پھر سری ذکر پر ہی عمر بھر عمل رہا، ذکر خواہ سری ہو یا جہری انفراداً کو ترجیح دیتے اور اجتماعی مجالس کے بارے میں کبھی تلقین کے کلمات نہیں سنے۔ کیفیت ذکر کے متعلق ایک سائل کے جواب میں لکھتے ہیں:

"ذکر ایک اہم ترین عبادت بلکہ عبادات کی جان ہے، اس لئے شریعت نے کسی نہ کسی صورت ہر حال میں اس

کی اجازت دی ہے، سر اور جہر اس کی کیفیات ہیں، نصوص شرعیہ میں دونوں وارد ہیں جہاں جو کیفیت منصوص ہے وہاں تو اس کے خلاف کرنا ناجائز ہے اور جہاں کوئی کیفیت منصوص نہ ہو وہاں دونوں جائز ہیں بشرطیکہ موانع نہ ہوں۔ مثلاً: بطور ریاء وسمعہ نہ ہو، کسی نائم ومصلی وغیرہ کو اذیت نہ پہنچائے، کیفیت کو قربت مقصودہ نہ سمجھے، تارک پر نکیر نہ کرے، جہر میں افراط نہ ہو، جائز ہونے کے باوجود افضل کون سا ہے؟ اس میں اہل علم کا اختلاف ہے بعض نے سر کو افضل کہا بعض نے جہر کو، یہ اختلاف اذواق اور ملاحظ کے اختلاف کا نتیجہ ہے۔

فقیر کا میلان بھی سر کے افضل ہونے کی طرف ہے۔ سوال میں جن اکابر کے اسماء گرامی مذکور ہیں ان کا اور ان جیسے دیگر محققین کا یہی مسلک رہا جیسا کہ حجۃ اللہ البالغۃ، فتاوی رشیدیہ: ص/ ۱۹۳، امداد الفتاوی: ج/ ۵، ص/ ۱۵۱ تا ۱۵۵، فتاوی دار العلوم دیوبند: ج/ ۲، ص/ ۲۴۸ تا ۲۵۳، کفایۃ المفتی: ۲/ ۴۸، خیر الفتاوی: ج ۱ ص/ ۳۴۹ تا ۳۵۰، فیض الباری: ج/ ۴، ص/ ۱۳۴، فتاوی خلیلیہ: ص/ ۲۷ ۳۲۹ تا ۳۲۹، انفاس رحیمیہ: ص/ ۳۹ وغیرہا سے ظاہر ہے۔

مندرجہ بالا تفصیل وشروط کے ساتھ جہر کو بدعت یا حرام کہہ دینا جہالت ہے، کہنے والا خود غالی مفسد اور بدعتی ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالی یا دیگر اہل علم نے ایسے ذکر کے جہر کو مکروہ وبدعت قرار دیا ہے جو صاحب شریعت سے بلا جہر ثابت ہو یعنی کسی موقعہ پر ذکر تو منقول ہو اور جہر منقول نہ ہو تو ایسے موقع پر جہر کو مکروہ فرمایا گیا ہے جب کہ صاحبینؒ اور دوسرے ائمہ کرام ایسے موقع پر بھی جہر کو جائز بلا کراہت کہتے ہیں اور مفتی بہ بھی حنفیہ کے نزدیک یہی قول ہے۔

ذات رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستگی

والد گرامی کی ذات رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستگی کا اندازہ تو درود شریف کے ساتھ والہانہ عشق سے ہی ہوجاتا ہے، کثرت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت ہوتی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر مصائب و تکالیف کا تذکرہ آتا، تو آنکھیں بھیگ جاتیں اور زار وقطار روتے، طویل عرصے تک درجہ اعدادیہ میں سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم خود پڑھاتے تھے۔ ہمارے ایک رشتہ دار ۱۹۸۳ء میں والد گرامی کے ساتھ حج میں شریک تھے، فرمایا کہ حضرت مدینہ طیبہ کی گلیوں میں جوتے اتار کر ننگے پاؤں چلتے تھے، کہ ان مقامات پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قدوم مبارک پڑے ہیں۔

حرمین کے قیام کے دوران انتہائی کم یعنی قوت لایموت کے بقدر کھاتے، روزہ وفاقہ کا اکثری معمول تھا، پانی کم پیتے اور وجہ یہ بتلاتے کہ اس ارض مقدس میں قضائے حاجت پر بڑی کوفت ہوتی ہے، انسانی بساط تک پوری کوشش کرتا ہوں کہ اس ناگوار ضرورت کا سامنا کم سے کم ہو، اس بشری ضرورت کی وجہ سے طبیعت پر ناگواری اور ملال کے

اثرات واضح دکھائی دیتے۔

ایک بار ایک شخص نے والد گرامی کے بارے میں سخت نازیبا کلمات کہے، ہم خاندان کے چند نوجوان انہیں تنبیہ کرنے کے ارادے سے جمع ہوئے، نامعلوم حضرت کو کیسے علم ہوا، تشریف لائے اور جمع ہونے کا مقصد دریافت کیا، ہم نے بات چھپانی چاہی تو فرمایا: آپس کا اکٹھ بہت اچھا ہے بشرطیکہ خیر اور نیک مقاصد کے لیے ہو، ذاتی انتقام کے واسطے نہ ہو۔ میں نے اپنے ساتھ زیادتی کرنے والے ہر شخص کو پیشگی معاف کر دیا ہے کیونکہ اگر میرا حق اس کے ذمہ باقی رہے اور کل قیامت کے دن اس سے اس بارے میں مؤاخذہ ہو، تو ضرور یہ پریشان ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی ہونے کی وجہ سے اس کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی پریشان ہوں گے اور یہ مجھے کسی طرح بھی گوارا نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میری وجہ سے کسی امتی کے لیے پریشان ہوں۔

آپ نے بیت اللہ کا غلاف پکڑ کر اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کیا کہ یا اللہ! جامعہ یوسفیہ میں جو بھی اعمال خیر ہوں انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں قبول فرما۔ ایک بار فرمایا کہ اگر میں ایک لحہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دھیان سے غافل ہو جاؤں تو خود کو مرتد محسوس کرتا ہوں۔

جب کوئی اجازت حدیث طلب کرتا تو آپ کو محض اس وجہ سے اجازت دینا گراں ہوتا کہ حدیث پاک کی اجازت کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے، فرماتے: اس کے لیے پاک نسبت ہونی چاہیے، جب کہ میرے اندر ظلمتیں ہیں، اس سے پرہیز کرتا ہوں کہ کہیں حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بے ادبی نہ ہو جائے۔ جب کوئی بہت ہی مجبور کر کے اجازت حاصل کرتا تو کئی دن تک طبیعت پر بوجھ اور اثر رہتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عاشقانہ تعلق کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ عمر بھر کبھی قصداً سنن عادیہ بھی نہیں چھوٹیں، حتی کہ شہادت سے کچھ دن پہلے فرمایا کہ عمر کے ۶۳ سال پورے کر چکا ہوں۔ زندگی کا معاملہ غیر اختیاری ہے، ورنہ اپنے اختیار سے کبھی سنت کے خلاف نہیں کیا، اگر خودکشی حرام نہ ہوتی تو میں مسنون عمر کی موافقت میں خودکشی کر لیتا۔

عشق نبوی کے اسی غلبہ کے باعث جس چیز کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محتمل یا موہوم نسبت بھی ہوتی تو اس کا بھی حد درجہ احترام کرتے۔ گلاب کے پھول اور انار کے ایک ایک دانے کا بہت احترام کرتے۔ فرماتے تھے کہ روایت اگرچہ ضعیف ہے مگر عقل تسلیم کرتی ہے کہ گلاب کا پھول آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پسینے سے پیدا ہوا ہے، اور انار میں ایک دانہ جنت کے انار میں سے رکھا جاتا ہے۔ مدینہ منورہ کی کھجور کا بہت احترام کرتے یہاں تک کہ اس کو دھونے بھی نہیں دیتے تھے۔ فرماتے: آج کل تو مدینہ منورہ میں گرد ہی نہیں مگر مدینہ کی ہوا تو ضرور لگی ہوگی۔

ایک حاجی صاحب نے مدینہ منورہ سے ڈبہ بند پگڑی ہدیہ میں لائی۔ اس نے ڈبے کو پھاڑا اور پگڑی نکال کر ڈبے کو پھینک دیا۔ والد صاحب نے مجھے اشارہ کیا کہ اسے اُٹھاؤ، میں نے اُٹھایا تو حضرت نے فرمایا کہ اس پر کیا لکھا ہے؟ اس پر کسی دوسرے ملک کا نام لکھا تھا۔ حضرت نے فرمایا کہ جس ملک کا بھی ہو کم از کم اس ڈبے پر مدینہ کی ہوا تو لگی ہوئی۔ ایک دفعہ بندہ مدینہ طیبہ سے ٹشو پیپر کا ڈبہ لایا، اس ڈبے پر المدینہ کا لفظ بھی لکھا ہوا تھا تو حضرت نے اس ڈبے کو اٹھایا اور الماری میں سنبھال کر رکھا کہ بعض بے احتیاط لوگ اس کے ساتھ استنجا کرتے ہیں، کوئی ناک صاف کرتا ہے، یہ میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔

درس وتدریس

والد گرامی میدان تحقیق کی طرح میدان تدریس کے بھی زبردست شناور تھے، آپ نے جامعہ بنوری ٹاؤن کے قیام میں تو کم ہی تدریس کی کیونکہ زیادہ تر تحقیقی مشغولیت تھی، تاہم آپ کا درس سلم العلوم اور ترجمۃ القرآن کی علمی حلقوں میں بڑی شہرت تھی، جامعہ یوسفیہ قائم کرنے کے بعد تقریباً تیس سال اعدادیہ سے لے کر مشکاۃ شریف تک تقریباً ہر کتاب کا درس دیا۔ تین کتابوں کی تدریس کی بڑی شہرت تھی، ایک شرح النقایہ، دوسری اوضح المسالک، تیسری قصیدۂ بدء الامالی، ان کتب کا درس اپنے خاص اجتہادی ذوق سے دیتے، اس کے علاوہ حدیث وفقہ اور علوم وفنون کی جملہ کتب کی تدریس میں اپنی ایک خاص شان تھی۔

اولاً عبارت کا آسان انداز میں اس طرح ترجمہ کرتے کہ مفہوم تک بھی رسائی ہو اور عبارت کی ترکیبی حالت کا بھی پتہ چلے۔ اس کے بعد اصل مسئلہ کو عام فہم انداز میں سمجھاتے، اگر مسئلہ مختلف فیہ ہوتا، تو جانبین کے دلائل انتہائی مربوط، جامع اور سہل انداز میں نمبروار ذکر فرماتے، اس کے بعد راجح مذہب کے وجوہ ترجیح بیان کرتے۔ مخالف جو بھی ہو اور اختلاف جتنا بھی سنگین ہو آپ فریق مخالف کا تذکرہ انتہائی شائستہ اور ادب واحترام سے فرماتے۔ فقہا کے اختلافات ذکر کرتے ہوئے اکثر اس نکتے کی طرف متوجہ کرتے کہ فقہی اختلاف میں اللہ تعالیٰ کی یہ حکمت ہے کہ سیدنا حبیب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ادا اللہ تعالیٰ کو اتنی پسند تھی کہ ان تمام اداؤں کو اپنے امت میں فقہا کے مسالک کی شکل میں دائماً جاری فرمادیا، کسی کو ایک حدیث پر عمل کی توفیق دی، کسی کو دوسری حدیث پر عمل کی توفیق بخشی۔

ترجمہ وتفسیر قرآن مجید کے سبق میں آسان لفظی ترجمہ کرتے، مشکل الفاظ کے لغوی معانی اور اس کے مختلف استعمالات پر روشنی ڈالتے، مشکل آیات کی نحوی تحلیل کر کے معانی مقصودہ کو اس کی روشنی میں متعین کرتے، ربط بین

الآیات والسور کا بھی اہتمام کرتے، آیات کے تذکیری پہلو کی خاص نشان دہی فرماتے، آیات سے استنباط احکام کا اللہ تعالیٰ نے اجتہادی ملکہ نصیب فرمایا تھا، اس کے مظاہر بھی دوران درس دیکھنے کو ملتے۔ جن آیات سے فرق ضالہ استدلال کرتے، ان کے دلائل کو بھرپور مسکت انداز میں توڑتے۔ جغرافیہ قرآن پر خاص نظر تھی، تفسیر القرآن بالقرآن کے ساتھ صحیح احادیث اور اقوال صحابہ وتابعین سے تفسیری مرادات متعین کرتے، اسرائیلیات سے اجتناب کرتے اور بطور خاص اس کی نشان دہی کرواتے۔ آیات کے بلاغی پہلو کو بھی کھول کر بیان کرتے، جس سے درس کے نشاط اور تازگی میں مزید اضافہ ہوتا۔ ان تمام خوبیوں کے باوصف درس میں طوالت نہ ہوتی بلکہ جامعیت واختصار ہوتا۔

درس میں تعلیم وتربیت کے علاوہ ادھر اُدھر کے باتیں ذکر نہیں کرتے تھے، آپ کی نظر دو چیزوں پر مبذول رہتی: ایک علمی استعداد کی بڑھوتری، دوسرا کردار سازی۔ اس مقصد کے تحت سبق کی مناسبت سے صحابہ کرامؓ یا اپنے اکابر کے واقعات بھی بیان کرتے۔ حضرت کے سبق کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں اکتاہٹ نام کی کوئی چیز نہ ہوتی، چاہے دو گھنٹے مسلسل سبق کیوں جاری نہ ہوتا۔ مقدار خواندگی میں یکسانیت ہوتی، روزمرہ درس ایک جیسے انداز میں ہوتا، یہ نہیں کہ ایک دن تحقیق اور دوسرے دن سرسری۔ لہجہ بھی ہمیشہ معتدل ہوتا، آواز کو بلند نہیں کرتے تھے، انداز تفہیم ایسا تھا کہ ذکی وغبی دونوں کے لئے مفید تھا۔ گذشتہ اسباق کا استفسار بھی فرماتے۔ طلبہ مشتاق ہوتے کہ استاذ صاحب کا سبق کب شروع ہوگا، ضرورت ہوتی تو عشا کے بعد بھی پڑھاتے۔

حضرت کے متعلق یہ بات بہت مشہور تھی کہ آپ صرف معقولی عالم ہیں، حالانکہ آپ کا اصل میدان تو علم حدیث تھا، اس کے ساتھ تفسیر، فقہ، کلام اور نحو میں خاص مہارت تھی، منطق وفلسفہ آپ کے جیب کی گھڑی ضرور تھی لیکن آپ نے کبھی اپنے علمی ذوق کا منتہی اسے نہیں بنایا۔

والد صاحب دوران درس سوائے اپنی کتاب کے اور کسی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے، کبھی کبھار مہمان درسگاہ کے دروازے پر کئی کئی منٹ کھڑے ہوتے مگر حضرت اپنے سبق میں اتنے منہمک ہوتے کہ اردگرد کی خبر نہ رہتی۔ سبق انتہائی شوق سے پڑھاتے، اگر طبیعت خراب ہوتی اور سبق پڑھانا شروع کرتے تو کچھ دیر پڑھانے کے بعد ایسے مگن ہوجاتے کہ بیماری کا گویا احساس ہی نہ رہا ہو۔

اردو شروحات سے سخت چڑ تھی، انہیں استاذ وشاگرد دونوں کے لیے زہر قاتل سمجھتے تھے، فرماتے کہ اس دور میں استعدادوں کی تباہی کا ان شروحات نے خوب سامان مہیا کردیا ہے۔

تصنیف وتحقیق اور ذوق مطالعہ

اللہ تعالیٰ نے والد گرامی کو بچپن ہی مطالعہ وتحقیق کا خوگر بنایا تھا، زمانہ طالب علمی میں پوری پوری رات مطالعہ میں خرچ کر لیتے، تحقیقی ذوق اتنا تھا کہ خامسہ والے سال کئی تحقیقی اور تنقیدی مقالات تحریر فرمائے، حضرت بنوریؒ کی صحبت میں اس ذوق کو مزید جلا ملی، یہاں تک کہ آپ مطالعہ وتحقیق کے اوج ثریا پر پہنچ گئے اور اس میدان میں حوالہ اور سند کی حیثیت سے یاد کیے جانے لگے۔

آپ کے تصنیفی وتحقیقی کارناموں پر تو ہمارے احباب نے بہت کچھ لکھا ہے جو اس اشاعت میں 'آثار امین' کے عنوان سے ملاحظہ فرمائیں، انہی باتوں کو دہرانا تکرار ہوگا، ذیل میں آپ کے ذوق مطالعہ وتحقیق کے حوالے سے چند واقعات ذکر کرنا چاہوں گا۔

فرمایا کہ ایک بار ایک حدیث کی تحقیق کی ضرورت پیش آئی، اس کے لئے میں نے چھ ہزار صفحات کا مطالعہ کیا تب جا کر مطلوب حاصل ہوا۔ فرمایا: ایک دفعہ ایک حدیث پر بحث کے لئے اٹھارہ ہزار صفحات کو ٹٹولا تھا۔ فرماتے تھے کہ کبھی اپنے اختیار سے ٹیک لگا کر مطالعہ نہیں کیا، نہ ہی بلا وضو کسی ورق وکاغذ کو چھوا ہے۔ ویسے بھی عادت طیبہ یہ تھی کہ ہر وقت وضو میں رہتے، آخر میں جب گردے کی شکایت بڑھ گئی تھی تو ہم دیکھتے تھے کہ بار بار وضو بناتے لیکن بے وضو رہنا تب بھی گوارا نہ تھا۔ حضرت فرماتے تھے کہ معمولی بے ادبی اور گستاخی سے بھی علم ومعرفت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں، ہمارے اکابر معمولی سی معمولی چیز کا بھی خیال رکھتے تھے۔

فرماتے تھے کہ جس کتاب کا مطالعہ چارپائی یا کسی گدے وغیرے پر بیٹھ کر لوں اور جس کا باقاعدہ تپائی پر بیٹھ کر اہتمام سے کروں، دونوں میں زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے، پہلے مطالعہ میں وہ مضامین نہیں کھلتے جو دوسرے میں کھلتے ہیں، دونوں حالتوں کے اثرات میں واضح فرق محسوس کرتا ہوں۔

کثرت مطالعہ سے اللہ تعالیٰ نے تمام علوم وفنون کے ساتھ اتنی ممارست نصیب فرمائی تھی کہ باطن کی آنکھ سے علوم کی عبارات کا بھی ادراک کر لیتے، فرماتے: اگر میری آنکھیں باندھ لی جائیں اور کوئی آیت، حدیث اور عام عربی عبارت لکھ دے تو ان شاء اللہ میں بندھی ہوئی آنکھوں سے بتادوں گا کہ کہاں سے کہاں تک آیت ہے؟ کہاں سے کہاں تک حدیث ہے اور کہاں سے کہاں تک عام عربی عبارت ہے؟ الحمد للہ کثرت مطالعہ کے وجہ سے اب عبارت میں اثر بھی محسوس کرتا ہوں کہ اس میں جلال ہے یا جمال، بغیر تحقیق کے بتا سکتا ہوں کہ یہ کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہیں یا کسی صحابی کا یا کسی تابعی وغیرہ کا؟

ایک مرتبہ فرمایا: ایک بار ایک حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تحقیق میں بڑی پریشانی تھی، وہ روایت حضرت معاویہؓ سے منقول تھی، میں نے کافی کوشش کی لیکن صحت وضعف میں کسی ایک جانب رجحان نہ ہو سکا، رات کو خواب میں حضرت معاویہؓ کی زیارت ہوئی، آپ نے فرمایا کہ یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تشریف فرما ہیں، ان سے اس حدیث کے بارے میں دریافت فرمائیں؟ تو اماں جی نے تصدیق فرمادی کہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ جامعہ یوسفیہ کے دفتر کے اوپر پرانا مکتبہ (جو بمباری میں گر گیا تھا) اس خواب کی وجہ سے معرض وجود میں آیا تھا، خواب میں جہاں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے سامنے بیٹھ کر حضرت نے استفادہ کیا تھا، مکتبہ میں اسی جگہ آپ نے اپنی نشست بنائی۔ والد صاحب فرماتے کہ میں عام حالت میں قبلہ رو بیٹھنے کو پسند کرتا ہوں، الحمدللہ خواب میں بھی اماں جی کو اس حالت میں دیکھا کہ ان کا چہرہ مبارک جنوب کی طرف تھا، میں آکر ایسی حالت میں بیٹھا کہ میرا چہرہ قبلہ کی طرف ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے بے مثال قوت حافظہ سے نوازا تھا، بدقسمتی سے ۱۹۹۲ء میں ایکسیڈنٹ ہوا، سر میں چوٹ لگنے کی وجہ سے اپنے حافظ کی شکایت کیا کرتے تھے کہ اب وہ قوتِ حافظہ نہیں رہی، اس کے باوجود ایک مرتبہ حصن حصین کی شرح حرز الثمین کے بارے میں فرمانے لگے کہ فلاں دعا اس میں مذکور ہے، اور اس کے حاشیہ پر میں نے فلاں الفاظ دیکھے تھے۔ اب یاد نہیں کہ یہ شرح میں نے کب اور کہاں دیکھی ہے؟ اس کے لئے جامعہ بنوری ٹاؤن کا مکتبہ تلاش کیا نہیں ملی، پھر حضرت اقدس مولانا خواجہ خان محمد صاحبؒ کے کندیاں شریف کے مکتبہ میں تلاش کی نہیں ملی، پھر کسی نے اسلامیہ کالج پشاور کے بارے میں بتایا کہ وہاں موجود ہے مگر وہ فوٹو کاپی دینے کے لیے تیار نہیں، پھر غالباً برادرم مولانا محمد ساجد صاحب صمدوی نے نیٹ کے ذریعہ سے جامعہ ازہر سے منگوائی۔ ان دنوں حضرت کسی کتاب کی تلاش میں جامعہ یوسفیہ کے دوسرے مکتبہ میں تشریف لے گئے، جو نچلی منزل میں تھا اور اس میں عموماً درسیات کا ذخیرہ رہتا تھا۔ اچانک ایک کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ فلاں کتاب اٹھاؤ، میں نے اٹھائی تو وہ حرز الثمین تھی، حضرت بہت خوش ہوئے، فرمایا: میں نے آپ لوگوں کو بتایا تھا کہ فلاں رنگ ہے اور اس طرح کی جلد ہے۔ ہم نے حضرت کے فرط مسرت سے فائدہ اٹھا کر حصن حصین کی اجازت مانگی تو حضرت نے بڑی بشاشت سے مدرسہ کے تمام حاضر اساتذہ کو اجازت مرحمت فرمائی۔

ایک بار آنکھوں کا آپریشن ہوا، ڈاکٹر حضرات نے سجدہ اور کتابوں کے مطالعہ سے سختی سے منع فرمایا۔ ایک دن کے بعد مجھے تنہائی میں فرمایا کہ قصہ خوانی بازار کے مکتبوں میں التجرید تلاش کرو۔ میں نے جا کر تلاش کی مگر نہیں ملی۔ والد صاحب فرماتے تھے کہ امام قدوریؒ کے تصنیف ہے، کئی بار خود بھی تلاش کی، مگر دستیاب نہیں ہوئی، پھر دوبارہ

بھجوایا کہ ابن عاشور کی تفسیر لے آؤ، تو مکتبہ والے نے مجھ سے پوچھا کہ حضرت کہاں ہیں؟ میں کہا کہ حضرت بیمار ہے، ہسپتال میں زیرِ علاج ہے تو وہ عیادت کرنے میرے ساتھ آ گئے۔ حضرت نے آتے ہی پہلے یہ پوچھا کہ کوئی نئی کتاب تو نہیں آئی؟ اس نے کہا کہ بہت سی کتابیں آئی ہوئی ہیں۔ 'المختارۃ' کا ذکر کیا کہ اس کا جدید نسخہ مولانا عبدالسلام صاحب لے گئے ہیں، قدیم نسخہ ہمارے پاس ہے، کم قیمت میں آپ کو دے دوں گا، جب وہ چلے گئے، تو والد صاحب خود جانے لگے میں نے اصرار کیا کہ حضرت ایسا نہ ہو کہ ڈاکٹر صاحب ناراض ہو جائیں۔ فرمانے لگے کہ بیٹا! کوئی ذی روح بغیر کھائے پیئے زندہ رہ سکتا ہے؟ کتابوں کا مطالعہ میری غذا بن چکی ہے، اس کے بغیر مجھے زندگی کا لطف نہیں آتا لہٰذا خود جا کر 'المختارۃ' اٹھا کر لائے۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ حضرت نے ایک کتاب الماری سے نکالی تو دیکھا کہ وہ 'تجرید' کا نسخہ تھا، مگر اوپر ٹائٹل پر غلطی سے کوئی اور نام درج تھا۔ حالانکہ میں تجرید تلاش کر کے ناکام لوٹا تھا، حضرت ان کتب کو لے کر ہسپتال واپس آنے۔ تو فرمانے لگے کہ آپ کو تو ویسے بھی مطالعہ سے بخار چڑھتا ہے مگر آج کل روزانہ کچھ نہ کچھ ان کتابوں کو دیکھا کرو، تاکہ اگر ہسپتال والے پوچھیں تو میں تو ریہ کر کے کہہ سکوں کہ ان کا مطالعہ میرا بیٹا یوسف کر رہا ہے اور جھوٹ سے بچ سکوں۔ الغرض اسی زخمی آنکھ کے ساتھ آپریشن کے بعد صرف ایک دن وقفہ کر کے حسبِ سابق مطالعہ شروع کر دیا۔

اسی بیماری میں ایک دن مجھے ایک دوسرے مکتبہ والے کے پاس بھیجا کہ فلاں دو کتابیں لے آئیں، میں ایک لے آیا ایک موجود نہ تھی، تھوڑی دیر بعد مکتبہ والے نے فون کیا کہ وہ دوسری کتاب بھی آگئی ہے، میں نے کہا کہ حضرت ہسپتال میں ہیں، میں ان کے ساتھ ہوں، وہ خدا کا بندہ مطلوبہ کتاب اور مزید پانچ کتابیں اٹھا کر ہسپتال آگیا۔ والد صاحب نے ان میں سے چار خرید لیں، ان کے جانے کے بعد مجھے ڈانٹا کہ آپ مجھ سے جھوٹ بول رہے تھے کہ کتاب نہیں ہے، میرے بجائے ڈاکٹروں کا ساتھ دے رہا ہے۔ میں نے واقعی صورت حال عرض کی کہ حضرت یہ تو اس نے مجھے فون کر کے بتایا تو میں نے بلایا، اس پر حضرت نے معذرت تسلیم کی۔

قلم کاغذ کا بھی خاص خیال رکھتے، قلم کے بارے میں فرماتے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی قسم کھائی ہے، دوسرا اس کے ذریعے علوم انسان تک پہنچے ہیں، یہ اس امت کا محسن بھی ہے، صاف کاغذ کو ضائع ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے تھے، کاغذ کا معمولی ٹکڑا بھی صاف ہوتا تو اس کو لکھائی کے لیے استعمال کرتے، عموماً خطوط کے لفافوں تک پر لکھتے، خط کاغذ کے دونوں اطراف پر لکھنے کا معمول تھا، اتنا کاغذ لیتے کہ دونوں طرف بات پوری ہو جائے۔ اسی طرح زمین پر سے کاغذوں کے ٹکڑوں کو جمع کرتے، کبھی نالوں سے بھی اخبار کے ٹکڑوں کو نکالتے، اگر ہم موجود ہوتے تو برائے تعلیم ہم سے نکلواتے۔ اب الحمدللہ ہمارے گھر کے تمام افراد ان چیزوں کا خیال رکھتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ اس میں اللہ

تعالیٰ کا نام یا کلام تو نہیں۔

حضرت کا ذوق تحقیق طالب علمی سے نمایاں تھا، جامعہ میں تقرری کے بعد حضرت مولانا بنوری قدس سرہ کی طرف سے حضرت مفتی رشید احمد صاحب کو ایک تحریر کا جواب لکھا، جو اس زمانے میں 'ترجمان اسلام' میں شائع ہوا، اور کافی مقبول ہوا۔ اسی طرح مولانا عبدالعزیز رائے پوریؒ پر کسی کے اعتراضات کا بھی مدلل جواب لکھا جو حضرت رائے پوری کے سامنے آیا تو فرمایا کہ اگر میں اس شخص سے ملا تو اس کے ہاتھ چوموں گا۔ یہی تحریر حضرت رائے پوری سے مراسم کا ذریعہ بنی، پھر یہ تعلق اتنا مضبوط ہوا کہ حضرت رائے پوری اہم علمی مسائل میں والد صاحب کی تحقیق پر ہی اعتماد کرتے۔

عالم اسلام کے اجل علما آپ کی تحقیقات خصوصاً نثر الازھار علی شرح معانی الآثار کے قدردان تھے، عالم اسلام کے ممتاز حنفی عالم شیخ محمد عوامہ حفظہ اللہ کو کسی نے نثر الازہار ہدیہ میں پیش کی، اسے دیکھ کر شیخ متمنی تھے کہ مصنف کی زیارت کرلیں۔ ۲۰۰۵ء میں حج کے موقع پر والد صاحب شیخ کی ملاقات کے لیے چلے گئے، شیخ کی خوشی دیدنی تھی، آپ نے والد صاحب کی پرتکلف دعوت فرمائی، اور مصنف ابن ابی شیبہ اپنی تحقیق کے ساتھ کامل ۲۶ جلدوں میں آپ کو ہدیہ میں پیش کی۔ والد صاحب نے مروتاً کہا کہ میں پاکستان میں لے لوں گا، آپ تکلیف نہ فرمائیں۔ تو شیخ نے جواب دیا کہ اگر آپ کے پاس سامان زیادہ ہو تو اس کے مصارف ہم ادا کریں گے یا ہمیں اپنا پتہ دے دیں یہ ہم بھجوا دیں گے، اس پر والد صاحب نے کتاب قبول فرمائی۔

شیخ محمد عوامہ حفظہ اللہ نے جب بندہ کو اجازت حدیث عنایت فرمائی تو والد صاحب کی نسبت ذکر کرتے ہوئے ان کے لیے 'محدث جلیل، فقیہ اور مجتہد' کے الفاظ لکھے۔

حلقۂ تلامذہ

حضرت استاذ صاحبؒ کے شاگردوں کا حلقہ بہت وسیع ہے، پاکستان کے علاوہ افریقہ، امریکہ، روس، افغانستان اور عرب ممالک میں آپ کے تلامذہ موجود ہیں۔ پاکستان میں مشہور چند تلامذہ یہ ہیں:

۱۔ مولانا اسلم شیخوپوری شہیدؒ...... ۲۔ مفتی محمد ولی درویشؒ...... ۳۔ مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ...... ۴۔ مولانا معراج الدین شہید (ایم این اے، جنوبی وزیرستان)...... ۵۔ مولانا محمد یوسف افشانی مدظلہ...... ۶۔ مولانا محمد انور مدظلہ...... ۷۔ مولانا قاری محمد قاسم مدظلہ...... ۸۔ مولانا محمد یٰسین مدظلہ...... ۹۔ مولانا سید رزین شاہ مدظلہ...... ۱۰۔ مفتی محمد نعیم مدظلہ...... ۱۱۔ مولانا امداد اللہ یوسفزئی مدظلہ...... ۱۲۔ مولانا سید عدنان کاکاخیل

مدظلہ۔

مناصب وخدمات

حضرت والد صاحب خالص تعلیمی وتحقیقی مزاج کے باوجود مختلف دینی تحریکات کا بھی حصہ رہے، اس کے ساتھ ساتھ مدارس میں بھی مختلف انتظامی ذمہ داریاں ادا کرتے رہے۔

(۱) جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن میں تخصص فی الحدیث کے بعد تدریس اور شعبۂ تصنیف میں حضرت مولانا سید بنوری رحمہ اللہ کے معاون اور رفیق کار رہے۔

(۲) جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن میں ایک عرصہ نظامت کے فرائض بھی سرانجام دیئے۔

(۳) وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے رکن عاملہ رہے۔

(۴) مفتی محمود صاحبؒ کے زمانہ میں جمعیت علماء اسلام کی صوبائی سطح پر ذمہ داریاں سپرد رہیں۔

(۵) شریعت کونسل کے رکن شوریٰ تھے۔

(۶) علاقائی سطح پر مختلف مذہبی جماعتوں کے سرپرست رہے۔ خصوصاً اہل السنۃ والجماعۃ کی سرپرستی فرماتے رہے۔

(۷) ہنگو اور اورکزئی ایجنسی کے تمام مذہبی وسیاسی جماعتوں کے مشترکہ پلیٹ فارم سنی سپریم کونسل کے بانی اور نائب امیر تھے۔

(۸) مدرسہ یوسفیہ کے بانی ومہتمم تھے، اس کے علاوہ کئی ایک مدارس، مکاتب اور مساجد آپ کی نگرانی وسرپرستی میں چل رہی تھیں۔

(۹) عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے ضلعی امیر تھے۔

ان تمام میادین میں آپ نے محض رسمی تعلق نہیں رکھا، بلکہ خادمانہ کردار ادا کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ تمام دینی تحریکوں میں اتفاق واتحاد کو فروغ دینے کے لیے ہمیشہ سرگرم رہے۔ جہاں کہیں تفرقہ یا اختلاف کی بات محسوس کرتے تو خود حاضر ہو کر یا ذمہ داران کو خطوط لکھ کر اپنی تجاویز سے آگاہ کرتے اور مناسب تنبیہ فرماتے۔

معمولات یومیہ

والدگرامی فجر سے ڈیڑھ دو گھنٹہ پہلے بیدار ہوتے، گھر کے تمام افراد کو بھی ان کی خواہش پر تہجد کے لئے اُٹھاتے، بلکہ ایسی تربیت فرمائی تھی کہ حضرت نہ بھی ہوتے تو گھر کے افراد خود بخود اُٹھ جاتے، تہجد کی رکعات میں وقت کی

مناسبت سے کمی بیشی بھی کر لیتے ،عموماً معمول ۱۲ رکعات کا تھا،اس کے بعد ذکر وشغل میں مشغول ہوتے ،اگر تہجد گھر میں پڑھا ہوتا تو اذان ہوتے ہی مسجد چلے جاتے ۔نماز کے بعد مسنون اذکار،سورۃ یٰسین کی تلاوت اور اشراق تک ذکر ومراقبہ کا معمول تھا،اشراق پڑھتے ہی متصلاً زیادہ سے زیادہ دس منٹ میں ناشتہ کرتے ۔ناشتہ کے بعد گھر کی خواتین کے لیے درس قرآن اور درس حدیث کا معمول تھا۔تقریباً سوا گھنٹہ سے دو گھنٹے تک اس میں مشغولیت ہوتی ۔اس کے بعد مدرسہ میں اسباق پڑھانے تشریف لاتے ۔

صبح ہوتے ہی مختلف النوع مہمانوں کی آمد بھی جاری ہوجاتی ،ان میں استفادہ کرنے والے اہل علم بھی ہوتے تھے،سیاسی زعما بھی ،دم تعویذ والے بھی ہوتے اور زیارت ودعا کے لیے آنے والے تلامذہ ومتعلقین بھی ،نجی وخاندانی مسائل میں رہنمائی لینے والے بھی ہوتے اور تنازعات حل کروانے کے واسطے آنے والے بھی ۔کمال یہ تھا کہ حضرت ہر مہمان کے رتبہ کا خیال رکھتے ،ہر ایک کی شان کے مطابق اکرام کرتے ۔ چائے تو ہر آنے والے مہمان کو پیش کی جاتی ۔اگر کوئی شوگر کا مریض ہوتا تو اس کے لئے علیحدہ انتظام ہوتا ۔رخصت کرتے وقت ہر ایک کے ساتھ دروازے تک جاتے ۔اس کے ساتھ اگر کہیں قومی وعلاقائی مسائل کے سلسلے میں آنا جانا ہوتا تو بھی کرتے ۔

ان مصروفیات کے باعث کبھی دوپہر کے کھانے کا موقعہ نہیں ملتا تھا،بندہ اور خاندان کے ایک دو بندے مستقل خدمت میں ساتھ ہوتے ،کبھی کبھار بے آرامی کی وجہ سے ہم تنگ ہوجاتے ،مگر شدید تھکاوٹ کے باوجود حضرت کا اکتانا تو درکنار چہرے پر اس کا اثر بھی ظاہر نہ ہوتا تھا،اگر مہمان نہ ہوتے تو دوپہر کھانے کے بعد قیلولہ کی نیت سے باہر جنگل کی طرف نکل جاتے ،کسی سایہ دار درخت کے نیچے یا سردی کے موسم میں کہیں ریت یا بڑی چٹان پر سوجاتے ، مرضی ہوتی تو گھر جاکر کچھ دیر لیٹ جاتے ۔

پھر ظہر کے بعد اگر گھنٹہ ہوتا تو وہ پڑھاتے ،ورنہ مطالعہ میں مصروف ہوجاتے ۔عصر کے بعد مغرب تک مسجد میں ذکر میں مشغول ہوتے ،آخری سالوں میں اس کا بہت زیادہ اہتمام فرماتے ۔نماز مغرب کے بعد نوافل سے فارغ ہو کر کھانا تناول فرماتے ،اگر مہمان ہوتے تو ان کے ساتھ شریک ہوتے ورنہ گھر میں چھوٹے بچوں کو ساتھ بٹھلا کر کھاتے ،خود کھانا بہت کم کھاتے تھے،مگر ساتھ بیٹھنے والے خوب سیر کرواتے ۔اس کے بعد پھر ذکر یا مطالعہ میں مشغول ہوتے ،عشا کی اذان کے بعد وضو کرکے مسجد چلے جاتے ،تحیۃ الوضوء اور تحیۃ المسجد کا اہتمام کرتے اور سنت غیر مؤکدہ بھی پابندی سے ادا کرتے ،نماز کے بعد سنتیں عموماً گھر میں یا مدرسہ میں اپنے کمرہ میں ادا کرتے ،عشا کے بعد رات گئے تک ذکر ومطالعہ،خطوط کے جوابات یا دیگر تحریری کاموں میں مصروف رہتے ۔تقریباً روزانہ چار سو سے آٹھ سو صفحات تک مطالعہ کا معمول تھا اور اوسطاً روزانہ دس تک مہمان تو ضرور ہوتے ۔اسی طرح مریضوں کی

عیادت، اور جنازوں میں شرکت اور غمی خوشی میں لوگوں کے ہاں حاضری کا بھی خاص اہتمام تھا۔

مسلکی جدوجہد

حضرت کی تشریف آوری سے قبل ہنگو میں تفرقہ بازی کا بازار گرم تھا۔ بدعات ورسومات پر لوگ باہم دست و گریباں ہوتے تھے، کچھ بریلوی حضرات اس سلسلے میں پیش پیش تھے اور ان کی ساری صلاحیتیں بدعات ورسوم کی ترویج کے لئے وقف تھیں، عام لوگوں نے دین کا دائرہ انہی چند رسومات میں بندکردیا تھا اور حق و باطل کا معیار رسومات وبدعات بن گئیں تھیں، ایک طرف سے ان کے مرتکبین مشرک کہلاتے اور دوسری طرف سے گستاخ اور وہابی کا طعنہ دیا جاتا۔

ہنگو کا تعلیم یافتہ طبقہ تیزی سے مودودی فکر سے متاثر ہورہا تھا اور صدیوں کے شیعہ سنی اختلافات کے باعث عصمت انبیا اور عدالت صحابہ جیسے قطعی طے شدہ مسائل پر سنی قوم کا باہمی افتراق سخت نقصان دہ تھا۔ خواہش پرستی و توہم پرستی کی وبا عام تھی۔ اس لئے ضرورت تھی کہ حکمت وتدبر سے ان مسلکی اختلافات کو ختم کیا جائے۔ حضرت نے ان فتنوں کے خلاف بڑے ہی حکمت سے دھیرے دھیرے کام شروع کیا اور کام کو اس سطح پر لے آئے کہ تفرقہ کے یہ اندھیرے مکمل چھٹ گئے اور چند سالوں کی مسلسل محنت کے بعد ہنگو کی حد تک سنیت کا باہمی اختلاف اور اختلاف ڈالنے والے عناصر ختم ہوگئے۔

اہل بدعت اور مودودی فکر علما کے ساتھ آپ کے طویل تحریری مکالمے ہوئے، نہایت مصلحانہ انداز میں ان کے اعتراضات کو مدلل اور ٹھوس جوابات کے ساتھ رد فرماتے تھے۔ جب مکالمہ کی تدبیر کارگر نہ ہوتی اور نوبت مناظروں تک پہنچ جاتی تو حضرت مناظروں سے بھی دریغ نہ فرماتے مگر الحمد للہ جہاں بھی مناظرے کی نوبت آئی تو مخالفین حضرت کا سامنا کرنے سے پہلے ہی بھاگنے پر مجبور ہوئے۔

ان حضرات کے ساتھ خطوط کا جو تبادلہ ہوا ہے وہ غیر مطبوع کتابی شکل میں موجود ہے، حضرت کی حیات مبارکہ میں چند مخلص احباب کی تمنا تھی کہ ان خطوط کو افادۂ عام کے لئے شائع کردیا جائے، اولاً تو حضرت نے رضامندی ظاہر فرمادی تھی، لیکن بعد میں ان کی اشاعت کو موقوف فرمادیا تھا۔ وہ اس وجہ سے کہ ان خطوط میں حضرت کے عالمانہ انداز کے ساتھ ساتھ مناظرانہ انداز بھی نمایاں ہے اور جگہ جگہ پر جلالی انداز کی جھلک تحریر میں دکھائی دیتی ہے۔ ایک موقع پر جب بندہ نے ان مکتوبات کو تصحیح اور نظر ثانی کے لئے حضرت کی خدمت میں پیش کیا، تو حضرت پڑھتے ہوئے ہنس دیئے۔ بندہ نے تعجب سے عرض کیا کہ حضرت! کیوں یہ آپ کی تحریر نہیں ہے؟ تو حضرت فرمانے لگے کہ

یوسف! یہ میرے جذباتی اور جنونی دور (یعنی جوانی) کی تحریرات ہیں، لہٰذا میرا مشورہ ہے کہ فی الحال ان پر کام روک دیا جائے۔

میری ذاتی سوچ کی حد تک ان خطوط میں جہاں کہیں تختی آئی ہے وہ مخاطب کے لہجے کا جواب بالمثل ہے ورنہ ان میں موجود علمی مواد اس سطح کا ہے کہ ان خطوط کے مخاطب عالم دین نے ایک دفعہ خود مولانا عبدالستار صاحب (چیئرمین سنی سپریم کونسل ہنگو) سے کہا کہ مولانا امین صاحب سے بڑا عالم شاید ہی اہل السنۃ میں کوئی ہو اور اس کا اندازہ مجھے اپنے نام ان کے مکاتیب سے ہوا ہے۔

حضرت کی محنت کے بدولت آج پورے علاقے میں مودودیت، بریلویت، پرویزیت اور غیر مقلدیت وغیرہ مکمل طور پر غیر موثر ہیں اور ان کی کوئی علمی یا معتدبہ عملی پہچان نہیں۔ خصوصاً پرویزی افکار اور دیندار انجمن کا آپ نے بھرپور علمی وعملی تعاقب فرمایا، اور عامۃ الناس کو پوری طرح ان کے فتنے سے محفوظ کیا۔

شرکیہ امور سے طبعی نفرت تھی، خصوصاً عقیدہ اور ایمان کے تحفظ کے بارے میں بہت حساس تھے، ایک دفعہ میں نے علاقہ کے بعض علمائے کرام کے بارے میں پوچھا کہ آپ ان کے ہاں جانے کی کوشش نہیں کرتے۔ فرمایا! جی چاہتا ہے کہ ان کی خدمت میں حاضری دوں، مگر یہ حضرات بعض بدعات میں مبتلا ہیں، ان وعیدات سے ڈرتا ہوں جو بدعتی کی توقیر کے متعلق آئی ہیں، پھر میں نے عرض کیا کہ جب وہ حضرات ادھر آتے ہیں تو آپ ان کا بہت احترام کرتے ہیں۔ فرمایا! یہاں ان کی حیثیت مہمان کی ہوتی ہے۔ میں نے اپنی استطاعت تک ان کی اصلاح کی بھرپور کوشش کی ہے، مگر بدقسمتی سے یہ حضرات ضعیف ہو چکے ہیں، میرے بارے میں حاسدین نے ان کے کانوں میں بہت کچھ ڈالا ہے کہ یہ وہابی اور پنج پیری ہو گیا ہے اس وجہ سے میرے باتوں کو زیادہ توجہ نہیں دیتے۔

والد صاحب مسلکی مسائل میں متصلب تو تھے لیکن متعصب ہرگز نہیں تھے، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ افریقہ سے شیخ ابراہیم آئے تھے، وہ حنفی مسلک پہ نہ تھے۔ والد صاحب نے ان کو اول دن عشا کے کھانے پر فرمایا کہ بھائی ہم احناف ہیں، مگر آپ کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی کھلی اجازت ہے۔ اس نے چند دن بعد از خود حنفی مسلک پر عمل شروع کر دیا۔ آخر میں جاتے ہوئے والد صاحب سے فرمایا کہ مجھے آپ کے نظریہ، معتدل مزاج اور آپ کے مکتبہ نے بہت متاثر کیا اور آپ کی وسعت ظرفی نے مجھے حنفی بنایا، آپ کے مکتبہ میں ہر مذہب کی مستند کتابوں نے بھی مجھے بہت فائدہ دیا۔

ایک دفعہ کوہاٹ سے ایک دوست نے غیر مقلدین کے بارے میں کچھ سوالات بھیجے، والد صاحب نے ان کے جوابات تحریر کرنے کے بعد آخر میں متنبہ کیا کہ ان مسلکی مسائل کو اپنے دائرہ میں رکھنا لازمی ہے، اور اجتہادی

وفروعی اختلافات کی بنیاد پر کسی کے گمراہ ہونے کا فیصلہ کرنا ہرگز مناسب نہیں۔

اپنی ذات پر ہر قسم کی تنقید برداشت کرتے تھے مگر مسلک و مذہب کے بارے میں کوئی تنقید برداشت نہ تھی۔ مولانا امین صفدر اوکاڑوی صاحب رحمہ اللہ نے واقعہ کربلا کے متعلق ماہنامہ الخیر میں ایک مضمون لکھا جس کے بعض مندرجات سے منفی مطالب کشید کر کے اہل تشیع نے ہمارے ہاں مشاغبہ کے لیے استعمال کیا، اس پر حضرت والد صاحب نے حضرت اوکاڑویؒ کو ایک خط لکھ کر اس حوالے سے احتیاط برتنے کا فرمایا۔ جواب میں مولانا مرحوم نے والد صاحب کا خط شائع کیے بغیر الخیر میں جوابی خط لکھا اور اسے خوب پھیلایا، جس سے کوئی اچھا تاثر نہیں پھیلا۔ حالانکہ انصاف کا تقاضہ یہ تھا کہ دونوں خط ساتھ ساتھ شائع ہوتے۔ والد صاحب اگر چاہتے تو اس کا مدلل جواب لکھ سکتے تھے لیکن آپ نے کوئی جواب نہیں دیا، کیونکہ آپ اہل حق میں مباحثہ کا طول پسند نہیں کرتے تھے۔ آپ کی طرف سے مولانا عبدالغفور سیالکوٹی رحمہ اللہ نے مولانا اوکاڑوی صاحبؒ کو جواب لکھا۔ ہم نے کبھی بھی والد صاحب سے مولانا اوکاڑوی رحمہ اللہ کے بارے میں کوئی ہلکے الفاظ نہیں سنے۔ کبھی کبھار صرف اتنا گلہ فرماتے کہ دیانت کے تقاضہ کے پیش نظر کم از کم میرے خط کو بھی شامل اشاعت کر لیتے، اس میں میرا بنیادی مدعا یہ تھا کہ ہمارا علاقہ بہت حساس ہے، شیعہ حضرات صحابہ کرامؓ کے حوالے سے ہمارے لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے مختلف حربے استعمال کرتے ہیں، لہٰذا مسئلہ یزید یا دیگر ایسے موضوعات جنہیں غیر اپنے مقصد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں، اگر ان کو بیان نہ کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ اس سے اتنا بڑا معمہ بنانا انصاف کے خلاف تصور کرتا ہوں۔

آپ فرماتے کہ ہمارے علما اگر عوام کے ساتھ اختلاط کرتے، تو بہت سارے مسائل کا سمجھنا ان کے لئے آسان ہو جاتا۔ فرمایا: ایک دن میں اور مولانا عبداللہ صاحب ایک دکان پر بیٹھے تھے کہ ایک شیعہ مولوی صاحب اہل السنہ کی کسی کتاب کا حوالہ دے کر لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس دن مجھے احساس ہوا کہ ہمارے آپس کے معمولی مسلکی اختلافات سے کتنا بڑا نقصان ہوتا ہے۔

فرمایا: ایک بار دورۂ حدیث کے سال میں نے اس نیت سے رفع یدین کیا کہ حدیث میں آیا ہے تو حدیث پر عمل ہو جائے، لیکن رات کو خواب میں سخت تنبیہ ہوئی۔ اس پر فرماتے تھے کہ بلا اشد ضرورت کے خروج عن المذہب کو جائز نہیں سمجھتا۔ فرماتے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ نامناسب امور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ ہو جاتی ہے۔

جاہ سے نفرت اور اخفا کا غلبہ

حضرت والد صاحبؒ دنیاوی مناصب اور عہدوں کو عارضی سمجھ کر کوئی حیثیت نہیں دیتے تھے، اللہ رب العزت

نے جو شہرت دی تھی اور جس علمی و عملی کمال سے نوازا تھا اس کے باوجود اپنے آپ کو کسی عہدے اور منصب سے بچانا چاہتے تو یہی عنوان اختیار کرتے کہ میں اس کا اہل نہیں۔

کراچی سے علاقے واپس تشریف لاتے ہی بڑے بڑے اداروں کی طرف سے تدریسی خدمات سرانجام دینے کی درخواستیں شروع ہوئیں مگر آپ سب سے معذرت فرماتے، حتی کہ اپنے مادر علمی کی طرف سے بھی دوبارہ آنے کی بارہا خواہش ہوتی رہی مگر آپ تیار نہیں ہوئے۔

محدث العصر علامہ بنوریؒ کے چچازاد بھائی اور دارالعلوم سرحد کے مہتمم حضرت مولانا ایوب جان بنوریؒ سخت بیماری اور کمزوری کی حالت میں تشریف لائے۔ حضرت سے فرمایا کہ آپ ہمارے ساتھ تشریف لے جائیں، ہمیں شیخ الحدیث کی ضرورت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں اپنے بھائیوں سے مشاورت کے بعد آپ کو اطلاع دے دوں گا، چند دن بعد ایک تفصیلی خط ان کی خدمت میں روانہ کیا۔ اس میں لکھا کہ میں کسی طرح اپنے آپ کو اس منصب کا اہل نہیں پاتا، حدیث پڑھانا بہت بڑی ذمہ داری اور ادب کا متقاضی ہے جس کی پاس داری میں نہ کر پاؤں گا۔ غرض فنائیت ایسی غالب تھی کہ گویا اپنی نگاہ میں اپنا کوئی کمال عیاں ہی نہیں تھا۔ اس معذرت کے خط کا کچھ حصہ یہاں نقل کرتا ہوں:

''بالحاح عرض کرتا ہوں کہ محدث کے منصب پر بیٹھنا اپنے لیے ایک عظیم خیانت تصور کرتا ہوں، اور گناہ کبیرہ سمجھتا ہوں اور جو عملی کوتاہیاں ہیں منافی اس منصب کے، ان کا تو شمار ہی ناممکن ہے۔ لہٰذا حضرت اقدس کی خدمت میں انتہائی شرمندگی اور افسوس کے ساتھ گزارش ہے کہ یہ فقیر حضرت کی فرمائش کی تعمیل سے معذور ہے۔ اگر حضرت اس ناکارہ کو دارالعلوم سرحد میں جاروب کشی کا حکم دیں تو بلا چون و چرا یہ ناکارہ تیار ہوگا۔ مجھے احساس ہے کہ حضرت والا کو اس ناکارہ کے اس جواب سے شدید رنج ہوگا، اللہ تعالیٰ سے بھی اس کے ایک مقرب بندے کے غیر اختیاری دل آزاری کے لیے عفو و صفح کی التجا ہے اور حضرت والا سے بھی عاجزانہ درخواست ہے کہ للہ تعالیٰ اس بدحال و بدنصیب کے لئے بدعا نہ فرمائیں اور اپنے کریمانہ مشفقانہ رویے کو کام میں لاتے ہوئے اصلاح حال و مآل کی دعا سے نوازیں، فقیر نے ائیرپورٹ میں حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب دامت برکاتہم سے اور برادر مکرم جناب سید خالد احمد صاحب حفظہم اللہ تعالیٰ سے اپنی اس بے بسی کا اظہار کیا تھا۔ میرا رب ہی جانتا ہے کہ کس حالت میں کس احساس کے ساتھ یہ سطور لکھ رہا ہوں۔

والسلام، خاندان بنوری کا ایک ناکارہ کفش بردار محمد امین عفا اللہ عنہ''

آپ کی معذرت کا خط روانہ ہونے کے ایک ہفتہ بعد عشا کے وقت حضرت مولانا ایوب جان بنوریؒ پھر تشریف

لے آئے۔ اس وقت ہمارا علاقہ جنگل ہی جنگل تھا، تمام تر سہولیات سے محروم تھا، آبادی نہ ہونے کی وجہ سے بجلی اور گاڑیوں کا خاص انتظام نہیں تھا، مغرب کے بعد تو انتہائی پرخطر سمجھا جاتا تھا، حضرت ہنگو شہر سے گاؤں تک تقریباً دس کلومیٹر کا فاصلہ پیدل طے کر کے آئے تھے، اتنی زحمت اٹھانے پر والد صاحبؒ کو سخت حیا آرہی تھی، اور حد درجہ پریشانی تھی کہ حضرت کسی طرح معذرت قبول نہیں کر رہے۔ والد صاحبؒ نے کھانے کا بندوبست کیا لیکن حضرتؒ نے کھانا کھانے سے بھی انکار فرمایا اور فرمانے لگے کہ جب تک آپ مجھے تسلی بخش جواب نہیں دیں گے، اس وقت تک میں کھانا نہیں کھاؤں گا اور ساتھ ہی جیب سے مدرسے کا ایک پیڈ نکال کر حضرت کے سامنے رکھا جس پر تحریر فرمایا تھا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ مدرسہ کی مکمل ذمہ داری آپ کے سپرد کر دوں، آپ نے بمشکل انہیں کھانا کھلایا لیکن اس ذمہ داری کو قبول کرنے پر کسی طرح راضی نہ ہوئے۔

مینگورہ سے حضرت مولانا فضل محمد سواتیؒ کی بھی خواہش تھی کہ آپ مظہر العلوم سوات تدریس کے لئے آجائیں۔ مختلف ممالک سے حضرت کے بہت سے تلامذہ کی طرف سے بھی وقتاً فوقتاً اپنے ممالک میں مستقل دینی خدمت کے لئے آنے کی دعوتیں ملتی رہیں بلکہ اصرار کی حد تک کوشش ہوتی رہی، مگر حضرت ہر ایسی جگہ سے انکار فرماتے تھے جہاں جاہ ومنصب کا شائبہ ہوتا تھا۔

ایک دفعہ پنجاب کے علما کا ایک وفد آیا، جنہوں نے حضرت سے پرزور مطالبہ کیا کہ آپ ہر صورت ہمارے ساتھ تدریس کے لئے جائیں گے، اس مدرسہ کی کافی شہرت تھی، اور انتظامیہ اہل علم کی خوب مالی خدمت میں مشہور تھی۔ مگر حضرت نے ان حضرات سے یہ کہہ کر معذرت فرمائی کہ میری صحت بھی ٹھیک نہیں اور میں اپنے بھائیوں کی مشاورت کے بغیر کچھ نہیں کہہ سکتا، پھر انہوں نے حضرت کے چچا اور بڑے بھائی سے درخواست کی کہ آپ لوگ حضرت کو ہمارے ساتھ جانے کی اجازت دیں کیونکہ ہمارے ادارے کو حضرت جیسی شخصیت کی بہت ضرورت ہے، یہ دونوں حضرت کے پاس گھر آ کر فرمانے لگے کہ ہم آپ کے کاموں میں مداخلت نہیں کرتے مگر یہ لوگ بہت منت ساجت کر کے ناراض ہو رہے ہیں، آپ اگر جانا مناسب سمجھتے ہیں تو ان کی درخواست قبول کرلیں ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ حضرت ان کے سامنے رونے لگے کہ آپ حضرات بھی میری تباہی کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، مجھے علم یقین ہے کہ ان شاء اللہ ان حضرات کو مجھ سے بہتر شخص مل جائے گا اور ان کا کام بھی چلے گا مگر ان کی بنسبت ہمارے علاقے میں بہت کام باقی ہے اور ضرورت بھی ہے اور میں اپنے آپ کو عنداللہ بھی مکلف سمجھتا ہوں، لہٰذا آپ حضرات ان کے بجائے میرا ساتھ دیں۔ ہمیں علم تھا کہ حضرت کبھی ایسی شہرت کی جگہ نہیں جائیں گے لیکن غلبہ مروت کے باعث مہمانوں سے معذرت کے لئے یہ ساری تعبیرات اختیار کرتے تھے۔ بعد میں حضرت نے اسی مدرسہ کے لئے استاذ گرامی مولانا

منظور احمد مینگل مدظلہ کی تقرری کی تجویز دی اور پچاس ہزار نقد وظیفہ، گاڑی اور گھر سمیت کئی سہولیات کی مدرسہ کی انتظامیہ نے پیشکش بھی کی ،لیکن استاذ جی دور ہونے کے باعث تشریف نہ لا سکے۔

خود جامعہ یوسفیہ میں آپ کے لئے دورۂ حدیث شروع کرنے سے کوئی مانع نہ تھا لیکن ہمیشہ ہمارے اصرار پر یہ فرما کر ٹال دیتے کہ اتنے بڑے مشائخ موجود ہیں مجھ سے کون پڑھے گا۔ حالانکہ ہم نے معتبر اہل علم سے سنا کہ آپ برصغیر کے گنے چنے چند محدثین میں سے ایک تھے۔

ابتدائی تحریکی زندگی میں جب آپ نوجوان ہونے کے ساتھ ساتھ صحت مند بھی تھے اور مصروفیات بھی کم تھیں، جمعیت علمائے اسلام میں مختلف عہدوں پر فائز رہے لیکن بعد میں کئی مذہبی اور سیاسی جماعتوں کی طرف سے اعلیٰ عہدوں کی فرمائشیں ہوتی رہیں مگر حضرت ہمیشہ عہدہ قبول کرنے سے معذرت فرماتے، علاقائی سطح پر آپ تمام دینی تحاریک خصوصاً ختم نبوت اور تحریک ناموس صحابہؓ کے غیر اعلانیہ سر پرست تھے لیکن واقفان حال جانتے ہیں کہ سرپرستی، رہنمائی اور عملی جدوجہد کے باوجود آپ پس منظر میں رہنے کی کوشش کرتے ۔اور سٹیجوں یا نمائشی مقامات پر آنے سے بچتے۔

ہم نے ایک دفعہ درس قرآن شروع کرنے کے بارے میں درخواست کی تو حضرت نے شروع فرما دیا، چند دن کے بعد جب درس کے شرکا میں اضافہ ہونے لگا تو خود درس بند کر دیا اور ایک دوسرے استاذ کے بارے میں فرمانے لگے کہ وہ درس دیں گے، میں بیمار اور مصروف ہوں۔ ہمارے ساتھی اصرار کرنے لگے کہ حضرت آپ خود ہی پڑھایا کریں مگر حضرت نے واضح طور پر فرمادیا کہ میرے عزیز بھائیو! مجھے شہرت سے جتنی نفرت ہے اتنی کسی دوسری چیز سے نہیں ،اسی وجہ سے میں نے بڑے بڑے اداروں میں بخاری شریف پڑھانے کے بجائے اپنے ہاں نورانی قاعدہ پڑھانے کو ترجیح دی ہے اور ہمیں اپنے اکابر نے یہی تعلیم دی ہے کہ بہت ساروں کو پڑھانے کے بجائے ایک کو پڑھائیں اور سنائیں۔ یہ لوگوں کے ہجوم سے مجھے وحشت ہوتی ہے ،لہٰذا مجھے معذور سمجھیں۔

یہ حضرت کا صرف قال نہیں بلکہ حال تھا، آپ پر اخفا کا اتنا غلبہ تھا کہ شاید عصر حاضر میں اس کی نظیر ملے۔ ہم نے حضرت کو شہرت اور بدعت سے حد درجہ متنفر پایا گویا ان سے نفرت طبیعت ثانیہ تھی ،اور شہرت اور بدعت کے مواقع پر ایسی حالت ہوتی کہ برداشت نہ کر پاتے اور طبیعت پر بیماری کا سا اثر ہو جاتا گویا واضح گھٹن محسوس کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے کارنامے سرانجام دینے کے باوجود آپ کی زندگی میں کم لوگوں کو ان کا علم ہو سکا۔

حضرت کا ہمیشہ یہ معمول دیکھا کہ دوسروں کی حوصلہ افزائی فرما کر آگے بڑھاتے ،ان کی عزت افزائی کے مواقع فراہم کرتے، حالانکہ محنت، تدبیر اور اصل کام آپ کا ہوتا لیکن خود کو در پردہ رکھتے ہوئے شہرت کا تاج دوسروں کے

سر پر سجا دیتے۔

بعض معاملات ایسے ہوتے کہ جو بظاہر مشکل نہیں بلکہ ناممکن نظر آتے مگر حضرت اپنی مخلصانہ سعی کی بدولت جان کی بازی لگا کر سر انجام دیتے اور ان کے بارے میں حضرت کے خاص الخاص متعلقین کو بھی خبر نہ ہو پاتی کہ یہ کام کس نے کر دیا، یقیناً اگر وہ کام کوئی اور کر لیتا تو عوام میں اس سے ضرور پذیرائی حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ آپ نے قوم کے لئے بعض ایسے کارنامے سر انجام دیئے کہ اگر کسی سیاسی یا سماجی رہنما کے ہاتھ پایہ تکمیل تک پہنچتے تو ساری عمر قوم کو اپنے احسانات تلے دبائے رکھتا اور اپنی شہرت و وجاہت کے لئے استعمال کرتا۔ مگر حب جاہ سے تنفر کے باعث آپ اپنے آپ کو صرف مخفی ہی نہیں رکھتے بلکہ اپنے بارے میں یہ تاثر دیتے تھے گویا انہیں کسی شے کا علم ہی نہیں۔ حضرت ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ میں جو کچھ کرتا ہوں صرف رضائے الٰہی کی خاطر ہی کرتا ہوں، نہ میں نے سیاست کرنی ہے اور نہ ہی مخلوق کی خوشنودی مطلوب ہے۔

حضرت کے تلامذہ کا وسیع حلقہ ہے جو اندرون اور بیرون ملک پھیلا ہوا ہے۔ لیکن کبھی بھی ہم نے حضرت سے یہ نہیں سنا کہ فلاں میرا شاگرد ہے بلکہ اپنے تلامذہ کا تذکرہ اس انداز سے فرماتے کہ کسی کو معلوم ہی نہ ہوتا کہ یہ حضرت کا ہم جماعت ہے یا شاگرد...... اور جب بھی باتوں میں کسی شاگرد کا ذکر آجاتا تو حضرت ''ہمارے فلاں ساتھی'' کے الفاظ سے یاد فرماتے۔ اگر کسی کے بارے میں استفسار ہوتا کہ آپ کا شاگرد ہے تو حضرت جواب میں فرماتے کہ ہاں فلاں ہمارا اچھا، شریف یا مخلص ساتھی ہے۔ یہ الفاظ کبھی ان کی زبان سے نہیں سنے کہ فلاں میرا شاگرد ہے۔

اس وجہ سے حضرتؒ کے بہت سی خدمات اور تلامذہ کے بارے میں کسی کو کوئی علم نہیں، اکثر باتیں ایسی ہیں جو ہمیں حضرت کی شہادت کے بعد بعض دیگر ذرائع سے معلوم ہوئیں۔ ان میں سے ایک دورۂ حدیث کے سال حضرت کی وفاق المدارس میں پہلی پوزیشن کی بات ہے۔ حالانکہ میں حضرت کی مجلس کا ہمہ وقت حاضر باش خادم تھا، کئی اہم باتیں میرے سامنے ہوتیں، پھر ایک بڑے بیٹے کی حیثیت سے بعض باتیں بطور خاص بھی مجھے بتا دیتے لیکن یہ بات مجھے معلوم نہیں تھی، مجھے جامعہ بنوری ٹاؤن کے مدرس برادر معظم حضرت مولانا محمد یاسین صاحب کی وساطت سے اس کا علم ہوا اور اس بات کا علم حضرتؒ کے دیگر خاص متعلقین کو بھی نہیں تھا۔ حضرت مولانا یاسین صاحب فرماتے ہیں کہ ایک دن جامعہ کے دفتر میں مجھے وہ رجسٹر ملا جس میں علامہ بنوریؒ نے جامعہ کے مدرسین کی تقرری کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند فرمائے تھے تو اس میں حضرت بنوریؒ نے حضرت کے بارے میں یہ بات تحریر فرمائی تھی۔

مہمان نوازی

حضرتؒ کی ضیافت اور مہمان نوازی بھی قابل تقلید تھی۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ ضیافت، حمیت، مروت اور امانت و دیانت جیسے اوصاف کو اپنانے کے لئے پہلے زمانے میں عملی مجاہدے ہوا کرتے تھے، اللہ رب العزت نے یہ عظیم صفات ہمارے اہل وطن کو بغیر کسی مجاہدے کے ودیعت فرمائی ہیں اور الحمد للہ ہمیں یہ صفت اپنے والد صاحب سے وراثۃً ملی ہے، فرماتے کہ میرے والد صاحب کی ضیافت کا ایک چرچا تھا اور مجھے اس پر خوشی ہے کہ ان کی تمام خوبیوں میں سے مجھے صرف ضیافت کا عشر عشیر ملا ہے۔ عشیر عشیر فرمانا حضرت کی تواضع تھی، دیکھنے والے جانتے ہیں کہ آپ مہمان نوازی میں حد کر دیتے۔ کراچی سے ہمارے جتنے اساتذہ تشریف لائے وہ حضرت کی وصف ضیافت کا عجیب تاثر دل میں لے کر گئے۔ یہ ممکن نہیں کہ آپ کو ملنے والا آپ کی مہمان نوازی کا تذکرہ کئے بغیر رہ جائے۔

پھر حضرتؒ کے مہمانوں کا لامتناہی سلسلہ چلتا تھا، حیرت کی بات تھی کہ بعض اوقات نماز فجر کے بعد مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوتا اور عشا تک تسلسل کے ساتھ جاری رہتا اور کوئی مہمان بغیر اکرام کئے نہیں جا سکتا تھا، بسا اوقات اگر ہم میں سے کوئی نہ ہوتا تو مہمانوں کی خدمت خود فرمایا کرتے تھے۔

ایک موقع پر کچھ مہمان آئے تھے تو بندہ مدرسہ کی کسی کام میں مصروف تھا، غالباً مہمانوں کو زیادہ توجہ نہ دے سکا۔ جب میں فارغ ہو کر حاضر خدمت ہوا تو حضرتؒ فرمانے لگے کہ بیٹا! فرائض اور واجبات کے علاوہ یہ دیگر امور تمہارے لئے استحباب کے درجہ میں ہیں اور میرے جیسے ضعیف اور بیمار والد کی خدمت تمہارے لئے فرض کا درجہ رکھتی ہے۔ اگر آپ میری خدمت میں کوئی کوتاہی کریں تو آپ کے لئے معافی کی گنجائش ہے مگر مہمانوں کی خدمت میں کسی قسم کی کوتاہی نا قابل معافی جرم متصور ہوگا، اس لئے کہ یہ میرے والد صاحب کی وراثت ہے اور اس میں کمی بیشی میرے لئے نا قابل برداشت ہے۔ بس یہ سبق پھر ہمیشہ کے لئے کافی ہو گیا الحمد للہ علیٰ ذلک۔

قرض کو سخت ناپسند فرماتے تھے لیکن اس کے باوجود اگر مہمانوں کی ضیافت کے لئے قرض کی ضرورت پیش آتی تو قرض لینا گوارا فرما لیتے مگر ان کی مہمان نوازی میں کوئی کسر نہ چھوڑتے۔

گھر میں اکثر مہمانوں کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی اور اپنے بزرگوں کے واقعات سناتے اور یہ بھی فرماتے تھے کہ اگر مہمان کے اکرام کے لئے اس بات کا شرعی جواز ہوتا کہ اپنے جسم کا گوشت کاٹ کر اس کی خدمت میں پیش کیا جائے تو میں ایسا کرنے سے بھی گریز نہ کرتا۔

بندہ جب مینگورہ میں حضرت مولانا فضل محمد صاحبؒ کے ہاں زیر تعلیم تھا تو ان دنوں ایک بار حضرت مولانا ڈاکٹر

حبیب اللہ مختار صاحبؒ تشریف لائے۔ مولانا فضل محمد صاحبؒ کہیں سفر پر تشریف لے گئے تھے اس لئے مولانا حبیب اللہ مختارؒ سے ملاقات نہ ہوسکی۔ حضرتؒ نے ایک معذرت نامہ لکھ کر بندہ کو دے دیا اور ساتھ فرمایا کہ میں رات کے لئے ہنگو مولانا محمد امین صاحب کے پاس جارہا ہوں۔

مولانا فضل محمد صاحبؒ سفر سے واپس تشریف لائے، تو بندہ نے وہ خط حضرتؒ کی خدمت میں پیش کیا اور ساتھ پوری تفصیل بھی سنادی، حضرتؒ بڑے ظریف تھے فوراً فرمانے لگے کہ وہ ہنگو نہیں بلکہ بکری خانہ گئے ہیں۔ چند دن بعد والد صاحب مینگورہ آئے تو میں نے حضرت کا یہ جملہ انہیں سنایا اور اس کا مطلب پوچھا۔ اس پر والد صاحب ہنس پڑے اور فرمانے لگے کہ ہم چونکہ اکثر خاص مہمانوں کے لئے بکری ذبح کرتے ہیں، اس وجہ سے حضرت نے ہنگو کی تعبیر بکری خانہ سے فرمائی ہے۔

حضرت کی مہمان نوازی میں خاص کمال یہ تھا کہ اس کے ساتھ اپنے دیگر معمولات کا سلسلہ بدستور جاری رکھتے تھے، بڑے بڑے علما وزعما کی تشریف آوری کے باوجود حضرت اپنے اسباق اور ذکرواذکار کا کبھی ناغہ نہ فرماتے۔ بعض مرتبہ حضرت اتنے مصروف ہوتے کہ ان کی اس بے پناہ مصروفیت پر ترس آجاتا مگر اس کے باوجود بھی اگر کوئی مہمان تشریف لے آتے تو ان کے ساتھ ایسے ہشاش بشاش ہوکر بیٹھتے کہ معلوم بھی نہ ہوتا کہ حضرت تھکے ہوئے ہیں بلکہ حضرت اپنے چہرے پر تبسم اور خوشی کے اثرات نمایاں کرتے تھے۔ بسااوقات ہم اپنے قدیم مہمانوں کو بتادیتے کہ حضرت آج بہت تھکے ہیں اور صحت بھی خراب ہے لہٰذا آپ کچھ دیر بعد خود سے اصرار کر کے حضرت کو گھر جانے پر مجبور کریں مگر تب بھی حضرت تشریف فرمارہتے۔

مہمانوں کے ہاتھ خود دھلواتے، اگر وہ انکار کرتے تو فرماتے کہ کیا میرا ثواب کمانا گوارا نہیں۔ جب مہمانوں کے ساتھ کھانا تناول فرماتے تو اپنے سامنے سے چیزیں اٹھا اٹھا ان کو محبت وشفقت کے ساتھ پیش فرماتے، حضرت کی اس ادا سے مہمانوں کو بڑا لطف حاصل ہوتا۔ رات کو سونے کے لئے مہمانوں کی چارپائیاں اور بستر خود لگالیتے تھے، سردیوں کے موسم میں صبح اذان سے پہلے خود گرم پانی لاتے، بسااوقات مہمانوں کے کھانا بھی خود تیار کرتے۔

مہمانوں کے مزاج اور علاقے کی مناسبت سے ضیافت فرماتے۔ کراچی سے آنے والے حضرات کے لئے نمکین قسم کی چیزیں تیار فرماتے۔ ایک دفعہ صحافیوں کا ایک وفد آیا، اس میں بعض حضرات یورپ کے تھے چنانچہ حضرت نے بندہ کو حکم دیا کہ بازار سے خشک میوہ جات لے آؤ، میں نے بادام وغیرہ خریدے اور ساتھ کچھ اپنی طرف سے کیک وغیرہ بھی لے آیا۔ جب حضرت نے دیکھا تو بہت غصہ ہوئے کہ میں نے آپ کو کیا کہا تھا اور آپ یہ کیا لے آئے۔ پھر بعد میں فرمانے لگے کہ بیٹا! میں احمق نہیں ہوں، یہ چیزیں فضول ضائع ہوجاتی ہیں کیونکہ یہ لوگ ان

خشک میوہ جات کو زیادہ پسند کرتے ہیں، جب مہمان آگئے تو سب نے وہی خشک میوہ جات کھائے۔ کیک وغیرہ کی طرف کسی نے دیکھا بھی نہیں۔

مہمانوں کو رخصت کرتے وقت ان کے ساتھ سڑک تک جاتے، ورنہ دروازے تک تو جانا لازمی ہوتا، ابتدا میں علاقہ غیر آباد ہونے کی وجہ سے گاڑیوں کی آمدورفت کم تھی تو بذات خود مہمان کے ساتھ گاڑی کے آنے کا انتظار فرماتے۔ جب ان کو گاڑی میں بٹھاتے تو ان کا کرایہ بھی خود ادا کر کے ڈرائیور سے یہ تاکید فرماتے کہ یہ میرا مہمان ہے اس کو اڈا تک پہنچا دینا، کبھی کبھار مہمانوں کو رخصت کرنے کے لئے ہنگو اور کوہاٹ تک جاتے۔ مہمانوں کے ساتھ ان کا سامان وغیرہ گاڑی میں اپنے ہاتھ سے رکھتے اور حسب موسم پھل وغیرہ ان کے ساتھ کر دیتے تا کہ راستہ میں استعمال کریں۔ علاوہ ازیں حضرت کا معمول تھا کہ مہمانوں کو رخصت کرتے وقت ان کو کچھ نقد رقم کے علاوہ دیگر تحائف سے بھی نوازتے۔ وہ بھی اس طریقہ سے کہ مہمان کو مقدار وغیرہ معلوم بھی نہ ہو پاتی، اگر مہمان کے ساتھ کوئی دوسرا فرد ہوتا ان کو بھی معلوم نہ ہوتا کہ میرے دوسرے ساتھی کو کچھ ملا ہے یا نہیں؟ حضرت جیب سے نکالتے وقت خود بھی نہیں دیکھتے تھے، باقی مقدر کی بات ہوتی کہ کس کو کتنا ملا۔ بعض مہمانوں کو ان کے والدین اور اہل وعیال بلکہ ان کے خاندان میں قابل قدر شخصیات تک کے لئے ان کے مناسب شان ہدیہ وغیرہ بھیجتے۔

ایک بار مولانا عبدالعلیم چشتی مدظلہم جامعہ یوسفیہ تشریف لائے، میں اُس وقت کراچی میں زیر تعلیم تھا، حضرت دوپہر کے وقت گھر جاچکے تھے، مدرسہ میں موجود ہمارے چچازاد بھائی کو علم نہ ہو سکا کہ یہ کتنی بڑی شخصیت ہے، اس لئے اُن کا شایان شان اکرام نہ ہو سکا اور انہیں عام سادہ کھانا کھلایا۔ رات کے وقت حضرت نے مجھے فون کیا تو آواز بڑی بوجھل تھی، میں نے عرض کیا کہ حضرت صحت ٹھیک نہیں ہے؟ فرمایا کہ نہیں بلکہ آج ایک بڑا حادثہ ہوا ہے، اُس سے روحانی کوفت اتنی ہوئی کہ جسمانی بیماری کے آثار ظاہر ہو گئے، مولانا چشتی صاحب مدظلہم تشریف لائے تھے، اُن کی بے اکرامی ہوئی، میں گھر میں تھا، پتہ نہ چل سکا، وہ رات کے لئے رکے بھی نہیں، انہیں جلدی واپس جانا تھا، اس لئے آپ اُن کے پاس حاضر ہو کر اُن سے معافی مانگیں، مجھے تو شرم کے باعث کچھ کہنے کی جرأت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ لہٰذا میں حضرت کے پاس حاضر ہوا اور والد صاحب کی طرف سے معذرت کی، حضرت نے تو اس بات کو قطعاً بھی محسوس نہ فرمایا تھا لیکن والد صاحب کی طبیعت پر وہ سخت اثر آج بھی نہیں بھولتا۔

مہمان آجاتے تو گھر سے فوراً نکل آتے، مہمان اور کتاب کے مطالعہ کے لئے حضرت ہر چیز سے گزر جاتے، ایک دن سخت گرمی کا موسم تھا، حضرت کا معمول یہ تھا کہ جب ہم چھوٹے تھے، سب بھائیوں اور بہنوں کو اپنے ساتھ ایک ہی کمرہ میں سلا دیتے، ہم سو گئے، اس دوران ایک چھوٹا طالب علم آگیا، مجھے کہنے لگا کہ مہمان آگئے ہیں، اب

میں سخت نیند کی حالت میں تھا، بیٹھا تو سہی، لیکن اٹھنے کی ہمت نہ ہوئی اور دوبارہ لیٹ کر سو گیا۔ حضرت بہت آرام کے ساتھ اُٹھے اور مہمانوں کے پاس تشریف لے گئے، تھوڑی دیر بعد میری آنکھیں کھلیں، تو حضرت کی چارپائی کو خالی پایا، وقت دیکھا تو ابھی ظہر کی اذان میں کافی وقت تھا، والدہ صاحبہ خدمت میں مصروف تھیں، کہنی لگی کہ استاذ صاحب سخت ناراض ہوئے ہیں، آپ نے اچھا کیا کہ اُٹھ گئے ہیں۔ میں جلدی سے مہمانوں کے پاس جا کر ملا لیکن حضرت نے بالکل التفات نہیں فرمایا۔ پھر حضرت کھانا لانے گھر چلے، تو میں بھی پیچھے پیچھے چل پڑا، حضرت نے کھانے کے برتن اٹھائے، میں نے لینے کی کوشش کی تو سخت جھاڑ پلاتے ہوئے فرمایا کہ جاؤ سو جاؤ، اب لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے اپنی کوتاہی پر افسوس اور احساس ندامت تھا۔ نماز ظہر کے بعد میں نے گھر سے چائے اٹھا کر ایک طالب علم کو دی کہ مہمانوں کو پلا دو، خود ڈر کے مارے جانے کی جرأت نہ تھی، گھر آیا تو والدہ نے چائے دینی چاہی لیکن میں نے شدت غم میں لینے سے انکار کیا۔ اس دوران حضرت گھر آئے، میرا پوچھا تو والدہ صاحبہ کو خوف ہوا کہ اسے ماریں گے، لہٰذا انہوں نے بچانے کی منتیں شروع کیں۔ والد صاحب نے فرمایا کہ مہمان پوچھ رہے تھے، میں اس لیے پتہ کر رہا ہوں۔ والد صاحب میں یہ عظیم صفت تھی کہ اگر کسی کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا، تو درگزر فرماتے۔ حضرت کمرہ میں داخل ہوئے، خوف کے مارے میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، حضرت نے یہ دیکھا تو مجھے اپنے سینے سے لگایا، سر پر چوما اور چائے کی پیالی منگوا کر دی، اس پر میرے رونے میں مزید شدت آ گئی۔ پھر فرمایا کہ بیٹا! اس میں آپ کی کوئی غلطی نہیں تھی، صاحب نوم کو اللہ تعالیٰ نے کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔ میں بھی اس لئے اُٹھا کہ آپ سخت نیند میں تھے۔ بلکہ میری تسلی کے لئے فرمایا کہ یہ مہمانوں کی غلطی تھی کہ وہ بغیر اطلاع بے وقت آئے۔ پھر ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے والد صاحب کو بہت سارے اوصاف سے نوازا تھا، ان میں ان کا مشہور وصف مہمانوں کی ضیافت تھی، میں نے کافی کوشش کی کہ اپنے والد صاحب کا یہ مشہور و معروف وصف اپناؤں، مگر بہت مشقت و محنت کے بعد ان کا عشر عشیر نصیب ہوا ہے۔ بیٹا! یہ بعض صفتیں بہت مشکل کے بعد انسان کو نصیب ہوتی ہیں، اس کے لئے بہت ریاضتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

حضرت کے مہمانوں کی کثرت اور ضیافت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ ایک بار میں نے مہمانوں پر دس دن کے خرچے کا حساب لگایا تو دس دنوں میں چینی کی ۵۰ کلو والی بوری، ۳۰ کلو گھی، ۲ کلو چائے پتی، ۲۲ مرغی، ۸ کلو گوشت، ۲۵ کلو کی ایک بوری چاول استعمال ہوئے۔ اسی طرح ایک بار ایک مہینہ کا حساب لگایا تو پونے تین بوری چینی، سوا چار کلو چائے کی پتی، ۴۵ کلو گھی، ۵۴ مرغیاں، ۲۰ کلو بڑا گوشت، تقریباً ۲۴ کلو چھوٹا گوشت، تقریباً ۱۲۰ کلو آٹا، ۸۰ کلو چاول اور ۱۶ کلو بسکٹ استعمال ہوئے۔ جب میں نے یہ پرچی حضرت کے سامنے رکھی، تو فرمایا

کہ بیٹا! وہ بھی ایک دور تھا، جب میں مہمانوں کی ضیافت کے لیے ترستا تھا، ایک دفعہ میرے پاس چند مہمان آئے ،میری جیب میں ایک روپیہ بھی نہ تھا کہ ان کی ضیافت کا اہتمام کرتا، اس بے بسی پر میں رو پڑا۔ انہی دنوں آپ کے نانا صاحب فوت ہوئے تھے، گھر کے اکثر افراد ان کے ہاں تھے۔ پریشانی کے عالم میں سجھائی نہیں دیا کہ اب کیا کروں۔ میں نے دو رکعات پڑھے کہ یا اللہ رحم فرما! میرے پاس مدرسہ کی رقم تھی، لیکن اس کے بارے میں میں نے قسم کھائی تھی کہ میں اس رقم سے سخت سے سخت حالت میں بھی قرض نہیں لوں گا۔ اسی فکر میں تھا کہ مدرسہ سے ایک چھوٹا طالب علم آیا کہ حاجی نور اکبر صاحب آئے ہے (یہ حضرت کے دیرینہ دوست تھے)، خوشی ہوئی کہ ان کے ذریعے کھانے کی کوئی ترتیب بناؤں گا۔ ان کے پاس آیا تو وہ بھی پریشان تھے، بتایا کہ آج طبیعت ٹھیک نہیں تھی، آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ اگر یوسف کے نانا کے گھر جانا ہو تو ساتھ چلیں گے، یہ اگلا امتحان تھا کہ یا اللہ کھانے کا وقت قریب ہے اور ایک کے بجائے دو مہمان ہو گئے۔ اس دوران علاقہ کا ایک نوجوان آگیا کہ حضرت آج دوپہر کو ہم نے کھانے کی دعوت کی ہے، آپ تمام احباب سمیت تشریف لائیں، یوں اللہ تعالیٰ نے پردہ رکھا اور غیب سے مہمانوں کا انتظام ہو گیا۔

فرمایا: ایسا بھی ہوا ہے کہ دوپہر کے وقت گھر میں کھانا کھا رہا تھا، دریں اثنا اطلاع ملی کہ کوہاٹ سے ایک مہمان آگیا ہے؟ گھر میں پوچھا کہ روٹی وغیرہ ہے یا نہیں؟ آپ کی والدہ کے آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے کہ آج آپ کے بھائی کے پاس مہمان آئے تھے، جو روٹی تھی وہ لے گئے ہیں۔ یہ ایک روٹی میں نے آپ کے لئے آپ کی بہن کے گھر سے لائی ہے۔ میں نے ایک لقمہ کھایا تھا، دوسرا اُٹھایا تھا کہ واپس رکھ دیا اور یہی روٹی سالن اس مہمان کیلئے لے گیا۔ اس سے صرف ایک ٹکڑا بچا، وہی لے کر ایک مرچ اور پانی کے ساتھ کھالیا، پھر اس پر حضرت پر رونے لگے کہ دیکھیں آج اللہ تعالیٰ کے انعامات کی کتنی بہتات ہے۔

حضرت اپنے گھر کے سودا سلف کا مکمل حساب رکھتے، پھر خرچ میں بھی اعتدال فرماتے، باقاعدہ گھر میں ایک ایک چیز کا محاسبہ ہوتا تھا، لیکن مہمانوں کے اخراجات پر کوئی پابندی نہیں تھی، صرف زندگی میں یہی دو مرتبہ حساب لگایا۔

ایک دفعہ حضرت ہسپتال میں داخل تھے، دن بھر مہمانوں کا ہجوم ہوتا، ہر مہمان اپنے ساتھ کچھ نہ کچھ لے کر آتا، روزانہ ہم پورے وارڈ میں ان چیزوں کو تقسیم کرتے، بعض قریبی رشتہ داروں کے گھروں پر بھی بھیج دیتے، ہسپتال کے عملے کو بھی وافر مقدار میں دیتے، حضرت فرماتے: کوئی چیز کل کیلئے نہیں رکھنی۔ فرماتے کہ اپنے آپ سے بنی اسرائیل نہ بناؤ، مہمانوں کی کثرت کی وجہ سے مجبوراً ہسپتال میں ایک کمرہ کے بجائے تین کمرے کرایہ پر لینے پڑے، ہسپتال میں بھی مہمانوں کے لیے حسب موقع چائے سے لے کر کھانے تک کا انتظام کرنا ہوتا تھا۔

تواضع و مروت

حضرت کی تواضع بھی ضرب المثل تھی ، استاذ گرامی مولانا نور البشر صاحب اکثر فرماتے ہیں کہ واللہ العظیم میں نے اپنی زندگی میں حضرت جیسی متواضع شخصیت نہیں دیکھی، تواضع کا یہ عالم تھا کہ ہر کام خود ہی سرانجام دینے کی کوشش فرماتے ، جب مدرسہ یا مسجد کا کوئی کام ہوتا تو ایک مزدور کی طرح مصروف اور مشغول نظر آتے ، بسا اوقات کام کو خود شروع فرماتے اگر کوئی ان کے ہاتھ سے کام لینے کی کوشش کرتا تو بہت مشکل سے لینے میں کامیاب ہوتا۔ مسجد و مدرسہ میں جھاڑو لگانا، گھر میں جانوروں کو چارہ ڈالنا، فصلوں کی کٹائی وغیرہ میں خود حصہ لینا، طلبا کے لئے سالن تیار کرنے میں گھر والوں کی معاونت کرنا ، مہمانوں کے لئے چائے اور کھانا تیار کرنا معمول کے کام تھے۔ ہماری والدہ فرماتی ہیں کہ جب آپ لوگ چھوٹے تھے، میں آپ لوگوں کو سنبھالنے یا گھر کے کسی کام میں مصروف ہوتی اور کوئی مہمان آ جاتے تو حضرت چائے وغیرہ خود بنالیتے اور مجھے فرماتے کہ تم اپنا کام پورا کرو۔

میں نے والدہ سے پوچھا کہ حضرت کے متعلق کوئی انوکھی بات بتائیں تو فرمانے لگیں کہ مدرسہ کی ابتدائی سالوں میں کاموں کی کثرت تھی ، ہمارے گھر میں افراد کم تھے اس لئے سارے کام مجھے نمٹانے پڑتے ، رات کو تھکاوٹ سے جسم چور چور ہوتا۔ حضرت صبح تہجد کے لئے اٹھ کر لکڑیاں پھونک پھونک کر خود چولہا جلاتے اور پانی گرم کر کے وضو فرما لیتے ، جب میں بیدار ہوتی تو حضرت کو دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوتا کہ مجھ سے تاخیر کیوں ہوئی۔ حضرت میری کیفیت دیکھ کر تسلی دیتے کہ مجھے آپ کے گھریلو مصروفیات کا احساس ہے اس وجہ سے یہ چھوٹے موٹے کام میں خود سرانجام دے سکتا ہوں، اس کے لئے آپ پریشان نہ ہوں۔

میرا اتنا خیال رکھتے کہ آگ جلانے کے لئے کمرہ کے اندر رکھی ہوئی لکڑیوں کو توڑ کر استعمال نہ فرماتے بلکہ باہر لے جا کر توڑتے تا کہ ہمارے آرام میں خلل واقع نہ ہو یہاں تک کہ مجھے بھی فرماتے کہ آگ لگانے میں احتیاط کیا کریں تا کہ ان چھوٹوں کی نیند خراب نہ ہو۔

ایک دفعہ بندہ حضرت کے ساتھ کسی بڑی تقریب میں ایک جگہ مقیم ہوا، میزبانوں نے ہم باپ بیٹے کے لیے ایک بیٹھک میں رہائش کا انتظام کیا اور بھی کئی مہمان تھے جو ارد گرد کے گھروں میں مقیم تھے، رات کو میں نے دیکھا کہ حضرت کی چارپائی خالی ہے، میں اٹھ کر بیٹھ گیا کہ آخر حضرت کہاں چلے گئے۔ اس دوران باہر سے پانی بہنے کی آواز آئی، میں نے اُٹھ کر دیکھا تو حضرت بیت الخلاء کی صفائی میں مصروف تھے۔ میں جا کر جھاڑو وغیرہ لینے کی کوشش کی لیکن حضرت نے فرمایا کہ تم جاؤ، میں کر لیتا ہوں، بس میں بھی ساتھ لگ گیا، جب فارغ ہوئے تو فرمانے

لگے کہ صفائی کے بارے میں ہمارے اکابر کا مزاج ممتاز تھا، میں نے بیت الخلاء اس وجہ سے صاف کی کہ کسی کو تکلیف نہ ہو، دوسری بات یہ ہے کہ کل لوگ دیکھیں گے کہ باپ بیٹے کا قیام ادھر تھا، گندگی بھی انہوں نے پھیلائی ہوگی۔

ایک مرتبہ حضرت حج پر تشریف لے جارہے تھے کہ پشاور کے ایک صاحب حاجی فخر عالم صاحب ان کے ساتھ جہاز میں رفیق سفر بن گئے، جناب سگریٹ نوشی کے عادی تھے اور حضرت کو سگریٹ کی بو سے سخت الرجی تھی اور انتہائی سخت تنگ ہوتے تھے، اس کے باوجود ان صاحب کو اپنی فطری مروت کی بنا پہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ مجھے آپ کی سگریٹ نوشی سے تکلیف ہورہی ہے۔ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد اولاً تو ان صاحب نے حضرت سے تلبیہ کے بارے میں پوچھا کہ بابا! آپ کو تلبیہ یاد ہے یا نہیں؟ اس کے بعد فوراً حضرت کو تلبیہ پڑھانا شروع کیا کہ بابا اس کو یاد کرنا ضروری ہے، حالانکہ ان کے بعض الفاظ میں غلطی تھی، حضرت نے بہت محتاط انداز میں اس کی تصحیح کر کے ان کو اپنے بارے معلوم نہیں ہونے دیا۔

پھر اس نے پوچھا کہ بابا آپ نے قرآن پڑھا ہے یا نہیں؟ حضرت نے کہا کہ میں ایک دیہاتی آدمی ہوں، پرانے زمانے میں اپنے علاقے کے ایک استاذ سے پڑھا ہے۔ اس نے جواباً کہا کہ پہلے زمانے میں اساتذہ کم ہونے کے ساتھ ساتھ آج کل کی طرح قابل بھی نہیں تھے، قرأت بھی صحیح نہیں ہوتی تھی اس لئے آپ دوبارہ کسی اچھے قاری سے قرآن پاک پڑھ لیں۔ حضرت نے بتایا کہ جب ہم مکہ مکرمہ پہنچے تو ہمارے تمام ساتھی تھکاوٹ کی وجہ سے سو گئے۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور عمرہ سے اپنے آپ کو فارغ کر کے واپس آیا، کپڑے وغیرہ تبدیل کر کے سر پر عمامہ باندھا تو موصوف نے خوشگوار موڈ میں مجھ سے کہا کہ بالکل مولانا جیسے لگ رہے ہو۔ میں نے کہا کہ شاید آپ کی نظر میں۔

پھر ایک دن شام کے وقت ہمارے علاقے کے کچھ احباب حضرت سے ملاقات کے لئے تشریف لائے، انہوں نے موصوف سے حضرت کے بارے میں کہا کہ استاذ صاحب کہاں ہے؟ تو اس نے حیران ہوکر کہا کہ ہمارے ساتھ کوئی استاذ وغیرہ نہیں ہے بلکہ ایک باباجی ہیں، وہ ذرا تاخیر سے آتے ہیں۔ انہوں نے اسے استاذ صاحب کا حلیہ بتایا تو اس پر کہنے لگا کہ ہاں اسی حلیہ کے باباجی ہیں۔ اس پر انہوں نے ان کو کہا کہ بندۂ خدا وہ تو بہت بڑے محدث و مفسر ہیں۔ یہ سن کر وہ بے چارہ بے حد پریشان ہوا کہ میں نے تو بے تکلفی میں اسے کیا کچھ کہا ہے۔ جب حضرت کو معلوم ہوا تو اس کی ایسی دلجوئی فرمائی کہ وہ آج بھی حضرت کا معتقد اور مداح ہے۔

حضرت کی تواضع اور مروت کا ایک اور عجیب واقعہ ہمارے ایک رشتہ دار نے سنایا کہ میں حضرت کے ساتھ

پشاور گیا تھا۔ ظہر کی نماز پڑھنے کے لئے ہم ایک مسجد گئے۔ نماز سے فراغت کے بعد دیکھا تو میرے جوتے کوئی لے گیا تھا، میں اپنے جوتے ڈھونڈنے لگا، حضرت استاذ صاحبؒ فرمانے لگے کہ میرے خیال میں آپ کے جوتے گم ہو گئے ہیں، میں نے عرض کیا کہ جی۔ فرمانے لگے کہ کس قسم کے جوتے تھے اور کس نمبر کے تھے؟ میں یہ سمجھا کہ استاذ صاحب بھی شاید ڈھونڈنے کے واسطے پوچھ رہے ہوں تو نوعیت بتلادی۔ حضرت نے فرمایا کہ آپ دوسری جانب ڈھونڈلیں ہوسکتا ہے آپ رکھنے کی جگہ بھول گئے ہوں، میں اس طرف جاتا ہوں۔ کچھ ہی دیر بعد میں نے دیکھا کہ استاذ صاحب میرے لئے نئے جوتے خرید کر تشریف لے آئے اور فرمایا کہ آپ یہ جوتے پہن لیں، پتہ نہیں آپ کے مزاج کے موافق ہیں یا نہیں، میں نے خریدے ہیں کیونکہ یہ پشاور ہے یہاں گم شدہ چیز کا ملنا مشکل ہوتا ہے۔

اسی طرح حضرت کا معمول تھا کہ ہمیشہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھتے اور چارپائی پر بہرصورت سرہانے کی بجائے پائنتی کی طرف بیٹھتے۔ درسگاہ میں جو گدی اساتذہ کے لئے رکھی جاتی ہے حضرت اس پر بھی بیٹھنے سے گریز فرماتے، مہمانوں کے جوتے خود سیدھے فرماتے، کھانے کے وقت بالکل ایک خادم کی طرح ان کی خدمت کرتے، ابتدائی ایام میں طلبا کے لئے گھر سے خود کھانا لاتے، جب کسی کتاب کی ضرورت پیش آتی تو بذات خود زحمت فرماتے، مختصراً یہ کہ بالکل ایک عام آدمی کی طرح زندگی بسر فرماتے۔

حضرت کی مثالی مروت پر یہ واقعہ بھی شاہد ہے کہ ایک مرتبہ ہمارے علاقے کے بزرگ عالم دین مولانا عبدالجبار صاحبؒ کے متعلق فرمایا کہ جب ہم ہنگو میں پڑھتے تھے، تو مولانا صاحب مجھ سے ایک سال آگے تھے مگر کمرے میں کھانا پینا اکھٹے کیا کرتے تھے، ایک دن میرے پاس رقم ختم ہوگئی، میں نے صبح کا ناشتہ چھوڑ دیا، عصر کے وقت مولانا نے مجھ سے پوچھا کہ آج صبح کی چائے پینے آپ نہیں آئے تھے، ان دنوں سخت گرمی بھی تھی، میرے جسم پر شدید گرمی کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے دانے نکل آئے تھے، میں نے بہانہ کر کے ان کو وہ دانے دکھائے کہ بھائی میرے جسم پر خارش ہے لہٰذا چائے چھوڑ دی، مولانا اگلے دن ایک حکیم کے پاس گئے اور دو شربت لے کر آئے، فرماتے کہ ان کا وہ احسان آج تک یاد ہے، لہٰذا ان کی اولاد کے ساتھ حسن سلوک کرتے رہنا، ان کے صاحبزادے جب بھی آتے تو حضرت بہت اکرام فرماتے۔

حضرت والد صاحب کبھی کسی کو از خود ذاتی خدمت کا نہیں فرماتے تھے، حتیٰ کہ خود مجھے بھی مالش یا بدن دبانے وغیرہ کا نہیں فرماتے، اگر ہم خود کرتے تو منع بھی نہ فرماتے لیکن اپنی زبان سے کبھی نہیں کہا، اگر کوئی کام ہم سے کروانا چاہتے تو فرماتے کہ فلاں کام اس طرح کرنا چاہئے، اکثر ہماری والدہ صاحبہ سے فرماتے کہ ان کو کسی چیز کے بارے میں حکماً نہ کہا کرو، ان کے نہ کرنے پر آپ کو ناراضگی ہوگی اور اس وجہ سے ان کی آخرت میں عنداللہ گرفت ہوگی۔

زہد وفقر اور مصائب ومشکلات

حضرت کے زہد کے بارے میں آپ کے تلمیذ رشید، جامعہ بنوری ٹاؤن کے استاذ الحدیث وناظم تعلیمات حضرت مولانا عطاء الرحمن شہیدؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے زہد کی کتابوں کو دیکھا اور پڑھا تھا مگر اس کا عملی نمونہ حضرت کی شکل میں دیکھا۔ بلکہ اگر یہ کہوں تو بے جانہ ہوگا کہ حضرت کی زندگی ان کتابوں کی تعبیر اور تفسیر تھی۔

حضرت کی تمام تر زندگی درویشانہ اور زاہدانہ تھی، آغاز سے لے کر شہادت تک حضرت کی زندگی زہد وفقر کا ایک درخشاں باب ہے۔ سرکاری اور غیر سرکاری اعلیٰ عہدیداروں سے تعلق کے باوجود کوئی یہ ثابت نہیں کرسکتا کہ حضرت نے ان سے ذاتی اغراض کو مدنظر رکھ کر کچھ کہا ہو۔

ایک مرتبہ جنرل عارف خان بنگش (سابق گورنر صوبہ خیبر پختونخواہ) نے مجھ سے کہا کہ بھائی! آپ کے والد صاحب سے میری اٹھارہ ملاقاتیں ہوئی ہیں، میں نے کبھی بھی ان سے ذاتی غرض کی بو بھی محسوس نہیں کی۔ اسی طرح سابق گورنر علی محمد جان نے ایک موقعہ پر کہا کہ ''اکثر میں ان سے تنہائی میں عرض کرتا کہ کسی خدمت کا موقع دیں، تو حضرت فرماتے کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں، ایک دفعہ میں نے کچھ رقم بھیجی تو حضرت نے صرف واپس ہی نہیں کی بلکہ تنبیہی پیغام بھی بھیجا کہ اگر آئندہ ایسا کیا تو ملاقات کا موقع بھی نہیں دوں گا''۔

جب بااثر حضرات آتے تو حضرت فرماتے کہ ان کی اچھی طرح خدمت کرو تاکہ ہمارے بارے میں یہ نہ سوچیں کہ ان کو یہاں فلاں فلاں چیز کی ضرورت ہے۔

ابتدائی زمانے میں حضرت کے حالات بڑے ہی فقر کے تھے حتی کہ کرایہ نہ ہونے کی وجہ سے ہنگو شہر میں نماز جمعہ ادا کرنے کے لئے پیدل جاتے۔ ایک دن مجھے خود فرمایا کہ اب آپ لوگ مزے کرو کہ کسی چیز کی کمی نہیں، آپ لوگ تو شکر کریں کہ وقت نے آپ کے لئے ضرورت اور سہولت کی اصطلاح کو بھی ختم کر دیا۔ میں اب بھی تخیلات وتصورات کی دنیا میں جاتا ہوں اور آغاز کی زندگی یاد کرتا ہوں تو آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوتے ہیں، اکثر ان بے تحاشا انعامات سے ڈر لگتا ہے کہ کہیں ٹوٹے پھوٹے مجاہدات کا عوض نہ ہو۔

فرماتے: بیٹا! زمانہ طالب علمی میں ہمیں بچپن سے لے کر دورۂ حدیث تک سہولیات تو دور کی بات اپنی زندگی کی ضروریات بھی میسر نہ تھیں، ابتدا سے ہی ابتلا اور مصائب کا سامنا تھا۔ سب سے پہلا جو امتحان آن پڑا تھا، وہ اپنے والدین کے سایہ عاطفت سے محرومی تھی، اس وقت برادران بھی کم سن تھے، کسی کام کاج کے قابل نہیں تھے۔ مجھے اپنے والد کی شہادت پوری طرح یاد نہیں کیونکہ میں تو بالکل چھوٹا تھا، بلکہ میرے بڑے بھائی حاجی مسلم الدین

صاحب کی عمر بمشکل چودہ سال تھی، نہایت سخت اور کٹھن حالات کے باوجود آپ کو ہماری ذات پر کوئی انگلی اٹھانے والا نہیں ملے گا کہ اس بے کسی اور بے بسی کے زمانے میں کسی کی گستاخی و بے ادبی یا کسی سے بداخلاقی کا مظاہرہ کیا ہو، الحمدللہ اپنی تحمل مزاجی اور ذاتی شرافت سے ہر مشکل و مصیبت کو خندہ پیشانی سے قبول کر کے آپ کے لیے ایک تاریخ چھوڑ رہا ہوں۔

ایک بار فرمایا: مجھ پر بہت سی مشکلات آئی ہیں، خصوصاً جب کراچی سے آیا تو ایسے حالات درپیش ہوئے کہ ان کی تلخی تصور سے بھی بالاتر تھی۔ بدعات کی مقاومت اور سنت کے پرچار کی وجہ سے پوری فضا میں مخالفت کے علاوہ کچھ نہیں تھا، لوگ معاونت و محبت کے بجائے مخالفت وعداوت پر اتر آئے تھے۔

اس زمانے میں حضرت کے فقر کی یہ حالت تھی کہ بسا اوقات گھر میں کھانے پینے کی اشیا بھی دستیاب نہ ہوتی تھیں۔ فرماتے: ایک دور ایسا بھی تھا کہ میں رات کی تاریکیوں میں طلبا سے بچے ہوئے روٹی کے ٹکڑے اٹھا کر مرچ اور پیاز کے ساتھ کھالیتا اور ایسا وقت بھی آیا کہ دوپہر کے وقت طلبا کو اسباق پڑھانے کے بعد جب طلبا سو جاتے، تو میں سخت گرمی میں باہر جنگل کی طرف چلا جاتا اور جنگلی بیر، انجیر وغیرہ کھالیتا اور ان سے اپنی بھوک مٹاتا۔

فرمایا: برخوردار! ایک دن گھر میں کھانا کھانے بیٹھا، اطلاع ملی کہ دو مہمان آئے ہیں، جو ماحضر تھا وہ مہمانوں کے لیے لے گیا۔ ان سے کچھ بھی نہیں بچا تو فاقہ کرنا پڑا، گھر آیا تو تیری والدہ پریشانی کے عالم میں کہتی ہے کہ یہ تنگ دستی کب فراخی میں تبدیل ہوگی۔ کاش! میرا ایک کوئی بھائی ہوتا تو اس سے مدد مانگتی، (والدہ صاحبہ کے بھائی نہیں تھے) یہ فاقے تو نہ آتے۔ میں نے پوچھا کہ کیا ہوا، کیوں پریشان ہو رہی ہو؟ اس نے کہا کہ آپ نے پڑوس سے بھی کچھ مانگنے پر پابندی لگائی ہوئی ہے، اب میں کیا کروں گی؟ جو کھانا آپ کے لئے رکھا تھا وہ آپ مہمانوں کے لے گئے، میں نے آپ کے بھائی کے گھر میں روٹی تلاش کی، مگر یہ ایک سوکھا ٹکڑا ملا ہے۔ فرمایا: میں خود ان جیسے مواقع کو تلاش کرتا کہ کب ایسا موقع ملے کہ میں اس کی مناسبت سے تمہاری والدہ کی ذہن سازی کر سکوں، میں نے کہا کہ کیا تم نے میرے سامنے کھانا نہیں رکھا تھا؟ لیکن وہ میرے حصے کا رزق نہیں تھا، وہ تو ان مہمانوں کے مقدر میں تھا، وہ حضرات کھا گئے۔ شاید کریم و حکیم ذات کی کوئی حکمت ہو کہ مجھے یہ سوکھی روٹی دینا چاہتے ہوں، یہ مقدر کی باتیں ہیں، اس میں پریشانی کی کیا ضرورت ہے؟ اس سے بڑے بڑے امتحانات اللہ تعالیٰ کے مقربین پر آئے ہیں۔ خصوصاً ہمارے پیارے محبوب سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تو فقر و فاقہ کے بہت سخت حالات گزرے ہیں۔ اس کے ساتھ میں نے صبر کی بھی تلقین کی، مزید آپ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور اپنے اکابرؒ کے کچھ واقعات سے تسلی کروا کر مسجد کی طرف چلا گیا۔

دو پہر کا وقت تھا، دو رکعات صلوٰۃ حاجت پڑھ کر سونے کے ارادے سے مسجد سے باہر آیا تو باہر حجرے کی چارپائی پر ایک شخص بیٹھا نظر آیا، پہلے تو پریشانی لاحق ہوئی کہ یا اللہ! یہ تو کوئی مہمان ہے، کھانے کا وقت بھی ہے اور گھر میں کھانے کی کوئی چیز بھی نہیں۔ جب قریب پہنچ کر دیکھا تو وہ کوئٹہ سے تعلق رکھنے والا میرا ایک مخلص ساتھی تھا، علیک سلیک کے بعد فوراً کہنے لگا کہ میں کھانا کھا چکا ہوں اور تھکاوٹ سے جسم چور چور ہے بس صرف آرام کرنا چاہتا ہوں اور ساتھ لائے ہوئے تھیلے کی طرف اشارہ کر کے بولا کہ اس کو کسی کے ذریعہ گھر بھیج دو۔ میں نے ان کو حجرہ میں سلایا، اور سامان بذاتِ خود گھر لے گیا، اس میں کھانے پینے کی کافی چیزیں تھیں، میں نے تیری والدہ کو تھماتے ہوئے کہا کہ لے! تو بڑے دور کے واسطے دے کر مانگ رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ایک دینی بھائی کے ذریعہ تمہاری ضرورت پوری کر دی، شاید تیرا سگا بھائی ہوتا تو وہ بھی اتنی جلدی ضرورت نہ پوری کر پاتا۔

حضرتؒ یہ بھی فرماتے تھے کہ ” میرے نزدیک صرف مسلمان نہیں بلکہ مطلق انسان پر بھی امتحان آئے گا اور خاص کر مسلمان اور امتحان تو لازم اور ملزوم ہے، اسی وجہ سے ہمارے اکابر ان امتحانات کو لرفع درجات یا لدفع سئیات قرار دیتے ہیں، صاحب ایمان کے لیے استقامت شرطِ اول ہے، ان مصائب میں اسے کلفت نہیں مسرت محسوس ہوتی ہے، ان حالات کو اپنے لیے شقاوت و مصیبت کا نہیں بلکہ سعادت و رحمت کا ذریعہ سمجھتا ہے، اس لذت میں وہ ایسے مست ہو جاتا ہے کہ بہت سے منازل طے کرتا ہوا اپنے محبوب کے ہاں ایک خاص مقام کو پالیتا ہے، جیسے حضرت بلالؓ و حضرت خبیبؓ کو ان مصائب و مشکلات میں قربِ الٰہی کے خاص اسرار نظر آتے، ان تکالیف کی بدولت یہ حضرات عشق و جنون کی وہ تاریخ رقم کر گئے کہ اہل دنیا سے اپنے آپ کو منوایا۔ اس بات پر تاریخ گواہ ہے کہ اس تیز رفتار سفر کے لیے صبر و شکر کی پروں کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔“

حضرت کی ابتدائی زندگی میں بے شک فقر اضطراری تھا لیکن جب اس کی لذت سے آشنائی ہوئی تو بعد میں اس کی شان اختیاری تھی۔ اس کی زندہ مثال حضرت کا ذاتی گھر تھا، اس کا یہ حال تھا کہ صرف دو کچے کمرے تھے، ایک رہائشی اور دوسرے کمرے میں حضرت کی ذاتی کتابیں اور گھریلو سامان رکھا ہوتا۔ حضرت کے رہائشی کمرہ کی بہت ہی عجیب حالت تھی۔ لوگ اس میں خطرہ محسوس کرتے کہ کہیں گر نہ جائے۔

ایک دفعہ حضرت مولانا حبیب اللہ مختار شہیدؒ مع اہل وعیال کے تشریف لائے تھے۔ ان کی اہلیہ اور بچوں کے لئے رات کو سونے کا انتظام حضرتؒ کے رہائشی کمرے میں کیا گیا تھا اور مولانا مختار شہیدؒ حضرت کے ساتھ مدرسہ میں ٹھہرے، رات کے وقت بچے اس کمرے کے درو دیوار اور چھت دیکھ کر گھبرائے اور کہا کہ ہمارے ابا جی کو بلائیں، ہمیں یہاں ڈر لگتا ہے۔ مولاناؒ گھر کے دروازے پر تشریف لائے تو اہلیہ محترمہ نے فرمایا کہ بچے وہاں سونے کے

لئے تیار نہیں ہیں، کمرہ کچا ہونے کی وجہ سے ڈر محسوس کر رہے ہیں۔ حضرتؒ نے کافی تسلی دی کہ یہاں ساری آبادیاں اسی طرح ہیں مگر وہ نہ مانے پھر ان کیلئے ہمارے چچا کے گھر پر آرام کرنے کا انتظام کیا گیا، ان کے کمرے پختہ تعمیر تھے۔

صبح ناشتے کے بعد حضرت مولانا حبیب اللہ مختارؒ نے گھر دیکھنے کی خواہش ظاہر فرمائی۔ حضرت والد صاحبؒ نے کافی کوشش کی کہ مولانا وہ کمرے نہ دیکھ پائیں لیکن حضرت مولانا کے بے حد اصرار کی وجہ سے والد صاحب مجبور ہوگئے اور مجھ سے کہنے لگے کہ گھر میں پردہ کا انتظام کرلیں، کچھ ہی دیر بعد دونوں حضرات گھر آگئے، جب مولانا حبیب اللہ صاحبؒ نے کمرہ کا معائنہ فرمایا تو آبدیدہ ہوگئے اور فرمانے لگے کہ زندگی کا مزہ ان کھنڈرات میں ہے۔

پھر فرمایا: مجھے آپ کے ذوق کا خوب اندازہ ہے لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بارش یا آندھی میں گر جائیں۔ گھر سے نکلتے وقت راستے میں حضرت والد صاحبؒ کا ہاتھ پکڑ کر فرمانے لگے کہ آپ میرے بھائی ہیں، میں کچھ رقم کا انتظام کہیں سے کراوں گا اور یہ کمرے نئے تعمیر کرلیں۔ والد صاحب نے کہا کہ ہمارے بڑے بھائی نے ارادہ کیا ہے، ان شاء اللہ عنقریب بن جائیں گے، ہمارے تایا بھی وہیں گھر کے راستے میں کھڑے تھے، مولانا صاحب ان سے کہنے لگے کہ بھئی! اس کے لئے گھر جلدی تعمیر کریں۔ تایا صاحب نے گھر کی تعمیر کے لئے تمام چیزوں کا انتظام کرلیا مگر حضرت پھر بھی تیار نہ ہوئے، انہوں نے چھ بار حضرت کا کمرہ تعمیر کرنے کی نیت سے سامان لایا مگر حضرت نے ہر بار معذرت فرمائی۔ بالآخر شہادت سے تین سال قبل وہ گھر اتنا بوسیدہ ہوگیا تھا کہ مزید رہائش کا متحمل نہیں تھا لہٰذا ہم نے وہ گھر منہدم کردیا لیکن حضرت نے اپنا کمرہ نیا تعمیر نہیں ہونے دیا اور میری شادی کے موقع پر میرے لئے جو کچا کمرہ تعمیر کیا تھا اپنی زندگی کے بقیہ ایام اسی کمرے میں گزارے۔ آج بھی اکثر احباب اس کی زیارت کیلئے آتے ہیں۔

گھر کی طرح مدرسہ کی تعمیر میں فقر کی یہی شان رکھی، جب بھی ہم حضرت سے عرض کرتے کہ اگر یہ تعمیر اس طرح ہوجائے تو بہتر ہوگا تو آپؒ جواب میں فرماتے کہ بھائی! یہ ساری خواہشات ہیں کہ یہ کام فلاں ترتیب سے ہوجائے، ہم قطعاً ترتیب کے مکلف نہیں بلکہ کام کے مکلف ہیں۔ مدرسے کی ساری تعمیر میں دیواروں میں سیمنٹ وغیرہ کے بجائے مٹی کا استعمال کیا ہے۔ فرماتے تھے کہ اگر بالفرض کل عمارت گرانی پڑے تو آسانی ہوگی اور اینٹ وغیرہ بھی خراب نہیں ہوگی۔ مدرسہ اور مسجد کی ابتدائی تعمیر کے وقت ہمارے اکثر ساتھیوں کا اصرار تھا کہ اگر بنیادیں مضبوط اور کنکریٹ کی پختہ رکھ دی جائیں تو بہتر ہوں گی۔ حضرت اس وقت فرمایا کرتے تھے کہ ان عمارات میں ویسے بھی تیس سال کے بعد تبدیلی آنے والی ہے۔ مضبوط بنا کے کیا کرنا ہے۔ یہ بھی حضرت کا کشف تھا، تقریباً تیس سال کے بعد بمباری میں اکثر عمارات ملیامیٹ ہوگئے۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ احادیث میں وہ رقم بدترین قرار دی گئی ہے جو عمارت پہ لگ جائے۔ اسی وجہ سے محسن اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے چودہ سو سال پہلے اپنی امت کو ان البزازۃ من الایمان کی تعلیم دی ہے۔ اس میں صاف اشارہ ہے کہ محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی سادگی کو ترجیح دی ہے اور امت کے لئے بھی اسے پسند فرمایا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی زندگی اس پر عین شاہد ہے، ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کی نماز میں سجدہ کے لئے جاتے وقت میرے پاؤں کو دبا دیتے تو میں اپنے پاؤں کو ہٹاتی او رآپ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ فرماتے۔ ان روایات میں رہن سہن کے حوالے سے امت کیلئے بہت سی تعلیمات ہیں ۔ جب تک مسلمانوں میں یہ عظیم صفات موجود تھیں تو اس وقت تک یہ ترقی کے راہ پر گامزن تھے۔ فرمایا: تمہیں تاریخ بھی بتائے گی کہ صحابہ کرامؓ سے لے کر ہمارے اکابر علمائے دیوبند تک تمام حضرات رہن سہن میں تکلفات کے قائل نہیں تھے۔

ہم نے اپنے آپ کو پریشانی میں ڈالا ہے کہ کام سے پہلے ہی خیالی نقشے بنا دیتے ہیں کہ ایسا مدرسہ، اتنے کمرے، ایسا دارالحدیث بنائیں گے۔ حالانکہ یہ ہمارے اسلاف کے مزاج کے صریح خلاف ہے۔ ہمیں بار بار علامہ بنوریؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہم جس چیز کے مکلف نہیں ہیں خواہ مخواہ اپنے آپ کو اس چیز کا مکلف بنا دیتے ہیں، اسی وجہ سے ہم ذلت کا شکار ہو جاتے ہیں، اگر آج ہم جتنے کام کے مکلف ہیں اتنے کو اختیار کریں تو کوئی پریشانی ہی نہیں رہے گی، ہمارے حضرت بنوریؒ اسی وجہ سے اخلاص اور تقویٰ پر بہت زور دیتے تھے اور ہمارا مادر علمی جامعہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اس میں تعمیرات کے بجائے تعلیم وتربیت، اخلاص وتقویٰ، زہد و سادگی پر توجہ ہوتی تھی اور جامعہ کی ترقی کی وجہ بھی یہی ہے۔ جب سے معرض وجود میں آیا ہے، آج تک اسی سادہ اور قدیم طرز پر قائم ہے۔ سادگی کے باوجود طلبا کی کثرت اور علمی خدمات میں سب سے بڑھ کر ہے۔

حضرت لباس میں بھی بہت سادگی پسند تھے، ہماری والدہ کہتی ہے کہ حضرت استری شدہ کپڑے پہننا پسند نہیں فرماتے تھے اور گھر میں بھی اسی پر زور دیتے تھے کہ بغیر استری کے کپڑے استعمال کیے جائیں۔ فرماتی ہے کہ مجھے یاد نہیں ہے کہ حضرت نے ملبوسات کے بارے میں یہ فرمایا ہو کہ یہ اچھا ہے یا برا یا مجھے فلاں کپڑے دیدو۔ ہاں صرف موسم کے اعتبار سے فرماتے کہ یہ کپڑا موٹا ہے یا باریک ہے۔ متعلقین حضرات بہت اچھے اچھے کپڑے ہدیہ میں لاتے تھے مگر حضرت ان کو سال کے اختتام پر مدرسہ کے اساتذۂ کرام اور غریب طلبا میں تقسیم فرما دیتے۔

ماکولات ومشروبات میں بھی سادگی کو ترجیح دیتے تھے، اکثر بغیر دودھ والی چائے کے ساتھ روٹی تناول فرماتے تھے، حضرت کی اقامت گاہ، نشست، مکتبہ، دفتر، ذاتی کمرہ ہر چیز فقر و درویشی اور سادگی کی یادگار ہے۔ سادگی کے

باوصف حضرت کے مزاج پر نفاست کا بہت زیادہ غلبہ تھا، انتہائی صاف ستھرے رہتے اور کپڑے کمرے بھی اس سلیقے سے صاف رکھتے کہ حسن وجمال کی خاص دل آویزی ٹپکتی۔

والد گرامی نے مدرسہ کو خالص توکل اور زہد وفقر کی بنیاد پر چلایا، کئی بار اس کی نوبت آئی کہ مدرسہ بند کردیا جائے، لیکن اللہ تعالیٰ کی نصرت کے کھلے نظارے ہوتے اور کام چل پڑتا۔

ایک مرتبہ گرمی کے موسم میں حضرت مولانا فضل محمد صاحب عین دوپہر کے وقت تشریف لائے، بندہ اس وقت چھوٹا تھا اور کھیل کود میں مصروف تھا۔ حضرت کو دیکھ کر ان سے مصافحہ کے لئے حاضر ہوا، فرمانے لگے کہ پہلے یہ کام کرو کہ گھر میں جو کھانا تیار ہو وہ لے کر آؤ، اور اگر کوئی چیز تازہ تیار کی تو یاد رکھیں پھر میں کھانا ہرگز نہیں کھاؤں گا۔ بندہ نے جلدی سے ماحضر پیش کیا، اس دوران والدہ صاحبہ نے حضرت والد صاحب کو جگادیا، وہ بھی حاضر خدمت ہوئے، کھانے کے بعد والد صاحب کو کمرہ میں تنہائی میں بیٹھایا اور تمام حاضرین کو نکال دیا، کچھ دیر بعد بندہ کسی کام کے واسطے اندر داخل ہوا، تو دیکھا کہ دونوں حضرات رو رہے ہیں، حضرت مولانا فضل محمد صاحبؒ حضرت والد صاحبؒ کے ہاتھوں کو چوم رہے تھے اور والد صاحب اس جگہ کو چومتے، جہاں حضرت نے ہونٹ لگائے تھے، کچھ دیر بعد حضرت واپس چلے گئے۔ والد صاحب نے بندہ کو بلاکر فرمایا: تم نے جو کچھ دیکھا، اس کو کسی سے بیان نہ کرنا۔ بندہ نے پوچھا کہ حضرت اتنا اچانک آکر جلدی واپس کیسے چلے گئے؟ اس سوال پر والد صاحب پر گریہ طاری ہوا۔ کچھ دیر بعد فرمایا کہ حضرت مہتمم صاحب کو خواب میں جناب سیدنا محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی اور فرمایا کہ میرا بیٹا محمد امین پریشان ہے، آپ ان کی فکر کریں۔ استفسار پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جامعہ یوسفیہ کی کچھ مالی پریشانی ہے، آپ ابھی روانہ ہوجائیں۔ اس پر حضرت کافی دیر تک روتے رہے، فرمایا: ہمارے کام کو دیکھو لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں یاد رکھتے ہیں۔

سخاوت اور انفاق فی سبیل اللہ

اللہ تعالیٰ نے والد صاحب میں سخاوت وانفاق کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا والد صاحب جب کہیں سفر پر جاتے تو واپسی پر بڑوں سے چھوٹوں تک ہر ایک کے لئے ان کی شان اور ذوق کے مطابق تحائف لاتے اور جب کسی کے پاس تشریف لے جاتے تو اپنے ساتھ ضرور کوئی نہ کوئی ہدیہ لے کر جاتے۔ صرف اندرون نہیں بلکہ بیرون ملک میں بھی اپنے متعلقین کو ہمیشہ کچھ نہ کچھ ضرور بھیجتے۔

جب میں کراچی میں زیر تعلیم تھا تو اکثر علاقائی چیزیں مثلاً شہد اور اخروٹ وغیرہ اپنے خاص متعلقین کے علاوہ

میرے تمام اساتذۂ کرام اور خصوصاً حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب اور حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب مدظلہم العالیہ کے لئے ہدیہ بھیجتے۔

اپنے علاقے میں عیدین کے موقع پر غربا وفقرا کے گھرانوں میں انتہائی اخفا سے سامان ضرورت تقسیم فرماتے۔ ضرورت منداور حاجت مندلوگوں کے علاوہ باہر سے آنے والے مہمانوں کو رخصتی کے وقت کچھ نہ کچھ رقم ضرور دیتے، خصوصاً رمضان المبارک میں لاکھوں روپیہ تقسیم کرتے۔اسی طرح مدارس اور مساجد کے ساتھ بھر پور معاونت فرماتے اپنے متعلقین کے مدارس پر خاص توجہ فرماتے تھے۔جہاد افغانستان میں بہت زیادہ رقم لگایا کرتے تھے اور جس کو بھی یہ رقم حوالہ کرتے اس سے مضبوط عہد لیتے کہ اس رقم کو افغانستان میں خرچ کرنا ہے اور مستحق تک پہنچنے سے قبل ان نوٹوں میں بھی تبدیلی نہ ہونے پائے۔فرماتے کہ جن حضرات نے مجھ پر اعتماد کرکے یہ رقم دی ہے۔میں آپ پر ان شرائط کے تناظر میں اعتماد کرکے خود کو بری الذمہ کرکے تمہیں حوالہ کرتا ہوں، آگے آپ حضرات کی ذمہ داری ہے کہ اس امانت کو شریعت کے حدود میں رہتے ہوئے استعمال کریں۔صرف ایک سال کے دوران افغانستان میں مستحقین کے لیے ستر والاکھ کی خطیر رقم بھیجی۔

علاقے اور خاندان کے جو حضرات دور کے مدارس میں پڑھتے تو ان کو بھی رخصت کے وقت کچھ رقم ضرور عنایت فرماتے اور وہ حضرات جو گھر کی طرف سے مالی تنگی کا شکار ہوتے ان کو سال بھر کا خرچہ دیتے۔اسی طرح اگر کوئی تبلیغ میں جاتا تو اس کے ساتھ بھی تعاون فرماتے۔اپنے متعلقین میں سے اگر کوئی فوت ہوجاتا تو ان کے اہل وعیال پر خود بھی خرچ فرماتے اور قریبی احباب کو بھی متوجہ کرتے۔

جب کوئی حضرت سے مالی تعاون کی اپیل کرتا اور حضرت کے پاس کچھ نہ ہوتا تو اپنے متعلقین سے قرض لے کر ان کی ضرورت کو پورا فرماتے۔عام بھکاریوں کو بھی حسب استطاعت نوازتے اور اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ان بے چاروں کو خالی ہاتھ ہرگز واپس نہ کیا کریں تاکہ "یمنعون الماعون" کے تحت نہ آجائیں اور اگر دینے کو پاس کچھ نہ ہو تو "أما السائل فلاتنہر" کو پیش نظر رکھ کر باعزت طریقے سے رخصت کرنے کی کوشش کریں۔

اپنے علاقے میں اگر کوئی بھکاریوں کو تنگ کرتا تو حضرت سخت ناراض ہوتے اور فرماتے کہ اللہ کے بندو! اگر دعا نہیں لے سکتے ہو تو کم از کم ان کی بد دعا سے بچنے کی فکر تو کریں۔بندۂ ناچیز کو ہمیشہ تلقین فرماتے کہ" دینی امور میں سرپرستی کے بجائے معاونت کو ترجیح دیا کریں، اور تعاونو اعلی البر و التقوی میں اسی طرف اشارہ ہے"۔

اگر میں یہ کہوں کہ ہمارے علاقے میں ایسی مساجد اور دینی مراکز نہ ہوں گے جن میں حضرت نے مالی معاونت نہ فرمائی ہوں تو قطعاً مبالغہ نہ ہوگا۔

اسی طرح اپنے مدرسہ میں غریب اور مسافر طلباء کرام پر خصوصی توجہ فرماتے ۔میں نے حضرت کو ایسی حالت میں بھی دیکھا ہے کہ ان کی جیب میں ذاتی رقم بالکل ختم ہوجاتی تو دیکھنے والوں کو یاد ہوگا کہ کبھی کبھار حضرت مجھے تنہائی میں لے جا کر فرماتے کہ گھر جا کر اپنی والدہ یا چچا صاحبان یا میری بہنوں سے کچھ رقم بطور قرض لے آؤ ،میں لاتا تو حضرت وہ رقم آنے والے مہمانوں کو عطیہ فرماتے ۔

حضرت کا لطف وعطا اور جود وسخا ماہِ رمضان میں مزید پھوٹ پڑتا اور ماہِ رمضان میں صرف عبادت نہیں بلکہ سخاوت کا سلسلہ بھی زوروں پر ہوتا۔ایک رمضان کی فہرست بندہ کے پاس موجود ہے جس میں تقریباً تین لاکھ روپے نقدی اور کچھ دیگر اشیاء ضروریہ مثلاً گھی ،آٹا ،چینی ،چائے کی پتی اور چاول وغیرہ فقرا ومساکین میں تقسیم کرنے کے بارے میں تفصیل لکھی گئی ہے۔عجیب بات یہ تھی کہ ہر دوسرے روز نماز اشراق کے بعد مجھ کو بلا کر اپنی جیب سے ایک فہرست نکال لیتے جس پر قریبی علاقوں کے تمام فقرا کے نام لکھے ہوتے اور ساتھ ہی ان کو دی جانی والی رقم اور دیگر اشیا کی مقدار درج ہوتی ۔فہرست کی حوالگی کے وقت فرماتے کہ یہ امانت جلد از جلد ان حضرات کو پہنچا دو تا کہ وہ عید کی خریداری کر سکیں اور ساتھ تاکید فرماتے کہ یہ چیزیں اس انداز سے تقسیم کریں کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلے۔اسی طرح جو رقم ہمارے عزیز واقارب میں تقسیم ہوتی اس کا علم ہماری والدہ محترمہ کو بھی نہ ہوتا۔امانت دینے سے پہلے فرماتے کہ اگر میں معتکف نہ ہوتا تو یہ کام میں بذاتِ خود کرتا مگر از روئے مجبوری تمہیں تکلیف دیتا ہوں۔اس میں میرا مقصد آپ کی تربیت بھی ہے لیکن خدارا! اس بات کو ملحوظ خاطر رکھو کہ یہ میں کسی شہرت کے لئے نہیں بلکہ اپنی آخرت کے لئے کر رہا ہوں ،اس لئے اس بات کو پھیلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔اللہ تعالیٰ حضرت کی تمام خدمات کو مقبول ومنظور فرمائیں۔

کسی کے والد کا انتقال ہوجاتا تو تعزیت کے بعد ان کو اپنے والد کے متعلقین سے تعلقات برقرار رکھنے کی تلقین فرماتے کہ یہ والد کا بنیادی حق ہے۔

اتباعِ سنت اور بدعت سے نفرت

حضرت کی زندگی کا ایک ایک کام اور لحظہ اتباعِ سنت سے معمور تھا،حتی کہ مستحبات وآداب کا بھی پورا خیال رکھتے تھے۔بدعات ورسومات سے سخت نفرت تھی ،کسی مجلس یا محفل میں کوئی معمولی بدعت کی بات دیکھتے تو وہاں سے احتراز کرتے ،آئندہ کے لیے وہاں جانے سے بچتے۔

جب لوگ بیعت کے بارے میں مشورہ لیتے تو حضرت فرماتے کہ متبع سنت مرشد سے بیعت ہونا چاہیے۔

اگر کوئی نماز کی قرأت وتلاوت میں مسنون مقدار کا لحاظ رکھتا تو بہت خوش ہوتے اور مسنون مقدار میں کوتاہی پر

اگر مہمان نہ ہوتا تو تنبیہ بھی کرتے۔ جب ہم مینگورہ میں پڑھتے تھے تو ایک ہفتہ چھٹی پر گھر آئے تھے، واپسی جمعہ کو تھی۔ حضرت نے فرمایا کہ آپ لوگ ہفتہ کے دن جائیں کیونکہ ایک روایت میں جمعہ کے دن سفر سے ممانعت آئی ہے۔ ہم جمعہ کے بجائے ہفتہ کو گئے تو ناظم صاحب نے حضرت مولانا فضل محمد صاحب سے ہماری شکایت کردی، حضرت نے پوچھا کہ کل کیوں نہیں آئے تو ہم نے والد صاحب کی بات سنادی، اس پر حضرت مہتمم صاحبؒ نے حاضرین مجلس سے فرمایا کہ حضرت اورکزئی صرف عامل بالسنۃ ہی نہیں، عامل بالحدیث بھی ہیں۔

ایک دن فجر کی اذان کے بعد نماز سے پہلے مسجد کے برآمدے میں لیٹ گئے، میں سمجھا کہ شاید حضرت کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اس لئے جلدی سرہانہ اُٹھا کر حاضر کیا، تو حضرت نے فرمایا، سرہانے کی حاجت نہیں، ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھار اس طرح لیٹتے تھے، اتباع سنت میں ایسا کیا، یہ بھی حضرت کا معمول تھا۔

فرماتے: یہ میرا عقیدہ ہے اور جاء الحق وزھق الباطل الخ میں اس طرف اشارہ ہے کہ جہاں سنت کا نور آئے گا، بدعت کی ظلمت مٹ جائے گی، اگر توحید کی روشنی آنے گی تو شرک کی ظلمت بھاگ جائے گی۔

اخلاص وتقویٰ

حضرت والد صاحب کو اللہ تعالیٰ نے بچپن ہی سے اخلاص وتقویٰ کی دو صفات سے بطور خاص نوازا تھا۔ بندہ نے حضرت سے اخلاص وتقویٰ کی حقیقت کے متعلق جو کچھ سنا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اخلاص کا معنی ایسی خالص شی جو ہر قسم کی ملاوٹ اور مشتبہات سے پاک ہو اور تقویٰ کا معنی اپنے مالک کو اس کی امانت اس انداز میں واپس کرتا کہ جس میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ ہو۔

فرماتے: جس طرح ہم ملاوٹ شدہ دودھ قبول نہیں کرتے بالکل اسی طرح خداوند قدوس ہمارے اس عمل کو بھی قبول نہیں فرماتے جس میں ظلمت شرک وکفر ظلمت بدعت ورسم یا ظلمت ریا ہو۔

تقویٰ کی مثال شیشے کی گلاس سے دیا کرتے تھے کہ کسی نے امانتاً ایک شفاف گلاس آپ کے پاس رکھا اور اس کا مطالبہ ہے کہ اسے اسی حالت پر واپس لوٹانا ہے تو اسے معمولی میل کچیل سے بھی بچا کر رکھنا ہوگا کیونکہ شفاف شیشے پر آلودگی کا معمولی اثر بھی نمایاں ہوتا ہے۔ اگر بالفرض یہ گلاس میل کچیل سے آلودہ یا ٹوٹ جائے تو ہم کس طرح اسے اپنے مالک کو واپس کریں گے۔ متقی کے اعمال ایسی شفاف حالت میں اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچتے ہیں، اگر ہمارا ہر عمل سیئات ومعصیات کے اثرات سے منزہ ہو تو تب اس عمل کو رب لم یزل قبولیت سے نوازے گا۔

حضرت کے اخلاص و تقویٰ کے بہت سے واقعات ہیں، اپنی زندگی میں ان کا خود بھی خاص اہتمام رکھا اور دوسروں کو بھی تلقین فرماتے رہے۔ آپ نے ملکی سطح پر عموماً اور علاقائی سطح پر خصوصاً بہت سی دینی، مذہبی، قومی اور سیاسی خدمات سرانجام دی ہیں لیکن ان کے بارے میں عام طور کسی کو علم نہیں کیونکہ وہ ان چیزوں کا اظہار اپنے اخلاص کے منافی سمجھتے تھے۔ اس کی ایک بڑی مثال اہلیانِ ہنگو کے لئے سوئی گیس کی فراہمی ہے۔

ایک بار ایک ضروری کام کے سلسلے میں بندۂ ناچیز حضرت کی معیت میں اسلام آباد گیا تھا۔ رات کے وقت جب اپنے کاموں سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ تمہارے پاس ہمارے ایم این اے ڈاکٹر غازی گلاب جمال صاحب کا فون نمبر ہے؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں! حضرت نے فرمایا کہ ان کو بتائیں کہ حاجی امین گل صاحب کے گھر پر تشریف لے آئیں (یہ حضرت کے قدیم ساتھی ہیں اور اسلام آباد میں مقیم ہیں۔) میں نے ڈاکٹر صاحب کو فون کر کے بتایا، وہ آگئے۔ حضرت نے ان سے ساتھی مسائل پر تفصیلی بات چیت کے بعد اہلیان ہنگو کے لئے سوئی گیس کی فراہمی کا مطالبہ کیا اور فرمایا کہ یہ ہمارا برحق مطالبہ ہے کیونکہ ہمارے ضلع کی گیس کے وسائل سے اہلیانِ ہنگو کو محروم رکھ کر دوسرے اضلاع کو فائدہ پہنچایا جارہا ہے جو ہمارے ضلع کے ساتھ سراسر ناانصافی اور باعث تشویش ہے۔ ساتھ یہ بھی فرمایا کہ الحمدللہ اب آپ کو اللہ تعالیٰ نے خدمت خلق کا موقع دیا ہے اس کو غنیمت سمجھ کر فائدہ اٹھانا چاہیے، آپ حضرات اقوام اورکزئی کے ایم این اے ہیں مگر بحیثیت وفاقی وزیر یہ کام اور بھی آسانی سے آپ سرانجام دے سکتے ہیں۔ الحمدللہ ڈاکٹر صاحب اس ملاقات کے بعد اس مسئلہ کے حل کے لئے پوری طرح متوجہ ہوئے اور ان کی ذاتی دلچسپی اور محنت سے اہلیانِ ہنگو کو گیس فراہم ہوگئی، وہ خود بھی اس کے معترف ہیں کہ میں نے یہ کام حضرتؒ کی توجہ دلانے اور ان کی فرمائش پر کیا، حالانکہ اس گیس کی منظوری کے بہت سے دعویدار ہیں مگر اصل حقیقت کا علم کسی کو بھی نہیں ہے کہ اس میں بنیادی کردار کس کا تھا تو اس سے بڑا اخلاص کیا ہوگا کہ اتنے بڑے بڑے کاموں کو بھی مخفی رکھتے تھے اور تشہیر کو اخلاص کے منافی تصور فرماتے۔

اکثر فرماتے تھے کہ میرے نزدیک اللہ تعالیٰ کو تمام امور میں مطلوب ترین اور محبوب ترین چیزیں دو ہیں: ایک اخلاص اور دوسری تقویٰ، حتی الوسع ان کو ہر قسم کی ملاوٹ سے پاک رکھنا چاہیے۔ حضرتؒ کے اخلاص کا یہ عالم تھا کہ اپنا مدرسہ ہونے کے باوجود دیگر مدارس کے ساتھ غیر معمولی تعاون فرماتے۔ مدارس و مساجد کی تعمیر اور دیگر فلاحی کاموں میں بھی حسب استطاعت حصہ لیتے اور معمولی دینی کاموں پر بھی ان کے منتظمین کی زبردست حوصلہ افزائی فرماتے۔ ان میں سے بعض باتوں کا علم ہمیں حضرتؒ کی رحلت کے بعد ہوا۔

اخلاص کا یہ عالم تھا کہ حضرت اپنے مدرسے کے نام کا علامتی بورڈ لگانے کو بھی پسند نہیں فرماتے تھے، حالانکہ بہت

سے حضرات نے اس کے متعلق اصرار بھی کیا تھا کہ اکثر ہم کو آنے میں دشواری اور مقام کے تعین میں مغالطہ ہوتا ہے اگر ایک چھوٹا سا بورڈ لگایا جائے تو بہتر ہوگا (یقیناً اس پریشانی سے اکثر ساتھی دو چار ہوتے تھے) مگر اس کے باوجود آخر تک حضرت بورڈ لگانے کے لئے تیار نہ ہوئے۔

حضرت مولانا فضل محمد صاحبؒ اکثر والد صاحبؒ کے اخلاص کے بارے میں کہتے کہ حضرت نے کراچی جیسے شہر کو چھوڑ کر ایک جنگل کو آباد کیا، پھر اتنے بڑے مدرسہ کو چھوڑ کر ایک چھوٹے سے مدرسہ میں تدریس کو اختیار کیا، ان باتوں کا احساس ان کو ہوتا ہے جو صاحب علم وعمل اور صاحب کمال ہوں۔

حضرت کا اس جگہ پر مدرسہ بنانا ہی اخلاص کی علامت تھی، آبادی کا نام ونشان تک نہیں تھا بمشکل آٹھ گھرانے تھے، مکمل جنگل... رات کو ہر طرف جنگلی جانور گھومتے تھے، خوف کی وجہ سے نیند نہیں آتی تھی۔ ایک بار حضرت مولانا مفتی احمد الرحمن صاحبؒ آئے تھے، رات کا قیام بھی ہوا، حضرت فرماتے تھے کہ جنگلی درندوں کے خوف سے میں نے ساری رات چوکیداری میں گزاری کہ رات کے وقت کہیں حضرت کو کوئی تکلیف پیش نہ آئے۔

ہمارے ایک ساتھی نے اخلاص کے موضوع پر کتاب لکھی، تو تقریظ کے لئے حضرتؒ کی خدمت میں پیش کی، آپؒ نے فرمایا کہ ماشاء اللہ وقت کی مناسبت سے بہت اچھا کام ہے کیونکہ مسلمانوں کے تمام امور خواہ دینی ہوں یا دنیوی ان میں ''عقل واخلاص'' ہونا بے حد ضروری ہے، اگر ان میں ایک بھی کم ہو تو اس کام میں کاملیت ونافعیت نہیں رہے گی، یہ فقیر کا تجربہ ہے۔ ہمارے حضرت بنوریؒ فرماتے تھے کہ '' آج عوام کا کیا کہنا بلکہ خواص بھی اخلاص کو نہیں جانتے۔'' آج مسلمانوں کو ان سے روشناس کروانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ لیکن آپ نے فقیر کو بڑے امتحان سے دو چار کر دیا۔ کہاں میں؟ کہاں اخلاص کے موضوع پر تقریظ؟ یہ تو ریشمی لباس میں ٹاٹ کا پیوند لگانے کے مترادف ہے، اگر اس پر کسی اللہ والے، مخلص بندہ سے تقریظ لے لیتے تو بہت بہتر ہوتا۔

ان کے رخصت ہونے کے بعد بندہ نے حضرت سے اخلاص کی حقیقت کے بارے میں پوچھا تو فرمایا: اسے 'خالص' سے تعبیر کرتا ہوں کہ ایک ایسی خاص چیز جو ہر قسم کی ملاوٹ سے پاک ہو۔ اس کیفیت میں اللہ عزوجل کی بندگی اور عبدیت کا مظاہرہ ہو کہ قلب مؤمن سے لے کر رب ذوالجلال تک چلنے والی تمام لائن بالکل صاف ستھری ہو یعنی ہر قسم کی آلودگی سے پاک ہو اور خواہشِ نفسانی سے بالاتر ہو کر شریعتِ ربانی کے موافق ہو۔ فرمایا: لوگوں نے اخلاص کو گپ شپ سمجھ رکھا ہے، ہر ایک اخلاص کا مدعی ہے، حالانکہ بعض لوگوں کو اخلاص کی بو بھی نہیں لگی ہوگی۔ اس کا پہچاننا اور اس کو اپنانا بہت مشکل کام ہے۔

تقویٰ کے بارے میں فرماتے تھے کہ آج کے دور میں ڈاکٹر وحکیم کے کہنے پر جسمانی امراض سے بچنے کی خاطر

مضر صحت چیزوں سے پرہیز کی کوشش کی جاتی ہے،لیکن افسوس کہ احکم الحاکمین ذات کی طرف سے روحانی امراض سے حفاظت کے لئے جن چیزوں کی ممانعت کی گئی ہےان سے بچنا تو درکنار، بچنے کا تصور بھی نہیں کیا جاتا۔

حضرت اپنے آپ کو صرف محرمات ومنہیات سے نہیں بلکہ مکروہات ومشتبہات سے بھی اعلیٰ درجہ بچانے کی کوشش کرتے تھے اور بعض مباح امور میں بھی احتیاط فرماتے تھے۔مثلاً مدرسہ کے لئے زکوۃ کی مد میں یا دیگر کوئی رقم مل جاتی تو اس رقم کی نوٹوں میں تبدیلی سے بھی اجتناب فرماتے۔

ایک دفعہ ایک صاحب نے حضرتؒ سے مدرسہ کے مکتبہ کی ایک کتاب استفادہ کے واسطے لے جانے کی اجازت چاہی۔پہلے تو حضرتؒ نے حامی بھر لی لیکن تھوڑی دیر بعد اپنے ارادہ کو ترک کرکے فرمایا کہ یہ مدرسہ کی ملکیت ہے شاید مجھے اس حد تک تصرف کا حق حاصل نہ ہو۔

ایک دفعہ امتحان کے لئے جوابی پرچوں کے کاغذات اپنی ذاتی رقم سے لائے تھے تو بندہ اس پر مہر لگا رہا تھا جب حضرت نے دیکھا تو فرمایا کہ بقدر ضرورت پر مہر لگائیں ورنہ مہر شدہ زائد کاغذات ہماری ملکیت سے نکل جائیں گے،کیونکہ مہر اور سیاہی مدرسہ کی ملکیت تھی،جب وہ ذاتی کاغذ پر استعمال ہو کر کاغذ کے ساتھ خلط ہو جاتی تو حضرت اس کا استعمال کہاں گوارا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک آدمی نے کچھ برتن مدرسہ کے لئے لائے اور کہنے لگے کہ ان کو مدرسہ میں طلبا کے لئے استعمال کریں۔ان کے جانے کے بعد حضرتؒ فرمانے لگے کہ یہ لوگ ہمیں امتحان میں ڈال دیتے ہیں۔شاید تمہاری توجہ ان کے استعمال شدہ الفاظ کی طرف نہیں تھی،بڑے سخت الفاظ میں اپنی امانت ہمارے حوالہ کردی۔کہ اول تو مدرسہ کی شرط لگادی،پھر طلبہ کی شرط لگادی،اب یہ کسی مہمان یا استاذ کے لئے بھی استعمال نہیں کیے جاسکتے۔پھر حضرتؒ نے فرمایا کہ میں استعمال کی اکثر اشیا اپنی ذاتی رقم سے لینے کی کوشش کرتا ہوں تاکہ اساتذہ کے لئے کوئی حرج نہ ہو۔

طلبا کے لئے سالن گھر میں تیار کیا جاتا ہے،حضرتؒ گھر میں سختی سے تلقین فرماتے کہ اگر ہماری ذاتی اشیا طلبا کے لئے استعمال ہو جائیں تو یہ ہماری سعادت ہے اور اگر بالفرض طلبا کی اشیا ہم نے استعمال کیں تو بس ہماری ہلاکت کے لئے یہی کافی ہے۔اس وجہ سے گھر میں مدرسہ اور گھریلو اشیا الگ الگ جگہوں پر رکھی جاتی تھیں۔

ایک دفعہ گھر کی ہانڈی پک رہی تھی،ہماری والدہ محترمہ کسی کام میں مصروف تھیں،گھر کی کسی خاتون نے غلطی سے ہانڈی کے نیچے مدرسہ کی لکڑی جلادی۔حضرتؒ نے اس دن گھر کا سارا سالن طلبا کے سالن میں شامل کردیا اور فرمایا کہ آج بغیر سالن کے روٹی کھالیں۔

جب میں درس نظامی مکمل کرکے مدرسہ میں درس دینے لگا تو ایک دن مجھے فرمایا کہ مدرسہ کے بجائے گھر میں کھانا

کھایا کریں، جب مدرسہ میں کھانا ہوتو گھر سے ذاتی روٹی اور سالن لے جایا کریں۔ مگر مجھے علم ہے کہ آپ حضرات سے یہ زحمت نہ ہو سکے گی۔ پھر فرمایا کہ مدرسہ کے اساتذہ اگر چہ مسافر ہیں مگر اس کے باوجود میں ماہانہ کچھ نہ کچھ رقم آپ لوگوں اور ان کی طرف سے خرچ کی مد میں مدرسہ کے چندہ میں جمع کرتا ہوں۔

مدرسہ کے اجتماعی اموال میں حد درجہ محتاط تھے، یہ معمول تھا کہ رات تین بجے آکر مدرسہ میں پنکھے بند کر لیتے کیونکہ ہمارے علاقے میں رات کا آخری پہر گرمیوں میں بھی معتدل رہتا ہے، جب میں جامعہ میں مدرس ہوا تو یہ ذمہ داری مجھے سونپ دی، وضو اور غسل پر مسنون مقدار سے زیادہ پانی خرچ نہ کرتے، جنوبی افریقہ کے طلبہ نے ایک بار مجھ سے کہا کہ ہم نے حضرت سے باقی کچھ سیکھا ہو یا نہ ہو، وضو اور غسل کا طریقہ ضرور سیکھا، ہم تو اپنے علاقوں میں ۲۰۰ لیٹر پانی غسل پر لگا لیتے، اس پر ایک افریقی طالب علم کا واقعہ یاد آیا، وہ بے چارا نیا نیا تخصص فی الحدیث کرنے آیا تھا، حضرت الاستاذ ابتدا میں بندے کی استقامت بھی معائنہ کرتے کہ قوت برداشت کتنی ہے؟، ایک بار اُن صاحب نے نہانے کے لئے غسل خانے میں دو بڑی بالٹیاں بھر کر رکھیں، جب آپ نے دیکھ کر بلایا تو فرمایا کہ میں تو تقریباً دو تین لیٹر پانی سے غسل کرتا ہوں، ہمارے علاقے میں پانی کا فقدان ہے، پانی جتنا بھی کم استعمال کریں اتنا ہی زیادہ بہتر ہوگا، اگر آپ زیادہ سے زیادہ استعمال کرنا چاہتے ہیں تو ایک چھوٹی بالٹی استعمال کریں، اس سے زیادہ ہرگز استعمال کرنے کی کوشش نہ کریں اور حضرت خود دو گلاس پانی سے وضو بناتے یہ حضرت کا عام معمول تھا۔

والدہ محترمہ فرماتی ہے کہ جب طلبا کے لئے بکرا وغیرہ ذبح ہوتا تو فرماتے کہ اس میں سے مدرسہ کے مہمانوں یا عملہ کے لیے گوشت نہ رکھیں بلکہ سارا طلبہ کے لیے پکائیں کیونکہ بکرا صدقہ کرنے والا خدا کا بندہ یہ کہہ گیا ہے کہ یہ طلبہ کے لئے ذبح کیا جائے۔ اگر وہ 'طلبہ' کے بجائے 'مدرسہ' کا لفظ استعمال کرتا تو آسانی ہوتی مگر طلبہ کی قید لگا کر اس نے صدقہ کا مصرف خاص کر دیا، اب یہ مدرسہ میں صرف طلبہ ہی کھا سکتے ہیں۔

جب میں اور بھائی ظہیر یوسفیہ میں باقاعدہ طالب علم تھے اور کھانے کے وقفے میں طلبہ کا سالن لانے گھر جاتے تو کبھی ہم کھانا اپنے حصہ کا سالن لے کر گھر ہی میں کھا لیتے۔ حضرت نے والدہ صاحبہ سے فرمایا تھا کہ گو یہ دونوں مدرسہ کے طالب علم ہیں لیکن اگر کبھی یہ گھر میں کھائیں تو ان کے لئے صرف شوربہ ڈالا کریں، بوٹی قطعاً نہیں ڈالنی، کیونکہ معلوم نہیں کہ مدرسہ میں ایک طالب علم کو کتنی بوٹیاں ملتی ہیں۔ میں نہیں چاہتا ہوں کہ میرے بیٹے آگ کے انگاروں سے اپنا پیٹ بھریں۔

والدہ نے بتایا کہ حضرت امتیازی قسم کے لباس بالکل پسند نہیں کرتے تھے ایک دفعہ جب آپ چھوٹے تھے تو ایک دن کسی عزیز نے آپ کے لیے نئے کپڑوں کا عمدہ جوڑا 'جو جدید انداز میں سلا ہوا اور استری شدہ تھا' لایا۔

میں نے آپ کو پہنایا، جب حضرت نے دیکھا تو سخت غصہ ہوئے۔ فرمایا: بڑوں کی اولاد ہمیشہ اس وجہ سے تباہ ہوتی ہیں، پھر وہ کپڑے فوراً اتروا دیئے۔

والدہ فرماتی ہے کہ حضرت کو بعض اوقات متعلقین اچھے کپڑے ہدیہ فرماتے، ان میں سے کچھ میں علیحدہ کر دیتی کہ آپ کے لیے سلواؤں گی۔ جب حضرت کسی کو ہدیہ دینا چاہتے اور ان کے بارے میں پوچھتے کہ وہ فلاں نے فلاں رنگ کا کپڑا لایا تھا وہ کہاں ہے؟ میں کہہ دیتی کہ وہ مجھے پسند ہے، یوسف کے لیے سلواؤں گی تو فرماتے کہ اسے خواہش پرست نہ بناؤ۔ اور یوں وہ کپڑا لے کر کسی کو دے دیتے۔

میرے چھوٹے بیٹے کے لیے ننھیال میں سے کوئی بازاری کوٹ پتلون خرید کر لایا۔ حضرت نے دیکھا تو اتنے سخت ناراض ہوئے کہ مدرسہ سے تین دن تک گھر نہیں آرہے تھے۔ میں مسلسل منت سماجت کرتا رہا اور بتایا کہ حضرت کوئی اور لایا ہے، میں نے قطعاً نہیں خریدے، اس پر بمشکل راضی ہوئے۔ جب گھر تشریف لائے تو فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے "من تشبہ بقوم" حق فرمایا ہے۔ غیر کی چیز استعمال کرو گے تو اس کا اثر بھی لازمی چیز ہے، وہ اپنا اثر دکھائے گی۔ فرمایا: آپ یقین کریں کہ اگر کوئی مجھے لاکھ ڈالر بھی دے، تو میں پانچ منٹ کے لئے بھی غیر کا لباس پہننے کو تیار نہیں ہوں گا، یہ چھوٹے جب ابھی سے عادی ہو جائیں گے، تو بڑے ہو کر بغیر کسی تکلف کے استعمال کریں گے۔ ہمارے بڑوں کی مضبوط دینی غیرت وحمیت کی وجہ بھی یہی ہے کہ ان کی بچپن میں اچھی تربیت ہوئی ہے۔ حرام تو حرام ہے، حلال میں بھی حد درجہ احتیاط ہونی چاہیے۔ اکل حرام کی جو چالیس دن نحوست ہے، اس میں بھی اس طرف اشارہ ہے کہ پیٹ کی زمین سے جتنی اچھی زراعت چاہتے ہو، اس میں اتنی ہی اچھی تخم ریزی کرو۔ ایک بار فرمایا کہ انسان گرم، ٹھنڈی یا میٹھی، کڑوی جو چیز استعمال کرتا ہے، حساً اس کے اثرات محسوس کرتا ہے، مثلاً کوئی مرچ کھائے گا تو اس کی تلخی اور گرمی کا احساس ہوگا، آنکھوں سے آنسو، ناک سے نزلہ اور پیشانی پر پسینہ آئے گا، بعینہٖ اسی طرح اکل حلال وحرام کے بھی اثرات ہیں۔

ایک مرتبہ کسی نے عمرہ پر لے جانے کی پیشکش کی، حضرت کے پاسپورٹ کی مدت ختم تھی، میں نے دوبارہ بنانے کا عرض کیا تو فرمایا کہ یوسف چھوڑو، فرض حج ادا کر چکا ہوں۔ لہٰذا کسی طرح پاسپورٹ آفس جانے کو تیار نہیں ہوئے۔ میں بازار سے تصویر والے کو لے آیا، اس وقت یہ کمپیوٹرائزڈ پاسپورٹ شروع نہیں ہوئے تھے۔ میں نے حضرت کو تصویر دینے پر کافی مجبور کیا، جب انہوں نے تصویر لی، تو حضرت نے مسجد جا کر نوافل پڑھے اور بہت روئے۔ فرمایا: یوسف! ایک سنت عمل کے لئے حرام کا ارتکاب کر چکا ہوں۔

سخت سے سخت بیماری میں بھی نماز باجماعت نہ چھوٹتی، ایک دفعہ جب آنکھ کے آپریشن کے باعث ہسپتال میں

داخل تھے، ڈاکٹروں نے سجدہ اور مسجد تک جانے سے روکا تھا، لیکن آپریشن کے پہلے دن ہی ظہر کی نماز باجماعت ادا کی، ہمارے ایک ساتھی نے عرض کیا کہ حضرت احکام میں اللہ تعالی نے رخصت بھی تو رکھی ہے، اس پر ہنس دیے اور فرمایا کہ چلو پھر کمرے میں اپنی جماعت کرالیتے ہے۔ حضرت کا معمول تھا کہ اکثر اذان سے پہلے مسجد میں داخل ہوتے، تکبیر اولی کے ساتھ نماز باجماعت اور صف اول کی بہت پابندی فرماتے۔

ایک دفعہ پشاور میں ایک دینی جماعت کی کانفرنس تھی، جس میں مقررین حضرات کی تقریریں جاری رہیں اور ظہر کی نماز میں مسنون وقت سے کافی تاخیر کردی گئی۔ حضرت کو اس پر بڑی کوفت ہوئی اور آئندہ کے لیے قسم کھائی کہ پھر کسی ایسی کانفرنس میں شرکت نہیں کروں گا۔

چونکہ مدرسہ میں مالی معاملات اور چندہ وصولی میں انتہائی احتیاط کرتے تھے، اس لیے بعض اوقات منامی اشارات پر بھی سختی سے عمل کرتے تھے، ایک بار کسی صاحب نے ہزار روپے مدرسہ کے لیے دیئے، آپ نے جیب میں رکھے، رات کو خواب دیکھا کہ جیب میں مور ہے لیکن اس کا سر سانپ کا ہے۔ بس صبح ہوتے ہی فوراً وہ کسی طالب علم کو دے دیئے اور اجتماعی مال میں شامل نہ کیے۔

اسی احتیاط کے پیش نظر ہر کسی کا مال بھی قبول نہیں کرتے تھے، خصوصاً مالداروں اور خوانین کا چندہ لینے میں کافی استغنا کا مظاہرہ فرماتے۔ ایک دفعہ کوہاٹ کے مولانا تلاوت شاہ کسی صاحب کی طرف سے ایک گاڑی ہدیہ میں لے کر آئے اور کافی اصرار کیا کہ قبول فرمالیں لیکن آپ نے نہیں لی، وہ بار بار منت کرتے رہے تو آخر میں غصے سے لوٹایا۔

ایک بار آپ اور مولانا عبداللہ صاحب رحمہ اللہ تشریف فرما تھے، سرحدات پر ڈیوٹی کرنے والا ایک سپاہی حاضر خدمت ہوا، باتوں باتوں میں اس نے کہا کہ حضرت اب الحمد للہ روزانہ دوران ڈیوٹی تہجد پڑھنے کی توفیق ہوجاتی ہے۔ چونکہ رباط کے دوران یہ صحابہ کا عمل تھا اس لیے پابندی کی کوشش کرتا ہوں، مولانا عبداللہ صاحب نے فرمایا کہ بڑی اچھی بات ہے۔ جب وہ سپاہی اٹھ کر چلا گیا تو والد صاحب نے انتہائی عاجزانہ انداز میں مولانا عبداللہ صاحب سے عرض کیا کہ استاد جی! صحابہ کا رباط تو رضا کارانہ تھا جس میں وہ ذاتی اعمال کرسکتے تھے، انہیں رباط کا سرکاری معاوضہ ملتا ہے، اس سے ڈیوٹی میں خلل ہونے کا اندیشہ ہے تو اس کے لیے تہجد پڑھنا کیسا ہے؟ اس پر مولانا عبداللہ صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ اس بندے کو واپس بلالیں۔ میں نے بلایا تو والد صاحب نے ان سے کہا کہ جب آپ چھٹی پر ہوں تو گھر میں تہجد کا اہتمام کریں، اور جب ڈیوٹی پر ہوں تو دوران ڈیوٹی تہجد نہ پڑھیں بلکہ ڈیوٹی پر توجہ دیں، جب مولانا عبداللہ صاحب اجازت دیں تو تب پڑھنا۔ اس طرح مولانا عبداللہ صاحب کے مقام کو بھی قائم

رکھا اور تقویٰ کے اعتبار سے جو مثالی صورت تھی وہ بھی اس آدمی کو سمجھا دی۔

فرماتے: بغیر صدق و اخلاص اور تقویٰ کے کوئی ثمرہ مرتب نہیں ہوسکتا، زمانہ بعید کو نہیں قریب میں علماء دیوبند کی شاندار ماضی کو دیکھیں ایک ایک فرد پوری قوم کے برابر تھا، ان کے اور ہمارے مابین فرق صرف یہی ہے کہ ان کے پاس روحانیت کی قوت اور اخلاص کی دولت تھی اور وہ تقویٰ کے لباس میں ملبوس تھے، ان کے پاس افرادی قوت نہیں تھی، نہ ان کے پاس مال و دولت تھی، اور نہ ہی ان کے پاس مادی وسائل تھے، پھر بھی کامیاب تھے۔ ہمارے پاس سب کچھ ہے پھر بھی شکست خوردہ ہیں۔ دوسرا جس چیز میں بھی کثرت آتی ہے، کثرت اپنے ساتھ غفلت لاتی ہے اور غفلت کے ساتھ شکست مقدر ہے، سورۃ تکاثر سے یہی مفہوم ہوتا ہے۔ حضرت کمیت کی بجائے کیفیت کو پسند کرتے۔ فرماتے: مدارس کی کثرت، طلبا وعلما کی کثرت، دعوت وتبلیغ کی کثرت...... بدقسمتی سے دین داروں میں بھی یہ بیماری آگئی ہے، ہر طبقہ کا نقطہ نظر ہی کثرت ہے۔

مثالی تقویٰ کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے مردم شناسی کی ایک خاص بصیرت عطا فرمائی تھی، اور ہر شعبہ کے لیے خاص خاص افراد چن کر تیار کیے تھے، اپنے خاص تلامذہ کی بھی اسی نہج پر تربیت اور تشکیل فرماتے تھے۔

علماء دیوبند سے عقیدت

والد گرامی علماء دیوبند کے تذکروں سے خوب محظوظ ہوتے، خصوصاً جب بھی قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحبؒ کا ذکر خیر آتا تو آنسو قابو رکھنا مشکل ہوجاتے۔ تلامذہ کو تلقین کرتے کہ کسی فاضل دیوبند شخصیت کی زیارت کا موقع ہو تو اس کی خدمت میں ضرور جاؤ کیونکہ ان پر کاملین کی نظریں پڑی ہیں۔

فرماتے: میرے نزدیک وہ لوگ بہت مبارک ہیں جنہوں نے اکابر دیوبند دیکھے ہیں۔ میں نے کئی بار حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ سے عرض کیا تھا کہ آپ ہمارے پاکستان کے علما پر یہ احسان عظیم فرمالیں کہ یہاں کے فارغ التحصیل علما کے لئے انڈیا حکومت سے صرف چالیس روز یا بیس روز کے ویزہ کی بات کرلیں۔ تاکہ یہ فضلا دارالعلوم دیوبند کے دورۂ حدیث میں چند ایام گزار لیا کریں۔ میرا نظریہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں اب بھی ہمارے بڑوں کی نگاہ کا اثر اور فیض موجود ہے، یہ باتیں اہل دل سے پوچھیں، ان پر قطعاً مخفی نہیں۔

خود بھی فضلاء دیوبند کے پاس جاتے، ہم کو بھی ساتھ لے جاتے اور ان حضرات کو بھی اپنے ہاں آنے کی دعوت دیتے، بذات خود میرے دورۂ حدیث کے موقعہ پر فرمایا کہ بیٹا! اگر مولانا سلیم اللہ خان صاحب دامت برکاتہم کے فاضل دیوبند اور مولانا مدنی کے تلمیذ ہونے کی نسبت نہ ہوتی تو میں آپ کو ضرور اپنے مادر علمی بنوری ٹاؤن میں داخل

کرواتا۔

جب بھی کسی فقیہ کا ذکر آتا، احتراماً ان کے ساتھ مناسب القاب ضرور ذکر کرتے، مثلاً شمس الائمہ، فقیہ الامت، شمس العلماء، وغیرہ۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ کا فرمانا تو لازمی تھا، مخالف اہل علم کا نام بھی احترام سے لیتے۔ عالم اسلام میں کہیں بھی کوئی بڑے عالم دین فوت ہوتے تو ان کے ایصال ثواب کے لئے مدرسہ میں باقاعدہ ختم قرآن کا اہتمام فرماتے، ساتھ مختصر اور جامع الفاظ میں ان کا تعارف اور نمایاں کارنامے بھی ذکر فرماتے۔

مدرسین وطلبہ سے رویہ

حضرت والد گرامی مدرسہ کے مدرسین کا انتہائی احترام کرتے اور ان کی ضروریات کا پوری طرح خیال رکھتے۔ ایک بار میں اپنے زمانہ تدریس میں جامعہ کے ایک اُستاذ کے ساتھ چارپائی پر سر سے ٹوپی اُتار کر بے تکلف تکیہ لگا کر بیٹھا تھا، موصوف میرے استاذ تو نہ تھے لیکن جامعہ کے کبار مدرسین میں سے تھے۔ حضرت والد صاحب تشریف لائے اور میرے اس طرز نشست کو دیکھا تو ایسے تیور سے گھورا کہ اگر اس کی جگہ مجھے سو تھپڑ لگتے تو شاید وہ سہل ہوتے۔ اس پر تین دن مجھ سے بات نہ کی اور نہ ساتھ کھانے پر بیٹھایا، تین دن بعد معافی ملی۔ فرمایا کہ تیرے اندر حیا وشرم نہیں کہ مدرسہ کے ایک بڑے مدرس کے سامنے یوں ٹوپی اُتار کر اور ٹیک لگا کر بیٹھے ہو، اس سے مجھے الحمد للہ ایسی عبرت ہوئی کہ آئندہ کے لئے احتیاط نصیب ہوگئی۔

جب سالانہ تعطیلات ہوتیں اور طلبا رخصت لینے آتے تو حضرت کے آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے۔ دو تین دن تک اس کا اثر رہتا، اگر کوئی طالب علم بیمار ہوتا تو اپنے ہاتھ سے دوائی پلاتے، ڈاکٹر کے پاس بھجواتے، دوائی کی رقم بھی دیتے، ڈاکٹر کی طرف سے جو پرہیز مقرر ہوتا، اس کے مناسب کھانے کا انتظام کرتے۔ اگر کسی طالب علم کے گھر میں کوئی فوتگی ہوتی تو جنازہ میں شریک ہوتے، ورنہ تعزیت کے لئے ضرور جاتے۔ اگر کسی کا رشتہ دار ہسپتال میں ہوتا تو ان کی عیادت کیلئے جاتے اور اپنی استطاعت کے مطابق رقم بھی عنایت فرماتے۔

یہاں ایک لطیفہ ذکر کرنا مناسب ہوگا، ایک مرتبہ ایک طالب علم نے اساتذہ سے چھٹی لینے کے واسطے بہانہ بنا کر اپنے دادا کے بارے میں بتایا کہ وہ فوت ہوگئے ہیں۔ ایک دن استاذ صاحب نے پوچھا کہ فلاں طالب علم نظر نہیں آرہا، بندہ نے بتایا کہ ان کا دادا فوت ہوگیا ہے۔ والد صاحب نے فرمایا کہ کل اسباق کے بعد تعزیت کے لئے جائیں گے۔ اگلے دن ہم ان کے گھر چلے گئے، وہاں کوئی نظر نہیں آیا، میں نے عرض کیا کہ شاید تعزیت کے لئے کسی دوسری جگہ بیٹھے ہوں گے۔ جب میں نے معلومات کی غرض سے گھنٹی بجائی تو اندر سے ان کے دادا نکل

آئے۔ استاذ صاحب کو دیکھ بہت خوش ہوئے کہا کہ اللہ تعالی کا شکر ہے، آپ حضرات نے اپنی تشریف آوری سے ہمارے گھر کو زینت بخشی، اب اسے کیا معلوم کہ ہم تو اس کی تعزیت کرنے آئے تھے۔ ہم نے چائے وغیرہ پی اور اجازت لے کر نکل آئے۔ واپسی پر راستہ میں استاذ صاحب نے جھوٹ کی نحوست پر کافی طویل گفتگو فرمائی اور فرمایا کہ اگر ہم ان کے دادا کو بتادیتے تو اس خبیث کی کیسی بکی ہوتی۔

طلبہ میں ہمیشہ کیفیت کو مدنظر رکھتے، محض کمیت کے خلاف تھے۔ فرماتے: ہمارے اکابر نے کیفیت کو ملحوظ رکھا اس لیے ہمارے اداروں سے حضرت کشمیریؒ، حضرت مدنیؒ، حضرت بنوریؒ اور حضرت عثمانیؒ جیسے حضرات تیار ہوئے، جب سے ہم تکاثر کے پیچھے لگے، تو ہمارے ہاں مقدار تو اچھی ہوئی، مگر معیار گر گیا۔ ایک مرتبہ درجہ ثالثہ میں صرف دو طالب علم تھے، اساتذہ نے مجھے کہا کہ حضرت کو مشورہ دو کہ یہ دو حضرات کمزور بھی ہیں، اگر کسی دوسرے مدرسہ کو بھیج دیں تو بہتر ہوگا، جب میں نے استاذ صاحب سے عرض کیا تو سخت ناراض ہوئے۔ فرمایا: یہ مہلک مرض پاکستان کے اس کونے تک بھی پہنچ گیا ہے کہ اگر زیادہ ہوں تو پڑھائیں گے، اگر کم ہوں تو کسی دوسرے جگہ بھیج دیں گے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون جب سے ہمارے ہاں قلت وکثرت کا وبال آیا ہے، تب سے ہم تباہی وبربادی کا شکار ہوئے ہیں، بدقسمتی سے آج کل یہ وبا اتنی عام ہوئی ہے کہ اس مرض سے ہمارے مدارس اور تحریکیں تو درکنار خانقاہیں بھی محفوظ نہیں، وہاں بھی یہ مقابلہ شروع ہے۔ دوسری بدقسمتی یہ ہے کہ طلبا اس مرض کا شکار ہیں کہ جہاں سہولیات ہوں اس جگہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ بہرحال حضرت نے فرمایا کہ ان دو طلبہ کو صرف میں پڑھاؤں گا۔ میری دیگر کتابیں کسی اور استاذ کے سپرد کردو۔

ایک مرتبہ رمضان شریف میں رات کو گردے کی شکایت کی وجہ سے آرام نہیں کیا، اشراق کے بعد فرمایا کہ میں ایک گھنٹہ آرام کرتا ہوں، گاؤں کے ایک طالب علم کے بارے میں فرمایا کہ وہ پڑھنے آئے گا، ان کو بتائیں کہ میں ایک گھنٹہ آرام کر کے سبق پڑھاؤں گا۔ جس کے بارے میں فرمایا، مجھے تعجب ہوا کہ وہ بے چارہ کیا پڑھے گا، وہ تو بہت کمزور ہے، جب وہ آیا تو میں نے اس سے پوچھا کہ آپ نے استاذ صاحبؒ سے کون سی کتاب شروع کر رکھی ہے، اس نے بتایا کہ ارشاد الصرف، وہ نصف سے زیادہ پڑھ چکا تھا، میں نے مختلف جگہوں سے پوچھا، تو بہت اچھے جوابات دیئے۔ اس نے بتایا کہ میں نے استاذ صاحب سے عرض کیا تھا کہ میں رابعہ تک پہنچ گیا ہوں لیکن اب تک صرف ونحو کی کوئی سمجھ نہیں۔ اساتذۂ کرام مشورہ دیتے ہیں کہ پنجاب یا کراچی کے کسی مدرسہ میں داخلہ لے لوں کیونکہ اب تک آپ لکھائی نہیں کر سکتے، آپ کی استعداد بھی کمزور ہے، گاؤں کا ماحول بھی ہے، یہاں آپ کیا پڑھیں گے! تو استاذ صاحب نے فرمایا کہ نہیں، ادھر ہی پڑھو، چھٹیوں میں آیا کرو، میں خود صرف پڑھاؤں گا۔ جب استاذ

صاحب بیدار ہوئے اور وضو ونفل کے بعد سبق شروع کیا تو میں بھی شریک ہوگیا، استاذ صاحب نے عام فہم انداز میں فارسی عبارت کا سہل ترجمہ کیا، پھر مثالوں کے ذریعہ قانون کی وضاحت کی۔آخر میں مجھے فرمانے لگے کہ یوسف! میں صرف ان کو پڑھانے کے لئے اٹھا، ورنہ رات کی تکلیف کا اثر اب تک ہے، نوافل میں ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے مانگا۔آپ لوگ تو اسباق سے جان چھڑانا چاہتے ہو جب کہ میں ایسے طلبہ کے ذریعہ سے اپنے لئے نجات تلاش کرتا ہوں، ذہین طلبہ کو تو ہر کوئی پڑھانا چاہتا ہے، مگر ان جیسے طلبہ کو کون پڑھائے گا اور یہی لوگ قابل رحم ہے ۔آپ یقین کریں کہ وہ طالب علم آئندہ سال اتنا تگڑا ہوا کہ مدرسہ میں پوزیشن لینا شروع کی۔اور مطالعہ میں اتنی ترقی کی کہ بسا اوقات اساتذہ ان کے اعتراضات سے تنگ آجاتے تھے۔اساتذۂ کرام حیران تھے کہ یہ نااہل کیسے قابل ہوگیا، میں عرض کرتا کہ استاذ صاحب نے رمضان میں صرف کیا پڑھائی ہے کہ اپنی تمام تر توجہات مبذول کرکے ان سے ایک بلا بنادی ہے۔

ایک سال درجہ حفظ کے اساتذہ کرام اچھی طرح کام نہیں کررہے تھے، حضرت کام سے مطمئن نہیں تھے ،اصلاح کی بھی بہت کوشش کی مگر کامیابی کی بجائے مایوسی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا، آخرکار حضرت بہت تنگ ہوئے اور ارادہ کیا کہ حفظ کے شعبہ کو ختم کرتے ہیں۔میں نے عرض کیا کہ حضرت اگر یونہی چلنے دیں!! تو فرمانے لگے کہ بیٹا !میں نے مدرسہ آخرت میں نجات کے لئے بنایا ہے، دنیاوی تجارت کے لئے نہیں بنایا، قرآن کی صحیح خدمت باعث برکت ہے، اگر صحیح خدمت نہ ہو تو باعث ہلاکت ہے۔مجھے خوف ہے کہ کہیں عذاب الٰہی کا مستحق نہ ہوجاؤں۔

اتفاق سے اسی دن حضرت مولانا فضل محمد صاحب رحمہ اللہ تشریف لائے، ان کے سامنے جب یہ بات آئی تو فرمایا کہ شعبہ حفظ ہرگز ختم نہ کریں۔والد صاحب کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ ان شاء اللہ مقدور بھر محنت اور کوشش کے بعد اگر کوئی کمی مدرسین کی طرف سے آتی ہے تو اس پر آپ کا مؤاخذہ نہ ہوگا۔آپ کی دعائیں ضرور رنگ لائیں گی ،مدرسہ میں حفظ قرآن کا سلسلہ باعث خیر وبرکت ہونے کے علاوہ مدرسہ کی زینت بھی ہے، جس مدرسہ میں حفظ کا شعبہ نہ ہو، وہ بغیر نمک کے کھانے کے مترادف ہے۔الحمدللہ ثم الحمدللہ حضرت کی کرامت ہے کہ درجہ حفظ کے شعبہ کا علاقے میں کردار اپنی مثل آپ ہے، کم ہی کوئی گھر ہوگا جس میں حافظ قرآن نہ ہو۔حضرت فرماتے تھے کہ میں رمضان میں ختم قرآن کے لئے ۲۰ کلومیٹر دور تک جاتا تھا، پورے ضلع میں صرف تین حافظ قرآن تھے، وہ بس چند مقامات پر ختم کرواتے تھے۔

سیاسی فکر

حضرت زندگی کے اواخر میں دینی سیاسی پارٹیوں اور الیکشن سے مایوس ہو گئے تھے، فرماتے تھے کہ الیکشن کے ذریعہ سے نفاذ اسلام ناممکن ہے۔ ہاں! اسلام کے تحفظ اور دین کی بقا کیلئے اسمبلی میں دو اولوالعزم، نڈر اور بے باک علما کا ہونا ضروری ہے، ورنہ یہ بے دین لوگ مسلمانوں پر کیا سے کیا بجلیاں گرائیں گے۔ صرف اس حد تک کہ اس بے دین طبقے کا مقابلہ ہو اس کے قائل تھے۔ سپاہ صحابہ کے الیکشن میں حصہ لینے پر سخت ناراض تھے، اس سلسلے میں قائدین سپاہ صحابہ کے نام کئی خطوط بھی لکھے تھے کہ آپ لوگ الیکشن سے دور رہیں، اگر زیادہ ضرورت ہو تو جھنگ کی سیٹ پر اکتفا کریں، اگر آپ الیکشن نہ لڑیں تو تمام جماعتوں کو اپنے مشن کے لیے ساتھ لے کر چل سکیں گے، کیونکہ جس طرح شیعوں کے ہاں حضرت حسینؓ کی محبت اتحاد اور اتفاق کا واحد ذریعہ ہے، اسی طرح ہمارے پاس تمام مسلمانوں کو متحد کرنے کی واحد اساس حب صحابہؓ ہے، اس پر ہر کلمہ گو متفق ہو سکتا ہے۔ تحریک ختم نبوت اس کی زندہ مثال ہے، اسمبلی سے باہر تحریک والے کام کرتے تھے اور اسمبلی کے فورم پر صرف دو ہی شیر لڑتے تھے، ایک امام انقلاب حضرت مفتی محمود صاحب اور دوسرے شیر اسلام حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی صاحب۔

حضرت چاہتے تھے کہ ہماری سیاسی جماعتیں معاشرے میں اسلامی قوانین کو رواج دینے کی سعی کریں، آپ نے اس سلسلہ میں ایک تفصیلی مکتوب پاکستان شریعت کونسل کے نام بھجوایا تھا کہ آپ لوگ ملک گیر مہم چلائیں کہ ہر تحصیل کی سطح پر ممتاز علما ایک کمیٹی تشکیل دیں، یہ کمیٹی ہفتہ میں صرف ایک دن بازار کے کسی جامع مسجد میں بیٹھے، اگر کوئی شریعت کے مطابق اپنا قضیہ حل کرنا چاہتا ہے، تو یہ حل کر کے دیں۔ اس میں کسی کے ساتھ تصادم کا کوئی خطرہ نہیں، بلکہ عدالتوں کا بوجھ کم ہوگا، اس سے شریعت کی برکات کا ظہور ہوگا اور لوگ خود بخود رجوع کریں گے کیونکہ عوام تو مفت اور سستے انصاف کے لیے ترستے ہیں، اس کے ساتھ معاشرے میں علما کے وقار میں اضافہ ہوگا، عوام کے ساتھ تعلق اور رابطہ بڑھے گا اور انہیں دیگر فتنوں سے محفوظ رکھنا آسان ہوگا۔

نفاست طبعی

اگرچہ زندگی سادہ تھی لیکن طبعاً انتہائی نفاست پسند تھے، معمولی بو وغیرہ سے طبعیت مکدر ہو جاتی، کمرے میں بیت الخلا بنانے کا تو سرے سے تصور ہی نہ تھا، فرماتے تھے کہ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ لوگ جس کمرے میں کھاتے، سوتے ہیں وہاں بیت الخلا کیسے بنا لیتے ہیں؟

۱۹۹۸ء تک تو آپ قضائے حاجت کے لئے دور جنگل جاتے، میرے بچپن میں ایک دفعہ حضرت دوپہر کے وقت جنگل میں قیلولہ کرنے کے لیے لیٹے تھے، میں نے دیکھا تو بھاگتا ہوا گھر آ کر رونے لگا کہ حضرت فوت ہو گئے

ہیں، گھر والے بھاگے بھاگے حضرت کے پاس پہنچے، حضرت انہیں دیکھ کر حیران ہو کر بیٹھ گئے۔ جب گھر آئے تو مجھے بلا کر اپنے سینے سے لگایا اور فرمایا کہ بیٹا! یہ ہمارے بڑوں کی سنت ہے۔

جب ۱۹۹۸ء میں حالات زیادہ خراب ہوئے اور آپ پر قاتلانہ حملوں کی کوششیں شروع ہوئیں تو خاندان والوں نے گھر کے قریب بیت الخلاء بنانے پر مجبور کیا گیا، مگر وہ بھی کمرہ سے نہیں بلکہ گھر سے تقریباً ۵۰ گز دور نہایت سادہ سا بیت الخلاء بنایا اور اس میں اتنی سادگی اختیار کی گویا اس پر رقم لگانا ضیاع سمجھتے ہوں، اُو پر چھت، بجلی اور نلکا وغیرہ کچھ نہ تھا ایک بالٹی خود اپنے ہاتھ سے بھر کر لے جاتے، حیا کا اس قدر غلبہ تھا کہ اُس بیت الخلاء میں کسی سے پانی رکھنے کی خدمت بھی نہیں لیتے تھے۔

مہمانوں کے لئے بیت الخلاء بنانے کا قصہ یوں ہوا کہ ایک بار حضرت مولانا فضل محمد صاحبؒ نے فرمایا کہ آپ کے والد ہمارے اکرام میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے لیکن ہمارے لئے بیت الخلا کا انتظام نہیں فرماتے، ہم کمزور لوگوں کو اس کی ضرورت ہے، بندہ نے گھر آ کر یہ بات والد صاحب سے عرض کی۔ آپ نے کچھ سوچ کر فرمایا کہ اب اس کا بنانا لازمی ہے، پھر مسجد اور حجرہ سے کافی باہر ایک جگہ منتخب کی اور وہاں بنایا گیا۔

عامۃ الناس پر شفقت

حضرت کی ساری زندگی مخلوق خدا کے ساتھ ہمدردی، خیر خواہی اور ان کی خدمت میں گزری۔ غم زدہ لوگوں کے حالات معلوم کر کے حتی الوسع ان کا تعاون کرتے۔ حضرت نے شہادت سے چند گھنٹے قبل بندہ سے فرمایا کہ بیٹا! میں کسی کا مقروض نہیں، بعض احباب نے مجھ سے کچھ رقم بطور قرض لی ہے اگر ان میں سے کوئی واپس کرنا بھی چاہے تو نہ لیں۔ حضرت کی شہادت کے بعد بہت سے حضرات آئے کہ ہم نے حضرت سے اپنی ضرورت اور بیماری وغیرہ کے لئے اتنی رقم بطور قرض لی تھی اب ہم واپس کرنا چاہتے ہیں، میں نے حسب وصیت کسی سے کچھ نہیں لیا، تاہم ہمیں پتہ چلا کہ حضرت لوگوں سے کتنی مالی معاونت فرماتے تھے جس کا ہمیں گھر کے افراد ہونے کے باوجود علم تک نہ تھا۔

حضرت نے لوگوں کی اسی خیر خواہی کی بنا پر دم تعویذ کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا، جب کوئی پریشان حال بیمار آتا، تو اس سے مرض کی پوری تفصیلات معلوم کرتے، دم تعویذ کے علاوہ اگر ڈاکٹر کی ضرورت ہوتی تو مریض کی رہنمائی کرتے۔ اگر ڈاکٹر متعلقین میں سے ہوتا تو اس کا فون نمبر، مکمل پتہ اور سفارشی خط بھی لکھ کر دے دیتے۔ ہم عرض کرتے کہ حضرت ہر مریض کے ساتھ اتنی دماغ سوزی آپ کا بہت سا قیمتی وقت لے لیتی ہے، تو فرماتے کہ مجھے رب کی رضا چاہیے، نہ جانے ہمارا پیارا رب کس چیز پر راضی ہو۔ فرماتے کہ یہ عملیات کا کام میں نے مجبوری کی وجہ سے

شروع کیا ہے، اساتذہ کا اصرار تھا کیونکہ اس پر گمراہ لوگ قبضہ کیے بیٹھے ہیں، سادہ لوح مسلمان غیر مسلموں کے پاس جاتے ہیں، غلط قسم کے تعویذات اور وظائف لیتے ہیں، جن میں شرکیہ الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ حضرت تعویذ دینے سے قبل عقیدہ کی تصحیح کرواتے، پھر فرماتے یہ بمثل دعا یا درخواست کے ہے، اس کے ساتھ علاج معالجہ کی کوشش بھی ہو۔ وظائف میں اسمائے حسنیٰ میں سے کسی نام کے بارے میں فرماتے کہ یہ پڑھا کریں۔

فرمایا: ایک زمانے میں عملیات کے کام سے میں بہت تنگ ہو گیا تھا، لوگوں کی کثرت ہوئی تھی، دوسری طرف حضرت مولانا عبداللہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ ایک فضول کام ہے، ٹھیک ہے کار خیر بھی ہے، لیکن ہمارے لوگ آپ کے اوقات کی قدر و قیمت نہیں جانتے، یہ کام کوئی دوسرا مولوی بھی کر سکتا ہے، آپ اپنی علمی خدمات کی طرف متوجہ ہوں، اس کے بعد میں نے پابندی لگا دی، اعلان بھی آویزاں کیا۔ چند دنوں کے بعد حضرت مولانا فضل محمد صاحبؒ تشریف لائے تو مجلس میں ایک صاحب نے اپنی کسی پریشانی کا ذکر کیا۔ حضرتؒ نے استاذ صاحب کے طرف اشارہ کیا کہ ان سے تعویذ لیں، تو وہ صاحب کہنے لگے کہ استاذ صاحب نے یہ کام چھوڑ دیا ہے۔ والد صاحب نے حضرت مہتمم صاحب سے عرض کیا کہ حضرت لوگوں کی کثرت کی وجہ سے علمی کاموں پر اثر پڑ رہا تھا، مجبوراً چھوڑا ہے۔ اس پر حضرت نے فرمایا کہ مولانا صاحب! نہ جانے ہمارا رب کس چیز پر بندہ سے خوش ہوتا ہے، لہٰذا ہفتہ میں دو دن کر لیا کریں۔ اس پر پھر شروع فرما دیا۔ فرمایا کہ کچھ عرصہ بعد پھر چھوڑنے کا ارادہ کیا تھا، مکتبہ میں جا کر ایک کتاب اُٹھائی اس میں اول صفحہ پر یہ حدیث درج تھی کہ بعض انسانوں کو اللہ تعالیٰ انسانیت کی خدمت پر مامور کر دیتے ہیں۔ اس روایت کو دیکھ کر حضرت مہتمم صاحب کے الفاظ یاد آئے، پھر چھوڑنے کا ارادہ مکمل طور پر ترک کر دیا۔

حضرت کی عملیات اتنی مشہور تھیں کہ بعض دفعہ تعویذ شروع کرتے تو مریض ٹھیک ہو جاتا، تعویذ یا دم کا شکرانہ کبھی نہیں لیتے تھے اگر کوئی اجنبی دینا چاہتا تو ان سے فرماتے کہ باہر کسی غریب کو دے دو۔ ایک دن تعویذ لینے کے لیے ایک غریب آدمی آیا، حضرت نے پہلے چائے پلائی، پھر ان کو کچھ رقم اور ایک جوڑا کپڑوں کا دیا، آخر میں تعویذ بھی دیا۔ اس نے جاتے ہوئے حضرت کو شکرانے کی معمولی سی رقم دی تو حضرت نے خلاف معمول لے لی۔ پھر فوراً مجھے دے کر فرمایا کہ یہ فلاں طالب علم کو دے دو، میں جانے لگا تو حضرت نے آواز دے کر واپس بلایا کہ یہ رقم کم ہے، یہ بھی ساتھ ملا دو، پھر جیب سے مجھے کچھ مزید پیسے دیئے، میں نے حضرت سے پوچھا کہ اس آدمی سے آپ نے خلاف معمول پیسے کیوں لیے؟ حضرت نے فرمایا کہ یہ بابا بہت ضدی ہے، اگر نہ لیتا تو یہ شور مچاتا، اس وقت چونکہ بعض طلباء کرام آرام کر رہے ہیں لہٰذا ان کے آرام میں خلل پڑتا۔ دوسری بات یہ تھی کہ اس نے جو رقم دی، وہ بہت ہی معمولی تھی، اگر میں نہ لیتا تو ان کے دل میں یہ بات آتی کہ یہ رقم کم ہے، اس لئے نہیں لی۔ تو ان کی دلجوئی کی وجہ سے لے لی۔

ایک بار ایک خاتون چھوٹی بچی دم کرانے لائی، وہ بے چاری انتہائی غریب گھرانے کی تھی۔ بچی انتہائی سخت تکلیف میں تھی، حضرت نے حکمت کی کتابوں کا کافی مطالعہ کر رکھا تھا، اس وجہ سے مریض کے حالات سے مرض کا اندازہ ہو جاتا۔ اس بچی کی تکلیف بھی اس نوعیت کی تھی کہ ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی ضرورت تھی۔ سخت گرمی کا موسم تھا، دوپہر کا وقت تھا، حضرت میرے پاس آئے اور نیند سے اُٹھا کر کہا کہ بیٹا! اگر تکلیف نہ ہو تو بازار تک جانا ہے، بندہ جلدی سے اُٹھا، حضرت سے پوچھا کہ حضرت خیریت تو ہے؟ فرمایا: یہ لڑکی بہت تکلیف میں ہے، اللہ تعالی کی رضا کی خاطر ڈاکٹر کے پاس لے جائیں۔ ساتھ رقم بھی دی اور ڈاکٹر کا بھی بتایا کہ فلاں کے پاس لے جائیں۔ پھر حضرت نے اپنے کمرہ سے تولیہ لے کر پانی میں بھگویا اور اس بچی کے سر پر رکھا اور اپنی چادر پانی سے تر کر کے ان کے پاؤں پر ڈالی۔ میں بچی کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا، اس نے معائنہ کیا تو بتایا کہ شدت بخار کی وجہ سے یہ عجیب وغریب حرکات اور باتیں کر رہی تھیں، گھر والے سمجھے کہ اس پر آسیب کا اثر ہے۔ جب میں واپس آیا تو والد صاحب نے بھی یہی فرمایا کہ ہمارا علاقے کے لوگ مرض کو نہیں دیکھتے، بس یہی سمجھتے ہیں کہ اس پر جنات ہیں۔ حالانکہ اس کو اتنا سخت بخار چڑھا ہوا تھا کہ اس کی وجہ سے اس کا دماغ متأثر ہو گیا تھا۔ اس پر میں نے ڈاکٹر صاحب کی بات ذکر کی تو حضرت نے فرمایا کہ اسی وجہ سے تو میں نے ڈاکٹر کا مشورہ دیا۔ یہ حضرت کے حسن سلوک اور حسن اخلاق وخدمت خلق کا ایک نمونہ تھا۔

ایک مرتبہ ہم حضرت کے ساتھ پشاور سے آ رہے تھے، راستے میں بارش تھی، کچھ عیسائی' جو صفائی وغیرہ کرتے ہیں' راستے میں کھڑے تھے، انہوں نے ہمیں رکنے کا اشارہ کیا لیکن ہمارے ڈرائیور نے گاڑی نہیں روکی، والد صاحب نے کہا کہ گاڑی روکیے، بارش ہے، بے چارے کیا کھڑے رہیں گے۔ حضرت نے انہیں گاڑی میں بیٹھا کر کھانے پینے کی چیزیں دیں، اپنا فون نمبر بھی دیا اور فرمایا کہ کوئی ضرورت ہو تو یاد کرلیا کریں، وہ بے چارے اس رویے پر سخت حیرت زدہ تھے۔ دو دن بعد ان کا فون آیا کہ ہم حضرت سے ملنا چاہتے ہیں، اگلے دن دس بجے کے قریب آ گئے، انہوں نے ہاتھ ملانا چاہا تو حضرت نے معانقہ فرمایا، حضرت نے ضروری ضیافت فرمائی، کچھ دیر بعد وہ کہنے لگے کہ حضرت ہم تو اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے آئے تھے، آپ ہمیں کلمہ پڑھا دیں تاکہ ہم مسلمان ہو جائیں۔ والد صاحب نے انہیں کلمہ پڑھایا پھر بتایا کہ آپ لوگ مسلمانوں کے بجائے اسلام کا مطالعہ کریں۔ اس پر حضرت نے ایک مثال دی کہ جاپان نے کاریں بنائی ہیں، اگر کوئی ان کو غلط طریقے سے استعمال کرتا ہے تو اس میں جاپان کی غلطی نہیں ہے، بلکہ استعمال کرنے والے کی غلطی ہے۔ پھر والد صاحب نے مجھے حکم دیا کہ حضرت مولانا محمد رفیق صاحبؒ (امیر تبلیغی مرکز ہنگو) کا پوچھیں کہ کہاں ہیں، میں نے ان کی معلومات کیں، پھر

ان سارے حضرات کو مولانا کے پاس لے گئے، انہوں نے ان سب حضرات کو ابتدائی تعلیم دی، والد صاحب نے مشورہ دیا کہ ان کو تبلیغ میں بھیجیں۔ پھر ان میں سے ہر ایک کو رقم دی اور رخصت فرمایا۔ بوقت رخصت ان لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ حضرت کے خادم ہیں؟ میرے بجائے حضرت نے جواب دیا کہ یہ میرا بیٹا ہے۔

کچھ عرصہ بعد پھر ان کا فون آیا کہ ہماری برادری کے کچھ لوگ حضرت سے ملنا چاہتے ہیں، حضرت ان دنوں بیمار بھی تھے اور کچھ مصروف بھی تھے لیکن انہوں بتایا کہ یہ مہمان باہر سے آئے ہیں، صرف حضرت کی زیارت کرنا چاہتے ہیں اور ایک ضروری مسئلہ ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ آجائیں، اگلے دن ظہر کی نماز کے بعد وہ آئے، حضرت نے اپنے پاس بٹھایا، اکرام کیا، تو انہوں نے کہا کہ ہمارے ساتھ گاڑی میں ایک مریض ہے، کافی زمانے سے صاحب فراش ہے، ہم اسے دم کرانے لائے ہیں، حضرت ان کے ساتھ گئے اور انہیں دم کیا۔

عین اسی وقت حضرت کے پاس ایک سرکاری آفیسر بھی آگیا، حضرت نے مجھے بلایا کہ ان سے معذرت کرلیں کہ میں مہمانوں کو دم کر کے آرہا ہوں۔ اس آفیسر نے کہا کہ یار استاذ صاحب کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ استاذ الجن ہیں، یعنی جنوں کو پڑھاتے ہیں، میں یہ نہیں مانتا تھا، آج میں نے تسلیم کرلیا کہ جب غیر مسلم بھی حضرت کے پاس آکر دم کرواتے ہیں تو حضرت صرف مسلمانوں ہی کے نہیں بلکہ انسانوں کے بھی استاذ ہیں اور جنوں کے بھی استاذ ہیں۔ اسی افسر نے کہا کہ چند دن قبل ایک شیعہ دوست نے بتایا کہ مجھے گردوں کی شکایت تھی، کسی نے کہا کہ حضرت اس کے لیے عرق گلاب دم کرتے ہیں، میں عرق گلاب لے کر حضرت کے پاس گیا، حضرت نے چائے بھی پلائی اور عرق بھی دم کر کے دیا۔ یہ عیسائی حضرات بار بار حضرت سے عرض کرتے رہے کہ آپ ان آفیسر صاحب کو پہلے فارغ کریں لیکن حضرت نے فرمایا کہ آپ پہلے آئے ہیں، لہٰذا پہلے آپ کا حق ہے۔ یقین کریں ان میں جو نئے حضرات آئے تھے، ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ حضرت کی شہادت پر اس برادری کے اکثر حضرات تعزیت کے لئے بھی آئے تھے۔ حضرت والد صاحب اکثر فرماتے تھے کہ کامیاب انسان وہ ہے، جو دن کی روشنی میں مخلوق خدا کی خدمت کرے اور رات کے اندھیرے میں خالق کی عبادت کرے۔

جانوروں پر شفقت

حضرت کا جانوروں سے بھی عجیب اُنس تھا اور جانور بھی آپ سے ایسے مانوس تھے، جیسے انسان انسانوں سے مانوس ہوتے ہیں، اس کا کچھ ذکر تو برادرم حافظ ظہیر الدین کے مضمون میں آچکا ہے، ایک دو واقعات میں بھی ذکر کر دیتا ہوں، ہمارا گھر چونکہ ایک پسماندہ گاؤں میں واقع ہے، جہاں لوگ رکھوالی کے لئے کتے رکھتے ہیں، ہمارے گھر

میں بھی رکھوالی کے لئے ایک کتا تھا، وہ سارا دن لاپتہ رہتا، شام ہوتے ہی آجاتا اور والد صاحب کے کمرے کے سامنے بیٹھ جاتا، جیسے چوکیداری پر متعین ہو، والد صاحب کو اگر رات کے وقت کسی ضرورت سے باہر جانا ہوتا تو یہ بھی ساتھ جاتا اور باہر بیٹھ کر آپ کا انتظار کرتا حتی کہ باہر بیت الخلا جانا ہوتا تو یہ ساتھ جا کر بیت الخلا کے دروازے پر بیٹھ کر انتظار کرتا، جب والد صاحب کی شہادت ہوئی تو یہ بڑا اُداس کمرے کے سامنے آکر بیٹھ جاتا، ہم نے خود دیکھا کہ انسانوں کی طرح اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے ہوتے، صرف ایک ماہ بعد وہ مر گیا۔

اس طرح ایک بلا جو تقریباً گیارہ سال ہمارے گھر میں رہا، حضرت سے انتہائی مانوس تھا۔ دودھ، گوشت وغیرہ کو منہ لگانا تو دور کی بات ان کی طرف التفات بھی نہیں کرتا تھا۔ ہر وقت حضرت کے ساتھ گھومتا پھرتا، حضرت کے اشارہ کو ایسا سمجھتا کہ ایک انسان بھی اس طرح اشارات کو نہ سمجھ سکتا، بالآخر حضرت سے وفا کا ثبوت دے کر آپ کی شہادت کے کچھ ہی دن بعد مر گیا۔

اسی طرح ہمارے گھر کی پالتو گائے والد صاحب سے بڑی مانوس تھی، آپ اُس کے لئے اپنے ہاتھ سے گھاس لاتے، چارہ ڈالتے، جب والد صاحب شہید ہوئے تو اُس پر کافی اُداسی تھی، ایک دن ہمارے تایا حاجی مسلم الدین صاحب جو قد کاٹھ میں والد صاحب کی طرح ہے، ہمارے گھر تشریف لائے تو یہ گائے منہ اُٹھا کر زور زور سے آوازیں نکالنے لگی جیسے کہ اس پر والد صاحب کا گمان کر رہی ہو، جب تایا جی نے اُس کی طرف دیکھا تو اُس کی آواز ایسے رندھ گئی جیسے کوئی شدت غم میں روتا ہے اور ٹپ ٹپ اُس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے، یہ منظر دیکھ کر سارے گھر والے رونے لگے اور حضرت کا غم تازہ ہو گیا۔

حضرت اپنے ہاتھوں سے پرندوں اور بلیوں کے لیے کھانے پینے کی چیزیں ڈالتے، محلے کی تمام بلیاں کھانے پینے آتی تھیں، انہیں حضرت کے آنے جانے کے اوقات بھی معلوم تھے۔ الحمد للہ یہ مناظر ہم نے اپنے گھر میں دیکھے ہیں کہ کتا، بلی اور مرغیاں وغیرہ اکٹھے کھاتے پیتے تھے۔

جانوروں پر شفقت کی بات چلی تو ایک لطیفہ یاد آ گیا اسے بھی لکھتا چلوں۔ مولانا حافظ انوار الاسلام صاحب رحمہ اللہ بڑے ظریف انسان تھے، جامعہ یوسفیہ میں مدرس تھے، ایک دن ہمارے تایا صاحب کے دو دنبے گم ہو گئے، دوسرے دن ظہر کے وقت حافظ صاحب نے تایا صاحب سے پوچھا کہ بہت پریشان نظر آرہے ہو، خیریت ہے؟ انہوں نے واقعہ سنایا تو حافظ صاحب نے کہا کہ میں پتہ لگالوں تو کتنے پیسے دوگے۔ تایا صاحب نے کہا کہ پچاس روپے دوں گا مگر وہ راضی نہ ہوئے، بالآخر سو روپے پر رضامند ہو گئے۔ اس کے بعد والد صاحب کے پاس آئے کہ اب کوئی وظیفہ بتاؤ، میں نے حاجی صاحب کے ساتھ سو روپے کی شرط لگائی ہے۔ والد صاحب نے ڈانٹا کہ

یہ کیا تماشہ شروع کر رکھا ہے، لیکن وہ واڑ گئے کہ مجھے ہر حال میں وظیفہ چاہیے، بہر حال والد صاحب نے مجبور ہو کر یہ وظیفہ بتایا کہ "یاجامع الناس لیوم لاریب فیہ انک لاتخلف المیعاد اجمع بینی و بین ضالتی" کو طاق عدد پڑھتے جاؤ، حافظ صاحب نے مذکورہ وظیفہ شروع کیا تو شام کے وقت دنبے گھر پہنچ گئے اور یوں سو روپے کما لیے۔

شجر و حجر کی محبت

والد صاحب کو پھول بوٹوں اور پودوں سے بھی بڑا انس تھا اور جامعہ یوسفیہ میں طرح طرح کے پودے لگائے تھے، ان کی خوب نگہداشت کرتے، اپنے ہاتھوں سے سیراب کرتے، ان کی شاخیں درست کرتے اور ان کو نقصان پہنچانے یا کاٹنے پر ناراض ہوتے۔ ایک مرتبہ سفر سے واپس آئے تو ایک درخت پر نظر پڑی کہ اسے کسی نے کٹوایا تھا، اس پر حضرت بہت غصہ ہوئے نماز مغرب کے بعد بندہ سے پوچھا کہ یہ کام کس نے کیا؟ بندہ نے لاعلمی ظاہر کی۔ فرمایا: ان درختوں کے احوال آپ لوگ کیا جانتے ہو؟ یاد رکھیں! مدرسہ کے طلباء کرام سے زیادہ مجھ سے مدرسہ کے در و دیوار اور درخت محبت کرتے ہیں۔ بذات خود میں نے اپنے گھر میں کتے سے لے کر چرندوں، پرندوں تک ہر چیز کو دیکھا ہے کہ حضرت سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے۔

والد صاحب کا رمضان

حضرت کو اللہ تعالیٰ نے اعلیٰ درجے کا ذوق عبادت نصیب فرمایا تھا، اپنی معروفیات کے علاوہ تقریباً ہر وقت ذکر و عبادت میں مشغول رہتے۔ خاص کر رمضان شریف میں عبادت کی بہت ہی کثرت فرماتے تھے۔ حضرت کی ایک ضعیف العمر چچی کہتی ہیں کہ حضرت بچپن میں اپنے چچا کے ساتھ رمضان میں تراویح کے لئے جاتے تھے وہ ان کو منع کرتے کہ ابھی تم چھوٹے ہو لیکن آپ منع نہ ہوتے اور رونے لگتے۔ اسی طرح سن بلوغ سے قبل ہی اپنے چچا کے ساتھ اعتکاف میں بیٹھتے۔ بلوغ کے بعد زمانہ طالب علمی میں رمضان کے ابتدائی ایام اولیا کی صحبت میں گزارتے۔ رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف کے لئے اپنی مسجد میں آجاتے۔ ایسا بہت ہی کم رمضان گزرا ہوا ہوگا کہ جس میں آپؒ نے اعتکاف نہ کیا ہو۔

۱۹۹۴ء سے ۲۰۰۹ء تک پورا مہینہ اعتکاف کرنے کا معمول تھا اور اس نفلی اعتکاف میں بھی ویسی پابندی کرتے جو سنت اعتکاف میں کی جاتی ہے، ہم عرض کرتے کہ حضرت یہ تو نفلی اعتکاف ہے اس میں زیادہ پابندیوں کی ضرورت نہیں ہوگی تو حضرت فرماتے کہ عبادت میں اصل چیز ریاضت اور مجاہدہ ہے، جب یہ ہوگا تو عبادت میں لذت ہوگی بظاہر لوگوں کو یہ مشکل لگے گا مگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ بہت ہی آسانی کا معاملہ فرماتے ہیں۔ یاد رکھیں کہ

طاعات اور حسنات شروع کرتے وقت بہت مشکل نظر آتی ہیں اور دشواری بھی محسوس ہوتی ہے پھر رفتہ رفتہ بندہ اس میں تھکاوٹ اور دشواری کے بجائے لذت محسوس کرتا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت کے پاس کچھ مہمان آئے، ایک نے عرض کیا کہ حضرت! مجھے نماز پڑھنے میں بہت دشواری محسوس ہوتی ہے، حضرت فرمانے لگے کہ نماز تو پڑھتے ہو؟ اس نے کہا کہ جی ہاں! پڑھتا تو ہوں مگر سر پر پہاڑ جیسا بوجھ محسوس کرتا ہوں، حضرت نے فرمایا کہ ماشاء اللہ آپ بڑا مجاہدہ کرر ہے ہیں اور چھوڑنے کی کوشش نہ کریں، ان شاء اللہ بہت جلد آپ وہ لذت محسوس کریں گے جس کا آپ نے کبھی تصور نہ کیا ہوگا۔ باقی اصل تو اخلاص سے نماز کی ادائیگی ہے، چاہے دل مانے نہ مانے اور مزہ وکیف ملے یا نہ ملے۔

حضرت رمضان سے کافی دن پہلے اعتکاف کی تیاری میں مصروف ہوجاتے۔ رمضان آنے پر بڑے ہی مسرور ہوتے اور گھریلو ضروریات کے بارے میں بار بار فرماتے کہ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو ابھی سے بتائیں پھر رمضان میں تنگ کرنے کی کوشش نہ کریں اور ساتھ ہی فرماتے کہ رمضان میں ضیاع وقت سے بچنے کی کوشش کریں۔ رمضان روحانیت کا مہینہ ہے لیکن بدقسمتی سے آج مسلمان اس کی حقیقت سے ناواقف ہیں۔

حضرت فرماتے کہ ہر مسلمان کو چاہیے کہ رمضان کے آغاز میں صلوۃ حاجت کا اہتمام کرکے رب ذوالجلال سے التجا کرے کہ اے میرے خالق! تو مجھے نیکی کی توفیق عطا فرما۔ جب کسی خوش قسمت کو اعمال صالحہ کا موقع ملے تو اس کے بعد صلوۃ شکر ادا کرنا چاہیے اس لئے کہ نیکی کی توفیق من جانب اللہ ملتی ہے۔ اس کے بارے میں ہمارے اکابر لکھتے ہیں کہ نیکی کو ایک مہمان سمجھ کر اس کا اچھا استقبال کرنا چاہیے تاکہ پھر وہ بار بار آنے کی کوشش کرے، کیونکہ مہمان اچھی ضیافت پر خوش ہوتے ہیں، اکرام اور اچھے سلوک کی وجہ سے یہ اس جگہ کو اپنا ٹھکانہ بناتے ہیں۔ حضرت فرماتے تھے کہ اگر کوئی شخص ان دو چیزوں پر کاربند رہے گا یعنی اللہ تعالیٰ سے طلب کرنا اور پھر اس پر شکر ادا کرنا تو اس کو طاعات وحسنات پر استقامت اور مسرت ملے گی یہ میرا تجربہ ہے۔

اعتکاف کے دوران حضرت پر عجیب قسم کے احوال آتے تھے، اکثر کے افشا سے حضرت نے ممانعت فرمائی ہے، کیونکہ حضرت اپنے کمالات کو صرف قابو ہی نہیں بلکہ حددرجہ مخفی بھی رکھتے تھے پھر خاص طور پر اپنے باطنی احوال اور مقام کو ہمیشہ اخفا میں رکھنے کا خاص اہتمام فرمایا۔ اس وجہ سے مخلص اور قریبی متعلقین بھی حضرت کے اکثر حال و احوال سے ناواقف ہیں۔

جب ۱۹۹۸ء میں ہنگو میں شیعہ سنی فسادات شروع ہوئے تو اس کے بعد کئی بار حضرت کو شہید کرنے کے منصوبے بنے مگر اللہ تعالیٰ نے حفاظت فرمائی۔ اس وجہ سے ہم اعتکاف کے ایام میں رات کو حضرت کا پہرہ دیتے، وہ بھی

حضرت سے چھپ کر۔ کیونکہ کئی دفعہ حضرت نے منع بھی کیا۔

ایک بار رات کو ہم پہرہ دے رہے تھے کہ اچانک مسجد ایک عجیب وغریب قسم کی روشنی سے بھر گئی اور ساتھ مسجد سے رونے کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ میں جلدی سے مسجد کی طرف آیا اور باہر کی کھڑکی کے شیشہ سے دیکھنے لگا کہ کیا ماجرا ہے؟ دیکھا کہ حضرت قیام کی حالت میں قبلہ رو کھڑے ہیں اور تلاوت فرما رہے ہیں اور ہر طرف سے تلاوت کی آوازیں بلند ہورہی ہیں اور حضرت تلاوت بھی کرتے ہیں اور روتے بھی ہیں، اس دوران مسجد کی طرف سے خوشبو بھی آنا شروع ہوئی۔ میں دروازے کی طرف آیا تو یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ کچھ دیر بعد حضرت باہر تشریف لائے، مجھے دیکھا تو آواز دی۔ میں حاضر ہوا تو بہت ہی سلیقہ سے میرے کھڑے ہونے کے بارے میں پوچھنے لگے۔ جب میں نے واقعہ کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا کہ گھر جا کر اپنی والدہ کو بلائیں۔ میں نے والدہ کو بلایا تو حضرت نے ان سے کچھ کہا اور پھر وہ واپس چلی گئیں۔ والدہ نے گھر میں کہا کہ اس واقعہ کا ذکر کسی سے نہ کرنا ورنہ نقصان ہوجائے گا۔ حضرت کی زندگی میں تو اس قسم کے واقعات ہم نے ظاہر کرنے کی کبھی جرأت نہیں کی لیکن اب اس نیت سے لکھ رہا ہوں کہ اللہ والوں کے مجاہدات اور ان سے اللہ تعالیٰ کے معاملے کا کچھ نقشہ سامنے آجائے اور یہ بھی کہ یہ سب کچھ اس زمانے میں بھی ممکن ہے، بس ہمت اور تعلق مع اللہ کو خالص کرنے کی ضرورت ہے۔

میری والدہ صاحبہ کے پاس حضرت کے اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں لیکن ان پر بھی پابندی لگائی تھی ورنہ والدہ کہتی ہے کہ ان کے اس طرح کے احوال سے ایک کتاب بھر جائے گی۔

رمضان میں دو دن میں ختم قرآن پاک، پندرہ ہزار مرتبہ کلمہ طیبہ، دس ہزار مرتبہ استغفار، پچیس ہزار مرتبہ اسم ذات اور پانچ ہزار مرتبہ درود شریف کا یومیہ معمول تھا۔ اس کے ساتھ چار سو سے آٹھ سو صفحات کا یومیہ مطالعہ بھی فرماتے اور مہمانوں کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔

وطن عزیز کی فکر

حضرت والد صاحب وطن عزیز میں قیام امن کے لیے ہمیشہ متفکر رہتے۔ فرماتے: امن نعمت عظمیٰ ہے، بدامنی سے بہت سے سنگین مسائل جنم لیتے ہیں، خصوصاً قبائل اور فوج کی لڑائی کے بارے میں کافی پریشان رہتے، فرماتے کہ یہ جنگ ہماری تباہی ہے، اس سے ہمارے ملک کو سوائے نقصان کے کچھ نہیں ملے گا، ہاں اس کا فائدہ بھارت، اسرائیل، روس، امریکہ اور ایران کو ملے گا کیونکہ یہ ممالک ہمارے ملک کا استحکام نہیں چاہتے۔ یہ بھی فرماتے کہ ہمارے حکمران وطن کے ساتھ مخلص نہیں، ورنہ پاکستان جیسا ملک کرۂ ارض پر کوئی نہیں۔ یہاں وسائل کی بہتات

ہے،عوام ملک وملت کے شیدائی ہیں ،اسلامی اور دینی خدمات کے حوالے سے یہاں جو آزادی ہے وہ کسی ملک میں بھی نہیں، یہاں ایسے ایسے رجال موجود ہیں جن میں سے ہر ایک مستقل اثاثہ ہے۔

ہمارا دشمن چاہتا ہے کہ ان افراد کے دلوں میں ملکی اداروں کے خلاف نفرت گھر کر جائے۔ان کی اس پالیسی پر کافی کوشش ہوئی ہے مگر اب تک کامیاب نہیں ہوسکے۔اب یہ جو خانہ جنگی کا سلسلہ شروع ہوا ہے،تو خدانخواستہ لگتا ایسے ہے کہ وہ اپنی پالیسی میں کامیاب ہوجائیں گے، کیونکہ ہماری فوج کی تربیت میں ان کو سخت رویہ ملا ہے، عوام کے ساتھ ان کی مقابلہ آرائی کے نتیجہ میں عوام کے دلوں میں نفرت پیدا ہوجائے گی ، جب کہ ملک چلتا عوام کی طاقت پر ہے،لہٰذا ملک اور اداروں کے ساتھ عوام کا اخلاص ختم ہوگا یوں دشمن اپنے مقاصد پانے میں کامیاب ہوگا۔

حضرت کا یہ قول بہت یاد آتا ہے کہ جو اللہ تعالی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مخلص ہوگا ،وہ ہمارے ملک کے ساتھ بھی مخلص ہوگا، جو ان کا وفادار ہوگا،وہ ہمارے ملک کا بھی وفادار ہوگا اور جو اللہ تعالی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وفاداری نہیں کرے گا تو وہ ملک کے ساتھ کیا وفاداری کرے گا؟

ہمارے علاقے کے سیاسی رہنماؤں کو متوجہ کرتے کہ ہنگو میں کارخانے اور فیکٹریاں بنائیں،اس سے لوگوں کو روزگار ملے گا،لوگ مصروف ہوجائیں گے اور یہ بدامنی خود بخود ختم ہوجائے گی۔ ہر ملک پر نظر ڈالیں کہ انہوں نے اپنے لوگوں کو کیسے مصروف رکھا ہوا ہے۔مزید اس حوالے سے برادرم مکرم مولانا محمد طفیل کا مستقل مضمون شامل اشاعت ہے،اس موضوع پر ان شاء اللہ اس میں کافی مواد ہے اور مجھے معلوم اکثر باتیں اس میں آگئیں ہیں

حضرت والد صاحب کے آخری ایام

والد صاحب کی شہادت سے تقریباً سات ماہ قبل حضرت مولانا عبداللہ صاحب سخت بیمار ہوگئے تھے ،حضرت نے اپنے رفقا سے مشاورت شروع کی کہ حضرت کی حیات میں سنی سپریم کونسل کے واسطے ان کا نائب منتخب کرنا چاہیے ، مجھے فرمایا کہ آج اسباق کے بعد حضرت مولانا محمد رفیق صاحب اور حضرت مولانا محمد صدیق اخونزادہ صاحب سے ملاقات کریں گے۔ جب مولانا محمد رفیق صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے حضرت سے پوچھا کہ ان مسلح تحریکوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ والد صاحب نے فرمایا کہ یہ ایک فتنہ ہے۔مولانا نے کہا کہ فتنہ کی جامع الفاظ میں تعریف فرمائیں تو حضرت نے فرمایا کہ ایک چیز کی ابتدا اور انتہا معلوم نہ ہو اور عقل کی رسائی سے باہر ہو۔ پھر حضرت نے تاریخ اسلام پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ ہر صدی میں تقریباً ان جیسی تحریکیں پیدا ہوئی ہیں، اگر میں تاریخ اسلام ذہبی کا مطالعہ نہ کرچکا ہوتا تو یہ تحریکیں میری سمجھ میں نہ آتیں ،اور ان کے مظالم مجھے دیوانہ

بنا دیتیں مگر امام ذہبی نے ایسے ایسے سخت واقعات نقل فرمائے ہیں جنہیں پڑھ کر دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہر اسلامی قائد کیلئے تاریخ اسلام للذہبی کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ فرمایا: مجھے بہت افسوس ہے کہ ایک طرف مسلمانوں خصوصاً پشتون کے خون کے ساتھ امریکہ کی جارح، ظالم اور جابر فوج کھیل رہی ہیں جب کہ دوسری طرف یہ نادان مسلمانوں کی بیخ کنی میں معروف ہیں، پھر ایک اہم شخصیت کا حوالہ دے کر فرمایا کہ القاعدہ کے روپ میں یمن کے شیعہ آئے ہیں وہ ہدایات دے کر ہمارے جذباتی نوجوانوں کو ہمارے ہی خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ فرمایا کہ بعض چیزوں میں ان کی خوارج کے ساتھ بھی کافی مماثلت ہے۔ ان باتوں کے بعد مولانا محمد رفیق صاحب نے حضرت سے دست بستہ ہوکر درخواست کی کہ خدارا! آئندہ کسی کے ساتھ یہ گفتگو نہ کریں تو حضرت نے تبسم کی حالت میں فرمایا کہ اگر تبلیغ والے ان دونوں فریقوں کو سمجھانے کی کوشش کریں تو امت کے ساتھ احسان عظیم ہوگا۔

والد صاحب مولانا عبداللہ صاحب کی صحت کی وجہ سے کافی پریشان تھے، دوسری پریشانی موجودہ سنگین حالات میں قوم کیلئے کوئی لائحہ عمل تیار کرنے کی تھی، ان دنوں بالخصوص وہ حضرات اغوا ہو رہے تھے جن کا حضرت سے خاص تعلق ہوتا، اس پر مستزاد پریشانی یہ تھی کہ ان دنوں میرے چھوٹے بھائی حافظ ظہیر مدرسہ کی تعلیم چھوڑ کر آگئے تھے۔ ان کے بارے میں بھی حضرت بے حد بے چین تھے، میں نے بھائی کو سمجھایا کہ والد صاحب آپ کے بارے میں کافی پریشان ہیں لہٰذا آپ مہربانی کر کے دوبارہ پڑھنا شروع کریں۔ بھائی نے آمادگی ظاہر کی تو والد صاحب نے فرمایا کہ آج کل حالات بہت تشویش ناک ہیں اس کے پیش نظر کسی مناسب مدرسہ میں داخلہ کروانا چاہیے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت اگر آپ حضرات مناسب سمجھتے ہیں، تو میں ان کو کربوغہ شریف لے جاؤں گا۔ حضرت نے اس مشورہ کو پسند فرمایا کہ آج نہیں کل ساتھ جائیں گے، کیونکہ میں نے مفتی مختار الدین صاحب سے ملاقات کرنی ہے۔

شام کے وقت والد صاحب نے فرمایا کہ حاجی عزت گل صاحب کو بلاؤ (یہ ہمارے رشتہ دار اور علاقائی رسم و رواج سے گہری واقفیت رکھنے والے سماجی رہنما ہیں) ان کے ساتھ موجودہ حالات پر طویل گفتگو کی، ساتھ یہ بھی فرمایا کہ سپریم کونسل کیلئے ایک مناسب امیر منتخب ہونا چاہیے، حضرت مولانا عبداللہ صاحب کی صحت اچھی نہیں۔ حاجی صاحب نے کہا کہ استاذ صاحب! اگر مولانا عبداللہ صاحب بیمار ہے تو آپ حضرات تو ہیں، آپ سے بہتر کوئی امیر نہیں ہوسکتا اور قوم بھی آپ کے بغیر کسی کو تسلیم نہیں کرے گی۔ والد صاحب اس بات پر سخت غصہ ہوئے اور اپنے جلالی انداز میں فرمایا کہ حاجی صاحب میرا تو آپ پر بہت زیادہ اعتماد تھا، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ اگر آپ کی رائے بھی دوسروں کے ساتھ متفق ہے تو پھر میرے پاس علاقہ چھوڑنے کے سوا کوئی راہ نہیں۔ اس پر حاجی صاحب بالکل

خاموش رہ گئے۔ والد صاحب نے حاجی صاحب سے فرمایا کہ آپ کی قرابت ومحبت کا مجھے احساس ہے، مگر اب میں ان ذمہ داریوں سے بھاگ رہا ہوں، آخری وقت ہے بس آخرت کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ پھر دونوں حضرات نے اس سلسلہ میں آئندہ ہفتہ حضرت مولانا عبداللہ صاحب کی مسجد میں علما کا اجلاس طلب کرنے کا فیصلہ کیا۔

اگلے دن ہم حضرت مفتی مختارالدین شاہ صاحب سے ملنے گئے، تقریباً پونے دو گھنٹے کربوغہ میں حضرت مفتی صاحب کے ساتھ ملاقات رہی، جس میں دونوں حضرات کی ملکی وعلاقائی صورت حال پر تفصیلی بات چیت ہوئی، وہاں سے پھرٹل کے طرف روانہ ہوگئے، راستہ میں سنی سپریم کونسل کے اہم ممبران سے ملاقاتیں کیں اور ان سب کو موجودہ صورت حال سے آگاہ فرما کر اعتماد میں لیا گیا۔

اگلی جمعرات کو اجلاس میں مولانا عبدالستار صاحب کا نام سنی سپریم کونسل کی امارت کیلئے نامزد کیا گیا اور بروز جمعہ جامع مسجد علیؓ ہنگو میں سنی سپریم کونسل کے ممبران سمیت پورے علاقے کے زعما اور قومی مشران کو بلا کر فیصلہ سے آگاہ کیا گیا۔ حضرت والد صاحب نے اس اجلاس میں ایک اہم اعلان یہ بھی کیا کہ یہ وطن عزیز ہمارا ہے۔ نہ ہم حکومت کے دشمن ہیں اور نہ اپنے ملک کے دشمن ہیں، ہم اہل تشیع کی مخالفت کسی عناد کی بنیاد پر نہیں کر رہے بلکہ اس وجہ سے کر رہے ہیں کہ ہم دلائل سے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ صرف اسلام کے نہیں بلکہ وطن عزیز کے بھی دشمن ہیں۔ یہ بات بھی یاد رکھیں کہ سنی سپریم کونسل کا دستور ومنشور یہ رہا ہے کہ ہم حکومت کے ساتھ تصادم کے قائل نہیں بلکہ ہمیشہ مفاہمت اور مذاکرات کی پالیسی پر عمل کیا ہے اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔ بالفرض اگر حکومت ہمارے اوپر ہاتھ ڈالے تو کوئی پروا نہیں ہم قانونی جنگ لڑیں گے، مگر کسی کو روڈ اور بازار بند کرنے، قانون ہاتھ میں لینے یا حکومت سے تصادم کی بالکل اجازت نہیں دیں گے، اگر کسی نے اس کی خلاف ورزی کی تو یہ اس کا ذاتی عمل متصور ہوگا۔

ان دنوں حضرت اکثر ایسے مواقع پر فرماتے کہ میں چند دن کا مہمان ہوں، ساری توجہ اپنی عبادت کی طرف کردی تھی اور آخری ایام میں طویل مراقبے کرتے تھے، ایک مرتبہ ایبٹ آباد کی بزرگ شخصیت چلاسی بابا نے مراقبوں کے بارے میں استفسار کیا تو حضرت فرمانے لگے کہ الحمدللہ آج کل یہ دو مراقبے ''مراقبہ معیت خداوندی'' اور ''مراقبہ موت'' بہت اہتمام سے کرتا ہوں اور ہر مراقبہ پر ایک گھنٹہ سے تین گھنٹے تک وقت لگاتا ہوں، والدہ محترمہ فرماتی ہے کہ آخری سال میں مراقبات میں بسااوقات سردی کے موسم میں بھی پسینہ پسینہ ہوجاتے، کبھی گرمی کی موسم میں ٹھنڈک کی وجہ سے کپکپی طاری ہوجاتی، تنہائی کو زیادہ ترجیح دیتے۔ اولیاء کرام کے تلقین کردہ اس اصول پر پہلے سے عمل پیرا تھے، یعنی قلت طعام، قلت کلام، قلت منام، اور قلت اختلاط مع الانام تو ضرورت کے پیش نظر نہیں کر سکتے تھے، مگر آخری ایام میں اختلاط مع الانام سے بھی احتراز کرتے تھے، حتی کہ مہمانوں سے بھی تنگ

ہوتے تھے، نہایت کم وقت دیا کرتے تھے، اگر کوئی مہمان اپنے آنے کی پہلے سے اطلاع دیتا تو حضرت فرماتے کہ معذرت کرلیں کہ ہنگو کے حالات ٹھیک نہیں ہیں اور یقینا حالات تسلی بخش تھے بھی نہیں۔

شہادت سے چالیس دن قبل ایک دن کے دورے پر سوات روانہ ہوئے تاکہ اپنے اساتذہ کرام ومشائخ عظام کی قبور پر حاضری دے سکیں۔ صبح اذان کے ساتھ روانگی ہوئی، اول دیر میں صندل باباجی صاحب کی خدمت میں حاضری دی، ان سے رخصت لے کر مینگورہ تشریف لے گئے، وہاں شیخ الحدیث مولانا فضل محمد صاحبؒ کے گھر جاکر ان کے صاحبزادوں سے ملاقات ہوئی، پھر حضرتؒ کے مرقد پر حاضری دی، اس کے بعد اپنے مرشد گڑھی باباجی صاحب کے قبر پر حاضری دی، اس کے بعد قاری اقبال احمد صاحب کے ہاں بشام روانہ ہوگئے، رات پونے بارہ بجے وہاں پہنچے، رات کا کھانا قاری اقبال صاحب کے ہاں تناول فرمایا، پھر وہاں سے تہجد کے وقت روانہ ہوئے اور اگلے دن تقریباً گیارہ بجے واپس مدرسہ پہنچ گئے۔

اس وقت یہ روڈ بھی قابل استعمال نہ تھا اور ہر جگہ مرمت کا کام جاری تھا، بدامنی کی وجہ سے جگہ جگہ آرمی کی چیک پوسٹیں قائم تھیں، اس کے باوجود یہ لمبا سفر اتنے مختصر وقت میں خالصتاً استاذ صاحب کی کرامت تھی۔

ان دنوں مدرسہ کا ششماہی امتحان قریب تھا۔ اس کے بارے میں اساتذۂ کرام کا اجلاس تھا، میں نے حضرت کو بتایا کہ امتحان کے بارے میں اجلاس ہے، اگر آپ شرکت فرمائیں۔ فرمایا کہ بیٹا! آپ اپنا کام جاری رکھیں، میں کب تک زندہ رہوں گا۔ امتحان کے شروع ہونے سے قبل ڈیرہ اسماعیل خان میں اپنے رفیق قدیم مولانا نور سید شاہ صاحب کی والدہ کی عیادت کیلئے روانہ ہوگئے۔

جب حضرت ڈی آئی خان سے واپس آئے تو مدرسہ میں تبلیغی جماعت آئی ہوئی تھی، ان دنوں امتحانات کے بعد چھٹیاں تھیں، حضرت کی اجازت سے بندہ سہ روزہ پر چلا گیا، جب روانگی ہونے لگی تو والد صاحب نے مجھے فرمایا کہ اگر سہ روزہ مرکز میں گزارلیں تو اچھا ہوگا۔ بندہ مرکز پہنچا، تو حضرت مولانا محمد رفیق صاحبؒ منتظر تھے۔ فرمانے لگے کہ استاذ صاحب نے فون کرکے بتایا کہ اگر یوسف کا سہ روزہ مرکز میں ہوجائے تو بہتر ہوگا۔ اس وقت مجھے کوئی اندازہ نہیں ہوا کہ اس میں کیا حکمت ہے۔ اس سہ روزہ میں بندہ نے خواب دیکھا کہ جامعہ یوسفیہ سے بادل اُٹھ رہے ہیں، وہاں سیدنا ابوبکر صدیقؓ کھڑے ہیں اور فرمارہے ہیں کہ ہنگو سے علوم نبوت اُٹھ رہے ہیں۔ دوسرے دن دوپہر کے وقت میں وضو کررہا تھا کہ ایک ساتھی آکر کہنے لگا کہ آپ کی نصرت کے لیے استاذ صاحب آئے ہیں۔ میں حاضر ہوا تو حضرت نے مزاحاً فرمایا کہ میرے خیال میں آپ بازار گئے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ جی نہیں وضو بنانے کیلئے گیا تھا۔ استاذ صاحب سے مرکز کے بڑوں نے درخواست کی کہ کچھ فرمائیں۔ استاذ صاحب نے فرمایا:

ایک زمانے میں اہل دین پر سخت امتحان آیا وہ تحفظ ایمان کی خاطر پہاڑوں اور جنگلوں کا رُخ کر کے ایک غار میں روپوش ہوگئے، ان خوش قسمت لوگوں کو اصحاب کہف کہا جاتا ہے۔ اگر اس زمانے میں کوئی اپنے ایمان کو محفوظ بنانا چاہتا ہے، تو اسے چاہیے کہ وہ مساجد، مدارس یا ان دینی مراکز کی طرف رجوع فرمائے، یہ ہمارے لئے اس غار کی مانند ہیں۔

حضرت زندگی کے آخری سالوں میں تبلیغی جماعت والوں کے ساتھ خود بھی سہ روزہ وغیرہ لگاتے تھے، فرماتے تھے کہ تبلیغی کام بڑا ہی بابرکت ہے، لیکن اس کو بزرگوں کے قدیم اصولوں پر شدت سے قائم رکھنے کی ضرورت ہے، ایک تو فجر کے بعد جس طرح مشورہ ہوتا ہے، اسی طرح یومیہ بعد از عشاء محاسبہ بھی ہو، کیونکہ جس تحریک میں احتساب نہ ہو اس کا کامیابی سے چلنا مشکل ہوتا ہے۔ دوسرا اس میں شرکت کرنے والوں کو یہ شعور دیا جائے کہ وہ اپنی اصلاح کی نیت سے شرکت کریں کیونکہ اب جسے دیکھیں وہ دوسروں کی اصلاح کے لیے فکرمند رہتا ہے، ایسے میں اپنی اصلاح کا کام بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔

جب بندہ سہ روزہ سے واپس آیا تو والد صاحب کو اپنا خواب کو سنایا، والد صاحب خاموش ہوگئے، تھوڑی دیر بعد فرمایا کہ میں نے بھی ایک عجیب خواب دیکھا ہے، مگر کسی کے سامنے ذکر نہیں کرتا کہ میں ایک طویل سفر پر جا رہا ہوں، میرے ساتھ دو بندے اور بھی ہیں، ایک کو تو میں جانتا ہوں کہ وہ ہمارے خاندان کے ہیں اور دوسرے کو نہیں جانتا کہ وہ کون ہیں؟

پھر حضرت نے فرمایا کہ چند دن قبل طالبان کی طرف سے کچھ دھمکی آمیز پیغام ملا ہے، مجھے خطرہ اور پریشانی تھی، کہ کہیں آپ کی تشکیل کسی نامناسب اور خطرناک علاقہ میں نہ ہو جائے، اسی وجہ سے آپ کا سہ روزہ مرکز میں لگوایا۔ پھر فرمایا کہ پرسوں میں مدرسہ میں لیٹ گیا، آدھی رات کو کچھ مشکوک آوازیں شروع ہوئیں، میں اُٹھا تو ایک خوفناک آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ بھاگتے قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ ان باتوں کی وجہ سے بندہ پریشان ہو گیا تو والد صاحب نے فرمایا کہ بیٹا! اس میں حیرانگی اور پریشانی کی کوئی بات نہیں، ہم مسلمان ہیں، مسلمان پر امتحان آنا لازمی چیز ہے، اس پر تاریخ اسلام شاہد ہے، جو بھی دین کا کام کرتے ہیں ان کے خلاف ہر دور میں قسم قسم کے حربے استعمال ہوتے ہیں، کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں دین کا کام چھوڑ دوں، حوصلہ رکھو، اب لوگوں کی نظریں آپ پر ہیں، اس واقعہ کو اپنے تک محدود رکھو، اگر اس میں کسی قسم کی خیانت کا ارتکاب کیا تو روز محشر پوچھوں گا۔ کھانے کے بعد مجھے بلا کر مدرسہ میں اپنے بیت الخلاء لے گئے، وہ سارا نقشہ دکھایا کہ اُس رات ان لوگوں کا یہاں بم رکھنے کا ارادہ تھا، اس دوران یہ پتھر اوپر سے نیچے بیت الخلاء کے اندر گرا جس سے آواز پیدا ہوئی اور بیت الخلاء میں پانی کا یہ برتن بھی

ٹوٹ گیا، اس وجہ سے وہ خبیث فرار ہو گئے۔

پھر فرمایا کہ اس سے قبل بھی میرے قتل کے کئی منصوبے بنے لیکن اللہ تعالیٰ نے ناکام فرمائے۔ پھر اُن کا بھی مختصر اذکر فرمایا کہ قتل کے ارادے سے آنے والے بے شرم لوگ دنیاوی نقصانات اٹھاتے تو معافی کیلئے بھی آجاتے۔ ایک دفعہ ایک معافی مانگنے آیا تھا، میں نے پوچھا کہ آپ نے اتنی رقم لے کر مجھے پھر زندہ کیوں چھوڑا تو کہنے لگا کہ آپ کے اردگرد کتابوں سے حیا آئی۔

ایک بار ایک بندہ آیا کہ آپ سے کچھ لوگ ملنا چاہتے ہیں اور آپ سے ایک راز کی بات عرض کرنا چاہتے ہیں، مگر وہ پہلے اپنے لیے امن چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ لے آئیں، میری طرف سے امن ہے، جب آگئے تو تین بندے تھے، ان میں دو معروف بھی تھے، بیٹھتے ہی رونے لگے کہ ہم سے غلطی ہوئی ہے ہمیں معاف کردیں۔ میں نے کچھ تسلی دی تو ان کو اطمینان ہوا، اس کے بعد پوری تفصیل سنائی کہ فلاں صاحب کی وساطت سے ہمارے ساتھ آپ کو قتل کرنے کے لیے چالیس لاکھ روپے پر بات ہوئی، پھر ہم نے کئی بار مختلف جگہوں پر کوشش کی مگر ناکامی ہوئی، ساتھیوں نے مشورہ کیا کہ پیسے واپس کرتے ہیں یہ کام ناممکن ہیں۔ جب ہم اس شخص کے پاس واپس آکر معذرت کرنے لگے تو اس نے کہا کہ میں تمہاری ان لوگوں سے ملاقات کروادوں گا، جنہوں نے مجھے یہ رقم دی ہے، پھر ہم رات کے لئے ان لوگوں کے پاس گئے، رات ان کے ساتھ گزاری اور چالیس کی بجائے پچپن لاکھ پہ بات طے ہوئی۔ اس کے بعد ہم نے آپ کے گھر کے قریب رات کے وقت فلاں درخت کے پاس عارضی مورچہ بنا کر پوزیشن لی، جب آپ مسجد کے دروازے سے باہر نکلے تو آپ کے جسم سے عجیب قسم کے شعلے نکلنا شروع ہو کر ہمارے اُوپر گرنے لگے، ہم نے خوف کے مارے دوڑ لگادی، تقریباً تین کلومیٹر تک وہ شعلے ہمارے پیچھے لگے رہے۔ حضرت نے فرمایا کہ انہوں نے اپنے بدنوں پر جھلسنے کے وہ نشانات بھی مجھے دکھائے اور کہا کہ اس واقعہ کے بعد تقریباً تین ہفتے ہو گئے ہیں کہ ہم لوگوں کو آرام نہیں آرہا ہے، خدارا! ہمیں معاف فرمائیں۔

میں نے حضرت سے پوچھا کہ یہ شعلے نما کیا چیز تھی؟ فرمایا کہ یہ حزب البحر وظیفہ کا اثر تھا۔ آخر میں فرمایا کہ موت کا وقت اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے، اس میں کسی قسم کی تبدیلی ناممکن ہیں، جب وہ چاہے گا تو موت آکر رہے گی۔ اموات میں سے بہترین موت شہادت کی موت ہے، کئی دفعہ دل میں آیا ہے کہ افغانستان کے جہاد میں شریک ہو کر یا کسی دوسرے محاذ پر جا کر جام شہادت نوش کروں۔ یہ بھی یاد رکھو کہ میں روزانہ شہادت کیلئے دو رکعات صلوۃ حاجت پڑھتا ہوں، وہ دعا اب یاد نہیں مگر ان جیسے الفاظ تھے کہ "اللھم ارزقنا شھادۃ فی سبیلک" فرمایا: یہ دعا بھی کبھار روزانہ ۳۱۳ مرتبہ پڑھتا ہوں، شہادت کی موت سعادت کی موت ہے اس پر فخر کرنا چاہیے اور شہادت کی موت

میری قلبی تمنا ہے، حضرت بنوریؒ بھی شہادت کی موت کے بارے میں فرماتے کہ یہ انسان کیلئے اس لئے بھی اچھی ہے کہ کم از کم اس کے جسم پر کسی کی نظر تو نہیں لگے گی، کیونکہ شہید کو غسل نہیں دیا جاتا۔

فرماتے کہ اب تک میرے جسم پر کسی کی نظر نہیں لگی، یا اللہ! موت کے بعد میرے جسم کی حفاظت فرمانا۔ بندہ کو کیا معلوم تھا کہ والد صاحب کی یہ تمام تر خواہشات رؤف وکریم رب چند دن بعد بطریق احسن پوری فرمائے گا۔

انہی ایام میں بندہ نے ایک اور خواب دیکھا کہ اچانک بارش شروع ہونے سے مکتبہ کی پچھلی دیوار گرگئی، یہ دیکھ کر میں بہت پریشان ہوا، اسی پریشانی کے عالم میں نیند سے بیدار گیا، میں حضرت کو یہ خواب سنا رہا تھا کہ ہمارے ایک پڑوسی آگئے اور حضرت سے کہنے لگے کہ کل ایک حاجی صاحب نے خواب سنایا کہ ایک بہت بڑا سمندر ہے، اس کے اوپر ایک خوبصورت تخت پر استاذ صاحب آرام فرما ہیں اور آپ کے جسم سے ستاروں کی طرح چمک دار روشنی کے قمقمے اٹھ رہے ہیں۔ حضرت ان دنوں کتب خانہ کے بارے میں نہایت متفکر تھے، اور اسے منتقل کرنے کے لیے مشاورت بھی کی لیکن شرح صدر نہ ہوا۔

ان دنوں حضرت نے اپنے رشتہ داروں سے ملاقاتوں کا سلسلہ بھی شروع فرمایا، ایک دن صبح ناشتہ پر بندہ سے فرمانے لگے کہ آج کل چھوٹی بہن بہت یاد آتی ہیں، اگر ان کو پیغام بھجوا کر بلالو تو بہتر ہوگا۔ میں نے ان کے پاس گاڑی بھجوادی کہ حضرت آپ کی ملاقات کے متمنی ہے، پیغام ملتے ہی وہ آگئیں، استاذ صاحب نے ان کو بعض ضروری باتوں کے متعلق وصیت فرمائی جو ان کے مضمون میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے، آخر میں ان کو بھی یہ فرماگئے کہ شاید میں چند دن کا مہمان ہوں، رخصت کرتے وقت اُن کے ہاتھ کو پکڑ کر فرمانے لگے کہ دنیا کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں شاید یہ میری اور آپ کی آخری ملاقات ہو، بس اپنی زندگی شریعت کے موافق گزاریں اور اپنے مابین صلہ رحمی سے کام لیں، اُمور دینیہ میں عجلت سے کام لیں، تساہل اور تسامح سے بچنے کی کوشش کریں اور امور دنیاوی میں تحمل، برداشت، عفو اور درگزر کو اختیار کریں۔

شہادت سے چند دن قبل ایک مخلص دوست نے فون کرکے بتایا کہ ایک پولیس افسر آپ لوگوں کے پیچھے پڑا ہوا ہے، خصوصاً استاذ صاحبؒ کے بارے میں منفی رپورٹیں پیش کررہا ہے اور کسی سے سنا ہے کہ مخالفین سے بہت بھاری رقم بھی لی ہے، بار بار مدرسہ کے اکاونٹ وغیرہ بھی چیک کررہا ہے، میں نے اس وقت یہ جواب دیا کہ بھائی ہم غریب لوگ ہیں، ہمارے اکاونٹ میں معلوم نہیں کہ کچھ ہے بھی یا نہیں، اگر کوئی چیک کرنا چاہتا ہے تو سو بار چیک کرے، باقی ہم کسی علاقہ غیر میں نہیں، ہمارے مدرسہ کا دروازہ چوبیس گھنٹے کھلا رہتا ہے، سینکڑوں لوگ آتے جاتے ہیں، ہماری زندگی کا کوئی گوشہ کسی سے مخفی نہیں، ہم عام لوگ ہیں اور چوبیس گھنٹے عوام میں رہتے ہیں، کسی کو شک ہو تو

ایک بار نہیں سو بار آئے، مدرسہ کی تلاشی لے، ہماری تلاشی لے اور اپنا شک دور کرے۔

نماز فجر کے بعد میں نے والد صاحبؒ کو پوری کہانی سنائی، والد صاحبؒ نے فرمایا کہ الحمد للہ اب تک مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی اپنے ملک کے قانون وآئین کی خلاف ورزی کی ہو، ہماری تاریخ مظلومیت سے بھری ہے، ان شاء اللہ میرا نام بھی ان مظلومین میں شمار ہوگا، آپ لوگ ظلم سے بچنے کی کوشش کریں، اگر مظلومیت کا سامنا ہوا تو بخوشی قبول کر کے اللہ رب العزت کا شکریہ ادا کرنا۔

دوسری بات یہ ہے کہ مذکورہ پولیس افسر کی میرے ساتھ مخالفت کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ میں ان اللہ کے بندوں کو سیدھا راستہ دکھاتا ہوں، الحمد للہ میں نے ہمیشہ حکومت کے ساتھ امور خیر میں معاونت کی ہے اور کڑے حالات سے نمٹنے کے آسان طریقے بتائے ہیں، سوائے اس کے آپ کو سینکڑوں افسران ملیں گے، جو اس چیز کا اعتراف کریں گے کہ مولانا نے ہمارے ساتھ فلاں فلاں معاملات میں معاونت کی تھی اور فلاں سخت مسئلہ میں خیر خواہی کا معاملہ فرمایا تھا۔ جس وقت اردگرد بدامنی کے واقعات شروع ہوئے تو میں نے ابتدا میں اس کو بتایا کہ تم ابھی سے داخلی راستوں پر چیک پوسٹیں قائم کرو، مقامی لوگ آپ کے ساتھ ہر قسم کے تعاون کیلئے تیار ہیں، علاقائی لوگ بھی ان شرپسندوں کو پسند نہیں کرتے، اگر یہ بروقت میری بات پر عمل پیرا ہوتا تو ہمارا علاقہ شرپسندوں سے بچ سکتا تھا۔ اس ملک دشمن کی طرف سے ہمارے ساتھ معاونت تو دور کی بات تھی، اس نے الٹا ان لوگوں کو ستانا شروع کر دیا جو قیام امن کے لیے سرگرم تھے اور شرپسندوں کے خلاف تھے، ان کی گرفتاری کیلئے خود کوہاٹ سے ہر روز آتا، ان کے گھروں پر چھاپے مارتا اور ان کو بے جا تنگ کرتا، حالانکہ یہ وہ لوگ تھے جو پوری پوری رات علاقہ کے تحفظ کیلئے بغیر کسی معاوضہ کے پہرہ دیتے تھے۔ یہ امن لشکر اس وقت معرض وجود میں آیا تھا جس وقت شرپسندوں کے خلاف بولنا یا ان کے خلاف حکمت عملی بنانا کوئی آسان کام نہیں تھا اور نہ کسی میں ان کی مخالفت کی جرأت تھی۔

اس امن لشکر کی روئیداد بھی پیش کرتا چلوں کہ یہ کیسے وجود میں آیا، جب شاہو خیل کے پہاڑوں سے مین بازار خاص کر سرکاری عمارات پر بھاری ہتھیاروں سے حملہ ہوا تو حضرت نے اہل علاقہ کو جمع کر کے طویل گفت وشنید کے بعد یہ بات طے کیا کہ اول مقامی انتظامیہ سے بات کرتے ہیں کہ ہنگو کی طرف آنے والے تمام راستوں پر آرمی یا کم از کم ایف سی تعینات کی جائے۔ جب جرگہ کی ڈی آئی جی سے ملاقات ہوئی تو اس نے جواب دیا کہ ہمارے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں۔ اس پر دوبارہ اہل علاقہ کو طلب کیا گیا تو یہ بات طے ہوئی کہ ہم پر اپنے علاقہ کا تحفظ لازمی ہے، اس کیلئے اجتماعی طور پر ایک کمیٹی تشکیل دی گئی اور شاہو خیل سے ذیچ بازار تک علاقہ میں پوری رات پہرہ دینے اور ان لوگوں کے خلاف حکومت سے مکمل تعاون کرنے کا فیصلہ ہوا۔

انہی دنوں ہنگو کے جامع مسجد الشراوی میں تمام اہل علاقہ کا ایک اہم اجلاس طلب کیا گیا، جس میں تمام مکاتب فکر کے بڑے علما وزعما شریک تھے۔ اس دن بھی والد صاحب نے پوری وضاحت کے ساتھ فرمایا کہ شر پسند اولاً بظاہر اپنے آپ کو بہت ہمدرد ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جب یہ مضبوط ہوں گے تو پھر وہ کام کریں گے کہ ان کا فائدہ سراسر دشمن کو ملے گا۔

انہی دنوں مجھ سے فرمایا کہ مدرسہ کے اکابر اساتذہ کو جمع کرو، میں نے حضرت مولانا فیض الرحمن صاحب کو بتایا اور مولانا ظفر احمد صاحب کو فون کیا، استاذ صاحب تشریف لائے، کمرہ میں مولانا فیض الرحمن صاحب اور بندہ ناچیز بیٹھے تھے، حضرت نے مولانا ظفر احمد صاحب کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں ہیں؟ بندہ نے عرض کیا کہ آرہے ہیں، پھر مفتی عظمت اللہ صاحب کے بارے میں پوچھا، بندہ نے خاموشی اختیار کی، حضرت نے پھر پوچھا کہ مفتی صاحب کہاں ہے؟ بدقسمتی سے اس دن وہ موجود نہ تھے۔

مذکورہ اجلاس میں فرمایا کہ کھانے پینے کیلئے پریشان ہونا میرے خیال میں حیوانیت سے بھی بدتر ہے۔ کھانا، پینا تو ہر روز جانوروں کو بھی ملتا ہے، نہ ان کی کوئی مارکیٹ ہے اور نہ مستقبل کیلئے کوئی آمدنی، اس کے باوجود وہ اپنے کاموں میں مصروف نظر آتے ہیں، ہماری مثال تو انسانوں کی شکل میں پرندوں جیسی ہے کہ صبح سویرے اٹھ کر اپنے گھونسلوں سے چلے جاتے ہیں اور اپنے کام میں مصروف ہوتے ہیں، ہم بھی ان کی طرح اپنے مقصد اصلی جو کہ عبدیت ہے اس کیلئے متفکر ہوتے ہیں کہ ہم اس فریضہ کو کس ادا کریں گے، اگر مالداری اور مال ودولت جمع کرنا میرا نظریہ ہوتا تو خدا کی قسم آپ لوگ میرے اسفار کو شمار نہ کر پاتے۔ دین کی اشاعت کیلئے سفر ایک مباح اور احسن چیز ہے، میں اس سے بھی بچنے کی کوشش کرتا ہوں کہ اس کام کیلئے دنیا میں مجھ سے بہت زیادہ اچھے لوگ موجود ہیں۔ فرمایا کہ بعض احباب نے ان باتوں کی بھی کوشش کی کہ اگر مدرسہ کیلئے پشاور وغیرہ میں ایک مارکیٹ یا پلازہ کا انتظام ہو جائے تو بہت بہتر ہوگا، تا کہ مدرسہ کیلئے مستقل آمدنی ہو، اس سے کم از کم مدرسہ کی مالی پریشانی ختم ہو جائیگی۔ میں نے ان حضرات سے عرض کیا کہ الحمدللہ مجھے کل کیلئے جس چیز کی فکر و پریشانی ہے وہ اس بات کی ہے کہ میرا آنے والا کل آج سے بہتر ہے یا نہیں؟ اور یہ جو کچھ کر رہا ہوں یہ عند اللہ مقبول ہوگا یا نہیں؟

ان دنوں اہل علم میں اسلامی بنکاری کا مسئلہ زیر بحث تھا، ہر جگہ اس مسئلے پر بحث مباحثے جاری تھے، اس پر حضرت نے فرمایا کہ یہاں کے مسلمانوں پر کیا گزر رہی ہے، ہمارے علما کو نہ جانے اس وقت اس مسئلہ میں کس نے مبتلا کیا؟ جی چاہتا ہے کہ یہاں شر پسندوں کی طرف سے اسلام کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے ان کے متعلق علما سے متفقہ فیصلہ لوں تا کہ مسلمانوں کو پتہ چلے کہ چودھویں صدی کے خوارج یہی ہیں۔

بندہ نے اس بات کا ذکر حاجی عزت گل صاحب سے کیا تو انہوں نے کہا کہ چند دن پہلے مجھے اس سے بھی زیادہ سخت انداز میں یہ بات فرما چکے ہیں بلکہ ان کے ایک اہم ذمہ دار سے بھی یہ بات کر چکے ہیں کہ آپ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں نہ یہ عقلاً جائز ہے نہ نقلاً اور نہ عرفاً اس کا کوئی جواز ہے۔ اگر آپ لوگ اطمینان چاہتے ہیں تو میں آپ لوگوں کو مطمئن بھی کر سکتا ہوں۔

ایک دن میں نے عرض کیا کہ حضرت! بہت سارے علما موجود ہیں اگر آپ حضرات خاموشی اختیار فرمائیں تو مناسب ہوگا کیونکہ ہمارا علاقہ بھی حساس ہے اور لوگ بھی فتنہ باز ہیں، یہ بعض لوگ صرف منافقت کیلئے آپ کے پاس آتے ہیں تاکہ جاسوسی کر سکیں اور اوپر کے لوگوں پر بھی کوئی اعتماد نہیں ہے تو حضرت نے فرمایا کہ بیٹا! میں نہ ڈرنے والا ہوں اور نہ دین میں مداہنت کو برداشت کر سکتا ہوں، ایک دن احکم الحاکمین کے دربار میں حاضری دینی ہے اگر وہ ذات مجھ سے پوچھے کہ سورۃ العصر میں کیا پڑھا تھا؟ تو کیا جواب دوں گا۔ اس میں تو ایک مسلمان سے نہیں بلکہ ایک انسان سے جن چیزوں کا مطالبہ ہے وہ ایمان، اعمال صالحہ، حق بات کی وصیت، اور صبر کی وصیت ہے، اگر میں ایمان کی حفاظت کی بجائے اپنے جان کی فکر کروں تو اس سے مجھے کیا فائدہ ملے گا؟ موت سے بچ جاوں گا، موت کیلئے وقت، دن اور تاریخ سب کچھ متعین ہے پھر کس بات کی پریشانی ہے۔ خدا کی قسم! جان تو ہر کسی کو عزیز ہے مگر کیا کروں؟ بعد میں تاریخ معاف نہیں کرے گی، میں یہ سب کچھ اس لئے کرتا ہوں کہ ہمارے بعد لوگ ارتداد سے بچ جائیں۔ آپ دیکھیں گے کہ اس 'اسلامی نظام' کے بارے لوگ کیا کیا کہیں گے، صرف معمولی باتوں پر لوگ دائرۂ اسلام سے خارج کیے جائیں گے۔

فرمایا: آج سے پچیس سال قبل ایک کتاب میں یہ بات نظر سے گزری تھی کہ غیروں کیلئے پاکستان، مدارس اور آزاد قبائل ناقابل برداشت ہیں، ان کے بارے میں منصوبہ بندی جاری ہے، میرے خیال میں اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آگیا ہے اور دشمن اسے حتمی شکل دے رہا ہے۔

آخری جمعہ کو نماز کے بعد ہنگو کے خوانین کے ہاں کھانے کی دعوت تھی، اس میں مولانا عبدالستار صاحب کو بھی شریک فرمایا، کھانے کے دوران خوانین سے خاندانی تعلق کے پس منظر پر تفصیلی روشنی ڈالی اور خوانین حضرات کو اپنے اکابر کی تاریخ بتائی کہ آپ کے آباء واجداد نے اس علاقہ میں بہت سے کارنامے سرانجام دیئے ہیں، خصوصاً حضرت مولانا غلام محمد بخشش صاحبؒ جو ہنگو خوانین میں ممتاز شان کے حامل بزرگ گزرے ہیں کہ حالات سنائے کہ انہوں نے اپنے وقت میں مذہب اور مسلک کا کس طرح دفاع کیا اور کس جرأت و بہادری سے توحید وسنت کا پرچار کیا۔ فرمایا: ہمارے پشتونوں کی بدقسمتی ہے کہ ہم میں بڑے بڑے لوگ گزرے ہیں مگر کسی نے بھی ان کی

تاریخ محفوظ کرنے کی زحمت نہیں کی، ورنہ عالم میں ہمارے اکابر کی عظیم داستان ہوتی۔

اس جمعہ کے بعد حضرت کی مکمل توجہ عبادت کی طرف ہوگئی تھی، انتہائی یکسو ہوگئے تھے، مدرسہ صرف پڑھائی کیلئے تشریف لاتے، پڑھائی سے جیسے ہی فارغ ہوتے، گھر تشریف لے جاتے اور مطالعہ میں مشغول ہوتے۔ اتوار کے دن حضرت کی ایک رشتہ دار بزرگ خاتون تشریف لائیں، ان سے مختصر ملاقات کی، ان سے بھی معافی طلب کر کے فرمایا کہ زندگی پر کوئی بھروسہ نہیں شاید یہ میری آخری ملاقات ہو۔

ان دنوں میں کھانا تقریباً چھوٹ گیا تھا، یعنی نہ ہونے کے برابر تھا، اگر ہم زیادہ اصرار کرتے تو صرف معمولی دودھ نوش فرماتے، یا ایک دو کیلے استعمال کرتے۔ ایک دن میں نے کھیر تیار کروا کے پیش کی تو فرمایا کہ بیٹا! زیادہ تکلفات کی ضرورت نہیں، کسی چیز کی طرف اشتہا نہیں ہوتا۔

اسی رات مدرسہ کی پائپ لائن میں کچھ خرابی پیدا ہوگئی تھی، مجھے ٹھیک کرانے کا حکم دیا، میں نے مستری کو لا کر وہ کام نمٹایا، بازار میں ایک دوست دکاندار سے اس کام کے لیے کچھ اوزار اٹھالایا تھا، وہ تا حال ایسے ہی بکھرے پڑے تھے، میں آیا تو حضرت انہیں سمیٹ رہے تھے۔ آپ نے تنبیہ کے انداز میں فرمایا کہ یوسف! اسلام صرف اپنی چیزوں کی حفاظت کا حکم نہیں دیتا بلکہ دوسرے کی چیز کے بارے میں مزید اہتمام سے سنبھالنے کی تاکید کرتا ہے۔

شہادت سے ایک دن قبل صبح کے وقت مجھے فرمایا کہ اب ہمت نہیں ہورہی ہے، اسباق ظہر کے بعد پڑھاوں گا، نماز ظہر کے بعد ٹل سے تعلق رکھنے والے حضرت کے پرانے ساتھی حافظ حاجی عزت خان صاحب تشریف لائے، ان سے فرمایا کہ معلوم ہوا ہے کہ میرے خلاف مہم چلانے والے پولیس افسر کے ساتھ آپ کے اچھے مراسم ہیں، میری طرف سے ان کو بتائیں کہ تم جو کچھ کر رہے ہو، مجھے ایک ایک چیز کا علم ہے، اور ان کی ساری شرارتوں اور خباثتوں سے خوب واقف ہوں، اس کی یہ کوشش ہے کہ مجھے بدنام کرے، اور مجھ پر بے بنیاد الزامات لگائے، جتنا کر سکتا ہے کرلے لیکن ایک دن انصاف کا آنے والا ہے، ان شاء اللہ اس دن یہ ملزم نہیں بلکہ ایک مجرم کی حیثیت سے کھڑا ہوگا اور اہل وطن میری بے گناہی کی گواہی دیں گے۔ حاجی صاحب آپ کو علم ہے کہ میرے ضمیر میں خلوص کے علاوہ کچھ نہیں، لیکن میں ڈرنے والا انسان نہیں ہوں، باقی ان کے پاس طاقت ہے، سب کچھ کر سکتا ہے، مگر محمد امین کو مرعوب نہیں کر سکتا۔

اس دن اسلام آباد سے حضرت کے ایک پرانے دوست حاجی امین گل صاحب آئے تھے۔ والد صاحب نے فرمایا کہ دلی خواہش ہے کہ آپ اپنے کام نمٹا کر رات کے لئے میرے ہاں آجائیں۔ حاجی صاحب نے فرمایا کہ آج کچھ مصروفیات ہیں، ان شاء اللہ پھر کسی موقع پر آؤں گا۔ والد صاحب نے فرمایا کہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں کہ کل کون زندہ رہے گا۔

مہمانوں کو رخصت کر کے حضرت نے فرمایا کہ طلبہ کو بلاؤ، میں نے مشکاۃ کے طلبہ کو اوپر مکتبہ کے سامنے استاذ صاحبؒ کی نشست کے پاس بھیج دیا، روزانہ ایک ورق پڑھنے کا معمول تھا، مگر اس دن صرف ایک حدیث سید الاستغفار کی پڑھی اور استغفار کے متعلق خلاف معمول ایک جامع تقریر فرمائی۔ ارشاد فرمایا کہ آج کے زمانے میں ہمارے استغفار پر بھی ایک ہزار مرتبہ استغفار ہونا چاہیے۔ آج ہم استغفار تو کرتے ہیں مگر صرف زبانی، جب ہمارا استغفار ہمارے دل تک نہیں پہنچتا اور ہمارے ارادوں میں ذرا برابر تبدیلی نہیں لاسکتا تو وہ استغفار رب العالمین کو ہماری طرف کیسے متوجہ کرے گا۔ پھر فرمایا کہ اس سے آگے ان شاء اللہ کوئی اور پڑھائے گا۔ یہ آپ کا آخری درس مشکاۃ تھا۔

اس دن حاجی یار بادشاہ صاحب نامی ایک شخص کا انتقال ہو گیا تھا، میں نے نماز جنازہ کا عرض کیا کہ بعد از عصر ہے۔ اس دوران ہمارے تایا جان حاجی عین الدین صاحب بھی آ گئے، انہوں نے مشورتاً فرمایا کہ کل تعزیت کے لئے چلیں جائیں، حالات بھی ٹھیک نہیں اور وقت بھی مناسب نہیں ہے تو حضرتؒ نے فرمایا کہ نہیں نمازِ جنازہ میں شرکت سنت ہے اور تعزیت سے بہتر ہے۔ بھائی جان! آج کل کے حالات میں زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں کہ کل کیا ہوگا اور کون زندہ رہے گا۔

اس دن گاڑی میں دیگر بزرگ موجود ہونے کے باوجود خلاف معمول حضرت میرے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھے کہ آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ فرمایا کہ اپنے مدرسہ کی طرف پوری طرح متوجہ ہو جاؤ، یہ علوم نبوی علی صاحبها الصلوۃ والسلام کا گلشن ہے اور علوم بنوریؒ کی ایک شاخ ہے، اس کو تروتازہ رکھو۔ خبردار! خبردار! خبردار! علاقے کے موجودہ فتنہ سے اپنے آپ کو بچانا، ان لوگوں کی فکر ونظر بہت سطحی ہے، اس میں دین کے بجائے دنیاوی مفادات ہیں۔ اس کے بعد گھر کے متعلق کچھ ضروری باتیں ارشاد فرمائیں۔ جنازہ سے واپسی پر فرمایا کہ گھر کیلئے سودا سلف بھی ساتھ لے جائیں گے۔ میں نے عرض کیا کہ کل لے جائیں گے، اب دیر ہو رہی ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ نہیں ابھی لے کر جانا ہے۔ کل نہ جانے کون زندہ رہے گا۔

راستے میں مولانا عبدالجلیل صاحب پیدل جا رہے تھے، ان کو اپنے ساتھ بیٹھا دیا اور قیام امن کے سلسلے میں چند اہم امور پر تبادلہ خیال ہوا، ان میں سے ایک بات ساری روڈ کے تحفظ کے حوالے سے تھی جبکہ دوسری اہم بات بازار کی حوالے سے تھی، بازار کے بارے میں استاذ صاحب نے فرمایا کہ اگر ہم اپنی مارکیٹیں اور دکانیں ٹل روڈ پر آباد کریں تو اس سے ہماری قوم کی پریشانی ختم ہو جائے گی۔

ہم نے حضرت کے دیرینہ دوست حاجی وزیر خان کی دکان سے سودا سلف لیا بوقت رخصت حاجی صاحب نے

فرمایا کہ استاذ جی! ہمارے لئے دعا کیا کریں۔ حضرت نے فرمایا کہ حاجی صاحب آج تک تو میں بشمول آپ کے تمام مسلمانوں کیلئے دعا کیا کرتا تھا، مگر کل سے آپ لوگ مجھے اپنے دعاؤں میں یاد رکھا کریں۔

راستہ میں حضرت نے فرمایا کہ ڈی۔ پی۔ او محمد سجاد صاحب کو فون کرو، اگر موجود ہوں، تو ملاقات کریں گے، جب میں نے فون کیا تو اس نے کہا کہ ابھی میں موجود نہیں ہوں، اگر کوئی حکم ہو تو بتادیں۔ حضرت نے ایک سپاہی کے بارے میں بتایا کہ وہ میرے پاس آیا تھا، ان کا فلاں کام اٹکا ہوا ہے، اپنی غربت اور مالی پریشانی کا ذکر بھی کر رہا تھا، لہٰذا اگر ان کے کام میں کوئی قانونی پیچیدگی نہ ہو تو بہتر ہوگا کہ کردیں۔ سجاد صاحب نے کہا کہ ٹھیک ہے، میں چیک کر کے آپ کو بتادیتا ہوں۔

اس دوران بھائی ظہیر کا فون آیا کہ کچھ مہمان آئے ہیں۔ میں نے حضرت کو بتایا، تو فرمانے لگے کہ عجیب لوگ ہیں آخری وقت میں بھی یکسو ہونے نہیں دیتے، پھر فرمایا کہ کل سے عزم کر چکا ہوں کہ ان شاء اللہ روزے رکھوں گا۔ میں نے کہا کہ حضرت جون کا مہینہ ہے، آج کل گرمی زیادہ ہے اور دن بھی لمبے ہیں اور آپ کو گردوں کی شکایت بھی ہے، اگر ان باتوں کا خیال رکھا جائے تو بہتر ہوگا۔ حضرت فرمانے لگے کہ بیٹا! اللہ سے ۶۳ سالہ زندگی مانگی تھی وہ مل چکی، اب محبوب سے عمر بڑھ جانا عشق کا تقاضہ نہیں، لہٰذا کافی غور وفکر کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ جب تک زندہ رہوں گا تو مسلسل روزے رکھوں گا۔

جب ہم مدرسہ پہنچے تو حضرت مہمانوں سے مل کر خلاف معمول بالکل خاموش بیٹھ گئے، ایسے لگ رہا تھا جیسے حضرت کسی اہم سوچ میں مستغرق ہوں، اس دوران مغرب کی آذان شروع ہوئی۔ فرض پڑھ کر حضرت گھر تشریف لے گئے اور مجھے مہمانوں کے کھانے کا انتظام کرنے کو فرمایا۔ میں ضروری انتظام کر کے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا کہ اگر طبیعت ٹھیک نہ ہو تو ڈاکٹر کا انتظام کرتا ہوں۔ حضرت نے فرمایا کہ طبیعت ٹھیک ہے مگر سارے اوراد و وظائف رہ گئے ہیں، اس وجہ سے طبیعت میں انقباض ہے۔ عام دنوں میں حضرت نماز عصر کے بعد دلائل الخیرات، الحزب الاعظم اور دیگر وظائف کا اہتمام فرماتے تھے مگر اس دن جنازے میں شرکت کی وجہ سے یہ چیزیں رہ گئی تھیں، میں نے تربوز توڑ کر حضرت کی خدمت میں پیش کیا، حضرت نے تھوڑا سا تناول فرمایا، اس دوران حضرت کی بڑی ہمشیرہ تشریف لے آئیں، حضرت ان کی اپنی والدہ کی طرح عزت کرتے، خود ان کے لئے جگہ بناتے اور تکیہ وغیرہ اپنے دست اقدس سے رکھتے، اس وقت حضرت وظیفہ میں اس حد تک منہمک تھے کہ ان کے سلام کا جواب دے کر صرف تربوز کی طرف اشارہ فرمایا کہ یہ کھالیجئے۔ میں نے دوائی پیش کی تو حضرت نے فرمایا کہ یوسف! میرے خیال میں اب ان کے استعمال کی ضرورت نہیں۔ فرمایا: مہمانوں کے لئے پھل وغیرہ لے جاؤ اور میری طرف سے بہت

معذرت کرلیں کہ کھانے میں شریک نہ ہوسکا۔

میں مہمانوں سے فارغ ہوکر دوبارہ حضرت کے پاس حاضر ہوا، اس وقت عشا کی اذان شروع ہو چکی تھی۔ حضرت نے اپنی ہمشیرہ سے فرمایا کہ بہن! اگر اجازت ہو تو میں نماز پڑھنے جانا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا کہ میں صرف آپ کی زیارت کے لئے حاضر ہوئی تھی وہ ہو چکی، اب میں جانا چاہتی ہوں۔ حضرت نے فرمایا کہ بہن! ہاتھ ملاؤ، زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، پھر ہاتھ ملانے کا موقع ملے گا یا نہیں، پھر میری والدہ سے کہا کہ آپ انہیں ہاتھ سے پکڑ کر اپنے گھر کے دروازے تک پہنچا دیں۔ اس دوران دوبارہ حضرت واپس آئے اور اپنی ہمشیرہ کو متوجہ کر کے فرمایا کہ بہن! میں نے اپنی استطاعت کے مطابق آپ کی خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، پھر بھی انسان نہایت ضعیف اور کمزور ہے، میری طرف سے خدمت میں کسی قسم کی کوتاہی یا حق تلفی ہوئی ہو، تو معافی چاہتا ہوں۔ اس نے فرمایا کہ بھائی جان! آپ ہمیں معاف کیا کریں کیونکہ بچپن ہی سے آپ نے ساری زندگی تکالیف اور مصائب میں گزاری ہے، میں تو آپ پر فخر کرتی ہوں کہ آپ جیسا بھائی اللہ تعالی نے دیا ہے۔ یہ کہہ کر وہ گھر کو چل دی اور حضرت ٹارچ جلا کر ان کے لیے روشنی فرماتے رہے یہاں تک وہ نظر سے غائب ہوگئی، پھر حضرت مہمانوں کے پاس آگئے ،۱۰ منٹ ان کے ساتھ تشریف فرما ہوئے مختصری گفتگو ان سے ہوئی اور معذرت بھی کر لی کہ زیادہ بولنے سے قاصر ہوں، اس دوران جماعت کا وقت ہوگیا۔

نماز پڑھ کر خلاف عادت دوبارہ گھر تشریف لے گئے، میں بھی گھر تک ساتھ گیا، حضرت نے فرمایا کہ آپ جائیں مہمانوں کو سلائیں، چائے وغیرہ کے بارے میں پوچھیں جو ان کے مزاج کے موافق ہوں وہی چائے بنائیں، میں واپس آکر مہمانوں کے پاس آگیا، تھوڑی دیر بعد جب مہمان سو گئے تو دوبارہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، جو دوائیں رات کو استعمال کرتے تھے، وہ اُٹھا کر حضرت کے سامنے پیش کیں تو حضرت نے معذرت کر لی کہ بیٹا! مزید ان دواؤں سے بھی تنگ آگیا ہوں، بس واپس رکھ دو، میں نے بلڈ پریشر کی گولی' جو حضرت ہمیشہ استعمال فرماتے تھے' کے بارے میں اصرار کیا تو حضرت نے فرمایا کہ بیٹا چھوڑ دو بس، ان شاء اللہ آئندہ اس کی ضرورت نہیں رہے گی۔ میں جب حضرت کے کمرے سے نکل آیا تو تھوڑی دیر بعد حضرت نے دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی لگائی۔ میں نے والدہ سے کہا کہ آج حضرت نے دوائی بھی نہیں کھائی اور مجھے مالش وغیرہ کی خدمت کا موقع بھی نہیں دیا تو والدہ نے کہا کہ آج تو صحت بھی دوسرے دنوں کی بنسبت بہتر تھی، مگر حضرت آج پورا دن ذکر میں مصروف تھے شاید بیماری کی وجہ سے وظائف وغیرہ رہ گئے ہوں، ان کی تکمیل میں مصروف ہوں۔

بہر حال جب میں پھر مدرسہ جانے لگا تو حضرت کے کمرہ سے آواز آرہی تھی، جب میں قریب پہنچا تو حضرت

تلاوت کلام پاک میں مصروف تھے غالباً سورۃ الفتح کی تلاوت فرما رہے تھے، مگر تلاوت کے ساتھ رونے کی آواز بھی شامل تھی، پھر صبح جس وقت حضرت نماز تہجد کے لئے مسجد آتے تھے، اس سے کافی دیر قبل مسجد تشریف لے آئے تھے، میں جب اٹھا تو حضرت تہجد پڑھ چکے تھے اور اپنے اوراد و وظائف میں مصروف تھے۔ میں نے گھر جا کر دو عدد کیلے، پانچ عدد عجوہ کھجور اور ایک گلاس زم زم کا پانی سحری کے لیے لے کر حاضر خدمت ہوا، حضرت نے تین کھجور اُٹھا کر تناول فرمائے اور دو مجھے دے کر کھانے کو فرمایا اور زم زم آدھا گلاس پی کر باقی مجھے پینے کو دیا اور کیلوں کے بارے میں فرمایا کہ یہ عمیر کے لئے رکھو۔ میرے چھوٹے بیٹے عمیر سے بہت ہی پیار تھا۔

نماز فجر کے بعد خلاف عادت مسجد سے کافی دیر بعد نکلے، عموماً صلوۃ اشراق چار رکعات پڑھتے تھے، اس دن آٹھ رکعات پڑھی تھیں اور دعا میں بھی کافی وقت لگایا، مہمانوں کے بارے میں پوچھا کہ کدھر ہیں اور کیا ارادہ ہے، میں نے بتایا کہ آپ کے انتظار میں ہیں بس اجازت لینا چاہتے ہیں۔ حضرت ان کے پاس تشریف لے گئے، چند منٹ بیٹھ کر ان سے فرمانے لگے کہ اگر آپ لوگ جانا چاہتے ہیں تو بروقت چلے جائیں، گرمی بھی ہے اور آج کل حالات بھی ٹھیک نہیں ہیں اور تاکید سے فرمایا کہ آج کل زیادہ گھومنے پھرنے سے گریز کیا کریں، پھر مجھے فرمایا کہ تکیہ کے نیچے کچھ رقم پڑی ہے، اس سے پانچ ہزار روپے لے کر مہمانوں کو دے دو اور کہہ دو کہ یہ آپ حضرات کا خرچہ ہے۔

جب وہ چلے گئے تو حضرت گھر جا کر درس قرآن میں مصروف ہو گئے، روزانہ ایک رکوع پڑھاتے تھے، اس دن خلاف معمول چار رکوع پڑھا کر سورۃ کی تکمیل فرما دی۔ پھر دوبارہ مجھے بلایا کہ غسل کرنا چاہتا ہوں، پانی کا انتظام کریں۔ پھر فرمایا کہ بیٹا! کل کے جنازے میں جو خرافات آپ نے دیکھیں، کہیں میرے جنازے میں یہ چیزیں نہ کرنا۔ فرمایا: الحمدللہ تحدیث بالنعمۃ کے طور پر کہتا ہوں کہ اپنی پوری زندگی میں ہمیشہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کی کوشش کی ہے، ایسا نہ ہو کہ مرنے کے بعد خلاف سنت کر کے میرے ساتھ ظلم کرو۔ بیٹا! سنت عمل میں زینت بھی ہے اور راحت بھی ہے۔ نہ میری موت کا اعلان نہ کرنا اور نہ دفن میں ایک نماز کے وقت سے زیادہ تاخیر کرنا۔

غسل کر کے تشریف لائے تو اپنی الماری سے ساری رقوم نکالیں، پھر سب کو علیحدہ علیحدہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ میری ذاتی رقم ہے، یہ مدرسہ کی رقم ہے، یہ زکوۃ اور یہ غیر زکوۃ ہے، یہ غربا و مساکین کے لئے ہے اور یہ مجاہدین افغانستان کے لئے۔ پھر کچھ رقم کے بارے میں بتایا کہ یہ کنویں کھودنے میں استعمال کریں۔ اس کے علاوہ مختلف لوگوں کی امانتیں تھیں وہ بھی دیں کہ آج ہی یہ ان تک پہنچادیں، پھر فرمایا کہ ابھی جا کر بازار سے پانی کی دو ٹینکیاں لے آئیں، میں نے عرض کیا کہ حضرت اگر ایک ہو تو اس سے بھی کام چل جائے گا۔ حضرت نے فرمایا کہ کل آپ لوگ ہی پریشان

ہوں گے، میں تو آپ لوگوں کی وجہ سے دو کا کہہ رہا ہوں۔(جب بمباری ہوئی تو اس کی وجہ سے مدرسے کی تمام ٹینکیوں میں دراڑیں آئیں، اگر ہم بروقت یہ انتظام نہ کرتے تو ہمارے لیے بڑی پریشانی ہوتی، یہ بھی حضرت کی کرامت تھی)۔ پھر آخر میں فرمایا کہ ساتھ تین چادریں بھی لے آئیں۔ میں نے چادروں کے بارے میں استفسار کیا تو حضرت نے اپنے جلالی انداز میں فرمایا کہ "اتنا بڑا ہوگیا مگر آدمی نہ بن سکا، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔" میں نے خاموشی اختیار کی مجھے کیا معلوم کہ والد صاحب کو کفن کی چادریں درکار تھیں۔ پھر میں نے رقوم کے بارے میں پوچھا کہ حضرت میں ان کو کہاں رکھوں، بہتر یہی ہے کہ آپ کے پاس ہی ہوں حضرت فرمانے لگے کہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، موت ایک ایسا دوست ہے کہ کسی بھی وقت آسکتا ہے، اس کیلئے پہلے سے تیاری کرنی چاہیے۔

فرمایا: بیٹا! سب سے قیمتی انسان وہ ہے جو اس دنیا سے ایمان کی حالت میں اپنے رب سے جاملے، پھر اموات میں سب سے بہترین موت مظلومانہ شہادت ہے اور عند اللہ بھی مقبول ہے، ہر مسلمان کی یہی تمنا ہوتی ہے کہ مجھے بحالت ایمان موت نصیب ہو۔ بیٹا! اس دنیا میں ایک دن فراق ہے، انفصال ہر صورت میں آتا ہے، دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ دار سرور میں دائمی اتصال نصیب فرمائے۔ یہ فرما کر حضرت صلوۃ تسبیح کے لئے کھڑے ہوگئے، میں مدرسہ کی طرف آگیا، کچھ دیر بعد میری چھوٹی بچی کو بھیج دیا کہ اسے بلائیں، جب میں حضرت کے کمرہ میں داخل ہوا تو حضرت کسی فکر میں نہایت مستغرق نظر آئے، مجھے عطر کی ایک شیشی تھمادی اور فرمانے لگے کہ آج ہی سے تمام تر توجہ مدرسہ کی طرف مبذول کرلو، میں یہ پھول آپ کے لیے چھوڑ رہا ہوں، اس کی پانچ منٹ خدمت بھی اپنے لئے سعادت اور ذریعہ نجات سمجھیں۔ ویسے بھی حسن خلق اچھی چیز ہے پھر اپنوں کے ساتھ تو نور علیٰ نور ہے، میرے بھائی اور بہنوں کا خاص خیال رکھا کریں، اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ حسن سلوک کا رویہ رکھیں۔ میری ذاتی رقم بھائی عبدالہادی کو دے کر تجارت میں استعمال کریں اور اس مضاربت میں جو منافع حاصل ہو وہ اپنے مابین عدل وانصاف کے ساتھ تقسیم کیا کریں، خصوصاً اپنی والدہ کا خاص خیال رکھیں اور ان سے مزید خدمت لینے کی کوشش نہ کریں، آج کل وہ عمر کے جس حصے میں ہے، میرے خیال میں شرعاً بھی ان سے کام لینا جائز نہیں ہوگا، آپ کے لئے تو بطریق اولیٰ جائز نہیں ہے۔ پھر فرمایا کہ جلدی بازار جائیں اور جتنا جلدی ہوسکے واپس آئیں۔

میں والدہ کے پاس گیا کہ میں بازار جارہا ہوں اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو والدہ نے کہا کہ یہ حضرت کو کیا ہوا ہے؟ کل پوری رات آرام نہیں فرمایا، صبح تہجد کے وقت مجھے بلا کر بہت سی نصیحتیں کیں اور معافی تلافی کرکے فرمایا کہ بچوں کا خیال رکھیں اور ان سے نرمی کا برتاؤ کریں، میں نے عرض کیا کہ مجھے خود سمجھ نہیں آرہی، میرے ساتھ بھی اسی قسم کی گفتگو فرمائی ہے۔ بہرحال میں حسب حکم بازار گیا، جن لوگوں کی امانتیں تھیں وہ بھی سب کو پہنچادیں اور پلاسٹک کی

ٹیکسیاں لے کر ان میں نکلنے لگائے، واپسی پر ابھی مدرسہ سے چند کلومیٹر دور تھا کہ مولانا سعید علی شاہ صاحب نے فون پر بتایا کہ مدرسہ پر بمباری ہوگئی ہے آپ جلدی پہنچیں، جب دوسرا بم گررہا تھا تو تقریباً اس وقت میں پہنچنے والا تھا لیکن راستہ میں اہل علاقہ نے روک لیا۔ جب مدرسہ کی کھڑکی سے جھانکا تو یہ دل خراش منظر دیکھ کر پاؤں تلے زمین نکل گئی کہ ہر طرف ملبے کا ڈھیر تھا، کتابوں اور قرآن مجید کے اوراق بکھرے پڑے تھے۔ اسی پریشانی میں فوراً گھر میں داخل ہوا تو سب سے پہلے والدہ محترمہ سے ملاقات ہوئی، جو غم والم کے پہاڑ سینے پر لے کر سہہ رہی تھی، مجھ سے یہ برداشت نہ ہوا اور دوبارہ مدرسہ کی طرف آیا لیکن مدرسے میں مجھے کوئی نظر نہیں آیا، باہر کھیتوں کی طرف سے رونے کی آواز محسوس کی، جب میں باہر نکلا تو دیکھا کہ ساتھیوں نے چارپائی پر ایک لاش رکھی ہوئی ہے، درختوں کے نیچے ادھر ادھر لے کر جاتے تھے۔ جب میں پہنچا اور حضرت کے چہرے پر نظر پڑی تو ایک لمحہ کے لیے عالم تاریک ہوگیا لیکن انا للہ وانا الیہ راجعون کا ورد زبان پر جاری ہوا اور اللہ تعالیٰ نے حوصلہ نصیب فرمایا، ساتھی پریشان تھے کہ کہیں دوبارہ بمباری نہ ہوجائے، اس لیے لاش قریب میں حاجی ربیب صاحب کے گھر منتقل کی، اس دوران ہمارے مخلص ساتھی ڈاکٹر عبدالوہاب پہنچ گئے، انہوں نے نبض وغیرہ چیک کر کے تصدیق کی کہ حضرت شہید ہوگئے ہیں، وہ زخموں پر پٹی باندھنے لگے۔ میں نے استاذ گرامی مولانا فیض الرحمن صاحب مدظلہم کو استاذ صاحبؒ کی وصیت سنائی کہ جتنا جلدی ہوسکے میری تدفین کرنی ہے، میرے بارے میں کسی کو اطلاع نہیں دینی اور نہ کسی کے انتظار میں میری لاش کو رکھنے کی اجازت ہے۔ اللہ تعالیٰ استاذ جی کو جزائے خیر دے انہوں نے ہمت باندھی اور فی الفور قبر کی تیاری میں مصروف ہوگئے۔ حضرت کی محبوبیت کا یہ عالم تھا کہ یکایک علاقہ لوگوں سے بھر گیا ہمیں کیا معلوم کہ آپ ہمیں اعلانات سے منع کرتے ہیں مگر آپ کی مظلومیت اور شہادت پر مساجد کے لاؤڈ سپیکروں کی بجائے پوری دنیا کی میڈیا اور ٹیلی وژن پر اعلانات ہوتے رہیں گے۔ پورے ہنگو میں حضرت کی شہادت کی خبر سے سناٹا چھا گیا اور حضرت نے جو پہلے سے بتایا تھا کہ میری مظلومیت کی پوری دنیا گواہی دے گی، وہی منظر ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، ہر طرف راستے بند ہونے کے باوجود حضرت کی نماز جنازہ میں جو ہجوم تھا اس کی نظیر پھر اہل ہنگو نے نہیں دیکھی۔

حضرت کی شہادت صرف میرے لئے نہیں بلکہ پورے علاقہ کے لئے ایک عظیم سانحہ تھا جس طرح میرا گھر اجڑا تھا، میرے جیسے سینکڑوں گھرانے اجڑ گئے تھے، وہ تو پورے علاقے کے لئے ایک ہمدرد اور غمخوار راہنما تھے۔ حضرت کی ذات پر ہمیشہ یہ الزام لگتا تھا کہ حضرت حکومت کی طرف داری کرتے ہیں، ایجنسیوں کے اشاروں پر کام کرتے ہیں، مصلحت پسند ہیں، نہ جانے کیا کیا الزامات تھے، جو حضرت کی شہادت کے ساتھ حرف غلط کی طرح مٹ

گئے۔ یقیناً آپ نے قیام امن کے لیے وہ خدمات سرانجام دی ہیں، جن کا تصور بھی ایک اکیلے فرد سے ناممکن ہے، ہنگو سے لے کر لال مسجد اسلام آباد تک مصلحانہ کاوشوں کی ایک عظیم تاریخ رقم کر کے چھوڑی، مگر افسوس کہ وہ دشمنانِ وطن اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئے اور میرے والد ماجد کو شہید کر دیا۔

کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایک محب وطن اور شر پسندوں کے تعاقب میں شب و روز مصروف شخصیت کو وطن دشمن اور دہشت گردوں کا خیر خواہ ظاہر کر کے دن دھاڑے شہید کر دیا جائے، یہ سراسر ظلم ہی ظلم ہے، اپنے دل اور اپنے مخلصین کے دلوں کی تسکین کے لئے حضرت شہید کا پسند فرمودہ شعر لکھ کر اجازت چاہوں گا:

وہ درد مجھ کو ملا جس سے اجنبی ہیں سبھی
کہوں تو کس سے کہوں، سہوں تو کیسے سہوں

اللہ تعالیٰ میرے والد ماجد کی تمام قومی، ملی، مذہبی اور سیاسی خدمات قبول فرمائے، آپ کی شہادت کو قبولیت سے نوازے اور ہم سب کو آپ کی فیوضات و برکات سے کما حقہ مستفید فرمائیں، آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد و آلہ و صحبہ اجمعین

سماجی کردار اور معاشرے پر ان کے اثرات

محمد طفیل کوہاٹی

حضرت الاستاذ مولانا محمد امین اورکزئی رحمہ اللہ مسلمہ علمی جلالت شان رکھنے کے ساتھ ساتھ قابل رشک رفاہیانہ مزاج کے حامل انسان تھے۔آپ نے اپنی مختصری زندگی میں علاقہ واہل علاقہ کے لیے جو مفید اور دیرپا سماجی خدمات سرانجام دیں اور معاشرے وسماج پر جو اپنا گہرا اور ایجابی اثر ثبت فرمایا وہ میدان سیاست کے بڑے بڑے جغادری سالہا سال کی محنتوں اور برسوں کے آزمودہ سیاسی ہتھکنڈوں سے حاصل نہیں کر پاتے۔آپ کی ذات میں قدرت نے ایک جانباز قائد، سلیقہ مند منتظم، معاملہ فہم مدبر، بیدار مغز سیاست دان اور دردمند رہنما کی جملہ صفات ودیعت فرمائی تھیں۔آپ نے کچے گھر میں روکھی سوکھی کھا کر اور ایک دور دراز کی جنگل نما بستی میں بیٹھ کر ہنگو کے عوام کے دلوں پر راج کیا۔بغیر کسی دنیاوی کروفر، پروٹوکول اور مادی شوکت کے عوام آپ کے اشارہ آبرو پر پتنگوں کی طرح دیوانہ وار ٹوٹتے تھے اور اپنے تمام سیاسی وسماجی مسائل میں آپ کی ذات کو اپنا مرجع تصور کرتے تھے۔صرف عوام ہی نہیں بلکہ سیاسی پارٹیوں کے رہنماؤں کے لیے بھی اپنی پوزیشن کا استحکام آپ کی حمایت کے بغیر ممکن نہ تھا،اس بات میں ذرا بھر مبالغہ نہیں کہ ہنگو کے سیاسی منظرنامے پر وہی قوتیں ظہور پا سکتیں جنہیں حضرت مولانا عبداللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور حضرت الاستاذ رحمہ اللہ تعالیٰ کی سرپرستی وتعاون حاصل ہوتا کیونکہ عوام کی رائے ان دو حضرات ہی کے منشا پر استوار ہوتی تھی۔

آپ کی چند نمایاں صفات وخصوصیات ایسی تھیں جن کی بدولت پختون معاشرت میں آپ ایک اہم سماجی رہنما کی حیثیت سے تادم آخر مقبول رہے۔ان میں سے چند ایک کا تذکرہ پیش خدمت ہے جن سے حضرت الاستاذ کی مجموعی شخصیت کے ساتھ ساتھ آپ کی زندگی کا سماجی پہلو اجاگر ہوگا اور یہ بات واضح ہوگی کہ معاشرے پر آپ کی شخصیت کے گہرے اثرات کی پشت پر کون سے عوامل کارفرما تھے:

(۱)علمی جلالت شان:

ایک کامیاب سماجی رہنما ٹھوس علمی استعداد کے بغیر تمام طبقات میں وقعت ووجاہت حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے اور علمی کمال کے بغیر اس سے عوامی وابستگیاں محض مفادی واغراضی نوعیت کی ہوتی ہیں۔علمی کمال ہی وہ جوہر ہے جس سے سماج کے نبضوں کو گہرائی سے جانچ کر درست سمت میں فیصلہ کی قوت مہیا ہوتی ہے۔طالوت علیہ السلام

کو شرف قیادت سے نوازنے میں اولین وصف، کمال علمی ہی تھا جس کا اظہار 'بسطۃ فی العلم' میں فرمایا گیا۔ حضرت الاستاذ کو باری تعالیٰ کے بے پنا خزانوں سے علمی قوت وجلالت کا حظ وافر نصیب ہوا تھا۔ تفسیر وحدیث، فقہ وقانون، معاشرت واخلاقیات، منطق وفلسفہ، تاریخ وعمرانیات اور نفسیات انسانی...... غرض ہر علم وفن میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اسلام کے سماجی علوم کے شاید ہمارے دیار میں سب سے بڑے عالم تھے۔ عمرانی علوم پر گہری نظر اور تاریخی عوامل وسماجی حرکیات کے باہمی ربط سے مسائل کے استخراج میں آپ بے بدل تھے۔ آپ کے بہترین سماجی کردار کی پشت پر سماجیات کا یہی تبحر علم اور اس سے حاصل شدہ بصیرت کارفرما تھی۔ خطۂ ہنگو اور کوہاٹ برسوں شاید اس علمی گہرائی وگیرائی کو ترستا رہے جو حضرت الاستاذ کے سراپے میں تیس سال تک اسے فیض یاب کرتی رہی اور ان کے سماجی مسائل کی درست تشخیص اور بروقت مداوا کا سامان بنتی رہی۔

(۲) مثالی تقویٰ وطہارت:

محض علم، دعویٰ اور برتری کی اس نفسیات کو پیدا کرتا ہے جو سماجی ورفاہیانہ کردار کو غرض ومفاد کے خول میں بند رکھتا ہے اور ''من'' و''اذیٰ'' کے منفی جذبات کا سبب بنتا ہے۔ اس سے انسان مقبولیت کی بجائے سلیم فطرت لوگوں کی نظر میں اپنا مقام کھو دیتا ہے، اور اس کے ایجابی کاموں کی وقعت بھی قلوب سے نکل جاتی ہے۔ ایسے عالم کی تصویر ایک عام دنیا پرست اور مادیت زدہ سیاست دان سے ہرگز مختلف نہیں ہوتی۔ ایسے لوگ علم کے باوجود اپنی سماجی خدمات کو چند سیاسی اور وقتی مفادات کے بھینٹ چڑھا دیتے ہیں اور معاشرے میں ان کا دیرپا اور مثبت اثر مرتب نہیں ہو پاتا۔ انھیں اس سے زیادہ ریسپانس نہیں ملتا کہ بس کچھ عرصے تک ان کے سماجی کاموں پر ان کے ناموں کی تختیاں آویزاں رہتی ہیں اور پھر کچھ ہی عرصہ بعد وہ ایسے مٹ جاتی ہیں جیسے لوگوں کے دلوں سے ان کا نقش مٹ چکا ہوتا ہے۔ اس کی بنیادی اور بڑی وجہ محض علم کی پیدا کردہ اس نفسیات کا اثر ہوتا ہے جو سماجی خدمات کو مادی اغراض کے حصول سے بالاتر ہو کر پیش کرنے میں رکاوٹ بنتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ علم کی ''تیغ'' جب تک تقویٰ کے ''فساں'' پر نہ رگڑی جائے اس کی دھار حق کی حمایت ونصرت میں کند ہی رہتی ہے۔ حضرت الاستاذ کو بارگاہ لم یزل سے تقویٰ وطہارت باطنی کی وہ دولت ملی تھی جس نے آپ کے شخصی کمالات کو اوج ثریا پر پہنچایا اور آپ کے انفاس کی خوشبو کو چہار سو بکھیرا۔ تقویٰ ہی کی منہاج انسان میں خدمت خلق اور افادۂ سماج کی صحیح اسلامی خو پیدا کرتی ہے اور اسے وہ اخلاص وبے لوثی عطا کرتی ہے جس کی طاقت سے انسان محض رضائے خداوندی کے لیے اللہ کی مخلوق کی خیر خواہی میں ہمہ تن مصروف رہنے کو فریضۂ حیات تصور کرتا ہے

اور اس میں ایک گونہ باطنی سکون اور سرشاری کی لذت پاتا ہے۔ حضرت الاستاذ تقویٰ کے اسی منہاج پر فائز تھے۔ آپ کی بے لوثی اور جذبۂ خدمت خلق کا ایک زمانہ گواہ ہے، یقیناً یہ سب تقویٰ ہی کا کمال تھا کہ آپ نے زندگی بھر ایک بھرپور سماجی رہنما کی سی کامیاب زندگی گزاری۔

آپ نے اپنی سماجی خدمات کا رتی بھر صلہ دنیا میں وصول نہیں کیا، نہ ہی کسی سے اس کی طمع رکھی اور نہ ہی کسی کو بدلہ دینے کا موقعہ دیا۔ آپ کی تمام تر سماجی مساعی بغیر نام ونمود، بغیر کسی گروہی وتنظیمی ٹائٹل، بغیر کسی بینر واشتہار، بغیر کسی سیمینار ورونمائی جلسوں اور بغیر کسی اخباری بیان ومیڈیائی تشہیر کے سرانجام پاتیں۔ سماج میں تقویٰ کی ان بنیادوں پر کام کرنے والے حضرات ہی درحقیقت اسلام کے سماجی مزاج کے اصل وارث ہیں اور سماجی خدمات کے لیے انہی کا طرز وطریق آئیڈیل اور نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

تقویٰ کے بغیر سماجی وسیاسی کاوشیں عموماً اقتداری نفسیات پر استوار ہوتی ہیں، اس نفسیات کے ساتھ ذاتی و اندرونی منکر کے اضمحلال کا تصور عبث ہے چہ جائیکہ سماج ومعاشرت میں منکر کے استیصال اور معروف کی ترویج کا کام کیا جاسکے، یا رفاہی وفلاحی امور میں للّٰہیت باقی رکھی جاسکے۔ اقتداری نفسیات میں اپنی پوزیشن کا استحکام اور اپنی وجاہت کی بقا اولین ترجیح ہوتی ہے اس لیے وسائل کا ایک بڑا مصرف ایسے مواقع بنتے ہیں جہاں حقیقی ضرورت کی تکمیل سے زیادہ مذکورہ ترجیحات کا حصول ممکن ہو، یوں سماجی وسیاسی شخصیت اپنی ذاتی ترجیحات کے خول سے آزاد ہوکر عوامی مفاد میں سوچنے کی قوت سے یکسر محروم ہوجاتی ہے۔ حضرت الاستاذ اقتداری نفسیات سے بالکلیہ آزاد تھے ، یہ آپ کے مثالی تقویٰ ہی کی برکت تھی کہ نام ونمود سے طبعی نفرت ہوگئی تھی اور اخفا آپ کا لازمہ بن چکا تھا۔

(۳) شجاعت صدیقی:

سماج اور خصوصاً قبائلی سماج میں کردار ادا کرنا شجاعت ہی پر موقوف ہے۔ شجاعت، تہور اور جبن کے درمیان ایک مرتبہ کا نام ہے، جس میں نہ تو بے لگام بہادری ہو جو قیمتی کو بے قیمت اور دائمی کو وقتی پر قربان کردے اور نہ ہی جبن وبزدلی کہ اپنے مفاد کے حصول کے لیے جائز کاوش کی بھی ہمت نہ ہو۔

ایک شجاع سماجی رہنما معاشرے کو محفوظ طریقے سے تعمیر وترقی کی راہ پر گامزن رکھتا ہے۔ حضرت الاستاذ کو وصف شجاعت بطور خاص ودیعت کی گئی۔ آپ نے مثبت عوامی مفاد پر کبھی کسی اور مفاد کو ترجیح نہیں دی، لوگوں میں وقتی کی بجائے دائمی اور دیرپا مفاد کے حصول کو ترجیح دینے کا شعور اجاگر کیا۔ سماج دشمن عناصر اور مفاد پرست ٹولوں سے کبھی نہیں دبے بلکہ انہیں دم دبا کر بھاگنے پر مجبور کیا۔ جنکو عوام کی پسماندگی سے فائدہ

اٹھا کر سال ہا سال تک اپنی سیٹیں پکی رکھنے والے اور دینی پہچان لے کر سماج کو طبقات میں بانٹنے والے عناصر بھی حضرت الاستاذ ہی کی شخصیت سے بے اثر ہوئے۔

آپ کی شجاعت ہی تھی کہ نازک ترین مرحلوں اور جان لیوا مراحل پر ہنگو عوام کے واحد مرجع اور سہارا آپ ہی رہے۔ جب اہل ہنگو کی املاک جل رہی تھیں، ان پر عرصۂ حیات تنگ کیا جارہا تھا اور بیرونی قوتوں کے اشاروں پر بعض سماج اور ملک دشمن عناصر نے انہیں ہدف بنالیا تھا تب حضرت الاستاذ وہ واحد رہنما تھے جنہوں نے عوام کی قیادت کی، انہیں حوصلہ دیا، حالات کے جبر کے سامنے ڈٹنے اور اسے شکست دینے کا سلیقہ بخشا اور قیام امن کے لیے ایسے اقدامات کیے کہ ہنگو کے عوام چین وسکون کی طرف لوٹنے لگے۔ ان نازک مراحل میں آپ کی زندگی بھی خطرات سے دوچار رہی، سماج دشمن عناصر کی طرف سے بارہا آپ کو شہید کرنے کے منصوبے بنائے گئے، آپ کی حفاظت کے لیے پہروں تک کی نوبت آئی، لیکن آپ عوام کو تنہا چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے۔ ان حالات میں بعض اوقات ایسے مراحل بھی آئے کہ موافقین ساتھ دینے میں متذبذب ہوئے تب آپ کا نعرۂ صدیقی "اینقص الدین وأناحي" آپ کے عزم واستقلال کی خبر دیتا اور ساتھ والوں کو ایک نیا حوصلہ میسر آتا۔ بہت سے مسائل ایسے پیش آئے جن میں محض آپ کے استقلال وشجاعت ہی نے بند دروا کیے، حالانکہ دیکھنے والوں کو کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ یقینا شجاعت کے اس امتیازی وصف نے ہنگو معاشرے میں آپ کے مقبول سماجی کردار کے لیے بنیاد کے پتھر کا کام دیا۔

یہ حقیقت بھی عجیب تر ہے کہ آپ کسی دینی یا سیاسی تنظیم کے باقاعدہ رکن نہ تھے لیکن ہنگو کی معاشرتی خدمات کا دائرہ اور ان کے مسائل کا حل آپ ہی کے گرد گھومتا رہتا۔

(۴) معاملہ فہمی:

سماجی رہنما معاملہ فہمی سے عاری ہو تو اس کے فیصلے قوموں کو ڈبو دیتے ہیں، وسائل کے استعمال اور ترجیحات کے تعین میں ہمیشہ ناکامی کا شکار رہتے ہیں، بلکہ وسائل کے صرف سے مزید مسائل پیدا کرتے ہیں، عوام کے باہمی مسائل کے حل اور ان کی درست تشخیص میں بھی عموماً ٹھوکر لگتی ہے اور مثبت تاثر قائم نہیں کر پاتے۔ ایسے سماجی رہنماؤں کے ہاتھ کبھی عوامی خوشحالی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا۔ معاملہ فہمی راست فکر کے صدقے ملتی ہے اور راست فکر نہ ہو تو باوجود علم وشجاعت کے سماج کو مسائل کے سوا کچھ نہیں دیا جاسکتا۔

حضرت الاستاذ انتہائی اعلیٰ اور غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں اور گہری فہم وفراست والی شخصیت تھے، آپ کسی قضیہ

کے مبادیات سن کر ہی تہہ تک پہنچ جاتے تھے اور مخاطب کے لب ولہجہ اور اطوار ہی سے اس کی فکر ونظر کا پتہ لگا لیتے۔ آپ کو وہ مؤمنانہ فراست بدرجہ اتم نصیب تھی، جس کی خبر "اتقوا فراسۃ المؤمن" میں دی گئی۔ بعض مسائل پر آپ کے تجزیوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ معاملہ کی جملہ جہات مع نتائج آپ پر منکشوف کردیے گئے ہیں اور "یاساریۃ الجبل" اس لیے کہہ رہے ہیں کہ سب کچھ نظر باطنی کے سامنے ہے۔ آپ اس درجہ زیرک تھے کہ بعض اوقات ہواؤں کے رخ سے معاملات کے اثرات ونتائج کی بوسونگھ لیتے اور اس کی خبر بھی دے دیتے، آپ کی معاملہ فہمی دیکھ کر فاروقی نسبت کا فیض مشاہد ہوتا۔ معاملہ فہمی کی اس درجہ استعداد ہمارے دیار کی حد تک شاید ہی کسی سماجی رہنما کو میسر ہو، اس امتیازی وصف میں اپنے بیگانے سبھی آپ کے قائل رہے ہیں اور سبھی نے اس کے ثمرات سمیٹے ہیں۔

(۵) ہردل عزیزی ومحبوبیت:

حضرت الاستاذ کو اللہ تعالیٰ نے عجیب محبوبیت سے نوازا تھا، آپ کی شخصیت میں ایسی کشش تھی کہ ایک ہی مجلس میں دل موہ لیتے۔ آپ جلال وجمال کا مرقع تھے، آپ کو اول وہلہ میں دیکھ ایک رعب طاری ہوتا لیکن رفتہ رفتہ طبیعت آپ کی طرف میلان پاتی اور تھوڑی دیر میں محسوس ہونے لگتا کہ جیسے آپ سے برسوں واقفیت ہے۔ آپ کی طبیعت پر جلال کے غلبہ کے باوجود شفقت ورأفت کا وہ رویہ دیکھنے کو ملتا کہ ملنے والا دل کا سودا کر جاتا۔

آپ کی محبوبیت کا یہ عالم تھا کہ آپ کے تلامذہ ومتعلقین بیرون ممالک سے محض آپ کی زیارت کے لیے ہنگو جیسے دور دراز اور شوریدہ حال شہر کا سفر کرتے۔ علمۃ الناس محض زیارت وملاقات کا شرف پانے تانتا باندھ لیتے۔ آپ کو اسی محبوبیت کے ناطے ہمارے دیار میں عزت وشرف اور محبت ووارفتگی میں ذو بالقب "مشر استاذ صاحب" (بڑے استاد صاحب) عنایت ہوا۔ عام وخاص آپ کو اسی لقب سے یاد کرتے۔ جہاں آپ کا نام نامی آتا اس موقع وگفتگو کو بھی تبرک کا باعث سمجھا جاتا اور ایسے مواقع بھی تقدس کا جامہ اوڑھ لیتے۔ اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سماج ومعاشرے پر آپ کی شخصیت کا کتنا گہرا اثر تھا۔

شاید میرے ان الفاظ میں مبالغہ آرائی محسوس کی جائے لیکن جنھوں نے اس سراپا جمال شخصیت کو دیکھا ہو وہ ان جملوں کو محبوبیت کی حقیقی منظر کشی سے تشنہ پائیں گے اور انھیں اس کے نقص میں ذرا برابر تامل نہ ہوگا۔ الغرض یہی محبوبیت اور ہردل عزیزی تھی جس نے حضرت الاستاذ کو ایک ممتاز اور متفقہ سماجی قائد کے طور پر منوایا اور علمۃ الناس کی نگاہیں کسی بھی اہم سماجی مسئلے میں آپ کے علاوہ کسی اور طرف نہ اٹھیں۔

(۶) اخلاق حسنہ:

ایک کامیاب سماجی قائد اگر اخلاق حسنہ کی دولت سے مالا مال نہ ہو تو اس کی کاوشوں کی عمر کچھ نہیں ہوتی، بلکہ اس کی خوبیاں خامیوں کے پلڑے میں تولی جاتی ہیں اور اس کے مثبت کام بھی وقعت وحیثیت حاصل نہیں کر پاتے۔ اخلاق حسنہ ہی سے دوسروں کے دل جیتے جاسکتے ہیں اور انہیں اپنے کاز کے لیے مسخر کیا جاسکتا ہے۔

حضرت الاستاذ اخلاق کریمانہ کا چلتا پھرتا نمونہ تھے، زہد واستغنا کا یہ عالم تھا کہ کبھی مال داروں کا ہدیہ قبول نہیں کیا، بڑے بڑے خوانین گاڑیوں تک کے تحفے لے کر دروازے پر حاضر ہوتے لیکن شرف قبولیت نہ ملتا، اپنی ذات پر اختیاری فقر کے ساتھ ساتھ اپنے سے متعلقہ دینی خدمات کے لیے بھی کسی سے از خود چندہ کی اپیل نہیں کی۔ ساری زندگی توکل کا مجسمہ رہے اور جامعہ یوسفیہ کو اسی منہج پر عمر بھر چلایا۔

سادگی اور قناعت اس درجہ تھی، کہ تکلف وتصنع قریب بھی نہ پھٹک سکے، جو میسر ہوتا خود کھاتے اور دوسروں کو کھلاتے، لباس اور بود وباش سادہ رکھا، کچے گھر کے دو کمروں میں پورے کنبے سمیت ساری عمر بسر کی۔ ہزاروں متوسلین، سینکڑوں تلامذہ، بڑے بڑے مال دار متعلقین وخوانین کی وابستگیوں کو اگر اپنی دنیا سنوارنے کے لیے استعمال کرتے تو ہر لذت وآسائش پاسکتے لیکن اس تصور سے بھی دور رہے۔

تواضع اور عاجزی کا یہ عالم تھا کہ چھوٹی سی چھوٹی حیثیت کا شخص بھی ان کی مجلس میں احساس برتری پاتا اور وہ اسے ایک خاص مقام سے نوازتے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ایک معمولی حیثیت کے شخص سے کوئی کام پڑ گیا تو اسے طلب کرنے کی بجائے خود اس کے ہاں تشریف لے گئے اور اپنے آپ کو محتاج کی حیثیت دی۔

عموماً آنے والوں کی خدمت اپنے ہاتھ سے کرتے، مہمانوں کے ہاتھ دھلانا، دسترخوان بچھانا، گھر سے کھانا لانا معمول کی باتیں تھیں، چارپائی پر ہمیشہ مہمانوں کو سرہانے بٹھاتے اور خود پائنتی کی جانب بیٹھنے کا معمول تھا۔

مروت کا اس درجہ غلبہ تھا کہ دوسرے کی خامیوں پر چشم پوشی کا مادہ ان سے بڑھ کر کہیں نہ دیکھا، خوبیوں کے معترف ہوتے، غلطیوں سے درگزر کرتے، کبھی ضرورت بھی ہوتی تو دوستوں کو معمولی تنبیہ کر دیتے، آپ خوش اخلاقی، دوسرے کی رعایت اور مروت میں نبوی صفت "لو کنت فظا غلیظ القلب لانفضوا من حولک" کے پورے آئینہ دار تھے۔ ان بلند اخلاق کے باعث آپ کی معاشرتی اور سماجی حیثیت اور عامۃ الناس میں ہر حوالے سے آپ کی بے پناہ مقبولیت اچھنبے کی بات معلوم نہیں ہوتی۔

(۷) عبقری نظر وفکر

سماج ومعاشرت کی خدمت اور اس خدمت کی ہمہ جہتی ...... عبقریت فکر ونظر چاہتی ہے، عبقریت نہ ہو تو بڑے

سے بڑا سماجی وسیاسی رہنما گھمبیر حالات میں ڈگمگا جاتا ہے۔ ہنگو سو سال سے قبائلی اور شیعہ سنی کشیدگی کا گڑھ رہا ہے، یہاں کی قبائلی جنگیں سالوں پر محیط ہوتی ہیں۔ اس خطے میں مسلح شیعہ سنی ٹکراؤ کے بھی کئی عوامل رہے ہیں مثلاً: تاریخی عوامل، سماجی حرکیات، تقسیم وسائل کا عدم توازن، مذہبی اختلافات وغیرہ۔ ایسے حالات سے سماج دشمن عناصر جو فوائد حاصل کر سکتے ہیں وہ بھی کسی ہوش مند پر مخفی نہیں۔ ایسی صورت حال میں سماج ومعاشرت کو اپنی بقا اور تحفظ کے لیے ایسے ہی قائد کی تلاش رہتی ہے جس میں ان گھمبیر مسائل کا سامنا کرنے کے پوری صلاحیت ہو اور ان کے تمام تر عوامل، اسباب، حرکیات اور ان سے اثر پذیر نتائج کی نہ صرف خبر ہو بلکہ ان کے حل کے لیے ٹھوس لائحہ عمل بھی رکھتا ہو اور اس لائحہ کو روبہ عمل لانے کا حوصلہ بھی اس میں موجود ہو۔

وطن عزیز کے شوریدہ حال خطوں کو پچھلے دہائیوں میں بیرونی قوتوں نے اپنے مفادات واہداف کے حصول کے لیے جس طرح استعمال کیا وہ ہمارے اداروں کے ریکارڈ میں محفوظ ہے۔ ہنگو اور اس سے ملحقہ قبائل بھی اسی پٹی کے تحت داخل ہیں جہاں سال ہا سال بیرونی طاقتیں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے سرگرم رہیں۔

حضرت الاستاذ کو بخوبی اندازہ تھا کہ وہ جس سماج کے تحفظ کی جنگ لڑ رہے ہیں وہ بیرونی قوتوں کے نشانے پر ہے اور ان قوتوں کے اہداف کا حصول ہی اس سماج کی بدامنی وشورش زدگی میں ہے۔ ایک کامیاب سماجی وسیاسی رہنما کی فکر ونظر کا اصل امتحان یہی ہوتا ہے کہ ایسے حالات میں وہ اپنی قوم کو کن خطوط پر چلا کر محفوظ رکھتا ہے، یہ واضح حقیقت ہے کہ جب تک خود سماج کے اندر حضرت الاستاذ کی پالیسی کو عملی طور پر مسترد کرنے کے عناصر کا ظہور نہیں ہوا، بیرونی طاقتیں باوجود اپنی کوششوں کے امن کو مجموعی طور پر تاراج کرنے میں ناکام رہیں۔

لیکن آپ کی زندگی کے آخری سالوں میں جب نائن الیون کے بعد ایک عالمگیر سازش کے تحت امریکی جنگ کو ہمارے ملک میں دھکیل دیا گیا اور قبائل براہ راست اس کی زد میں آئے اور وہاں ملکی وملی مفادات کو کرش کرنے والی قوتوں کا ظہور ہوا تو اس اکیلی جان کی صدا نقار خانے میں طوطی کی آواز بننے لگی۔ آپ کا فکر ونظر بدلتے حالات اور ان کے تباہ کن نتائج کا ادراک کر چکا تھا۔ آپ نے ایسے حالات میں بقا وتحفظ کی جو پالیسی دی اگر اس کو روبہ عمل لایا جاتا تو شاید ان نقصانات وتباہ کاریوں سے حفاظت رہتی جنھوں نے اس خطے کو سالوں پیچھے دھکیل دیا ہے۔

(۸) ربط باہمی:

ایک کامیاب سماجی رہنما اور عوام کے مابین کبھی فاصلہ یا آہنی دیواریں نہیں ہوتیں، یہ آج کل کی ثقافت ہے جس میں رہنما کہلانے والے خوف کے مہیب سایوں میں بند قلعوں اور محلات میں جیتے ہیں، ایک مسلمان سماجی وسیاسی

رہنما حضرت عمر فاروقؓ کے طرز کا وارث ہوتا ہے، جو راتوں کو عوام کی خبر گیری کے لیے گشت کرتا ہے اور دن کو اپنا دروازہ ہر سائل کے لیے کھلا رکھتا ہے، وہاں حاجب و دربان کا تصور نہیں ہوتا۔ ایسا سماجی وسیاسی رہنما غریب وامیر ہر ایک کی دسترس میں رہتا ہے۔

حضرت الاستاذ کا عوامی ربط مثالی تھا، عوام کی خبر گیری، غربا کی فکر، مختلف طبقات کے مسائل کے لیے بے چینی، غمی خوشی میں شرکت، جنازوں کی مشایعت، مریضوں کی عیادت غرض کسی عوامی اجتماع کے موقع پر اپنے کو عوام سے علیحدہ نہ رکھا، اور اپنے آپ کو معاشرہ کے ایک عام فرد ہی کی حیثیت دی، نہ تو کسی امتیازی شان کے خواہاں ہوئے نہ ہی کسی پروٹوکول اور کروفر کے، بلکہ مجمع میں آپ کے روشن جبین کے علاوہ کوئی ایسا امتیاز نہ ہوتا جس سے آپ کی شخصیت ممتاز دکھائی دیتی۔ اس مثالی ربط کا اثر تھا کہ معاشرہ آپ کو اپنا محسن تصور کرتا، آپ کے وجود مسعود کو اپنے لیے رحمت خداوندی تصور کرتا اور زندگی کے کسی موڑ پر آپ اور آپ کے فیصلوں سے اپنے آپ کو مستغنی نہ سمجھتا۔

پختون معاشرت کی ایک اخلاقی خوبی کہیں یا جذباتی مزاج کا ثمرہ کہ انہیں ہمیشہ فلاحی ورفاہی کام کرنے والوں سے زیادہ ان رہنماؤں کا ممنون احسان پایا گیا جو ان سے رابطے میں رہیں، ان کا تعلق دائمی ہو اور وہ ان کی غمی خوشی میں شریک رہیں۔

(۹) وسعت ظرفی:

معاشرے میں مختلف طبقات اور متنوع مزاج کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے، ایک کامیاب رہنما ان تمام طبقات وافراد کی رعایت رکھتا ہے، اس لیے اسے وسعت ظرفی کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے، وسعت ظرفی کا خاصہ نہ ہو تو سماجی مسائل کا تدارک اور سب کو ساتھ لے کر چلنے کا کام کافی مشکل ہو جاتا ہے۔

حضرت الاستاذ نے ہنگو معاشرہ میں مذہبی، سیاسی وسماجی امور میں جس وسعت ظرفی کا مظاہرہ کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ عموماً آج کل رہنما اپنا حلقہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں، بعض دنیاوی مفادات کے لیے اور بعض اس اچھی نیت کے ساتھ کہ امور خیر میں معاون بنے۔ حضرت الاستاذ نے کبھی اپنا مخصوص حلقہ تشکیل دینے کی سعی نہیں کی، کیونکہ آپ کی عامۃ الناس سے کوئی طمع ہی نہ تھی۔

اس کی ایک واضح مثال بیعت کے لیے رجوع کرنے والوں کی ہے۔ یہ حقیقت مخفی نہیں کہ مریدین کا حلقہ تمام حلقوں میں سب سے زیادہ مضبوط، جانثار اور مفید وموثر ہوتا ہے اور اس سے امور خیر میں بڑی معاونت ملتی ہے، اجتماعی نوعیت کے کاموں میں آسانی پیدا ہوتی ہے، ادارے چلانا آسان ہو جاتے ہیں، تصنیف وتالیف

اور فکر و ذوق کے پھیلاؤ میں رضاکارانہ خدمات میسر آ جاتی ہیں۔ لیکن حضرت الاستاذ نے کبھی اس حلقے کی تشکیل کا بھی تصور نہیں کیا بلکہ سینکڑوں رجوع کرنے والوں کو دیگر صوفیا کے حلقوں سے وابستہ کیا۔

یہی حال آپ کے علمی اور سیاسی میدان کا رہا، آپ چاہتے تو اس دیار کے مقبول ترین شیخ الحدیث کا منصب اور معتدبہ حلقہ بنا سکتے تھے۔ الیکشن لڑتے تو کامیابی یقینی تھی لیکن ان میدانوں میں وسعت قلبی کا مظاہرہ کر کے دوسروں کو ترجیح دی۔ خود ایک سماجی خادم کی حیثیت سے اہل حق کا دست و بازو بنے اور ہمیشہ اپنے آپ کو سٹیج و منصب سے دور رکھا۔ بہت سے مواقع ایسے آئے جہاں کام تو محض آپ کی شخصیت کا تھا لیکن نام کسی اور کا اور یہی آپ کا منشا تھا۔

(۱۰) عوامی ترجیحات و مفادات کی حفاظت وحصول کا جذبہ:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک وصف قرآن مجید میں ''حریص علیکم'' بیان کیا گیا ہے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم مؤمنین کے نفع کے لیے حریص تھے، ایک قائد کی بنیادی خصوصیت یہی ہونی چاہیے کہ وہ اپنے عوام کی ترجیحات ومفادات کی حفاظت وحصول کے لیے سرگرم عمل رہے جو رہنما سماج کے لیے مفید ومضر میں امتیاز نہ کر سکے اور مفید کے حصول اور مضر کے اندفاع کے لیے کمر ہمت نہ باندھ سکے وہ کیونکر قیادت کا اہل ہو سکتا ہے۔

حضرت الاستاذ کی ساری عمر اسی میں گزری کہ ہنگو کے وسائل پر چند طبقات کی اجارہ داری ختم ہو، اس خطے کے ترقیاتی منصوبوں میں اپنے عوام کی سرمایہ کاری ہو، انہیں روزگار کے مواقع بہم پہنچیں اور ان وسائل سے اکثریتی پسماندہ سنی طبقہ مستفید ہو۔ آپ نے ہمیشہ اس کے لیے دوڑ دھوپ کی، لوگوں میں اس حوالے سے شعور پیدا کیا، ہنگو کی سطح پر ان سیاسی قوتوں کی پشت پناہی کی، جنھوں نے اس حوالے سے تحریری معاہدوں کے ذریعے آپ کو اطمینان دلایا، عوامی رائے عامہ ہمیشہ انہی کے لیے ہموار کی جو عوامی مفاد سے وابستہ مطالبات ماننے کے لیے تیار رہے۔ از خود مالی وسائل لگائے، اور اپنی مدد آپ کے تحت کئی منصوبوں کا اجرا کیا۔ حکومتی سطح پر عوامی حقوق کے تحفظ کے لیے آپ کی جد و جہد کی ایک مستقل داستان ہے جس کی تفصیل ان شاء اللہ سنی سپریم کونسل کے قیام کے تحت آئندہ پیش کی جا رہی ہے۔

حضرت الاستاذ کے عوامی مفاد کے تحفظ وحصول کے لیے یہ مخلصانہ مساعی بھی سماجی طور پر آپ کی مقبولیت کا واضح اور ٹھوس سبب بنے۔ مشتے از نمونہ خروار کے تحت یہ ان چند خصوصیات واوصاف کا تذکرہ تھا جنھوں نے آپ کے مسلمہ سماجی حیثیت کی تعیین اور عوامی مقبولیت اور اعتماد میں بنیادی کردار ادا کیا۔

حضرت الاستاذ کی سماجی خدمات کا استقصا مقصود ہے نہ اس مختصر مضمون میں ممکن ہے، بطور نمونہ آپ کی کچھ اہم

خدمات کا تذکرہ پیش کیا جاتا ہے اسی سے آپ کی خدمات کی متنوع جہات کا علم بھی ان شاء اللہ ہو جائے گا۔

معاشرتی وحدت اور قیام اتحاد میں آپ کی مساعی

اتحاد، معاشرت وسماج کی بقا کی اولین ضرورت ہے، اس کے بغیر کوئی معاشرت پنپ سکے یا سماج امن کا گہوارہ بن سکے، ناممکن ہے۔ حضرت الاستاذ نے اتحاد بین المسلمین کے لیے گراں قدر مساعی سرانجام دیں۔ آپ کا نکتۂ ارتکاز معاشرتی وحدت کا قیام تھا، مسلم امہ کے بین الاقوامی اختلاف سے علاقائی وشخصی نوعیتوں کے اختلافات تک مٹانے اور امت کو ایک لڑی میں پرونے کے لیے آپ نے ممکنہ حد تک بڑی کوششیں کیں۔ کئی کوششیں بارآور ہوئیں اور کئی ایک تشنۂ تکمیل رہیں ...... لیکن یہ کوششیں آپ کے فکر ونظر کے مختلف زاویے ضرور واضح کر گئیں۔

افغان طالبان اور احمد شاہ مسعود میں صلح کی کوشش

روسی انخلا کے بعد افغان مجاہدین جس ہولناک خانہ جنگی کا شکار ہوئے وہ اہل علم وفضل پر مخفی نہیں۔ اس وقت افغان طالبان کا ظہور اور ایک پرامن حکومت کی تشکیل معروضی حالات کے پیش نظر ایک راست سمت کی پیش رفت تھی جس پر اہل درد مسلمانوں نے افغان عوام کی اخلاقی وعملی مدد بھی کی۔

افغان طالبان کی مسلسل کامیابی اور سابقہ جہادی لیڈروں کے ناقص اور دوغلے رویے نے پاکستانی اہل علم کو بھی اس طرف مائل کیا کہ وہ افغان عوام کے روایتی اور ثقافتی تناظر میں قائم اسلامی اقدار وروایات سے ہم آہنگ اس نئی حکومت کا پوری طرح ساتھ دیں اور ان کے مقابل سرگرم عسکری قوتوں خصوصاً شمالی اتحاد کی مخالفت کریں، اس حوالے سے افغان طالبان کی حکومت کے ''شرعی''، ان کے مخالفین کے ''باغی'' اور ان کے خلاف جاری عسکری جدوجہد کے ''جہاد'' ہونے کا فتویٰ بھی جاری ہوا اور اس میں پاکستانی اہل علم کی عملی شرکت بھی رہی۔

شمالی اتحاد کئی عسکری گروہوں کا مجموعہ تھا لیکن ان میں مرکزیت احمد شاہ مسعود کو حاصل تھی اور افغان طالبان کے آخری مزاحمت کار یہی تھے، بقیہ لیڈروں کے علاقے طالبان تقریباً فتح کر چکے تھے اور احمد شاہ مسعود کا علاقہ ان کی آخری پناہ گاہ تھا۔

ہمارے خطے اور خصوصاً ہمارے حلقے میں عمومی طور پر ایک طبعی رجحان یہ بھی پایا جاتا ہے کہ ایک ایشو پر جب عملاً ایک ہی رخ کی پالیسی کو تقویت مل جائے تو اس ایشو کے دیگر زاویوں سے کلی طور پر صرف نظر کر لیا جاتا ہے، بلکہ بعض اوقات کسی اور زاویے سے اس کا جائزہ یا اس کے حل کے لیے کوشش طبعی افتاد سے متصادم ہونے کی بنا پر سخت تنقید کا نشانہ بنتی ہے اور اسے عمومی ماحول سے خلاف پا کر ''سازش'' کا ٹائٹل بھی دے دیا جاتا ہے۔

افغان طالبان اور شمالی اتحاد کے مسئلے کے تناظر میں ہمارے دیوبندی مکتب فکر کی حد تک طالبان کی عسکری جدوجہد میں معاونت یا حمایت کے علاوہ کسی نئے حل کا سوچنا اس وقت کے معروضی حالات میں خاصا مشکل کام تھا بلکہ لوہے کے چنے چبانے کے مترادف تھا۔ پھر یہ جنگ ایسے موڑ میں داخل ہوگئی تھی جہاں افغان پختون بیلٹ کے ہر گھر سے کوئی نہ کوئی مقتول یا زخمی ضرور تھا، یہی حالت شمالی اتحاد کی جانب سے بھی تھی۔ ایسے حالات میں اس خطے کے روایتی تناظر میں گفت وشنید سے اس جنگ کا خاتمہ بظاہر ناممکن ہوگیا تھا اور اس حوالے سے مکمل مایوسی تھی۔

پھر بیرونی طاقتوں کا ایک ہدف شمالی اتحاد میں انٹی پاکستان فکر کی تشکیل تھی جسے اس نے بخوبی حاصل کر لیا تھا، شمالی اتحاد بزعم خود پاکستانی فوج اور اداروں سے نبرد آزما تھا، جب کہ افغان طالبان اور پاکستانی اہل علم شمالی اتحاد کو بھارت اور ایران کا پروردہ سمجھتے تھے، اور شمالی اتحاد سے پکڑے جانے والے بھارتی اور ایرانی ساختہ ہتھیار ان کے کھلے دلائل وشواہد تھے۔ اس طرح اس جنگ کا منظر نامہ مخصوص علاقائی واسانی پس منظر میں تشکیل پانے کے بجائے ایک بین الاقوامی ٹکراؤ کی صورت پیش کرنے لگا۔ ہمیں بخوبی یاد ہے کہ ہمارے دیار میں ''فارسی بان'' یا ''احمد شاہ مسعود'' نفرت کے استعارے بن گئے تھے، اور ان کا بالکلیہ خاتمہ ہی اسلامی انقلاب کا تتمہ سمجھا جانے لگا تھا۔ ان حالات میں اگر اس جنگ کے خاتمہ کی لیے جانبین کی اہمیت اور جغرافیائی حدود تسلیم کرتے ہوئے کوئی حل باوجود مشکل تر ہونے کے نکلتا بھی، تو اس دور کا مذہبی ذہن اسے باآسانی تسلیم کرنے پر تیار نہ ہوتا۔

لیکن اس کے باوجود حضرت الاستاذ کی یہ دیرینہ تمنا رہی کہ چونکہ شمالی اتحاد کی مرکزی قوت احمد شاہ مسعود ہے اور اس کا پس منظر کیمونسٹ یا سیکولر نہیں بلکہ مذہبی ہے اس لیے اس شخص کی صلاحیتوں سے مستفید ہونا چاہیے اور طالبان اور ان کی باہمی مقاومت کا کسی طور خاتمہ کرنا چاہیے۔ حضرت الاستاذ احمد شاہ مسعود کی صلاحیتوں کے معترف تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ اس خطے میں افغان حکومت کے استحکام کے لیے اس جیسا ماہر جرنیل اکثریتی افغان نمائندگی کا حصہ ہونا چاہیے اور اس کی طاقت ومہارت کو اپنوں کے بجائے دین دشمنوں کے مقابلے میں لگنا چاہیے۔

شاید اس سوچ کا محرک یہ بھی ہو کہ افغانستان میں امن وجنگ دونوں کے پاکستانی قبائل اور ان سے ملحقہ شہروں پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں، افغان جنگ کی چار دہائیوں میں ہمارے قبائل، پشاور، ہنگو، بنوں، کوئٹہ وغیرہ شہروں میں ان اثرات کا مشاہدہ کیا جاتا رہا ہے۔ پھر افغان طالبان سے پختون اور ایک درست اور معقول موقف کے ترجمان ہونے کے ناطے اس خطہ کی جو جذباتی وابستگی تھی اس نے جاں سپاری کی ایک نئی نفسیات تشکیل دی تھی، جسے اگر اعتدال پر نہ رکھا جاتا تو یہ نفسیات مستقبل میں غلط تحریک پر چڑھ کر اپنے گلی کوچوں کو میدان جنگ میں بدل سکتی تھی۔ الغرض ان حالات میں باہمی صلح کی کوشش اپنے خطے کو مستقل جنگی اثرات اور اپنی نئی نسل کی نفسیات میں

ایک نئے زاویے کے نمو کی کوشش تھی جسے حضرت الاستاذ کی دوررس نگاہیں ضروری خیال کررہی تھیں۔

حضرت الاستاذ نے اس سلسلے میں احمد شاہ مسعود سے رابطے کے لیے کسی سیاسی ذریعے کے بجائے مذہبی پس منظر کا سہارا لیا، احمد شاہ مسعود نے ترجمۂ قرآن حافظ الحدیث مولانا عبداللہ درخواستی رحمہ اللہ اور شیخ القرآن مولانا محمد طاہر پنج پیری رحمہ اللہ کے پاس پڑھا تھا، حضرت الاستاذ نے شیخ القرآنؒ کے حلقے کے ذریعے کوشش کی کہ احمد شاہ مسعود سے بات چیت ہو، دراصل یہ ذریعہ اس لیے زیادہ مؤثر تھا کہ سیاسی ذرائع میں مفاد وغرض کے چکر عموماً گفت وشنید کو غیر مؤثر کردیتے ہیں اور قانونی زاویوں سے بالاتر ہوکر سوچنے کا موقع نہیں دیتے۔ جب کہ دینی نسبت خصوصاً تلمذ کا رشتہ جذباتی وابستگی ہوتی ہے جس میں قانونی دائروں سے بالاتر ہوکر ایثار وہمدردی کی بنیاد پر بات آگے بڑھانا قدرے آسان رہتی ہے۔

حضرت الاستاذ نے اس سلسلے میں وزیر قبائل کے بھی دورے کیے، وہاں ہم مزاج اہل علم، مقتدر ارباب فکر اور ذی وجاہت شخصیات کو اپنا مدعا، اس کے ثمرات ونتائج اور طرز وطریق سے آگاہ کیا اور ان سے تعاون کی درخواست کی۔

ملک کے کئی اہم اہل علم خصوصاً مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہؒ اور مولانا حسن جانؒ سے بھی اس سلسلے میں مکاتبت و مشاورت ہوئی، جانبین کے ہاں مقبول افراد کو بھی ساتھ لینے کی کوشش کی گئی۔ غرض انسانی بساط تک جو کچھ ہوسکتا تھا، حضرت الاستاذ نے اس میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ لیکن افسوس کے جانبین سے ان حضرات کے طے شدہ فارمولے کو قبول کرنے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ ہوا اور صلح کی یہ کوشش دم توڑ گئی۔ اس کی بڑی وجہ اس وقت افغان طالبان کی انتہائی تیز ترین فتوحات تھیں، جس میں منظر نامہ سو فیصد ان کے حق میں ہموار نظر آرہا تھا اور ان کے ہاں صلح یا احمد شاہ مسعود کے تشخص کو باقی رکھ مسئلہ کا کوئی حل دشمن کی گرتی دیوار کو از خود سہارا دینے کے مترادف تھا۔

آج اس خطے کے نتائج ارباب فکر کے سامنے ہیں، اگر افغانستان کی اندرونی قوتوں کو ایک فکر پر مجتمع کرنے کے لیے تمام طبقات کی جانب سے سنجیدہ کوششیں ہوتیں، اور ان میں کامیابی حاصل ہوجاتی تو شاید بیرونی طاقتوں کو افغان عوام کی قسمت سے یوں کھیلنا آسان نہ ہوتا اور نہ ہی ہمارے قبائل تاریخ کے بدترین یورش سے گزرتے۔

حضرت الاستاذ کی دوررس نگاہیں اس آگ وخون کا مشاہدہ کررہی تھیں جو اس خطے کا مقدر ٹھہرا۔ انہیں ادراک تھا کہ افغانی عوام کے باہمی مسائل جنگ وجدال کی بجائے گفت وشنید سے حل ہونا اسلام، افغان قوم اور اس خطے کے مجموعی مفاد میں ہے اور اس سے پہلو تہی امت اور بالخصوص اس خطے کو کسی بڑے حادثے سے دوچار کرسکتی ہے۔ لیکن افسوس کہ ان کی تمنا برنہ آئی اور ان کے خدشات حقیقت کا روپ دھار کر رہے۔ قدر اللہ ما شاء۔

مالاکنڈ قبائل اور حکومتی تصادم کے روک تھام کی کوشش

سماج کی اولین ضرورت امن ہونے کے ناطے استاذ گرامی ملکی امن وامان اور ملکی سطح پر اہل اسلام کے اتحاد کے نہ صرف داعی تھے بلکہ اس کے قیام کے لیے بھی گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔

یقیناً ملک میں عدم اتحاد یا بدامنی کی فضا جہاں ملکی عدم استحکام کا باعث بنتی ہے وہاں معاشرتی شکست وریخت کی بنیادیں فراہم کرتی ہے اور سماج کو تہہ در تہہ الجھنوں کا شکار کر دیتی ہے۔ باہمی اعتماد، مشترکہ ترجیحات اور متفقہ مفادات بری طرح متاثر ہوتے ہیں، ہر ایک کا کردار مشکوک دکھائی دینے لگتا ہے اور نسل نو میں دفاعی نوعیت کی ایک ایسی حساسانہ نفسیات تشکیل پاتی ہے جس کے ہوتے ہوئے فکر ونظر کا بانجھ پن ہی ترقی پذیر رہتا ہے اور کئی مثبت جہات پر سوچنے کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

ملکی سطح پر کئی مواقع ایسے آئے جہاں آپ نے قیام امن اور بقائے اتحاد کے لیے اپنا کردار ادا کیا، بطور مثال ہم ۱۹۹۴ء میں مالاکنڈ تحریک اور حکومت کے مابین ٹکراؤ روکنے کے لیے آپ کی کوششوں کو پیش کر سکتے ہیں۔

موجودہ دور میں اپنے ہی خطوں میں تحریکات کے اندر عسکری طریق سے کامیابی پانے کا رجحان دراصل اس آمرانہ نفسیات کا شاخسانہ ہے جو عالمی طاقتوں کے رویوں سے عصر جدید کی ثقافت کا جز بنتا جا رہا ہے۔ اس سے دنیا کے مختلف طبقات متاثر ہوئے لیکن گزشتہ دو دہائیوں میں حیران کن طور پر ہمارا مذہبی طبقہ بھی اسی نفسیات کی زد میں آیا یا بزور لایا گیا ہے۔ ہمارے اکابر نے ریاستی جبر کے خلاف یا اپنے راست مطالبات منوانے کے لیے بھرپور تحریکات چلائیں، جانی ومالی قربانیاں بھی دیں لیکن عسکری ٹکراؤ کی پالیسی کو درست نہیں سمجھا، بلکہ اس کی حوصلہ شکنی کی۔

مالاکنڈ میں نفاذ شریعت کی تحریک اپنے بنیادی مطالبات کے اعتبار سے قابل قبول تھی لیکن مطالبات منوانے کے لیے جس ٹکراؤ کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی وہ کسی بھی اعتبار سے حوصلہ افزا نہیں تھی، اس کے منفی اثرات محض علاقائی نوعیت کے نہ ہوتے بلکہ پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لیتے، خصوصاً مذہبی طبقہ نفاذ شریعت کی کوششوں کے حوالے سے اپنی حکمت عملی کے کھوکھلے پن کا عملی ثبوت فراہم کرتا اور اس سے عوامی اعتماد مجروح ہونے کے ساتھ ساتھ بیرونی قوتوں کے دباؤ اور ملکی سطح پر مشکلات کا بڑھ جانا یقینی تھا۔

حضرت الاستاذ کی کوشش تھی کہ مالاکنڈ کے اہل تحریک کا چونکہ کسی صورت حکومتی اداروں سے ٹکراؤ مناسب نہیں اس لیے انھیں اپنی جدوجہد کا دائرہ غیر عسکری رکھنا چاہیے۔ اس سلسلے میں آپ نے مولانا سراج الدین (باڑہ،

پشاور) سے ملاقات کر کے اعتماد میں لیا۔ مولانا نصر اللہ اورکزئی (مدرس جامعہ تعلیم القرآن بڑھ عباس ہنگو) راوی ہیں کہ:

''میں باڑہ میں شیخ سراج الدین صاحب کے ہاں پڑھتا تھا، مولانا محمد امین اورکزئی صاحب اور مولانا عبداللہ صاحب (استاذ الحدیث مدرسہ مفتاح العلوم ہنگو) ساتھ تشریف لائے۔ شیخ سراج الدین صاحب کے ساتھ مشاورت کے بعد مجھے ایک خط دے کر مولانا محمد طیب پنج پیری صاحب کے پاس بھیجا، جس میں مولانا امین صاحب نے مولانا طیب صاحب کو پشاور آنے اور اس مسئلے میں مشاورت کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ میں نے خط مولانا طیب صاحب تک پہنچایا، جس پر وہ پشاور تشریف لائے، ان شیوخ کرام کی اس مسئلے پر طویل گفتگو ہوئی، اس زمانے میں مولانا طیب صاحب کے بھائی میجر عامر صاحب حاضر سروس تھے۔ مولانا امین صاحب کا مدعا یہ تھا، کہ مالاکنڈ کے اہل تحریک اشاعت التوحید سے متعلق ہیں، لہٰذا انہیں مولانا طیب صاحب ڈیل کر سکتے ہیں جب کہ دوسری طرف میجر عامر سیکورٹی اداروں کی طرف سے مصالحت کے لیے مضبوط کردار ادا کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اگر یہ گھرانہ اس مسئلے کو سنجیدہ لے تو اس سے نمٹنا آسان ہوگا اور ایک بڑے نقصان کا تدارک ہو جائے گا۔''

اس مسئلے میں حضرت الاستاذ کے مدعا کو کس قدر سمجھا گیا اور اسے کتنی اہمیت دی گئی، اس کی تفصیلات معلوم نہ ہو سکیں، تاہم ملکی سطح پر سماج کو عسکریت پسندانہ رویوں کے ذریعے خانہ جنگی کا شکار کرنے والے امزجہ کی بروقت اصلاح وروک تھام میں آپ کے فکر اور کردار کا ایک روشن پہلو سامنے آتا ہے۔

آپ کی حکمت عملی ہمیشہ یہ رہی کہ دینی قربانی کا مزاج رکھنے والے افراد اللہ تعالیٰ کی نعمت ہوا کرتے ہیں، لہٰذا اس قوت کو دین متین کے قوام کے لیے حکمت وبصیرت کے ساتھ نظریاتی طور پر استعمال کرنے کی ضرورت ہے، اور اسے محض جذباتی نعروں کے بھینٹ چڑھانا کسی طرح درست نہیں۔

قبائلی جنگوں کے خاتمے کے لیے کوششیں

قبائلی جنگیں اور دشمنیاں ہمارے خطے کا مستقل روگ ہے۔ معمولی باتوں پر جاہلیت قدیمہ کی مثل سال ہا سال جنگوں کے سلسلے فخر ومباہات اور غیرت وحمیت کا لازمہ سمجھے جاتے ہیں۔ قیمتی جانوں اور لاکھوں مالیت کے اسلحے کا ضیاع معمولی بات ہوتی ہے۔ حضرت الاستاذ ہمیشہ ان جاہلی لڑائیوں کے خاتمے کے لیے کوشاں رہے اور اسے انتہائی اہمیت دی۔ بیسیوں خاندانی لڑائیوں کا خاتمہ کر کے معاشرے اور سماج کو امن وامان کا گہوارا بنانے میں آپ کا کردار مثالی رہا۔

لڑائیوں کے خاتمے کے لیے جہاں آپ نے جرگوں کے ذریعے فریقین کے تنازعات ختم کرنے کے عمل کو تیزی بخشی، وہاں نسل نو میں اس کے خلاف شعور پیدا کرنے کی سعی کی، اپنے دروس اور خطبات کے ذریعے ان جنگوں کی شناعت، نقصانات، نئی نسل پر پڑنے والے اثرات بد، شرعی حرمت اور معاشرتی وسماجی تباہیوں کو کھول کھول کر بیان کیا، اہل علم کو اس حوالے سے کردار ادا کرنے پر آمادہ کیا اور اپنے مخصوص جغرافیائی حالات میں ان جنگوں کے خاتمہ کو اپنی بقا کا سبب باور کروایا۔

اس حوالے سے آپ کے کئی کارنامے گنوائے جا سکتے ہیں لیکن بطور مثال ہم ایک مشہور جنگ کے خاتمہ میں آپ کی کاوشوں کا ذکر کرتے ہیں۔ مولانا نصر اللہ اورکزئی راوی ہیں کہ:

''۱۹۹۲ء میں تیراہ اورکزئی قبائل کی دو قوموں علی خیل اور ماموزئی میں گھمسان کی جنگ چھڑ گئی، دونوں طرف سے قبائلی لشکر مورچہ زن ہو گئے، بھاری ہتھیاروں کے ذریعے ایک دوسرے کے ٹھکانوں کو نشانہ بنایا جانے لگا، ایک دوسرے کے علاقوں پر مسلح چڑھائی ہونے لگی، خواتین، بچے اور بوڑھے گھروں میں محصور ہو گئے، راستوں کا امن ختم ہو گیا، اشیائے خورد و نوش کی قلت اور بیماریوں کی افزائش ہونے لگی، غرض روزگار زندگی بری طرح متاثر ہو گیا اور اس لاحاصل جنگ میں کئی لوگ جان کی بازی ہار نے لگے۔

مختلف اقوام اور بااثر افراد کی طرف سے اس جنگ کے خاتمے کے لیے زور وشور سے کوششیں شروع ہوئیں کیونکہ سارا علاقہ اس سے متاثر تھا بلکہ بڑی حد تک اس کی زد میں تھا۔ لیکن کسی کی کوششیں بار آور نہ ہو سکیں، حتی کہ یہ جنگ ایک سال تک جاری رہی اور اپنی تباہیاں بکھیرتی رہی۔

حضرت الاستاذ اس جنگ کے خاتمے کے لیے سرگرم ہوئے، آپ نے علاقہ کے اہل علم، بااثر افراد اور سربراہان اقوام کو اعتماد میں لیا، فریقین سے بات چیت شروع ہوئی، دوران گفت وشنید سخت مراحل بھی آئے لیکن آپ اور حضرت مولانا عبداللہ صاحب کے عزم مصمم میں ذرا برابر فرق نہ آیا بالآخر طویل جدوجہد کے بعد فریقین کو گفت وشنید کے ذریعے مسائل حل کرنے پر راضی کر لیا گیا۔

خادیزئی اورکزئی ایجنسی میں تمام اقوام اورکزئی کا تاریخی اجتماع ہوا، جس میں حضرت الاستاذ اور مولانا عبداللہ صاحبؒ کی کوششوں سے دونوں قوموں کی طویل جنگ کا خاتمہ ہوا اور فریقین نے ایک دوسرے کو غیر مشروط طور پر معاف کر دیا۔

مولانا کہتے ہیں کہ اس مجلس صلح میں مولانا عبداللہ صاحب نے تاریخی گفتگو فرمائی تھی، جس میں سورہ آل عمران کی آیت "والکاظمین الغیظ......الخ" کے تحت غصہ دبانے، معاف کرنے اور اپنا حق چھوڑ کر احسان کرنے کے فضائل بیان فرمائے، جسے فریقین نے عملاً برتا۔''

حضرت الاستاذ کی حیات طیبہ ایسی بے شمار مساعی سے بھرپور ہے۔ جن کا احصاء نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی مقصود۔

مسلح تحریکیں اور قیام امن کے لیے آپ کی مساعی

ہمارے قبائلی خطے کو گزشتہ دہائی میں جس بدترین صورت حال کا سامنا کرنا پڑا وہ تاریخ کا ایک المناک باب ہے، یہاں جو عسکری تحریکیں شروع ہوئیں اور ان کا مدوجزر اس خطے کو جن تہہ در تہہ مسائل سے دوچار کر گیا اس پر کسی تبصرے کی حاجت نہیں۔

حضرت الاستاذ جیسی دانش ور شخصیت ان تحریکوں کے اسباب، حرکیات، فکر ونظر اور اثرات کے گہرے نبض شناس تھے، آپ جانتے تھے کہ سماج کی ابتری پر ان کے نہ ختم ہونے والے اثرات بد پڑیں گے اور ان کا مداوا کرنے کے لیے جس گہری فہم وفراست اور حکمت وتدبر کی ضرورت ہے خطہ کے ارباب اقتدار اس سے صرف ناآشنا ہی نہیں بلکہ ان خطوط پر سوچنے سے عاری ہیں۔ آپ نے قبائل کے اندر سیلاب کی طرح چلنے والے بدامنی وقتل وغارت گری کے اس ریلے کا حتی المقدور جو سدباب وتدارک کیا، وہ امن کی عالمی تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے۔ آپ نے اصل اسباب کی نشان دہی کی، انہیں دور کرنے کے لیے ایک تدریجی پالیسی دی اور سیاسی رہنماؤں کو اس طرف متوجہ کیا۔ خود ان کا دست وبازو بنے اور کئی ایک کامیاب امن معرکے سر کیے۔

امن امن کی رٹ لگانے والے بہت دیکھے سنے جاتے ہیں لیکن جب بات امن کے تقاضے برتنے کی آتی ہے تو اس کو روبہ عمل لانے میں اپنے مفاد وغرض اور خواہش وتمنا کو مقدم رکھا جاتا ہے۔ قیام امن کے لیے غیر جانب داری، اخلاص، عوامی مفادات کے تحفظ کا جذبہ، عبقریت فکر ونظر اور معاملہ فہمی کی جو قوت درکار ہوتی ہے عموماً قیادتیں اس سے محروم ہوتی ہیں، نتیجتاً قیام امن کے نام پر صلح وآشتی کی بجائے انارکی وفساد کا دروازہ مزید کھلتا جاتا ہے۔

مفتی عظمت اللہ صاحب (رئیس دارالافتاء، جامعہ یوسفیہ ہنگو) راوی ہیں:

> ''جب بالکل ابتدا میں وزیرستان اور اورکزئی ایجنسی میں کچھ لوگ عسکری رجحانات لے کر کھڑے ہوئے اور ''شرعی'' عدالتیں قائم کر کے لوگوں کے قضیے نمٹانا شروع کیے تو حضرت الاستاذ نے مجھے بلا کر فرمایا کہ آپ کا ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟! چونکہ اس وقت قبائل کا بڑا مسئلہ ڈاکوؤں کا تسلط اور بعض راستوں کی بندش تھی، اور وہ دونوں مسائل ان مسلح گروہوں نے حل کر لیے تھے، ڈاکوؤں کا بھی خاتمہ ہو چکا تھا اور راستے بھی کھل گئے تھے اس لیے میں نے عرض کیا کہ حضرت! فی الوقت تو ان کے نتائج مثبت ہیں۔ لیکن حضرت کو اس پر اطمینان اور تشفی نہ ہوئی اور وہ ان سے کسی بڑے خطرے کی بو محسوس کر رہے تھے، کچھ عرصے بعد اغوا اور قتل کی وارداتیں شروع ہوئیں تو آپ کے خدشات سو فیصد درست ثابت ہونے لگے، ان مواقع پر آپ نے کھل کر

اظہار فرمایا کہ یہ رویہ لوگوں کو اسلام سے متنفر کرے گا، اسلام کے نام پر ہونے والے ان کاموں کا اسلام سے تو در کنار انسانیت سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ انہی ایام میں حضرت الاستاذ نے یہ پیغام بھی ذمہ داروں تک پہنچایا (حالانکہ مسلح تحریکوں کو نصیحت اپنے موت کے پروانے پر دستخط کے مترادف تھا) کہ تم جس شاخ (پاکستان) پر بیٹھے ہوا سی کو کاٹ رہے ہو لہٰذا اس کا نتیجہ یہی نکلے گا کہ اگر یہ شاخ گرے گی تو تم بھی باقی نہیں رہو گے، پاکستان ہماری زمین ہے اور اپنی زمین کو آگ وخون کے دلدل میں دھکیلنا دنائت کے سوا کچھ نہیں۔ ایک دفعہ مجھ سے ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ اب مکمل خارجی فکر اپنا چکے ہیں، معمولی غلطی پر لوگوں کا قتل خارجیت ہے، خارجی گناہ کبیرہ کے مرتکب کو قابل گردن زنی سمجھتے تھے۔"

مولانا محمد یوسف صاحب راوی ہیں کہ:

"ایک دفعہ شاہو میں ایک شیعہ کو قتل کر کے اس کا گلہ کاٹ دیا گیا، اس پر آپ سخت مضطرب اور پریشان تھے، فرماتے تھے کہ اہل تشیع سے ہمارا نظریاتی اختلاف اپنی جگہ لیکن اس طرح کے اقدام کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں، یہ فساد ہے۔ جب قتل واغوا کے واقعات کا حد درجہ شیوع ہوا تو آپ نے ہنگو شہر میں تمام دینی جماعتوں اور سماجی طبقات کا اجلاس بلایا اور ایک متفقہ پالیسی تشکیل دینے کی کوشش کی لیکن اس خطے میں مسلح تحریکوں کے گہرے خوف کے باعث اس پر متفقہ پالیسی سامنے نہ آسکی۔ تاہم اس اجلاس میں آپ نے وضاحت سے اس کو "فتنة عمياء" (اندھا فتنہ) قرار دیا۔

ایک دفعہ شاہو میں دو سی پولیس اہل کاروں کو ذبح کیا گیا۔ راوی نے حضرت استاذ صاحب کو واقعہ سناتے ہوئے کہا کہ حضرت جس کو ذبح کیا جا رہا تھا وہ بھی تکبیر کا نعرہ بلند کر رہا تھا، اور ذبح کرنے والا بھی اللہ اکبر کہہ رہا تھا۔ ان میں سے ایک حافظ قرآن تھا، چہرے پر داڑھی تھی۔ اس کے جیب میں سے مسواک بھی برآمد ہوا، اس کی والدہ لاش لینے آئی تو جائے شہادت سے چمٹ کر روتی رہی اور وہاں سے اٹھنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ یہ سن کر آپ کی حالت غیر ہوگئی، رمضان کا مہینہ تھا، سخت گرمی کے روزے تھے، پریشانی کا یہ عالم تھا کہ صرف پانی سے افطار کیا اور غم کی شدت میں کھانا تک نہ کھا سکے۔ آپ کسی پر حکم لگاتے ہوئے حد درجہ احتیاط برتتے تھے لیکن اس دن فرمایا کہ اگر قاتل نے یہ ظلم ثواب کی نیت سے کیا ہو تو دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

ان گروہوں کے مذہبی استدلال کا تجزیہ کرتے ہوئے آپ فرماتے تھے، کہ ان کی بڑی فکری غلطی یہ ہے کہ انہوں نے کفار کی معاونت پر مسلم کی تکفیر وارتداد کا فیصلہ سنا دیا ہے اور اس بنیاد پر خروج کو درست سمجھ رہے ہیں، غیر متعلقین تک کو مار رہے ہیں اور تعصبات کو نشانہ بنا رہے ہیں حالانکہ موجودہ صورت میں فقہی تکییف کی رو سے ذمہ داروں کی بھی محض تفسیق ہوتی ہے نہ کہ تکفیر... اور فسق کی بنیاد پر کسی کا قتل جائز نہیں، فاسق

کے قتل کا موقف خارجیوں کا ہے، اہل السنۃ کبھی اس کے قائل نہیں رہے۔

جاوید ابراہیم پراچہ (سابق ایم این اے مسلم لیگ کوہاٹ) کا کہنا ہے کہ

''حضرت الاستاذ نے بارہا ان حالات پر ان سے تبادلہ خیال کیا، وہ ان سے سخت دل برداشتہ تھے اور اس عسکری لہر کو خالص شرعی جہاد کے خلاف ایک عالمگیر سازش، افغانستان میں سرگرم اتحادی فورسز کے تحفظ اور استحکام کی ایک کوشش اور پاکستان کے عدم استحکام، بدامنی، انارکی اور خانہ جنگی کی کڑی قرار دیتے تھے۔''

یہ اس دور کی بات ہے جب فورسز ابھی تک ان علاقوں میں نہیں آئی تھیں، پھر جب ان مسلح گروہوں اور فورسز کے درمیان تصادم شروع ہوا اور ہزاروں لوگ اپنے گھروں سے بے گھر ہونے لگے تو آپ کی تڑپ اور بے چینی دیکھی نہ جاتی، آپ ان خدشات کو حقیقت کا روپ دھارتے ہوئے دیکھ رہے تھے جو سالوں سے آپ کے ذہن میں منڈلا رہے تھے اور اہل وطن کی عاقبت نااندیشی کہ ان کے بھیانک نتائج سے بے پروا ہو کر ان کا شکار ہو رہے تھے۔

ان مسلح گروہوں کے بارے آپ کی فکر یہی تھی جو پیش کی گئی، یہ بات اس کی متقاضی تھی کہ آپ گوشہ نشین ہو کر بیٹھ جاتے اور اپنے آپ کو مامون کر لیتے، لیکن سماج کے تحفظ کا جذبہ تھا جس نے آپ کو چین لینے نہ دیا اور اس ناگفتہ بہ صورت حال میں بھی اپنی پوری توانائی قیام امن کے لیے صرف فرمادی۔ آپ نے آخری دم تک محنت کی کہ ان گروہوں اور حکومتی اداروں میں امن معاہدوں کی صورت استوار ہو، ان گروہوں کو پاک افغان بارڈر کے تحفظ کے لیے استعمال کیا جائے اور ان کی عسکری کارروائیوں کا رخ ملکی اداروں کی بجائے افغانستان میں اتحادی قوتوں اور انڈیا کے خلاف موڑ دیا جائے۔

ان امن معاہدات کے سلسلے میں آپ کی گراں قدر کوششیں مستقل تصنیف کی متقاضی ہیں، ذیل میں چند اہم امن معاہدات میں آپ کی کوشش و کردار کا مختصر تذکرہ پیش خدمت ہے، اسی سے طالبانائزیشن کے بارے میں آپ کے رویے اور ملک وملت کو اس کے اثرات سے محفوظ رکھنے میں آپ کے کردار کا اندازہ ہوگا۔

مسلح عسکری گروہوں کے وجود اور فکر کی بنیاد وزیرستان میں پاک فورسز اور نیک محمد کے گروہ کے درمیان جھڑپوں سے پڑی، حضرت الاستاذ کی دوررس نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ اگر اس موقع پر قبائل کے لوگوں اور فورسز کے درمیان جنگ بندی نہ ہوئی تو ملک وملت کے حق میں اس کے غیر معمولی برے نتائج نکلنے کے ساتھ ساتھ ایک مستقل مکتب فکر وجود پالے گا جو ٹکراؤ کی اس کیفیت کو جو افغانستان میں اتحادی افواج کے ناجائز اور ظالمانہ حملے کے نتیجے میں وقوع پذیر ہو چکا' یہاں اپلائی کرے گا، اس مکتب کا بنیادی فلسفہ یہی ہوگا کہ ہم سے ٹکرانے کے پاداش میں پاک فورسز امریکی معاون بن گئیں لہٰذا ان کے خلاف مسلح جدوجہد جہاد ہے۔

دوسری طرف ریاست اسے اپنے رٹ سے متصادم سمجھ کر کارروائی کرے گی یوں یہ آگ وزیرستان سے نکل کر پورے ملک کو لپیٹ میں لے لی گی اور یہ موہوم اور مفروض فکر حقیقت کا روپ دھار لی گی۔اس موڑ پر انتقام کی آگ وسائل جنگ کی یافت کے لیے اغوا ولوٹ مار کے فروغ کا سبب بنے گی۔معمولی غلطیوں پر جان لینے کے خارجی فکر کا نمو ہوگا۔بیرونی قوتوں کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے تیار میدان میسر آئے گا۔وہ اپنے ڈالر لگا کر پر امن دینی قوتوں کو اس نومولود فکر سے ختم کر کے دینی کاموں کے سد راہ کا مقصد حاصل کرے گا۔نتیجتاً ملک سیکولر قوتوں کی زد میں آکر اپنی اصل شناخت کھودے گا۔

دیکھنے والی آنکھ دیکھ لے کہ استاذ گرامی کے فکر کا کون سا جز یہ ہے جس کا وقوع نہ ہوا۔اس لیے استاذ محترم رحمہ اللہ نے اس ابتدائی ٹکراؤ ہی سے پیدا ہونے والی صورت حال میں اپنا کردار ادا کرنے کی سعی کی،آپ کا دونوں جانب کوئی پیشگی تعارف نہ تھا،بس اخلاص کی قوت تھی جو راستے کھولتی گئی۔وزیرستان میں موجود آپ کے تلامذہ کا وسیع حلقہ اور کچھ اہل دردسرکاری آفیسر اس کام کو آسان سے آسان تر بنا گئے اور بحمد اللہ طویل جدوجہد کے بعد فورسز اور نیک محمد میں امن معاہدہ کی راہیں ہموار ہوئیں۔وہ معاہدہ ہوا بھی،جن امن دشمن طاقتوں کو ہضم نہیں ہوا ان کی کوششوں سے ٹوٹا بھی......اور پھر اس کے نتائج بھی ہمیں دیکھنے پڑے لیکن اس سے یہ اندازہ ضرور لگائیں کہ ملک کے عبقری نظر وفکر کے حامل علما کی ترجیحات کیا تھیں اور اس کے لیے انہوں نے کیا سے کیا کوششیں کیں۔

حاجی گل جنان اورکزئی سماجی معاملات حضرت الاستاذ کے دست راست،معاون اور کئی اہم رازوں کے امین رہے۔وہ راوی ہیں کہ:

> ''میرے چچا علی محمد جان اورکزئی سابق کور کمانڈر پشاور جب خیبر پختون خوا کے گورنر بنے تو آپ نے پہلی پریس کانفرنس میں یہ بیان جاری کیا کہ ہم وزیرستان کو گلستان بنائیں گے۔ان کا یہ بیان پریس ریکارڈ میں موجود ہے۔اس سے امن کے لیے ان کے عزائم واضح ہوئے،انہوں نے مجھ سے رابطہ کیا کہ قبائل میں ایسی کون سی مؤثر شخصیت ہوگی جن سے قیام امن کے لیے تعاون لیا جائے،میں ذاتی طور پر حضرت مولانا محمد امین اورکزئی رحمہ اللہ سے واقف تھا،میرے بیٹے مولانا عارف نے جامعہ یوسفیہ میں حضرت کے ہاں تعلیم حاصل کی تھی۔میں نے عرض کیا کہ میری معلومات کی حد تک قبائل میں مولانا امین صاحب سے زیادہ دور اندیش،محب وطن اور مخلص شخصیت کوئی نہیں۔گورنر صاحب نے کہا کہ مولانا صاحب ہمارے ساتھ قیام امن کی کوششوں کے لیے راضی ہو جائیں گے؟میں نے کہا کہ میں ان سے بات کروں گا،مجھے پوری امید ہے کہ وہ اس میں دلچسپی لیں گے اور ہمارا ساتھ دیں گے۔

گورنر صاحب نے مجھے اپنی گاڑی دی کہ آپ مولانا صاحب کے پاس جا کر اس بابت بات چیت کریں۔ میں حضرت کے پاس حاضر ہوا اور اس خواہش کا اظہار کیا، آپ اس پر بہت خوش ہوئے اور قیام امن کو اپنی دیرینہ تمنا قرار دیا۔ گورنر صاحب سے اس بارے میں کئی ملاقاتیں ہوئیں، تفصیلی لائحہ عمل طے ہوا، بار ہا شمالی وزیرستان جانا ہوا، بالآخر حافظ گل بہادر اور حکومت کے درمیان امن معاہدہ طے ہو گیا۔ جس کی تفصیلات ملکی پریس کے ریکارڈ میں موجود ہیں، اس میں کئی رکاوٹیں پیش آئیں، تعجب خیز امر یہ تھا کہ بعض قوتیں حضرت کی کاوشوں سے اس معاہدہ کے انجام تک پہنچنے میں سدراہ بنی رہیں۔ حضرت نے گورنر صاحب کو یہ بھی باور کروایا کہ قبائل کے عام افراد کے تشخص کا خیال رکھنا از حد ضروری ہے تاکہ فضا مزید مکدر نہ ہو۔ اس سلسلے میں آپ نے عام آبادیوں میں قائم چیک پوسٹیں وغیرہ ختم کرنے کی سفارش کی، اور لوگوں میں اعتماد کی فضا بحال کرنے پر زور دیا، جس کا بڑی حد تک لحاظ رکھا گیا۔

حاجی صاحب کا کہنا ہے کہ انہی ایام میں آپ نے منگل باغ اور مولوی محبوب کے درمیان خیبر ایجنسی میں جاری خون ریز جنگ کے خاتمے کے لیے بھی کوششیں کیں، اور اس سلسلے میں گورنر صاحب کو کردار ادا کرنے پر آمادہ کیا۔ خیبر ایجنسی اور شمالی وزیرستان کے ساتھ ساتھ آپ نے جنوبی وزیرستان میں جاری کشیدگی ختم کرنے اور وہاں شمالی وزیرستان طرز کے امن معاہدے کے لیے بھی کافی تگ ودو کی۔ ان میں کئی ایک کوششیں وقتی طور پر بارآور ہوئیں، کئی کوششیں دیرپا ثابت ہوئیں، کئی ایک میں کسی فریق کی غیر سنجیدگی کامیابی سے مانع رہی۔

حاجی صاحب کا مزید کہنا ہے کہ اس ساری جدوجہد میں حکومت نے جن لوگوں کا تعاون لیا، ان کو بھاری رقوم دیں، تحفظ دیا اور ہر طرح کی سہولیات سے نوازا۔ میں گورنر کا بھتیجا ہونے کے ناطے یہ سب کچھ استاذ صاحب کے لیے حاصل کر سکتا تھا بلکہ خود گورنر صاحب کی خواہش تھی کہ استاذ صاحب اتنے آتے جاتے ہیں، ملکی وقومی خدمت میں مصروف ہیں، لہٰذا انھیں کوئی ہدیہ وغیرہ دینا چاہیے، لیکن واللہ کہ آپ نے کبھی ایک رتی قبول نہیں کی۔ بلکہ گورنر ہاؤس کا پانی تک پینا گوارا نہیں فرماتے تھے۔ گورنر صاحب نے کئی دفعہ کھانے اور رات ٹھہرنے پر اصرار کیا لیکن ہمیشہ ٹال دیتے اور میرے گھر آکر رات گزارتے، وہیں کھانا کھاتے۔ میں بار ہا مذاق میں کہہ دیتا کہ استاذ جی! میرے ہاں آپ کو دال انڈا کھانے پڑتے ہیں، اگر آپ گورنر ہاؤس رک جاتے تو ہم بھی آپ کے ساتھ کھاتے، آپ مسکرا کر فرماتے کہ حاجی صاحب! ہم مجبوراً ملک وقوم کے تحفظ کے لیے ان دروازوں کے چکر کاٹ رہے ہیں ورنہ ہمیں یہاں کیا لینا دینا، لہٰذا جب گفتگو کا مقصد پورا ہو تو ایک لمحہ بھی یہاں رکنا گوارا نہیں ہوتا، آپ کے حجرے میں آکر سکون ملتا ہے۔"

چونکہ قبائل میں تصادم کی فضا عالمی سازش کے تحت انتہائی منظم طور پر بن رہی تھی، اس لیے ایک فرد یا چند مخلصین کی کوششیں اس سیلاب کا راستہ روکنے کے لیے بظاہر نا کافی تھیں، تاہم آپ نے ڈٹ کر اپنا کردار ادا کیا اور اس سلسلے میں کسی خوف اور مصلحت کو آڑے آنے نہیں دیا۔ چونکہ عالمی طاقتوں کو ان خطوں کی بدامنی درکار تھی اس لیے حضرت الاستاذ کی مظلومانہ شہادت کا ایک محرک یہ بھی قرار دیا جاتا ہے کہ آپ کی شخصیت قبائل میں امن کی آخری نشانی تھی اور دشمن کو اس خطے میں امن کا یہ محور ہرگز برداشت نہ تھا۔

ہمارے ملکی تاریخ میں لال مسجد کا آپریشن ایک بدنما داغ ہے، معصوم بچیوں کو جس طرح جلا کر راکھ کیا گیا، یہ کالک ہمارے چہرے سے دھل نہ سکے گا، بے حسی و بے بسی کی ایک تصویر تھی جو رونما ہوئی، ایک ڈکٹیٹر کی انا کی تسکین کی خاطر مسجد و مدرسہ کے مقدس ماحول میں خون کی ہولی کھیلی گئی۔ اس واقعہ کے اسباب کیا تھے؟ کن کن پینتروں سے حالات کو اس گھمبیر موڑ پر لایا گیا کہ لاشیں گرانے کے سوا کوئی آپشن ہی باقی نہ بچا؟ کون تھا جو ان معصوموں کے ڈورے ہلا کر ان کے اخلاص سے کھیل رہا تھا اور انھیں اس بند گلی میں لا کھڑا کیا جہاں سے نکلنے کی کوئی راہ نہ تھی؟ یہ تشنہ سوالات ہیں جو شاید عرصہ تک راست اور درست تجزیے کے محتاج رہیں۔ مجھے صرف اس خون ریز واقعے سے قبل حضرت الاستاذ کے ایجابی کردار پر مختصر روشنی ڈالنی ہے، جو شاید اخفا کے باعث تاریخ کا بالکل نایاب ہوگا اور یہ اَن کہی داستان اس سے پہلے سوائے چند مخصوص لوگوں کے کسی کو معلوم نہ ہوگی۔

مولانا محمد یوسف اور مولانا عبدالستار راوی ہیں کہ:

> ''لال مسجد تنازع کے پہلے مرحلے میں علامۃ الناس، اہل علم اور سیاسی و سماجی رہنما مولانا عبدالعزیز اور غازی عبدالرشید شہیدؒ کے مطالبات کو پوری قوم کی آواز سمجھتے تھے لیکن اس کے لیے احتجاج سے آگے بڑھ کر ''جہاد'' کی جو پالیسی ترتیب دی گئی، وہ اپنے نتائج کے اعتبار سے ان مقاصد کے حصول کی بجائے ان کی راہ میں مزید رکاوٹیں پیدا کرنے والی تھی، اسی سلسلے میں تمام اکابر اہل علم کی خواہش رہی کہ ان مقاصد کے لیے پرامن احتجاج سے کام لیا جائے، لیکن اس تحریک کو ایسے موڑ پر لانا جہاں کشت وخون کے بجز کوئی دوسرا راستہ باقی نہ بچے، غالباً دشمن کی طے شدہ پالیسی تھی، اس لیے ایسے حالات پیدا کیے گئے کہ اکابر اہل علم کی ملاقات اور کوششوں کا کوئی ثمرہ برآمد نہ ہوسکا۔
>
> اس مرحلے پر حضرت الاستاذ نے کردار ادا کرنے کی کوشش کی، گورنر علی محمد جان اورکزئی اور ڈاکٹر گلاب جمال اورکزئی (ایم این اے اورکزئی ایجنسی) کی معاونت سے آفتاب احمد خان شیرپاؤ، اعجاز الحق اور سید کمال شاہ وغیرہ حضرات سے رابطے ہوئے، اتفاق سے یہ اکثر حضرات ہمارے خطے سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے

حضرت الاستاذ کی شخصیت کا قدرے اثر بھی ان پر تھا۔حضرت الاستاذ نے اسکے بعد مولانا عبدالعزیز صاحب سے ملاقات کی، اوران کا مدعا معلوم کیا اور معاملہ حل ہونے کے مرحلے میں ان سے فیصلے کا اختیار بھی لے لیا۔ پھر حضرت الاستاذ نے شیر پاؤ صاحب پر واضح کیا کہ آپ چونکہ جرگہ کے اصول سے اچھی طرح واقف ہیں اور خود یہی ثقافت رکھتے ہیں، اس لیے اگر آپ اس معاملے میں بے بس نہیں اور سنجیدگی سے اس کے حل کے لیے کوشاں ہیں تو جرگہ کو اختیار دینا پڑے گا۔گفت وشنید کے بعد ان کا مدعا بھی سامنے آگیا اور انھوں نے سنجیدگی کا مظاہرہ کر کے حضرت الاستاذ کو اختیار دینے پر رضامندی ظاہر کی۔

بات اس مرحلے پر پہنچ کر فیصلہ کن شکل اختیار کر گئی کہ کچھ خواتین کے ذریعے جامعہ حفصہ کا جائزہ لیا جائے گا اور کچھ سیکورٹی اہل کاروں سمیت لال مسجد کا سروے کر کے مسجد کے صحن میں متفقہ پریس کانفرنس کر لی جائے گی کہ ہم نے مسجد و مدرسہ کا آپریشن مکمل کر لیا ہے، ہمیں یہاں سے کوئی متنازعہ یا قابل گرفت مواد وافراد نہ مل سکے جب کہ لال مسجد کی انتظامیہ بھی اپنے قبضے وغیرہ واپس لے لی گی، اور عسکری طریق کی جو ترغیبات بیانات میں دی گئیں ان سے برأت کر لے گی۔حضرت الاستاذ کے اس فیصلے کو حکومتی فریق نے تسلیم کیا۔آپ یہ فیصلہ سنانے لال مسجد گئے تو غازی عبدالرشید شہید رحمہ اللہ بھی اس کے مندرجات پر راضی تھے، مولانا عبدالعزیز صاحب نے اپنے اہل رائے حضرات سے مشاورت کے لیے کچھ وقت لیا، مشاورت کے بعد وہ واپس آئے تو انھیں لفظ''آپریشن'' پر اعتراض تھا کہ جب پریس میں یہ لفظ جاری ہوگا تو اس سے ہماری مثبت کاوش کے دہشت گردی ہونے پر مہر ثبت ہو جائے گی اور ہمارے ادارے کی سخت بدنامی ہوگی، حالانکہ ہم تو برحق مطالبات لے کر کھڑے ہیں، لہٰذا ہمیں اپنے خلاف آپریشن کے لفظ کا استعمال کسی طرح قبول نہیں۔ حضرت الاستاذ نے یقین دہانی کرائی کہ آپریشن یا چھاپہ کے بجائے ان کا کوئی دوسرا متبادل شامل کر لیں گے، اور اس پر حکومتی فریق کو ان شاء اللہ راضی کر لیا جائے گا لیکن مولانا عبدالعزیز صاحب کے کچھ خدشات شاید ایسے تھے جن کے باعث وہ اس فیصلے کو ماننے پر راضی نہ ہو سکے۔

اس مرحلے پر حضرت الاستاذ کی حالت ایسی تھی، جیسے کسی کا بچہ آگ کی لپیٹ میں جا رہا ہو اور وہ اسے دیوانہ وار روکنے کی ناکام کوشش میں ہو، ظاہر ہے ایسے وقت میں جو بن پڑتا ہے انسان اپنی بساط کی حد تک کر گزرتا ہے، مولانا عبدالعزیز صاحب بھی انھیں اولاد کی طرح عزیز تھے اس لیے اس موقع پر آپ اپنی جلالی طبیعت پر قابو نہ پا سکے اور مولانا عبدالعزیز کو شاگرد ہونے کے ناطے کئی سخت باتیں کہہ دیں۔

غالباً مولانا عبدالعزیز کو وفور اخلاص اور غلبۂ حال میں ان حالات کی سنگینی کا ادراک نہیں ہو رہا تھا یا وہ اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کر چکے تھے جن کا ادراک حضرت الاستاذ کی دوررس نگاہیں کر رہی تھیں۔اس لیے وہ

بہرصورت انھیں ان حالات سے دو چار ہونے سے بچانا چاہتے تھے،لیکن مقدرات ٹلا نہیں کرتیں،اس معاملہ میں بھی تدبیریں اور تمنائیں دم توڑ گئیں اور یوں یہ کوشش ناکام ہوگئی۔یہ باہمی جنگ شروع ہونے سے پہلے کے بالکل آخری مذاکرات تھے،اس کے بعد گولی چلی،جنگ شروع ہوئی،دوران جنگ مذاکرات کا مشہور سلسلہ بھی حکومتی ہٹ دھرمی سے ناکام ہوا،حالانکہ غازی عبد الرشید شہید تمام ضروری مطالبات تسلیم کر چکے تھے۔بالآخر آپریشن ہوا اور وہ دردناک منظر دیکھنے کو ملا جو شاید ہی کبھی ذہنوں سے محو ہو سکے۔انا للہ وانا الیہ راجعون''

لال مسجد آپریشن ہی کی کھوکھ سے سوات،اورکزئی ایجنسی اور جنوبی وزیرستان کے سنگین حالات نے زور پکڑا اور مزید پیچیدگیوں نے جنم لیا۔حضرت الاستاذ ان حالات پر سخت رنجیدہ ودل برداشتہ تھے۔امراض اور بڑھاپے کے باوجود بھاگ دوڑ نے انھیں اعصابی طور پر سخت تھکن کا شکار کر دیا تھا۔جن خدشات کو سالوں پہلے بتاتے تھے وہ ان کے سامنے حقیقت کی شکل میں موجود تھے،انھیں ملک وملت کی یوں بے جا تباہی پر جو صدمہ تھا اس کیفیت کی ترجمانی سے الفاظ قاصر ہے۔مفتی عظمت اللہ صاحب راوی ہیں کہ اس موقع پر حضرت یہ فرمایا کرتے تھے کہ اب امن وآشتی کا بندھ خانہ جنگی کے سیلاب کی تاب نہ لاتے ہوئے ٹوٹ چکا ہے اور جب بندھ ٹوٹ جائے تو اس سیلاب کو ہاتھوں سے بنائے ہوئے کمزور منڈیر نہیں روک سکتے۔

مفتی صاحب کا کہنا ہے کہ ایک دن مجھے بلا کر فرمایا کہ دل ان ناگفتہ بہ حالات پر سخت صدمے سے دوچار ہے،دل چاہتا ہے کہ کہیں علاقے سے باہر چلا جاؤں۔وزیرستان میں دوست احباب تھے وہاں کے حالات بھی بدتر ہے،سوات میں مولانا فضل محمد صاحب ؒ کی اولاد کے پاس جانا ہوجاتا تھا لیکن سوات بھی آگ وخون میں کھیل رہا ہے۔اب کہاں جائیں،دل کرتا ہے کہ آپ کے گاؤں (غوریزئی کوہاٹ) چلے جائیں۔چونکہ موسم گرمی کا تھا اور مجھے اپنے گاؤں کی گرمی اور وسائل آرام کے فقدان میں حضرت کی تکلیف کا خدشہ تھا،اس لیے میں خاموش رہا۔اس کے کچھ ہی عرصہ بعد حالات اتنے خراب ہوئے کہ حضرت کی شہادت ہوگئی۔

ہنگو: شیعہ سنی کشیدگی ختم کرنیکے لیے آپ کی کوششیں

اورکزئی ایجنسی کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو شیعہ سنی کشیدگی یہاں کا قدیم قومی مسئلہ چلا آرہا ہے۔''ہسٹری آف سیدس'' کے مطابق اس علاقہ میں اول تفرقہ عہد جہانگیر میں پڑا،اس عہد میں سید میر اقول نامی ایک شخص نے' جو علاقہ ''کریز'' کا رہنے والا تھا' شیعہ مذہب قبول کیا اور اپنی کوششوں سے عبد العزیز خیل،بر محمد خیل،منی خیل اور سپائے اقوام کے لوگوں میں کئی حضرات کو شیعہ بنایا۔اس کے ردعمل میں عبد العزیز خیل قوم کی ایک شاخ کمال خیل کے ملک

تورخان نے میر اقول کو قتل کر دیا اور سیدوں کے ساتھ جنگ کر کے ان کو علاقہ سے جلاوطن کیا۔ یہ پہلا شیعہ سنی تصادم تھا جو عہد جہانگیر میں رونما ہوا۔

اہل تشیع سے زبانی گفتگو میں ان کا یہ مؤقف سامنے آیا ہے کہ اس خطے میں ان کا مسلک عہد غزنوی سے موجود ہے۔ کرم ایجنسی علاقہ کڑمان میں سید فخر عالم کا مقبرہ ہے، اہل تشیع اسے اپنا جد امجد سمجھتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ یہ محمود غزنویؒ کے داماد تھے۔ بندہ کو یہ بات تحریری طور پر نہ مل سکی کہ اہل تشیع کا حقیقی مؤقف اس حوالے سے کیا ہے۔ تاہم اخوند درویزہ باباؒ جو ہمارے دیار کی ایک بڑی روحانی شخصیت ہوگزری ہے، نے اپنی کتاب ''تذکرۃ الابرار والاشرار'' میں لکھا ہے کہ اورکزئی ایجنسی میں سید میر قاسم تیراہی نے اپنے کتوں پر صحابہ کرام کے نام رکھے تھے۔ اہل علاقہ نے ان سے مناظرہ کے لئے ہندوستان سے ملا شمس الدین کو بلایا، ملا صاحب کے ہاتھ پر میر قاسم توبہ تائب ہوا اور اپنی بیٹی کا نکاح ملا صاحب سے کرا کر انہیں مستقل اپنے پاس ٹھہرالیا۔ میر قاسم کی یہ بیٹی بدستور رفض پر قائم رہی لیکن تقیہ کر کے اپنے آپ کو خفیہ رکھا، اس نے اپنی اولاد کی تربیت بھی عقیدہ رفض پر کی اور بعد میں انہی کے ذریعے رفض کا شیوع ہوا۔

شاہ جہان نامہ کے مصنف صالح محمد کمبوہ نے بھی دور شاہ جہان کا ایک واقعہ لکھا ہے جس سے اس عہد میں ہمارے خطے کے اندر رفض کے اثرات کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے مطابق کوہاٹ سے ٹل تک کا علاقہ بنگش پایاں کہلاتا تھا جبکہ ٹل سے کرم ایجنسی تک کے خطے کو بنگش بالا کہا جاتا تھا۔ مغلیہ دور حکومت میں ان دونوں علاقوں کے لئے علیحدہ علیحدہ گورنر مقرر تھے جنہیں ''فوج دار'' کہا جاتا تھا۔ مصنف کے مطابق بنگش بالا کے فوج دار لشکر خان نے شیعہ مسلک قبول کر لیا تھا، عوامی شکایت پر بادشاہ نے انہیں گرفتار کروا کر قلعہ گوالیار میں بند کیا اور اس کی جگہ سعید خان کو فوج دار بنگش مقرر کیا گیا۔

جان بس ٹکر ۱۸۸۳ء میں کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر تھے، انہوں نے گزیٹیر کوہاٹ میں یہ رپورٹ لکھی ہے کہ بنگش پایاں کے علاقے سملزی بنگش اور استرزئی وغیرہ میں اٹھارویں صدی کے آخر میں شیعہ مذہب کا شیوع ہوا۔ اس سے قبل یہ علاقہ مکمل اہل سنت تھا۔ انہوں نے اس دور میں کوہاٹ سے ٹل تک کی کل آبادی ایک لاکھ اٹھاون ہزار ذکر کی ہے جس میں اہل تشیع کی تعداد دس ہزار بتلائی ہے۔

کوہاٹ کے ایک انگریز ڈپٹی کمشنر ایل وائٹ کنگ (۱۸۹۷ء) نے اپنی کتاب {country orakzai and clans} میں لکھا ہے کہ ۱۸۷۴ء میں اورکزئی ایجنسی میں پہلی بڑی شیعہ سنی جنگ ہوئی ہے۔ وائٹ کنگ کے مطابق اس دور میں ملا ولی اللہ نے اہل تشیع کے بارے میں تکفیر کا فتویٰ دیا تھا اور قومی سطح پر ان کے سماجی بائیکاٹ

کا اعلان کیا تھا۔ پھر ان کے پوتے اخونزادہ محمود خان اورکزئی کی قیادت میں ۱۹۲۶ء میں دوسری بڑی جنگ ہوئی ہے۔ محمود خان نے علاقہ میں اہل تشیع کی سرگرمیوں کو روکنے کے لئے اہل السنۃ فورس تشکیل دی تھی اور اہل تشیع کے ساتھ کچھ معاہدات بھی کیے تھے۔ اس مختصر جائزے سے ہمارے خطہ میں اہل تشیع کے ارتقا پر کسی قدر روشنی پڑتی ہے اور ساتھ اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ یہاں کے مخصوص قبائلی مزاج کے تحت ان دونوں گروہوں میں مسلح مقاومت کا سلسلہ بھی قدیم تر ہے۔ آغاز سے شیعہ سنی تصادم کے عوامل اس خطے میں مذہبی نہ تھے بلکہ قومی وقبائلی تھے، اس لیے اس زمانے میں جتنی بھی جنگیں ہوئیں وہ تمام تر قومی سطح پر لڑی گئیں اس میں دونوں اطراف کے خوانین پیش پیش تھے اور یہ کسی خاص جماعت یا تنظیم کا مسئلہ نہیں تھا۔

جہاں تک اہل علم کا تعلق ہے تو ان کا اہل تشیع کے ساتھ اختلاف کا تناظر ہمیشہ علمی رہا ہے، جس کا اظہار باہمی تحریری وتقریری مکالموں یا مناظروں کی صورت میں ہوتا رہا۔ ہمارے خطے کی تاریخ میں اس حوالے سے دو بڑے نام پیش کیے جا سکتے ہیں: ایک سلسلہ نقشبندیہ کے مشہور بزرگ حضرت حاجی بہادرؒ کا ... جن کی کاوشوں اور خاموش اصلاحی محنتوں سے ہمارا خطہ بڑی حد تک اثرات رفض سے محفوظ رہا۔ یہاں ایک دلچسپ بات نقل کرنا مناسب ہوگی، ایک بار بندہ کے شیخ ومربی حضرت حاجی ڈاکٹر فدا صاحب مدظلہ ہمارے ہاں کوہاٹ میں تشریف لائے تھے، انہوں نے کچھ دیر مراقب ہوکر بندہ سے فرمایا کہ کوہاٹ میں حاجی بہادر صاحب کے ورود نے رفض کے اثرات کو دور کیا ہے، وگرنہ یہ علاقہ ان کا گڑھ ہوتا۔ بندہ کو اندازہ ہوا کہ حضرت نے یہ بات کشف سے کہہ دی ہے، مجھے اس کے تاریخی ثبوت کی تلاش تھی، جب اس مضمون کے لیے مواد تلاشنے کی مہم جاری تھی، تو ہمارے خطے کی تاریخ پر گہری نظر رکھنے والے جناب تحسین اللہ خان صاحب کے ہاں بندہ کو حضرت حاجی بہادرؒ کے ایک فارسی مخطوط کا علم ہوا، جس میں حضرت کے دیگر افادات کے ساتھ رفض کے حوالے سے ان کی کاوشوں کا ذکر بالتفصیل موجود ہے۔

اس حوالے سے دوسرا نام مولانا غلام احمد بگش رحمہ اللہ کا ہے، یہ ۱۸۷۰ء میں ہنگو خوانین کے گھرانے میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۸ء میں وفات پائی، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، مولانا عبدالشکور لکھنویؒ اور مولانا ظہور احمد بگویؒ کے قریبی احباب میں سے تھے۔ ماہنامہ شمس الاسلام بھیرہ میں آپ کے علمی افادات مستقل چھپتے رہے ہیں، یہ وہ شخصیت ہے جنہوں نے قادیان جا کر مرزا کو چیلنج کیا اور مسجد حاجی بہادر کوہاٹ میں ۱۹۳۳ء میں قادیانیوں کو ایک کھلے عوامی مباحثے میں شکست سے دوچار کیا۔ اہل تشیع کے ساتھ بھی آپ کے کئی تحریری مکالمے ہوئے، جو افادات بگش کی شکل میں موجود ہیں۔

غرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ برصغیر کے دیگر خطوں کی طرح یہاں بھی شیعہ سنی اختلاف کا تناظر اہل علم کے مابین

علمی رہا ہے، اور اس کے پرتشدد ہونے میں مذہبی سے زیادہ قومی وسماجی عناصر کا دخل رہا ہے۔

اورکزئی ایجنسی سے اس کشیدگی کے اثرات ایرانی انقلاب کے بعد ہنگو میں سرایت کرنا شروع ہوئے، ۱۹۸۰ء میں پہلی بار سنی خوانین کے گھروں پر مسلح حملے ہوئے، امام بارگاہوں سے باقاعدہ اس جنگ میں شمولیت کے اعلانات کیے گئے اور سنی خوانین کی عورتوں کو باندیاں بنانے کی بات کی گئی۔ یہ جنگ رمضان کے مہینہ میں ہوئی جس میں گیارہ افراد شہید اور درجنوں زخمی ہوئے۔ اس پر اہل السنۃ نے بھی مسلح دفاعی پوزیشن اختیار کی اور حافظ فخر الاسلام کی قیادت میں سنی اتحاد وجود میں آیا۔ اس طرح ہنگو میں قومی سطح پر باقاعدہ کشیدگی کا آغاز ہوا۔

مارچ ۱۹۸۰ء میں حضرت الاستاذ جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی سے مستقل طور پر واپس اپنے علاقہ تشریف لائے، آپ کے ورود کے بعد چونکہ ہنگو میں شیعہ سنی تصادم کی بنیادیں پڑ چکی تھیں، اس لیے آپ نے اس نظریاتی اختلاف کو علمی بنیادوں پر رکھ کر اپنے مسلک ومذہب کے تحفظ پر زور دیا اور سنیت کو نظریاتی بنیادیں فراہم کیں، آپ کی فکر یہ تھی کہ علمی ونظریاتی سطح پر اختلاف رکھنے سے جہاں اپنے مسلک ومذہب کے بارے شعوری آگاہی ہوتی ہے وہاں اختلاف کا محض جذباتی تناظر باقی نہیں رہ پاتا، یوں اس تشدد پر بھی قابو پانا آسان ہو جاتا ہے جو علمی رویوں سے بے اعتنائی اور محض جذباتی روش سے وجود میں آتا ہے، اورکزئی ایجنسی اور ہنگو میں علمی لحاظ سے اس قدر سطحیت تھی کہ ایک دوسرے کے عقائد ونظریات کا گہرا ادراک تو درکنار اپنے مسلک ومشرب کا بھی واضح علم نہ تھا، خصوصاً اہل تشیع نے اپنی بقا جن رسومات سے وابستہ کر رکھی تھی اور پورے مذہب کا خاکہ چند رسومات اور تاریخی روایات کے تذکروں میں بند کر دیا تھا۔ ایسے حالات میں اختلافات کی بنیادیں عموماً علمی نہیں ہوتیں بلکہ قومی وسماجی حرکیات اور اپنا غالب تعصب ہی کشیدگی کا باعث بنتے ہیں۔ آپ نے اپنے اس موقف اور ایرانی انقلاب کے بعد اہل تشیع کے رویے اور مزاج میں پیدا ہونے والی جوہری تبدیلیوں کو ایران سے تشریف لانے والے شیعہ علما کے ایک وفد کے سامنے بھی بڑی تفصیل سے پیش کیا تھا جو ۱۹۸۱ء میں آپ سے ملاقات کے لئے چند مقامی اہل تشیع علما کے ساتھ آیا تھا اور انہیں اس طرف راغب کیا تھا کہ اس خطے میں مستقل امن کی سنجیدہ کوشش لازمی ہے، ورنہ مستقبل میں اس آگ پر قابو پانا ممکن نہ ہوگا۔

ہنگو میں دوسرا بڑا شیعہ سنی تصادم ۱۹۸۸ء کو جنرل ضیاء الحق کی شہادت کے موقع پر ہوا، اہل تشیع نے جنرل صاحب کے حادثے پر خوشی میں جشن کا انعقاد کیا تھا، اور سنی علاقہ میں خوشی کے جلوس نکالے تھے، دوسری طرف اہل السنۃ اپنے علاقے میں حادثے پر سوگ منا رہے تھے، دونوں جلوسوں میں خطرناک خونی تصادم میں کئی لوگ مارے گئے۔ اس تصادم پر استاذ صاحب کو فکر دامن گیر ہوئی کہ اگر یوں ہی بازاروں میں کھلے عام تصادم کی راہیں ہموار رہیں

توہنگو کے امن کو بڑا دھچکا لگ سکتا ہے۔

آپ نے سنی قوم میں نظریاتی وحدت پیدا کی اور اہل تشیع سے اختلاف کے علمی حدود سماجی رواداری کے دائروں کو قائم رکھتے ہوئے طے کیے۔آپ نے یہ فکر متعارف کی کہ از حد خود اہل تشیع کی دل آزاری یا تکلیف سے مکمل طور پر بچا جائے، اور ان کی جغرافیائی حیثیت تسلیم کرکے پرامن رہا جائے ،چونکہ عموماً اکثریت کو ایک نقطۂ نظر پر اکٹھا کرنا مشکل ہوتا ہے اس لیے ہمیشہ منظم اقلیت منتشر اکثریت پر حکمرانی کرتی ہے،لیکن آپ کا کمال تھا کہ آپ نے سنی قوم کو سنیت پر اکٹھا کیا اور ان کے مسلوب حقوق کی بازیابی اور حصولی کی کامیاب اور پرامن جنگ لڑی۔

۱۹۸۸ء کے بعد ۱۹۹۸ء تک کوئی قابل ذکر کشیدگی رونما نہیں ہوئی اور دونوں فریق خطے میں تقریباً پرامن رہے، لیکن اہل تشیع کی طرف سے بعض ایسے عوامل مستقل طور پر ارتقا پذیر رہے جن سے خطے میں امن کی غیر یقینی صورت حال پیدا ہوسکتی تھی، ان میں سنی علاقوں کے اندر مستقل طور پر ماتمی اور جشن نوروز کے جلوس، متنازعہ چاکنگ اور جلوسوں میں صحابہ کرام پر کھلے عام تبرا جیسے امور خصوصی طور پر شامل تھے۔

چونکہ اس زمانے میں افغانستان کے اندر ایک اسلامی حکومت قائم ہوگئی تھی اور افغان مجاہدین کے خلاف پاکستان کے ازلی دشمن اور انڈیا نواز شمالی اتحاد کی حمایت وپشت پناہی پر ایران کے منفی کردار کا چہرہ پریس کے کھلے فورمز پر بالکل عیاں ہوچکا تھا۔اسی طرح بامیان ،فاریاب اور مزار شریف میں سنیوں کے قتل عام سے بھی فضا مکدر تھی ۔اس کے ساتھ ساتھ ملک میں تحفظ ناموس صحابہ کی تحریک بھی زوروں پر تھی ،اس لیے فطری طور پر سنی شیعہ آبادیوں میں عدم اعتماد اور رواداری کے فقدان کا تاثر پنپ رہا تھا۔ہنگو اور اورکزئی ایجنسی کی پون صدی سے زیادہ تاریخ باہمی جنگوں اور کشیدگیوں سے بھرپور تھی ،اس لیے یہ خطرہ پھر سے سر اٹھانے لگا کہ امن کا طویل دورانیہ جو حضرت الاستاذ کی کاوشوں سے استحکام پاچکا تھا کہیں پھر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہ ہو۔

یہ خدشہ اس وقت حقیقت بن گیا جب ۱۹۹۸ء رمضان المبارک میں جمعۃ الوداع کے موقع پر اہل تشیع اور اہل السنۃ کے دو جلوسوں کا باہمی تصادم ہوگیا،اس کی وجہ یہ بنی کہ اہل تشیع کا جلوس حکومت کی طے کردہ حدود پار کرکے سنی علاقے میں آگیا جس پر باہم گالی گلوچ ،ہاتھا پائی، گولی اور پھر باقاعدہ مورچہ زن ہوکر جنگ تک نوبت پہنچ گئی۔

اس جنگ سے حضرت الاستاذ کی دوررس نگاہوں نے یہ سبق اخذ کیا کہ خطۂ ہنگو میں مستقل امن کے قیام اور فریقین کی جانی مالی حفاظت کا واحد طریق یہی ہے کہ کشیدگی کے اسباب کا گہرا تجزیہ کرکے انھیں مستقل بنیادوں پر حل کرنے کی کوشش کی جائے اور حکومت کو یہ باور کرا کر عملی اقدامات کے لیے دباؤ ڈالا جائے۔اس مقصد کے لیے آپ نے سنی سپریم کونسل کی بنیاد رکھی جو اہل السنۃ کی طرف سے قیام امن کے لیے حکومت کے ساتھ متفقہ اقدامات پر

تعاون اور خطے میں سنی حقوق کے استحصال کو روکنے کا منشور لے کر اٹھی۔

سنی سپریم کونسل میں تمام مذہبی، سماجی و سیاسی سنی تنظیموں کے ۷۵ سے رہنما شامل تھے اور یہ سنی قوم کی نمائندہ تنظیم تھی۔ اس کے بنیادی اہداف درج ذیل تھے:

۱۔ ہنگو اور مضافات میں شیعہ سنی تناؤ کا خاتمہ اور قیام امن

۲۔ سنیوں کے سیاسی حقوق کے حصول کی جدوجہد

۳۔ قومی وسماجی مسائل کے حل میں دلچسپی اور حکومت سے اس بابت تعاون

۴۔ انتخابی سیاست سے بالکلیہ آزاد رہ کر محض سماجی ومعاشرتی خدمت

۵۔ تمام امور میں اہل علم کی سرپرستی اور مشاورت سے اہداف کا تعین

اہداف کے تناظر میں دیکھا جائے تو سنی سپریم کونسل ایک غیر سیاسی، غیر انتخابی جماعت تھی جس کی قیادت اہل علم کے ہاتھ میں ہونا ضروری قرار پائی تھی اور اس کا بنیادی مقصد امن کے قیام کے لیے کوشش اور انتظامیہ سے تعاون تھا۔ ابتداءً حضرت الاستاذ نے حکومت کو درج ذیل اقدامات کا مشورہ دیا تھا، جسے بڑی حد تک سراہا گیا اور ہنگو میں امن کے لیے ایک اہم پیش رفت قرار دیا گیا:

۱۔ نقص امن کے اسباب پر غور وخوض کر کے مستقل بنیادوں پر ان کا تدارک کیا جائے۔

۲۔ فریقین کو طے شدہ فیصلوں پر عمل درآمد کی سختی سے تلقین کی جائے۔

۳۔ شیعہ سنی تنازعات پیش آنے کی صورت میں ان کے تصفیہ کے لیے حکومت متفقہ بااختیار قبائلی جرگہ تشکیل دے، جو ان تنازعات کا جائزہ لے کر تحقیق کے بعد فیصلہ کرے، از خود اور بلا تحقیق کسی فریق کو کارروائی کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔

۴۔ ملک دشمن عناصر کی امن کے خلاف جاری سازشوں اور ملکی حالات کی دگرگوں صورت حال کے پیش نظر ماتمی جلوسوں کو امام بارگاہوں یا اہل تشیع کے اپنے علاقوں تک محدود کیا جائے۔ سنی علاقوں میں ان جلوسوں کا داخلہ اور نعرے بازی نقص امن اور اشتعال کا سبب بنتا ہے۔

۵۔ جشن نوروز جو اہل تشیع کی طرف سے صرف ہنگو میں سنی علاقوں کے اندر منایا جاتا ہے، اس سے اہل تشیع بھی محفوظ نہیں ہوتے اور امن کی صورت حال بھی مخدوش رہتی ہے لہٰذا اسے سنی آبادی سے منتقل کیا جائے۔

۶۔ اذان میں شہادت ثالثہ کا اضافہ جو خود اہل تشیع کے ہاں اتفاقی مسئلہ نہیں، سنی عقیدے پر براہ راست وار اور خلیفۃ الرسول حضرت ابوبکر صدیقؓ کی توہین ہے، لہٰذا اکثریتی سنی آبادی کے عقائد کا احترام کرتے ہوئے لاؤڈ اسپیکر

پر اس کا اعلان بند کر دیا جائے۔

حکومت نے ان تجاویز کا خیر مقدم کیا اور ماتمی جلوس کو محدود اور نوروز کی مجلس کو سنی آبادی سے منتقل کر دیا۔لیکن اس کے باوجود اگلے سال حکومتی پابندیوں کی یک طرفہ خلاف ورزی سامنے آئی ،اس موقع پر شیعہ سنی تصادم کا خطرہ ایک دفعہ پھر منڈلایا، تاہم حضرت الاستاذ کی بصیرت نے معاملات کو قابو میں رکھا اور بحمد اللہ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا، اس پر حضرت الاستاذ نے حکومتی اداروں کو ایک تنبیہی خط بھیجا جس میں حکومتی پابندیوں کی یک طرفہ پامالی سے حالات کے خراب ہونے کا خدشہ ظاہر کیا گیا اور حکومتی رٹ کے قیام پر زور دیا گیا، اس سلسلے میں انتظامیہ سے ملاقات کے لیے ایک وفد بھیجا جس میں ہنگو کے افسران کے نام درج ذیل پیغام تھا:

''جناب عالی اہل سنت سپریم کونسل ہنگو کا یہ نمائندہ وفد آپ کا اور جملہ صوبائی، ڈویژنل، ضلعی اور مقامی انتظامیہ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے کہ آپ کے مخلصانہ مساعی سے ہمارے علاقہ میں امن قائم ہوا، ہماری دعا بھی ہے اور خواہش بھی کہ یہ امن پائیدار اور مستقل ہو، بدقسمتی سے بعض عناصر امن کی اس فضا کو پسند نہیں کرتے ان کی مذموم کوششوں کا ایک نمونہ عریضہ ہذا کے ساتھ منسلک ہے اور جناب اگر موقع عنایت فرمائیں تو چند مزید حقائق عرض خدمت کریں گے، اجتماعی امن اجتماعی کوششوں اور تمام متعلقہ فریقوں کے تعاون سے ہی ممکن ہوتا ہے۔''

(اس کے بعد محولہ بالا تحریر پیش کی گئی:)

اہل السنۃ والجماعۃ کا یہ نمائندہ وفد جناب کی توجہ چند ضروری اور اہم معاملات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہے، اور علاقہ کے لیے آپ کی مخلصانہ ودیانت دارانہ مساعی کا اعتراف اور شکریہ ادا کرتے توقع رکھتا ہے کہ آپ ان معروضات کے بارے میں تسلی بخش کارروائی فرمائیں گے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجا کرتی، ہم نے اپنے برادران وطن اہل تشیع حضرات کے ساتھ ہر موقع پر انتہائی رواداری سے کام لیا اور ان کی تکلیف ودل آزاری سے بچنے کی کوشش کی مگر ان حضرات نے ہمیشہ ہماری رواداری سے ناجائز فائدہ اٹھایا، ہماری پختہ رائے ہے کہ ملکی اور بین الاقوامی حالات کے تناظر میں یہ یک طرفہ سلسلہ زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکے گا۔

گزشتہ سال (۱۹۹۸ء کے فسادات مراد ہیں، از: مرتب) کے افسوسناک واقعات کے بعد ہم نے اپنے اور اپنے نوجوانوں کے جذبات کو دبا کر ان حضرات کو محرم الحرام کے ناجائز رسومات کو ان کے حسب منشا ادا کرنے دیا اور پھر ربیع الاول میں اپنے جلوس کو ختم کر کے جلسہ بھی ان کے حدود سے بالکل دور منعقد کیا۔ ہمیں توقع تھی کہ یہ حضرات بھی ہوش وتدبر سے کام لے کر امن کی طرف قدم بڑھائیں گے، مگر امسال محرم کے موقع پر انہوں

نے نہ صرف اپنی شرپسندی کی روایت کو برقرار رکھا بلکہ اس میں کچھ اضافہ ہی کر دیا۔

۱۔ مین روڈ کو سابقہ قانونی اجازت کے مطابق آدھا گھنٹہ کے بجائے تین چار گھنٹوں تک بند کیے رکھا۔

۲۔ پہلی مرتبہ چوک پر جلوس روک کر نئی مفسدانہ حرکت کی اور فساد کا بیج بویا۔

۳۔ فریقین کے درمیان طے شدہ فیصلہ تھا کہ کوئی فریق ''مردہ باد'' وغیرہ شرانگیز نعرے نہیں لگائے گا لیکن اس کی پوری پوری خلاف ورزی کی اور بہادر باندہ کے قریب خطرناک حد تک حالات نازک ہو گئے۔

۴۔ دوسرے علاقوں سے اپنے جلوس بڑھانے کے لیے لوگ درآمد کیے گئے، جب کہ ان علاقوں میں ان کی امام بارگاہیں ہیں اور مجالس منعقد ہوتی ہیں۔

۵۔ ''چشمہ'' میں جس کے متصل نیچے اہل السنۃ کی کئی مساجد ہیں نوجوانان اہل السنۃ کو مشتعل کرنے کی کوشش کی گئی۔

ہم پوری سنی قوم کی طرف سے ان باتوں پر اپنی تشویش اور ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے اہل تشیع سے باز پرس کا حق محفوظ رکھتے ہیں اور واضح کرتے ہیں کہ آئندہ کے لیے اس قسم کی حرکات ناقابل برداشت ہوں گی اور ذمہ داری ان حرکات کے مرتکبین پر ہوگی۔

اس کے ساتھ ساتھ ہم حکومت وقت سے بھی درخواست کرتے ہیں کہ پولیس اور ملیشیا خود سے مقرر کی جائے اسے کسی ایک فریق کی من مانی پر مقرر نہ کیا جائے اس کے عواقب سنگین ہو سکتے ہیں۔''

اس خط سے جہاں فریق مخالف کے لیے خیرخواہی، امن کے قیام کے لیے بے چینی و تڑپ اور مفسد عناصر کی نشان دہی ہوتی ہے، وہاں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آپ نے سنی اکثریت کے تشخص اور حقوق کی بالادستی کا تصور بھی قائم رکھا، اس پر کسی قسم کی آنچ آنے نہیں دی اور اس میں کسی خوف، تساہل یا مصلحت کوشی کو نہیں برتا۔ یہ آپ کی جرأت و بسالت کا ایک نمایاں نمونہ ہے۔

خط کشیدہ عبارت بھی قابل غور ہے، اس وقت وسط ایشیا سمیت مختلف ممالک میں شیعہ سنی تصادم کی جس بدترین صورت حال سے امت مسلمہ دوچار ہے، وطن خداداد کو اس سے محفوظ کرنے کے لیے ۹۹ء میں یہ بات کی جارہی ہے کہ فرقہ وارانہ عناصر کا کڑا احتساب نہ ہوا تو ملکی و بین الاقوامی حالات کے تناظر میں یک طرفہ امن کی خواہش پوری نہ ہو سکے گی، کیا ہی بصیرت تھی اور کیا ہی دقت نظر!!!

الغرض حضرت الاستاذ کی کوشش یہی رہی کہ فریقین ہنگو کے امن میں سنجیدگی کا مظاہرہ کریں، اور حکومتی پابندیوں کو پوری طرح قائم رکھیں۔

حضرت نے شیعہ سنی تصادم کے گہرے تجزیے کے بعد اس رخ پر زیادہ ترکیز رکھی کہ ان کا اختلاط کم سے کم ہو،

اس سلسلہ میں ایک اہم مسئلہ روزمرہ آمدورفت کے لیے مشترکہ روڈوں کا استعمال تھا۔ ہنگو میں رونما فسادات کے اندر شاہراہوں کے اشتراک کے مسائل بنیادی نوعیت کے تھے۔ عموماً روڈوں پر غیر مناسب رویے، بے عزتی، چاٹنگ یا معمولی تو تو میں میں سے مسلح تصادم تک نوبت پہنچ آتی۔ حضرت الاستاذ نے اہل السنۃ کی ایسی تمام شاہراہوں کو جو شیعہ آبادیوں سے گزرتی تھیں' کاٹ کر سنی آبادی سے گزارنے کی منصوبہ بندی کی اور پھر طویل جدوجہد کے بعد اپنی مدد آپ کی تحت اسے عملی جامہ پہنایا، تاکہ باہم اختلاط سے نقص امن کے آئے روز خدشات کو کم سے کم کیا جاسکے۔ حضرت الاستاذ کی سماجی خدمات میں تنہا یہ کارنامہ اس اہمیت کا حامل ہے جس پر ہنگو کے عوام کی رہتی نسلیں آپ کی ممنون احسان رہیں گی۔

(۱)..... ان شاہراہوں میں اولین..... اورکزئی ایجنسی کی مرکزی شاہراہ ہے جو اکثر شیعہ آبادی سے ہوکر گزرتی ہے، اس کو'' کلایہ روڈ'' کہا جاتا ہے، اس روڈ پر عموماً باہمی فسادات کی نوبت آتی جو پورے خطے کو لپیٹ میں لے لیتے۔ حضرت الاستاذ نے اورکزئی کے اہل السنۃ آبادی کے لیے مشتی میلہ سے ڈبوری تک'' اسلامی روڈ'' کے نام سے نئی شاہراہ بنائی اور یہ طے ہوا کہ اس پر اہل تشیع آمدورفت نہیں رکھیں گے تاکہ باہم تصادم کی نوبت نہ آئے۔

(۲)..... کلایہ روڈ کو استعمال کرنے والی اہل السنۃ کی ایک کثیر آبادی آفریدی خاندانوں کی بھی تھی۔ آفریدی قوم کے اعتبار سے اورکزئی نہ تھے لیکن اہل السنۃ ہونے کی وجہ سے عموماً اہل تشیع کے ساتھ تصادم میں اورکزئی قبائل کے حلیف سمجھے جاتے تھے۔ کلایہ روڈ پر اہل السنۃ کی عام آمدورفت کی بندش سے یہ بالکل تنہا ہو گئے تھے، اور ان کے مسائل مزید بڑھ گئے تھے۔ حضرت الاستاذ نے ان کے لیے اُبلن کوہاٹ کی طرف سے ایک نئی شاہراہ بنائی جو شیعہ آبادیوں سے ہٹ کر تھی، اسے'' خازے روڈ'' کہا جاتا ہے۔ یوں ان کو بھی تصادم کے خطرے سے نکال باہر کیا۔

(۳)..... اہل السنۃ اورکزئی کی اقوام'' شیخان'' اور'' مشتی'' کی کثیر آبادی کی شاہراہ اہل تشیع کے دو بڑے گاؤں '' کچی'' اور'' لودھی خیل'' سے ہوکر گزرتی ہے، اس کا نام'' کچی روڈ'' ہے۔ ان دو علاقوں پر آمدورفت میں کافی تصادم ہوئے۔ آوازیں کسنے، گاڑیوں کو نقصان پہنچانے، بے عزتی اور بے حرمتی تک کے واقعات ہوئے۔ جس سے یہ شاہراہ مشترکہ آمدورفت کے لیے بالکل موزوں نہیں تھی، بلکہ بدامنی کا گڑھ تھی۔ حضرت الاستاذ نے یہاں کی اہل السنۃ آبادی کے لیے متبادل'' بیگوتنگی'' شاہراہ بنوائی جو سنی آبادی سے ہوکر گزرتی ہے۔

(۴)..... '' شاہو خیل'' نامی علاقہ سے جہاں کی اکثریتی آبادی اہل السنۃ اورکزئی اقوام کی ہے،'' رئیسان'' نامی علاقے تک جو شیعہ آبادی پر مشتمل ہے،'' رئیسانور روڈ'' کے نام سے ایک شاہراہ گزرتی ہے، اس پر بھی مشترکہ آمدورفت کے باعث نقص امن کا خطرہ رہتا تھا، حضرت الاستاذ نے اہل السنۃ آبادی کے لیے سنی علاقوں سے گزرتی

ہوئی ایک نئی شاہراہ ''شیخان باندہ روڈ'' کے نام سے بنوائی، یہ بھی اپنی مدد آپ کے تحت تھی۔ آج کل حکومت نے اس روڈ کی توسیع کر کے اسے پختہ کر دیا ہے اور اس کا نام حضرت مولانا عبداللہ اور حضرت الاستاذ کی طرف منسوب کر کے ''شاہراہِ شیخین'' رکھ دیا ہے۔

(۵) ......ان شاہراہوں میں اہل السنۃ واہل تشیع کی طویل مشترکہ شاہراہ کوہاٹ تا ہنگو روڈ ہے جو افغانستان تک جاتی ہے۔ اس روڈ پر کوہاٹ اور ہنگو کے مابین تقریباً ۲۰ کلومیٹر آبادی اہل تشیع کی ہے۔ اس وقت یہ شاہراہ پرامن طور پر مشترکہ استعمال ہو رہی ہے لیکن ماضی میں کئی مواقع پر یہاں مسلح تصادم ہوئے اور مہینوں یہ شاہراہ عام ٹریفک کے لیے بند رہی۔ ہنگو اور بالائی اضلاع کے اہل السنۃ واہل تشیع کی اس مشترکہ شاہراہ پر امن وامان ہنگو کے امن امان کے لیے کلیدی حیثیت رکھتا ہے، حضرت الاستاذ کی کوشش یہ تھی کہ اس شاہراہ پر فریقین کی مشترکہ آمد ورفت کے نتیجے میں نقص امن کے خطرات سے مستقل خلاصی کے لیے اہل السنۃ کے واسطے سنی آبادی سے گزرتی ہوئی علیحدہ شاہراہ بنوائی جائے، اس کے لیے آپ ۱۹۹۶ء سے سرگرم رہے، مختلف سیاسی رہنماؤں سے اس کی منظوری کے لیے تگ و دو کی، اہل خیر اور سماجی رہنماؤں کو اس جانب متوجہ کیا، لیکن اس کی عملی شکل نہ بن سکی۔

بالآخر ۲۰۰۶ء میں یہاں ایک دلخراش واقعہ پیش آیا کہ حج سے آنے والے چند سنی حضرات کو زندہ جلا دیا گیا اور عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔ ظلم کے اس بھیانک فعل نے آپ کو جھنجھوڑ کر دیا اس واقعہ کی وجہ سے شاہراہ بند ہوگئی، اہل السنۃ کے لئے سخت مصیبت کے ایام تھے، ان کی چھ سو دکانیں بھی انہی ایام میں ہنگو بازار کے اندر جلائی گئی تھیں، کوہاٹ تک آمد ورفت خصوصاً مریضوں کو لے جانے میں سخت دقت تھی، سیاسی حلقے اور حکومت علیحدہ شاہراہ بنانے کے لئے سنجیدہ نہ تھے۔ اس پر آپ نے یہ حیران کن عزم کیا کہ یہ شاہراہ خود تعمیر کرنی ہے۔

کوہاٹ کی جانب متبادل راستہ ''سماری'' نامی گاؤں سے ممکن تھا، لیکن اس پر ۱۳ کلومیٹر دشوار گزار پہاڑی سلسلہ تھا۔ بہرحال آپ کے عزم مصمم کے سامنے یہ پہاڑ بھی پگھل گئے، یہ آپ کی زندہ کرامت تھی کہ اس پہاڑی حصہ پر محض دو دن میں روڈ بن گیا۔ اس علاقہ کے سنگلاخ پہاڑوں کو دیکھنے والے دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں کہ یہ محیر العقول کارنامہ اتنی کم مدت میں کیسے پایہ تکمیل پہنچا۔ یہ حضرت الاستاذ کی دیرینہ تمنا تھی جو پوری ہوئی۔ اس شاہراہ کی تعمیر اپنی مدد آپ کے تحت شروع کی گئی، اللہ تعالیٰ کی خاص نصرت ومدد، ہنگو عوام کے جوش وجذبہ اور حضرت الاستاذ پر اعتماد کا ثمرہ تھا کہ جو کام حکومتیں سالوں میں نہیں کر پاتیں وہ ان فقراء نے دنوں میں کر دکھایا۔

مولانا محمد یوسف اس شاہراہ کی تعمیر کا حال سناتے ہوئے کہتے ہیں:

''حضرت الاستاذ نے مجھے رات کو طلب کر کے کہا: یوسف! کل روڈ کی تعمیر شروع کرنی ہے، میں حیران

تھا کہ کیسے شروع کرنی ہے؟ کیا ایسے سنگلاخ پہاڑوں اور گھنے جنگلوں میں روڈ ہاتھوں سے بنتے ہیں؟ لیکن حضرت الاستاذ کے سامنے کچھ کہنے کی جرأت تو نہ تھی، ہاں اتنا عرض کیا کہ حضرت زور کی بارش ہو رہی ہے اگر کل بھی بارش کا سلسلہ یوں ہی رہا تو کام کیسے ہوگا؟ فرمایا: یہ بارش کل کا موسم ٹھیک کرنے کے لیے ہے۔ فضا خوشگوار ہوگی اور زمین نرم۔

حضرت نے میری یاداشت کے مطابق کبھی کسی اہم سے اہم کام کے لئے بھی طلبہ کے سبق کا ناغہ نہیں کرایا لیکن اس دن مجھ سے فرمایا کہ کل سارے اساتذہ اور بڑے طلبہ ساتھ چلیں گے، اس لئے درس کی چھٹی ہوگی۔ صبح بارش بدستور جاری تھی، آپ نے گھر سے کدالیں، بیلچے، کلہاڑیاں اور ضروری سامان اٹھوایا اور اساتذہ اور طلبہ کو لے کر چل پڑے، مولانا عبداللہ صاحب رحمہ اللہ کو بھی ساتھ لے لیا۔ جس جگہ سے شاہراہ بنانے کا آغاز کرنا تھا، وہاں ایک چھوٹی سی مسجد تھی، جب ہم مسجد کے پاس اترے تو بارش رک گئی، مولانا عبداللہ صاحب کو اتارا گیا، دونوں اکابر اور طلبہ نے نفلیں پڑھیں، پھر طلبہ سے حضرت نے ختم قرآن کروا کر مولانا عبداللہ صاحب سے دعا کروائی، مولانا کو ذکر ومراقبہ کے لئے مسجد میں چھوڑا اور خود کدال ہاتھ میں لے کر بسم اللہ کر دی۔ طلبہ نے قریبی مسجدوں میں اعلانات کئے کہ حضرات شیخین خود تشریف لائے ہیں، لہٰذا شاہراہ کی تعمیر کے لئے لوگ گھروں سے کدالیں، بیلچے اور کلہاڑیاں لے کر نکل آئیں۔ یہ اعلانات جنگل کی آگ کی طرح پھیلے۔ صرف ایک گھنٹے کے اندر جم غفیر کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ حضرت استاذ صاحب ہجوم سے آگے آگے اپنے ذہن میں طے کردہ نقشہ کے مطابق چونا ڈالتے جاتے تھے اور لوگوں کا ہجوم اس راہ کے درختوں کو کاٹتا، چٹانوں کو توڑتا اور کدالوں، بیلچوں سے راہ ہموار کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا، دشوار جگہوں کو ہموار کرنے کے لئے چند ٹریکٹر بھی پہنچ گئے تھے۔ دوپہر تک قریباً دس ہزار کا مجمع اکٹھا ہوگیا تھا، جس میں بوڑھے، جوان سب شامل تھے۔ دو فقیروں نے پچاس طلبہ کو لے کر کدال کیا چلائی تھی کہ مخلوق خدا ٹوٹ پڑی۔ سخت چٹانیں، مسلسل چڑھائی، دشوارگزار بل کھاتی گھاٹیاں اور درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ اپنا راستہ چھوڑ رہے تھے۔ میرے ذمے کھانے کا انتظام تھا، دس ہزار افراد کو کھانا کھلانا بس میں کہاں تھا؟ چودہ دیگ چاول بمشکل پکانے اور آن واحد میں ختم ہو گئے۔ گھروں سے ماؤں، بہنوں نے کھانے پکا کر بھیجنا شروع کر دیے، جتنا کھانا آتا، لوگ پہاڑی دروں میں اور درختوں تلے بیٹھ کر کھاتے جاتے۔

دوپہر تک شاہراہ پہاڑ کی چوٹی تک پہنچ گئی، اس جگہ کو ہموار کرنے میں کافی مجاہدہ لگا، ایک سخت چٹان حائل تھی، جس نے جوانوں کو پسینہ پسینہ کر دیا تھا، تکبیر کے نعروں میں جب اسے توڑا گیا اور اس پر ساتھیوں نے گاڑی چڑھانی چاہی تو حضرت نے روک لیا کہ اس مقام مفتوح پر پہلے قدم حضرت الاستاذ مولانا عبداللہ صاحب کے

پڑنے چاہئیں، حضرت کو لایا گیا اور پہلے وہ مقام حضرت نے عبور کیا۔

میں نے دیکھا کہ حضرت استاذ صاحب گرد آلود چہرے اور کپڑوں کے ساتھ زمین پر ایک درخت سے ٹیک لگائے اکڑوں بیٹھے ستا رہے تھے۔ اس دوران ہنگو کے ضلع ناظم غنی الرحمن مرحوم اور دیگر کئی سیاسی رہنما آئے، غنی الرحمن نے حضرت کی گود میں ایک لاکھ روپے کا بنڈل نیازمندانہ انداز سے رکھا، لوگوں نے دیکھا تو پیسوں کی بارش ہوگئی۔ گھروں سے خواتین سونے کے زیورات بھیجنا شروع ہوگئیں، شام تک کوئی ۶۵ لاکھ روپے شاہراہ کے واسطے جمع ہوگئے۔ جس میں سات لاکھ سے کچھ زائد خواتین کے زیورات تھے۔ جب حضرات شیخین نے عزم کیا تو سارے سیاسی اور سماجی حلقے پہنچ گئے، میڈیا والے بھی مکھیوں کی طرح امڈ آئے۔ بہت سے سیاسی رہنما نمائشی کدالیں لے کر مارتے تاکہ ایک تصویر بن جائے، حضرات شیخین نہ میڈیا کے کیمروں کے سامنے آئے نہ اس میں دلچسپی ظاہر کی۔ بحمد اللہ دوسرے دن شاہراہ مکمل ہوگئی۔ جو کچھ تھوڑا بہت کام رہ گیا تھا وہ اقوام پر تقسیم کر دیا گیا کہ باری باری کرتے جائیں۔

بعد میں ایم ایم اے دور میں حضرت الاستاذ نے کافی بھاگ دوڑ کر کے اسے پختہ کرانے کی منظوری کروائی، حکومتی انجینئر زآئے، پھر نئے سرے سے نقشہ بنا جو بڑی حد تک استاذ صاحب کے نقشہ کے مطابق تھا اور اب یہ شاہراہ ایک اہم متبادل کے طور پر موجود ہے۔''

آپ نے اہل تشیع کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اور ان کے متقادمانہ رقابت کو کم کرنے کے لیے اس روڈ کا نام ''شاہراہ حسن ابن علی رضی اللہ عنہ'' تجویز فرمایا۔ یہ شاہراہ کشیدگی کے دوران سالوں اہل السنۃ کے لیے متبادل کا کام دیتی رہی اور افغانستان تک کی اہل السنۃ آبادی کے لیے کوہاٹ سے جڑنے اور اپنی ضروریات پورا کرنے کا واحد آسان ذریعہ رہی۔

بات کچھ لمبی ہوگئی، میرا مدعا فقط اتنا تھا کہ حضرت الاستاذ اہل السنۃ و اہل تشیع کی کشیدگی کا ایک بڑا سبب مشترکہ راستوں کا استعمال بھی سمجھتے تھے، آپ اس کے سدباب لیے عملاً کوشاں رہے اور سماج کو محفوظ رکھنے کے لیے ازخود اہم اقدامات کرنے سے دریغ نہیں کیا۔

بہر حال ۱۹۹۸ء کے تصادم کے بعد استاذ گرامی کی پالیسی کا رخ زیادہ تر ان اسباب کے خاتمے کی طرف رہا جو مسلح لشکر کشیوں کا باعث بنتے رہے۔

۲۰۰۱ء میں نامعلوم دہشت گردوں کی فائرنگ سے چند شیعہ قتل ہوئے، یہ قابل مذمت واقعہ تھا۔ طے شدہ معاہدات کے رو سے اگر اہل تشیع اپنا مجرم کسی سنی کو گردانتے بھی تھے، تو مشترکہ جرگہ کے ذریعے اس کی تفتیش اور مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کا پر امن آپشن موجود تھا، لیکن اس مرحلے پر بھی سنی املاک کے جلاؤ گھیراؤ اور بازار

میں نتیجے سنی مزدوروں پر فائرنگ سے جنگ چھیڑ دی گئی۔ راقم السطور اس وقت جامعہ یوسفیہ ہنگو میں زیر تعلیم تھا، عیدالاضحیٰ کے لیے ہماری تعطیلات کا اعلان ہوا لیکن ہمارے نکلنے سے قبل ہی جنگ کی اطلاع آگئی۔ اس موقع پر ہم نے حضرت الاستاذ کا مثالی تدبر اور ضبط اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔ آپ نے کسی استاذ وطالب علم کو مدرسے سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں، خود برستی گولیوں میں ہنگو شہر جا کر امن مذاکرات کی کوشش میں لگ گئے۔ آپ کی شخصیت کا اثر تھا کہ اس موقعہ پر اہل السنۃ کی طرف سے دفاعی جنگ بھی نہ ہونے دی اور دوسرے دن ہی جنگ بندی اور حکومت سے متفقہ جرگہ تشکیل دے کر معاملہ کے تصفیہ کی سفارش کی۔

ان جنگوں سے مہینوں عدم اعتماد کی فضا رہتی، مجھے خوب یاد ہے کہ ہم نے طویل پہاڑی راستوں سے کچھ پیدل اور کچھ گاڑیوں کے ذریعے سنی آبادیوں سے ہوتے ہوئے ۴۰ منٹ کے کوہاٹ کا سفر ۵ گھنٹوں میں طے کیا۔ اور جب عیدالاضحیٰ کی تعطیلات ختم ہوئیں تو عام شاہراہ کھلنے کے باوجود ہنگو شہر کی غیر یقینی صورت حال کے باعث ہنگو شہر جانے کی بجائے شہر سے پہلے اتر کر پہاڑوں پر مدرسے تک کئی گھنٹے کا پر مشقت راستہ پیدل طے کیا۔

اس کے بعد ۲۰۰۶ء میں ہنگو شہر میں محرم الحرام کے ماتمی جلوس میں خودکش دھماکہ ہوا، جس میں کئی لوگ مارے گئے، یہ بھی امن دشمن عناصر کی کارروائی تھی جس کی ہر معقول شخص نے مذمت کی، اس وقت یہ خطہ شوریدہ حالات سے گزر رہا تھا، اور خودکش حملوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو چکا تھا، جس پر ہر محب وطن کی پریشانی یقینی تھی، تقریباً تمام محب وطن عناصر اس پر متفق تھے کہ اس قسم کی کارروائیاں دراصل یہاں فرقہ وارانہ فسادات کو ہوا دینے کے لیے دشمن کی ایک کوشش ہے جس کا مقابلہ مسلکی اختلافات کے دائرے سے بالاتر ہو کر خالص ملکی وملی مفاد میں سوچنے اور اتفاق واتحاد کو قائم رکھنے سے ہی کیا جاسکتا ہے۔ اس مرحلے پر ضرورت تھی کہ ہنگو کے امن کو برقرار رکھنے کے لیے حوصلہ وتدبر سے کام لیا جاتا اور امن دشمن عناصر کا مشترکہ مقابلہ کرنے کی کوشش کی جاتی، لیکن حسب سابق اس واقعے کے انتقام میں عام اہل السنۃ نشانہ بنے۔ اہل السنۃ کا ایک کلومیٹر سے زیادہ مکمل بازار جلا کر راکھ کر دیا گیا، کروڑوں کی املاک نذر آتش کی گئیں، کوہاٹ کی طرف سے آنے والے تجاج کو زندہ جلا دیا گیا اور قتل وغارت گری کا مکروہ کھیل شروع ہو گیا۔ اس جنگ کے بعد برسوں شیعہ سنی اعتماد بحال نہ ہو سکا۔ حضرت الاستاذ نے اس موقع پر بھی یہی دہائی دی کہ عالمی وملکی حالات کے تناظر میں اب کھلے عام جلوسوں کو امن دشمن عناصر کے دست برد سے بچانا مشکل ہے لہٰذا ہنگو کے اہل تشیع امن کی خاطر اپنی مجالس کو اپنے علاقوں اور امام بارگاہوں تک محدود کر لیں۔ تاکہ اس مخدوش صورت حال کا تدارک کیا جاسکے اور باہمی فسادات سے بچا جا سکے۔ لیکن افسوس کہ اس جانب مطلق توجہ نہ دی گئی۔

اس جنگ کے بعد آپ کی زیادہ تر کیز اس جانب ہوئی کہ اب اہل السنۃ کی جانوں اور اموال کو فریق مخالف اور امن دشمن عناصر کے دست برد سے زیادہ سے زیادہ محفوظ بنانے کی سعی کی جائے۔اس کے لیے آپ نے بائیکاٹ یعنی سماجی مقاطعہ کی پالیسی تشکیل دی۔ اگر اہل السنۃ اس پالیسی پر عمل پیرا ہوتے تو بغیر کسی تصادم اور بغیر گولی چلے انہیں امن کا پروانہ مل سکتا تھا، جیسا کہ گزر چکا کہ ساری روڈ کی تعمیر بھی اسی مقاطعہ کی ایک کڑی تھی۔لیکن ایک تو جلد ہی استاذ صاحب رحمہ اللہ کی شہادت کا افسوس ناک واقعہ پیش آیا، دوسرا خطے میں حکومت مخالف مسلح تحریکوں نے امن شکنی میں رہی سہی کسر پوری کردی۔ان کے اثرات سے حفاظت کے لیے آپ کے مساعی کا دائرہ زیادہ تر ادھر پھیل گیا، جس کے باعث مقاطعہ کی پالیسی پر اہل السنۃ کی بڑی آبادی کو نہ لایا جاسکا۔

دینی حلقوں کے اتحاد اور مؤثر سماجی کردار کے لیے آپ کی کوششیں

سماج میں دینی مزاج کی تشکیل اور مؤثر کام کے لیے دینی حلقوں کا باہمی اتحاد محتاج بیان نہیں، حضرت الاستاذ معاشرے میں سرگرم مختلف شعبہ ہائے دین سے وابستہ جماعتوں کو ایک لڑی میں پرونے کے قائل تھے۔حضرت بنوری علیہ الرحمۃ کے زمانے سے ہی آپ کی یہی فکر رہی۔ان کی وفات کے بعد آپ کی کوشش رہی کہ ساری جماعتیں اور تحریکات حضرت مولانا احمد الرحمنؒ کو امیر منتخب کرلیں۔آخری زمانے آپ کی یہ خواہش خواجہ خواجگان مولانا خان محمد صاحبؒ سے متعلق رہی۔اس فکر کا بنیادی محرک یہ تھا کہ معاشرے میں ہمہ جہت دینی محنتوں کی مربوط شکل دیرپا اثرات چھوڑنے کے ساتھ ساتھ عملی تنوع کے باوجود وحدت فکر بخشتی ہے اور جو قوم عملی تنوع اور ہمہ جہت دینی کاوشوں کے باوجود وحدت سے آراستہ ہو اور پھر وہ عددی اکثریت بھی رکھتی ہو تو اسے معاشرے کے دلوں پر حکمرانی اور اپنے فکر ودعوت کے بھرپور اور منظم ارتقا سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔جب اکثریت ایک وحدت میں آ کر سمٹتی ہے تو وہ اپنا مقصد وجود پالیتی ہے۔لیکن ہمارے ہاں قیادتوں سے لے کر عوامی سطح تک معمولی نوعیت کے مزاج وترجیحات کا اختلاف بھی تفریق اور تشتت کا باعث بنتا ہے اور دینی حلقوں میں یہ نفسیات روز افزوں ہے۔اس لیے باہمی اتحاد کا یہ خواب وقتی اور ہنگامی نوعیت کے اضطراری اکٹھ سے آگے اس سطح تک نہ بڑھ سکا جو حضرت الاستاذ کا منشا تھا۔

دینی جماعتوں کی باہمی رقابتوں کو ختم کرنے کی آپ عمر بھر سعی فرماتے رہے۔کوشش رکھی کہ اپنے اپنے دائرے میں کام کرنے کے باوجود تحابب وتناصر کا رویہ باقی رہے۔اس سلسلے میں جہاں ایسے اسباب وعناصر دکھائی دیے جو امت بننے کے لیے نقصان دہ ہوں، ذمہ داروں کو اس کی نشان دہی کی اور شفقت ورأفت ان کے سد باب کی طرف متوجہ کیا۔تبلیغی جماعت، جہادی وسیاسی تنظیموں اور مسلکی کام کرنے والی جماعتوں سب کی آپ نے اس حوالے سے فکر

رکھی۔ آپ کے مجموعۂ مکاتیب سے آپ کی زندگی کا یہ پہلو بخوبی واضح ہوتا ہے۔

جب مفتی محمودؒ کی وفات کے بعد جمعیت علمائے اسلام دھڑے بندی کا شکار ہوئی، تو ملک کے مقتدر علما نے مولانا سمیع الحق اور مولانا فضل الرحمن کے درمیان صلح کے لئے کافی تگ و دو کی۔ حضرت الاستاذ چونکہ جمعیت سے وابستہ تھے اور اس اختلاف پر سخت نالاں تھے اس لئے آپ نے دونوں دھڑوں میں اتحاد کے لئے بھرپور سعی کی اور اس سعی کی ناکامی پر جمعیت سے عملاً علیحدگی اختیار کر کے کنارہ کش ہو گئے۔

اس دھڑا بندی سے جہاں اور نقصانات سامنے آئے وہاں حضرت الاستاذ کی نظر میں جمعیت کے بنیادی فکر سے بھی انحراف کیا گیا، آپ کا کہنا تھا کہ جمعیت دینی سیاسی جماعت تھی اس میں مذہب و مسلک مقدم اور سیاست ثانوی حیثیت رکھتی تھی۔ لیکن اس دھڑا بندی کے بعد پہلی تبدیلی یہ رونما ہوئی کہ فکر و مزاج میں سیاست کو مذہب و مسلک پر اولیت دے دی گئی، اس کا اثر عملی سیاست پر پڑا اور رفتہ رفتہ اہل باطل کی طرف جھکاؤ بڑھتا گیا۔

مولانا عزیز الرحمن مروت کے نام ایک مکتوب میں جمعیت کے دھڑوں میں اتحاد کے لئے اپنی مساعی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انہی دنوں میں مولانا فضل الرحمن صاحب بھی کوہاٹ کے دورہ پر آئے ہوئے تھے، میرا تو علیحدگی میں ملنے کا ارادہ تھا مگر حالات نامساعد تھے، ایک وفد کی صورت میں جس میں حضرت الاستاذ (یعنی مولانا عبداللہ صاحب) زید مجدہم، حضرت مفتی صاحب (مفتی مختار الدین صاحب) جناب میاں صاحب زرگری، اخوند زادہ محمد صدیق صاحب کاہی، مولانا محمد رفیق صاحب اور یہ ناچیز شامل تھے، ہنگو میں مختصری ملاقات ہوئی، دوران گفتگو کچھ لوگ اور بھی تھے، سوء اتفاق سے یہ کوشش ناکام رہی، مہمان کی حیثیت سے وہ زیادہ بااختیار تھے اور خلاف توقع ان کا رویہ بھی نامناسب رہا .... خیر بہرحال ہم مایوس نہیں ہوئے، کوہاٹ گئے، مغرب کے بعد پھر ملاقات ہوئی، یہ ملاقات نسبتاً اچھی رہی اور امید کی کچھ کرن دکھائی دینے لگی۔ تاہم ذاتی طور پر فقیر جو کچھ چاہتا ہے اس کی امید کم دکھائی دے رہی ہے۔''

جمعیت کے دھڑوں کا غیر دیوبندی پلیٹ فارم پر اتحاد و اجتماع بھی آپ کو گوارا نہ تھا اور اسے اپنے ٹھیٹھ سیاسی مقصد کے لئے سم قاتل سمجھتے تھے، آپ کا فلسفہ اتحاد کس نوعیت کا تھا؟ اس پر آپ نے مولانا سمیع الحق کے نام ایک یادگار مکتوب لکھا ہے جو اس نمبر کے حصہ مکاتیب میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ اس میں دیوبندی مکتب کی تمام جماعتوں کے مؤثر اتحاد کا فارمولہ اور طریقہ کار بھی پیش کیا گیا ہے۔

جمعیت کے غیر دیوبندی طبقات کی طرف میلان کا رونا روتے ہوئے ایک مکتوب میں رقم طراز ہیں:

''موجودہ صورت حال سے میں تو اس لئے زیادہ پریشان ہوں کہ ایک گروپ کے ذہن میں لادین عناصر سے نفرت ختم ہوئی بلکہ ان سے ایک گونہ الفت پیدا ہوئی ہے، حضرت مفتی صاحبؒ کی یاد منانے کی محفل میں ملتان کی جن شخصیتوں نے حصہ لیا اس سے اس حقیقت کی غمازی ہوئی ہے۔ جبکہ دوسرا گروپ مودودیت سے گلے ملنے لگا ہے۔ متحدہ تنظیمیں بن رہی ہیں۔ کیا یہ جمعیت کے مرحوم ہونے کی دلیل نہیں؟ میں نے بہت سوچا اس کے سوا کوئی حل نظر نہیں آرہا کہ جمعیت کو یوم تاسیس کی طرح پھر مذہبی سیاسی جماعت بنائیں، یعنی پالیسیوں کا محور مذہب ہو سیاست کو ثانوی حیثیت حاصل ہو، اس طرح جمعیت زندہ ہو سکتی ہے اور زندہ رہ سکتی ہے۔ آئندہ جمعیت کسی سے اتحاد نہ کرے صرف تعاون کرے۔''

آپ نے اشاعۃ التوحید والسنۃ کے ایک مرکزی ذمہ دار کے پاس باقاعدہ تشریف لے جا کر انہیں اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ آپ کے کام کا عنوان ''توحید'' کا فروغ اور ''شرک وبدعت'' کا استیصال ہے، یہ ایک مقدس محنت ہے، اس کے پوری طرح بارآور ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آپ اپنے کارکنوں کو اس کام کے فروغ کے لیے تبلیغی جماعت کی عوام کو شفقت ومحبت سے مائل کرنے کی پالیسی پر گامزن کریں۔ اس سلسلے میں ان کی تربیت، معتدل مزاج کی تشکیل اور اسلوب دعوت کی تصحیح کا کام انتہائی ضروری ہے، اس سے آپ لوگوں کی محنت رنگ لائے گی۔ اگر اس کام کو محض تردیدی جوش وجذبے سے کیا جائے تو اس کے مؤثر نتائج کم نکلیں گے بلکہ اس سے نوجوان اہل علم میں علمی وعملی تشدد کی راہ کھلے گی اور تفرقہ، تشتت اور فکری پراگندگی کے مظاہر سامنے آئیں گے، عملی تشدد کے نتیجے میں باہمی جنگ وجدل تک کا دروازہ کھل سکتا ہے۔ جوامت کے حق میں کسی طرح مناسب نہیں۔

آپ نے مولانا علی شیر حیدریؒ اور مولانا اعظم طارقؒ کو اس جانب متوجہ کیا کہ ناموس صحابہ کی تحریک کی بھرپور قربانیوں کا ثمرہ تب ہاتھ آئے جب نوجوانوں کو محض تردیدی اور جذباتی مزاج سے نکال کر علمی وتحقیقی سطح پر تیار کیا جائے۔ اس سے سنجیدہ فکری ارتقا کے ساتھ ساتھ جذباتیت سے پیدا ہونے والے مسائل اور محدود معلومات ومطالعہ کے باعث اپنے لوگوں کے ساتھ رقیبانہ مقاومت کو بھی قابو کیا جا سکے گا جس کی شکایت عموماً نوجوانوں سے ہوتی رہتی ہے۔ مولانا حیدریؒ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں جامعہ حیدریہ میں اس نوعیت کی علمی سرگرمیوں کا آغاز بھی کر دیا تھا اللہ تعالیٰ کرے کہ دوبارہ آور ہوں۔

ہمارے علاقہ کوہاٹ میں ایک بار جلسہ کے انعقاد پر دو تنظیموں کے درمیان سخت کشمکش ہو گئی، حتی کہ مسلح تصادم تک نوبت پہنچ آئی اور خطرہ تھا کہ باہمی ٹکراؤ سے قیمتی جانوں کا ضیاع ہو جائے۔ اس وقت حضرت الاستاذ علاقہ کی واحد شخصیت تھی جن کی وجاہت کے سامنے جانبین کو جھکنا پڑا۔

ان میں ایک تنظیم کے سابقہ ذمہ دار نے بندہ سے کہا کہ:

''ہماری غلطی مجھ پر واضح تھی، حضرت الاستاذ نے مجھے شفقت بھرا خط لکھا جس میں ہماری خدمات کا اعتراف اور تشجیع تھی، ساتھ اس تنازعہ کو ختم کرنے کی سفارش بھی تھی۔ دوسرا فریق استاذ صاحب سے زیادہ قربت رکھتا تھا اور آپ کے تلامذہ و متعلقین پر مشتمل تھا۔ لیکن جب میں معذرت کے لیے حاضر خدمت ہوا، تو مجھے یہ محسوس ہی نہ ہونے دیا کہ آپ کا جھکاؤ اپنے تلامذہ و متعلقین کی طرف ہے بلکہ ہماری طرف سے تنازعہ کا سبب جو بظاہر کمزور اور موہومہ و مفروضہ قضیوں سے عبارت تھا کو نہ صرف توجہ دی، بلکہ اپنے متعلقین کو اس کا پاس رکھنے کی تاکید کی۔ یوں اس سے رقابت کی فضا بھی ختم ہوئی اور علاقہ میں تنظیم کا بھرم بھی باقی رہا۔''

آپ کی کوشش تھی کہ دینی تنظیمیں سماج میں اپنا موثر کردار ثبت کریں، اپنے آپ کو معاشرے کی ایک ناگزیر ضرورت کے طور پر منوالیں، اسی میں ان کی بقا ہے اور اسی سے ان کے فکر کا دیرپا فروغ ممکن ہے۔

استاذ گرامی مولانا فیض الرحمن نے بندہ کو بتایا کہ:

''قائد جمعیت مولانا فضل الرحمن حضرت الاستاذ کے ایک عزیز کی وفات پر تعزیت کرنے جامعہ یوسفیہ آئے تھے تو حضرت نے ان سے کہا کہ آپ حضرات راسخ علما پر مشتمل ضلعی سطح پر مصالحتی کمیٹیاں تشکیل دے دیں، یہ کمیٹیاں شریعت کے رو سے فیصلہ کرنے والوں کے قضایا نمٹائے۔ اس سے عدالتوں کا بوجھ کم ہو گا، شرعی فیصلوں کا رجحان بڑھے گا، شریعت پر عمل کی برکت سے معاشرتی خیر پھیلے گا، عوام کو مفت اور جلد انصاف ملے گا، سال ہا سال کی کچہریوں میں ذلت وخواری سے نجات ملے گی اور سب سے بڑھ کر یہ عوامی خدمت کی شکل میں ان کے ساتھ ایک مضبوط ربط کی شکل بنے گی جو معاشرہ میں اہل علم کی قدر ومنزلت اور دینی حلقوں کے فکر ودعوت کی پذیرائی کا ایک بڑا سبب ہوگی۔''

جناب جاوید ابراہیم پراچہ نے کہا کہ:

''جب ہم نے کوہاٹ میں سنی سپریم کونسل کی بنیاد رکھی تو مولانا محمد امین صاحب رحمہ اللہ نے مجھے فرمایا کہ اگر آپ سماجی و معاشرتی سطح پر قوم کی موثر خدمت کرنا چاہتے ہیں تو انتخابی سیاست کو خیر باد کہہ دیں اور ہمہ تن قومی و معاشرتی مسائل میں دلچسپی لینا شروع کر دیں، پھر دیکھیں کہ آپ اپنی قوم کے حقوق کی بالادستی کی جنگ جیتتے ہیں یا نہیں۔ ساتھ اس جانب بھی توجہ دلائی کہ سنی سپریم کونسل چونکہ دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث وغیرہ جملہ جماعتوں کا پلیٹ فارم ہے اس لیے اسے محض سیاسی جدوجہد تک محدود نہ رکھیں بلکہ عوام کے لیے رفاہی منصوبے شروع کریں۔ پانی، بجلی، گیس اور روزگار کے مسائل پر توجہ دیں، اس سے باہمی اتحاد کے استحکام اور معاشرے میں دینی حلقوں پر اعتماد کی فضا ہموار ہوگی۔''

الغرض حضرت الاستاذ کی بھرپور کوشش رہی کہ دینی جماعتیں سماج کے لیے مفید وکارگر ہوں اور باہمی اتفاق و اتحاد سے دینی مسائل کے لیے سرگرم عمل رہیں۔

سماج کی تعمیر وترقی کے لیے اصلاحی ورفاہی خدمات

حضرت الاستاذ نے امن واتحاد کے قیام کے ساتھ ساتھ ہنگو عوام کے لیے گراں قدر رفاہی خدمات سرانجام دیں، اور تقریباً منتخب ہونے والے تمام سیاسی رہنماؤں سے ان معاہدات کے شرط پر تعاون کیا کہ وہ عوام کی فلاح وبہبود میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کریں گے۔ آپ نے ڈاکٹر گلاب جمال اورکزئی اور عتیق الرحمن (ایم این ایز) پر واضح کیا کہ وہ شیعہ سنی دونوں کے حقوق کا خیال رکھیں کیونکہ وہ علاقائی نمائندے ہیں محض کسی خاص مسلک کے نمائندے نہیں لیکن سنی اکثریت کی بنا پر ان کے حقوق کا آبادی کے تناسب سے لحاظ رکھنا ضروری ہے، ہمیں حقوق کی یکسانیت پر اعتراض نہیں ہاں تساوی پر ضرور اشکال ہے۔ اسی فیصد اور بیس فیصد کی آبادی رکھنے والے دو فریقوں کو دو برابر مساوی حصوں میں وسائل بانٹ کر دینا بہرحال انصاف کے تقاضوں کے منافی ہے۔

اسی ضمن میں خوشحال گڑھ کوہاٹ پل کی تعمیر کے بعد اس دورویہ مرکزی شاہراہ کی تعمیر کا مسئلہ بھی درپیش تھا جو افغانستان تک پہنچی ہے۔ حضرت الاستاذ چاہتے تھے کہ دوسی پٹی جس پر خٹک قوم آباد ہے اور وہاں تیل اور گیس کے وسیع ذخائر دریافت ہوئے ہیں یہ شاہراہ کوہاٹ سے ہوتے ہوئے ضلع کرک کے ان مضافاتی علاقوں سے گزر ہنگو سے ملائی جائے، اس علاقے میں سنی اکثریت کا حق ہے کہ اس شاہراہ کے فوائد انہیں ملیں، لیکن اہل تشیع کی پوری کوشش تھی کہ ان علاقوں کو محروم رکھ کر یہ مرکزی شاہراہ اہل تشیع کے علاقوں پر سے گزرے، اس سے پراپرٹی کی قیمت میں بڑھوتری، گیس اور تیل اسٹیشنوں، ہوٹلوں، رہائشی ریسٹورنٹوں اور دیگر کاروباری فوائد کے حصول کا بڑا موقع تھا، حضرت الاستاذ سنی اکثریت کے لیے اس مطالبے میں حق بجانب تھے۔ آپ کی ٹھوس اور موثر پالیسی اور مضبوط سماجی شخصیت کے پیش نظر یہ ناممکن تھا کہ اس شاہراہ کو اکثریت کی خواہش اور مفاد کے خلاف تعمیر کر دیا جاتا، چونکہ آپ کی رحلت کے بعد اب یہ شاہراہ اہل تشیع کی آبادی ہی سے گزر رہی ہے، اس لیے اس علاقے کی سیاست پر گہری نگاہ رکھنے والے تجزیہ نگار کہتے ہیں کہ آپ کی شہادت کے محرکات میں سے یہ بھی ایک بڑا محرک تھا۔

حضرت نے معاشرے میں شدت پسندی کے رجحانات پروان چڑھنے کے دور میں گورنر علی محمد جان اورکزئی کو بھی اس جانب راغب کیا کہ اس خطے میں انڈسٹری اور سرمایہ کاری کے ذریعے ترقیاتی کاموں کا جال بچھانا چاہیے

تا کہ نئی نسل مصروف ہو، اور جو فضا بنتی چلی جارہی اس کے اثرات کی زد میں نہ آئے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ ہمارے خطے میں عموماً نوجوان طبقہ فارغ رہتا ہے، اور بقول حضرت الاستاذ ''فراغت فتنوں کا سب سے بڑا دروازہ ہے، انسان مصروف ہو تو کم دیدن، کم گفتن و کم شنیدن جیسے فوائد خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں۔'' اس خطے میں فراغت و بے روزگاری بھی نوجوان نسل کے منفی استعمال کا بڑا باعث بنی ہے۔

ہنگو سے افغان باڈر تک کے بالائی علاقوں کی ٹریفک ہنگو بازار سے ہو کر گزرتی تھی۔ بڑھتی آبادی کے پیش نظر بازار میں اتنی کثیر ٹریفک کا داخلہ عموماً حادثات اور عوامی پریشانی کی صورت میں نکلنا یقینی تھا۔ حضرت الاستاذ کی خواہش تھی کہ بازار سے عمومی ٹریفک کو کاٹ کر بائی پاس کے ذریعے مرکزی شاہراہ سے ملایا جائے۔ ایم ایم اے دور حکومت میں آپ نے کافی تگ و دو اور بھاگ دوڑ کے بعد بائی پاس روڈ منظور کروایا اور پھر مسلسل اس کی تعمیر کے لیے دباؤ جاری رکھا یہاں تک کہ روڈ تعمیر ہو گیا۔ بندہ سے ایم ایم اے کے ایک مقامی رہنما نے فرمایا کہ اس روڈ کی تعمیر حضرت ہی کی وجاہت، دباؤ اور مسلسل کوشش سے ممکن ہوئی۔ ورنہ یہ عام سیاسی رہنماؤں کی ترجیحات میں سرے سے داخل ہی نہ تھی۔

ہنگو کے لیے گیس کی حصولی کا مسئلہ بھی آپ کی ذاتی دلچسپی اور کاوشوں سے حل ہوا، آپ نے ڈاکٹر گلاب جمال ایم این اے کی وساطت اور عوامی قوت سے یہ حق حاصل کیا۔ آپ کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے ہنگو کو گیس کی فراہمی کے بعد ایم این اے کی خواہش تھی کہ صرف آپ کے مدرسے کے لیے بھی ایک پائپ لائن بچھائی جائے جو شہر سے تقریباً آٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے لیکن آپ نے اس امتیازی سہولت کو اپنے لیے پسند نہ کیا اور کہا کہ جب اہل علاقہ کو عام سہولت میسر ہو گی تو ہم بھی مستفید ہوں گے۔ اس بے غرضی اور بے لوثی کی مثال اس دور میں کون پیش کر سکتا ہے۔ ہنگو میں ایک بڑے سرکاری ہسپتال کی تعمیر کے لیے بھی آپ نے سیاسی رہنماؤں اور حکومتی اداروں پر کافی دباؤ ڈالا، ہنگو میں موجودہ ہسپتال کی تعمیر میں دیگر رہنماؤں کے ساتھ استاذ صاحب کی کوششوں کو بھی کافی دخل رہا ہے۔ اسی طرح ہنگو بجلی گریڈ سٹیشن کی تعمیر میں بھی آپ کی بھرپور مساعی شامل رہیں، جس سے ہنگو میں بجلی کی ابتر صورت حال میں کافی بہتری آئی۔

حضرت الاستاذ کی خواہش تھی کہ عصری تعلیمی ادارے بھی ٹھوس اسلامی ثقافت کے تحت اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں، آپ کی محنت سے ہنگو میں کئی ایک معیاری سکولز کی بنیاد پڑی، آپ عصری تعلیمی اداروں کو اپنے اثر سے باہر نہیں رکھنا چاہتے تھے اس لیے ان پر اپنی پوری توجہ رکھی اور ان کی بہتری کے لیے بہترین لائحہ عمل دیا۔ یہ آپ کی شخصیت کا ایک نمایاں اثر تھا کہ ہنگو میں آپ کی حیات تک کسی پبلک سکول میں پینٹ شرٹ اور ٹائی کا استعمال شروع

نہیں ہوا اور نہ ہی نئے تعلیم یافتہ طبقے میں جدیدیت کے تباہ کن اثرات ظہور پذیر ہوئے حتی کہ ہنگو میں کیبل کا استعمال بھی آپ کی شہادت کے بعد شروع ہوا اور آپ کی حیات تک کسی کو اس کی جرأت نہ ہوئی۔ معاشرے کو فحاشی و عریانی کے وبال سے بچانے میں آپ کے فکر و کردار کا اندازہ اسی سے ہو جاتا ہے۔

ایک بار ایک وزیر نے ہنگو میں سنیما قائم کرنے کا اعلان کر کے جگہ مختص کی اور اس کے لئے اینٹیں وغیرہ بھی لے آئے۔ استاذ صاحب نے اسی جگہ استسقا کے نوافل ادا کرنے کا اعلان کیا، شہر بھر کے لوگ جمع تھے، آپ نے سارے علما کو اس پر متفق کیا کہ سنیما یہاں کسی حال میں بھی نہیں بننا چاہیے۔ نماز کے بعد علما نے اعلان کیا کہ سنیما کی تعمیر کے لئے قوم کے خزانے سے لائی گئی اینٹیں قوم ہی اٹھا کر لے جائے۔ کیونکہ اس پر قوم کسی طرح بھی راضی نہیں، لہٰذا سارے لوگ اینٹیں اٹھا کر لے گئے، اور بحمد اللہ آج تک ہنگو سنیما کی لعنت سے پاک ہے۔

یہاں وہ حلف نامہ نقل کرنا بھی مناسب ہوگا جس پر آپ اپنے ہر حمایت یافتہ سیاسی امیدوار سے دستخط لیتے تھے، اس حلف نامے پر دستخط اور اس کے مندرجات پر عمل کی یقین دہانی کے بغیر کوئی نمائندہ ہنگو سے الیکشن جیت جائے یہ ناممکن تصور ہوتا تھا، وہ حلف نامہ حسب ذیل ہے:

میں............بن............اللہ جل شانہ کو حاضر و ناظر جانتے ہوئے یہ حلفیہ عہد کرتا ہوں کہ الیکشن میں کامیاب ہو کر اپنی استطاعت کے مطابق مندرجہ ذیل کام کروں گا۔

۱۔ میں اسمبلی میں فرقہ وارانہ تشدد اور اس کے حقیقی اسباب کو ختم کرنے کے لئے ”تحفظ ناموس صحابہ و اہل بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین“ کا بل پیش کروں گا۔ یا اگر کسی اور نے پیش کیا تو غیر مشروط طور پر اس کی تائید کروں گا اور تمام فرقوں کے مذہبی رسومات کو اپنے مقامات تک محدود رکھنے کی کوشش کروں گا۔

۲۔ اسلامی و جہادی تنظیموں پر ناجائز پابندیاں اٹھانے اور ان کے مظلوم قیدیوں کی رہائی کے لیے آواز اٹھاؤں گا اور عملی جد و جہد کروں گا۔

۳۔ علما حضرات اور اہل سنت کے دوسرے مخلص دانشوروں کے مشورہ سے جسٹس سجاد علی شاہ کا فرقہ وارانہ اختلاف کو ختم کرنے یا کم کرنے کے لئے شروع کردہ نامکمل کام کو مکمل کرنے کی کوشش کروں گا۔

۴۔ اسمبلی میں اسلامی شریعت یا علاقائی و قومی معاملات میں سے متعلقہ جو بھی معاملہ علما حضرات کے اتفاق سے زیر بحث آئے گا، میں علمائے کرام کے مؤقف کی تائید کروں گا۔

۵۔ ملک کے اندر مکمل نفاذ شریعت اور خارجہ امور میں ملک کی آزاد باوقار خارجہ پالیسی اختیار کرنے کی سعی بلیغ کروں گا اور بیرونی دباؤ سے ملک کو جلد از جلد آزاد کرنے کی کوشش کروں گا۔

۶۔ اسلامی ممالک کا مؤثر اور فعال بلاک اور ان کے درمیان پائیدار، نتیجہ خیز اتحاد کے لیے کوشاں رہوں گا۔

۷۔ ضلع ہنگو کی پسماندگی کو ختم کرنے کے لئے ہر شہر وقصبہ میں اپنی مدد آپ کی تنظیمیں، کواپریٹیو نوعیت کی سوسائٹیاں قائم کر کے پورے ضلع میں صنعتی ادارے اور رفاہی کاموں کا جال بچھاؤں گا۔

۸۔ شاہو خیل سے چیچنہ تک روڈ کا جو نقشہ بنا ہے اس پر فوری طور پر عمل شروع کراؤں گا۔

۹۔ صحیح دینی مدارس اور مذہبی تنظیموں کی ترقی وتحفظ کو اپنا فریضہ سمجھوں گا اور لادین این۔ جی۔ اوز کے مقابلے میں اسلامی رفاہی ادارے بناؤں گا۔

۱۰۔ میں بلا کسی قسم کے تعصب محروم طبقوں کے حقوق حاصل کرنے اور آبادی کے لحاظ سے سرکاری ملازمتوں میں منصفانہ توازن قائم کرنے کی کوشش کروں گا۔

اس حلف نامے کی ایک ایک شق سے ملی، قومی اور علاقائی مفاد کے لیے آپ کی تڑپ اور ایک سیاسی رہنما کے لیے ممکنہ اہم کاموں کی جملہ جہات سامنے آتی ہے۔ اس سے آپ کی سیاسی بصیرت بھی بخوبی آشکارا ہوتی ہے کہ آپ وطن خداداد کی اسلامی ساکھ اور خود مختاری کی بحالی اور خصوصاً اپنے ضلع میں قیام امن اور اسباب بدامنی کے خاتمہ کے لیے کس قدر سرگرم تھے۔ نیز فرقہ وارانہ فسادات کا خاتمہ آپ کے ہاں کتنا اہم تھا۔

آپ نے خود فقر کی زندگی بسر کی لیکن عامۃ الناس کو ہر سہولت بہم پہنچانے کی فکر مسلسل دامن گیر رہی۔ خصوصاً علاقے کے غربا ومساکین کے لیے آپ ایک بڑا سہارا تھے۔ مولانا یوسف صاحب راوی ہیں کہ:

> ''آپ کا معمول یہ تھا کہ ایک پرچی پر علاقہ کے سارے غربا کے نام لکھ دیتے، اور مجھے بلا کر ان کے لیے تعاون کی رقم اور اشیائے خورد ونوش (آٹا، دالیں، چینی، چائے) کے خوراکی پیکٹس حوالے کر دیتے کہ انہیں تقسیم کر دیں۔ صرف ایک رمضان میں میرے ہاتھ سے تین لاکھ کی نقد رقم اور لاکھوں مالیت کے اشیائے خورد ونوش تقسیم کیں۔ آپ یہ ہدایت فرماتے کہ رقم جلد از جلد تقسیم کریں تاکہ یہ لوگ عید کے لیے اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔ غربا کو قرضوں کی فراہمی بھی آپ کا معمول تھا، شہادت سے کچھ گھنٹے قبل مجھے بلا کر فرمایا کہ مجھ پر کسی کا کوئی قرض نہیں، مجھ سے کئی احباب نے پیسے لے رکھے ہیں لیکن ان سے واپس نہیں لینے۔
> آپ کی شہادت کے بعد کئی لوگ آ کر کہتے کہ ہم نے فلاں ضرورت کے لیے استاذ صاحب سے قرضہ لیا تھا۔
> فلاں بیماری کے علاج کے لیے رقم لی تھی۔ لیکن حضرت کی وصیت کے مطابق کسی کا قرض واپس نہیں لیا گیا۔''

علاقہ کے لیے لوگوں کے لیے مساجد ومدارس کی تعمیر میں بھی آپ بھرپور دلچسپی لیتے، کئی مساجد کی تعمیر میں کمک ودوکی، مدارس سے مالی تعاون بھی فرماتے، خود اپنے لیے یا کسی اور کے لیے چندہ کا معمول نہ تھا لیکن اہل علم اور طلبا کی

حتی المقدور بھرپور خبر گیری کرتے۔

معاشرہ پر آپ کے اثرات

ان گراں قدر سماجی خدمات کی وجہ سے معاشرے پر آپ کے گہرے اور دوررس اثرات پڑے۔ ان میں ایک چند نمایاں اثرات کا تذکرہ مناسب ہوگا۔

(۱)... آپ کی شخصیت علمی حلقوں میں ایک مرجع کی حیثیت اختیار کر گئی تھی، ہمارے دیار کی حد حضرت الاستاذ کی علمی جلالت شان اور عبقریت پر اجماع تھا۔ تمام محقق علما آپ کو ہر علمی حوالے سے سند سمجھتے تھے، جب بھی کوئی اہم دینی قضیہ درپیش ہوتا تو سب کی نظریں آپ ہی کی طرف اٹھتیں۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور جملہ معقولات و منقولات میں آپ کو جو دستگاہ حاصل تھی، سبھی اس کے معترف و قدر دان تھے۔ میں نے کئی ایک محقق علما کو دیکھا کہ وہ اپنے علمی اشکالات کی گتھیاں سلجھانے حضرت الاستاذ کی خدمت میں پہنچتے۔ بیسیوں حضرات اپنے علمی اور تحقیقی کاموں کے خطے آپ ہی سے بنواتے اور آپ ہی کے زیر نگرانی تحقیقی کام کرتے۔ الغرض علمی حوالے سے آپ کی شخصیت ایک ایسے متفق علیہ امام کی تھی جس سے اہل علم پوری طرح اپنی تشفی پاتے تھے۔

(۲)... سیاسی و سماجی مسائل میں بھی آپ کو ایک فیصلہ کن شخصیت کا مرتبہ حاصل تھا۔ کسی خاندانی، معاشرتی اور قومی قضیہ یا تنازعہ میں حضرت الاستاذ کی کہی ہوئی بات آخری اور فیصلہ کن شمار ہوتی۔ کئی ایک لاینحل مسائل محض آپ کی وجاہت کے زور پر حل ہوئے۔ قتل، اقدام قتل، دیوانی تنازعات اور عائلی مسائل میں آپ کے جرگوں اور فیصلوں کو اگر اکٹھا کیا جائے تو ایک مبسوط مقالے کا مواد ہے۔ کئی خاندان آپ کی کوششوں سے جڑے، کئی تنازعے جڑ سے ختم ہوئے، کئی جانیں محفوظ ہوئیں اور سال ہا سال کی دشمنیاں ختم کر کے لوگ باہم شیر و شکر ہوئے۔ آپ کی طرف ان معاملات میں لوگوں کے رجحان کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ آپ سب کچھ محض اللہ کی رضا کے لیے بغیر کسی دنیاوی طمع ولالچ کے کرتے، کبھی تحکیم پر معاوضہ نہیں لیا، بلکہ اپنے وسائل لگائے۔ اسی طرح آپ کی حقانیت اتنی مسلم تھی کہ ازلی دشمن بھی آپ سے پورے انصاف کا یقین رکھتا، اس لیے کسی کے ساتھ ناانصافی یا کسی کی حق تلفی کا سوال ہی نہ تھا۔

(۳)... حضرت الاستاذ کا ایک بڑا سماجی اثر مشرب اعتدال کا قیام تھا۔ آپ کی کوششوں سے ہنگو کے ضلع میں بغیر تشدد اور بغیر تصادم کے بدعات و رسومات کا خاتمہ ہوا، اس حوالے سے آپ کی حکمت عملی مخالف پر محض تنقید اور تردید کی نہ تھی، بلکہ شفقت و رأفت سے اسے مائل کرتے اور حکمت سے تدریجاً لوگوں کا مزاج بناتے۔ اسی کا اثر تھا

کہ ہنگو کی حد تک سنی قوم میں کوئی قابلِ ذکر مکتبِ فکر نہ تھا بلکہ سب ایک ہی نظریے پر جمع تھے۔ اس کا ایک عام اندازہ ہم نے بعض ایسی دینی جماعتوں کے کارکنوں سے مل کر لگایا ہے جنھیں عموماً علمی رویوں میں سخت گیر سمجھا جاتا ہے کہ وہ بھی دیگر علاقوں کی نسبت یہاں معتدل اور وحدت کے قیام کے لیے کوشاں دکھائی دیے، اور حضرت الاستاذ کے ساتھ وہی اہمیت اور احترام والا رویہ تھا جو اپنے اکابر کے ساتھ ہوتا تھا۔

(۴)..... حضرت الاستاذ کی شخصیت کا معاشرے پر ایک اور گہرا اثر اصلاح وارشاد اور نیکی ومعروف کا عام رجحان تھا، یہ اہل اللہ کا ایک خاص اثر ہوتا ہے، آپ سے ایک ملاقات کرنے والا بھی اپنے اندر معروف کی قوت اور منکر سے نفرت محسوس کرتا، علاقہ میں بے پردگی، اعلانیہ گانے بجانے یا ڈھول تماشوں کا تصور تک نہ تھا، لوگ آپ کے تذکروں میں ایک گونہ تقدس محسوس کرتے، عصر تعلیمی اداروں اور عام افراد کی زندگیوں پر بھی آپ کی پارسا شخصیت کے اثرات کا کچھ تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔

(۵)..... حضرت الاستاذ کا ایک بڑا اثر ہنگو کی سطح پر سنیت میں وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل کا قیام تھا، آپ کی زندگی تک سنی قوم یک جان تھی، آپ نے کسی کو اس دھارے سے ٹوٹنے نہیں دیا، سنی سپریم کونسل کے نام پر سب کو اکٹھا رکھا، ایک سنی کا مسئلہ پوری قوم کا مسئلہ متصور ہوتا۔ ہنگو جن تہہ در تہہ اور سنگین نوعیت کے مسائل کا شکار تھا اور لوگوں کے حقوق کا استیصال جس زوروں پر تھا وہاں سنی قوم کا اتحاد ان کے بقا کی آخری ضمانت تھی، حضرت الاستاذ نے ساری زندگی اسی رنگ میں کاٹی کہ یہ اتحاد قائم ودائم رہے اور عوامی خوشحالی اس خطے کی مقدر ہو۔

افسوس کہ حضرت الاستاذ کے بعد اب وحدتِ فکر وعمل کی وہ تصویر دکھائی نہیں دیتی جو آپ کی زندگی میں تھی، باہمی تنازعات اور رقابتوں کے سلسلے اجتماعی مفاد میں زبردست آڑ بن چکے ہیں اور سنی قوم اس خطے میں اپنے تشخص اور حقوق کی بالادستی قائم رکھنے کے لیے مضبوط پوزیشن میں دکھائی نہیں دیتی، اس کے اور بھی عوامل ہو سکتے ہیں لیکن جو سب سے بڑا محرک ہمیں سمجھ آتا ہے وہ وحدتِ فکر وعمل کا فقدان اور ذاتی مفادات وترجیحات کی پاس داری ہے اور کسی متفقہ لائحہ عمل سے منظر نامہ خالی نظر آتا ہے۔

استاذ گرامی کے زندگی کا ساتجی پہلو نوجوان اہل علم کے لیے بھی اپنے اندر رہنمائی کا بڑا سامان رکھتا ہے، آج حکمت ومصلحت کے نام پر اپنی خودی کا سودا کیا جاتا ہے اور خوف ومداہنت کو امت کی خیر خواہی سمجھا جاتا ہے جب کہ دوسری طرف قربانی کے نام پر اپنا سر پھوڑنا ''جہاد'' اور ''دینی غیرت کا مظاہرہ'' بن چکے ہیں، حضرت کی زندگی کے اس پہلو سے واضح ہوا ہوگا کہ یہ دونوں رویے منہجِ اعتدال سے کوسوں دور ہے۔ حکمت وبصیرت کے بجز کوئی ایجابی نتیجہ نکلنا ممکن نہیں لیکن اپنی خودی اور تشخص کا سودا بزدلی ہے۔ دینی غیرت اور جہاد وقربانی ایمان کا تقاضا ہے لیکن

اپنی قوم اور ملک وملت کی جڑیں کاٹ کر وقتی وہنگامی نتائج کے حصول کے لیے حد سے گزرنا دنائت وتہور سے سوا کچھ نہیں۔

ہمارے نوجوان فضلا معاشرے سے اپنے مقام واحترام کے جو عاجلانہ توقعات وابستہ کرکے میدان میں قدم رکھتے ہیں اور پھر متوقع نتائج سے شدید مایوسی پر ان کی خدمات کا دائرہ جس تنگی کا شکار ہو کر اپنی ذات میں بند ہو جاتا ہے اور وہ اپنے رویوں سے اپنے اور سماج کے درمیان جس نہ پاٹ سکنے والے دریا کو جنم دے دیتے ہیں، یقینا حضرت الاستاذ کی زندگی کا سماجی پہلو اور مجاہدات ان کے لیے سرمۂ بصیرت اور سماج میں مؤثر کردار ادا کرنے کے حوالے سے رہنمائی کا ذریعہ بنیں گے۔

معاشرے میں آپ کے اس مثالی کردار پر ثقہ گواہ موجود ہیں بلکہ ہنگو خطے کا ہر فرد اس کا شاہد ہے۔ قیام امن کے لیے تیس سال تک تسلسل سے جدوجہد کرنے والی شخصیت کو بدامنی کا ذمہ دار ٹھہرا کر نشانہ بنا دینا تاریخی حقائق کا ایسا کھلا اور بدترین مذاق ہے جس پر اس خطے کا ہر منصف مزاج حیرت میں غوطہ زن ہے۔ مسخ حقائق کی اس سے بدترین صورت شاید کوئی اور نہ ہو۔ یہ ایک اہم سوالیہ نشان ہے کہ کیا ملکی اداروں کی کارکردگی اس درجہ متاثر ہو چکی ہے یا تساہل وغفلت کوشی کی ایسی چادر ان پر تن گئی ہے کہ وہ ملک وملت کے محبین کی پہچان بھی نہیں کر پاتے؟

حضرت کی شہادت ان امن پسندوں کے لیے بھی تشویش کی لہر تھی جو اپنی مدد آپ کے تحت معاشرے میں لگی اس آگ کو ٹھنڈا کرنے آتش نمرود میں بے خطر کود پڑے تھے، کہ کیا خبر گھائل ہو کر جو پیچھے مڑیں تو اپنی ہی کمین گاہ سے برستے تیروں کا ہدف ہوں؟ اگر ہمارے ہوش وحواس وفہم وفراست کی یہی حالت ہے کہ دوست ودشمن کی پہچان ہی نہیں، اور ہماری معلومات وانفارمیشن کا معیار یہاں تک پہنچ گیا کہ محض اوہام ومفروضات اور مظنونات وتخیلات کے بل بوتے اتنی بڑی کارروائیاں ہو جاتی ہیں تو یہ کشتی اپنے ناخداؤں سے ڈوبنے پر شکوہ کناں ہوگی۔

یقین جانیے مائیں مولانا اورکزئی جیسے سپوت روز نہیں جنا کرتیں، اس پایہ کی شخصیات معاشرے پر اللہ کا انعام ہوا کرتی ہیں لمحوں کی خطاؤں سے ضائع ہونے والی ان شخصیات کو پھر صدیاں روتی ہیں اور ایسے انعامات کی ناقدری پر اللہ کا غیظ وغضب ضرور جوش میں آتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے اولیا کی اہانت برداشت نہیں کرتا اور ایسا کرنے والوں کو کھلے جنگ کی دعوت دیتا ہے، اور اللہ کی ذات سے کون جنگ کر سکتا ہے؟؟؟؟

مجھے احساس ہے کہ عجلت کے ان چند سطور میں میں اپنے استاذ کی زندگی کا سماجی پہلو کما حقہ واضح کرنے میں ناکام رہا ہوں اور اس ہمہ گیر شخصیت کے سماجی کمالات کا احاطہ مجھ جیسے طفل مکتب کے لیے ممکن بھی کہاں ہے، تاہم امید رکھتا ہوں کہ حضرت الاستاذ کی حیات طیبہ کے اس پہلو کی ایک دھندلی سی تصویر اذہان پر ضرور ابھری گی اور کم

سکی لیکن اس کا اثر ضرور محسوس کیا جائے گا۔

اھل خانہ کے رشحات قلم

میرے سر کا تاج...... جو ٹوٹ گیا!!!

ام مولانا محمد یوسف اورکزئی

ایک عورت کے لئے سب سے بڑا سایہ وسہارا شوہر کی ذات ہوتی ہے، یہ سہارا زندگی میں چھن جائے اور یہ سایہ سر سے اٹھ جائے تو زمانے کی ابتلاؤں کا درد دگنا ہو جاتا ہے۔ والدین کے لئے اولاد بھی بڑا سہارا اور خداوند عظیم کی بیش بہا نعمت ہوتی ہے، تاہم زوجین کا باہمی تعلق اور رشتہ کا نعم البدل نہیں، پھر اگر قدرت کی ایسی دستگیری ہو کہ زوجین یک جان دو قالب ہوں، زندگی بھر کبھی ایک دوسرے کو شکایت کا موقع نہ دیا ہو، ایک دوسرے کی راحت وآرام کے لئے ہمیشہ اپنے چین وسکون کو قربان کرنا آسان معلوم ہوا ہو، تو ان کا فراق کس قدر الم ناک و دردانگیز ہوگا یہ وہی جان سکتے ہیں جو اس آگ کی بھٹی سے گزریں ہوں۔

حضرت مولانا ابو یوسف صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ ایک باکمال اور اونچے اخلاق وصفات والے شخص تھے۔ یہ میری خوش بختی اور سعادت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے میری قسمت ان کے ساتھ جوڑ دی تھی۔ آپ کی محیر العقول زندگی کے بعض گوشے ایسے ہیں جن کی واحد راز دار میں ہوں، میں نے رفیقۂ حیات کی حیثیت سے ان کے بعض ایسے کمالات دیکھے کہ وہ آپ کے متعلقین کی نظروں میں نہیں آئے ہوں گے۔ کئی واقعات ہیں لیکن یاد کرتے ہوئے دل چرتا ہے اور بے قراری ہوش وحواس معطل کر دیتی ہے، اس لئے ارادہ کرتی بھی ہوں تو سنانے اور لکھوانے سے قاصر ہوں۔

وہ میرے لئے بہترین جیون ساتھی اور بہترین شوہر تھے۔ آپ نے اپنے علم وتقویٰ اور بلند مقام کے باوجود مجھ جیسی ایک عام خاتون کے ساتھ عمر بھر ایک مثالی شوہر اور دوست کی زندگی گزاری، ہر طرح سے میری راحت وآرام

کا خیال رکھا اور اپنی وسعت سے بڑھ کر رکھا۔ الحمدللہ مجھے بھی کبھی شکایت یا بتکلف ناز برداریوں کی عادت نہیں ہوئی۔ آپ کی ابتدائی زندگی مجاہدہ کی تھی، الحمدللہ! اللہ تعالیٰ نے مجھے سخت اوقات وحالات میں آپ کے ساتھ مجاہدات وتکالیف میں ایک شریک حیات کے طور پر شانہ بشانہ چلنے کی توفیق دی۔

جب ہماری شادی ہوئی تو اسی سال آپ دورۂ حدیث شریف کر کے فارغ ہو گئے تھے، لیکن پھر اپنے استاذ کے مطالبے پر تخصص فی الحدیث کے لئے تشریف لے گئے۔ رخصتی کے بعد حضرت کی جو پہلی گفتگو میرے ساتھ ہوئی وہ میری ساری زندگی کے لئے سبق آموز تھی۔ وہ گفتگو میرے ذہن میں آج بھی نقش ہے۔ فرمایا: ''کہ میں نے شادی محض اس نیت سے کی ہے کہ یہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے، اس کے علاوہ شادی کا کوئی دوسرا جذبہ اور داعیہ نہیں تھا۔ نہ تو مجھے اولاد کی خواہش ہے اور نہ اس کی کہ گھر میں کھانے پکانے یا خدمت کی حاجت ہے۔ الحمدللہ میں سارے کام خود کر لیتا ہوں لیکن تکمیل سنت کے جذبے اور داعیے کی بنا پر میں نے عقد نکاح کیا ہے، لہٰذا ہماری رفاقت کی بنیاد خالص دینی ہے اور اس میں کسی دوسرے جذبے کی آمیزش نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ سے پہلے میرا ایک اور رشتہ ہو چکا ہے اور وہ رشتہ 'علم' اور 'کتاب' سے ہے۔ یہ رشتہ مجھے بہت عزیز ہے، میں آپ سے پیشگی معافی طلب کرتا ہوں کہ اس رشتے کا پاس رکھنے کی وجہ سے مجھ سے آپ کے حقوق میں کوتاہی ہوگی اور مجھے امید ہے کہ آپ مجھے معاف کر دوگی۔

تیسری بات یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے راستے کا طالب علم ہوں، میرے پاس جو رقم آتی ہے وہ میں گھر کے ضروری اخراجات اور کتابوں پر صرف کرتا ہوں، اس سے بچ جانے تو بھائیوں اور چچاؤں کو دیتا ہوں کہ ان کے اس احسان کا کچھ بوجھ اتار سکوں جو انہوں نے آٹھ دس سال تک مجھ پر مسلسل خرچ کر کے کیا ہے۔ اس لئے مجھ سے پیسوں کی تمنا نہیں رکھنی۔ ہاں! میں آپ کے لئے ایک سلائی مشین خرید لوں گا اور چنگیر اور چھابے بنانے کے لئے بان وغیرہ لے آؤں گا، آپ کو گھر کے کاموں سے فرصت ملے تو اپنے اوقات اس میں لگانا، اس سے آپ کو ذاتی آمدنی حاصل ہوگی، جس سے آپ اپنی سہولت یا آسائش کا سامان کر سکیں گی۔''

حضرت کی ان باتوں سے مجھ پر کوئی مایوسی یا بوجھ نہیں بنا، بلکہ میرے اندر ایک ولولہ اور جوش پیدا ہوا اور میں نے اپنے رفیق کا ساتھ دینے کا عزم کر لیا۔ حضرت نے میرے لئے سلائی مشین خرید لی، اس وقت خواتین کا فی جوڑا ایک روپیہ سلائی ملتا تھا۔ اسی طرح چنگیر بنانا شروع کر دیئے۔ حضرت کے چچا صاحب میلوں پر چیزیں بیچنے خریدنے جایا کرتے تھے تو میرے چنگیر، چھابے بھی بیچنے ساتھ لے جاتے تھے۔ کوئی آٹھ آنے یا روپیہ میں بک جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں اتنی برکت ڈالی کہ میں اپنی ذاتی آسائش کے ساتھ گھر کے ضروری اخراجات میں بھی حضرت کی

معاونت کرلیتی اور بچوں کے لئے بھی چیزیں خرید لیتی اور حضرت بوقت ضرورت مجھ سے قرض بھی لے لیتے۔ ہمارے عام ماحول میں عورت کی ذاتی ملکیت کا کوئی احترام نہیں لیکن حضرت اس حوالے سے سخت محتاط تھے اور کبھی میری رقم میری اجازت کے بغیر نہیں لی۔ رقم کی واپسی کا بھی اہتمام فرماتے۔

آپ اپنے علمی اور سماجی مصروفیات کے باوجود کوشش کرتے کہ گھر کے لئے وقت نکالیں، میں بھی اپنی طرف سے پوری کوشش کرتی کہ چھوٹے موٹے کام کبھی آپ کو نہ کہوں کہ آپ کی یکسوئی متاثر نہ ہو۔ لیکن خود آپ کو پوری فکر رہتی، ہر جمعہ کو ہفتہ بھر کا سودا سلف بازار سے بذات خود لے آتے تھے۔

گھریلو کاموں میں میرا ہاتھ بٹانا ان کا معمول تھا، ہمارے ہاں یہ مردوں کے لئے عیب سمجھا جاتا تھا اور مجھے بھی عام ثقافت کی وجہ سے آپ کا گھریلو کاموں میں ہاتھ بٹانا سخت باعث شرم محسوس ہوتا لیکن آپ فرماتے کہ یہ انبیاء کرام علیہم السلام کی سنت ہے اور ہمارے بزرگوں کا یہ طریقہ رہا ہے، اس پر کئی واقعات مجھے یاد آرہے ہیں۔ سبزی کاٹنا اور صفائی وغیرہ کرنا تو آپ کا معمول تھا۔ میں گھر کے کاموں میں مصروف ہوتی تو آپ باورچی خانے سے خود ہی سامان اٹھا کر ایک طرف بیٹھ جاتے اور سبزی کاٹ لیتے تھے۔ چولہا جلا لیتے اور اس میں کبھی عار محسوس نہیں فرماتے۔

ایک بار حضرت کے کچھ مہمان آئے، الحمد للہ مہمانوں کا سلسلہ دن بھر جاری رہتا اور اللہ تعالیٰ مجھے خدمت کی توفیق دیتے۔ حضرت جلدی سے گھر تشریف لائے اور فرمایا کہ مہمانوں کے لئے کھانے کا بندوبست کرنا ہے۔ مرغی ذبح کرنی ہے، آپ ذرا مرغی دیکھ لیں۔ ہماری گھریلو مرغیاں ہوتی تھیں جو باہر کھیتوں میں گھومتی رہتی تھیں۔ میں کپڑے دھونے بیٹھی ہوئی تھی، جلدی سے اٹھی تاکہ بچوں کو بھیج کر مرغیاں گھر کی طرف بھگانے کا کہہ دوں۔ مرغی پکڑنا بھی خاصا کام ہوتا تھا، آوازیں دے دے کر مشکل سے اپنے پاس بلا کر بہت دشواری سے پکڑا جاتا، میں اس کام میں لگ گئی اور کپڑوں کی طرف سے دھیان ہٹ گیا۔ جب میں گھر کی ڈیوڑھی سے مرغی پکڑ کر اندر آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ حضرت نے کپڑے دھو کر نچوڑ کر تار پر لٹکا بھی دیئے ہیں۔ مجھے بڑی حیرت اور شرمندگی ہوئی، دست بستہ عرض کیا کہ آپ کیا کرتے ہیں؟ میرے لئے سخت باعث عار ہے، آپ ایسا نہ کریں، اس پر مسکرا کر فرمایا کہ اللہ کی بندی! اس میں کیا حرج ہے؟ آپ ایک کام میں مصروف ہوگئیں، میں ایسے فارغ بیٹھا رہتا، اس سے بہتر تھا کہ یہ کام نمٹا لوں۔

ایک بار حضرت بڑی جلدی سے تشریف لائے، میں آٹا گوندھ رہی تھی۔ فرمایا کہ بڑے دور سے مہمان تشریف لائے ہیں، ذرا عمدہ چائے جلدی سے بنا دیں۔ حضرت جب کسی کام کا فرماتے تو میں کتنے ہی اہم کام میں مصروف ہوتی فوراً اسے چھوڑ دیتی، میں نے جلدی سے آٹے کی تھال پر کوئی چیز رکھ دی اور اٹھ کر باورچی خانے چائے بنانے

چلی گئی، چائے بنا کر جب میں باہر نکلی تو یہ عجیب منظر دیکھا کہ حضرت آستین چڑھائے آٹا گوندھ رہے ہیں۔ میں جلدی سے لپکی اور منت ساجت کر کے بولی کہ یہ کیا کر دیا؟ مسکراتے ہوئے فرمایا کہ اس میں کوئی حرج نہیں، بس آپ کا کام آسان ہو جاتا ہے۔

ایک بار میں مہمانوں کا سالن بنا رہی تھی، حضرت تشریف لائے اور فرمایا کہ کچھ اہم مہمان تشریف لائے ہیں، آپ چائے بنا دیں، میں نے عرض کیا کہ گھر میں دودھ موجود نہیں، قہوہ بنا دوں؟ فرمایا: نہیں دور کے مہمان ہیں، چائے دودھ والی بنانی ہے۔ میں نے دوسرے چولہے پر چائے بھی رکھ دی، ارادہ کر رہی تھی کہ جا کر کسی رشتہ دار کے گھر سے گائے کا دودھ لے آؤں۔ واپس آ کر دیکھتی ہوں کہ حضرت کے ہاتھ میں دودھ سے بھرا ہوا برتن ہیں، پوچھنے پر بتایا گیا کہ فلاں بکری سے دوہ لیا۔ ہمارے علاقے میں جانوروں کا دودھ دوہنا خواتین کی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے اور مردوں کے بارے پھر اتنے ذی وجاہت علما کے بارے میں تو یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے ہاتھ سے یہ کام کر دیں، میں حسب سابق حیرت واستعجاب کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ حضرت نے فرمایا کہ اپنے ہاتھ سے جانوروں کا دودھ دوہنا ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ کافی زمانہ سے اس سنت پر عمل کرنے کی خواہش تھی الحمد للہ آج اس کی بھی تکمیل ہوگئی اور یہ فرماتے ہوئے دودھ کا برتن مجھے تھما دیا۔

یہ تو حضرت کی گھریلو زندگی کے چند واقعات تھے، گھر سے باہر کی ذمہ داریاں تو اس سے بھی بڑھ کر فکر مندی سے پوری فرماتے۔ اپنے ہاتھوں سے زراعت کرتے، کھیتی کا سارا کام خود کرتے، طلبہ کرام بھی ساتھ مل جاتے، گندم کی کٹائی اور گہائی بھی اپنے ہاتھ سے انجام دیتے۔ جانور پالنا، ان کی دیکھ بھال کرنا، گھر کے لئے جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانا، جانوروں کے چارے کا بندوبست کرنا عمومی ذمہ داریاں تھیں۔ کبھی یہ نہیں جتلایا کہ وہ اتنے بڑے عالم ہیں، یا قومی کاموں اور جرگوں میں مصروف رہتے ہیں بلکہ ہمیشہ میرا احسان مانا حالانکہ باوجود انتہائی زیادہ مصروفیات کے وہ مجھ سے بڑھ کر گھریلو ذمہ داریوں کو پورا فرماتے۔

اپنے بھائیوں، بھتیجوں، بھانجوں اور خاندان کے ہر فرد سے مثالی شفقت کا رویہ رکھتے تھے۔ خاندان میں کوئی بیمار ہوتا تو مجھے بھی عیادت کی تاکید کرتے اور خود بھی پہنچتے بلکہ حتی الوسع تعاون بھی کرتے اور ان کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھتے۔ بڑے بھائیوں کا اپنے والد کی طرح احترام فرماتے تھے اور ہم سے بھی یہی تقاضا ہوتا تھا۔

بچوں کی تربیت کا خاص خیال رکھا، خصوصاً دینی حوالے سے کوئی کوتاہی برداشت نہیں کی۔ بڑے بیٹے مولوی یوسف کو حافظ قرآن بنانے کی خواہش تھی مگر ابتدا میں اکلوتا تھا، اکثر بیمار رہتا بلکہ کئی دفعہ تو موت کی منہ سے واپس آیا تھا اور صحت کی خرابی کے وجہ سے باہر سفر کے قابل بھی نہیں تھا، اس لیے اکثر اپنے ساتھ رکھتے اور اس کے بارے

میں یہ خواہش تھی کہ بس ایک اچھا اور مثالی انسان بن جائے۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے مہربانی فرمائی کہ بڑے بیٹے کو عالم دین اور چھوٹے بیٹے ظہیر الدین کو حافظ قرآن بنایا اور حضرت کی شہادت کے بعد مزید پڑھائی کے بجائے اپنی معاشی کام کاج کی طرف متوجہ ہو گیا۔

رسم ورواج اور توہمات سے سخت نفرت تھی۔ ہمارے علاقوں میں خواتین میں توہمات اور رسومات ورواجات کی وباعام تھی، مگر الحمدللہ حضرت کی برکت سے ہمارا پورا خاندان ان چیزوں سے پاک رہا۔ ہم نے کبھی رسومات وغیرہ میں کوئی دلچسپی نہیں لی بلکہ اپنی استطاعت کے مطابق دیگر خواتین کو بھی ان چیزوں سے روکنے کی کوشش کرتی رہی۔

حضرت کی ساری زندگی زہد اور قناعت سے عبارت تھی، ہم نے چالیس سالہ رفاقت پرانے زمانے کے دو کچے کمروں میں گزاری جن کی دیواریں مٹی گارے سے چنی ہوئی تھیں اور چھت کو کئی ستونوں کے ٹیک دے کر خاشاک اور نرکل کے پتوں سے ڈھانکا گیا تھا۔ حضرت کو کبھی پختہ گھر بنانے کا خیال پیدا نہیں ہوا، الحمدللہ حضرت کی برکت سے کبھی ہماری بھی یہ تمنا نہ ہوئی کہ اپنا پختہ گھر بنے۔ حضرت ہمیشہ سادگی اور قناعت کی ترغیب دیا کرتے تھے، صحابہ کرامؓ اور اسلاف کے عسرت اور تنگی کے حالات سنایا کرتے تھے اور فرماتے کہ دنیا کی چند روزہ زندگی ہے، عاقبت بنانے کی فکر کرنی چاہیے۔ جب شہادت سے دو سال قبل یوسف نے دو پختہ کمرے تیار کرائے، تو مجھے کہتے کہ قیامت میں اس کا حساب آپ کے ذمے ہے، میں ان پر راضی نہیں، پھر آپ نے گھر کا ایک کچا کمرہ اپنے لیے منتخب فرمایا۔

حضرت کا ذوق عبادت اور دعا بھی قابل رشک تھا۔ آپ عموماً مدرسہ سے اس وقت فارغ ہو کر گھر آتے، جب ہم سو چکے ہوتے، کیونکہ دن بھر مہمانوں اور طلبہ کی خدمت اور گھریلو کام کاج کی وجہ سے آرام کا موقع نہیں ملتا تھا، اس لئے عشا پڑھ کر متصلاً سونے کا معمول تھا، جب کہ حضرت تو مدرسہ کے کتب خانہ میں رات دیر تک مطالعہ اور لکھنے لکھانے کے کاموں میں مشغول ہوتے تھے۔ لیکن رات کو جب آنکھ کھلتی تو عموماً آپ کو دعا وعبادت میں مشغول پاتی، لمبی لمبی نمازیں پڑھتے اور طویل دعائیں مانگتے۔ زندگی بھر آپ کے تہجد کے مختلف نظارے اور عجیب وغریب حالات دیکھے ہیں۔ مثلاً جب آپ عبادت میں مشغول ہوتے اور دعا ومناجات اور مراقبہ فرماتے تو میں نے بارہا آپ کے سامنے سنہری قسم کی جالیاں دیکھیں۔ مجھے علم نہ تھا کہ یہ کیا چیز ہے؟ اور کبھی اس کا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔ یہ دیکھنا اتنی بار ہوا کہ ان جالیوں کی صورت مجھے اچھی طرح یاد تھی۔ جب مجھے اللہ تعالیٰ نے پہلی بار حرمین شریفین کے سفر سعادت سے نوازا اور حج کرنے گئی، تو روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جالیاں دیکھ کر دم بخود رہ گئی کہ یہ تو وہی جالیاں ہیں جنہیں میں رات کی عبادت ومناجات میں استاد صاحب کے سامنے دیکھا کرتی تھیں۔

اسی طرح رات کو جب ہم گرمیوں میں گھر کے صحن میں سوتے تھے تو بارہا میں نے مشاہدہ کیا کہ آسمان سے

ستاروں کی طرح چمکدار چیزیں جگنو کی شکل میں نیچے استاد صاحب کے پاس آتیں۔ مجھے اس سے سخت ڈر محسوس ہوتا تھا، ایک بار میں نے استاد صاحب اس بارے میں پوچھا، تو آپ نے غصے سے ٹال دیا، لیکن میں پھر عرض کیا کہ مجھے اس سے ڈر لگتا ہے، آپ نے اس پر فرمایا کہ یہ ارواح ہیں، اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟

جب آپ سفر سے تشریف لاتے تو یہ معمول تھا کہ آپ کی غیر موجودگی میں آنے والوں کے بارے میں پوچھتے کہ کون آیا تھا؟ اور کس ضرورت کی وجہ سے آیا تھا؟ ایک بار آپ کی غیر موجودگی میں گاؤں درسمند سے ایک خاتون تشریف لائیں کہ میرا بیٹا بحری جہاز سے عرب کے سفر پر گیا تھا لیکن ایک عرصہ بیت گیا ہے اس کا کوئی پتہ نہیں کہ زندہ ہے یا مردہ؟ استاد صاحب سے دعا اور وظیفہ کے پوچھنے کے واسطے آئی ہوں کہ میرا بیٹے کی خیریت کی کوئی اطلاع مل جائے۔ آپ واپس تشریف لائے تو اگلے دن پوچھنے پر میں نے اس عورت کی داستان عرض کی۔ اس پر ناراضی کا اظہار فرمایا کہ کل ہی بتانا چاہیے تھا، مجھے کسی نے خواب میں اس لڑکے کے بارے اطلاع دی ہے۔ پھر مجھے ایک سفید کاغذ دے کر فرمایا کہ اسے سلائی مشین میں رکھ کر اس پر مشین الٹا چلانا شروع کریں۔ میں کاغذ سوئی کے نیچے رکھ کر الٹا چلاتی رہی اور اس دوران آپ کوئی عمل پڑھتے رہے۔ ظہر کے قریب وہ خاتون ہمارے گھر تشریف لائی اور کہا کہ الحمدللہ میرا بیٹا باعافیت گھر لوٹ آیا ہے۔

ایک بار ہماری ایک رشتہ دار خاتون نے کسی کے لیے جنات کا تعویذ مانگا اور میرے ذریعے سے عرض کیا، آپ نے فرمایا کہ تعویذ ایک جہت سے اچھی چیز ہے لیکن دوسری جہت سے اچھی نہیں بھی ہے۔ اگر عامۃ الناس بددین اور شیعہ عاملوں کے پاس نہ جاتے تو میں کبھی عملیات کا کام نہ کرتا۔ اگلے دن میں نے پھر یاد دہانی کروائی تو غصہ میں فرمایا کہ آپ کو میں ہی لایعنی نظر آیا ہوں، یہ تعویذ سے کیا بنا رکھا ہے، جا کر پوچھیں وہ مریض ٹھیک ہو چکا ہے۔ میں نے معلومات کروائیں تو ان لوگوں نے کہا کہ جنات تو کل چلے گئے اور اس پر بڑے ناراض تھے کہ آپ لوگوں نے استاد صاحب کو کیوں شکایت لگائی۔ آخر عمر میں باقاعدہ مجھے یہ تلقین فرماتے تھے کہ خواتین جب کسی مسئلہ کے لیے تعویذ مانگیں تو انہیں اسماء الحسنیٰ کا ورد بتادیا کریں۔ تعویذ سے عقیدہ کمزور ہوتا ہے۔

آپ کے پاس اپنے بزرگوں کی کئی تبرکات تھیں۔ ان کو گھر کے ایک بکس میں سنبھال کر رکھا تھا، خصوصاً ایک مٹی کے برتن کے بارے میں مجھے سخت تاکید کی تھی کہ اس کی بڑی فکر رکھنی ہے کہ کہیں ٹوٹ نہ جائے۔ مجھے بتایا کہ یہ برتن روضۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مٹی مبارک کو بیر زمزم اور بیر شفا کے پانی میں گوندھ کر بنایا گیا ہے۔ اب یہ معلوم کرنے کی جرأت مجھے نہیں ہوئی کہ وہ برتن آپ کے پاس کہاں سے آیا تھا؟ تاہم اس برتن کی حفاظت تمام اشیا سے بڑھ کر کرتے تھے۔ اسے کبھی استعمال نہیں فرمایا، بلکہ جب ہاتھ میں لیتے تھے تو رنگ متغیر ہو جاتا اور جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی۔

حضرت کی توجہ اور شفقت الحمدللہ ہمیشہ مجھ پر میرے استحقاق سے بڑھ کر رہی۔ ہر بیوی کی خواہش ہوتی ہے کہ اسے اپنے شوہر سے ہر طرح کی راحت اور آرام ملے لیکن عورت کی ایک نفسیات یہ بھی ہے کہ وہ شوہر کی محبتوں اور چاہتوں کے باوجود اپنا مخدوم ہی دیکھنا پسند کرتی ہے اور خود خادمانہ رویے کو اعزاز سمجھتی ہے جب شوہر اس کے خادمانہ رویے کا اعتراف کرے اور اسے سراہے تو خاتون پھولے نہیں سماتی۔ اس نفسیات کے تحت حضرت سے تمام تر ناز ونیاز کی تمنا کے باوجود میری قلبی خواہش یہی رہی کہ میری خادمانہ زندگی پر آپ کا اطمینان رہے اور الحمدللہ حضرت سے اطمینان کی سند مجھے ملتی رہی لیکن بعض اوقات حضرت میری راحت کے خیال میں کچھ ایسا کر جاتے کہ میں شرم سے پانی پانی ہو جاتی۔

ایک دفعہ میں سخت بیمار تھی، زور کا بخار تھا، گھر کے کاموں کا بھی ہجوم تھا، حضرت کو میری بڑی فکر تھی، لیکن وہ کچھ اہم قومی مسائل میں اُلجھے ہوئے تھے۔ بخار میں تپتے تپتے پتہ نہیں کب میری آنکھ لگ گئی۔ رات کو حضرت گھر آئے تو بجلی نہیں تھی، حضرت کو فکر ہوئی کہ اس کی آنکھ لگ گئی ہے، کہیں گرمی کی وجہ سے دوبارہ جاگ نہ جائے۔ آپ نے دستی پنکھا اُٹھایا اور جھلنا شروع کیا۔ پتہ نہیں کتنی دیر سے بجلی نہیں تھی اور کتنا وقت آپ پنکھا جھلتے رہے کہ اچانک کروٹ لیتے ہوئے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ رات کے قریباً دو پہر گزر چکے ہیں اور حضرت بیٹھ کر پنکھا جھل رہے ہیں۔ میری آنکھیں بھر آئیں اور اچھل کر بیٹھ گئی اور منت سماجت کرتی ہوئی بولی کہ حضرت! یہ کیا غضب کرتے ہیں؟ مجھے کیوں گناہ گار کر رہے ہیں؟ حضرت اس پر قدرے غصہ ہو کر فرمانے لگے کہ آپ بیمار ہیں اور آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ ٹھیک ہے میں پختون ہوں اور آپ کی پختونی غیرت میرا یہ سب کچھ گوارا نہیں کر رہی۔ لیکن یہ میرا فرض تھا، آپ آرام کریں۔ اب آرام مجھے کہاں آئے؟ میں سوچتی رہی کہ ایسے شفیق خاوند بھی ہوا کرتے ہیں۔ سارا دن مہمانوں کا ہجوم رہا ہے۔ لمحہ بھر کے لئے آپ کو آرام کی فرصت نہیں ملی، سنگین قومی مسائل چل رہے ہیں، اس کی وجہ سے سخت ذہنی تھکاوٹ ہوتی ہوگی۔ پھر رات دیر تک مطالعہ میں مصروف رہے ہوں گے لیکن ان تمام تھکاوٹوں کے باوجود میرے آرام کی اس درجہ فکر ہے۔ یہ سب کچھ میرے لئے بہت عجیب تھا کیوں کہ ہم جس ثقافت میں زندگی گزارتے تھے، وہاں کا مرد تو صرف بت ہوتا تھا اور عورت کے ذمے اُس کی پوجا ہوتی تھی، لیکن یہ دین کی برکت تھی کہ حضرت نے ہمارے حق سے زیادہ ہمارا خیال رکھا۔

حضرت نے سارے بچوں کی شادیاں ایسی سادگی سے کیں کہ کم از کم ہمارے علاقے کی حد تک کوئی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ شادی چونکہ اسلامی معاشرے میں اتنی مشکل نہ تھی، جتنا اسے آج کل بنا دیا گیا، اس لئے لوگ طرح طرح کی مصیبتوں، قرضوں اور آزمائشوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ حضرت کی تربیت کی برکت تھی کہ ہم خواتین کو

بھی شادیوں کے حوالے سے حضرت کے رویے پر کوئی ناراضگی یا اشکال پیدا نہیں ہوا۔ یوسف کی شادی اس طرح ہوئی کہ حضرت مولانا عبداللہ صاحبؒ مدرسہ تشریف لائے ہوئے تھے۔ عصر کی نماز کے بعد حضرت نے اعلان فرمایا کہ ابھی حضرت مولانا عبداللہ صاحب ایک نکاح پڑھائیں گے۔ آپ حضرات میں جو شریک ہونا چاہتے ہیں تشریف رکھ لیں۔ پھر حضرت نے یوسف کو بلایا، اُس بے چارے کو علم ہی نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے؟ حضرت نے اُن سے فرمایا کہ بھئی! حضرت تیرا نکاح پڑھیں گے، اُسی مجلس میں سادگی سے نکاح پڑھا گیا، حضرت نے خود ہی کچھ چھوارے منگوائے تھے وہ حاضرین میں تقسیم فرمائے۔ مجھے گھر میں اطلاع ملی کہ یوسف کا نکاح ہو گیا، خوشی بھی تھی تعجب بھی تھا لیکن حضرت کی ادائیں تو ساری ہی ایسی نرالی تھیں، لہٰذا کیا کہا جا سکتا تھا اور کچھ کہنے کی جرأت بھی نہ تھی۔ جب گھر تشریف لائے تو فرمایا کہ ضروری انتظام کر لیں، تین دن بعد یوسف کا ولیمہ ہوگا۔ لہٰذا میں ضروری انتظام اور رشتہ داروں کو پیغام دینے میں لگ گئی، ولیمہ بھی انتہائی سادہ مختصر فرمایا۔ اس طرح جب بڑی بچی کا نکاح اور رخصتی تھی۔ تو یوسف تک کو علم نہ تھا، ایک دن قبل بتایا کہ ضروری انتظام کر لیں کل بچی کو رخصت کرنا ہے۔ اگر ہمارا معاشرہ شادی کے متعلق اس معیار کو اپنا لے تو نہ تو کوئی پریشانی ہوگی اور نہ یہ مصیبتیں پڑیں گی جو شادی کے بعد خاندانوں کے ٹوٹنے کی شکل میں پڑتی ہیں۔

میرے والد صاحب کی پہلی اہلیہ سے اولاد نہ تھی۔ اولاد کی خواہش میں دوسرا عقد کیا اور میری شکل میں اللہ تعالیٰ نے 'اکلوتی' اولاد عطا فرمائی۔ میرا کوئی بھائی تو تھا نہیں، والد صاحب بھی شادی کے چند سال بعد انتقال کر گئے تھے۔ فطرتاً ایسی عورت اپنے اندر ایک محرومی کا احساس رکھتی ہے۔ لیکن حضرت کے سلوک نے مجھے ہر رشتہ کی چاہت سے مستغنی کر دیا تھا، کبھی عمر بھر احساس نہیں ہونے دیا کہ میرا بھائی یا باپ موجود نہیں ہے۔

شادی کے بعد ہم حضرت کے بڑے بھائی اور میرے جیٹھ حاجی عین الدین صاحب کے ساتھ ایک گھر میں شریک رہتے تھے۔ حضرت نے مجھے جیٹھانی صاحبہ سے عاجزانہ تعلق، اُن کی خاطر داری، کاموں میں بڑھ چڑھ کر معاونت کی ہمیشہ تاکید کی۔ باورچی خانے کا کام شروع سے میرے سپرد رہا کیونکہ طلبہ کا کھانا بھی مجھے بنانا ہوتا تھا تو گھر کا بھی میں بناتی۔ حضرت مجھے ہمیشہ قناعت کی تلقین کرتے۔ مشترکہ گھر میں اس درجہ احتیاط رکھی کہ مجھے کہا کہ آپ چونکہ کھانا بناتی ہے، آپ کو اندازہ ہے کہ گھر کے افراد کتنی مقدار کھاتے ہیں، خواتین میں جو سب سے کم مقدار کھاتی ہو۔ آپ اپنے کھانے کی مقدار اُس سے کم رکھیں اور مردوں میں جو سب سے کم کھاتا ہو، میرے لئے اس سے بھی کم مقدار رکھا کریں۔ اس پر فقر و فاقے کی فضیلتیں اور کم کھانے کے فوائد بتلاتے تھے۔ اکابر کے دُنیا سے بے رغبتی اور قلت طعام کے واقعات سنایا کرتے تھے۔ بحمداللہ میرا ایسا مزاج بن گیا تھا کہ بارہا میں نے اور حضرت نے

ایک ہی روٹی پر گزارا کیا، عمدہ کھانوں کی تو کبھی طلب نہیں فرمائی۔ قناعت اس درجہ تھی کہ شروع میں یومیہ مقدار کے مطابق سودا سلف لاتے تا کہ ضائع نہ ہو، کیونکہ جب ہر چیز زیادہ ہوتی ہے تو خواتین زیادہ مقدار میں بنالیتی ہیں جس سے بچ جانے اور ضائع ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ تکلف کی زندگی سے اتنا دور تھے، کہ ایک بار جب آپ چھٹیاں گزار کر کراچی واپس جارہے تھے تو رات کو گھر میں کھانے کا کوئی خاص بندوبست نہ ہوسکا، آپ نے وہی معمولی چیز جو گھر میں پکی تھی کھالی، رات کو میں نے عرض کیا کہ لوگ دبئی جاتے ہیں تو ان کے لئے گھروں میں دنبے ذبح ہوتے ہیں، مجھے سخت کوفت ہوئی کہ آپ ایک لمبے عرصے بعد گھر آتے ہیں اور آپ کے لئے تھوڑا بھی اہتمام نہ ہوا۔ اس پر بہت سخت ناراض ہوئے کہ آپ کو یہ خیال کیسے پیدا ہوا اور آپ نے یہ بات کیسے کہہ دی؟ اور یہ ناراضگی اتنی شدید تھی کہ صبح میلے کپڑوں میں تشریف لے گئے، کپڑے تبدیل کرنا بھی گوارا نہیں فرمائے۔

ایک موقع پر میں نے عرض کیا کہ حضرت! بحمد اللہ میں تو ہر حال میں آپ کے ساتھ راضی ہوں اور ہر حالت کو اللہ کا انعام سمجھتی ہوں لیکن دل چاہتا ہے کہ ذرا بچوں کے لئے عمدہ لباس، عمدہ چیزیں اور عمدہ کھانا پینا ہوا کرے۔ اس پر قدرے جلال میں آکر فرمایا کہ تو بچوں کی عجیب ماں ہے! عمدہ لباس پہنا کر اور عمدہ چیزیں دلوا کر زبردستی انہیں ہلاکت کے گڑھے میں پھینکنا چاہتی ہے۔ آپ اس وقت اکڑوں بیٹھے ستون سے پشت لگائے ہوئے تھے۔ سامنے ایک چھوٹا سا پتھر پڑا تھا۔ جلال میں وہ ہاتھ میں اٹھایا اور اس پر نظریں گاڑھ دیں۔ میں دیکھ کر دہل گئی کہ اس کا رنگ بالکل زرد سونے جیسا ہو گیا، پھر اسی جلال میں مجھے مخاطب کر کے بولے کہ تیرا کوئی بھائی نہیں، ورنہ میں تجھے یہ پتھر دے کر کہتا کہ جا اپنے بھائی کو دے اور اسے کہہ کہ اسے دُنیا میں لے کر پھرے کہ اس کی کیا قیمت ہے؟ پھر وہ پتھر دور پھینکتے ہوئے بولے، یہ دُنیا کا سامان اور آسائش کچھ نہیں، میں روزانہ دو رکعت صلوٰۃ حاجت پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگتا ہوں کہ مجھے اور میری اولاد کو دُنیا کے فتنے سے محفوظ رکھنا۔ آپ کے اس تصرف سے میری ایسی آنکھیں کھلیں کہ آئندہ کبھی اولاد کے لئے بھی عمدہ چیز کی خواہش پیدا نہ ہوئی۔

ایک موقعہ پر میں نے عرض کیا کہ مدرسہ کی مصروفیات بڑھ گئی ہیں، اگر آپ مدرسہ کے کام میں یکسوئی کے لئے معاشی ذمہ داریوں کا کوئی دوسرا ذریعہ تیار کرلیں۔ اپنے بھائیوں یا متعلقین میں کسی کے ساتھ کچھ رقم تجارت میں شامل کرلیں تو اس طرف سے بے فکر رہیں گے اور مستقبل میں اولاد کے لئے بھی معاش کا ایک حلال ذریعہ میسر ہوگا۔ اس پر فرمایا کہ اس کی فکر نہ کریں میں نے اپنے تو کیا پرایوں میں بھی محبت کے بیج بوئے ہیں۔ اپنی اولاد کے لئے کانٹے نہیں لگائے۔ اگر اس دیار کے لوگ نمک حرامی نہ کریں تو سو سال تک میری نسلیں ایسی عزت اٹھائیں گی جیسی میں نے اس قوم کو دی ہے اور انہیں دینی خدمت کی راہ میں کبھی معاش کی فکر نہیں ستائے گی۔

بچوں کی تربیت کا اُن کے بچپن ہی سے خاص خیال رکھا، گود کے بچے کے علاوہ مجھے بڑے بچوں کو میکے لے جانے سے منع کرتے تھے کہ اس طرح بچے وہاں کی رعایتوں سے بگڑ جاتے ہیں۔ بچوں کو کرکٹ، گلی ڈنڈا یا دیگر ایسے اجتماعی کھیلوں سے سختی سے منع کرتے تھے جن میں ایک دوسرے سے ضد، مقابلہ بازی، حسد، بغض، بدخوئی، اوقات کے ضیاع اور دوسروں کی اذیت کا خدشہ ہوتا تھا، اس طرح بچے گالی گلوچ سیکھ لیتے ہیں اور بری عادتیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ فرماتے: ان کھیلوں سے بچپن ہی میں بچوں کے اندر یہ رذائل جڑ پکڑ لیتے ہیں اور بعد میں ان کی زندگی برباد کردیتے ہیں۔ گھر ہی میں بچوں کے لئے گاڑیوں کے کھلونے لے کردیتے تھے اور گھر کے اندر ہی اُن کے لئے کھیل کا ماحول بناتے تھے۔

جب یوسف کی پیدائش ہوئی تو ان کی خواہش تھی کہ ان کا نام ''ادریس'' رکھیں لیکن خواب میں مفتی ولی حسن ٹونکیؒ کی زیارت ہوئی اور انہوں نے تاکید کی کہ بچے کا نام ''یوسف'' رکھنا ہے۔ حضرت فرماتے تھے کہ میں نے اپنے استاذ حضرت بنوری قدس سرہ کو کبھی نام لے کر یاد نہیں کیا، بڑی بے ادبی معلوم ہوتی ہے کہ اسے یوسف یوسف پکارتا ہوں، حضرت بنوریؒ بہت بڑے انسان تھے، مجھے خوف رہتا ہے کہ کہیں ان کے نام کی بے ادبی نہ ہوجائے۔

ایک دفعہ مولانا حبیب اللہ مختارؒ کراچی سے تشریف لائے، تو یوسف کے لئے موٹروں کا بڑا ڈبہ لائے۔ میں نے کھولا تو اس میں موٹر کے ۲۱ کھلونے تھے۔ حضرت اس پر ہنس دیئے کہ مولانا کا خیال ہوگا کہ یوسف بھی کراچی کے صاحبزادوں کی طرح مخدوم ہوگا، میری تو کوشش ہے کہ اسے مخدومیت کی بو بھی نہ لگے، اسے خادم بنا کر چھوڑوں
۔

بچوں کو روزانہ رات کھانے سے آدھا گھنٹہ قبل بٹھلاتے اور دسترخوان، ملاقات، مسجد اور پڑوس کے آداب و حقوق سکھلاتے۔ پھر بچوں کا امتحان لیتے اور درست جواب پر نقدی انعام میں دیتے۔ میں اس دوران کھانا لگا رہی ہوتی تھی۔ کبھی مجھے کہتے کہ بچوں سے کھانا لگوائیں تاکہ یہ عملاً طریقہ سیکھیں۔ خود ہاتھ دھلواتے، کھانے کی دُعا پڑھواتے، دسترخوان پر کھانا لگانے اُٹھانے کی ترتیب سکھلاتے اور کھانے پینے کا مسنون طریقہ تلقین کرتے ۔ الحمدللہ بچپن ہی سے بچوں میں یہ عادتیں جڑ پکڑ گئی تھیں۔ کھانے کے بعد نماز، دُعاؤں اور کلمات سکھانے کی کلاس ہوتی۔ تقریباً آدھا گھنٹہ بچوں کو یہ سکھلاتے۔ گھر کے سارے بچے آپ کے اردگرد بیٹھ کر اس مجلس میں دلچسپی لیتے بلکہ اس کا انتظار کرتے۔ اس مجلس میں نماز وغیرہ کی عملی مشق بھی بچوں سے کرواتے۔

بچیوں کی تعلیم کا اپنا نصاب تجویز فرمایا تھا۔ ہماری بیٹیوں، حضرت کی بھتیجیوں اور بھانجیوں سب نے حضرت سے یہ نصاب پڑھا۔ آپ روزانہ فجر کے ایک گھنٹہ بعد تک اس کی تعلیم دیتے۔ اس نصاب میں اولاً با تجوید ناظرہ

قرآن، پھر تعلیم الاسلام، پھر بہشتی زیور کا پشتو ترجمہ، پھر اسلامی فقہ پشتو پھر معارف الحدیث کا پشتو ترجمہ اور آخر میں معارف القرآن کا پشتو ترجمہ پڑھایا۔ اس کے ساتھ قرآن مجید کا لفظی ترجمہ بھی بچیوں کو پڑھایا۔ میں نے ایک موقع پر بچیوں کو درس نظامی پڑھانے کی تجویز دی تو فرمایا: یہ اس کی مکلف نہیں ان کے لئے یہی کافی ہے۔

بچیوں کو بوقت رخصتی خاص تاکید کی کہ خاوند کے گھر میں کبھی کسی چیز کا طمع یا لالچ نہیں رکھنی، نہ ہی اپنے منہ سے کسی چیز کا مطالبہ کرنا ہے۔ جہیز میں سلائی مشین دی تا کہ اپنے ہاتھ سے کام کاج کر سکیں۔ اس کے علاوہ ضرورت کا مختصر سامان یعنی چند جوڑے کپڑے، تکیہ بستر اور کھانے پینے کے کچھ برتن خرید کر دیئے اور مروجہ تکلفات میں نہ خود پڑے نہ مجھے اجازت دی۔

حضرت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مجھ بندی پر جو خاص احسانات فرمائے، اُن میں سے ایک طلبہ کرام مہمانان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کا موقع ہے۔ ۱۹۸۰ء میں جامعہ یوسفیہ قائم ہوا تو اُس وقت سے طلبہ کے لئے گھر کے کنویں سے میٹھا پانی بھرنا اور طلبہ کا سالن روٹی بنانا میرے ذمے تھا۔ کچھ عرصہ تک سالن روٹی دونوں کی خدمت میرے سپرد تھی۔ پھر جب طلبہ کرام کی تعداد بڑھ گئی تو حضرت نے روٹی پکانے کے لئے مدرسہ میں تندور لگا کر باورچی رکھ لیا۔ لیکن سالن پکانے کی خدمت الحمدللہ آج تک بدستور نصیب ہے۔ ۲۷ سال ہو چکے ہیں، اللہ تعالیٰ معذوری سے محفوظ رکھے۔ سردی گرمی بارش ہر موسم میں کبھی ناغہ نہیں ہوا، اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے اور آئندہ بھی توفیق بخشے گو کہ اب مدرسہ میں طلبہ کی تعداد بہت بڑھ چکی ہے۔ موقوف علیہ تک اسباق ہیں، حفظ کی پانچ جماعتیں ہیں لیکن بحمد اللہ کوئی مشکل اور تکلیف پیش نہیں آتی اور سارا کام اکثر خود کر لیتی ہوں۔ سالن کے لئے حضرت لکڑیاں خود باہر سے لاتے، جب کہ برتن دھونے اور پکانے کی ذمہ داری میری تھی۔ اجتماعی اموال میں اس قدر احتیاط فرماتے تھے کہ مدرسہ اور گھر کے سامان کے لئے علیحدہ جگہیں مقرر تھیں تا کہ باہم اختلاط نہ ہو۔ فرماتے تھے کہ دنیا کے حرام سے جس قدر بچو گی، جہنم کی آگ سے اتنی دور ہو گی۔

خود بھی صابر و شاکر تھے، دوسروں کو بھی یہی تلقین کرتے تھے۔ جب ہمارا دوسرا بیٹا محمود الحسن ڈھائی سال کی عمر میں فوت ہوا تو مجھے بڑی تسلی دی۔ فرمایا کہ بچپن میں فوت ہونے والی اولاد قیامت میں والدین کے لیے اللہ میاں سے جھگڑا کرے گی، یہاں تک کہ وہ والدین کی شفاعت کرالے گی۔ لہٰذا محمود ہمارا شفیع بن کر آگے گیا ہے۔

حضرت کی ایک خوبی عمر بھر بڑی پسند آئی کہ کبھی کھانے میں کوئی عیب نہیں نکالا، نہ ہی کسی خاص چیز کی خواہش اور تمنا کی جو کچھ میسر ہوا، شکر کر کے عاجزانہ کھا لیتے۔ گھر میں مرغیاں پال رکھی تھیں۔ کچھ نہ ہوتا تو انڈوں کا آملیٹ بنا لیتی وہی خود بھی رغبت سے کھاتے اور حاضرین کو بھی کھلاتے۔ فرماتے کہ انڈوں سے سخت کوفت ہوتی ہے

اور طبیعت پر راس نہیں آتے مگر حضرت الشیخ علامہ بنوریؒ بہت شوق سے تناول فرماتے تو میں بھی حضرت کی وجہ سے نہایت رغبت ومحبت سے کھالیتا ہوں۔

حضرت کی قوت بینائی، شنوائی اور شامہ عام انسانوں سے بہت قوی تھیں، قوت ادراک وامتیاز بھی عجیب تھی، فرماتے کہ جب میں گھر سے تین کلومیٹر دور وریچ بازار پہنچتا ہوں تو گھر کے جانوروں کی آوازیں سنتا بھی ہوں اور پہچان بھی لیتا ہوں کہ یہ کس بکری اور گائے کی آواز ہے۔ ایک دفعہ گھر میں داخل ہوئے تو فرمایا کہ سانپ کی بو آرہی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ بھلا سانپ کی بھی کوئی بو ہوتی ہے؟ فرمایا: تیری ناک بند ہے، تجھے کیا پتہ چلے۔ پھر تلاش کیا تو واقعتاً سانپ برآمد ہوا۔ حضرت کی کس کس ادا کو یاد کیا جائے، آپ ہر حوالے سے قابل رشک تھے، جب وطن کے حالات خراب ہوئے تو سخت پریشان رہتے تھے، شہادت سے قبل کچھ ایسی کیفیات طاری تھیں اور ایسی باتیں ارشاد فرماتے تھے کہ میرا دل گھبرا جاتا، وساوس گھیر لیتے کہ حضرت یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں، ان باتوں میں اس طرف اشارہ ہوتا کہ گویا آپ کا وقت پورا ہو چکا ہے اور کوچ کی تیاری ہے۔

جس دن حملہ ہوا، تو پہلا بم مدرسہ کے پیچھے کتب خانہ کی عمارت کی پچھلی دیوار کے ساتھ گرا۔ جس سے کتب خانہ کی چھت گر گئی، اس پر طلبہ واساتذہ نے مدرسہ خالی کر لیا، آپ اس وقت گھر میں تھے، اساتذہ کے چائے کا وقفہ تھا، اس دوران جب اساتذہ کی چائے مدرسہ چلی جاتی تو گھروں کے بچے بھی مدرسہ چلے جاتے، عموماً برتن لاتے تو اساتذہ کھانے پینے کی کوئی چیزیں دے دیتے، اس دوران میں مفتی عظمت اللہ صاحب (رئیس دارالافتاء جامعہ یوسفیہ) کی ساڑھے تین سالہ بچی حدیقہ بھی باہر نکلی تھیں، وہ پہلے بم کا نشانہ بن کر شہید ہو گئیں۔ حضرت پہلے حملے کے بعد تیزی سے اٹھے اور مدرسہ کی طرف نکلنے لگے، میں نے آگے بڑھ کر دامن پکڑا اور راستہ روک لیا کہ آپ ہرگز نہیں نکلیں گے۔ فرمایا کہ راستہ سے ہٹ جائیں، اب آخری وقت ہے۔ میں مزید اصرار کرنے لگی تو حضرت نے جلالی انداز میں فرمایا کہ اب تک اچھی زندگی گزری ہے، آخری وقت ہے، آپ آخر میں کیوں ناراض کرتی ہو۔ میرے ساتھ آخری گفتگو اس بات پر ختم کی کہ طلبا شہید ہوں گے اور میں زندہ رہوں گا۔ اساتذہ وطلبا اکیلے ہیں مجھے جانے دیں۔ فرمایا کہ سورت یٰسین کی تلاوت شروع کرو، خود بھی یٰسین کی تلاوت شروع کی۔ طلبہ سے تو آپ کی محبت مثالی تھی، آپ کو کہاں چین آرہا تھا۔ ہم نے بہت روکنے کی کوشش کی لیکن آپ گھر کے دروازے سے نکل کر متصل مدرسہ میں داخل ہو گئے۔ میں دیوانہ وار پیچھے بڑھی۔ طلبہ واساتذہ تو مدرسہ کب کا خالی کر چکے تھے۔ وہ مدرسہ سے باہر جنگل اور کھیتوں میں بکھر گئے تھے، اسی اثنا میں عزیزم مولوی طاہر کا چھوٹا بیٹا عبدالرحمن جس کی عمر گیارہ بارہ سال تھی، بھاگتا ہوا گھر سے نکل کر حضرت کے پیچھے مدرسہ میں داخل ہو گیا۔ حضرت بڑی بے چینی سے مدرسہ میں ارد گرد نگاہ

ڈال رہے تھے کہ مسجد اور دفتر کی درمیانی گلی میں اچانک دوسرا بم آ گرا۔ میں نے اپنے سر کے تاج کو خود گرتے ٹوٹتے دیکھا۔ عبدالرحمن بھی گر گئے۔ میں آگے بڑھی تو گرد وغبار کے بادلوں میں آنکھوں سے سب کچھ اوجھل ہو گیا، کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ گھر کے افراد تیزی سے دوڑتے اندر آئے، میرے ہوش وحواس معطل تھے۔ مجھے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اس ملبے میں حضرت کہاں ہوں گے۔ حضرت کے آخری کلام اور انداز سے مجھے علم ہو گیا تھا کہ اب حضرت اس دنیا سے کوچ کرنے والے ہیں۔ میں اس نتیجہ تک پہنچ گئی کہ کئی دنوں سے جو فرماتے تھے کہ بس میں جانے والا ہوں، سو اب وہ وقت پہنچ آیا جس کے وہ منتظر تھے۔ دور سے دیکھتی رہی کہ مدرسہ میں آہ وبکاہ کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ ماتم کا ماحول بن گیا، حضرت کی لاش ملبے سے نکالی گئی، اب میری آنکھیں ترس رہی تھیں کہ میں حضرت کی لاش کا کب دیدار کروں گی کیونکہ ظالموں کے اڑتے طیاروں میں آپ کے زخموں سے چور چور جسم کو گھر تک لانے کے حالات نہیں تھے۔ میں دیکھتی رہی کہ عزیز طلبا حضرت کی لاش جنگل کی طرف لے گئے ہیں، کبھی ایک درخت کے نیچے رکھتے کبھی دوسرے درخت کے نیچے۔ بالآخر مدرسہ کے پڑوس میں حاجی ربیب صاحب کے گھر لے گئے۔ پھر بھی طیاروں کی پروازیں جاری تھیں، جس کی وجہ سے حضرت کی لاش دوسری جگہ منتقل کرنے کے لئے گاڑی میں لے گئے، طیارے واپس لوٹے تو دو گھنٹوں کے بعد حضرت کی لاش واپس لائی گئی اور اپنے گھر کے بجائے حضرت کے بڑے بھائی حاجی مسلم الدین صاحب کے گھر میں رکھی گئی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ حضرت کی لاش پر کوئی ظاہری زخم نظر نہیں آ رہا تھا مگر صرف سر مبارک سے بارش کی قطروں کی طرح خون ٹپک رہا تھا، اس سے پہلے میں نے اس سر کو کبھی رب کے حضور سجدوں میں، کبھی اللہ اللہ کے ضربیں لگانے میں اور کبھی اس قوم وملت کی کامیابی کی فکر میں ڈوبا دیکھا تھا۔ مجھے کیا پتہ جن کے لئے بے چین ہیں وہی آپ کو ہم سے چھین لیں گے۔ عجیب بات تھی کہ باقی پورا جسم صحیح وسالم تھا، نہ بدن پر داغ، نہ زخم کا نشان تھا۔ عجیب قیامت تھی جو ٹوٹ پڑی، انسان بھی کیا چیز ہے! کیسے کیسے غموں کے پہاڑ سہہ لیتا ہے، یہ غم کا طوفان تھا جو موجیں مار مار کر قلب وذہن کی دنیا میں طلاطم برپا کر رہا تھا، اپنے حواس واپس آتے آتے عرصہ بیتا۔ میری ساری کائنات حضرت کی ذات تھی، یوں لگا جیسے زندگی کا ہر عیش وآرام رخصت ہو گیا۔ زندگی پھیکی پڑ گئی، حضرت کی برکات وعنایات اور ان کی شفقتوں ومحبتوں کی یاد دن رات ستاتی ہے۔ میرے دامن میں اللہ تعالیٰ کے اس مقبول بندے کی رفاقت کے سوا اور کچھ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دین ودنیا کی جو سعادتیں نصیب فرمائی ہیں وہ سب حضرت ہی کی برکت سے ہیں۔

میں اپنے ان بچوں کے لئے دعا گو ہوں جنہوں نے حضرت کے حالات کو جمع کرنے کا عزم کیا ہے، جس دن سے عزیزم محمد یوسف نے بتایا ہے کہ حضرت کے ایک شاگرد مولانا محمد طفیل صاحب حفظہ اللہ یہ عظیم کام کر رہے ہیں، اس

دن سے روزانہ دو رکعات صلوٰۃ حاجت خاص اس کام کی سہولت اور مقبولیت کے لئے پڑھتی ہوں، دعا بھی کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کام کو آسانی سے تکمیل تک پہنچا کر زیادہ سے زیادہ مقبول و مفید بنائے۔ ہم سب کو حضرت کی برکات سے مالا مال فرمائے، دنیا و آخرت کی سعادتیں نصیب فرمائے اور ساتھ ہی روز قیامت میں حضرت کی رفاقت و شفاعت بھی نصیب فرمائے۔ بارگاہِ ایزدی میں دست بدعا ہوں کہ اللہ تعالیٰ حضرت کو شہید کرنے والے ظالموں سے پورا پورا حساب لیں، اس ظلم ناروا پر ان کو آخرت میں رسوا کر دیں اور اس دنیا میں بھی عذاب چکا دیں تا کہ میں اپنی ترستی آنکھوں سے اس کا نظارہ کر سکوں۔ آخرت میں تو ان شاء اللہ ان کی تباہی و بربادی ویسے بھی مقرر ہے۔

میرے بھائی، میرے محسن

حاجی مسلم الدین

ہمارے چھوٹے بھائی مولانا محمد امین شہید رحمہ اللہ تعالیٰ کی برکت ہے کہ ہمارے گھرانے اور علاقے پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور عنایات بارش کی طرح برس رہی ہیں۔ ہم قبائلی اور سادہ لوح لوگ ہیں، ہمیں کون جانتا؟ کون دعائیں دیتا؟ کون ہمارے ان ویران علاقوں کو شرفِ قدوم بخشتا؟ سینکڑوں علما اور اکابر ہمارے دستر خوان پر مہمان بنے، ہمارے اعزاز کا باعث بنے، ہمارے گھر اور خاندان کو محبت دی، یہ سب مولانا محمد امین صاحبؒ کی برکت ہے۔ ہمارا خاندان اور پورا علاقہ اگر حضرت کے احسانات کا بدلہ چکانا چاہے تو ساری عمر لگا کر بھی نہیں چکا سکتا۔ حضرت ہمارے چھوٹے اور محبوب بھائی ہی نہیں بلکہ دل کا قرار، آنکھوں کی ٹھنڈک، روح کا سکون اور محبت و عقیدت کا مرکز تھے۔

بہن بھائیوں میں بڑا میں تھا۔ جب ۱۹۵۲ء میں والد صاحب دنیا سے کوچ کر گئے، تو میں بھی نابالغ تھا، لیکن والد صاحب نے الحمدللہ ہر طرف ہمارے لئے پھول بکھیرے تھے۔ نیک سیرت، غمخوار، انسان دوست اور محبت کرنے والے شخص تھے۔ اسی وجہ سے ہمارے چچاؤں نے ہمارے استحقاق سے بڑھ کر ہماری خبر گیری کی۔ جس طرح یتیم بچوں کی جائیدادوں کو ہتھیا لیا جاتا ہے اور انہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ہمارے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا، بلکہ ہمارے چچاؤں نے بچوں کی طرح ہماری نگہداشت کی۔ صرف چچا ہی کیا... والد صاحب کے

سارے دوست احباب اور متعلقین ہمارا سہارا بنے۔ والد صاحب نے صرف اپنی قوم (شیخان) ہی نہیں دیگر قبائل میں بھی لوگوں کے ساتھ اتنے احسانات کر رکھے تھے کہ وہ لوگ ہمارا بچوں کی طرح خیال رکھتے۔ والد صاحب کی حیات میں مجھے خود ان کے ساتھ غربا کے گھروں میں جا کر آٹا، گھی اور گڑ تقسیم کرنا یاد ہے۔

والد صاحب کے ایک دوست حاجی احمد صاحب درہ آدم خیل کے رہائشی تھے۔ جب میری عمر چودہ سال ہوئی تو انہوں نے مجھے بلا کر کہا کہ بیٹا! آپ کے والد نے ہمارے ساتھ بہت احسانات کیے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ ابھی سے کام کاج اور تجارت شروع کریں، کچھ تجربہ ہو جائے تو میں آپ کو اپنے ساتھ کام میں شریک کرلوں گا۔ چودہ سال عمر میں بدن کی کمزوری اور چھوٹے قد کے باعث میں دس گیارہ سال کا معلوم ہوتا تھا، میں نے تجارت کے لئے کمر باندھ لی، اورکزئی ایجنسی تیراہ سے لکڑیاں لاتا اور گھروں میں بیچتا۔ نوعمر ہونے کی وجہ سے خواتین پردہ نہیں کرتی تھیں۔ گھر کے اندر بلا کر لکڑیاں تڑوا بھی دیتیں۔ لکڑیوں کے گھٹے بیچنے اور لکڑیاں توڑنے کی مزدوری دن میں ایک روپیہ بن جاتی۔ چچا ہر جمعہ کو نماز جمعہ پڑھنے پختہ مسجد ہنگو شہر آتے تھے تو ہفتہ میں لگ بھگ آٹھ روپے انہیں دیتا۔ یوں اللہ تعالیٰ نے اپنی بیوہ ماں اور معصوم بہن بھائیوں کی کفالت کا میرے ذریعے بندوبست فرمالیا۔ مہینے میں تیس پینتیس روپے اچھی خاصی مزدوری تھی۔ لکڑیاں بیچنے کے کام میں میرا لوگوں سے رابطہ اور تعلق بنتا گیا۔ اب بڑی مقدار میں درخت خریدنے اور کٹوا کر بیچنے تک ترقی کرلی تھی۔ جب میری عمر ۱۸ سال ہوئی تو حاجی احمد صاحب نے مجھے بلا کر ۱۷۰۰ روپے دیئے کہ ان سے کاروبار شروع کریں۔ یہ ان کا ایسا احسان تھا کہ ہم آج تک نہیں بھول پائے، انہوں نے مجھے اپنے پاؤں پر کھڑا کیا، میں آج تک انہیں اپنے والدین کی طرح دعاؤں میں یاد رکھتا ہوں اور الحمدللہ ان کی اولاد سے بھی محبت اور تعلق رکھتا ہوں کیونکہ یہ خاندان ہمارا محسن ہے۔

حضرت استاذ صاحب اس زمانے میں مدرسہ میں داخل ہو گئے، ابتدا میں ہم گھر والوں نے انہیں روکنے کی کوشش کی، لیکن انہیں دینی تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ ذہین بھی تھے، شریف النفس بھی۔ بچپن سے بزرگوں جیسی عادتیں تھیں۔ اس لئے ہم نے انہیں مدرسہ جانے کی اجازت دی۔ عجیب بات ہے کہ کبھی مدرسہ جاتے ہوئے ہم سے پیسے نہیں مانگے۔ ہم خود دیتے تھے۔ کوشش رہتی تھی کہ حتی المقدور خیال رکھوں۔ تجارت کے لئے دربدر رہنے کی وجہ سے بے توجہی بھی ہو جاتی، لیکن آپ نے کبھی اشارے یا کنایے سے بھی خفگی کا یا اپنی ضرورت کا اظہار نہیں کیا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ مولانا اپنی خودداری اور استغنا کی وجہ سے کبھی کسی پر بوجھ نہیں بنے ہوں گے۔

حضرت مولانا بچپن ہی سے انتہائی معصوم اور مؤدب تھے۔ بچپن میں بچے ایسی شرارتیں تو کرتے ہیں کہ ڈانٹ ڈپٹ یا مارنے کی نوبت آجاتی ہے۔ لیکن آپ نے بچپن میں کبھی میرے یا والدہ کے ہاتھ سے مار یا ڈانٹ ڈپٹ

نہیں کھائی۔ والد صاحب کی وفات کے بعد چند سالوں میں والدہ کا سہارا بھی چھن گیا تھا، پھر چھوٹا بھائی فوت ہوگیا تھا۔ اس لئے میری کوشش بھی یہی ہوتی کہ بہن بھائی مجھ سے زیادہ خوش رہیں اور میں انہیں کچھ نہ کہوں۔ تمام بہن بھائیوں میں سے حضرت استاذ صاحب کا رویہ مجھ سے سب سے زیادہ ادب واحترام کا تھا۔ مجھے ہمیشہ والد کے برابر درجہ دیا، میں بیٹھتا تو تکیہ لا کر رکھ دیتے۔ آخری عمر تک اگر ایک نماز میں بھی موجود نہ ہوتا تو میرے متعلق دریافت فرماتے اور پھر آکر سلام کر کے پوچھتے۔ میرے سر میں درد بھی ہوجاتا تو عیادت کے لئے آجاتے اور علاج معالجہ کی فکر کرتے۔ میں طبیعت کا سخت مزاج تھا، لیکن علاج میں میری من مانی نہیں چلنے دیتے۔ پوری زندگی میرے لئے کبھی پریشانی کا باعث نہیں بنے، بلکہ مجھے ہر جگہ ان کی وجہ سے عزت ملی اور میرا احترام کیا گیا۔ لوگ مجھے کہتے کہ آپ کے گھر میں ہیرا ہے اس کی قدر کریں۔ حضرت کی وجہ سے بڑے بڑے علماء کرام ہمارا خیال رکھتے تھے۔ میں نے گاڑیوں کے فریموں کا کاروبار شروع کیا تو اس سلسلے میں کراچی جانا پڑتا تھا۔ کراچی میں حضرت کے پاس بنوری ٹاؤن حاضری لازمی تھی۔ اس زمانے میں مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ زندہ تھے اور وہ میری ایک وقت کی دعوت ضرور کیا کرتے تھے۔ جب حضرت بنوریؒ سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو صبح کے ناشتے کی دعوت دی۔ ہم دیہاتی لوگ ادب آداب سے بھی ناواقف ہوتے ہیں اور دوسری جگہ بے تکلفی سے کھا پی بھی نہیں سکتے۔ میں شرم کے مارے سکڑا ہوا بیٹھا تھا اور چھوٹے چھوٹے لقمے توڑ رہا تھا۔ حضرت بنوریؒ نے مجھے دیکھا تو اپنے ہاتھ سے روٹی توڑی اور ایک بڑے لقمے میں آدھا انڈا اٹھا کر مجھ سے فرمایا کہ پٹھان اور دیہاتی اس طرح بے تکلف شیروں کی طرح کھاتے ہیں، اس طرح کھائیں، یہ چھوٹے چھوٹے لقمے نہ لیں۔

حضرت مولانا کی بنوری ٹاؤن میں بڑی اہم علمی مصروفیات تھیں۔ لیکن اس کے باوجود میرے لئے مارکیٹ سے تجارتی سامان کی قیمتیں معلوم کرتے اور پھر خط میں پوری تفصیل لکھتے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان میں مروت اور صلہ رحمی کا مادہ کس قدر تھا۔ جب بھی کراچی سے گھر آتے تو تمام گھر والوں چھوٹے بڑوں، خواتین سب کے لئے ہر ایک کے مناسب ہدایا لاتے۔ بچوں کے لئے کھلونے، خواتین کے لئے کپڑے وغیرہ لانے کا معمول تھا۔

جب آپ نے بنوری ٹاؤن سے استعفیٰ کا ارادہ کیا اور مستقل اپنے علاقے آنا چاہا تو مجھ سے بھی مشورہ کیا، میں اتنا ہوشیار نہ تھا لیکن کوئی کام میرے علم میں لائے بغیر یا مشورہ کیے بغیر نہیں کرتے تھے۔ میرا مشورہ یہ تھا کہ آپ ان باتوں کو بہتر جانتے ہیں کہ آپ کا فائدہ کس جگہ ہے لہٰذا ہماری طرف سے مکمل اجازت ہے کہ اگر یہاں آنا چاہو تو آؤ لیکن میرا دل کرتا ہے کہ آپ وہیں رہیں، اس کا فائدہ زیادہ ہوگا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ ہمارے علاقے میں کام کی ضرورت ہے، میں یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ یہاں کام شروع کروں۔ میں اپنی سادگی کی وجہ سے ان باتوں کو

سمجھنے سے قاصر تھا لیکن اتنی بات میں نے عرض کی کہ یہاں کے لوگ جاہل ہیں، یہ آپ کا مقام نہیں جانتے، یہ آپ سے استفادہ نہیں کرسکیں گے، الٹا آپ کو ضائع کردیں گے۔

حضرت کو اپنے گھر اور اہل خاندان کی دینی تربیت کی فکر ہر وقت دامن گیر رہتی، بہت سے قومی یا خاندانی معاملات ایسے پیش آئے کہ قبائلی مزاج اور عصبیت کی وجہ سے ہم مغلوب ہونے لگتے، لیکن آپ کسی منفی اقدام کی اجازت نہیں دیتے تھے، ایسے کاموں سے ہمیشہ منع فرماتے اور صبر کی تلقین کرتے۔ مجھے سورۂ یٰسین یاد کرنے کی ترغیب دی، الحمدللہ میں نے یاد کرلی اور روزانہ پڑھنے کا ایسا معمول بنایا کہ چھوٹنا یاد نہیں۔ میرا اعتقاد بن گیا کہ ہر مشکل اسی سے حل ہوگی اور الحمدللہ سورۂ یٰسین کی برکات میں زندگی میں واضح دیکھتا ہوں۔

حضرت کے تمام اساتذہ اور علما احباب ہمارے سر کے تاج اور ہمارے لئے قابل احترام تھے اور ہیں لیکن ذاتی طور پر میں مولانا فضل محمد سواتی رحمہ اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ متأثر ہوا، ہم انہیں مہتمم صاحب کہا کرتے تھے۔ مہتمم صاحب جب بھی تشریف لاتے، میرا ضرور پوچھتے، میں حاضر ہوتا اور خدمت کی سعادت حاصل کرتا۔ ۱۹۸۷ء میں میں نے قصبہ شاہو خیل میں مارکیٹ بنائی تھی۔ ایک بار مہتمم صاحب تشریف لائے ہوئے تھے۔ میں عصر کے وقت حاضر ہوا تو فرمایا کہ آج اتنی تاخیر سے کیوں آئے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت شاہو خیل مارکیٹ کا کام آخری مراحل میں ہے وہاں جاتا ہوں۔ صبح ناشتے پر فرمایا کہ مارکیٹ دیکھنے چلتے ہیں۔ میں برکت اور دعا کے لئے حضرت کو لے گیا۔ مارکیٹ دیکھنے کے بعد مجھے ہاتھ سے پکڑ کر ایک طرف لے گئے اور فرمایا: مولوی محمد امین صاحب کو کون کون سی دکانیں دیتے ہو؟ میں نے عرض کیا حضرت! جن کی تعیین آپ فرمادیں وہی دوں گا۔ پھر بازار کے شروع حصے میں جو دکانیں تھیں ان کے دینے کا حکم دیا، پھر فرمایا کہ تیرا سب کچھ استاذ صاحب کی برکت سے ہے، لہٰذا ہر چیز میں ان کا حصہ ضرور متعین کیا کرو۔ اس کے بعد ہم اورکزئی ایجنسی کے ایک پرفضا مقام ''شکر تنگی'' گئے۔ وہاں استاذ صاحب نے مہتمم صاحب کی ضیافت کے لئے بکرا ذبح کروایا، مہتمم صاحب نے کھلے میدان میں چادر بچھائی اور طویل نفلیں ادا کیں، پھر لمبی دعا فرماتے رہے۔ میں نے یقین کرلیا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ آج کی اس دعا میں میرا حصہ ضرور ہوگا۔ میں نے مہتمم صاحب کو کئی بار ہدیہ دینے کا سوچا لیکن عجیب اتفاق تھا کہ جب میں رقم دینے کا ارادہ کرتا تو وہ اس سے پہلے مجھے دے دیتے۔

ایک بار ہمارے علاقہ میں کوئلہ کی کان نکلی، جس میں ہمارے علاقہ کے لوگوں نے تجارتی دلچسپی لی اور خوب لاکھوں کمائے، میرا بھی ارادہ ہوا کہ چونکہ ہماری قومی زمین میں ہے اس لئے میں بھی اس کے مالی فوائد حاصل کروں۔ میں نے استاذ صاحب سے مشورہ کیا تو آپ نے مہتمم صاحب سے مشورہ کرنے کا فرمایا۔ میں نے مہتمم

صاحب سے عرض کیا تو انہوں نے فی الفور مشورہ دینے کے بجائے استخارہ کیا اور استخارہ کے بعد فرمایا کہ اس میں آگ ہے اس سے بچو۔ کچھ عرصہ بعد اس پر قومی تنازعہ ہوا اور دو قوموں کے درمیان سخت جنگ شروع ہوئی جس میں کروڑوں کا نقصان اور کئی جانوں کا ضیاع ہوا۔ اس وقت مجھے استاذ صاحب متوجہ کر کے فرماتے کہ بھئی! مہتمم صاحب کی بات یاد ہے؟ ان حضرات کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں دنیا بھی خوب دی، لیکن دنیا کمانے میں جن حوادث وآفات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی روحانیت کی برکت سے ہمیں اس سے بچائے رکھا۔

حضرت استاذ صاحب نے مجھے اپنی تجارتی زندگی میں دو چیزوں کی انتہائی اصرار کے ساتھ تلقین کی۔ ایک یہ کہ اپنے معاملات ہمیشہ صاف رکھیں۔ الحمدللہ! اس ارشاد کی اللہ تعالیٰ نے ایسی لاج رکھنے کی توفیق دی کہ لاکھوں کروڑوں کے کاروبار کیے، گاڑیوں کا کاروبار عرصہ دراز تک رہا، اینٹوں کی بھٹی اور ٹرک تا حال چل رہے ہیں، لیکن اس ساٹھ سالہ تجارتی زندگی میں کبھی پانچ روپے کا دھوکہ یا فریب بھی کوئی ثابت نہیں کر سکتا۔ دوسری بات یہ فرمائی کہ زکوٰۃ ضرور ادا کرنی ہے اور اس میں تاخیر سے بچنا ہے۔ گاڑیوں وغیرہ کے کاروبار میں بعض اوقات حسابات اتنے گنجلک ہوتے کہ حضرت استاذ صاحب زکوٰۃ کی مقدار تقوی کی بنیاد پر بتلاتے اور فرماتے بھائی صاحب! زیادہ دینے میں کوئی حرج تو ہے نہیں۔ ضمیر مطمئن رہتا ہے اور اگر مقدار سے زیادہ ہو تو وہ صدقہ ہو جائے گا۔ میں نے حضرت کے ارشادات پر جب عمل شروع کیا تو معاملات کی صفائی رکھنے میں شروع کے چند سال یہ مجاہدہ برداشت کرنا پڑا کہ کاروبار کی وسعت نہ ہوئی لیکن پھر تو ایسی برکت ہوئی کہ ہم خود حیران رہے اور سیدھے سادھے تجارتی طریقوں سے اللہ تعالیٰ نے اتنی دنیا نصیب فرمائی کہ بڑے بڑے ڈگری یافتہ تاجر نہیں کما سکتے۔

حضرت کا قائم کردہ مدرسہ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔ الحمدللہ روز اول سے اس کی خدمت کی توفیق ہوئی۔ جب حضرت نے آغاز میں مسجد کے ساتھ متصل جگہ مدرسہ کے لئے منتخب کی تو اس وقت اینٹوں کا ٹرک پانچ سو روپے کا تھا۔ میں نے اپنی اینٹوں کی بھٹی اس وقت بنائی تھی اور ٹرک بھی لیا تھا۔ اس وقت تعمیری ضرورت کی ساری اینٹ جو پندرہ ٹرک بنی تھی، اللہ تعالیٰ نے مجھے دینے کی توفیق بخشی، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

حضرت سادہ زندگی گزارتے تھے اور سادگی پسند کرتے تھے۔ میں نے جب ذاتی گاڑی لینے کے لئے مشورہ کیا تو آپ نے منع فرمایا۔ آخر میں جب میرا ضعف بڑھ گیا تھا تو تب اپنی کار لینے کی اجازت عنایت فرمائی۔ آپ کے استغنا کا یہ عالم تھا کہ گاڑی گھر میں کھڑی رہتی لیکن کبھی خود سے طلب نہیں فرمائی اور کرایے کی گاڑی میں چلے جاتے۔ ہاں! ہمیں اگر سفر کا پہلے سے پتہ ہوتا تو گاڑی ضرور پیش کرتے۔ جب کہیں اکٹھے جانا ہوتا تو مجھے اگلی سیٹ پر بٹھاتے، خود پیچھے بیٹھتے۔ مجھے آپ کے علمی مقام سے حیا آتی لیکن آپ فرماتے کہ مقصود منزل پر پہنچنا ہے آگے بیٹھ کر ہو یا

پیچھے بیٹھ کر اور کبھی آگے نہ بیٹھتے۔ میں عموماً ذرا جلدی مسجد آجاتا اور پنکھے چلانے کی بھی عادت تھی کیونکہ گرمی زیادہ لگتی تھی، ایک کی جگہ کئی پنکھے چلا دیتا، آپ پر اضافی پنکھے چلانے سے سخت بوجھ آتا تھا اور طلبہ کی تو اس پر سخت گرفت کرتے تھے، خود اٹھ کر اضافی پنکھے اور بلب فوراً بند کر دیتے تھے۔ میری عادت چونکہ بنی ہوئی تھی، اس لئے آپ کے خلافِ طبع تو تھا لیکن میں آتے ہی پنکھے چلا دیتا اور نکلتا بھی سب سے آخر میں تھا اس لئے چلتے رہتے۔ ایک دن مجھ سے فرمایا کہ بھائی صاحب! یہ مدرسہ ومسجد کی بجلی وقف ہے، وقف کی چیز کو متعین اور محدود ضرورت کے علاوہ استعمال کرنا جائز نہیں۔ آپ کے پنکھوں کے حوالے سے فیاضی کا بوجھ مجھ پر آپڑتا ہے اور میں ایک عرصہ سے بجلی کا پورا بل اپنی جیب سے دیتا ہوں۔ فرمایا کہ بھائی! بجلی بل آپ کی طرف سے میں ادا کر رہا ہوں مگر یہ اسراف ہے اور اسراف بہت قبیح چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ان لوگوں کو اخوان الشیاطین قرار دیا ہے، لہٰذا اس سے بچنا چاہیے۔ اس بات سے مجھے سخت ندامت ہوئی اور آپ کے تقویٰ اور احتیاط کے سامنے اپنے رویے پر سخت شرم محسوس کی اور اس کے بعد سے پوری احتیاط شروع کردی۔

مجھے ذاتی طور پر حضرت کا قومی مسائل میں دلچسپی، لوگوں کے تنازعات ختم کرنے کے لئے جرگے اور بدامنی کے زمانے میں حکومت وقبائل کے درمیان صلح کی کوششیں قطعاً پسند نہیں تھیں۔ میں چاہتا تھا کہ یہ ایک طرف بیٹھ کر اپنا علمی کام کریں، میں نے ایک آدھ بار انہیں منع کرنے کی کوشش بھی کی کہ یہ لوگ آپ کا وقت ضائع کرتے ہیں، بھاڑ میں جائیں یہ مسائل۔ آپ اپنا کام کریں اور خود کو خطرات میں نہ ڈالیں۔ لیکن آپ نے جواب میں فرمایا کہ بھائی صاحب! آپ کی بات اپنی جگہ درست ہے لیکن مجھے "وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر" کا حکم چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے کل مجھ سے میری ذمہ داری کے بارے میں سوال کیا تو کیا جواب دوں گا؟ اور دونوں صورتوں میں پریشانیاں ہیں مگر ایک پریشانی کا تعلق دنیا سے ہے اور دوسری کا تعلق آخرت سے ہے اور دنیا کی پریشانی بہر حال ایک دن ختم ہو جائے گی، مگر آخرت کی پریشانی نہ ختم ہونے والی ہے، اس وجہ سے اپنے آپ کو پریشانی میں ڈالا ہے۔ جب کوئی اہم کام درپیش ہوتا تو مجھے تنہائی میں لے جا کر مشورہ کرتے، شہادت سے چند دن قبل بھی تنہائی میں کمرے کے اندر بلایا اور فرمایا: بھائی صاحب! زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، امید ہے کہ میں تم لوگوں سے پہلے آگے چلا جاؤں گا، میں نے اپنے بچوں کی تربیت ایسی کی ہے کہ وہ آپ کے لئے اپنے بچوں سے زیادہ فرمانبردار ثابت ہوں گے۔ ہم دونوں بھائیوں نے یتیمی دیکھی ہے، لہٰذا میرے بعد میرے یتیم بچوں کا خیال رکھنا ہے۔ یہ باتیں میرے لئے عجیب تھیں لیکن چند دن بعد حقیقت بن گئیں۔ جب میں انہیں کچھ رقم خرچ کرنے کے لئے مکمل اختیار کے ساتھ دیتا تو وہ کچھ حصہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور کچھ والد صاحب کو ایصال

ثواب کی نیت سے صدقہ کرتے۔ میرا بھی الحمدللہ اب یہی معمول ہے، میں حضرت استاذ صاحبؒ کے لئے بھی ساتھ نیت کرلیتا ہوں۔

آپ کی زندگی ایک کھلی کتاب کی مانند تھی، زندگی بھر صبر واستقامت، سادگی وتواضع اور اخلاص وللٰہیت کا پیکر بن کر رہے، کبھی کسی کو اپنے ہاتھ یا زبان سے تکلیف نہیں دی۔ ہر ایک کے لئے حتی کہ دشمن کے لئے بھی دل صاف رکھتے۔ اللہ تعالیٰ آپ پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے۔ آپ کے درجات بلند فرمائے اور آپ کی برکات سے ہمیں بہرہ ورفرمائے۔ آمین ثم آمین

میرے پیارے بھائی

حاجی عین الدین

میرے برادرِ صغیر حضرت مولانا محمد امین اورکزئی رحمہ اللہ تعالیٰ مجھ سے ڈیڑھ سال چھوٹے تھے۔ ۱۹۴۹ء میں جب میری عمر تقریباً ساڑھے پانچ سال اور ان کی تقریباً ۴ سال تھی، ہمارے والد مکرم جناب تاج الدینؒ نے ہمارے ناظرہ اور عصری تعلیم کے لئے ہنگو سے ایک مدرس کو چار روپے ماہوار تنخواہ پر بلایا، جو ''خانی ملا'' کے نام سے مشہور تھے۔ ان کی رہائش ہماری مسجد میں تھی، کھانا پینا بھی ہمارے ذمے تھا۔ ہم نے چار سال ''خانی ملا'' کے پاس پڑھا۔ ۱۹۵۲ء میں والد صاحب کی شہادت ہوگئی تھی۔ چند سال بعد ہمارے چچا ہمیں ہنگو شہر لے آئے اور بازار کے قریب ایک پرائمری سکول میں چہارم جماعت میں داخل کروایا۔ ہمارے سکول کے استاذ مولانا عبدالہادی خان بھی عالم دین تھے۔ انہوں نے ہماری بہترین تعلیم وتربیت فرمائی۔ پانچویں جماعت کے لئے جو استاد سکول میں مقرر تھے وہ طلبہ کو سخت اور فحش قسم کی گالیاں دیا کرتے تھے، لڑکوں کو ایک دوسرے پر سوار کر کے سکول کا چکر لگلوایا کرتے تھے اور انتہائی بدخلق اور سخت مزاج تھے۔ جب ہم نے چوتھی جماعت پاس کرلی تو استاذ صاحب نے گھر میں کہہ دیا کہ وہ اگلے سال اس استاذ کے پاس نہیں پڑھیں گے، کیونکہ وہ طالب علموں کو ننگی گالیاں دیتا ہے۔ اس پر ہمارے چچا

نے انہیں ہنگو کے مضافات میں ابراہیم زئی نامی گاؤں کے ایک سکول میں داخل کروادیا۔ وہاں ہمارے ننھیالی رشتہ داروں کا گھر تھا، استاذ صاحب انہی کے پاس رہائش پذیر تھے۔

آپ کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ استاذ کے منہ سے سن لیتے، وہ من وعن یاد رہتا۔ ہم گھر آکر رات گئے تک کتابوں کے رٹے لگاتے اور یاد کرتے لیکن ہم نے آپ کو کبھی گھر میں کتاب کھولتے نہیں دیکھا۔ دل دل میں یاد کرتے ہوں تو وہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ اس وجہ سے کلاس میں ہمیشہ پہلی پوزیشن آپ کی رہتی۔ میں نے کبھی ان کو سکول میں سزا کھاتے نہیں دیکھا، عموماً جب طلبہ سبق نہ سناپاتے تو استاذ ان کو غیرت دلانے کے لئے آپ سے سزا دلواتے، یہ سزا تھپڑ یا مکامارنے کی شکل میں ہوتی تھی، چونکہ آپ کلاس کے سارے طلبہ سے عمر میں کم تھے، اس لئے کوئی اس طرح برا بھی نہیں مانتا تھا۔ لیکن جب میری یا بڑے بھائی کی باری آتی تو آپ رک جاتے۔ بچپن میں اتنے ہوشیار تھے کہ اس بات کا ادراک تھا کہ یہ میرے بڑے بھائی ہیں، ہمیں کبھی آپ نے نہیں مارا، سر جھکا کر خاموش کھڑے رہتے، استاذ کو اندازہ ہوجاتا کہ یہ بھائیوں کو نہیں مارے گا تب استاذ ہمیں خود ہی سزا دے دیتے، اس وجہ سے استاذ ہمیں بادشاہ اور آپ کو وزیر کہتے تھے۔

ذہانت، ادب اور معصومیت کی وجہ سے آپ سب اساتذہ کے چہیتے تھے۔ جب آپ نے مدرسہ میں داخلہ لینے کا ارادہ کیا تو تمام اساتذہ اور گھر والوں نے اس وجہ سے روکنا چاہا کہ آپ انتہائی ذہین ہیں لہٰذا دنیاوی تعلیم حاصل کرکے ماں اور یتیم بہن بھائیوں کے لئے کچھ کمائیں گے۔ آپ سے پہلے میرا مدرسہ جانے کا شوق ہوا، چچا نے مجھے دارالعلوم ٹل میں حفظ کے لئے داخل کروایا۔ لیکن صحت کی کمزوری کی وجہ سے میں ہر وقت بیمار رہتا اس لئے دس، پندرہ دن گزار کر بھاگ آیا۔ میرے بعد جب حضرت نے مدرسہ جانے پر اصرار شروع کیا، تو چچا وغیرہ بالکل راضی نہ تھے، لیکن آپ نے پختہ عزم کر رکھا تھا اس لئے ان کو بادل نخواستہ اجازت دینی پڑی۔ لیکن سکول کے اساتذہ بدستور ناراض تھے۔ اس لئے ایک طویل عرصہ تک آپ کو پانچویں کا سرٹیفکیٹ بھی نہیں دیا۔

آپ نے اپنی دینی تعلیم ٹل، ہنگو، کوہاٹ اور کراچی میں حاصل کی، اور ۱۹۶۷ء میں درس نظامی سے فراغت پائی۔ زمانہ طالب علمی میں بچپن ہی سے بدعات ورسومات سے سخت نفرت تھی۔ بارہا مجھے بچپن میں یہ بات کہی کہ یہ ساری چیزیں مجھے دین میں اضافہ معلوم ہوتی ہیں، حالانکہ اس وقت علمی طور پر شاید آپ کو ان کی حقیقت کا علم نہ ہو۔ ایک بار طالب علمی کے زمانہ میں اورکزئی ایجنسی میں ایک جنازہ پڑھایا اور اجتماعی دعا اور حیلۂ اسقاط وغیرہ کچھ بھی نہیں کیا، یہ ہمارے علاقہ میں میری یادداشت کے مطابق پہلی نماز جنازہ تھی جو سنت کے مطابق پڑھی گئی۔ اس وقت لوگوں نے آپس میں کچھ چہ میگوئیاں کیں، لیکن ہمارے دادھیال اور ننھیال کی خاندانی وجاہت کے باعث کسی کو کھل کر

کچھ کہنے یا آپ کی مخالفت کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ بحمد اللہ ہمارے آباؤ اجداد کی نیک نامی میں شہرت تھی۔ مجھے اپنے نانا کی ایک ہی زیارت وملاقات یاد ہے۔ بچپن میں ہم والدہ کے ساتھ گئے تھے، ہمارے نانا ''دعاگو'' مشہور تھے کیونکہ ہر وقت دعائیں دیتے رہتے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ وہ تلاوت کر رہے ہیں اور ان کے آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ میں نے والدہ صاحبہ سے پوچھا کہ یہ کیوں رو رہے ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا کہ یہ بزرگ اور نیک ہے۔ نیک اور بزرگ لوگ قرآن پڑھتے ہوئے اس طرح روتے ہیں۔ ہماری والدہ ہمارے نانا کی سکھلائی دعائیں پڑھ کر ہم کو دم کیا کرتی تھیں۔ جب ہم بیمار ہوتے تو ''وبالحق انزلناہ وبالحق نزل'' پڑھا کرتی تھیں۔

زمانہ طالب علمی اور تدریس کے زمانہ میں حضرت کی عادت مبارکہ تھی کہ چھٹیوں میں مختلف اکابر اور بزرگان دین کی زیارت کو جایا کرتے تھے۔ وہ مجھے بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ حضرت کی معیت میں بندہ نے مفتی محمودؒ، مولانا عبداللہ درخواستیؒ، مولانا نصیر الدین غورغشتویؒ، مولانا غلام اللہ خانؒ، مولانا محمد یوسف بنوریؒ، مولانا عزیر گلؒ، مولانا عبدالحقؒ، مولانا سراج الیومؒ (گڑھئی بابا جی) اور مولانا عبداللہ شہیدؒ خطیب لال مسجد کی زیارت اور ملاقات کا شرف حاصل کیا ہے۔

حضرت طالبعلمی اور تدریس کے ابتدائی زمانہ میں جمعیت علماء اسلام سے وابستہ تھے۔ اس وقت جمعیت کا ہفت وار رسالہ 'ترجمان اسلام' چھپا کرتا تھا۔ آپ نے مجھے اس کے مطالعہ کی خاص تاکید فرمائی تھی۔ ہمارے ہنگو میں جمعیت کا کوئی نظم موجود نہیں تھا۔ حضرت نے ہنگو کے سرکردہ حضرات کو جمع کیا اور پھر ایک وفد کی صورت میں مفتی محمود صاحبؒ کے پاس لے گئے۔ اس کے بعد آپ نے ہنگو میں جمعیت علماء اسلام کی باقاعدہ تاسیس فرمائی اور جماعتی نظم قائم کیا۔ جمعیت سے آپ کی وابستگی مفتی محمودؒ کی حیات تک رہی۔ بعد میں جب دھڑا بندی شروع ہوئی تو آپ خاموشی سے غیر جانبدار ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو تحمل اور برداشت کی صفت سے خوب نوازا تھا۔ مجھے بچپن سے لے کر شہادت تک یاد نہیں کہ آپ نے اپنے ذاتی حق یا ذاتی مفاد کے لئے کسی سے جھگڑا کیا ہو یا کبھی کسی سے ناراض ہوئے ہوں یا اختلاف کیا ہو، اگر کہیں آپ کا حق ضائع بھی ہوتا تو الجھنے کی بجائے عفو ودرگزر کو ترجیح دیتے۔ ہم ایک بڑے عرصے تک گھر میں مشترک رہے، اس سارے زمانے میں آپ کو قناعت، صبر وتحمل وبرداشت کا پیکر پایا۔ لیکن آپ کا یہ تحمل صرف دنیاوی معاملات میں تھا جہاں کوئی دینی امر ٹوٹتا ہوا دیکھتے تو قطعاً برداشت نہ ہوتا۔ اس کے لئے ناراض بھی ہوتے اور اختلاف بھی کرتے اور حتی المقدور جھگڑا بھی کرتے چاہے کوئی ناراض ہو یا کسی کا دل پھٹے۔ مجھ سے چھوٹے تھے لیکن ایسے معاملات میں میرے ساتھ بھی سختی کر جاتے۔ کیونکہ دینی معاملات میں انہیں تساہل قطعاً گوارا نہیں تھا۔ گو

بعد میں دل جوئی کرتے یا معافی مانگ لیتے۔ مسئلہ دوٹوک اور صاف بیان کرتے، انداز نرم اور مشفقانہ ہوتا تھا لیکن بات مداہنت سے پاک ہوتی تھی، اس پر کوئی ناراض ہوتا تو اس کی بالکل پروانہیں کرتے تھے۔

حضرت کو اللہ تعالیٰ نے خودداری اور استغنا کا وصف پورے کمال سے عطا کیا تھا۔ زمانہ طالب علمی میں ہم بھائی ہی اس کے کفیل تھے لیکن کبھی ہم سے ذاتی خرچ کے لئے رقم کا مطالبہ نہیں کیا۔ ہاں! کتابیں لینے کا بہت شوق تھا اور کتابیں خریدنے کے لئے پیسوں کی ضرورت ہوتی تو بتادیتے بلکہ اس کے لئے قرض تک لیتے تھے۔

آپ نے کبھی ہماری دینی تربیت میں غفلت نہیں فرمائی۔ ایک بار کراچی سے تشریف لائے تو مجھے فرمایا کہ ایک مشورہ ہے کہ آپ مولانا سراج الیوم (گڑھئی باباجی) سے بیعت ہوجائیں۔ پھر مجھے خود ساتھ لے جاکر حضرتؒ سے بیعت کروایا۔ باباجیؒ نے مجھے درود پاک اور استغفار کا وظیفہ پڑھنے کو دیا۔ یہ ۱۹۸۷ء کی بات ہے کہ بیعت کے کچھ عرصہ بعد گڑھئی باباجی کا انتقال ہوگیا، میں تعزیت کے لئے حاضر نہ ہوسکا۔ انہی دنوں میں نے خواب دیکھا کہ پہاڑ کے دامن میں ایک قبر ہے۔ میں، بڑے بھائی حاجی مسلم الدین اور حضرت استاذ صاحب اس قبر کے پاس حاضر ہوئے۔ قبر سے گڑھئی باباجی اٹھے اور ہم تینوں سے مصافحہ فرمایا۔ سب سے آخر میں مجھ سے ملے اور میرے دل پر ہاتھ رکھا۔ میں نے حضرت استاذ صاحب سے خواب عرض کیا تو آپ نے فرمایا کہ فوراً قبر پر حاضری دیں۔ میں قبر پر حاضر ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بالکل وہی جگہ ہے جو میں نے خواب میں دیکھی تھی۔ دل پر ہاتھ رکھنے کی تعبیر حضرت نے ''ذکر قلبی'' سے فرمائی اور فرمایا کہ اسے شروع کریں۔ حضرت کو بارہا اس پر شکر ادا کرتے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میرے سارے اساتذہ و مشائخ متبع سنت تھے۔

حضرت جب کراچی سے چھٹیوں میں تشریف لاتے تو کبھی ہمیں یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ عالم ہونے کے ناطے کسی رعایت یا خصوصی استحقاق کے طالب ہیں۔ بلکہ ہمیشہ ایک عام آدمی کی طرح گھر کے کاموں میں میرے ساتھ شریک رہتے۔ جانور چرانا، پہاڑ سے لکڑیاں کاٹ کر لانا، کھیتوں سے چارہ لانا اور کمروں وغیرہ کی لپائی کرنا یہ سارے کام اپنے ہاتھ سے کرتے۔ صاف پانی گھر سے دور تھا، روزانہ کئی کئی کین بھر کر لاتے۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت سے علما دیکھے ہیں اور ان کے شب و روز کا مشاہدہ بھی کیا ہے لیکن اپنے بھائی سے بڑھ کر متواضع، عاجز اور مخلص کسی کو نہیں دیکھا۔

میں عالم تو نہیں تھا کہ آپ کی علمیت کا صحیح اندازہ کرسکتا لیکن ایک بار ہمارے ہاں علما میں یہ بحث چھڑی کہ انگریز چاند پر جانے کا دعویٰ کرتا ہے کیا چاند پر جانا ممکن ہے؟ اس پر باقاعدہ جمعے پڑھائے گئے۔ میں نے اپنی تشفی کے لئے حضرت کو کراچی ایک خط لکھا۔ آپ نے قرآن و حدیث سے مبرہن تفصیلی جواب عنایت فرمایا۔ اس میں یہ بات

بھی لکھی کہ چاند پر پہنچنا کون سا کمال ہے، ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم تو چودہ صدیاں پہلے معراج کے موقع پر سدرۃ المنتہی سے آگے تک پہنچے ہیں۔

علمی مسائل میں ہمارے خاندان کے حضرات کا معمول یہی تھا کہ وہ آپ کی طرف رجوع کرتے اور آپ کا فیصلہ حرفِ آخر سمجھا جاتا۔ سارے ہی خاندان والے استاذ صاحب کی ذہانت اور لیاقت سے متاثر تھے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ میں دینی غیرت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اس کے ساتھ مروت بھی کمال درجے کی تھی۔ فرماتے تھے کہ میں نے غیرت ومروت اپنے استاذ اور شیخ مولانا فضل محمد صاحب سے سیکھی ہے۔ اس پر مولانا فضل محمد صاحب کا ایک دلچسپ لطیفہ یاد آ گیا، ایک بار میں حضرت استاذ صاحب کے ساتھ سوات گیا تھا، رات ہم نے مولانا فضل محمد صاحب کے ہاں گزاری۔ صبح ناشتے پر مولانا فضل محمد صاحب نے فرمایا کہ میں آج کل کچھ دن فارغ ہوں لہٰذا ''کالام سوات'' چلتے ہیں، آپ نے کسی کو بھیج کر سیٹیں بک کروادیں، جب ہم اڈہ پہنچے تو وہ سیٹیں ڈرائیور نے کسی اور کو دے دی تھیں۔ اس پر مولانا فضل محمد صاحب نے ڈرائیور کو متوجہ کیا لیکن وہ صاحب بات سننے کو تیار نہ تھے بلکہ کہنے لگے کہ یہ دو جو آپ کے ساتھ ہیں یہ بوڑھے تو نہیں ان کو پیچھے بٹھادو۔ اتنا کہنا تھا کہ فضل محمد صاحب آگ بگولہ ہو گئے ڈرائیور کو گریبان سے پکڑ لیا کہ آپ نے میرے مہمانوں کی بے عزتی کی ہے، بڑی مشکل سے ہم نے اور لوگوں نے مل کر چھڑایا اور اس نے معافی مانگی۔

حضرت استاذ صاحب مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے لیکن میں نے ہمیشہ ان کو اپنا بڑا سمجھا، وہ بھی میرا حد درجہ خیال رکھتے تھے اور کوئی کام میرے مشورہ کے بغیر نہیں کرتے تھے۔ جب آپ نے جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن سے استعفیٰ کا ارادہ کیا تو مجھ سے مشورہ طلب کیا، میں خاموش رہا، میری خواہش تھی کہ آپ جامعہ ہی میں رہیں، لیکن جب آپ نے تفصیلاً وجوہات بیان کیں تو پھر میری رائے آپ کے موافق ہوگئی۔ آپ نے کراچی چھوڑنے کی تین وجوہات بیان فرمائی تھیں، اولاً: یہ کہ کراچی کی آب وہوا میرے موافق نہیں، حضرت بنوری کی حیات تک ان کی صحبت کی خاطر تو طبیعت یہ برداشت کرتی رہی لیکن اب برداشت نہیں۔ ثانیاً: اپنے علاقے میں بدعات ورسومات کی جڑیں پختہ ہیں اور جہالت عام ہے، بنسبت کراچی کے علاقہ میں کام کی ضرورت زیادہ ہے۔ ثالثاً: یہ کہ حضرت الشیخ علامہ بنوریؒ میں بے انتہا اخلاص تھا، میں حضرت سے اخلاص تو نہ سیکھ سکا، لیکن ان کے اخلاص کی ہوا مجھے ضرور لگی، ان کی رحلت کے بعد اب حالات کچھ ایسے بن گئے ہیں کہ اگر میں مزید یہاں رہتا ہوں تو میرا اخلاص مجھے اجازت نہیں دیتا اور اخلاص کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، میں حضرت بنوریؒ سے حاصل شدہ اس دولت کو کھونا نہیں چاہتا۔

جب آپ نے دورۂ حدیث شریف مکمل کرلیا تو اپنے چچاؤں اور ہم بھائیوں کو بھلایا کہ جس وقت والد صاحب کا انتقال ہوا تھا اس وقت ہم بہن بھائی نابالغ تھے اس لئے والد صاحب کی جائیدادجوں کی توں رہی۔ ہمارے علاقے میں بہنوں کو حصہ نہیں دیا جاتا یہ سخت گناہ ہے۔ میں نے آپ لوگوں کو اس لئے جمع کیا ہے کہ والد صاحب کی میراث کا حساب لگا کر بہنوں کو ان کا حصہ حوالہ کیا جائے۔ پھر آپ نے تینوں بہنوں کی میراث کا حصہ لگایا تو ہر بہن کے حصہ میں زمین کے عوض تین تین ہزار کی رقم پہنچی، آپ نے تجویز دی کہ چونکہ جائیداد ہم تینوں بھائیوں کے مشترکہ قبضہ میں ہے اس لئے ہر بھائی ایک ایک بہن کو تین تین ہزار روپے دے دے، یہ ۱۹۶۷ء کی بات ہے، اس وقت تین ہزار کی مالیت ایسی تھی جیسے تین لاکھ کی۔ بحمد اللہ آپ کی برکت سے خاندان میں میراث کی شرعی تقسیم کا حکم زندہ ہوا۔

حضرت کو اللہ تعالیٰ نے صلہ رحمی کا وصف خوب عطا فرمایا تھا۔ رشتہ داروں کی غمی خوشی میں شرکت، ان کی خبر گیری اور تعاون آپ کے معمولات کا حصہ تھا۔ اگر علاقے میں کوئی فوت ہوجاتا تو کراچی قیام کے دوران ضرور ان سے تعزیتی خط لکھتے۔ جب گھر والوں کے نام خط آتا، تو تمام بڑوں اور معاصرین کے فرداً فرداً نام لکھ کر دعا وسلام اور حال احوال پوچھتے، کسی کی بیماری کی اطلاع ہوجاتی تو عیادت کے لئے خط لکھتے اور اس میں ان کے مناسب حال جو مشورہ ہوتا وہ دیتے۔ بعض اوقات دوا وعلاج میں اپنی وسعت کے مطابق خود بھی دلچسپی لیتے۔ بندہ کے نام آپ نے سینکڑوں مکاتیب لکھے جو میں نے ہمیشہ سے انتہائی محفوظ رکھے اور گھر کے بجائے دکان میں میری رقم کی جو حفاظتی الماری تھی وہاں محفوظ کئے لیکن میری بدقسمتی کہ ۱۹۹۰ء میں دکان کی چوری ہوئی اور چور ظالم نے ان خطوط پر بھی ہاتھ صاف کردیا تھا۔ ان خطوط میں خاندانی ومعاشرتی مسائل کے حل کے لئے اتنا مواد تھا کہ اگر وہ دستیاب ہوتے تو اس موضوع پر ایک اچھے خاصے مجموعے کی اساس بن جاتے۔ مہمان نوازی خون میں شامل تھی، رشتہ داروں کی بڑی بڑی باتیں معمولی نسبتوں کی وجہ سے برداشت کرجاتے اور معافی ودرگزر سے کام لیتے۔ سادگی پسند تھے۔ میراث میں ہمارے لئے مہمان نوازی، غیرت، سادگی اور اخلاص چھوڑ گئے ہیں۔ خاموش مزاج تھے، بولتے کم اور کام زیادہ کرتے تھے۔ میں نے آپ کی شخصیت میں ہمیشہ گفتار کے بجائے کردار دیکھا ہے۔

میں کئی بار حضرت کے ساتھ کراچی بھی حاضر ہوا، مجھے اپنے تمام اساتذہ خصوصاً حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ، مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ اور مفتی ولی حسن ٹونکیؒ سے ملوایا۔ حضرت بنوریؒ، حضرت غورغشتویؒ اور مولانا فضل محمد صاحبؒ سے "دلائل الخیرات" کی اجازت بھی دلوائی۔

کراچی میں ایک چھوٹا سا بچہ بڑا خاموش اور معصوم سا آپ کی خدمت میں کتاب لے کر کمرے میں آتا تھا اور حضرت اسے کمرے میں پڑھاتے تھے۔ سبق کے بعد وہ ایک طرف بیٹھ کر محنت سے یاد کررہا ہوتا۔ میں نے ایک

دفعہ حضرت سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ عبدالعزیز ہے، اسلام آباد کے مولانا عبداللہ کے بیٹے ہیں، انہوں نے اصرار وتلقین سے ان کا خیال رکھنے اور پڑھانے کا کہا ہے۔

حضرت کا میرے اوپر ایک بڑا احسان طلبہ کی خدمت کا موقع ہے، حضرت کی وجہ سے ہمیں ان مہمانان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کے بڑے مواقع ملے اور میں بالیقین عرض کرتا ہوں کہ آج میں جو کچھ بھی ہوں یہ سب حضرت اور طلبا کی برکت ہے۔ عرصہ دراز تک مدرسہ کے مختلف انتظامی کام حسبۃ للہ میرے سپرد رہے اور اس پر میں مفت دعائیں حاصل کرتا رہا۔

میں اپنے اردگرد علاقے کے کئی کروڑ پتیوں کو جانتا ہوں جن کی مالی حیثیت کچھ نہ تھی لیکن وہ حضرت سے مستقل تعلق اور آپ کے مشوروں پر یہاں تک پہنچے کہ دنیا کے ہر آسائش کے مالک ہوئے۔ میں سوچتا ہوں کہ جس شخص نے زندگی بھر دنیا کا کوئی کام تجارت وغیرہ نہیں کیا اس کی بصیرت سے اگر محنت مزدوری کرنے والے عام افراد کروڑوں کے مالک بن سکتے ہیں تو دینی امور میں اس کی اتباع کرنے والوں کا کیا حال ہوگا، علمی اور اصلاحی تربیت میں رہنے والوں کو کتنا فائدہ ہوا ہوگا اور ان کا دامن کیسے خالی رہ سکتا ہے کیونکہ علم واصلاح تو آپ کے مستقل میدان تھے اور ان میں آپ کی بصیرت کا ثانی نہ تھا۔

ہمارے بڑے بھائی کی خواہش تھی کہ حضرت تجارت وغیرہ میں دلچسپی لیں لیکن میری کبھی چاہت نہیں ہوئی بلکہ کوشش رہی کہ حضرت اپنی علمی وتصنیفی خدمات میں لگے رہیں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ ہمیں دین ودنیا کی جو دولتیں ملیں وہ حضرت کی برکت سے ملیں حضرت کی شہادت پر جو لوگ روتے اور چیختے رہے اور کشیدہ حالات کے باوجود جس طرح انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر امڈ آیا تھا اس سے اندازہ ہوا کہ صرف ہم اہل خاندان ہی آج بے آسرا نہیں ہوئے بلکہ بہت سے لوگوں کا سہارا چھن گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپؒ پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائیں اور آپ کی برکات وفیوضات سے اہل خاندان سمیت پوری امت مسلمہ کو مستفید فرمائیں۔ آمین

تم اہل دل کا سا جینا ہمیں سکھا کے چلے

مولانا ابو محب اورکزئی

حضرت الاستاذ شہیدؒ کے حوالے سے سہ ماہی المظاہر کی خاص اشاعت کا سن کر خواہش ہوئی کہ میں بھی مادحین حضرت شہیدؒ کی فہرست میں نام درج کرا لوں۔ حضرت شہیدؒ کے مناقب کی فہرست اتنی لمبی ہے کہ ہم جیسے نالائق لوگوں کی چند سطور اس کے چند عنوانات کا بھی حق ادا نہیں کرسکتیں تاہم کیا یہ کم سعادت ہے کہ آپ کے مادحین میں میرا نام آجائے۔ کئی دن سے کاغذ وقلم لیکر بیٹھا ہوں مگر کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا لکھوں اور کہاں سے بات شروع کروں اور کہاں ختم کروں؟ اس حالت تحیر میں کتنا عرصہ گزر گیا، اس عرصہ میں کئی مسودے بدلے، کئی عنوانات سوچے اور کئی موضوعات کو قلم بند کیا، لیکن دل کی بات زبان اور قلم پر نہ لا سکا:

بہت عنوان سوچے اور بہت خاکے بنا ڈالے
مرتب ہو سکا نہ دردِ دل کا فسانہ

حضرت کی نادر شخصیت میں بہت سے ایسے کمالات پائے جاتے تھے جن میں ان کا پایہ بہت بلند تھا، ان کی

ایمانی قوت، ان کا اعتماد اور توکل علی اللہ، ان کی ہمت وجرأت، ان کی عبادات، صحابۂ کرام کی زندگی سے ان کی گہری واقفیت ومناسبت اور ان کے حالات کا استحضار، اتباعِ سنت کا اہتمام، فہم قرآن اور واقعات انبیا سے عظیم نتائج کا استخراج یہ سب ان کی زندگی کے وہ پہلو اور نمایاں صفات ہیں، جن کے متعلق بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے جس کی تصدیق وہ لوگ کریں گے جن کو ان کی خدمت میں کچھ دن رہنے کی سعادت یا کسی سفر میں رفاقت کا شرف حاصل ہوا ہو۔

بندہ نے چند بے ترتیب سطور کی شکل میں ذکر محاسن کے طور پر جو بات بے ساختہ ذہن میں آئی اور بات سے بات کی طرف ذہن منتقل ہوا اسے سپرد کاغذ کر دیا ہے، بس یہ محض ایک تذکرہ ہے جس سے اپنی اور ناظرین کی تنشیط مقصود ہے اور یہ تمنا کہ ان صالحین کا تذکار ہماری دنیوی واخروی کامرانیوں اور سعادتوں کا سبب بن جائے۔ وباللہ التوفیق

حضرت شہیدؒ میرے اپنے والد سے زیادہ مجھ پر مہربان تھے، میرے استاذ اور مربی تھے، انہوں نے ہمیں بہت کچھ سکھایا اور سمجھایا، میری تعلیم کے تقریباً اسی فیصد اخراجات برداشت کیے۔ ہمارے خاندان میں حضرتؒ میرے ساتھ اپنے لاڈلے بچے جیسا پیار فرماتے۔ میں نے اعدادیہ سے لے کر دورۂ حدیث تک کے تمام درجات جامعہ یوسفیہ کی بجائے دیگر مدارس میں پڑھے ہیں، میری دلی خواہش تھی کہ میں یہیں جامعہ میں پڑھوں تاکہ حضرت الاستاذ سے کچھ استفادہ کر سکوں مگر میری اس خواہش کو حضرت یہ کہہ کر رد فرماتے کہ یہاں گھریلو ماحول اور گھریلو ضروریات آپ کی تعلیم پر ضرور اثر انداز ہوں گی لہٰذا میں جہاں آپ کو بھیجنا چاہوں اس میں پس وپیش نہ کرنا، اس میں آپ کا بہت بڑا فائدہ ہے۔ میں نے وہ فائدہ فراغت کے بعد دورانِ تدریس بہت اچھی طرح محسوس کیا کیونکہ جب میں اولیٰ پڑھ رہا تھا تو اس وقت میرا علمی ذوق وشوق نہ ہونے کے برابر تھا بس صرف حضرت استاذ صاحبؒ کے خوف سے پڑھ رہا تھا۔ چنانچہ درجہ اولیٰ پڑھ کر جب میں سالانہ چھٹیوں میں گھر آیا تو حضرت نے مجھ سے امتحان اور اسباق کے متعلق دریافت فرمایا، میں نے جواباً کہا کہ باقی تو مشکل نہیں مگر نحو میر بہت مشکل ہے، میں نے اس کو اچھی طرح یاد کیا ہے اور امتحان میں سو نمبر بھی لئے ہیں لیکن اس کے قواعد پر ذہن نہیں کھل رہا، صرف رٹہ لگایا ہے۔ حضرت اس پر ہنس پڑے اور فرمانے لگے کہ یہاں چند طلبا اور بھی پڑھنے والے ہیں، اگلے بدھ سے تیاری کر لو میں آپ کے ساتھ کوشش کروں گا ان شاء اللہ سمجھ جائیں گے۔ بدھ کے دن جب نحو میر کا پہلا سبق پڑھایا، بالکل سیدھے سادے الفاظ میں، پھر فرمایا: جاؤ! ابھی اس کو یاد کرو، باقی ظہر کے بعد پڑھیں گے۔ میں نے فوراً کہا: حضرت! یہ تو مجھے یاد ہے ابھی سنا سکتا ہوں کیونکہ نحو میر تو مجھے پہلے سے یاد تھی۔ حضرت نے دوبارہ ذرا غصیلے انداز میں فرمایا کہ میں آپ سے کہتا ہوں جاؤ، اس کو یاد کر کے اس کا تکرار کرو، چلو، ایک گھنٹہ کے بعد آ جاؤ۔ میں تو نادان تھا، صرف اپنی فکر کر رہا تھا مگر حضرتؒ کے سامنے تو اور طلبا بھی تھے ان کو بھی پڑھانا تھا، چنانچہ تکرار وغیرہ کر کے جب ہم دوبارہ واپس آئے تو

حضرت نے پہلے فرداً فرداً ہر ایک سے سبق سنا، پھر فرمایا: جاؤ! ہر ساتھی قرآن مجید لے کر آؤ۔ میں دل میں سوچ رہا تھا کہ نحو میر کا قرآن مجید سے کیا تعلق؟ جب ہم نے قرآن مجید کھولا تو سب سے پہلے حضرتؒ نے مجھ سے سوال کیا کہ "الحمد مفرد ہے یا مرکب؟" میں نے بغیر سوچے سمجھے جواب دیا کہ مرکب! جو کہ غلط تھا۔ حضرت نے بغیر غصہ کے نہایت نرم لب ولہجہ میں فرمایا کہ بھتیجا! تم نے سبق تو بہت اچھی طرح سنایا اور جواب غلط دیا، پھر ہمیں اجرا کا پورا طریقہ سمجھایا اور "الحمد للہ رب العالمین" میں اس سبق کی مکمل وضاحت خود کی۔ بس حضرت کا اس جملے کو حل کرنا تھا کہ مجھے نحو میر پر ایسا شرح صدر ہوا جیسے میرے سینے کے اندر کسی نے کچھ پھونک دیا ہو۔ اس سبق پر میرا ذہن ایسے کھل گیا کہ کچھ مخفی نہیں رہا، نحو میر کا یہ درس رمضان کے آخر تک چلتا رہا، حضرت ہر سبق پڑھانے کے بعد قرآن مجید میں سے ہم سے مثالیں نکلواتے تھے۔ حضرت استاذ صاحب کے درس کے اس انداز سے مجھے علم کے ساتھ ایسی دلچسپی پیدا ہوئی کہ فراغت تک مجھے ایک سیکنڈ کے لئے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ میں تعلیم تعلم کے علاوہ بھی کچھ مصروفیت رکھوں گا۔ نحو میر کے اس درس میں ایک طرف روحانیت کا جو مزہ تھا وہ الگ تھا، دوسری طرف علمی ذوق کی جو مٹھاس اور مزہ میں نے محسوس کیا اس کے بیان کرنے سے میری زبان اور قلم قاصر ہیں۔

درجہ ثانیہ پڑھنے کے بعد چھٹیوں میں حضرتؒ نے مرقات ایسے انداز سے پڑھائی کہ منطق کی دوسری کتب پڑھنے سے میں نے اپنے آپ کو مستغنی سمجھا۔ درجہ خامسہ پڑھنے کے بعد سالانہ چھٹیوں میں حضرت نے اصول فقہ میں تاسیس النظر پڑھائی لیکن بدقسمتی سے اس سال علاقائی حالات خراب ہونے کی وجہ سے یہ کتاب درمیان میں رہ گئی اور مکمل نہ ہوسکی۔ درجہ سادسہ کے لئے میں نے جامعہ فریدیہ اسلام آباد میں داخلہ لیا، عید الاضحیٰ کی چھٹیوں پر میں گھر نہیں آیا تو حضرت نے واپس آنے والے طلبا کے ہاتھ میرے لیے عیدی بھی بھیجی اور ساتھ ہی یہ پیغام بھی بھیجا کہ آپ کو چھٹیوں میں گھر آنا چاہیے تھا۔

چھٹیوں میں میں حضرت کے ساتھ اکثر مکتبہ میں ہوتا تھا، جب آپ کسی مسئلہ کے لئے کتابوں سے حوالے نکالتے تو حسب استعداد مجھ سے بھی کام لیتے، مکتبہ میں چونکہ کتابیں غیر مرتب تھیں اس وجہ سے کبھی کبھار حضرت کو کتاب کی تلاش میں کافی دقت اٹھانی پڑتی اور بہت وقت صرف ہوتا۔ میں نے حضرت کی سہولت کی خاطر تمام کتابوں کی حروف تہجی کی ترتیب سے ایک فہرست بنائی، ہر کتاب کے نام کے ساتھ الماری اور خانہ نمبر لکھ دیا، جس کے ذریعہ کتابوں کو تلاش کرنا آسان ہوگیا، حضرت نے جب دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور بہت زیادہ دعائیں دیں۔

اکثر چھٹیوں میں جب دیگر اساتذہ اور مفتی صاحب نہیں ہوتے تھے تو اس دوران اگر کوئی مسئلہ پوچھنے آجاتا تو اگر معمولی اور آسان مسئلہ بھی ہوتا تب بھی مجھے فرماتے کہ تم یہ مسئلہ فلاں کتاب میں دیکھ لو، جب مسئلہ دیکھ کر ان کے

سامنے پیش کرتا تو حضرت مزید دو تین کتابوں کا حوالہ دے کر مزید تلاش کرنے کے لئے فرماتے، چنانچہ معمولی مسئلہ کے لئے بھی حضرت تیس چالیس کتابوں کی ورق گردانی کرا دیتے۔ آخر میں مبسوط للسرخسی اور شرح النقایہ لملا علی القاری کا حوالہ دیتے، نیز متقدمین فقہائے کرام کی عبارات کو بنیاد بنا کر مسئلے کا حل نکالتے۔ پھر فقہا کے ذوق اور اس وقت کے حالات پر تسلی بخش بحث فرما کر مسئلہ کی مکمل وضاحت فرماتے۔ حضرتؒ فقہ کی کتابوں میں مبسوط للسرخسی اور شرح النقایہ کو بہت ترجیح دیا کرتے، خصوصاً شرح النقایہ کے بارے میں اکثر فرماتے کہ میں دعویٰ کے ساتھ کہتا ہوں کہ جو شخص شرح النقایہ کو کما حقہ پڑھ لے وہ کبھی غیر مقلد کے سامنے لاجواب یا اس سے متأثر نہ ہوگا۔ حضرت فرماتے کہ کوئی بھی شخص امام ابوحنیفہؒ کا ایک فقہی جزیہ ایسا نہیں بتا سکتا جو صحیح حدیث کے خلاف ہو۔

دوران تدریس جب کسی مسئلہ یا عبارت پر شرح صدر نہ ہوتا تو اس کو حضرت کے سامنے پیش کرتے، آپؒ منٹوں میں اس مسئلے کو ایسے حل فرماتے کہ بندہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ جیسے حضرتؒ دوران تصنیف خود مصنف کے ساتھ موجود تھے۔ دوسری اہم بات جو مسئلہ کے دریافت کرتے وقت ہمارے مشاہدے میں آئی وہ یہ کہ ہم نے اس مسئلے سے متعلق جن کتابوں کا مطالعہ کیا ہوتا حضرتؒ انہی کے مطابق جواب دیتے حالانکہ ہم نے حضرتؒ کو کبھی یہ نہیں بتایا ہوتا کہ ہم نے اس کے متعلق فلاں فلاں کتاب کا مطالعہ کیا ہے مگر ہمارے پوچھتے ہی حضرتؒ سمجھ جاتے کہ اس نے کس حد تک اس مسئلہ کو تلاش کیا ہے، یہ حضرت کی گہرائی تھی کہ مسئلہ کا حل انہی عبارات سے نکال دیتے جنہیں پڑھتے وقت ہماری رسائی نہ ہوتی تھی۔

ایک مرتبہ مجھے حسامی کے ایک مسئلہ کے بارے میں الجھن پیدا ہوئی، اردو کی ایک شرح دیکھ کر میں سیدھا حضرت کے پاس گیا، حضرت نے اس مسئلہ کو حل کیا۔ اتفاقاً دوسرے دن وہی مسئلہ مولوی یعقوب میں پھر سامنے آیا تو وہی الجھن دوبارہ ذہن میں گردش کرنے لگی لہٰذا میں پھر حضرت استاذ صاحبؒ کے پاس گیا، حضرتؒ کو میں نے اور کچھ نہیں کہا بلکہ صرف اتنا کہا کہ حضرت! پرسوں بھی اس مسئلہ کے بارے میں پوچھا تھا مگر پوری طرح سمجھ نہیں آیا، حضرتؒ ہنس پڑے اور فرمایا کہ پرسوں جو تم نے یہ مسئلہ میرے سامنے لایا تھا اس وقت آپ نے فلاں اردو شرح دیکھی تھی میں نے اسی کے مطابق جواب دیا تھا جبکہ آج آپ نے مولوی یعقوب کا مطالعہ بھی کیا ہے، مولوی یعقوب کے مطالعے سے پہلے اگر میں آپ کو یہ جواب دیتا تو آپ کو اس وقت مسئلہ سمجھ نہ آتا بلکہ آپ کی الجھن مزید بڑھ جاتی، اس کے بعد بڑی تفصیل کے ساتھ وہ مسئلہ مجھے سمجھایا، چند اصول بھی ذکر کرکے فرمایا کہ اس طرح کے مسائل کے لئے جب فلاں کتاب کا مطالعہ کروگے تو یہ اشکالات پیدا ہوں گے، ان اشکالات کو حل کرنے کے لئے فلاں کتاب کی طرف رجوع کیا کریں۔

مجھے حضرتؒ کے ساتھ کئی مرتبہ سفر کرنے کی سعادت نصیب ہوئی، ایک مرتبہ حضرت نثر الازہار کی اشاعت کے سلسلے میں کراچی جاتے ہوئے مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ پشاور سے خوشحال ایکسپریس میں ہم تیس گھنٹے کا طویل اور پرتھکن سفر کر کے کراچی پہنچے۔ سفر میں حضرتؒ نے میرے ساتھ نثر الازہار کے حوالے سے بڑی تفصیلی گفتگو فرمائی کہ اس کے کن کن مقامات پر معترضین اعتراض کر سکتے ہیں اور اس کے کیا جوابات ہوں گے؟ مزید وضاحت کیلئے کن کن کتابوں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا؟ اگر کوئی اس میں مزید پیش رفت کرنا چاہے تو کن چیزوں کو ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا؟ وغیرہ، مگر چونکہ یہ میری فراغت کا پہلا سال تھا اور حضرت کی یہ گفتگو میری ذہنی سطح سے بلند تھی اور نہ اس وقت ریکارڈ کرنے کا میرے پاس کوئی آلہ تھا، حضرت کو بھی میری کم فہمی کا احساس تھا اور اس کے متعلق مجھے سمجھانے کی بھرپور کوشش کی مگر بدقسمتی سے میرے اندر وہ قابلیت ہی نہ تھی جس کا حضرتؒ کو حسن ظن تھا۔ اس لئے میں اس گراں قدر گفتگو کو محفوظ نہ کر سکا۔ کراچی میں ہم نے قاری محمد قاسم دامت برکاتہم العالیہ کے ہاں قیام کیا۔ اس دوران رمضان المبارک کا چاند نظر آ گیا پہلی افطاری کے بعد حضرت نے فرمایا کہ جتنا جلدی ہو سکے واپسی کرنی ہے کیونکہ اب یہاں سے باہر نکلتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے میرے جسم پر کپڑے نہ ہوں۔ میں نے حضرت سے وجہ دریافت کی تو آپ نے فرمایا کہ بھتیجے! یہاں اس مہینے میں عام طور پر مہتممین حضرات چندہ اور زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے آتے ہیں، کوئی ہمیں دیکھے گا تو ہمارے متعلق بھی یہی سوچے گا اور اس چیز سے مجھے بہت سخت نفرت ہے۔

کراچی سے واپسی پر قاری صاحب نے جہاز کے ٹکٹ کا بندوبست کیا، جہاز میں یہ میرا پہلا سفر تھا، جہاز کی روانگی کے بعد کھانے پینے کی اشیا پر مامور ایک لڑکی تمام مسافروں کو اشیا تقسیم کرنے لگی۔ روزہ داروں کو پیکٹ بند اشیا اور غیر روزہ داروں کو چائے پانی وغیرہ پہنچا رہی تھی۔ حضرت شیشہ کی طرف تشریف فرما ہو کر اپنے ذکر واذکار میں مشغول تھے، جب وہ لڑکی ہمارے قریب پہنچ گئی تو میں پریشان ہو گیا کہ آخر کس طرح ایک نامحرم لڑکی سے حضرتؒ کے سامنے بات کروں؟ اس سے کچھ لوں یا نہ لوں؟ کیا کروں؟ بغیر بتائے حضرت میرے پریشانی کو سمجھ گئے اور فرمایا کہ بھتیجے! پریشان نہ ہونا وہ ہمارے پاس نہیں آئے گی، چنانچہ جیسے ہی وہ ہماری سیٹ کے پاس پہنچی تو ہم سے چند سیٹ پیچھے ایک فیملی والوں کے بچے کھانے پینے کی اشیا دیکھ کر رونے لگے اور شور مچانے لگے، وہ لڑکی جلدی سے پہلے وہاں سامان لے گئی، جب واپس آئی تو ہماری سیٹ کو چھوڑ کر اگلی سیٹ سے سامان تقسیم کرنے لگی۔ میں حضرت کی کرامت دیکھ کر حیران رہ گیا اور اس پر سوچنے لگا، حضرت نے میری اس حیرت کو بھی محسوس کیا تو فوراً فرمایا کہ یہ آپ کے فکرمند ہونے کی برکت تھی دیکھیں! کیسے اللہ تعالیٰ نے بچا لیا۔

ایک مرتبہ دوران تدریس رخصت اور عزیمت کی بحث میں ایک مقام پر میں ذہنی الجھن کا شکار ہوا جو اشکالات

ذہن میں آرہے تھے، وہ حل نہیں ہورہے تھے، کافی کوشش کی، ارادہ تھا کہ جمعہ کو حضرت سے اس کے بارے میں دریافت کروں گا، مگر حضرت اچانک جمعرات کو اسباق سے فارغ ہونے کے بعد دیر روانہ ہوئے، بندہ بھی ساتھ ہو لیا۔ ہنگو سے مولانا عبدالجلیل صاحب بھی ہمارے ساتھ ہو گئے، دیر سے واپس ہوکر ہم ہفتے کی رات عشا کے بعد ہنگو شہر پہنچے۔ ہمارا سفر باقی تھا، مگر مولانا عبدالجلیل صاحب کا سفر ختم ہو چکا تھا۔ حضرت نے عشا کی نماز بازار ہی میں پڑھنے کا کہا۔ مولانا عبدالجلیل صاحب وضو بنانے تشریف لے گئے۔ حضرت نے فرمایا: بھتیجے! آپ امامت کرائیں، اگر مولوی عبدالجلیل آ گئے تو وہ پوری چار رکعت پڑھائیں گے۔ لہٰذا میں نے دو رکعت سفر کی نماز پڑھائی مگر حیران تھا کہ حضرت نے آخر یہ کیوں کہا؟ کیوں کہ چار رکعت والی صورت تو میرے ذہن میں زیادہ باعث اجر تھی۔ یہ سوالات صرف میرے ذہن میں گھوم رہے تھے، اشارۃً بھی کسی سے نہیں کہا تھا، نماز سے فارغ ہوتے ہی حضرت نے بلا تمہید رخصت اور عزیمت پر ایسی گفتگو شروع فرمائی جیسے رخصت اور عزیمت کے متعلق میری ذہنی الجھن کی حضرتؒ کو کسی نے خبر دی ہو۔ ہنگو شہر سے گاؤں آتے ہوئے راستے میں بھی کچھ بحث فرمائی۔ جب مدرسہ پہنچے تو تھوڑی دیر اپنے کمرہ میں بیٹھنے کے بعد کتب خانہ کی طرف چل دیے، میں بھی ساتھ ہو لیا۔ دو دن مسلسل سفر کی تھکاوٹ کے باوجود حضرت اس بحث (یعنی رخصت اور عزیمت) کے بارے میں مختلف کتابیں کھنگالنے لگے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سفر کی وجہ سے میرا جسم چور چور تھا اور حضرت مطالعہ کے وقت ہشاش بشاش تھے، رات کا ڈیڑھ بج گیا۔ فرمانے لگے کہ میں جب مطالعہ شروع کرتا ہوں تو مجھ پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ کتاب سے باہر پھر مجھے کسی چیز کا اندازہ نہیں ہوتا ہے، پھر فرمانے لگے کہ اگر خدانخواستہ مجھ پر فالج کا حملہ ہوا تو فالج کے دیگر اسباب کو تلاش مت کرنا بلکہ سب سے بڑا سبب میرا کثرت مطالعہ ہوگا۔

حضرت صرف مطالعہ نہیں بلکہ مطالعہ کے ساتھ زیر مطالعہ کتاب کے حواشی پر ضروری نوٹ بھی تحریر فرماتے رہتے، اکثر مجھے فرماتے کہ اگر کوئی بندہ صرف میرا حاصل مطالعہ لکھنا شروع کر دے تو یہ کم از کم بیس جلدوں سے بڑھ جائیں گے، ایک مرتبہ حضرت نے خود عنوانات لگا کر اس پر کام شروع کرنے کا حکم دیا، میں نے وہ کام شروع بھی کیا مگر مجھے ایک ہفتے کے اندر اندر اندازہ ہوا کہ یہ مجھ جیسے نالائق کا کام نہیں ہے، حضرت نے ہماری تربیت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی مگر افسوس کہ میرے اندر وہ قابلیت اور استعداد نہیں تھی جس کا حضرتؒ کو گمان تھا۔

نثر الازہار کی دوسرے اشاعت کے وقت فرمایا کہ راویوں کے ناموں پر اعراب لگانا چاہیے، یہ کام مدرسہ کے مدرسین حضرات نے اکھٹے شروع کیا مگر مولانا فیض الرحمن صاحب، مفتی عظمت اللہ صاحب اور مجھ کو یہ کام کرنے کا زیادہ موقع ملا، اس دوران میں نے ایک راوی ''عکرمہ'' کے نام پر اعراب لگائے، حضرت نے جب دیکھا تو

دریافت کرنے پر میں نے جہاں سے حوالہ نکالا تھا وہ کتاب پیش کی۔ حضرت نے اس پر نہایت خوشی کا اظہار فرمایا اور کہا کہ میں تو بچپن سے اس کو عکرمہ پڑھتا تھا اور حقیقت میں یہ عکرمہ بکسر العین والراء ہے، پھر کچھ عرصہ کے بعد میں نے ایک کتاب کے حاشیے پر اسی لفظ سے متعلق حضرتؒ کا نوٹ دیکھا تو میں حیران رہ گیا کہ حضرت نے تو کئی سال پہلے اس کے ضبط کی تحقیق کی تھی، سب کچھ معلوم ہونے کے باوجود صرف میرا حوصلہ بڑھانے کیلئے اپنے آپ کو دانستہ طور پر لاعلم ظاہر فرمایا۔

حضرت مہمان نوازی میں اپنی مثال آپ تھے۔ برادرم یوسف اور میں جب چھوٹے تھے تو مجھے یاد ہے حضرت مہمانوں کیلئے کھانا اور چائے خود لاتے تھے، جب مہمان کھانے کیلئے بیٹھ جاتے تو دسترخوان کی نگرانی حضرت خود فرماتے تھے، جہاں جس چیز کی کمی محسوس کرتے تھے وہاں خود اپنے ہاتھ سے وہ چیز رکھتے اور چائے کی پیالی خود بھر کر پلاتے، جب ہم کچھ بڑے ہو گئے تو ہمیں بار بار مہمانوں کے اکرام وخدمت کی تلقین کرتے حتی کہ اگر کوئی کوتاہی ہوجاتی تو مار پیٹ سے بھی گریز نہ فرماتے۔ جب مہمانوں کی خدمت میں کمی محسوس کرتے تو بے ساختہ میرے بڑے بھائی حافظ محمد طیبؒ کو یاد کر کے فرماتے کہ کاش وہ زندہ ہوتے مہمانوں کی خدمت میں وہ انتہائی چست اور باذوق تھے۔ بار بار یہ فرماتے تھے کہ خدمت کیلئے دو چیزوں کا پایا جانا ضروری ہے: (۱) عقل (۲) اخلاص، ان میں سے ایک میں بھی کمی ہو تو خدمت کا حق ادا نہیں ہوتا۔

مدرسہ کے سلسلے میں بار بار مجھے یہ نصیحت کرتے کہ مدرسہ میں تعمیر ضرورت کے مطابق کریں ضرورت سے زیادہ قطعاً نہیں، نیز تعمیر پر خرچہ بھی ضرورت کے مطابق کریں، اس کے کیلئے چندہ وغیرہ ہرگز نہ کریں، جب ضرورت پیش آئے گی اللہ رب العزت کے غیبی خزانوں سے مدد کی جائے گی اور اکثر فرمایا کرتے کہ طلبا کی کثرت یا قلت کی پروا کیے بغیر خالص اللہ کی رضا کیلئے خدمت کیا کریں اور حلفاً فرماتے تھے کہ قاعدہ بغدادی کا درس جو اخلاص پر مشتمل ہو اس بخاری شریف کے درس سے بہتر ہے جس میں دکھلاوا، خودنمائی اور نمود ونمائش ہو۔

مدرسہ کے اخراجات کے بارے میں بیسیوں مرتبہ فرمایا کہ یہ طلبا اللہ تعالیٰ کے مہمان ہوتے ہیں، وہ اپنے مہمانوں کا بندوبست خود کرتے ہیں، جتنی آپ کی طاقت ہو اسی کے مطابق طلبا رکھیں، چاہے ایک ہو یا دو ہو یا تین، ان کو اپنے گھر سے کھلائیں مگر نہ ان کیلئے چندہ کریں اور نہ ہی کسی کے سامنے دست سوال پھیلائیں، جب تک انتظامات کر سکتے ہیں کریں جب خرچہ ختم ہو جائے تو ان کو رخصت کردیں، آخرت میں آپ سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ آپ نے مدرسہ میں اتنی تعداد کیوں نہیں رکھی؟ یا ان کو پورا سال کیوں نہیں پڑھایا؟

حضرتؒ مدرسہ کی اشیا میں بہت زیادہ احتیاط فرماتے تھے، مدرسہ کیلئے سالن گھر میں پکایا جاتا ہے مگر سوال ہی

پیدا نہیں ہوتا تھا کہ کوئی پیاز کا ایک ٹکڑا گھر میں استعمال کر لے، معمولی سی کوتاہی بھی محسوس فرماتے تو سخت تنبیہ فرماتے ،غصہ سے چہرہ لال ہو جاتا اور فرماتے کہ اپنی ذات کیلئے مدرسہ یا طلبا کی چیزوں کو استعمال کرنا آگ ہے آگ۔

فراغت کے بعد میں حضرتؒ کے درس (مشکوۃ شریف ،شرح النقایہ ،اوضح المسالک) میں شریک ہوتا تھا، کسی حد تک اس کو ریکارڈ بھی کیا تھا، چنانچہ جب پہلی دفعہ میں شرح النقایہ کے درس میں شریک ہوا تو سردیوں کا موسم تھا، حضرت جب درسگاہ میں تشریف لائے تو میں فوراً اٹھا اور دروازہ بند کر کے لائٹ جلادی۔ حضرت مسکراتے ہوئے فرمانے لگے کہ مولوی صاحب! یہ کراچی نہیں شاہو وام ہے۔ دروازہ کھولو، جب دروازے کی روشنی سے کام چلتا ہے تو بلب روشن کرنے کی کیا ضرورت ہے، قیامت کے دن اس کا جوابدہ کون ہوگا؟

ایک مرتبہ ایک صوبائی وزیر نے پیغام بھیجا کہ میں نے زکوۃ کی مد سے مدرسہ کیلئے کچھ رقم مختص کی ہے آپ کسی کو بھیج دیں تا کہ وہ رقم وصول کریں، یہ میرا چشم دید واقعہ ہے، حضرتؒ نے جوابی پیغام بھیجا کہ اگر اپنی زکوۃ کی رقم ہمارے طلبا پر خرچ کرنا چاہتے ہو تو خود لے کر آؤ، میں کسی کو نہیں بھیجوں گا۔ صوبائی وزیر نے دوبارہ پیغام بھیجا کہ ہنگو بازار میں کوئی بندہ بتادیں ہم اس کے حوالہ کریں گے۔ حضرتؒ نے اس سے بھی انکار کر کے پھر وہی جواب دیا۔ تیسری مرتبہ اس وزیر نے ہمارے ایک رشتہ دار کے بارے میں بتایا' جو ہنگو بازار میں دکاندار تھا' کہ فلاں دکاندار کو ہم دیں گے وہ آپ کے پاس لے آئیں گے، حضرت نے پھر انکار کر کے فرمایا کہ اپنی زکوۃ کی ادائیگی کیلئے خود آجائیں تب قبول کریں گے بالآخر وزیر صاحب خود آ گئے ،رقم وصول کرتے وقت حضرت نے پھر پوچھا کہ یہ حکومتی تعاون تو نہیں۔ اس نے کہا کہ نہیں حضرت! یہ میری ذاتی آمدن کی زکوۃ ہے، پھر حضرت نے فرمایا کہ ہم آپ کی زکوۃ طلبا کیلئے وصول کرتے ہیں اس میں آپ کا ہمارے اوپر کوئی احسان نہیں ہے، اگر کہیں اور دینا چاہتے ہو تو خوشی سے لے جاؤ ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔

جب ہماری شیخان قوم کے مشترکہ علاقے میں کوئلے کے ذخائر دریافت ہوئے تو اس میں سے قوم نے اپنے اجتماعی مفادات کیلئے فنڈ جمع کرنا شروع کیا، وہ فنڈ کروڑوں تک پہنچ چکا تھا، چنانچہ ایک مرتبہ قومی مشران کا وفد متفقہ طور پر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگے کہ حضرت! ہم پوری قوم کی طرف سے نمائندے بن کر آئے ہیں اور قومی فنڈ سے مدرسہ کیلئے ایک ٹیوب ویل کا بندوبست کرنا چاہتے ہیں تا کہ طلبا کیلئے باہر سے پانی لانے کی ضرورت نہ پڑے مگر حضرت راضی نہ ہوئے ،انہوں نے خوب اصرار کیا مگر حضرت نے سختی کے ساتھ رد کرتے ہوئے فرمایا کہ اس فنڈ میں قوم کے یتیم بچوں اور بیواؤں کا حق ہے، ہم اسے یہاں نہیں لگا سکتے۔

حضرت اسراف پر بہت غصہ ہوتے تھے، پانی کے استعمال میں خود بھی انتہائی محتاط تھے اور دوسروں کو بھی تنبیہ

کرتے تھے۔ نلکوں سے جو ایک ایک قطرہ پانی بہتا تھا خود جا کر اپنے ہاتھوں سے اس کو اچھی طرح بند کر دیتے تھے، ہمارے گاؤں میں پانی کی شدید قلت تھی اکثر باہر سے ٹریکٹروں کے ذریعہ سے ٹینکیوں میں پانی لاتے تھے اور بارش کا پانی ذخیرہ کرتے تھے۔

حضرت شرک و بدعت سے سخت نفرت کرتے تھے، زندگی کے ہر پہلو میں احکام خداوندی پر عمل پیرا اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا کامل اتباع کرتے ہوئے نظر آتے، حضرت کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے خیر القرون کے کسی ہستی کو اللہ رب العزت نے اس دور میں پیدا فرمایا ہے۔ اکثر فرماتے تھے کہ اگر کوئی شخص زندگی میں مسنون دعاؤں کا اہتمام کرے تو اس کو اصلاح کیلئے کسی پیر و مرشد کے وظائف کی ضرورت نہیں پڑتی، اسی طرح دلائل الخیرات کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ پابندی کے ساتھ اس کے ورد کرنے والے کیلئے یہ ایک کامل مرشد کی حیثیت رکھتا ہے

۔

طالبعلمی کے دور سے میری عادت تھی کہ فجر اور مغرب کی نماز کے متصل بعد میں کچھ مخصوص اذکار کا ورد کرتا تھا جس پر تقریبا پانچ دس منٹ لگتے تھے، تو ایک دفعہ میں مغرب کی نماز میں حضرت کے ساتھ صف میں برابر کھڑا تھا، نماز کے بعد حضرت سنت پڑھنے میں مشغول ہو گئے اور میں اپنے مخصوص اذکار کا ورد کرنے لگا، بعد میں تنہائی میں حضرت نے تنبیہ فرمائی کہ فرض اور سنت کے درمیان اتنا وقفہ رکھنا خلاف سنت ہے، یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ میں نے کہا: حضرت! احادیث میں فرض نمازوں کے بعد جن اذکار اور دعاؤں کا ذکر ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟ تو آپؒ نے فرمایا کہ فرض نماز کے بعد "اللھم انت السلام و منک السلام الخ" پر اکتفا کریں، باقی اذکار و دعائیں سنتوں سے فارغ ہونے کے بعد پڑھیں۔

ایک مرتبہ میں مسجد کے دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا اور طلبا کی نگرانی کرنے لگا جو طالب علم مسجد میں بائیں پاؤں سے داخل ہوتا، میں اس کو سخت تنبیہ کر کے کہتا کہ مسجد میں داخل ہوتے وقت پہلے دایاں پاؤں داخل کریں، خلاف سنت کام مت کریں۔ حضرت میرے پیچھے کھڑے میرا نظارہ فرما رہے تھے، میں نے حضرت کو نہیں دیکھا تھا۔ بعد میں حضرت نے فرمایا کہ: "یہ آداب میں سے ہیں اور ترک ادب پر نکیر خود ایک منکر ہے، بدقسمتی سے ہم لوگوں نے آداب، مستحبات اور سنن کو خلط ملط کیا ہوا ہے اس لئے پھسل جاتے ہیں، ایک عالم دین کو چاہیے کہ شرعی احکام پر عمل کرتے وقت ان کے مراتب کو ملحوظ رکھے، ورنہ غلو فی الدین سے بچنا مشکل ہو جائے گا۔"

جو لوگ اعمال پر زور دیتے تھے اور معاملات میں شرعی احکام کو روندتے تھے ان پر بہت سخت غصہ ہوتے تھے اور فرماتے تھے کہ شریعت کی مثال ایک مشین کی سی ہے، جس طرح کسی مشین کا ایک پرزہ خراب ہو تو وہ صحیح کام نہیں

کرتی، نیز ہر ایک پرزہ کی اپنی اپنی اہمیت ہوتی ہے، بعض پرزے نہ ہونے کی وجہ سے مشین بالکل کام ہی نہیں کرتی اور بعض کے نہ ہونے کی وجہ سے کام تو کرتی ہے لیکن ناقص طریقہ سے، اسی طرح اگر شریعت کے بعض احکام پر عمل پیرا رہیں گے اور بعض احکام کو روندیں گے تو وہ نتائج کبھی ظاہر نہیں ہوں گے جو متوقع ہوتے ہیں۔

لوگوں کے اصلاح کے حوالے سے یہ آیت "وانذر عشیرتک الاقربین" تلاوت فرما کر ارشاد فرماتے کہ اصلاح کا عمل سب سے پہلے اپنے گھر اور اپنے خاندان سے شروع کرنا چاہیے، پھر رفتہ رفتہ آگے بڑھانا چاہیے۔

درجہ سادسہ کے سال میں جب سالانہ چھٹیوں میں جامعہ فریدیہ اسلام آباد سے گھر آیا تو رمضان کی ایک رات تراویح پڑھانے کیلئے آگے بڑھا۔ خوب اطمینان سے آہستہ آہستہ تراویح کی نماز پڑھائی جس پر دیگر ایام کی نسبت کافی دیر لگی۔ تراویح سے فارغ ہونے کے بعد حضرت نے فرمایا: بھتیجے! یہ اسلام آباد نہیں شاہو دام ہے۔ اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔ میں بھی حیران تھا کہ مجھ سے کیا لغزش ہوگئی؟ بعد میں تنہائی میں حضرت نے سمجھایا کہ امام کو مقتدیوں کی حالت ملحوظ رکھنی چاہیے، یہاں بیمار اور بوڑھے لوگ بھی ہیں اور یہ دیہاتی علاقہ ہے لوگ پورا دن محنت اور مزدوری کر کے تھکے ہوتے ہیں، اس طرح لمبی نمازوں سے لوگ تنگ آکر مسجد آنا چھوڑ دیں گے، پھر اس کے بعد میں ہمیشہ امامت کے دوران مسنون مقدار پر اکتفا کرتا تھا۔

طالب علمی کے دوران میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ فقہا نے مسنون قرأت کیلئے جو طوال مفصل، اوساط مفصل اور قصار مفصل کا ذکر کیا ہے بعینہ یہی سورتیں مسنون ہیں، جب حضرت کے ساتھ اس کا تذکرہ کیا تو حضرت نے سمجھایا کہ فقہا کا مقصد بعینہ یہی سورتیں نہیں ہیں بلکہ یہ صرف ایک مقدار بتائی ہے کہ اس مقدار پر قرآن مجید کے جس حصہ سے بھی تلاوت کریں گے وہ مسنون قرأت ہوگی، ورنہ لوگ باقی قرآن کو چھوڑ کر صرف انہی سورتوں کے پیچھے پڑ جائیں گے البتہ افضلیت اور عدم افضلیت کے لحاظ سے یہ بات ضرور ہے کہ کسی رکعت میں آدھی سورۃ پڑھنے سے کامل سورۃ پڑھنا افضل ہے۔

حضرت جب درس یا مطالعہ میں مشغول ہوتے تو کوئی دنیاوی بات یا کام کے لئے خلل ڈالنا بالکل برداشت نہیں فرماتے تھے، جب گھر کی طرف سے کوئی پیغام یا بات ہوتی تو درس اور مطالعہ کے دوران ہم خوف کی وجہ سے اس کو حضرت کے سامنے پیش نہیں کر سکتے تھے، سوائے حضرت کی چھوٹی بہن یعنی ہمارے پھوپھی جان کے جس کے پیغام کو ہم حضرت کے پاس بلا خوف وتردد کے لے جاتے تھے، حضرتؒ کو چونکہ ان سے بہت زیادہ محبت تھی، لہٰذا اس کی کسی بات کو نہیں ٹالتے تھے اور نہ ہی اس کی سفارش کو رد فرماتے تھے۔ جب حضرت استاذ صاحب کسی وجہ سے ناراض ہو جاتے تو ہم پھوپھی کو شکر تنگی سے بلا کر سفارش کرواتے تھے، شہادت سے پہلے بھی حضرتؒ نے ان کو بلا کر

کچھ اہم وصیتیں کی تھیں۔

ایک مرتبہ ہم ہنگو بازار گئے، بازار میں حضرت جیسے ہی گاڑی سے اتر رہے تھے تو ایک ساتھی نے غلطی سے جلدی میں گاڑی کا دروازہ بند کر دیا جس کے نتیجہ میں حضرت کی انگلیاں دروازے میں پھنس گئیں اور بری طرح زخمی ہوگئیں حضرت قریب ہی ایک ڈاکٹر کے پاس گئے، ڈاکٹر نے پٹی وغیرہ کر کے ساتھ دوائی بھی دی اور درد کم کرنے کے لیے ڈبل پونشان کی گولیاں دیں جو کہ مارکیٹ میں تازہ تازہ آئی ہوئی تھیں، حضرت نے وہ گولی استعمال کر کے مغرب کے بعد مجھے بتایا کہ گولی کا مجھ پر ایک عجیب اثر ہوا، بالکل بچپن کی باتیں یاد آنے لگی ہیں، اس کے بعد والدہ کی وفات کا واقعہ سنایا۔

مدرسہ میں مدرسین کی مقرر کوئی تنخواہ نہیں تھی پھر بھی مدرسین کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی کہ بڑی مشکل سے دو دو یا تین تین کتابیں ہر ایک کے حصہ میں آتیں۔ تنخواہ نہ ہونے کے باوجود حضرت کی کوشش رہتی کہ ہر ایک کو اس کے اخراجات کے بقدر کچھ نہ کچھ ضرور دیں۔ حضرت کی ایک عجیب کرامت یہ تھی کہ مجھے ہر ماہ تقریباً ۱۵۰۰ یا ۲۰۰۰ روپے دیتے تھے، ان پیسوں سے پورا مہینہ گھر کا خرچہ بھی پورا ہوتا تھا اور پھر بھی جیب میں دو یا تین سو بچ جاتے تھے، کبھی کبھی مجھے اپنے متعلقین کی طرف سے بیک وقت دس پندرہ ہزار روپے مل جاتے مگر ان پیسوں سے گھر کا دو ہفتوں کا خرچہ بھی پورا نہ ہوتا تھا، یہ تجربہ میں نے کئی بار کیا تھا اور اپنے بعض دوستوں سے اس کا تذکرہ بھی کیا۔

ہنگو میں شیعہ سنی تصادم کی وجہ سے اکثر حالات خراب رہتے تھے لیکن حضرت نے امن قائم رکھنے کے لیے جتنی کوششیں کی تھیں وہ کسی سے مخفی نہیں تھیں۔ حضرت کا موقف انتہائی مدلل اور معتدل ہوتا تھا۔ آپ نے ہر فورم پر اس بات کی دہائی دی کہ ہنگو میں ہر فرقہ کی عبادات اور رسوم ورواج اس کے عبادت خانوں تک محدود کر دی جائیں، یہ امن قائم رکھنے کیلئے ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ وہ بار بار فرماتے تھے کہ جنگ وجدال سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، اگر حکومت مخلص ہو تو ہنگو کا مسئلہ بات چیت کے ذریعہ حل ہو سکتا ہے۔ چونکہ وہ جنگ وجدال اور لوٹ مار کے بالکل قائل نہیں تھے اس وجہ سے بعض عاقبت نااندیش حضرت کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے لگے کہ حضرت شرعی جہاد کے بھی مخالف ہیں حالانکہ حضرت ایک مجاہد انسان تھے، دینی غیرت وحمیت آپ کے رگ وپے میں سرایت کی ہوئی تھی، اور دنیا کے جس خطے میں بھی مظلوم مسلمان اپنے دفاع وبقا کے لیے کفریہ طاقتوں کے خلاف برسرِ پیکار تھے ان کے لیے بے چین رہتے اور انہیں اپنی شب وروز کی دعاؤں میں یاد رکھتے۔

حضرت کے ساتھ اکثر میں جرگوں اور اجلاسوں میں شریک ہوتا تھا، جس مجلس میں حضرت موجود ہوتے تو حاضرین میں سے کسی کی بس کی بات نہیں ہوتی تھی کہ وہ حضرت کے موقف کا توڑ پیش کر سکے، آپ کی بات آخری

اور حتمی شمار ہوتی۔

مجھے رمضان المبارک میں تقریباً پندرہ سال تک حضرت کے ساتھ اعتکاف کی سعادت نصیب ہوئی، حضرت تو پورا مہینہ اعتکاف فرماتے مگر میں صرف آخری عشرہ میں اعتکاف کرتا۔ اگر میں حضرت کے صرف اعتکاف کے احوال اور کیفیات لکھنا شروع کر دوں تو ہوسکتا ہے کہ یہ مضمون ایک کتاب کی شکل اختیار کر جائے مگر اختصار کے پیش نظر صرف ایک دو باتوں کے ذکر پر اکتفا کرتا ہوں۔

رات کو ہمارے سونے کا معمول یہ تھا کہ ہم تراویح کے ایک گھنٹہ بعد سوتے تھے، حضرت میری آرام کی خاطر بظاہر جلدی سو کر میرے سونے کے بعد دوبارہ اٹھ جاتے اور عبادت میں مشغول ہو جاتے، جب میرے جاگنے کا وقت ہوتا تو اس سے تھوڑی دیر پہلے سو جاتے اور دوبارہ اٹھ کر وضو فرماتے، بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ حضرت رات کو میرے ساتھ سوئے تھے اور ابھی اٹھے ہیں۔ یہ راز مجھ پر اس طرح افشا ہوا کہ ایک رات میرے سر میں درد تھا، حضرت نے دو تین مرتبہ پوچھا کہ آپ پریشان نظر آرہے ہو کیا وجہ ہے؟ میں نے جواباً کہا کہ حضرت! کوئی پریشانی نہیں ہے۔ پھر میں سونے کے ارادہ سے لیٹ گیا لیکن درد کی شدت کی وجہ سے نیند نہیں آرہی تھی، سردیوں کا موسم تھا، میں نے اپنے اوپر رضائی ڈالی ہوئی تھی، حضرت نے لائٹ بند کی اور لیٹ گئے، کچھ دیر بعد حضرت بڑی خاموشی کے ساتھ اٹھے اور نماز پڑھنے لگے، میں رضائی کے کنارے کو معمولی سا اٹھا کر خاموشی سے دیکھنے لگا، عبادت حضرت فرما رہے تھے مگر کیفیت مجھ پر ایک ایسی طاری ہوئی اور ایک ایسا مزہ محسوس کرنے لگا کہ نہ اس سے پہلے کبھی محسوس کیا اور نہ بعد میں۔ سر درد تو بالکل ہی ختم ہو گیا نیز جسم میں ایک تبدیلی سی محسوس کرتے ہوئے ایسی گہری نیند سو گیا جیسے کسی نے نشہ کی دوا پلائی ہو، جب تقریباً تین بجے دوبارہ بیدار ہوا تو مسجد میں ایسی روشنی دیکھی جیسے سورج نکلا ہوا اور حضرت کو ایسی کیفیت میں پایا جس کو بیان کرنے سے حضرت کی وصیت مجھے مانع ہے۔

ایک دفعہ ہنگو سے کچھ حضرات دوران اعتکاف آگئے، امن وامان کے حوالے سے حضرت کے ساتھ گفتگو کرنے لگے، دوران گفتگو حضرت نے اپنے منہ پر اس انداز سے ہاتھ رکھا تھا کہ ناک بھی بند کی ہوئی تھی نیز رفتہ رفتہ حضرت کا چہرہ بھی سرخ ہوتا جا رہا تھا، جب وہ حضرات رخصت ہوئے تو حضرت اپنے معمولات میں مصروف ہو گئے، میں حضرت پر کافی بوجھ محسوس کر رہا تھا، ان افراد کی طرف سے بھی کوئی نامناسب بات محسوس نہیں ہوئی تھی۔ افطاری کے بعد میں نے حضرت کو دوائی استعمال کرنے کے لئے کہا لیکن حضرت نے ٹال دیا۔ تراویح پڑھنے کے بعد میں نے دوبارہ حضرت سے عرض کیا کہ آپ کو تکلیف ہے، آج کل راتیں بھی لمبی ہیں، تکلیف بڑھ گئی تو مسئلہ ہوگا۔ ابھی چیک اپ کے لئے شاہو سے ڈاکٹر کو بلا لیں گے۔ حضرت نے فرمایا: جسمانی تکلیف نہیں ہے بلکہ یہ ایک روحانی تکلیف

ہے لیکن اسے میری زندگی میں راز رکھنا، اس کو افشا نہیں کرنا، میرے ساتھ کافی عرصہ سے یہ معاملہ ہے کہ مجلس میں جب کوئی جھوٹ بولتا ہے یا غیبت کرتا ہے تو ایسی بدبو محسوس ہوتی ہے جیسے انسان کی گندگی اور غلاظت کی بدبو اور یہ لمحات میرے لئے انتہائی تکلیف دہ ہوتے ہیں پھر رمضان میں اور اللہ تعالیٰ کے گھر میں ایسے لمحات اور بھی شدید تکلیف کا باعث ہوتے ہیں اور کافی دیر تک ذہن پر بوجھ رہتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد میں حضرت کے سامنے بات کرنے میں انتہائی احتیاط سے کام لیتا تھا۔

ایک مرتبہ اعتکاف میں ہی سحری سے کچھ دیر پہلے جب ہم اُٹھے تو حضرت انتہائی ہشاش بشاش نظر آرہے تھے، فرمانے لگے کہ آج تو مجھے بہت ہی عجیب وغریب کیفیت کا سامنا ہے، پھر مولانا عبدالستار صاحب (جو اُس وقت عمرہ کی ادائیگی کے لئے حرمین شریفین تشریف لے گئے تھے) کا نام لیتے ہوئے فرمانے لگے کہ میرے خیال میں وہ ملنگ روضۂ اقدس پر سلام پیش کرنے میں مصروف ہے۔ میں نے اس وقت اور تاریخ کو نوٹ کرلیا۔ جب مولانا عبدالستار صاحب عمرہ سے واپس آگئے تو میں نے ان سے باتوں باتوں میں روضۂ اقدس پر حاضری دینے کی تاریخ اور وقت کا پوچھا تو انہوں نے بعینہٖ وہی وقت اور تاریخ بتائی جس وقت اور جس دن حضرت نے مذکورہ جملہ کہا تھا اور مولانا عبدالستار صاحب نے ساتھ یہ بھی کہا کہ اس وقت میں نے حضرت کی طرف سے روضۂ اقدس پر سلام بھی عرض کیا۔ میں نے مولانا عبدالستار صاحب کو اس واقعہ سے آگاہ نہیں کیا، آج پہلی مرتبہ اس کا ذکر کررہا ہوں۔

ایک مرتبہ ہم اعتکاف میں تھے کہ کسی نے یہ اطلاع دی کہ حاجی فیض اللہ صاحب کو اہل تشیع کے بعض جرائم پیشہ افراد نے اغوا کرلیا ہے، حضرت کافی پریشان ہوگئے، بار بار فرمارہے تھے کہ اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت فرمائے بڑا کام کا بندہ ہے۔ ایک رات عشاء کے بعد حاجی فیض اللہ کے والد حاجی فضل اکبر مرحوم (جو حضرت کے قریبی دوستوں میں شمار ہوتے تھے) آئے اور اپنے بیٹے کی رہائی کے حوالے سے حضرت کے ساتھ کافی دیر مشاورت کی۔ حاجی صاحب (مرحوم) کے رخصت ہونے کے بعد حضرت نے مجھے فرمایا کہ حاجی صاحب بہت زیادہ پریشان ہیں، فیض اللہ کی رہائی کے لئے دعاؤں کی بہت زیادہ تاکید کی ہے لہٰذا آپ بھی اہتمام کریں، پھر حضرت دو رکعت نفل پڑھ کر دعا میں مصروف ہوگئے، میں نے اس سے پہلے کبھی حضرت کو اتنی لمبی دعا کرتے نہیں دیکھا تھا، حضرت دعا میں مصروف ہی تھے کہ میں سوگیا، صبح نماز کے بعد کسی نے خوشخبری سنائی کہ حاجی فیض اللہ رات کو اغوا کاروں کی قید سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ جب حاجی فیض اللہ صاحب واپس آگئے تو انہوں نے اپنی اسیری اور رہائی کے بارے میں لمبی چوڑی کارگزاری سنائی لیکن میں نے اُس میں جو اہم بات نوٹ کی وہ یہ تھی کہ اس رات جب ہم تینوں مغویان سوگئے تو خواب میں حضرتؒ کو ایسی حالت میں دیکھا کہ حضرت نے دونوں ہاتھ دعا کے لئے اُٹھائے

ہوئے تھے، اس کے ساتھ ہی میں فوراً بیدار ہوا، اپنے اندر بھاگنے کی ایک زبردست ہمت اور حوصلہ محسوس کرتے ہوئے فوراً اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد پہنچ گئی، چلو توکل کر کے بھاگنا ہے، ہاتھ پاؤں میں ہتھکڑیوں، بیڑیوں کے ساتھ ہم دو ساتھیوں نے ایک ڈھلوان سے اپنے آپ کو گرایا اور تیزی سے پہاڑ میں نیچے کی طرف پھسلنے لگے۔ یوں ہم ان کی قید سے فرار ہونے میں کامیاب ہوئے۔

حضرت کا مزاج ہی ایسا تھا کہ جلسوں اور جلوسوں کے بالکل قائل نہیں تھے بلکہ جہاں ازدحام اور رش ہوتا تھا وہاں بہت زیادہ تنگ ہوتے تھے، اس کے باوجود کراچی میں ہماری دستار بندی کے موقع پر ہم نے ایک جلسے کا انتظام کیا، میری دلجوئی کی خاطر حضرت خود بھی تشریف لائے اور اپنے ساتھ اپنے استاذ محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا عبداللہ صاحب رحمہ اللہ کو بھی لائے۔

حضرت کے مطالعہ میں عجیب برکت تھی، جب کتاب شروع کر دیتے تو کتاب ختم کیے بغیر ان کو آرام نہیں آتا تھا، کبھی کبھی مطالعہ کی مقدار روزانہ ہزاروں صفحات تک پہنچ جاتی۔ صرف مطالعہ ہی نہیں بلکہ ساتھ ساتھ حواشی پر نوٹس بھی لکھتے تھے، حضرت کے مطالعہ کا انداز دیکھ کر مجبوراً کہنا پڑتا کہ واقعی علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے بعد حضرت ایک چلتا پھرتا کتب خانہ کے مصداق تھے۔ آپ خداداد ذہانت، فطانت، فہم وفراست، قوت حافظہ، بدیہہ گوئی اور حاضر دماغی میں عجوبہ روزگار تھے، میں نے بارہا دیکھا تھا کہ ہنگو میں امن وامان کے سلسلہ میں اجلاسوں میں بڑے بڑے افسر، وکلا اور ملکان حضرات ہوتے تھے لیکن مجال تھا کہ وہ حضرت کے دلائل کا جواب دیتے، پوری مجلس پر حضرت کا اثر ہوتا تھا۔

میں نے دوران تعلیم کراچی میں بڑے بڑے شیوخ سے سنا کہ علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے علوم ومعارف کے امین مولانا یوسف بنوریؒ تھے اور مولانا بنوریؒ کے علم کے صحیح حامل اور ان کے علوم ومعارف کے امین حضرتؒ ہی ہے۔

حضرت سے ملنے والا سب سے پہلے یہ تاثر لیتا تھا کہ حضرت اعتماد علی اللہ اور اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص ملکہ رکھتے ہیں، اور آپ کا یہ ملکہ لازمی نہیں متعدی ہے، یعنی گھڑی دو گھڑی صحبت میں وقت گزارنے والا بھی اپنے دل کو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے سرشار پاتا۔

حضرت کو کتب بینی اور مطالعہ کا شغف بہت زیادہ تھا، کام کے سلسلے میں جب تک کہ دوسروں کی طرف سے طلب اور کافی طلب ظاہر نہ ہوتی تھی، متوجہ نہ ہوتے تھے، حضرت کی ذکاوت وذہانت طبعی تھی، فہم نہایت تیز اور طبیعت سادہ تھی، علم کی بنیاد فہم ہی ہے، جب اسے کتاب وسنت میں استعمال کیا گیا تو علم کا دو چند ہوجانا تو قدرتی امر تھا، درس میں مضامین کو جامعیت اور استقصا کے ساتھ ادا کرتے تھے، کلام میں بسط ہوتا تھا مگر غیر مہمل، ایک مسئلہ کو اس

کے تمام شقوق وجوانب کے ساتھ کھولنے اور صاف کرنے کی روش تھی، اس لئے درس میں کمیت پر نہیں کیفیت پر نظر رہتی تھی۔

حضرتؒ کو اللہ رب العزت نے فقہ میں جو مقام عطا فرمایا تھا وہ حضرت کے متعلقین میں سے کسی سے مخفی نہیں، مگر اس کے باوجود اگر آپؒ سے کوئی فتوی لینے آتا تو حضرت اس کو مفتی عظمت اللہ صاحب کے پاس بھیج دیتے، فتوی کی تحریر میں اختصار اور جامعیت کو بہت پسند فرماتے تھے، آپؒ تمام مدرسین میں سے مفتی عظمت اللہ صاحب کی تحریر اور فتوی نویسی کی بہت تعریف فرمایا کرتے تھے اور اکثر یہ نصیحت فرماتے تھے کہ مفتی کو ہمیشہ اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ اس کے فتوی سے کوئی فتنہ نہ کھڑا ہو جائے، نہایت سوچ سمجھ کر لکھنا چاہئے، فقہا نے فرمایا ہے: "من لم یعرف اھل زمانہ فھو جاھل"۔

حضرت شہیدؒ مسلک حنفیت پر نہایت سختی سے عمل پیرا رہتے مگر اس کے باوجود کبھی راہ اعتدال کو نہیں چھوڑا اور نہ ہی دیگر مسالک کے بارے میں کوئی متعصبانہ رویہ کبھی اختیار فرمایا، مسئلہ حل کرنے میں ہر پہلو پر نظر رکھتے، ایک مرتبہ اپنا ایک واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ کچھ لوگ میرے پاس آئے اور ایک مسئلہ کے بارے میں پوچھا، مسئلہ اس نوعیت کا تھا کہ دیگر معلومات حاصل کرنے اور موقع کی نزاکت دیکھنے کے بعد مجھے یقین ہوا کہ اگر اس وقت ان کو مجھ سمیت کوئی بھی اس مسئلہ میں قول راجح پر فتوی دے دے تو موقع پر ان فریقین کے آپس میں دو قتل تو یقینی ہیں، باقی دشمنی کا سلسلہ جو چلتا اور باہم جو کشت وخون ہوتا اس میں پتہ نہیں کتنی اموات واقع ہو سکتی تھیں۔ ساری صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے کافی سوچ بچار کے بعد میں نے اپنے مسلک کے قول راجح کی بجائے ایک مرجوح فقہی قول کے مطابق فتوی دیا۔ فتوی دینے کے بعد مجھ پر کافی بوجھ تھا، ذہن بوجھل اور پریشان تھا کہ ایسا نہ ہو کہیں یہ فتوی میں نے غلط نہ دیا ہو، چنانچہ اپنے دلی اطمینان اور تسلی کی خاطر میں نے حضرت مہتمم صاحب (مولانا فضل محمد سواتیؒ) کے پاس مینگورہ سوات جانے کا ارادہ کیا، وہاں جا کر میں نے مہتمم صاحبؒ کو اول تا آخر پورا واقعہ بیان کرنا شروع کیا، واقعہ سنتے سنتے حضرت مہتمم صاحبؒ کا چہرہ مبارک غصہ سے سرخ ہونے لگا چنانچہ میری بات کو کاٹ کر فرمانے لگے کہ باقی باتیں چھوڑو، یہ بتاؤ کہ تم نے ان کو کیا فتوی دیا؟ میں نے کہا: حضرت میں نے تو اپنے مسلک کے بجائے فلاں قول کے مطابق فتوی دیا ہے، یہ سن کر مہتمم صاحب کا چہرہ خوشی سے کھلکھلا اٹھا اور فرمایا کہ مجھے یہ ڈر لگا کہ چونکہ آپ حنفیت میں بہت سخت ہیں، ہو سکتا ہے کہ آپ نے اپنے مسلک کے مطابق فتوی دیا ہو جس کے نتیجہ میں آپ ان کو بھی تباہ کرتے اور اپنے آپ کو بھی تباہی میں ڈال دیتے۔ اس مثال کے عرض کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ استاذ صاحب فتوی دینے میں حالات کو کس طرح مدنظر رکھتے اور کس طرح راہ اعتدال پر گامزن رہتے۔

ایک دوسرا مسئلہ جو ہمارے علاقے میں کثرت کے ساتھ وقوع پذیر ہوتا رہتا ہے یعنی طلاق مغلظ کے لیے لوگ 'مور، خور، تر ور' (ماں، بہن، پھوپھی) کے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور ان تین الفاظ کو بول کر طلاق دیتے ہیں۔ ان الفاظ کے ساتھ کون سی طلاق واقع ہوتی ہے؟ اس بارے میں علاقے کے مفتیان کرام کی آرا مختلف ہیں اور ان کی آپس میں کافی بحثیں ہوئی ہیں۔ استاذ صاحب کی رائے اور موقف ہمیشہ یہ رہا کہ ان الفاظ کے ساتھ طلاق مغلظ واقع ہوجاتی ہے۔ اس بارے میں مفتیان کرام کے ساتھ حضرت کی گفتگو بھی ہوئی، حضرت استاذ صاحبؒ فرماتے کہ فقہا نے لکھا ہے کہ یمین اور طلاق میں عرف معتبر ہوتا ہے یعنی یمین اور طلاق میں جو الفاظ استعمال کیے جائیں، ان سے عرف میں جو مراد لی جاتی ہے وہی مراد معتبر ہوگی۔ اب ہمارا عرف کیا ہے؟ اور اس کی پہچان کیسے ہوگی؟ کہ ہمارے عرف میں 'مور، خور، تر ور' کے تین الفاظ طلاق مغلظ کے ہیں یا نہیں تو اس کی واضح علامت یہ ہے کہ ہمارے علاقے کے ایک چرواہے سے پوچھا جائے کہ اگر آپ بیوی کو طلاق دینا چاہیں تو کیسے دیں گے؟ تو وہ جواباً یا تو پتھر پھینک کر ایک دو تین کہے گا، یا 'تہ پہ ما باندے مور، خور، تر ور یے' (تو میرے اوپر ماں، بہن، پھوپھی کی طرح ہے) کے الفاظ ادا کرے گا، اس لئے کہ جو شخص اپنی بیوی کے لیے ''مور، خور، تر ور'' کے الفاظ استعمال کرتا ہے اس کا سوائے طلاق کے دوسرا مقصد ہی نہیں ہوتا، اس کے ذہن میں یہی ہوتا ہے کہ میں نے طلاق مغلظ دینی ہے اور ان الفاظ کے ساتھ طلاق واقع ہوتی ہے، لہٰذا ہمارا عرف چونکہ یہی ہے اس وجہ سے استاذ صاحب فرماتے کہ 'مور، خور، تر ور' طلاق مغلظ ہے، پھر اگر کوئی اس بارے میں بہت چھیڑ چھاڑ کرتا تو استاذ صاحب اس کو خود جواب نہ دیتے بلکہ اس کو کسی دوسرے مفتی کے پاس بھیج دیتے، دیگر مفتیان کرام کی اس بارے آرا جدا تھیں، اس لیے ان کے لیے گنجائش نکل آتی۔

استاذ صاحب نسوار کے بارے میں فرماتے کہ نسوار کے متعلق بعض کہتے ہیں کہ حرام ہے، بعض کہتے ہیں کہ مکروہ ہے، بعض کہتے ہیں کہ مباح ہے اور بعض کہتے ہیں کہ جائز ہے وغیرہ وغیرہ، مگر استاذ صاحب اس بارے میں فرماتے کہ نسوار ڈالنا مکروہ تحریمی ہے اور اس کے لئے ایک زبردست دلیل ذکر فرماتے کہ ایک بدبودار اور مضر صحت چیز کے منہ میں ڈالنے کا درجہ کبھی بھی مکروہ تنزیہی سے کم نہیں ہوسکتا، یعنی اگر کوئی اس میں گنجائش نکال کر اس کو کم سے کم درجے پر لانا چاہے تو اس کو مکروہ تنزیہی سے کم درجہ پر کبھی نہیں لاسکتا اور مکروہ تنزیہی پر دوام مکروہ تحریمی تک پہنچتا ہے اور اس پر تسلسل خود بخود مکروہ تحریمی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

اسی طرح منہ میں نسوار رکھنے سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں؟ استاذ صاحبؒ فرماتے کہ احتیاطاً وضو کرنا چاہیے، اور اس پر ڈھوڈہ واستاذ صاحبؒ کا حوالہ تائید میں پیش فرماتے کہ میں ایک دن ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ کسی نے پوچھا کہ نسوار سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں؟ فرمایا: وضو کرنا چاہیے، پھر اس کی وجہ ذکر کی کہ جو شخص ہونٹ کے نیچے نسوار رکھتا ہے

اس مقام پر باریک باریک دانے نکل آتے ہیں، چنانچہ نسوار ڈالنے سے پہلے وہ جگہ خود بخود خارش کرنے لگتی ہے ،ایک بے چینی سی محسوس ہوتی ہے اور نسوار ڈالنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے، جب وہ نسوار ڈالتا ہے تو وہ دانے پھٹ جاتے ہیں اور بے چینی ختم ہو جاتی ہے، ان دانوں کے ٹوٹنے کی صورت میں ان سے جو پانی نکلتا ہے وہ ناقض وضو بن سکتا ہے، اس لئے احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ نسوار ڈالنے کے بعد وضو کر لینا چاہیے۔ فرمایا کرتے تھے کہ مفتی کو اپنے ذاتی عمل میں احتیاط ملحوظ رکھنی چاہیے اور فتویٰ دیتے وقت عوام الناس کی سہولت کو مدنظر رکھنا چاہیے۔

ہمارے علاقے میں مشہور تھا کہ لوگ اعتکاف کے دوران ضروری باتوں سے بھی پرہیز کرتے اور اسے اعتکاف ٹوٹنے کا باعث سمجھتے ، ہمارے والد صاحب کے چچا حضرت کاکا کو ہم نے خود دیکھا تھا کہ وہ اعتکاف کے دوران بالکل باتیں نہیں کرتے تھے حتیٰ کہ پانی بھی مانگتے تو ہاتھ سے اشارہ فرماتے اور ہم ان کے لئے پانی وغیرہ لے کر آتے مگر جب استاذ صاحبؒ خود اعتکاف فرمانے لگے تو حضرتؒ نے بہت سی چیزوں کے بارے میں تنبیہ فرمائی کہ اعتکاف میں بالکل باتیں نہ کرنا یہ طریقہ شریعت میں نہیں، ہم نے خود اس کو اپنے لئے مشکل بنایا ہے۔ یہ صورت حال ہمارے علاقے میں کافی عام ہو چکی تھا مگر جب لوگوں نے حضرت استاذ صاحب کے طرز اعتکاف کو دیکھا تو یہ صورت حال کافی حد تک ٹھیک ہو گئی اور لوگ صرف غیر ضروری باتوں سے پرہیز کرنے لگے باقی ضروری باتیں خواہ وہ دینی ہوں یا دنیاوی بلا جھجک کرنے لگے۔

استاذ صاحبؒ مجھے بار بار کمپیوٹر سیکھنے کے متعلق فرماتے حالانکہ آپؒ کا ظاہراً کمپیوٹر وغیرہ سے بالکل مناسبت یا تعلق نہیں تھا۔ فرماتے بھتیجے! اگر آپ مستقبل میں دین کی صحیح خدمت کرنا چاہتے ہیں تو اس چیز (کمپیوٹر کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے) میں مہارت پیدا کریں، کیونکہ مستقبل میں اس چیز کا استعمال اور غلبہ زیادہ ہوگا، اس وقت میرے ذہن میں یہ بات نہیں آ رہی تھی اور اس چیز کا تصور بھی نہیں تھا مگر استاذ صاحب بار بار مجھے فرمایا کرتے کہ آنے والے دور میں اس چیز سے دین کی خدمت لی جائے گی، آپ اس میں مہارت حاصل کریں۔

درس و تدریس کے زمانے میں اکثر مجھے استاذ صاحب ایک نصیحت فرماتے کہ ہر وہ فقہی مسئلہ جو متقدمین میں مختلف فیہا اور مجتہد فیہا ہو یعنی متقدمین کے دور میں اس میں اختلاف پایا گیا ہو تو اس مسئلہ میں ایک جانب پر اتنے سخت نہ ہو جایا کرو کہ اس کو اعتقاد کی حد تک لے جاؤ یعنی کہ آپ اعتقاد اور یقین کے ساتھ یہ کہنے یا سمجھنے لگیں کہ یہ جانب صحیح اور یہ جانب خطا ہے۔ ہاں! دلائل اپنے سامنے رکھیں، اس کی رو سے جس جانب کو ترجیح دینا چاہتے ہوا اپنے عمل کیلئے اس کو ترجیح دے دو اور جانب آخر کے بطلان کے بارے میں یہ یقین نہ کیا کریں کہ یہ خالص باطل ہے، بلکہ ایک جانب کو ترجیح دینے کے ساتھ ساتھ دوسری جانب کیلئے یہ خیال ذہن میں ہو کہ ہوسکتا ہے کہ یہ بھی حق ہو۔

متقدمین اور متاخرین کی توضیح کرتے ہوئے فرماتے کہ تیسری صدی سے پہلے والے حضرات متقدمین جب کہ تیسری صدی کے بعد والے حضرات متاخرین میں شمار ہوتے ہیں۔

حضرتؒ مدرسہ کے اساتذۂ کرام کا بہت احترام فرمایا کرتے تھے، اس کے باوجود کہ سب ان کے شاگرد تھے مگر پھر بھی بڑے ادب اور احترام کے ساتھ پیش آتے، ان کی تمام ضروریات کا پورا پورا خیال رکھتے تھے، مجھے اکثر تنہائی میں فرماتے تھے کہ مدرسین کے ساتھ آپ کا چونکہ استاذ اور شاگرد کا رشتہ نہیں ہے یعنی ان میں سے ایک بھی آپ کا استاذ نہیں ہے لہٰذا آپ ان سے بخوبی آگاہ ہو سکتے ہیں کہ ان کے کیا کیا مشکلات اور پریشانیاں ہیں؟ ایسا نہ ہو کہ کسی مالی مشکل کی وجہ سے کوئی علم دین کی خدمت سے محروم ہو جائے، فرمایا کرتے تھے کہ اکثر میری خواہش یہ رہتی ہے کہ مدرسہ میں چند اللہ والے جمع ہو جائیں اگرچہ تعداد میں دو تین ہی کیوں نہ ہو، ان کا مقصود صرف اور صرف اللہ کی رضا ہو اور کچھ نہ ہو۔

مدرسہ سے متعلق جتنے بھی امور تھے، آپؒ مدرسین حضرات سے مشاورت کے بعد ہی سرانجام دیتے، اگر معمولی مسئلہ بھی ہوتا تب بھی آپؒ مجھے گھر بلا کر فرماتے کہ یہ مسئلہ پیش آیا ہے اس کیلئے کیا کرنا چاہئے؟ تھوڑی بہت اس پر بحث کرنے کے بعد حضرت فرماتے کہ فلاں وقت تمام مدرسین کو اجلاس کیلئے اطلاع دے دیں، پھر اجلاس میں ہر ایک سے مشورہ لینے کے بعد فیصلہ کرتے، بعض اوقات ویسے ہی مدرسین کو جمع کر کے ان کو وعظ ونصیحت فرماتے، اپنے فرض منصبی کا احساس اور اخلاص کی تلقین کرتے، جو اساتذہ اپنے ذمہ داری کا احساس نہ کرتے، درس میں دیر سے آتے یا بلا وجہ سبق کا ناغہ کرتے یا سبق میں فضول باتیں کرتے جس سے سبق کی کیت یا کیفیت کا نقصان ہوتا، ان تمام امور کو ادارہ کے ساتھ خیانت تصور کر کے سخت ناراض ہوتے تھے۔ ایک دفعہ جب میرے سمیت بعض مدرسین نے تدریس میں نو وارد اور ناتجربہ کار ہونے کے باعث کتابوں کو اختتام تک نہیں پہنچایا، تو حضرت نے سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا اور اس کے سدباب کیلئے مقام درس متعین کر کے کتاب کی سالم مقدار کو سال کے مہینوں پر تقسیم کروایا اور ہر تین ماہ کی مقدار متعین کرادی۔

استاذ صاحبؒ کی ایک ایک ادا بھلائے نہیں بھولتی، آپ کی شہادت ایک قومی وملی حادثہ ہے، تاہم شہادت کا حسین انعام آپ کی ذات کے لیے عظیم اعزاز ہے۔ اللہ رب العزت آپ کے فیوض وبرکات کو یونہی جاری وساری رکھے اور ہمیں آپ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

کچھ غمگین اور کچھ حسین یادیں

اُم مولانا عنایت اللہ

۱۱ جون ۲۰۰۹ء کا دن ہمارے لئے قیامت کا دن تھا، ہمارے پیارے اور عزیز بھائی مولانا محمد امین شہیدؒ کو ظالموں نے ہم سے چھین لیا، ہمارے بھائی نے تو زندگی بھر کسی کا برا نہیں چاہا تھا، نہ کسی کو کوئی تکلیف دی تھی، نہ کسی سے کوئی دشمنی تھی، وہ تو عمر بھر محبتیں بانٹتے رہے، دشمنیاں ختم کرتے رہے، سالوں کے ٹوٹے ہوئے خاندانوں کو جوڑتے رہے، نامعلوم آپ میں ظالموں کو ایسی کون سی خرابی نظر آئی کہ آپ پر گولہ و بارود کی بارش کر دی، وہ فرشتہ صفت اور معصوم انسان تھے، ہمیشہ قوم کے لئے خدمات سرانجام دیں، غریبوں اور بے سہارا لوگوں کی مدد کی اور قومی بدامنی کو ختم کرنے کے لئے دن رات ایک کیے۔

مجھے معلوم ہوا کہ میرے عزیز بھائی کی زندگی پر آپ کے جانثار تلامذہ کام کر رہے ہیں، تو حد سے زیادہ خوشی ہوئی ،اُس دن سے دُعا کا اہتمام کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی محنتوں کو قبول فرمائے اور ان کے لئے تمام مشکلات آسان فرمائے ،میرے لئے سعادت ہے کہ میں اپنے چھوٹے بھائی کی زندگی کے کچھ گوشے جو عموماً گھریلو زندگی کے متعلق ہیں قارئین کے سامنے پیش کرسکوں، ان شاء اللہ اس میں سیکھنے کے لئے بہت کچھ سبق موجود ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے بزرگوں کی زندگی اپنانے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین

بھائی صاحب میں بچپن ہی سے میں نے جو ایک اہم خوبی دیکھی تھی وہ وقت کی پابندی اور وقت کی قدر تھی ،آپ جب پانچ چھ سال کے تھے ،فجر کی اذان کے ساتھ ہی بیدار ہوکر گھر کے بڑوں کے ساتھ مسجد چلے جاتے ، مجھے یاد نہیں پڑتا کہ آپ کو نماز کے واسطے کبھی والدہ صاحبہ کو کہنے کی ضرورت پیش آئی ہو، اگر کسی دن اتفاق سے آنکھ نہ کھلتی تو اتنے سخت پریشان ہوتے کہ صبح کی چائے اس غم میں نہ پیتے ،تب والدہ صاحبہ آپ کو تسلی دیتی ،مناتی اور چائے پلانے کی کوشش کرتی۔اس طرح ہمارے بڑے بھائی سکول جانے کے لئے عموماً ٹال مٹول کرتے ، بہانے بناتے اور کوشش کرتے کہ کسی طرح چھٹی کرلیں ،لیکن آپ چائے پی کر فوراً تیاری مکمل کرتے اور انتظار میں بیٹھ جاتے کہ کب بھائی روانہ ہوں تا کہ سکول جائیں ،والدہ صاحبہ بڑے بھائیوں کی ڈانٹ ڈپٹ کر کے سکول کے لئے تیار کرتی لیکن آپ کو ڈانٹنا ہمیں یاد نہیں۔

جب آپ نے مدرسہ میں داخلہ لیا تو ششماہی امتحان کی چھٹیوں میں گھر آئے ،اُن دنوں ہماری والدہ صاحبہ کی طبیعت اتنی سخت خراب تھی کہ نزع کی حالت تھی ،گھر کے تمام لوگوں نے آپ سے اصرار کر کے کہا کہ چند دن اضافی چھٹیاں کرلیں ،والدہ کی بیماری کا کوئی بھروسہ نہیں ،لیکن آپ نہیں مانے اور کہا کہ میری چھٹیاں مکمل ہوگئیں ، اگر میں وقت پر حاضر نہ ہوا تو میرے اسباق ضائع ہوں گے اور اساتذہ بھی ناراض ہوں گے ،اس لئے میں نہیں رُک سکتا ، اوقات کی اتنی قدر اور علم کا اتنا شوق تھا کہ والدہ صاحبہ کو اسی حالت میں چھوڑ کر چلے گئے۔

والدہ صاحب اُس بیماری سے جانبر نہ ہوسکی ،تین ماہ بستر علالت پر تڑپتی رہی اور بالآخر اسی دن انتقال ہوگیا ، جس دن بھائی جان سالانہ امتحان کے بعد چھٹی پر گھر تشریف لائے۔وہ منظر یاد آگیا تو اُسے بھی بیان کرتی چلوں۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد ہماری والدہ محترمہ ہمیشہ اولاد کی محبت کے لئے ترستی رہی ،ہمیں تو والدہ کا قرب نصیب تھا لیکن تینوں بھائی ایک ایک کر کے آپ سے جدا ہوگئے ،بڑے بھائی صرف چودہ سال کی عمر میں محنت مزدوری کے لئے اورکزئی ایجنسی سے ہنگو آگئے ،چھوٹے دونوں بھائی سکول کے لئے ہنگو لے جائے گئے ،مہینوں بعد کہیں چند دن کے لئے اورکزئی ایجنسی والدہ کے پاس آجاتے ،ہمارے چچا مشفق انسان تھے ،لیکن بے چارے

عموماً سفر پر رہتے ، گھر کی واحد مالکن اور سیاہ وسفید پر بااختیار ہماری چچی تھی ، پتہ نہیں کیوں وہ ہمیں اپنے دسترخوان پر بوجھ سمجھتی وگرنہ ہمارے والدصاحب کی وسیع جائیداد کی کمائی اور بڑے بھائی کی مزدوری اس کے ہاتھ آتی تھی ، اُس کا سلوک ہماری والدہ اور ہم تین بہنوں کے ساتھ کسی سوتیلی ماں سے ہرگز کم نہ تھا ، والدہ صاحبہ انتہائی صابر خاتون تھیں ، نہ تو کبھی بھائیوں کو اس بارے میں کچھ کہا ، نہ چچا کے سامنے کبھی کوئی شکایت کی ، بلکہ ہمارے ننھیال میں بھی کبھی زبان سے ایک حرف نہیں نکالا ، بس بچوں کی خاطر سب کچھ برداشت کرتی رہی ، بالآخر ایسی بیماری لگ گئی کہ جوانی ہی میں جان کی بازی ہار گئی۔

بھائی محمد امین جب مدرسہ سے گھر پہنچے ، تو گھر میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی ، ہم تین بہنیں اور دو بھائی اپنے اس چھوٹے اور معصوم بھائی کی پریشانی اور غم دیکھ کر دوگنے غم میں مبتلا ہو گئے ، اس وقت آپ کی عمر تو تقریباً گیارہ سال تھی لیکن بدن کی کمزوری اور چھوٹے قد کے باعث سات آٹھ سال کے لگتے تھے ، بھائی نے جب گھر کا منظر دیکھا تو خاموشی سے مسجد میں جا کر تلاوت شروع کر دی ، قرآن پڑھتے جاتے اور آپ کے خاموش آنسو قرآن پر گرتے جاتے ، لوگوں نے بہت اصرار کیا کہ قبرستان چلے جائیں ، ابھی والدہ صاحبہ کو دفنایا نہیں گیا ، زیارت کر لیں ، لیکن آپ نہ مانے ، اس کے بعد ہمارے بڑے بھائی مسجد گئے اور انہیں ساتھ لے جانا چاہا لیکن اُنہوں نے یہ کہہ کر جانے سے انکار کر دیا کہ جن آنکھوں سے والدہ کو زندہ دیکھا تھا بس وہی کافی ہے ، اب میں جنازہ کی چار پائی پر دیکھنے کی سکت نہیں رکھتا۔ بڑے بھائی جان ناکام نکلے تو ہم سے برداشت نہ ہو سکا ، میں اور چھوٹی بہن مسجد میں داخل ہوئیں ، ہمیں دیکھ کر آپ نے اپنا سر چادر میں ڈھانپ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر روئے ، میں نے آپ کو ایک ہاتھ سے پکڑ کر اور چھوٹی بہن نے دوسرے ہاتھ سے پکڑ کر زبردستی چیخ چیخ کر کھینچنا شروع کر دیا اور روتے روتے مسجد کے دروازے تک لے آئیں ، اس اثنا میں ہماری پھوپھی آئی اور آپ کو گود میں اُٹھا کر لے گئیں ، گاؤں کے لوگ مسجد کے پاس جمع ہو کر ہم یتیموں کے واویلے کا یہ منظر دیکھ رہے تھے اور آپ کے قرآن پڑھنے اور آنسو بہانے پر پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔

والدہ کا سایہ سر سے اُٹھنے کے بعد بھائی تو مسافری میں تتر بتر ہو گئے اور ہم بہنیں مصائب وحوادث سہنے کے لئے رہ گئیں ، مہینوں بعد کبھی بھائیوں کے چہرے دیکھنا نصیب ہوتے ، بڑے بھائی کمانے لگ گئے ، ہمیں پالا پوسا ، شادیاں کروائیں ، گھر آباد کیے اور حیرت ہوئی کہ وہی چچی جس نے بچپن میں ہمیں ہر ظلم کا نشانہ بنایا ، میرے تینوں بھائی خصوصاً مولانا محمد امین صاحبؒ اُس کا سہارا بنے ، اُنہیں اپنے گھر لایا اور اُن کی خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

بھائی صاحب کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ جو آپ کے ساتھ بھلائی اور احسان کرتا آپ اُس سے دوگنا احسان کر کے چھوڑتے اور احسان کرنے والے کا ہر مجلس میں تذکرۂ خیر کرتے کہ فلاں نے میرے ساتھ یہ بھلائی کی ہے، فلاں نے یہ احسان کیا ہے۔ حالانکہ آپ اُس سے کہیں زیادہ احسان کر چکے ہوتے۔

بچپن سے بڑے ہی نرم دل اور شفیق تھے، کسی ذی روح کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے، ہم بچپن میں ساتھ کھیل رہے تھے، کہ "نمرگل" نامی ایک لڑکا بھاگ کر آیا کہ فلاں جگہ بلی نے چڑیا کے سارے بچے کھا لیے، ہم سارے وہاں دیکھنے بھاگے تو ایک بچہ باقی تھا، بلی کے منہ پر خون لگا ہوا تھا، آپ نے اُس بچے کو اُٹھایا، پیار کیا۔ پھر کہنے لگے: بہنو! ہمارے ماں باپ دونوں فوت ہو چکے ہیں، ہمارا چھوٹا بھائی بھی فوت ہو گیا ہے، ہم اُن کی موت پر کتنے سخت پریشان تھے اور اب ہمیں وہ کتنے یاد آتے ہیں، یہ چڑیا کا بچہ اپنے بھائیوں اور ماں باپ کے لئے کتنا پریشان ہوگا۔ آپ یہ باتیں کر رہے تھے کہ نمرگل نے بلی کے سر پر وار کیا اور اُسے مار ڈالا، بلی تڑپنے لگی تو آپ اور بھی سخت پریشان ہو گئے اور نمرگل کو برا بھلا کہا کہ تو نے کیوں یہ ظلم کر لیا، آپ بڑے عرصے تک بلی کا وہ تڑپنا یاد کرتے تھے کہ اگر خبیث یہ ظلم نہ کرتی تو کیوں ماری جاتی۔

بھائی صاحب کو بچپن سے ہماری دینی تربیت کا بھی بڑا خیال رہتا اور وقتاً فوقتاً ہمیں مسائل کی تعلیم دیتے، جب ہمارے بڑے بھائیوں کی شادیاں ہوئیں تو اُس وقت آپ طالب علم تھے، مدرسہ سے آئے تو دیکھا کہ بھابھیاں کمرے کی چھت پر نماز پڑھ رہی ہیں، ہمارے ہاں یہ غلط رسم مشہور تھی کہ خواتین گھر کی چھت پر نماز پڑھتی تھیں اور کہتی تھیں کہ گھر کے صحن میں کتے گزرتے ہیں، مرغیاں اور بلیاں بیٹ اور پیشاب کرتی ہیں اس لئے صحن مین نماز نہیں ہوتی۔ آپ نے دیکھا تو مجھ سے کہا: بہن! خاتون کے لئے چھت پر نماز پڑھنا بالکل مناسب نہیں بلکہ اُسے تو یہ حکم ہے کہ زیادہ پوشیدہ جگہ پر نماز پڑھے تاکہ کسی نامحرم کی نظر نہ پڑ سکے۔ چونکہ آپ پر حیا کا بہت زیادہ غلبہ تھا، اس لئے بھابھیوں سے براہ راست بات چیت یا اُنہیں سمجھانے میں عار محسوس کرتے تھے، اس لئے مجھے کہا کہ آپ اگلی نماز میں چھت پر چلی جائیں، میں آ کر آپ کو برا بھلا کہوں گا، ڈانٹوں گا اور ایک آدھ مصنوعی تھپڑ مار کر چھت سے نیچے اُتار دوں گا کہ آئندہ یہاں نماز پڑھتے دیکھا تو اچھا نہ ہوگا۔ اگلی نماز میں ہم نے اس ترکیب پر عمل کر لیا، اُس سے بھابھیوں پر بہت رعب پڑ گیا کہ یہ تو واقعتاً کوئی سخت غلط کام ہے، جس پر مولوی صاحب کو اتنا سخت غصہ آیا ہوا ہے۔ بعد میں میرے پاس آئے اور کہا: بہن! میں نے گو کہ مصنوعی طور پر آپ کو ڈانٹا لیکن آپ میری بڑی بہن ہے، میرے لئے صورۃً بھی یہ بے ادبی مناسب نہ تھی، لہٰذا مجھے دل سے معاف کرنا، حالانکہ یہ ترکیب تو میری مرضی سے اختیار کی گئی تھی، لیکن اُن کی عادت تھی کہ بڑوں کا بہت زیادہ ادب واحترام اور خیال رکھتے تھے۔

آج سے چند دہائیاں قبل ہمارے علاقوں میں بڑی غربت ہوا کرتی تھی، اب تو مال کی بڑی فراوانی ہے لیکن اُس غربت کے دور میں بھائی صاحب کے حالات عام غریبوں سے بھی زیادہ کسمپرسی کے ہوتے تھے۔ایک بار آپ کہیں سفر پر جارہے تھے، مجھ سے ملنے ہمارے گھر آئے تو دیکھا کہ آپ کی چپل انتہائی بوسیدہ اور پھٹی ہوئی ہے ۔میرے شوہر قطر میں تھے اُن کا ایک جوڑا چپل نہایت عمدہ اور خوبصورت پڑا ہوا تھا، میں نے وہ اُٹھا کر بھائی صاحب کو دے دیا، آپ نے شکریہ کے ساتھ قبول کر کے پہن لیا اور سفر پر تشریف لے گئے، اتفاق سے سفر میں ایک چپل کھوگئی اور ایک رہ گئی، واپسی پر میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا: بہن مجھے تو خیال نہ ہوا کہ آپ سے پوچھ لیتا ، یہ چپل تو آپ کے شوہر صاحب کی ہے، کیا آپ نے اُن سے پوچھا تھا، جو مجھے دی ہے؟ میں نے عرض کیا کہ جی میں نے شوہر کو بتلایا ہے، وہ بہت خوش ہوئے اور مجھے حکم دیا کہ'استاذ صاحب' کو جس چیز کی ضرورت ہو، میری طرف سے مکمل اجازت ہے، آپ بے دھڑک اُسے دے دیا کریں، بلکہ خود اُن کی ضرورت کا خیال رکھا کریں۔اس پر فرمایا کہ جب سفر میں چپل کھوگئی تو مجھے کھٹکا لگا کہ کہیں بلا اجازت نہ لی گئی ہو اور یہ مصیبت اس وجہ سے پیش نہ آئی ہو۔

اس کے بعد بھائی صاحب کی مجھ پر یہ عنایت رہی کہ کبھی کبھار مہمانوں کی خدمت کا موقع عنایت فرماتے، ہماری بھابھی کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے اُنہوں نے عمر بھر طلبہ کرام اور بھائی کے مہمانوں کی خوب خدمت کی ہے، تاہم اگر کوئی اہم مہمان ہوتے تو بھائی صاحب لسی مکھن میرے ہاں سے منگوا لیتے تھے، مجھے اس پر بڑی خوشی ہوتی۔

عموماً عید کے دن بھائی صاحب صبح تشریف لا کر فرماتے کہ بہن! آج مہمانوں کی کثرت ہوگی، لہٰذا مکھن اور تازہ چائی کی لسی بنانی ہے، میں جلدی سے چائی، مندھانو اُٹھاتی اور دہی بلونے بیٹھ جاتی۔بھائی صاحب کا بھی عجیب معمول دیکھا کہ اس طرح کی خدمت سے پہلے یا بعد میں مجھے اچھی خاصی رقم ہدیہ میں دیتے، کبھی صراحتاً یا اشارۃً تو نہیں فرمایا کہ یہ اس مکھن یا لسی کی قیمت ہے، لیکن اتنا عنایت فرماتے کہ آپ کے مہمانوں کے لئے جو کچھ بھیجتی تھی، اُس سے کہیں زیادہ ہوتا تھا۔

ایک دن مجھ سے پوچھا کہ بہن! کبھی کبھار آپ میرے مہمانوں کے لئے لسی مکھن بھیج دیتی ہیں یا میں منگوا لیتا ہوں، آپ نے اپنے شوہر سے اس کی اجازت تو لے رکھی ہے ناں! گوکہ شوہر نے مجھے حضرت کی خدمت کے لئے ہمہ قسم چیزیں خرچ کرنے کی مکمل اجازت دے رکھی تھی، لیکن میں نے ازراہِ مذاق کہہ دیا کہ بھائی! شوہر صاحب قطر میں بیٹھے ہیں، اُنہیں ان چیزوں سے کیا لینا دینا اور اُن سے اجازت کی کیا ضرورت ہے؟ اس پر آپ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا: بہن یہ کیا کہتی ہو؟ یہ ساری چیزیں تو اُن کی ملکیت ہیں، اُن کی اجازت کے بغیر کسی کو دینا آپ کے لئے جائز نہیں۔انہی دنوں میرے شوہر قطر سے واپس آئے تو بھائی صاحب نے کہیں اُن سے بھی تذکرہ کردیا کہ

آپ کے گھر سے کبھی کبھار کوئی چیز منگوا لیتا ہوں، آپ کے علم میں لانا ضروری تھا۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ استاذ جی ! عجیب بات کرتے ہیں، ہم سب آپ کے ہیں، ان چیزوں کی کیا قیمت؟ جو کچھ ضرورت ہو میں نے آپ کی بہن سے کہہ رکھا ہے کہ فی الفور استاذ صاحب کی خدمت میں بھیجا کریں۔ جب وہ گھر آئے تو مجھے ڈانٹنے لگے کہ آپ لوگوں نے کہیں استاذ صاحب کو ناراض تو نہیں کیا، وہ عجیب باتیں کرتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ اُنہوں نے مجھ سے بھی یہ کہا ہے کہ شوہر کی اجازت کے بغیر اُن کی چیزوں کا باہر خرچ کرنا جائز نہیں، لہٰذا اُن کی صریح اجازت ضروری ہے، اس پر وہ اور بھی حیران رہ گئے۔

بھائی صاحب احسان کا بدلہ ضرور چکاتے اور احسان کرنے والے سے عمر بھر احسان کرتے رہتے۔ ایک بار میں بیمار ہوئی، بھائی صاحب مجھے کوہاٹ شہر کے فوجی ہسپتال معائنہ کے لئے لے گئے، وہاں مجھے داخل کرا دیا گیا۔ آپ کے زمانہ طالب علمی کے خاص رفیق حافظ عبدالحمید کوہاٹی مرحوم فوج میں خطیب تھے اور وہیں کہیں مقیم تھے۔ آپ کی پوری کوشش تھی کہ اُنہیں پتہ نہ چلے ورنہ تکلیف اُٹھائیں گے لیکن نامعلوم کسی طرح حافظ مرحوم کو علم ہو گیا، وہ ہمارے پاس آنے کے بجائے اپنے گھر گئے اور وہاں سے اپنی اہلیہ کو لے کر سیدھا ہسپتال آئے، اہلیہ کو میری خدمت پر مامور کیا اور بھائی صاحب کو لے کر اپنے گھر چلے گئے۔ تین دن روزانہ ہمارے پاس آتے، کھانا لاتے اور علاج معالجے کے لئے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرتے، غرض ہر نوع کی خدمت کرتے رہے، اُن کی اہلیہ محترمہ بھی شب وروز میری خدمت میں لگی رہی۔ تین دن بعد ہمیں ہسپتال سے فارغ کیا گیا تو راستے میں بھائی صاحب فرمانے لگے: حافظ صاحب کے میرے اُوپر بہت احسانات ہیں لیکن اس بار تو ایسی خدمت کی ہے کہ میں ان کا غلام بن گیا ہوں۔ آپ جب بھی کوہاٹ جاتے، حافظ صاحب اور اُن کی اہلیہ کے لئے میرے نام سے تحفے تحائف، کپڑے، جوتے اور کھانے پینے کی چیزیں بھیجتے۔ مجھے اس کا علم نہ تھا، ایک بار حافظ صاحب اپنی اہلیہ کے ساتھ بھائی صاحب کے گھر تشریف لائے تھے، اُن کی اہلیہ اُن ہدایا اور تحائف پر میرا شکریہ ادا کرنے کے لئے ملاقات کی خواہش مند تھی۔ بھائی صاحب نے مجھے بلایا اور فرمایا: بہن! چونکہ انہوں نے آپ کی بڑی خدمت کی تھی، اس لئے میں ایک عرصہ تک آپ کی طرف سے ان کو مختلف چیزیں بھیجتا رہا ہوں، یہ آپ کا شکریہ ادا کریں گی، یہ نہ ہو کہ آپ اپنی لاعلمی ظاہر کر دو کہ میں نے تو آج تک کچھ نہیں بھیجا۔ مجھے اس پر بڑی سخت حیرت ہوئی اور اپنے اُوپر تعجب بھی کہ میں احسان کے بدلے نیکی کرنے میں کتنی سست ہوں۔ میں نے بھائی سے عرض کیا کہ آئندہ آپ جب بھی کوہاٹ جائیں، مجھے ضرور بتائیں گے، میں ان شاء اللہ اُن کی خدمت میں کچھ نہ کچھ بھیجوں گی۔ اس کے بعد الحمدللہ میرا معمول بن گیا اور حافظ صاحب کے گھر والوں کی طرف سے بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔

بھائی صاحب کو ہم بہنوں سے اتنی محبت تھی کہ ہماری ذرا سی پریشانی بھی آپ برداشت نہیں کر سکتے تھے، اگر میں کسی وجہ سے ملنے کے لئے حاضر نہ ہو پاتی تو خود ہمارے ہاں چلے آتے اور فرماتے کہ مجھے تو کتابوں سے رہائی نہیں ملتی یہ آپ کے پاؤں کس چیز نے باندھ رکھے ہیں کہ تشریف نہیں لاتیں؟ آپ کے نہ آنے سے دل پریشان رہتا ہے لہٰذا کم از کم آپ تو آجایا کریں کہ گھر قریب ہے۔ آپ کا معمول تھا کہ عید کے موقع پر میرے لئے اور بھانجیوں کے لئے 'عیدی' ضرور بھیجتے، بلکہ جب میری بچیوں کی شادیاں ہوگئیں اور میرا گھر بہوؤں سے آباد ہوگیا تو تب بھی ان سب کے لئے عیدی بھیجتے، میری بچیاں تو جب عید کے موقع پر آتیں تو انہیں ماموں کی عیدی کا انتظار ہوتا اور اس کے لئے بڑی خوش ہوتیں۔

ایک بار بھائی صاحب نے مجھے بطور عیدی چار ہزار روپے بھیجے، جن میں کچھ میرے لئے اور کچھ بچیوں اور بہو کے لئے تھے، میں نے وہ پیسے جیب میں رکھ لیے۔ ادھر میرے بیٹے نے اپنے والد یعنی میرے شوہر کے ایصال ثواب کے لئے دس ہزار روپے بھیجے تھے، میں وہ رقم لے کر بھائی صاحب کے پاس آئی تاکہ انہیں مستحقین تک پہنچانے کے لئے دے سکوں۔ بھائی صاحب مدرسہ میں تھے، ہم جب حاضر ہوتیں تو مدرسہ سے گھر میں چھوٹی سی کھڑکی کھلتی تھی، اسی کھڑکی کے پاس بھائی صاحب آکر ملاقات کر لیتے اور ضروری بات چیت ہوجاتی لیکن اس دن غالباً آپ کی کوئی سخت مصروفیت تھی، اس لئے ملاقات نہ ہو سکی اور میں واپس چلی گئی۔ اگلے دن میں کوہاٹ کسی مریض کے ساتھ ہسپتال چلی گئی، بدقسمتی سے وہاں وہ دس ہزار روپے مع بھائی صاحب کے عطا کردہ چار ہزار عیدی کے مجھ سے کھو گئے۔ گھر واپسی پر کچھ دیر بعد بھائی صاحب ملنے آگئے کہ بہن! کل آپ تشریف لائی تھیں اور میں مصروفیت کے باعث مل نہ سکا اس لئے حاضر ہوا ہوں۔ میں کوشش تو کر رہی تھی کہ چہرے سے پریشانی ظاہر نہ ہو، لیکن آپ انتہائی زیرک اور حساس انسان تھے، کسی طرح بھانپ گئے اور بار بار پوچھنے لگے کہ کوئی بیماری تو نہیں، آپ کا رنگ اترا ہوا ہے۔ میں نے ہر چند تسلی دی کہ میں بالکل ٹھیک ہوں، ایسی کوئی بات نہیں لیکن آپ کو اطمینان نہ ہوا۔ بعد میں بانجھوں کو بلا کر ان سے پوچھا کہ گھر میں کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا؟ والدہ کیوں پریشان ہے؟ آپ لوگوں نے ناراض تو نہیں کیا؟ انہوں نے کہا کہ ماموں جان! ایسی تو کوئی بات نہیں لیکن ان سے کل چودہ ہزار روپے کوہاٹ میں کھو گئے ہیں، شاید اس وجہ سے پریشان ہے۔ اس پر آپ نے انہیں سات ہزار روپے دیئے کہ بہن سے کہیں یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں، یہ مصائب تو آتے رہتے ہیں۔ اگلے دن خود تشریف لائے اور کہا کہ بہن آپ نے تو ہمیں پریشان کر دیا تھا، پیسے ایسی چیز نہیں جن کے لئے پریشان ہوا جائے اور پھر ہاتھ ملاتے ہوئے مجھے مزید پانچ ہزار روپے دے دیئے۔ میں نے عرض کیا: بھائی صاحب! اس میں آپ کے چار ہزار عیدی والے روپے تھے، بچیاں

اُن پیسوں کے لئے بڑی خوش ہوتی ہیں اور تبرک کے طور پر رکھتی ہیں، اُن کے لئے پریشان تھی۔ آپ نے فرمایا: ان کے لئے اور بھیج دیں گے بس آپ پریشان نہ ہوں۔ یوں عید آنے سے پہلے پہلے بھائی صاحب نے مجھے انیس ہزار روپے دے دیئے، حالانکہ مجھ سے صرف چودہ ہزار گم ہوئے تھے۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ اُنہیں اپنے رشتہ داروں کی کس قدر فکر رہتی تھی۔

ایک دفعہ میں عید کے موقع پر ملنے آئی تو کمرے میں مصلّی پر بیٹھے ذکر کر رہے تھے، سامنے سیبوں کا ایک کریٹ رکھا تھا۔ فرمایا: بہن! بچوں کے لئے سیب لے جائیں، خود نکال لیں، میں وظیفہ کر رہا ہوں۔ میں نے تکلف سے کام لیتے ہوئے تین چار سیب لیے تو خود اُٹھے اور لپ بھر بھر کر میری چادر میں ڈال دیئے۔ میں نے کہا کہ بھائی صاحب! آپ کے نواسے تو سارا دن تیرے یہاں کھیلتے رہتے ہیں اور یہی کھاتے ہیں، اتنا میں گھر لے جا کر کیا کروں گی؟ (بھائی صاحب کی ایک صاحبزادی میری بہو ہے، میرا اشارہ اُن کے بچوں کی طرف تھا) اس پر آپ خفا ہوئے کہ بہن! یہ کیسی بات کردی، میں نے یہ اپنے نواسوں کے لئے تھوڑا دیئے ہیں۔ یہ میں آپ کے پوتوں کے لئے دے رہا ہوں اور میرے نواسوں کے علاوہ بھی آپ کے گھر میں پوتے پوتیاں ہیں، اس پر مجھے احساس ہوا کہ میں نے غلط بات کہہ دی ہے۔

بھائی صاحب ہمیشہ گھریلو معاملات میں ایسی رہنمائی فرماتے کہ جس میں خیر ہی خیر ہوتی۔ ایک بار میری شادی شدہ بچی عید پر آئی، وہ ایک دن میرے ساتھ ماموں سے ملنے آئی، دوسرے دن پھر آئی، تیسرے دن جب میں اکیلے حاضر ہوئی تو بھائی صاحب نے پوچھ لیا، کہ وہ چلی گئی یا ادھر ہی ہے؟ میں نے عرض کیا کہ سسرال والوں نے ہفتہ گزارنے کا کہا ہے لیکن اُس کا ارادہ ہے کہ دس پندرہ دن گزار کر جائے گی۔ اس پر فرمایا کہ بہن! فوراً انہیں گھر بھیجو، وہاں بھی ضروریات ہوتی ہیں، کام کاج ہوتے ہیں، بچیوں کو بالکل زیادہ دن نہ روکو، اگر سسرال والے ہفتہ کا کہیں تو یہ تین دن سے ہرگز زیادہ نہ گزارے، اس طرح بچے بھی نہیں بگڑتے اور گھروں میں انتشار بھی پیدا نہیں ہوتا

-

بھائی صاحب نے زندگی بھر ہر حوالے سے ہماری فکر رکھی۔ بچپن ہی سے بھائیوں کی محبت اور شفقت ہمارا واحد سہارا تھا جو الحمد للہ آخر تک قائم رہا اور ان عنایتوں اور محبتوں نے ہمیں والدین کا سایہ اُٹھنے کے غم سے بڑی حد تک بچائے رکھا، خصوصاً برادر عزیز مولانا محمد امین شہیدؒ نے تو چھوٹا ہونے کے باوجود باپ سے بڑھ کر ساری بہنوں کی ضروریات کا خیال رکھا اور ان کی خبر گیری کی۔ آج پورا خاندان اُن کی یاد میں سوگوار ہے، اُن کی یادیں تازہ ہوگئیں تو آنسوؤں کی بارش آنکھوں سے شروع ہوگئی، ایک ایک بات یاد کر کے روتی ہوں اور رُک رُک کر یہ سب کچھ لکھوانے

کی کوشش کی ہے، یقیناً اس قدر مونس وغم خوار بھائی اس نفسانفسی کے دور میں ماؤں نے بہت کم جنے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمارے بھائی کے درجات بلند فرمائے اور اُن کے قاتلوں کو دُنیا کے اندر ذلیل ورسوا کرتا ہوا ہمیں دکھائے، آمین اللہم آمین۔

میرا غم خوار بھائی

ام امداد اللہ

کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا کہ ہمارے پیارے بھائی جان حضرت مولانا محمد امین صاحب ہمیں یوں ہی اکیلا چھوڑ کر چل دیں گے۔ زندگی کے مصائب وحوادث تو بڑی دور کی چیزیں ہیں، پاؤں میں کانٹا چبھتا تو تب بھی بھائی جان ہماری ''سی'' کی آواز پر بے چین ہو جاتے اور جب تک اطمینان وسکون میں نہ دیکھ لیتے انہیں قرار نہ آتا۔ ہم تو اُن کی محبتوں کے سہارے ایسے جیئے کہ اُن کی شہادت تک ساٹھ سالہ زندگی میں کبھی دُکھ درد کا احساس تک نہ ہوا۔

بھائی جان کا تذکرہ اور یاد سہنا اتنا آسان نہیں۔ آج جب اُن کو ہم سے جُدا ہوئے سات سال سے زائد عرصہ بیت چکا ہے، چند لمحے اُن کا ذکر مسلسل چلے تو محفل ماتم بن جاتی ہے۔ آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتی ہے اور زندگی کی ساری بے سکونیاں و بے چینیاں دامن میں ڈیرے ڈال دیتی ہیں۔ مجھے تو قطعاً سہار نہیں کہ حضرت کے احوال اور یاداشتوں کو تازہ کرسکوں، لیکن میرے پیارے اور عزیز بھتیجے مولوی محمد یوسف صاحب سلمہ اللہ کا پیہم اصرار تھا کہ پھوپھو جان! آپ نے حضرت کی کچھ یادیں ضرور لکھوانی ہیں، ذیل میں لکھی ہوئی یہ تحریر میں نے مولانا محمد یوسف صاحب کو مختلف مجالس میں وقفے وقفے سے نقل کروانے کی ہمت کی ہے، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

بھائی جان مجھ سے تقریباً چھ سال بڑے تھے۔ میں والد صاحبؒ کی شہادت کے تین ماہ بعد ۱۹۵۲ء میں پیدا ہوئی اور میری پیدائش کے پانچ سال بعد والدہ صاحبہ کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا تھا۔ میں نے جب شعوری زندگی میں قدم رکھا تو ماں باپ کے رشتے کا تصور اجنبی سا تھا، لیکن میرے بہن بھائیوں اور خصوصاً میرے عزیز از جان بھائی مولانا محمد امین صاحبؒ نے جس لاڈ، پیار اور محبت سے مجھے بچپن میں رکھا اور پھر ساری زندگی اُسے نبھایا، اُس سے مجھے کبھی اس بات کا احساس ہی نہیں ہوا کہ میرے ماں باپ موجود نہیں اور میں یتیم ہوں۔ لوگوں سے جب ماں باپ کے پیار کا منظر سنتی یا دیکھتی تھی، تو اُس سے کبھی احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہوئی کیونکہ مجھے تو اس سے بڑھ کر پیار و محبت اور اس سے بڑھ کر چاہتیں اپنے پیارے بھیا کے پاس نصیب تھیں۔

بچپن ہی سے بھائی جان کی عادتیں، طور طریقے اور انداز نرالے اور انوکھے تھے۔ آپ باقی بچوں سے بالکل مختلف تھے۔ آپ میں سنجیدگی بھی تھی، حیا بھی تھی، وقار بھی تھا، گالم گلوچ سے سخت نفرت تھی، بچپن ہی سے دوسروں کے کام آنے کا جذبہ بھی تھا۔ ان میں سے سارے پہلوان شاء اللہ گھر کے دیگر افراد نے بیان کردیئے ہوں گے۔ میں زیادہ تر بھائی کی مخلوق خدا پر شفقت کا جذبہ، غم خواری اور خیر خواہی کے بارے میں کچھ لکھواؤں گی۔

ہم بچپن میں اپنے گھر سے دو ڈھائی کلومیٹر دور کھیتوں میں ایک جگہ کھیلنے جایا کرتے تھے، ہم سب بہن بھائی اور چچازاد بہن بھائیوں کا ایک پورا گروپ تھا، ایک دفعہ کھیلتے کھیلتے ہمارے بڑے بھائی حاجی عین الدین صاحب نے غلیل سے ایک چڑیا شکار کرلی، دوسرے درخت پر گھونسلے میں اُس چڑیا کے چھوٹے چھوٹے بچے تھے، جو چوں چوں کا شور مچانے لگے۔ بھائی جان مولانا محمد امین صاحبؒ اس پر اتنے سخت پریشان ہوئے کہ میں بیان نہیں کرسکتی، پھر روزانہ صبح و شام آپ دو کلومیٹر دور پیدل اُن بچوں کے لئے روٹی کے ذرات اور دانے وغیرہ خوراک لے کر جاتے۔ کئی ہفتے یہ سلسلہ جاری رہا، یہاں تک وہ بچے ہمارے ساتھ مانوس ہوگئے، پھر اچانک آپ نے مدرسہ میں داخلہ کا فیصلہ فرمایا اور ہمارے چچا جی آپ کو دارالعلوم ٹل داخلہ کے لئے لے جانے لگے۔ جانے سے پہلے مجھے دو تین بار سخت

تاکید کی کہ روزانہ جب کھیلنے جاؤ گی تو اُن چڑیا کے بچوں کے لئے خوراک لے کر جانی ہے، یہاں تک کہ جب گھر کے دروازے سے نکل رہے تھے تو دوبارہ واپس مڑ کر آئے، مجھے پیار کیا اور کہا: بہن! چڑیا کے بچوں کو بھولو گی تو نہیں۔ میں اُس وقت بمشکل پانچ، چھ سال کی تھی لیکن آپ کی وہ ادا آج تک میرے ذہن میں نقش ہے۔ میں نے جواب دیا: بھائی جان! میں روزانہ اُن کے لئے خوراک لے کر جاؤں گی، آپ بے فکر رہیں، تب آپ کو اطمینان ہوا، الحمد للہ میں بھی پابندی سے یہ وعدہ نبھاتی رہی۔

ایک دفعہ میں اورکزئی ایجنسی اپنے گھر سے بھائی جان کے پاس 'شاہو وام' ملنے آئی تھی، دیکھا تو آپ غصے میں ہیں اور گھر والوں کی ڈانٹ ڈپٹ کر رہے ہیں، میں نے عرض کیا کہ بھائی جان! کیا ہوا؟ اتنے غصہ کیوں ہو؟ فرمایا: بہن! وہ سامنے برتن دیکھو، یہ میں نے پرندوں کے لیے یہاں گاڑھا ہے، اسے روزانہ بھرنے کا ان کو کہا ہے، پرندے عادی ہو چکے ہیں، یہاں پانی پیتے ہیں، یہ کوتاہی کر لیتے ہیں، آج برتن خالی ہے، پتہ نہیں پرندوں نے پانی پیا بھی ہوگا یا نہیں؟ پھر خود ہی وہ برتن پانی سے بھر دیا تھوڑی دیر بعد بہت سی چڑیا اور دیگر پرندے آ کر وہاں جمع ہو گئے اور پانی پینے لگے۔

کھانے کے دوران خصوصاً صبح ناشتے پر عادت تھی کہ روٹی کے چھوٹے چھوٹے ذرات بناتے اور پرندوں کے لئے چھت پر یا صحن میں ڈال دیتے، پرندے آپ کے ساتھ اتنے مانوس تھے کہ ارد گرد جمع ہو جاتے، میں اکثر کہتی کہ بھائی جان آپ خود تو کھاتے ہی نہیں، ساری روٹی انہیں کھلا دیتے ہیں، فرماتے کہ یہ عادت بن گئی ہے، اب چھوڑنا مشکل ہے۔

یہ تو پرندوں کے ساتھ آپ کی شفقت اور غم خواری کا معاملہ تھا۔ کیا ایسے انسان نے کبھی دوسرے انسانوں کی برائی چاہی ہوگی جو جانوروں پر اتنا مہربان ہو، ذیل میں انسانوں کے ساتھ اُن کی ہمدردی اور خیر خواہی پر کچھ کہوں گی۔

بچپن میں ہم گھر سے باہر گلی میں کھیل رہے تھے دوپہر کا وقت تھا کہ ایک سائل فقیر زور زور سے آوازیں لگاتا ہوا وہاں آیا۔ اُس کی آواز اتنی بھدی تھی کہ ہم سارے بچے ڈر گئے اور روتے چیختے گھروں کی طرف بھاگ گئے۔ بھائی جان نے جب میری چیخنے کی آواز سنی تو بھاگ کر گھر سے باہر آئے اور پوچھا کہ کیا ہوگیا؟ میں نے کہا کہ اس فقیر نے ہمیں ڈرا دیا ہے۔ بھائی جان نے غصے میں اُس فقیر کو ڈانٹ کے کچھ کلمات کہہ دیئے اور مجھے گھر کے اندر لے آئے۔ پھر دفعتاً بغیر چپل پہنے گھر سے باہر بھاگ نکلے، میں پیچھے نکلی، دیکھا کہ وہ اُسی فقیر کے پیچھے جا رہے ہیں۔ آپ نے فقیر کو ہاتھ سے پکڑا، بڑی لجاجت سے معافی مانگی اور اُسے واپس حجرے میں لا کر بٹھایا۔ پھر گھر جا کر اُس کے لئے

کھانے پینے کی چیزیں لائیں، کپڑوں کا ایک جوڑا دیا، پیسے دیئے، آخر میں پھر اُن سے معافی مانگی کہ مجھ سے غصے میں یہ باتیں منہ سے نکل گئیں، مجھے معاف کردو، پھر اُسے اعزاز سے رخصت کیا۔ میں چھوٹی بچی تھی وہ سارا منظر میرے ذہن میں تازہ ہے، میرے لئے یہ ساری باتیں عجیب تھیں۔ میں نے پوچھا: بھائی جان! اس فقیر کو آپ نے ڈانٹا، پھر دوبارہ بلا کر اتنا اکرام کیا، یہ کیوں؟ تو فرمایا: بہن! یہ غریب لوگ ہیں، ہمارے اُوپر لازم ہے کہ ان کی خبر گیری کریں، اس کے ساتھ میرے اس روّیے سے اس کا دل دکھا تھا، مجھے خوف ہوا کہ اگر اس نے بددعا دی تو میرے لئے بہت برا ہوگا اور اللہ تعالیٰ مجھ سے ناراض ہوگا، اس لئے میں نے جاکر اُسے منایا ہے، اس بات کا مجھ پر بچپن ہی سے ایسا اثر ہوا کہ نادار لوگوں سے محبت ہوگئی اور ان کی ضروریات کی ہروقت فکر رہنے لگی۔

ایک دفعہ میں بھائی جان سے ملنے آئی تو کافی پریشان تھے، آپ کا چہرہ اتنا خوبصورت تھا کہ اُس پر پریشانی یا غم کا اثر بالکل واضح محسوس ہوتا تھا۔ میں نے پریشانی کی وجہ پوچھی تو فرمایا: بہن! یہ بچے بڑے بے احتیاط ہیں، بعض اوقات بے احتیاطی میں نامناسب کام کردیتے ہیں۔ آج بھی انہوں نے گڑبڑ کردی ہے، ایک شیعہ مجھ سے ملنے آیا تھا، میں گھر میں تھا، انہوں نے محض اس وجہ سے کہ وہ شیعہ ہے اُسے واپس کردیا کہ اُستاذ صاحب! گھر میں نہیں ہے، پتہ نہیں اُس بے چارے کی کیا پریشانی تھی، کیوں ملنے آیا تھا اور ان کے روّیے سے کیا تاثر لے کر گیا ہوگا؟ پھر مجھے ایک نبی علیہ السلام کا واقعہ سنایا کہ اُن کے ہاں کچھ غیر مسلم مہمان آئے تھے، جب اُنہوں نے کھانا پیش کیا اور فرمایا کہ "بسم اللہ" کہہ کر کھاؤ، تو وہ رُک گئے اور کہا کہ ہم اللہ کے نام سے نہیں کھا سکتے۔ اس پر اُن نبی علیہ السلام نے اُنہیں دسترخوان سے اُٹھوادیا۔ تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عتاب ہوا کہ مجھے ساری عمر جھٹلاتے رہے ہیں اور میرا انکار کرتے رہے ہیں لیکن کبھی ایک لقمہ ان کا بند نہیں کیا اور آپ نے دسترخوان سے اُٹھوادیا، پھر فرمایا: کیا معلوم میرے ملنے سے اُس کو ہدایت ہوجاتی، شاید وہ کوئی علمی مسئلہ میں تشفی کے لئے ملنا چاہ رہا ہو۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ ہنگو جیسے ماحول میں اپنے مخالف کے لئے بھی آپ کی رواداری اور ہمدردی وخیرخواہی کے یہ جذبات تھے۔

ہمارے علاقہ میں مرد وخواتین کا تقریباً یہ معمول تھا کہ اپنی دینی وذُنیاوی پریشانیوں میں بھائی جان ہی سے مشورہ کرتے اور وہی سے اُنہیں روحانی سکون ملتا۔ سینکڑوں لوگوں کو میں جانتی ہوں جن کے مسائل اللہ تعالیٰ نے بھائی جان کی ہدایات وتدابیر سے حل فرمائے۔ مجھے آپ پر ترس بھی آتا کہ اتنی مصروفیات کے باوجود ایک عام سے عام آدمی کا مسئلہ بغور سنتے اور اُس کے ساتھ ہر ممکنہ مدد کرتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آپ اپنے گہرے تجربے سے آنے والے کے مسئلے کا اندازہ لگالیتے اور اس کے بتانے سے پہلے مسکرا کر فرماتے کہ آپ کو یہ مسئلہ تو درپیش نہیں، پھر اُس کا حل ارشاد فرماتے۔ ہمارے پڑوس میں ایک خاتون تھی، ایک دفعہ اُن کا خاندان سخت مالی ومعاشی آزمائشوں کا

شکار ہوا، بے چارے بڑے ہی پریشان تھے، وہ خاتون اُستاذ صاحب سے عرض حال کے لئے حاضر ہوئیں۔ میں بھی موجود تھی، اُس خاتون نے تفصیل سے اپنی مالی پریشانیاں بتلائیں۔ آپ نے فرمایا: مجھے یہ گمان تو نہیں کہ آپ لوگوں کی کمائی میں حرام کی آمیزش ہے لیکن دو باتیں بتلاتا ہوں، اس پر آپ ناراض نہیں ہونا، یا تو آپ لوگ نماز میں سستی کرتے ہیں، یا جانوروں پر ظلم کرتے ہیں۔ خاتون خاموش ہوگئی اور تردید میں کچھ نہ بولی۔ چونکہ ہم لوگ بھی جانور پالتے تھے اس لئے بھائی جان ہمیں بھی سختی سے تاکید کرتے کہ جانوروں کے حقوق کا بہت خیال رکھنا ہے۔

بھائی جان جانور کو تکلیف دینے پر پریشان ہوجاتے اور اسے عذاب الٰہی اور خدائی پکڑ کا باعث بتلاتے۔ ایک بار ہمارے علاقہ ''لاکہ'' اور کزئی ایجنسی میں سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ پہاڑی چشموں کا پانی کم ہوگیا تھا، جانور سخت تکلیف میں تھے۔ میں بھائی جان کے پاس حاضر ہوئی اور دعا کی درخواست کی کہ بارش کے لئے دعا فرمائیں۔ فرمایا کہ ان شاء اللہ آج بارش ہوگی اور اللہ پاک اپنا خاص رحم فرمائیں گے۔ یقین جانیے! اللہ تعالیٰ کا اُس دن ایسا کرم ہوا کہ زوردار بارش ہوئی اور گھنٹوں جاری رہی، ہر طرف نالے بہہ پڑے، زمین پانی پانی ہوگئی، تالاب بھر گئے، گرمی کا زور ٹوٹ گیا اور چشموں کا پانی بھی معمول پر آگیا، یہ حضرت کی کرامتی دُعا تھی جس کا میں نے اپنی زندگی میں خود مشاہدہ کیا ہے۔ وہ بارش تھی تو بہت زیادہ لیکن اُس میں آندھی اور گرج چمک بالکل نہیں تھی۔ آپ فرماتے تھے کہ جس بارش میں آندھی نہ ہو اور بجلی نہ گرتی ہو، اُس میں دُعا کیا کریں، یہ قبولیت دعا کی گھڑی ہے کیونکہ اس کو بارانِ رحمت کہتے ہیں۔ اس دن بارش سے آپ کی طبیعت میں بڑا ہی نشاط تھا، بہت خوش تھے اور بار بار دعا فرما رہے تھے۔

بھائی جان رزق کے ضیاع یا ناقدری پر سخت ناراض ہوتے تھے اور اسے بھی معاشی تنگی کا سبب بتلاتے تھے۔ ایک بار میں حاضر خدمت ہوئی تو بھائی جان کی طبیعت پر بوجھ سا محسوس کیا۔ میں نے عرض کیا: بھائی جان! خیریت ہے؟ طبیعت ناساز تو نہیں، آپ کچھ بوجھل سے دکھائی دے رہے ہیں۔ فرمایا: بہن! طلبہ کے حال پر افسوس ہوتا ہے، خدا کے بندے رزق کی ناقدری میں مبتلا ہوجاتے ہیں، ابھی ایک طالب علم پانی ضائع کر رہا تھا، اس کی ڈانٹ ڈپٹ کی ہے، تو طبیعت بوجھل ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان ہیں، کہیں ان کو ڈانٹنے سے عتاب نہ ہوجائے، اگر نہ ڈانٹیں تو تربیت کے تقاضے پورے نہیں ہوتے، اس لئے لازماً تنبیہ کرنی پڑتی ہے، لیکن طبعاً بوجھ آجاتا ہے۔ پھر فرمایا کہ بہن! ہم نے زمانہ طالبعلمی میں ان سہولیات کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا، مدرسہ کی طرف سے محدود طلبہ کو رہائش ملتی۔ ہم نے زندگی مسجدوں کے حجروں میں گزاری ہے۔ مسجد سے گرمی، سردی، بارش ہر حال میں استاذ کے درس میں پیدل پہنچنا لازمی اور ضروری ہوتا تھا۔ کھانے پینے کا انتظام خود کرنا پڑتا تھا۔ انہیں سب کچھ انتہائی

باعزت طریقے سے مدرسہ کی چار دیواری کے اندر میسر ہے، لیکن پھر بھی ایسی کوتاہی اور تساہل سے کام لیتے ہیں کہ حیرت ہونے لگتی ہے۔

پھر زمانہ طالب علمی کے احوال سناتے ہوئے فرمایا کہ مجھے بحمد اللہ بچپن سے کتاب اور مطالعہ سے لگاؤ تھا۔ ہم جب کوہاٹ میں پڑھتے تھے تو چشمہ مسجد کوہاٹ میں ایک حجرہ کے اندر رہائش ہوا کرتی تھی۔ طلبہ مغرب کے بعد ٹوکریاں، چھابے اور برتن لے کر محلوں سے سالن روٹی اکٹھا کیا کرتے تھے۔ یہ کام بے ریش اور چھوٹے طلبہ کے ذمے ہوتا تھا۔ میری بھی عمر کم تھی، اس لئے بڑے طلبہ نے میری بھی دیگر طلبہ کے ساتھ ذمہ داری لگائی ہوئی تھی لیکن میرے مطالعہ کا سخت حرج ہوتا تھا، اس لئے عموماً میں اُن طلبہ کے ساتھ پھیری میں شریک نہ ہوتا تھا۔ اس کی سزا یہ ملتی کہ اُس دن مجھے دسترخوان پر بیٹھنے نہ دیا جاتا۔ میں رات بارہ بجے تک پڑھنے میں مشغول رہتا۔ جب بھوک بہت زیادہ ستاتی، تو امام مسجد صاحب یا طلبہ سے بچے ہوئے ٹکڑے اُٹھاتا اور مسجد کے پاس والے چشمے میں بھگو کر کھالیتا، اُوپر سے دو تین لپ پانی لیتا۔ سالوں یہی غذا رہی، لیکن اب تو طلبہ معمولی معمولی باتوں پر شکایتیں شروع کر دیتے ہیں، اُوپر سے طبیعت میں قناعت کا فقدان، صبر کی کمی اور طمع جیسے رذائل پیدا ہو گئے ہیں۔

فرمایا کہ ہم تین طلبہ ساتھی فجر میں چائے کے لئے کچھ تھوڑے پیسے اکٹھے کیا کرتے تھے۔ میرے پاس ایک بار پیسے ختم ہو گئے، ساتھیوں سے کئی طرح کے بہانے کر کے جان چھڑائی اور ان پر ظاہر نہ ہونے دیا کہ میرے پاس پیسے ختم ہیں۔ چند دن بعد تکلیف بڑھ گئی اور پریشانی زیادہ ہو گئی کیونکہ ضروریات پورا کرنے کا بظاہر کوئی وسیلہ نہ تھا۔ میں نے اپنے ایک استاذ سے عرض کیا کہ حضرت ایک شخص کو مالی پریشانی ہے تو اُسے کیا پڑھنا چاہیے؟ استاذ صاحب نے فرمایا کہ ایسے شخص کو کہیں کہ فجر کے فرائض اور سنتوں کے درمیان اکتالیس بار سورہ فاتحہ پڑھ لیا کرے، ان شاء اللہ رزق کی تنگی ختم ہو جائے گی۔ بھائی جان فرماتے تھے کہ میں نے پہلے دن وہ وظیفہ پڑھا تو ظہر کی نماز کے بعد مسجد میں ایک چھوٹا بچہ داخل ہوا، اُس نے مجھے کہا کہ باہر ایک شخص کھڑا ہے وہ آپ کو بلا رہا ہے۔ میں باہر نکلا تو ایک اجنبی آدمی کھڑا تھا، اُس نے مجھ سے مصافحہ کیا اور ہاتھ میں رقم تھما دی۔ میں نے لینے میں تأمل کیا تو کہنے لگے: یہ تیری امانت تھی اور مجھ پر پہنچانا لازم تھی، لہٰذا اسے قبول کریں۔ اس پر میں نے وہ رقم رکھ لی، بعد میں دیکھا تو وہ ۷۵ روپے تھے۔ یہ ۱۹۶۵ء کی بات ہے، اُس وقت کے حساب سے یہ اچھی خاصی رقم تھی۔ فرماتے: اللہ تعالیٰ کے راستے میں فاقوں کے بعد یہ پہلی واضح نصرت خداوندی تھی جس کا اللہ تعالیٰ نے کھلی آنکھوں مشاہدہ کرایا۔ بھائی جان نے یتیمی میں ان مجاہدوں کے ساتھ تعلیم حاصل کی تھی، اس لئے تو اللہ تعالیٰ نے علم اور عمل کی انمول دولت سے نوازا تھا اور سارے لوگوں کے لئے شمع ہدایت تھے اور یہ باتیں تو ہم بچپن ہی سے بھائی جان میں دیکھتے تھے کہ ابھی اُن کی عمر

آٹھ دس سال ہی تھی کہ کھیلتے کھیلتے اذان کی آواز سنائی دیتی تو سب کچھ چھوڑ کر مسجد چل دیتے۔ ہم پہاڑوں پر جا کر بچپن میں جانور چراتے، جب نماز کا وقت ہوتا تو بھائی جان ضرور نماز ادا کرتے۔ بچپن ہی سے از خود نیکی اور بھلائی کی طرف رجحان تھا، یہاں تک کہ کبھی والدہ صاحب یا بڑے بھائیوں کو اس بات کی ضرورت نہیں پڑی کہ وہ آپ کو مسجد بھیجیں یا نماز اور سبق کا کہیں۔

بھائی جان رمضان کا کچھ حصہ ہمارے ہاں ''لاکہ'' میں گزارتے، وہ اس طرح کہ جب آپ آغاز میں کراچی سے واپس تشریف لائے، تو علاقہ میں حفاظ کی قلت تھی، اس لئے آپ تراویح میں پہلا ختم قرآن اپنے شاگرد حفاظ سے مدرسہ یوسفیہ شاہو وام میں سنتے، پھر ان کو لے کر دوسرا ختم قرآن ''شکر تنگی'' اورکزئی ایجنسی میں کرتے، پھر تیسرا ختم ہمارے ہاں ''لاکہ'' میں سناتے، چوتھے کے لئے اپنے آبائی وطن ''سرہ ناکہ'' چلے جاتے۔ یہ پانچ چھ دن کے ختم ہوا کرتے تھے۔ میری خواہش ہوتی کہ ہمارے ہاں کا موسم ہنگو کی نسبت اچھا ہوتا تھا، لہٰذا بھائی جان رمضان کا کچھ زیادہ حصہ ہمارے ہاں گزار لیا کریں اور رکنے پر اصرار بھی کرتی لیکن فرماتے: بہن! ہمارے علاقوں کے بڑے بوڑھے بے چارے دور کی مسجدوں میں جا نہیں سکتے، اس لئے 'ختم قرآن' کی برکت سے محروم رہ جاتے ہیں، میری کوشش ہوتی ہے کہ قریبی علاقوں میں زیادہ سے زیادہ مسجدوں میں ختم قرآن ہوں، اس لئے میں ایک مسجد میں رُک کر رمضان نہیں گزار سکتا، پھر چند ہی سالوں میں اللہ تعالیٰ نے ایسی برکت فرمائی کہ ہمارے علاقوں میں کئی حفاظ ہو گئے اور ہر مسجد میں تراویح کے اندر بہار لگ جاتی، اس میں جامعہ یوسفیہ کا بڑا اہم کردار رہا ہے۔

بھائی جان کا معمول تھا کہ اگر میں مہینے میں حاضر نہ ہوتی تو بلاوا بھیجتے یا خود مختصر وقت کے لئے تشریف لاتے۔ میں روکنا چاہتی تو نہ رُکتے، فرماتے کہ بس آپ کی طویل غیر حاضری سے پریشانی لاحق تھی، اس لئے خیر خبر لینے حاضر ہوا ہوں۔ اسی وجہ سے میں سخت مجبوری نہ ہوتی تو مہینے میں ایک بار ضرور' وام' حاضری دیتی، تاکہ بھائی جان کو پریشانی نہ اُٹھانی پڑے، جب آپ تشریف لاتے تو مجھے وہ جگہیں بتاتے، جہاں ہم بچپن میں جانور چرایا کرتے تھے، یا مل کر کھیلا کرتے تھے۔ فرماتے: آپ چھوٹی تھیں اس لئے آپ کی ذمہ داریاں بھی ہم نبھاتے، جنگل سے لکڑیاں اکٹھی کرنا اور چشموں سے پانی لانا ہمارے ذمے ہوتا تھا۔

بھائی جان نے اپنے تمام تر علمی وسماجی مصروفیات کے ایک بھرپور گھریلو زندگی گزاری اور ہمیں پورا پورا وقت دیا۔ زندگی بھر محبتیں ہی محبتیں تقسیم کیں، اگر کوئی زیادتی خاندان والوں کی طرف سے ہو بھی جاتی تو کبھی اسے دل پر نہیں لیا، نہ کسی سے شکوہ شکایت کی، اپنی فقیری میں ساری بہنوں بلکہ اُن کے بچوں تک کا بھرپور خیال رکھا، کبھی اسے نہ دیکھا کہ مالی حیثیت اچھی نہیں ہے، باوجود غربت کے بہنوں کو ایسے عطا کرتے کہ اُنہیں کبھی والد صاحب کی کمی

کا احساس نہ ہوا۔

شہادت سے چار دن قبل مجھے بلایا اور کہا: بہن! بچپن سے آپ کے ساتھ بڑے راز شریک ہیں۔ آج ایک راز اور بتلاتا ہوں کہ میں تم لوگوں سے پہلے ہی دُنیا سے کوچ کر جاؤں گا۔ یہ بات میرے لئے غم کے پہاڑ ٹوٹنے سے کم نہ تھی، میں حیران و سرگرداں بھائی جان کا منہ تک رہی تھی کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں لیکن آپ کہتے چلے گئے اور بہت کچھ کہہ دیا۔ محبتوں اور شفقتوں کے بانٹنے کی آخری محفل تھی۔ وصیتیں، ہدایات، نصائح، معافی تلافی سب کچھ سے گزر گئے، کچھ کہنے کو باقی نہ چھوڑا۔

وہ ساری باتیں کر دیں جن کو جانے والوں کے پیچھے لوگ ارمان کر کے یاد کرتے اور رویا کرتے ہیں، پھر ایک خواب سنایا کہ بہن! میں نے دیکھا کہ گھر کی پچھلی گلی میں گھپ اندھیرا ہے۔ اچانک کچھ جہاز آئے، انہوں نے بمباری کی، مجھے ظاہری نقصان کا تو ادراک نہ ہوا، لیکن بارود کی تلخی میرے گلے میں اٹک گئی۔

پھر آخر میں چند رشتہ داروں کے نام لے کر کہا کہ میرے بعد شاید میری اولاد پر سخت حالات آئیں، ان سے کہنا کہ میری اولاد کو تنہا نہ چھوڑیں۔ یہ سب باتیں میرے لئے غمناک و المناک تو تھیں ہی، عجیب بھی تھیں لیکن یہ تو بھائی جان کا راز تھا، میں اُن کی زندگی میں اسے افشا بھی تو نہیں کر سکتی تھی کہ کسی کے سامنے بیان کر کے دل کا بوجھ ہلکا کر دوں اور پھر صرف چار دن بعد سب کچھ حقیقت کا روپ دھار گیا۔ میں اُس جلسے پر پہنچی تو دل پکڑ کر رہ گئی، سارا وہی منظر تھا جو بھائی جان بیان کر چلے تھے۔

ایک عہد ختم ہوا، ایک باب خاموش ہوا۔ ایسا عہد جس نے اپنے اندر علم و عمل کی تابندہ روایت بند کر دی اور ایسا باب جو اپنے اندر کئی نایاب، پوشیدہ گوہر ساتھ لے گیا۔ شہادت کے بعد تین دن مسلسل بھائی جان کے گھر میں ایک درخت سے نہایت ملائم اور بہت خوبصورت آواز صبح تہجد کے وقت سے لے کر نماز فجر تک سنائی دیتی۔ ہم نے معلوم کرنے کی کافی کوشش کی لیکن معلوم نہ کر سکے، اس آواز کی کیفیت بیان کرنے کے لئے میرے پاس تعبیر نہیں۔ زمانہ مدتوں بھائی جان کو روئے گا، یقین جانیں کہ ایسے لوگوں کی قدر اُن کے چلے جانے کے بعد آتی ہے۔ ہمیں بھائی جان کی زندگی تک اس کا پورا احساس نہ تھا کہ یہ پیار و محبت، رأفت، خبر گیری کیا ہوتی ہیں، آج ان کی گہری فہم والی باتیں ایک ایک کر کے یاد آتی ہیں اور ستاتی ہیں، لیکن ہم اللہ تعالیٰ کے قضا و قدر پر راضی ہیں اور اس پر مطمئن ہیں کہ ہمارے بھائی جان نے شہادت کی موت پائی ہے، جس طرح وہ دُنیا میں ہمیں اپنی محبتوں کے سائے میں رکھ کر محفوظ کرتے رہے، ان شاء اللہ قیامت کی سختیوں میں بھی ہمارے پرسانِ حال بنیں گے اور اللہ تعالیٰ سے اپنے دامن میں جگہ عنایت کرنے کی شفاعت و سفارش کریں گے۔ ان شاء اللہ العزیز۔

ابا جی کی یادیں

حافظ ظہیر الدین

والد گرامی حضرت اقدس مولانا محمد امین شہید محبتوں کے سائبان تھے۔ اس سائبان شفقت تلے صرف ہم بہن بھائی ہی نہیں آپ کے سارے بھتیجے، بھتیجیاں اور بھانجے، بھانجیاں تک عنایات وتوجہات کی دولت سے مالا مال

ہوتے رہے۔ حضرت اقدس کی زندگی اتنی متنوع اور کثیر الجہات تھی کہ اس کا احاطہ ہمارے بس سے باہر ہے، آپ کا ایک واقعی کمال یہ تھا کہ آپ نے اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے مختلف قسم کے لوگوں کو مستفید فرمایا اور ہر جہت سے علیحدہ علیحدہ حضرات کو روشناس کرایا۔ آپ کے علم وتفقہ کی درست پہچان کرنے والے آپ کے خاص خاص تلامذہ ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ ان حضرات کے علاوہ کسی اور پر آپ کی علمی شان اس انداز سے نہ کھل سکی جس طرح ان پر کھلی۔ پھر آپ کی زندگی کا روحانی اور سلوک واحسان کا پہلو ایسا ہے کہ اس کو حقیقی انداز سے بیان کرنے والے اور اس سے کسی قدر مستفید ہونے والے چند ہی لوگ ہیں۔ اسی طرح آپ کی زندگی کے سیاسی وسماجی پہلو کی معلومات آپ کے قریب ترین تلامذہ کو بھی نہیں، اس میدان میں آپ کے رفقا بالکل جدا نوعیت کے لوگ ہیں اور وہ جب آپ کے کارنامے گنواتے ہیں تو قریبی تلامذہ اور سال ہا سال تک مدرسہ میں ساتھ تدریس کرنے والے اساتذہ حیران رہ جاتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ والد گرامی ہر مزاج اور سطح کے انسان سے اسی نوعیت کا تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے تلامذہ آپ کی علمیت سے تو واقف تھے لیکن سیاسی کردار سے سرسری ہی واقفیت رکھتے تھے۔ اسی طرح سیاسی معاملات کے احباب کو پوری زندگی میں یہ بھی پتہ نہ چل سکا کہ آپ طحاوی کے شارح ہیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ والد گرامی ہر مجلس میں بے جا تذکرے اور اپنی کہانیاں سنانے کے بالکل عادی نہ تھے۔ جس طرح کی مجلس ہوتی اس طرز کی گفتگو ہوتی۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ آپ پر اخفا کا غلبہ بہت زیادہ تھا اور اکثر ایسے کام جس میں شہرت یا نام ونمود کا شائبہ تک ہوتا اس انداز سے کرتے کہ کسی کو پتہ تک نہ چلتا۔ مجھے خود آپ کی زندگی کے ستر فیصد کاموں اور کارناموں کا پتہ بھائی جان مولانا محمد یوسف صاحب مدظلہ یا آپ کے تلامذہ سے چلا۔

میں بچپن سے ذرا آپ کے مزاج کے خلاف غیر سنجیدہ اور شرارتی سا تھا۔ اس لئے کئی دفعہ سخت پٹائی اور مار بھی پڑی۔ پھر حفظ کے بعد شومئ قسمت کہ مجھے درس نظامی پڑھنے کی سعادت نہ مل سکی۔ اس پر بھی حضرت والد صاحب کو طبعاً تکلیف تھی گو کہ کبھی اظہار نہیں فرمایا، نہ ہی محبت وشفقت میں کمی آنے دی اور نہ ہی مجھے اپنی صحبت سے دور ہونے دیا۔ بلکہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ظہیر الدین! آپ علم حاصل نہ کر سکے لیکن یاد رکھیں کہ اہل اللہ کی صحبت میں کبھی کمی کوتاہی نہ کرنا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اس سے علم دین کی کمی کی بڑی حد تک تلافی ہو جائے گی۔ حضرت والد صاحب کی برکت سے کئی حضرات اولیائے کرام کی زیارتیں اور صحبتیں میسر آئیں۔ ایک بار بندہ آپ کے ساتھ صندل باباجی کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ نے باباجیؒ سے شکایت کی کہ یہ پڑھتا نہیں۔ دعا فرمائیں کہ یہ کچھ پڑھ لے۔ اس پر باباجیؒ نے فارسی میں چند اشعار پڑھے جن کا مفہوم یہ تھا کہ آپ اسے تنگ نہ کریں اور پڑھنے میں زبردستی نہ کریں اسے یونہی رہنے دیں اللہ تعالیٰ اسے بہت کچھ دے گا۔ اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کے حسن ظن کو حقیقت بنا دے۔ آمین

حضرت کو اللہ تعالیٰ نے جن کمالات سے نوازا تھا ان کا ذکر تو آپ کے اجل تلامذہ اور متعلقین کے مضامین میں بڑی حد تک آ گیا ہے۔ اس لئے آپ کے تقوی واخلاص، مہمان نوازی وتواضع وغیرہ جو روزمرہ کی چیزیں تھیں تو میں نہیں دہراؤں گا، نہ ہی ان سے متعلقہ واقعات درج کرنے کی حاجت ہے کہ کثیر تعداد ان واقعات کی بھائی جان اور والدہ محترمہ کے مضامین میں آ چکی ہے۔ تاہم میں بالکل عام قسم کے چند واقعات جو میرے لئے اہمیت کے حامل ہیں اور مجھے انہوں نے بہت فائدہ دیا ہے بیان کر دیتا ہوں، امید ہے قارئین کے لئے بھی سبق آموز ہوں گے۔

آپ کو اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات پر شفقت کا ایک خاص جذبہ ودیعت فرمایا تھا۔ انسان تو بڑی دور کی بات ہے ایک جانور کو بھی تکلیف میں دیکھنا گوارا نہیں کر سکتے تھے اور اس کی تکلیف پر سخت پریشان اور بے چین ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ ہمارے گھر کے پاس کہیں سے ایک ''کتیا'' آ کر رہنے لگی اور اکثر گھر میں بھی داخل ہوتی۔ ہم اسے بھگاتے لیکن وہ پھر آ جاتی، پھر اس نے بچے جن لیے۔ ایک بار بھائی جان مولانا محمد یوسف صاحب اسے کہیں دور چھوڑ کر آ گئے لیکن وہ اگلے دن پھر واپس آ گئی۔ والد صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ ظہیر الدین! اسے تنگ نہ کریں، اس کے بچے یہاں پر ہیں، وہ جہاں بھی جائے گی واپس آئے گی۔ لہٰذا ہم نے اسے اپنے حال پر رہنے دیا۔ ایک دن اچانک وہ مر گئی، میں مدرسہ کی گلی سے گزر رہا تھا کہ حضرت والد صاحب نے مجھے آواز دی، پھر فرمایا: بیٹا! ابھی ابھی میں نے کتاب میں ایک عالم دین کے حالات پڑھے ہیں کہ ان کے گھر میں اگر چوہا، بلی وغیرہ کچھ مر جاتا تو اسے باہر نہیں پھینکتے تھے۔ سنا ہے کہ وہ ''کتیا'' مر گئی ہے، آپ لوگ بھی اسے باہر پھینکنے کے لئے نہ لے کر جائیں بلکہ گھر میں ایک طرف دفن کر دیں۔ میں اور میرے چچازاد بھائی مولانا ضیاء الدین نے کدال اور بیلچہ اٹھایا اور اس کے لئے ایک گہرا گڑھا کھود کر اسے دفن کر دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ایک عجیب کیفیت پیدا ہوئی اور یہ احساس ہونے لگا کہ دل میں موجود رذائل کو بھی اگر دور نہ کیا جائے اور ایسے ہی چھوڑ دیا جائے تو کس قدر بدبودار ہوں گے کہ سارے بدن کو مکدر کر دیں گے، لہٰذا انہیں بھی دل کی کھائیوں میں دفن کر دینا چاہیے اور تکبر کی ایک لہر دل سے نکلتی ہوئی محسوس ہوئی کیونکہ ''کتیا'' کو دفن کرنا تو نفس پر شاق تھا ہی، پھر گھر کے اندر یہ کام کرنا بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ تاہم حضرت والد صاحب کے حکم کے سامنے اپنی کہنے کی تو قطعاً جرأت نہ تھی۔ لیکن اس کا جو روحانی اثر ہوا، مجھے وہ اپنے رذائل کا معالجہ محسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ حضرت والد صاحب پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے کہ ہر لحاظ سے ہماری تربیت کا اہتمام کرتے رہے گو کہ ہم اپنی نااہلیوں کے باعث اس سے کما حقہ فائدہ نہ اٹھا سکے۔

ایک بار ہماری بکری نے بہت خوبصورت سا بچہ جنا۔ اس کی شکل اتنی خوبصورت اور عادات ایسی مانوسیت والی تھیں کہ گھر میں سب ہی اس کا خیال رکھتے۔ حضرت والد صاحب کو اس میمنے کی بڑی فکر رہتی، جب مدرسہ سے

تشریف لاتے تو اپنے ہاتھوں سے روٹی توڑ توڑ کر اسے کھلاتے،کبھی بسکٹ دیتے تو کبھی جلیبیاں کھلاتے۔ وہ میمنہ بھی آپ سے اتنا مانوس تھا کہ یہ ساری چیزیں کھاتا اور آپ کے پیچھے چلتا رہتا،کبھی ساتھ مدرسہ چلا جاتا۔ والد صاحب نے خاص تاکید کر رکھی تھی کہ اسے باندھنا نہیں،یہ کھلا گھومتا پھرتا رہے۔ پھر ایک دن کہیں والدہ صاحبہ نے اسے باندھ لیا،قدرت کی شان دیکھیں کہ اسی دن اس کے پچھلے پاؤں کو کچھ بیماری لگ گئی اور وہ شل ہوگئیں۔ حضرت والد صاحبؒ سخت پریشان ہوئے،مجھے اس کی خصوصی دیکھ بھال کی تاکید کی۔ والدہ صاحبہ سے کہتے کہ میں تجھے نہ کہتا تھا کہ اسے نہیں باندھنا۔ یہ باندھنے کی وجہ سے ایسا ہوگیا۔غرض ہر وقت اسی میمنے کی فکر رہتی۔ جب آپ تہجد کے لئے بیدار ہوتے تو سب سے پہلے بکریوں کی کوٹھڑی میں جا کر اسے دم کرتے،پھر نماز پڑھتے۔ اسی طرح جب فجر کی نماز سے گھر واپس آتے تو سیدھا اس کے پاس جاتے اور اسے دم کرتے۔ مجھے ہنگو شہر جانوروں کے ہسپتال بھیج کر اس بیماری کی تفصیلات معلوم کروائیں۔ پھر ڈاکٹر کے پاس معائنہ کرانے بھیجا،ڈاکٹر نے کچھ انجکشن تجویز کیے،والد صاحب کی تاکید پر میں روزانہ اسے انجکشن لگوانے ہنگو شہر لے کر جاتا۔ مجھے حیرت تھی کہ آخر والد صاحب کو تمام تر علمی وسماجی مصروفیات میں آخر یہ میمنا بھولتا کیوں نہیں؟ بلکہ ہر وقت اس کی فکر سوار کیے رکھتے ہیں۔ اس کا ادراک کہاں تھا کہ اللہ والے ان بے زبانوں کی تکلیف پر انسانوں کی تکلیف کی طرح تڑپتے ہیں۔ اور ان کے حقوق کی عنداللہ جواب دہی کا خوف انہیں ہر وقت دامن گیر رہتا ہے۔قدرت کا فیصلہ تھا کہ وہ بچہ مرگیا۔ رات کو کھانے پر میں والد صاحب کے ساتھ بیٹھا تو پتہ نہیں کس وجہ سے میں نے دو تین لقمے لے کر ہاتھ کھینچ لیا،اس پر والد صاحبؒ نے فرمایا کہ کیوں؟ میمنے کی موت پر پریشان ہو؟ اس کی وجہ سے تو مجھے اتنی پریشانی ہے کہ دل پھٹتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا حکم ہی ایسا تھا۔ مجھے ایک دفعہ پھر حیرت ہوئی کہ میرے کھانا نہ کھانے کو بھی حضرت نے میمنے کی موت سے جوڑ دیا، گویا آپ کی نظر میں وہ اس قدر بڑی پریشانی تھی جب کہ ہماری طبیعتوں پر اس کا کوئی خاص اثر نہ تھا۔ یہ اس باطنی فرق کا واضح نتیجہ تھا جو اہل اللہ اور عام لوگوں کے قلوب میں پایا جاتا ہے اور انہیں مخلوق خدا سے جس قدر ہمدردی ہوتی ہے وہ عام لوگوں کی سطح سے بہت اونچی ہوتی ہے۔

ہمارے گھر میں والد صاحب کے ساتھ ایک بلا بڑا مانوس ہوگیا تھا،والد صاحب جہاں جاتے وہ بھی ساتھ جاتا۔ یہاں تک کہ مدرسے میں بھی ساتھ گھومتا پھرتا۔ اس کی ایسی عجیب عادات تھیں کہ کچھ کھلاتے تو خاموشی سے کھا لیتا، ورنہ خاموش ساتھ بیٹھا رہتا۔ ہم بچپن سے دیکھتے آئے تھے کہ وہ سردی میں انگیٹھی کے پاس والد صاحب کے قریب سہما بیٹھا رہتا۔ ہماری والدہ محترمہ دودھ گرم کرتی،دودھ کا دیگچہ ساری رات انگیٹھی کے کنارے پڑا رہتا،لیکن پوری رات کمرے میں رہنے کے باوجود وہ اسے منہ نہ لگاتا،گوشت کمرے میں بالکل کھلا رکھا ہوتا لیکن اس نے از خود کبھی

اس میں منہ نہیں ڈالا حتی کہ کبھی کبھار والد صاحب اسے روٹی کا ٹکڑا دیتے تو مرغا آکر اس سے چھین کر لے جاتا اور وہ والد صاحب کی طرف معصومیت سے دیکھتا رہ جاتا۔ اس موقع پر حضرت اسے ڈانٹتے کہ خبیث! کبھی بلوں سے بھی مرغوں نے روٹی چھینی ہے؟ ہمارے ایک پھوپھی زاد بھائی والد صاحب سے کہتے کہ آپ نے اسے صوفی جو بنایا ہے اس لئے یہ ایسا رہتا ہے۔ الغرض والد صاحب کا اس سے انس اور اس کا والد صاحب سے انس عجیب تھا۔ والد گرامی کی شہادت کے بعد اس بلے پر عجیب سی کیفیت طاری تھی، وہ ادھر اُدھر سرگرداں گھومتا پھرتا، جیسے اسے والد صاحب کی تلاش ہو۔ کبھی معصومیت سے آنکھیں اِدھر اُدھر دوڑاتا اور اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگتی۔ والد صاحب کی شہادت کے بعد اسی کیفیت میں اس نے صرف پندرہ دن گزارے، پھر وہ بھی مر گیا جیسے یہ صدمہ برداشت نہ کر سکا ہو۔ اس پر والد صاحب کی توجہ دیکھ کر ہمیں اندازہ ہوتا کہ اللہ والے تمام مخلوقات کے لئے کیسے رحم کے جذبات رکھتے ہیں۔

حضرت والد صاحبؒ اس کا بڑا خیال رکھتے تھے کہ ان کی وجہ سے کسی کو ادنی تکلیف بھی نہ ہو، ایک زمانے میں بندہ والد صاحب کو تہجد میں پارہ سنایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ تبلیغی جماعت آئی ہوئی تھی اور مسجد کے ہال میں وہ آرام فرما رہے تھے۔ بندہ حسب معمول مسجد آیا تو والد صاحب نے فرمایا: بیٹا! آج پارہ نہیں سنانا، یہ مہمان آرام کر رہے ہیں کہیں ان کے آرام میں خلل نہ آجائے۔ حالانکہ میں دھیمے آواز سے پڑھتا تھا، لیکن آپ حقوق العباد کے حوالے سے اتنے محتاط تھے کہ کہیں تکلیف دہی کا شائبہ بھی ہوتا تو اس سے احتراز فرماتے۔

پارہ سنانے پر یاد آیا کہ والد صاحب کو میری منزل کی فکر رہتی، اس لئے خود اہتمام سے میرا پارہ سنتے۔ ایک بار تراویح میں میرا پارہ کچھ کچا تھا، آپ نے ایک بار لقمہ دیا، میں نے ٹھیک کر لیا، پھر دوبارہ غلطی کر کے دوسرے رکوع میں چلا گیا، آپ نے پھر لقمہ دیا تو میں نے مزید کوئی گڑبڑ کر دی۔ بس جیسے ہی سلام پھیرا، میری شامت آگئی، محراب ہی میں تھپڑوں کی ایسی بارش کر دی اور ایسی زوردار پٹائی لگائی کہ ساری جماعت سہم گئی۔ پھر بھائی جان کی بھی سخت ڈانٹ ڈپٹ کی کہ میں ہی اس کا پارہ سنوں، اس کی منزل کی فکر رکھوں تو ٹھیک۔ وگرنہ آپ کو کبھی توفیق نہ ہوئی کہ اسے بٹھا کر کبھی یاد کروالیا کریں یا سن لیا کریں۔

ہمارے تایازاد بھائی مولانا محمد طاہر صاحب مدظلہ بڑے ہنس مکھ اور ظریف انسان ہیں، والد صاحب کو عموماً غصے کے وقت ایسے لطائف سنا دیا کرتے تھے کہ ان کا سارا غصہ کافور ہو جاتا اور ہنس دیتے۔ اس موقع پر بھی مولانا نے کچھ دلچسپ باتیں کہہ دیں کہ حضرت! یہ بچے ہیں، آپ حضرات نے اپنا ایک معیار بنا رکھا ہے، ہم جتنی بھی کوشش کریں اس معیار پر پورا نہیں اتر سکتے، یہ آپ حضرات کی وسعت ظرفی ہے کہ ہر ہم جیسے ہر ایرے غیرے کو مصلیٰ پر کھڑا کر دیتے ہیں۔ جب اتنا مجاہدہ برداشت کرتے ہیں تو ہماری یہ کوتاہی بھی برداشت کر لیا کریں۔ اس پر والد

صاحبؒ ہنس دیئے۔ حضرت والد صاحبؒ اور تایا جی حاجی عین الدین صاحب دونوں حافظ نہیں تھے لیکن انہیں قرآن سنانا آسان کام نہ تھا۔ زبر زیر کی غلطی جھٹ سے پکڑ لیتے تھے۔ تایا جی زندگی بھر یومیہ پانچ پارے تلاوت کر کے چھ دن میں قرآن ختم کر لیتے۔ اب ضعف زیادہ ہو گیا ہے اور مقدار کم کر لی ہے۔ کثرت تلاوت کی وجہ سے قرآن مجید اتنا پختہ ہے کہ خود مسلسل یاد سے نہیں سنا سکتے، لیکن اگر حافظ پڑھ رہا ہو تو فوراً غلطی پکڑ لیتے ہیں، یہی حال والد صاحبؒ کا بھی دیکھا کہ نفلوں میں مجھ سے پارہ سنتے اور خود ہی اغلاط کی تصحیح فرماتے۔

والد صاحب کا ایک بہت بڑا انعام ہم پر یہ ہے کہ ہمیں دنیا کی آسائشوں سے دور رکھا، جن مواقع پر آسائشوں کو اختیار کیا جاتا ہے ان مواقع پر بھی سادگی اور قناعت کی مثالیں قائم کیں۔ میری شادی کے موقع پر نہ تو میرے نئے جوڑے بنے، نہ کوئی تیاری ہوئی، نہ ہی مجھے پیشگی علم تھا۔ مدرسہ کی مسجد میں اساتذہ اور موجود طلبہ کو جمع کیا، مجھے بلایا کہ آپ کا نکاح ہے۔ مولانا ظفر احمد صاحب مدظلہ کو نکاح پڑھانے کا فرمایا، انہوں نے نکاح پڑھایا، چھوارے تقسیم ہوئے، اس دن ہمارے بھتیجے کا عقیقہ تھا، وہی عقیقہ میرا ولیمہ بن گیا، بس یہی شادی تھی۔ بھائی جان کی شادی بھی اسی طرح ہوئی۔ سادگی اور قناعت آپ کا شیوہ تھا۔

محبت وشفقت ایسی فرماتے کہ تربیت کے لئے کی جانے والی سختی کا احساس باقی نہ رہتا۔ اس شفقت پر ایک واقعہ یاد آگیا۔ والدہ صاحبہ اور بھائی جان حج پر گئے ہوئے تھے۔ ہم بہن بھائی گھر میں اکیلے تھے۔ والد صاحب رات کو مدرسہ سے تشریف لائے تو ہماری پریشان صورتیں دیکھ کر فرمایا کہ کیا ناک بھوں سکیڑ رکھی ہے۔ میں تو کئی بار گیا ہوں میرے پیچھے تو اتنے پریشان نہ ہوئے۔ یہ والدہ کیا گئی ہے کہ سب کے چہرے اترے ہوئے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ ابا جی! امی تو امی ہے آپ امی تو نہیں بن سکتے۔ اس پر والد صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ پھر ہم سب بچوں کو بلا کر گود میں اپنے ساتھ لپیٹ لیا کہ آج سے میں تمہارا باپ بھی ہوں اور تمہاری ماں بھی۔ اس کے بعد جب تک والدہ صاحبہ واپس تشریف نہیں لائیں آپ کا رد یہ بہت ہی عجیب تھا حتیٰ کہ اگر مہمان تشریف لے آتے تو رات کو ان سے جلدی رخصت لیتے کہ گھر میں بچے اکیلے ہیں۔

حضرت والد گرامی نماز میں تساہل وغفلت کو قطعاً برداشت نہیں کرتے تھے۔ میری اور مولانا ضیاء الدین کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اور ہم دونوں ایک دن نماز فجر میں مسبوق تھے، جب آپ نے پیچھے نگاہ ڈالی جیسا کہ آپ کی عادت تھی کہ طلبہ میں سے مسبوقین کے ملاحظہ کے لئے آپ کی یہی نگاہ کافی ہوتی تھی۔ تو ہماری اوپر نظر پڑ گئی، اس کے ساتھ ہی بلند آواز سے ڈانٹ کے سخت کلمات ارشاد فرما دیئے۔ بس مجمع عام میں وہی ڈانٹ ہمارے لئے کفایت کر گئی اور آئندہ پھر کبھی نماز میں تاخیر نہیں کی۔

جب کیمرے کے موبائل نئے آئے تھے تو شادی کے بعد مجھے بھی موبائل خریدنے کا شوق چرایا۔ والد صاحب نہ تو موبائل استعمال کرتے تھے اور نہ ہی اس کا استعمال پسند فرماتے تھے۔ میں نے موبائل خریدا اور اس میں نظمیں وغیرہ ڈال کر سنتا رہتا۔ پتہ نہیں کس طرح والد صاحب کو اس کا علم ہو گیا، حالانکہ میں بڑے خفیہ طریقے سے استعمال کرتا تھا، پہلے تو آپ نے بھائی جان کی ڈانٹ ڈپٹ کی کہ ظہیر الدین پر نگاہ رکھنا آپ کا کام ہے، آپ نے اسے کھلی چھوٹ دے رکھی ہے، اس نے موبائل خریدا ہوا ہے۔ پھر خود جب مدرسہ سے رات کے وقت گھر تشریف لائے تو میں سونے کے لئے اپنے کمرے میں لیٹ چکا تھا اور موبائل کا ہیڈ فون کانوں میں لگایا ہوا تھا۔ آپ نے کپڑے سے موبائل پکڑ کر اٹھایا کہ یہ نجس چیز پاس رکھی ہے اور پھر میری ایسی پٹائی لگائی کہ موبائل کا شوق ہی دل سے نکال دیا، یہ شادی کے بعد لگنے والی غالباً آخری پٹائی تھی۔

والد گرامی کی ایک ایک ادا بھلائے نہیں بھولتی۔ یقیناً آپ نے اپنے اہل خاندان خصوصاً اپنی اولاد کی دینی و دنیاوی تربیت میں حتی المقدور کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ آپ کی سادگی، زہد وقناعت، ایثار وقربانی، مہمان نوازی وسخاوت اور گھر والوں کی پوری نگہداشت سے ہم نے بچپن ہی سے بہت کچھ سیکھا۔ آپ نے اپنی اولاد اور تلامذہ کی تربیت کے لئے وہی منہج اختیار فرمایا جو حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ کے والد محترم مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ نے اختیار فرمایا تھا۔ یہ آپ کا ہمارے اوپر اتنا بڑا احسان ہے کہ ساری عمر دعائیں اور اعمال خیر کر کے بخشتے رہیں تو بھی اس کا بدلہ نہیں اتار سکتے۔ والدین کے احسانات کا بدلہ کون اتار سکتا ہے؟ اور پھر اللہ تعالیٰ جسے والدین بھی ایسے نصیب کر دیں، جیسے ہمیں نصیب فرمائے تو اس کے لئے تو دارین کے مزے مقدر ہیں۔

استاذ صاحبؒ کے ساتھ بیتے دن

مولانا رفیع اللہ خان

حضرت مولانا محمد امین شہید رحمہ اللہ تعالیٰ ہمارے خطے، ملک اور خاندان کے لئے عزت وشرف کی علامت تھے۔ میری زندگی کا اصل سرمایہ وہ دن ہیں جو حضرتؒ کی صحبت اور تربیت میں گزرے۔ میری وادی استاذ صاحب کی

خالہ تھیں۔ جب آپ جامعہ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن میں استاذ ہوئے تو آپ کی کوشش تھی کہ علاقہ اور خاندان سے اچھے طلبا کو علم دین پڑھنے کے لئے اپنے ساتھ لے جائیں۔ بندہ اور برادر مولانا حبیب اللہ کو بھی حضرت اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ ہم نے بچپن حضرتؒ ہی کے آغوش شفقت میں گزارا۔ ہماری ہر حوالے سے تربیت کی۔ اخلاق پر توجہ دی، ہمیں معاشرت سکھائی، اٹھنے اور بیٹھنے کا طریقہ بتلایا، اپنے اور پرائے کے حقوق سمجھائے اور سب سے بڑھ کر ہماری تعلیم پر توجہ دی۔

میرے والد صاحب کا ایک ناگہانی حادثہ میں پاؤں ٹوٹ گیا تھا، میں حضرت کی اجازت سے خدمت کے لئے کراچی سے علاقہ آیا اور یہاں جامعہ حقانیہ میں داخلہ لے لیا، برادرم مولانا حبیب اللہ خان بھی میرے ساتھ تھے۔ حضرت ہر ماہ خط لکھ کر پوری تعلیمی کیفیت اور سرگرمیوں سے آگاہ ہوتے تھے، کوتاہی پر تنبیہ کرتے، سمجھاتے، کبھی ناراضی کا اظہار فرماتے۔ بندہ آپ کے ان گراں قدر خطوط کے چند اقتباسات یہاں نقل کرتا ہے، یقیناً ان خطوط میں طلبہ کے لئے سیکھنے کا بڑا مواد ہے۔ ان سے ایک ایسے دردمند مربی کی شان جھلکتی ہے، جو اپنے چھوٹوں کی ایک ایک حرکت کی خبر گیری اور اصلاح کے لئے فکرمند ہو۔ ملاحظہ ہوں چند اہم اقتباسات:

بندہ اور برادرم مولانا حبیب اللہ خان کے داخلے کے حوالے سے پریشانی اور اپنے تعلق ومحبت کے احساس پر مشتمل ایک یادگار مکتوب میں لکھتے ہیں:

> ''فقیر جب سے کراچی پہنچا ہے آپ حضرات کے فکر سے ایک دن بھی غافل نہیں رہا اور اس توقع پر کہ آپ حضرات اپنی پہلی فرصت میں اپنے احوال سے آگاہ کردیں گے روزانہ خط کا منتظر رہا حتی کہ برادرم معین الدین صاحب کا مکتوب ملا، اس سے آپ کے حقانیہ میں داخلہ کا علم ہوگیا۔ دارالعلوم حقانیہ عظیم درسگاہ ہے، دیوبند ثانی کا لقب پاچکا ہے، آپ اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتے ہوئے پورے تندہی اور محنت سے مقصد پانے کے لئے کوشاں رہیں۔
>
> آپ ہوشیار ہیں اور مستقبل کے تجربات سے آپ پر یہ بات واضح ہوجائے گی کہ ایک انسان کا کسی کے ساتھ جس قدر قلبی تعلق قوی ہوتا ہے اتنا ہی وہ کسی ناگوار بات کی وجہ سے اس سے ناراض ہوجاتا ہے، حق تعالیٰ ہمیں بڑے بڑے معاصی کے ارتکاب پر اتنی ملامت نہیں فرماتے جس طرح وہ اپنے مقربین خصوصاً انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے طائفہ مقدسہ کے معمولی سے معمولی نامناسب اقدام پر ناراضگی کا اظہار فرماتے ہیں۔ مثال کے طور پر بہت سے لوگ ہمیں خط تو کیا خط کا جواب بھی نہیں دیتے لیکن ہم پر اس کا اثر نہیں ہوتا، آپ نے صرف ایک ہفتہ خط لکھنے میں تاخیر کی، اس پر قلبی صدمہ ہوتا رہا۔ مقصد یہ ہے کہ جسمانی طور پر ہمارے

درمیان گیارہ سو میل فاصلہ کے باوجود میرا قلبی تعلق آپ کے ساتھ بدستور قائم ہے، آپ کی عدم موجودگی کا اثر اس سے کسی طرح کم نہیں جیسا کہ ایک چھوٹے بھائی کے فقدان سے انسان کے دل ودماغ پر ہوتا ہے لیکن ''عسی ان تکرھوا شیئا وھو خیر لکم'' کے بموجب ان شاء اللہ تعالیٰ اس میں خیر و برکت ہوگی، فطری طور پر آپ دونوں کی خالی جگہ پر جب نظر پڑتی ہے تو ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے جو حیطۂ تحریر میں آنہیں سکتی۔''

بندہ کی حوصلہ افزائی اور تشجیع کے لیے رقم طراز ہیں:

'' آپ نے اسباق کی تفصیل بتلاتے ہوئے اطمینان ظاہر کیا تھا جو کہ میرے لئے بھی اس سلسلہ میں اطمینان کا باعث ہوا، مجھے امید ہے کہ پورے استقلال اور ہمت کے ساتھ اپنے مقصد کے حصول کے لئے کوشاں رہیں گے اور جہد تام وسعی کامل سے کام لیں گے۔ یہ سنت اللہ ہے کہ محنت ومشقت کے پھل سے کسی کو محروم نہیں فرماتے: ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین، ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔''

بندہ کی بیماری پر پدرانہ اضطراب کا مظہر یہ مکتوب، جس کے لفظ لفظ سے شفقت ومحبت ٹپکتی ہے:

''گزشتہ ہفتہ گھر سے واپسی کے بعد آپ کا محبت نامہ مل گیا، پڑھا اور حزن وملال کے دریا میں غوطہ زن ہوا۔ فقیر کے ساتھ آپ تھے تو بیماری کے حالت میں آپ یقین کیجئے کہ آپ سے زیادہ تکلیف مجھے ہوتی تھی لیکن ساتھ ہونے کی وجہ سے جو کچھ ہوسکتا تھا کر کے کچھ قلبی تسکین ہوتی تھی مگر اب جبکہ گیارہ سو میل کا طویل ترین فاصلہ حائل ہے سوائے اس کے اور کوئی صورت نہیں کہ اپنی ناچیز دعاؤں سے یاد کرتا رہوں اور غم وہم کے تلخ گھونٹ پیتا رہوں۔ اللہ تعالیٰ علم نافع کی تحصیل اور عمل صالح کے لئے کامل صحت سے نوازے۔ مقدر سے مفر نہیں تاہم اس فقیر نے بارہا متنبہ کیا تھا کہ اکوڑہ میں صحت کی خرابی کا خطرہ ہے۔ کاش! آپ حضرات میرے مخلصانہ مشوروں کو رد نہ فرماتے۔ میں خود بھی اقرار کرتا ہوں اور آپ بھی گواہ ہیں کہ میں انتہائی بدبخت بدعمل انسان ہوں لیکن اس کے باوجود اس پر اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اخلاص کی دولت سے حق تعالیٰ نے کافی حصہ دیا ہے جس کا نتیجہ ہے کہ میرا جس کے ساتھ بھی تعلق ہوتا ہے اس کی دنیوی واخروی فلاح کے لئے سوچتا ہوں اور پھر سکول کے لئے سفر کا زمانہ ملا کر تقریباً بیس سال سفری زندگی میں ہر قسم کے حالات کا تجربہ ہوا۔ مساعد نامساعد حالات سے گزرا، گوناگوں مشکلات سے دوچار ہوا، اس لئے اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود اس راستہ کے نشیب وفراز اور سفری زندگی کے تلخ وشیرین کا کافی علم رکھتا ہوں۔ اس لئے قطع نظر میری حقیر ذات سے میری باتوں پر آپ حضرات کو توجہ دینی چاہیے تھی۔ خواجہ شیراز نے شاید آپ ہی کو مخاطب کر کے کہا تھا:

سجادہ رنگین کن گرکت پیر مغان گوید

کہ سالک بے خبر نبود زراہ ورسم منزلہا

اب میری گزارش یہ ہے کہ آپ جہاں تک ہوسکے اکوڑہ میں گزارہ کرتے رہیں۔ امتحان میں اگر فیل ہوں تو کوئی بات نہیں، تاہم کام میں حسب امکان لگے رہیں، کھانا آپ ویسے بھی کم کھاتے ہیں کھانا زیادہ نہ کھائیں پانی کم پئیں، فروٹ استعمال کرتے رہیں، خالص گرم دودھ رات کو ایک پاؤ پی لیا کریں، مطالعہ تکرار اعتدال کے ساتھ ہوں اور عصر کے بعد ایک دو فرلانگ چکر لگائیں۔ ان شاء اللہ تعالیٰ صورت حال میں تبدیلی آجائے گی۔ ایک بات انتہائی ضروری ہے وہ یہ کہ دل سے ادھر ادھر چلے جانے کا وسوسہ قطعی طور پر نکالیں اور عزم کریں کہ یہ سال بہر حال گزارنا ہے، زندگی کے آخری لمحہ تک یہاں سے بستر اس سال نہیں اٹھانا ہے، اگر آپ نے اس صبر وثبات کا مظاہرہ کیا اور حسنِ نیت کے ساتھ حسنِ سیرت، حسن عمل کا خیال رکھا تو اللہ تعالیٰ کی نصرت واعانت، حفاظت ورحمت کی خوشخبری ابھی سے دیتا ہوں: ''ان اللہ مع الصابرین'' ''ان رحمت اللہ قریب من المحسنین'' ایک ناقابل انکار صداقت ہے۔ دواؤں سے جہاں تک ہو سکے بچنے کی کوشش کریں۔ انتہائی مجبوری کی صورت میں پشاور میں حکیم محمد ایوب یا دوسرے کسی یونانی حکیم سے دوالیں، امید ہے کہ دردمند دل سے نکلے ہوئے ان مخلصانہ گزارشات کا خیال رکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حافظ وناصر ہو۔''

بندہ کے انتخاب کتب پر تنبیہ اور رہنمائی فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' اپنے اسباق کے بارہ میں آپ نے جو کچھ لکھا تھا افسوس ہے کہ فقیر کی رائی آپ سے متفق نہیں، ہدایہ اس سال پڑھنا چاہیے تھا، ملاحسن خارجی وقت میں پڑھتے کافی ہوجاتا، اور ہدایۃ الحکمۃ پڑھے بغیر میں سمجھتا ہوں کہ ملاحسن پڑھنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے، خیر یہ عذر اتنا وزنی نہیں کہ ہدایہ موزوں استاذ کے پاس نہیں تھا، اس لئے کہ حقانیہ پر کیا انحصار ہے، آپ کی اہم ترین کتابیں حسامی اور ہدایہ ہیں، یہ اگر اچھی نہ تھیں تو دوسرے مدرسہ کا انتخاب کرتے، خیر جو کچھ ہوا ہے اللہ تعالیٰ اسی کو باعث خیر وبرکت بنائے، اور آپ کو صحت، ہمت، توفیق سے نوازے۔ آپ نے سلم کی شرح کے بارہ میں لکھا تھا فقیر کے پاس غالباً کندیا، مبین، احمد عبدالحق، بوستہ وغیرہ موجود ہیں[سلم العلوم بحاشیہ ضیاء النجوم آپ کے پاس ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو اگر وہاں ہو سکتا ہو تو لے لیں، ورنہ مجھے لکھیں میں روانہ کردوں گا۔ سلم کی شروح میں آپ کے مطالعہ کے لئے کندیا اور مبین بہتر ہوں گی، نیز اگر ممکن ہو تو حسامی کے ساتھ مولوی یعقوب کا مطالعہ التزاماً کرتے رہیں تاکہ مولوی یعقوب پڑھنے کی ضرورت نہ رہے اور اگلے سال اصول بزدوی یا تلویح پڑھ سکیں [سلم کی شروح پر کیا انحصار ہے، آپ جو کتاب چاہیں اٹھا کر لے جاسکتے ہیں، ملاحسن کا بہت اچھا نسخہ میرے پاس ہے جس کے آخر میں ملاحسن پر مولانا محمد یوسف لکھنوی کی شرح بھی ملحق ہے، اپنے ساتھ لے جانا چاہیں تو لے جائیں لیکن دوسروں

کے ہاتھ میں نہ دیں تاکہ غلط استعمال اور بے احتیاطی کی نذر نہ ہو جائے، نیز طلبہ کے لباس میں چور مدارس میں داخل ہوتے ہیں، کتاب نایاب ہے، گمشدگی کا بھی خیال رکھیے۔''

شفقت ورأفت میں ڈوبا ایک اور اقتباس جو میرے لئے سعادت عظمیٰ سے کم نہیں:

''الحمد للہ کہ آپ بخیریت ہیں اور سہ ماہی امتحان کے مرحلہ سے آگے نکل گئے۔ مولائے کریم تمام مراحل آسان فرمائے۔ آپ کی بیماری کے متعلق آپ کے دونوں خط خاموش ہیں، مجھے زیادہ تشویش اسی کی تھی، تاہم اجمالاً اتنا معلوم ہو گیا کہ مرض اتنا شدید نہیں جو قابل برداشت نہ ہو، آپ نے سال کے آخر تک اکوڑہ میں قیام کا عزم ظاہر کیا ہے یہ عزم مبارک ہو، دعا ہے اللہ تعالیٰ اپنی توفیق شامل حال فرمائے۔''

بندہ کے درخواست دعا پر اپنائیت اور شفقت سے بھرپور جواب ملاحظہ فرمائیں:

''آپ نے دعا کے لئے تحریر فرمایا تھا فقیر کا جو قلبی تعلق آپ سے رہا ہے اولاً تو اسے پیش نظر رکھ کر کیا آپ گمان کر سکتے ہیں کہ میں آپ کے لئے دعا سے غافل ہوں گا، پھر چار سال تک آپ کی مخلصانہ خدمات یاد دہانی کے لئے ناکافی ہوں گی؟ حق تعالیٰ آپ کو علم نافع، عمل صالح کی خلعت سے نوازے، اخلاص وانابت کے زیور سے آراستہ فرمائے، اپنے دربار قدس میں قبولیت بخشے۔''

سوءِ حافظہ کی شکایت پر حکیم ومحقق شیخ کا جواب پڑھیے:

''حافظہ کے لئے ہر نماز کے بعد رب اشرح لی صدری تا یفقھوا قولی ۲۱ مرتبہ اول وآخر درود کے ساتھ پڑھیں۔ کھانا جتنا ہو سکے کم کھائیں تاکہ پانی کم پینا پڑے: ''فان شرب الماء کثیرا یزید البلغم وھو یورث النسیان وقد أجمع الحکماء علی ذلک'' ۔ پھر اس سے بھی زیادہ اہم چیز تقویٰ اور معاصی سے احتراز ہے، معاصی کے حافظہ پر اثر انداز ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ بلوغ کے بعد ہر شخص حافظہ کی کمزوری کا شکار ہوتا ہے۔ قبل البلوغ چونکہ انسان مکلف نہیں ہوتا اس لئے ان کے افعال پر گرفت نہیں ہوتی۔ بلوغ کے بعد مکلف ہونے کی وجہ سے ذنوب کے صدور پر مؤاخذہ ہوتا ہے اور قلب پر گناہوں کا زنگ چڑھنے لگتا ہے اور آئینہ قلب کے غبار آلود ہونے کے بعد لازماً ادراک ومعرفت جس کا سرچشمہ قلب ہی ہے میں کمی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ امام شافعیؒ کی طرف منسوب اشعار میں یہی حقیقت بیان کی گئی ہے:

شکوت الی وکیع سوء حفظی

فأوصانی الی ترک المعاصی

فان العلم نور من الله

ونور الله لا یعطی لعاصی

وکیع بن جراحؒ امام شافعیؒ کے استاذ ہیں اور امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد ہیں، انہوں نے سوء حفظ کا علاج ترک

معاصی تجویز کیا ہے۔ بنا بریں آپ صفائے قلب کے لئے تلاوت کلام پاک، ذکر اللہ خصوصاً سو دفعہ استغفار کے ساتھ استغفار اور موت کا تذکرہ اور درود شریف کا التزام کیجئے اور جوارح ثلاثہ لسان، عینان، اذنان کو گناہوں سے پاک رکھنے کی کوشش کریں۔ امید ہے کہ بہت جلد نتائج کا مشاہدہ فرمائیں گے۔ حق تعالیٰ ہم سب کو مرضیات کی توفیق دیں اور ہر قسم کی معاصی سے بچائے رکھے۔ انہ سمیع المجیب۔''

اپنے ایک عزیز طالبعلم کا ہر جمعرات کی چھٹی پر گھر جانے کو ناپسند فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کل برادرم معین الدین صاحب کا والا نامہ ملا، اس میں جناب حاجی ظفر خان صاحب کا ایک واقعہ بھی تھا جس میں محمد حبیب صاحب کے گھر جانے کی اطلاع تھی، اس طرح گھر بار بار جانا مضر ہوتا ہے، اگر صبر کریں تو بہتر ہوگا، حصولِ علم کی اولین شرط یکسوئی ہے اور گھر جانے سے ہفتوں تک ذہن منتشر رہتا ہے۔ آپ نے سنا ہوگا تحصیل علم کے لئے لوگ دس پندرہ سال گھر سے باہر رہتے تھے اور بسا اوقات سالہا سال تک کوئی خط کسی عزیز کو نہیں لکھتے تھے۔''

علمی مشاغل کے ساتھ ملکی سیاست پر نظر اور ملک وملت کے لئے کڑھن ملاحظہ ہو:

''ملکی حالات پریشان کن ہیں، جن ہاتھوں نے جسدِ پاکستان پر چھری پھیر کر اس کے سر (بنگال) کو قلم کیا وہی ہاتھ اب پھر حرکت میں آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ پاکستان کے یمین ویسار کو کاٹ کر رکھ دیں، نا اہل قیادت کے ہاتھ میں زمامِ حکومت ہے، قدرت اپنے اٹل قوانین میں چند بے بس نفوس کی خاطر تبدیلی نہیں فرماتی۔ فسق وفجور کے باوجود حکومت باقی رہ سکتی ہے مگر ظلم وستم ایسا جرم ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے خلاقِ عالم کسی حکومت کو زیادہ ڈھیل نہیں دیتے۔''

مدینہ طیبہ میں قیام کی کوشش کے حوالے سے ایک عاشقانہ اقتباس پیش خدمت ہے:

''آج مدینہ منورہ سے باقاعدہ خط ملا، انہوں نے وہی پرانی بات لکھی ہے کہ اپنی حکومت کے ذریعہ سے درخواست بھیج دیں، کامیابی کی امید اسباب کے درجہ میں ختم ہونے کو ہے اللہ تعالیٰ کی قدرت عامہ اور تامہ سے بعید نہیں کہ پردۂ غیب سے کچھ انتظام فرمائے۔ اس خط کو پڑھ کر بہت رنجیدہ خاطر ہوں، سوائے آنسو بہانے کے کچھ کر نہیں سکتا، اخلاص سے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہماری لغزشیں معاف فرما کر اپنے اور اپنے حبیب پاک علیہ افضل الصلوات واکمل التسلیمات کی برکت سے حرم پاک میں حیا ومیتاً جگہ نصیب فرمائے۔ انہ علی کل شیء قدیر۔''

حوادث کی اطلاع کے بارے ضابطہ بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حوادث جب پیش آجائیں تو پھر چھپانے کی کوشش مہمل ہے۔ ہاں! قبل از وقوع اطلاع دے کر مسافر کو

پریشان نہیں کرنا چاہیے۔''

ہماری تعلیمی حالت کی بہتری کے لئے حضرت کی تمنا تو دیکھئے:

''ششماہی امتحانات آپ حضرات کے ہو چکے ہوں گے لیکن نتائج کی تفصیل سے تا ہنوز بے خبر ہوں جیسا کہ سہ ماہی امتحانات کی تفصیلات کا علم نہ ہو سکا، مناسب ہوتا اگر آپ کے نمبر معلوم ہو جاتے اور کلاس میں آپ کی پوزیشن (اول، دوم، سوم وغیرہ) کا علم ہوتا تاکہ آپ حضرات کی کارگزاری کا مجھے صحیح اندازہ ہوتا۔ اب تو دن تھوڑے رہ گئے ہیں مشیت ایزدی ہوگی تو عنقریب بالمشافہ حالات وکوائف پر گفتگو ہو جائے گی۔''

تعلیمی زندگی میں مشکلات کے اظہار پر حضرت کا ایک پرحکمت مکتوب:

''بعض احباب کے نام آپ اور حبیب کے آئے ہوئے خطوط سے وہاں آپ کو درپیش مشکلات کا علم ہوا۔ امسال سرحد کے کسی مدرسہ میں آپ حضرات کے داخلہ پر اصرار میں جہاں فقیر کا ایک یہ مقصد تھا کہ سال گزشتہ کے پروپیگنڈا کا غبار بیٹھ جائے اور ساتھ شرح وقایہ وشرح جامی مکمل پڑھی جائے، وہاں یہ مقصد بھی پیش نظر رہا کہ نیوٹاؤن میں حق تعالیٰ نے ہم پر انعام واکرام کے جو دروازے کھولے ہیں اس کا کچھ احساس دل میں پیدا ہو۔ قدر نعمت بعد از زوال اوست

ہمیں تو چونکہ آپ سے بدرجہا سخت حالات سے گزرنا پڑا اس لئے نیوٹاؤن میں میسر سہولتوں کی قدر وقیمت جانتے ہیں، اگرچہ وقتی طور پر غفلت کا پردہ آجاتا ہے، تاہم دل سے احساس کا ازالہ نہیں ہوتا۔ حقانیہ میں جو صعوبتیں آپ کو اٹھانی پڑیں شکر کیجئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں اور حق کے راستہ میں ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ لوگ چند ٹکوں کے خاطر کیسی کیسی مشکلات اور مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہیں۔ پھر ہم رضائے حق کی خاطر اس قسم کے معمولی مصائب کو کیوں برداشت نہ کریں۔

میرے معاشی حالات کا آپ کو بخوبی علم ہے اور یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ میں کتابوں کا مجنون ہوں، عواقب سے بے پرواہو کر جمع کرنے میں محو ہوں اور یہ بھی آپ جانتے ہیں کہ فقیر کے سینے میں کیسا دل ہے اور پھر اس دل میں آپ کا کیا مقام ہے؟ ان تمام باتوں کے باوجود اس سال فقیر آپ کی خدمت میں کچھ روانہ نہ کر سکا اس اضطراری تقصیر کا اثر دل پر علام الغیوب ہی جانتا ہے۔ یقین کیجئے کہ احقر نے اس سال گھر ایک روپیہ تک نہیں بھیجا، صرف پانچ سو روپیہ بھائی صاحب کے توسط سے قرض لئے تھے، وہ بھیج چکا ہوں فقط۔ اور فی الحال کتابوں کے سلسلہ میں تیرہ سو سے زیادہ قرضہ ہے۔ اس تفصیل کی روشنی میں امید ہے کہ آپ مجھے معذور سمجھیں گے، میرے قلبی اضطراب کا حال علامہ خطابیؒ کے زبانی سنیے:

وانی لأعرف کیف الحقوق

وکیف یبر الصدیق الصدیق

ورحب فؤاد الفتی محنۃ

علیہ اذا کان فی الحال ضیق

آج کچھ معمولی سی رقم (۱۰۰/۰۰) تاج الدین کو بھیج کر بذریعہ منی آرڈر روانہ کی۔ ملنے پر اطلاع دیجیے، تاکہ اطمینان حاصل ہو۔"

ایک اہم نصیحت جس کا ہر طالب علم محتاج ہے:

"وقت کی قدر کریں، ایک لمحہ عمر کا کسی قیمت پر واپس نہیں ہوسکتا۔ عمل صالح، جس کا ایک کامل فرد اشتغال بالعلم ہے، کے بغیر زندگی کے لمحات حسرات اور عبرات کا موجب ہوں گے۔ "ان الانسان لفی خسر" کا میں یہی مطلب سمجھ سکا ہوں۔ محنت کریں، وقت ضائع نہ کریں۔ تحصیل کے زمانہ میں کوئی بھی مشغلہ تباہ کن ہوتا ہے، اپنے آپ کو صرف اور صرف حصول علم کیلئے فارغ رکھیں، علم دین کے اسلحہ سے پوری طرح لیس ہوئے بغیر انسان دین کی صحیح خدمت نہیں کرسکتا اور نہ فرق ضالہ اور الحادو بے دینی کے یورش کا مقابلہ کرسکتا ہے۔"

بندہ کو ترجمہ قرآن پاک کے دورے کا شوق ہوا، ہمارے خطے میں ایسے دورات جو دوماہ میں کیے جاتے ہیں، عموماً مسلکی نوعیت کے ہوتے ہیں اور ان دوروں سے طلبا کا ایک خاص مسلکی ذہن تشکیل پاتا ہے جس کے خول سے نکلنا کافی مشکل ہوجاتا ہے، دورہ کے لئے مشورہ کا خط لکھا تو حضرت نے درج ذیل جواب دیا:

"آپ اپنے جذبہ کو ایک، دو سال تک دبائے رکھیں، دو مہینے میں قرآن حکیم کا لفظی ترجمہ بھی نہیں سمجھا جاسکتا ہے، سوائے خبط کے اور کوئی نتیجہ نہیں نکلتا، میری قلبی خواہش ہے کہ آپ شاہ منصوریت اور پنج پیریت کے رنگ سے مکمل طور پر محفوظ رہیں اور قلب و دماغ پر اس طوفان کا ذرہ بھر غبار نہ پڑے۔ شاہ منصور میں ترجمہ پڑھنے کے بعد آپ ایک فریق میں شامل ہوجائیں گے چاہیں یا نہ چاہیں، اور لازماً مابہ النزاع چند جزوی اور فرعی مسائل میں آپ کی دلچسپی بڑھ جائے گی جبکہ ہمیں پورے دین کی خدمت اور دینی نظام کو مکمل طور پر غالب لانے کی سعی کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضامندی کو نصب العین بنا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف صالحین کی زندگی اپنانے میں نجات ہے، ادھر اُدھر کے راستے ہلاکت و بربادی تک پہنچاتے ہیں۔ اعاذنا اللہ تعالی عن الغوایۃ بعد الھدایۃ و سددنا علی الصراط بفضلہ و کرمہ۔"

وطن سے دوری اور غربت میں اہل خاندان کی ملاقات سے فرحت وسرور اور اس میں سے معرفت رب کے اہم نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"چچا صاحب بسلسلۂ تبلیغ کراچی تشریف لائے تھے، پرسوں بروز ہفتہ راتے ونڈ بذریعہ عوامی میل تشریف لے

گئے۔ان کے وجودِ مسعود سے جو سرور اور قلبی اطمینان حاصل تھا وہ بھی ساتھ الوداع کہہ گیا، برادرم مسلم الدین صاحب تا حال موجود ہیں، بدھ کی صبح کو وہ بھی جانے کا عزم رکھتے ہیں، ان کے تشریف لے جانے کے بعد تنہائی اور مجبوری کے اصل خد و خال واضح ہو جائیں گے۔کاش اس نئی وقیوم کی ذات بابرکات کے ساتھ ہماری دلی وابستگی ہوتی جولم یزل ولا یزال ہے۔وھو معکم أینما کنتم۔"

حضرت الاستاذ کے خلاف بعض بدخواہوں نے ایک گہری سازش کے ذریعے حضرت بنوری قدس سرہ کو بدظن کرنا چاہا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے منصوبے کو ناکام فرمایا اور حضرت بنوریؒ پر جب حقیقت حال واضح ہوئی تو حضرت پر اعتماد مزید بڑھ گیا۔اسی دل خراش واقع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت الاستاذ زید مجدہم ۱۶ نومبر کو لندن سے تشریف لے آئے تھے۔سرسری اور عام ملاقاتیں تو ہوتی رہتی تھیں، ۲۵ نومبر کو ایک خاص ملاقات ہوئی، اس ملاقات میں فقیر کے کچھ کہنے سے پہلے ہی حضرت نے از خود نہایت محبت اور شفقت سے اپنے عتاب پر مشتمل گرامی نامہ کا ذکر چھیڑ دیا اور معذرت ظاہر فرمائی۔فرمایا: مجھے غلط فہمی ہوئی تھی، ارادہ تھا کہ پنڈی سے دوسرا خط لکھ کر تلافی ما سبق کروں لیکن حجاز کا سفر پھر لندن کا سفر درپیش ہوا، مولوی حبیب اللہ سے کہا تھا کہ میری طرف سے آپ کو خط لکھ دیں وغیر ذلک من کلمات الطیبۃ المبارکۃ۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ بدخواہ خائب وخاسر رہے، ان کے تمام شیطانی منصوبے خاک میں مل گئے، جھوٹ وافترا کے پہاڑ ''عہن منفوش'' دکھائی دینے لگے، ''جاء الحق وزھق الباطل'' کی تاریخی حقیقت ایک دفعہ پھر سامنے آئی۔آخر میں اٹھنے سے پہلے فرمایا کہ آپ کے کام کی میرے نزدیک بڑی اہمیت ہے، شیخ الازہر سے آپ کی آسانی کے لئے علامہ عینی کے طحاوی شریف پر شرح کا عکس منگایا ہے اور مدینہ طیبہ کی ایک معزز شخصیت سے وہاں کے ایک مکتبہ میں طحاوی کے صحیح ترین قدیم قلمی نسخے کے خریدنے کے لئے کہا ہے الخ''۔بہرحال اس سلسلہ میں میرے لئے آپ کے دل میں یقیناً تشویش ہوگی آپ پوری طرح بے فکر رہیں ''ولا تحزن ان اللہ معنا''۔

بندہ نے آپ کے محقق استاذ مولانا عبدالغفار کوہاٹیؒ کی تقریر بیضاوی جو آپ نے ان سے دوران درس لکھی تھی طلب کی، انہی دنوں حضرت بنوریؒ قدس سرہ کا انتقال ہوا، آپ جوابی مکتوب میں اپنے محبوب استاذ کے صدمہ انتقال کا حال لکھتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''آپ کا مکتوب کافی دن ہوئے ملا تھا، بیضاوی شریف کی تقریر جو صرف ایاک نستعین تک ہے اور اسی طرح ترمذی شریف کی تقریر سال کے شروع ہی میں دوسرے حضرات لے چکے ہیں۔میری عادت آپ کو معلوم ہے کہ چیز موجود ہو اور کوئی خواہش ظاہر کرے تو انکار نہیں کر سکتا۔ان حضرات سے میں نے گفتگو کی اور جلد

فارغ کرانے کے لئے کہا۔ اتنے میں سیدی وسندی ووسیلتی ابی العطوف الکریم استاذی وملجائی حضرت اقدس شیخ بنوری نور اللہ تعالی مرقدہ وبرد مضجعہ وروح روحہ وقدس سرہ وقدسنا بسرہ ونفعنا بعلومہ وفیوضہ وبانوارہ وبرکاتہ اس دار فانی سے دار البقاء کی طرف انتقال فرماتے ہوئے داغ مفارقت دے گئے۔ حضرت اقدس کا ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہوجانا ایک ایسا المیہ ہے جس کا صحیح اندازہ لگانا ممکن نہیں جو حالت گزری اور گزر رہی ہے نطاق بیان اس کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام کا فراق سیدنا یعقوب علیہ السلام کے لئے نا قابل برداشت بن گیا تھا جبکہ وہ خداوند قدوس کے برگزیدہ نبی جلیل القدر پیغمبر تھے۔ یوسفِ عصر سیدی حضرت بنوری کا ہجران کی روحانی اولاد کے لئے کمرتوڑ ثابت ہورہا ہے۔ شاید زیادہ مبالغہ نہ ہوگا اگر کہوں:

حال من در ہجر کمتر از یعقوب نیست
او پسر گم کردہ بود ما پدر گم کردہ ایم

حضرت کے وصال کے بعد ہمت جواب دے چکی ہے، آج نواں دن ہے مگر ایک خط لکھنا بھی دسترس سے باہر معلوم ہوتا ہے۔ اعصاب مفلوج، ذہن ماؤف، زبان ساکت، قلم ساکن، مدرسہ تو کیا دنیا میں اب جینا ہی ایک عذاب بن رہا ہے۔

ذم المنازل بعد منزلة اللوی
والعیش بعد اولٰئک الایام

آپ کی فرمائش اللہ تعالی نے چاہا تو عید کی چھٹیوں تک پوری ہوجائے گی۔ کوئی ملا تو دستی ورنہ بذریعۂ ڈاک روانہ کروں گا۔"

دوران طالب علمی مصائب وآفات پیش آنے پر آپ کا تسلی آمیز خط ملاحظہ فرمائیں:

"مصیبتیں اور تکلیفیں مؤمن کی نظر میں حق تعالی کے تحائف اور ہدایا ہیں۔ صبر' جو انسان کے اوصاف جمیلہ میں سے سب سے ارفع اور اعلی وصف ہے' کا مدار بلایا اور مصائب پر ہے۔ اس لئے مصائب سے مضطرب ہو جانے کے بجائے ان پر صبر وثبات کی دعا کرنی چاہیے۔ قرآن حکیم نے بتکرار واضح فرمایا ہے کہ "ان اللہ مع الصابرین" کیا خداوند متعال کی معیت اور دوست بننے سے بھی بڑھ کر کوئی نعمت ہوسکتی ہے اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اپنی معیت کے علاوہ بھی بے عد وصد اجر وثواب کا وعدہ فرمایا: "وانما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب" طبعی رنج یقینا ہونا چاہیے لیکن حق تعالی کی قضا کے بارے میں شکایت کی زبان ہرگز استعمال نہ کی جائے۔"

والد صاحب کی بیماری پر بندہ نے کچھ چھٹیاں کیں اس پر آپ کا تنبیہی خط پڑھنے کے قابل ہے:

''باقی آپ نے سبق ناغہ ہونے کا ذکر کیا تھا اس کا مجھے شدید افسوس ہے، اس میں شک نہیں کہ اعذار اور مجبوریوں کی وجہ سے ناغہ ہوہی جاتا ہے مگر پڑھنے کا شوق جب عشق کے درجہ میں ہوتو امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی گرامی قدر والدہ ماجدہ کی تجہیز، تکفین، تدفین دوسروں کے حوالہ کر کے خود اپنے عظیم استاذ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے درس میں شریک ہوجاتے ہیں۔ سلف کے حالات میں اس کی سینکڑوں مثالیں اور نظائر آپ کو تاریخ کے اوراق میں ملیں گے اور کچھ بعید نہیں کہ جب آپ کا شوق پڑھنے کے ساتھ اس درجہ کا ہوتو اللہ تعالیٰ پھر اس قسم کے مصائب سے عافیت میں رکھے۔''

طالب علمانہ زندگی کے لاابالی پن اور جلسوں میں شرکت کے شوق پر تنبیہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں اپنے سابقہ مختصر سے مکتوب میں آپ حضرات کے ادھر ادھر پھرنے پر اپنی طبعی تاثرات کا اظہار کر چکا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ آپ کے صرف دو مشغلے ہوں: یا اپنا کام ورنہ پھر آرام۔ گھومنے پھرنے وغیرہ امور میں وقت ضائع کرنے سے بہت رنج ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو وقت کی قدر جاننے اور اسے صحیح مصرف میں لگانے کی توفیق دے۔ قلب میں بعض ناپسندیدہ باتوں کی وجہ سے کدورت تھی، جن میں سے سرفہرست پشاور کے جلسہ میں شرکت تھی۔ سیاست کے بارہ میں میرا جو نظریہ ہے وہ آپ سے یقیناً مخفی نہیں لیکن اس کے ساتھ طالب علمی کے ایام میں سیاست میں عملاً حصہ لینا زہر قاتل سمجھتا ہوں۔ اکوڑہ خٹک سے جلسہ میں شرکت کی غرض سے پشاور جانا آپ کی علمی مصروفیت کے حدود اربعہ کا تعین کرتی ہے۔ اپنی پوری توانائی اور توجہ حصول علم میں صرف کریں، ترجمان اسلام وخدام الدین جمعہ کے دن پڑھنے کے علاوہ سیاسیات سے عملاً دور رہیں۔ اردو اور کتابت میں آپ روز بروز رو بہ تنزل ہیں جبکہ برادرم محمد حبیب کا معاملہ برعکس ہے، اس نے اردو لکھنے میں بھی ترقی کی اور خط بھی شاندار ہوگیا، وجہ کیا ہے؟ اس طرف خاص توجہ دیں۔''

طالب علم کے لئے تعلقات کی زہرناکی پر رقم طراز ہیں:

''آپ دونوں سے یہ قوی امید رکھتا ہوں کہ اپنے مقصد سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہیں رہیں گے، میں اپنے بے شمار تلخ تجربات کی روشنی میں وصیت کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ کی رضامندی ہر دم ہر کام میں پیش نظر رکھتے ہوئے جہاں تک ممکن ہو خلق سے کنارہ کش رہیں۔ لایعنی باتوں سے اور مہمل لوگوں سے زہر اور سانپ کی طرح اجتناب کیا کریں۔

میرے پیارے اور عزیز بھائی! سلامتی چاہتے ہوتو لوگوں سے کنارہ کش رہو۔ تعلقات بڑھانے کے بجائے گھٹاتے جاؤ، غیر اللہ سے تعلق مصائب اور مشکلات کا پیش خیمہ ہے، اپنے تینوں ساتھی اتفاق محبت سے رہیں،

دوسروں کے ساتھ میل جول قطعاً نہ رکھیں، جنگ وجدال و بداخلاقی سے بچتے ہوئے نہایت ہوشیاری اور نرمی کے ساتھ میری وصیت پر عمل کیجئے۔''

حضرت الاستاذ علاقہ تشریف لائے تو بندہ شومئی قسمت سے ملاقات کے لئے حاضر نہ ہوسکا، اس پر معذرت کا خط لکھا تو مندرجہ ذیل جواب عنایت فرمایا:

''میرے عزیز! میرے آنے کے موقع پر آپ نے اپنے نہ آنے پر معذرت کا اظہار کیا تھا۔ اصل چیز میرے نزدیک قلبی تعلق اور قلبی احترام ہے، اگرچہ اس مخفی احترام کے کچھ مظاہر ہوتے ہیں، تاہم عذر کی بنا پر اگر اس کا مظاہرہ کسی موقع پر نہ ہوسکے تو قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ آپ کے نہ آنے پر ذرہ برابر شکوہ نہیں ہوا فکر نہ کریں، چار سال کے طویل عرصہ میں آپ کے خلوص کا بارہا مشاہدہ کرچکا ہوں، آپ ہر آزمائش پر پورے اترے ہیں پھر اتنی چھوٹی سی بات پر ناراض کیسے ہوں گا، میں بالکل خوش ہوں اور ماضی کی طرح اپنے تعلق میں کچھ فرق نہیں آنے دوں گا۔''

یہ حضرت الاستاذ کے گراں قدر خطوط سے چند اقتباسات تھے، آپ کی علمی مصروفیات کا ہمیں اندازہ تھا اس کے باوجود ہماری معمولی اور اوٹ پٹانگ باتوں کا نہ صرف جواب عنایت فرماتے بلکہ ایسا رویہ رکھتے جیسے ہم ان کے شاگرد ہونے کے بجائے دوست ہوں۔

جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں آپ سے باقاعدہ شرح ابن عقیل پڑھنے کی سعادت ملی، لیکن ہماری معاونی صرف درسگاہ میں پڑھنے پر نہ تھی بلکہ بہت سی کتابیں خارجی اوقات میں اپنے کمرے میں پڑھاتے تھے، درسگاہ سے ہٹ کر خارجی اوقات میں زرادی، علم الصیغہ، ہدایۃ النحو اور شرح تہذیب وغیرہ کتابیں حضرت سے پڑھنا خوب یاد ہیں۔ حضرت الاستاذ کا انداز تدریس تحقیقی تھا لیکن یہ تحقیق عبارت اور متن کی ہوتی تھی، متن سے باہر قطعاً نہیں نکلتے تھے، آج کل مدرسین نے تحقیق اس کا نام رکھ دیا ہے کہ متن کا تو سرسری ترجمہ ہو لیکن لمبی چوڑی خارجی تقریریں رٹ کر طلبہ کو سنا دی جاتی ہیں۔ اس سے استعداد کبھی نہیں بن سکتی، بلکہ طلبہ کا وقت ضائع ہوتا ہے حضرت اس طرز تدریس کو ناپسند فرماتے تھے۔

جب آپ مدرسہ میں حضرت بنوری کی طرف سے ناظم مقرر کیے گئے تو مثالی نظم وضبط سے مدرسہ چلایا، طلبہ کی کڑی نگرانی رکھتے تھے، کسی کی ضابطے اور قانون کے مقابلے میں رعایت نہ تھی۔ اخلاقی لحاظ سے کڑی نگرانی اور معمولی لغزش پر گرفت آپ کے قدیم طلبہ کو خوب یاد ہوگا۔ طلبہ کی رہائش وخوراک کا بھی خوب خیال رکھتے تھے۔ مطبخ وغیرہ کے ناظمین کی بھی کڑی نگرانی رکھتے تھے تاکہ خوراک کے حوالے سے طلبہ کے حقوق ضائع نہ ہوں۔ لیکن ساتھ

ملازمین کے بارے میں طلبہ کی بے جا شکایات پر بھی طلبہ کی خوب خبر لیتے اور حوصلہ شکنی کرتے تا کہ ملازمین کے حقوق ضائع نہ ہوں۔ غرض اس حوالے سے مثالی توازن قائم فرمایا تھا۔

ہمارے دور طالبعلمی میں حضرت الاستاذ کی زیادہ تر ذمہ داری دارالتصنیف سے وابستہ تھی، دارالتصنیف میں حضرت مولانا یوسف بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ کی نشست درمیان میں، حضرت استاذ صاحب کی آپ کی دائیں جانب اور مولانا حبیب اللہ مختارؒ کی بائیں جانب تھی۔ اس زمانے میں استاذ صاحب صرف دو اسباق پڑھاتے تھے، بقیہ وقت تصنیف وتحقیق ہی میں گزرتا تھا۔

بندہ کو حضرت استاذ صاحب کی خدمت کا خوب موقع ملا، آپ کو ہمیشہ حد سے زیادہ مشفق پایا، حضرت نے بندہ کی خدمت کے دوران کبھی استری کپڑے نہیں پہنے، بندہ کپڑے دھو کر خشک ہونے کے بعد سلیقے سے اس طرح لپیٹ لیتا کہ اس کی شکنیں دور ہو جائیں، بس وہی کپڑے پہن لیتے۔

فراغت کے بعد بندہ اور برادرم مولانا حبیب اللہ استاذ صاحب کے مشورہ سے طاہر والی مولانا منظور احمد نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس تکمیل معقولات کے لئے چلے گئے، سال کے آخر میں استاذ صاحب کا پیغام موصول ہوا کہ میں کراچی سے مستقل علاقہ آ گیا ہوں، آپ دونوں میری معاونت کے لیے فی الفور آ جائیں، تدریس کا کام شروع کر دیا ہے۔ ہم دونوں فی الفور استاذ صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ مولانا محمد جمیل قریشی کو بھی استاذ صاحب نے بلالیا تھا۔ کچھ دس پندرہ طلبہ کی تعداد تھی، اعدادیہ سے ثالثہ تک چار جماعتیں چند طلبہ کی بنیں۔ چھوٹی سی مسجد تھی، استاذ صاحب نے چار کونے تقسیم فرمائے، ہر کونے میں ایک استاذ کی درسگاہ لگتی تھی، کچھ عرصہ بعد دو کمرے تعمیر ہو گئے تو دو جماعتیں وہاں منتقل ہو گئیں۔ بجلی اور پانی کا فقدان تھا، وام سے ہنگو تک ایک بس آتی جاتی تھی، جس میں اشیائے ضرورت خریدنے شہر آنا جانا ہوتا تھا۔ ہمارا گھر مدرسہ سے قریباً ۲۰ کلومیٹر دور پہاڑی میں تھا، بندہ ہر جمعرات کو یہ فاصلہ پیدل طے کرتا، اسباق پڑھا کر نکلتا اور مغرب کے قریب گھر پہنچ جاتا، ہفتے کے دن سحری کے وقت نکلتا اور دوسرے سبق میں پہنچ آتا، یہ سال ہا سال کا معمول رہا۔

دوسرے سال ایک صاحب چھوٹا سا جنریٹر لے آئے، اگر اس کے لئے تیل میسر آتا تو ایک دو گھنٹے رات کو مطالعہ کے لئے چلا لیتے۔ بندہ نے استاذ صاحب کی نگرانی میں ترجمۂ قرآن، شرح تہذیب، شذور الذہب، فصول اکبری، کنز الدقائق، شرح الوقایہ، نور الانوار، حسامی اور مولوی یعقوب وغیرہ کتابیں پڑھائیں۔ جہاں کوئی اشکال پیش آتا کتاب لے کر استاذ صاحب کی خدمت میں پہنچ جاتے، آپ کے استحضار کا یہ عالم تھا کہ برجستہ اس مقام کی تقریر فرما دیتے۔ مدرسہ کے تمام مدرسین توکلاً علی اللہ تدریس کرتے تھے، متعین تنخواہ نہ تھی جو کچھ استاذ صاحب کے پاس آتا

اساتذہ پر تقسیم کردیتے، بسا اوقات مروجہ تنخواہ سے زیادہ پیسے مل جاتے اور کبھی کچھ بھی نہ ہوتا تھا۔ بندہ پانچ سال حضرت کے زیر نگرانی پڑھاتا رہا، اسی اثنا بندہ پر کچھ سخت معاشی حالات آئے جس پر بندہ نے کار تدریس سے استعفیٰ پیش کر کے سکول میں ملازمت کرلی، اس پر استاذ صاحب ناراض بھی ہوئے کہ بندہ استقامت نہ دکھا سکا۔ ایک سال تک رویہ میں بیزاری رہی لیکن بندہ نے نیازمندانہ حاضری ترک نہ کی اور اپنی آمد مسلسل جاری رکھی اس پر حضرت کا رویہ دوبارہ پہلے جیسا ہوگیا۔

حضرت الاستاذ جفاکش اور چست انسان تھے اور دوسروں میں بھی یہ صفت پسند کرتے تھے، بندہ بدن سے ہلکا پھلکا تھا، اس لئے چلنے پھرنے میں بھی چست تھا، آپ کو یہ وصف بہت پسند تھا۔ ایک دفعہ ہم رات کو پیدل پہاڑی علاقے میں سفر کر رہے تھے، سخت اندھیرے کے باعث ایک گہری کھائی میں استاذ صاحب کا پاؤں جا پڑا، قریب تھا کہ آپ پھسل کر کھائی میں جا گرتے کہ بندہ نے جست لگا کر آپ کا کندھا تھاما اور زور سے اوپر کی طرف اٹھا کر قابو کر لیا۔ میری اس چستی پر استاذ صاحب بہت ہی محظوظ ہوئے، دعادی اور خوشی کا اظہار فرمایا۔

ہمیں استاذ صاحب سے عشق تھا اور عشق بعض اوقات نامناسب کام بھی کروادیتا ہے۔ ایک دفعہ کراچی میں جب بندہ چھوٹا بچہ تھا' استاذ صاحب کے ساتھ بس میں سوار ہوا، بیٹھنے کی جگہ نہ تھی لہٰذا مجبوراً بس میں کھڑا ہونا پڑا، اسی اثنا کچھ لوگ اترے اور سیٹیں خالی ہوگئیں، کھڑے لوگ جلدی جلدی سیٹوں پر بیٹھنے لگے، بندہ نے ایک سیٹ کے سامنے کھڑے ہوکر اسے ایک طرح سے گھیر لیا تا کہ استاذ صاحب اس پر بیٹھ سکیں، اس دوران ایک لمبا اور ہٹا کٹا آدمی آیا اور مجھے سامنے سے ہٹا کر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بندہ کو سخت غصہ آیا کہ اس میں اتنی تمیز نہیں کہ ایک عالم دین کھڑے ہیں اور یہ دوسرے سرے سے آکر سیٹ پر قابض ہوگئے ہیں۔ بندہ نے آؤ دیکھا تھا نہ تاؤ ایک زوردار تھپڑ ان صاحب کو جڑ دیا۔ سارے لوگ حیران۔۔۔۔ !!!! استاذ صاحب بھی سخت حیران ہوئے کہ یہ اس نے کیا کردیا، حضرت نے سختی سے ڈانٹا کہ اسے تھپڑ کیوں مارا؟ دوسری طرف میں چھوٹا بچہ تھا، عرض کیا کہ حضرت! اس میں اتنی تمیز نہیں کہ آپ کھڑے ہیں اور یہ آکر بیٹھ گیا۔ اس دوران ہمیں بھی بیٹھنے کی جگہ مل گئی، استاذ صاحب نے فرمایا: بچہ دیکھنا یہ شخص تجھے بھی تھپڑ مارے گا اور بدلہ چکائے گا۔ میں اپنے خیالوں میں گم بیٹھا تھا کہ کچھ دیر بعد بس رکی، وہ صاحب اترنے کے لئے کھڑے ہوئے اور میرے قریب سے گزرتے ہوئے چناٹ سے مجھے تھپڑ رسید کردیا اور فوراً بس سے اتر کر بس چل دی۔ استاذ صاحب ہنس پڑے اور فرمایا: میں نے نہ کہا تھا کہ یہ تجھ سے بدلہ ضرور لے گا۔

حضرت ایک عابد، زاہد اور متقی انسان تھے۔ مجھے زندگی بھر یاد نہیں کہ میں رات کو جاگا ہوں اور استاذ صاحب کو بستر پر پایا ہو یا تو آپ نوافل میں مشغول ہوتے یا ذکر و مراقبہ کر رہے ہوتے۔

آج حضرت الاستاذ کی یادیں ہیں اور وہ نہیں ۔المظاہر کے احباب نے بندہ کو حضرت سے وابستہ اپنی یادیں پیش کرنے کا کہا تھا، باتیں تو نجانے کتنی ہے لیکن ڈھلتی عمر میں اب حافظہ بھی ساتھ نہیں دیتا، وقتاً فوقتاً بہت کچھ یاد آجاتا ہے۔فی الوقت جو ذہن میں تھا اُسے پیش کردیا۔اللہ رب العزت حضرتؒ کو غریق رحمت فرمائیں اور ہمیں ان کے فیوض وبرکات سے پوری طرح مستفید ہونے کی توفیق بخشیں۔آمین

میرے مشفق چچا جان

مولانا محمد طاہر

حضرت الاستاذ مولانا محمد امین اورکزئی رحمہ اللہ جیسے انسان ماؤں نے بہت کم جنے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہر اعتبار سے کاملیت بخشی تھی۔ علم عمل، خدمت اور اصلاح وارشاد ہر اعتبار سے یگانہ روزگار تھے۔ زندگی کا کوئی ایسا پہلو ہمیں نظر نہیں آتا جس میں ہمیں آپ کے اندر کسی طرح کی تشنگی کا احساس ہوتا ہو۔

ہمارے چچا ہونے کے ناطے بچپن ہی سے ہم ان کی محبتوں، شفقتوں اور عنایات وتوجہات سے مستفید ہوتے رہے۔ جب ہم بچے تھے اور حضرت کے کراچی سے تشریف لانے کا سنتے تو ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ ہوتا تھا۔ گھر کے سارے چھوٹے استاذ صاحب کے منتظر ہوتے کیونکہ استاذ صاحب ہم سب چھوٹوں کیلئے کھلونے لاتے تھے۔ آپ کے پیار کے جو مزے ہم نے بچپن میں لوٹے ہیں، یقیناً ایسا پیار ہمیں اپنے والدین کی طرف سے بھی نہیں ملا، اور اس بات کا اظہار خود ہمارے والدین بھی کرتے ہیں۔ بندہ تو بچپن ہی سے حضرت کے ساتھ اس قدر مانوس ہوگیا تھا کہ حضرت جہاں تشریف لے جاتے، میں بھی ساتھ جاتا۔

ایک دن بچپن میں بندہ حضرت کے ساتھ پیدل جارہا تھا۔ راستے میں بندہ نے حضرت سے جنات کے وجود کے بارے میں پوچھا؟ حضرت نے فرمایا: ہاں! جنات کا وجود ہے۔ پھر دوبارہ اُن کی شکل وصورت کے بارے میں پوچھا؟ تو حضرت نے ان کی صورتوں کے بارے میں بتایا کہ بدنما آنکھوں اور ڈراونی شکلوں والے ہوتے ہیں۔ اس وقت ہمارے گاؤں سے ہنگو شہر تک آبادی کا نام ونشان تک نہ تھا، راستہ بالکل ویران و بے آباد تھا۔ حضرت نے مجھ سے فرمایا کہ تم ادھر بیٹھ جاؤ، میں قضائے حاجت کر کے آتا ہوں۔ حضرت ذرا دور چلے گئے، جب آنکھوں سے اوجھل ہوئے تو مجھے وہ باتیں جو حضرت نے جنات کی شکلوں کے بارے میں کی تھیں، متخیل ہونا شروع ہوگئیں، میں نے ڈر کے مارے رونا شروع کردیا۔ جب حضرت واپس آگئے، تو فرمانے لگے کہ کیوں رو رہے ہو؟ میں نے کہا کہ حضرت یہاں جنات تھے۔ حضرت نے ان کی شکلوں کے بارے میں پوچھا، میں نے وہی بتایا جو حضرت نے ان کی شکلوں کے بارے میں بتایا تھا۔ اس پر حضرت کی ہنسی چھوٹ گئی اور فرمایا: کوئی جن شن نہیں ویسے غلط بول رہے ہو۔

اس کے علاوہ حضرت جب بھی اساتذۂ کرام یا اولیاءعظام کے پاس جاتے تو میں بھی ان کے ساتھ جاتا، ان سے میرے لئے دعا بھی کرواتے۔ ایک دفعہ مجھے اپنے ساتھ ایک جگہ لے گئے، وہاں بہت سارے علما تشریف فرما تھے، اس وقت میں بہت چھوٹا تھا، علما اور ان کے مقام کا کوئی پتہ نہ چلا کہ یہ کون حضرات ہیں۔ پھر جب میں نے انجمن تعلیم القرآن کوہاٹ میں داخلہ لیا، تو تب معلوم ہوا کہ حضرت مجھے جس شخصیت کی زیارت کے لئے لائے تھے وہ تو حضرت صدر صاحب یعنی حضرت مولانا عبدالغفار صاحبؒ تھے اور دیگر علما ان کے متعلقین تھے۔

میری عمر ۸ سال تھی کہ حضرت اپنے ساتھ کراچی لے گئے۔ وہاں بنوری ٹاؤن میں قاری حبیب الرحمن صاحب سے ۲۲ پارے حفظ کیے۔ جامعہ میں ہمیں حضرت کی خدمت کا خوب موقعہ ملا اور حضرت کی شفقت ومحبت سے بھی خوب سیر ہوئے۔ ہماری رہائش حضرت نے اپنے ساتھ رکھی تھی۔ آپ تعلیم وتربیت میں نہایت سخت مزاج تھے، اس میں کسی قسم کی کوتاہی نا قابل برداشت تھی، لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ حضرت کی مار جتنی سخت تھی، پیار اس سے بھی زیادہ تھا۔ غلطی سرزد ہونے پر فوراً سزا ملتی، بعد میں پھر بہت پیار فرماتے۔ سزا کی وجہ سے کبھی بھی ہمارے دل میں نفرت یا تنگی پیدا نہیں ہوئی۔

کراچی کے زمانے میں ہم نے گھر میں رکھوالی کے لیے ایک کتا پالا ہوا تھا، حضرت کے ساتھ اس کا عجیب و غریب معاملہ تھا، ویسے بھی حضرت کے ساتھ جانور بہت انس رکھتے تھے۔ جب حضرت کراچی سے تشریف لاتے تو وہ انسانوں کی طرح دونوں اگلی ٹانگیں اٹھا کر حضرت سے گلے ملتا، حضرت کے ساتھ وفاداری کا یہ عالم تھا کہ رات بھر آپ کے کمرے کے سامنے پڑا رہتا۔ اس کا معمول تھا کہ عصر کے بعد حجرے کا چکر لگا کر مہمانوں کو دیکھتا، اور انہیں پہچان لیتا جو شخص حضرت کے پاس ایک بار آجاتا، تو یہ اسے پہچان لیتا پھر اگر وہ کہیں آدھی رات بھی آتا تو اسے کچھ نہ کہتا، لیکن اجنبی شخص کا رات کے وقت ہمارے گھروں کے ایریا میں آنا ناممکن تھا۔ جب یہ مر گیا تو حضرت کو اس کا بہت افسوس ہوا تھا اور حاجی معین الدین صاحب کے نام ایک خط میں اس کا ذکر بھی کیا تھا۔

کراچی کے زمانے میں بہت سارے حضرات سے ملاقاتیں اور ان کی خدمت کے مواقع ملتے رہے۔ حضرت علامہ بنوری صاحبؒ کا کئی مرتبہ دیکھنا یاد ہے۔ ایک دفعہ حضرت کے معیت میں ان کے گھر میں صبح کا ناشتہ کیا تھا اور ایک مرتبہ حضرت علامہ بنوریؒ دفتر سے باہر آرہے تھے تو ایک طالب علم کو دیکھا جس نے پانی کا نلکا کھلا چھوڑا ہوا تھا۔ اس پر حضرت سخت غصہ ہوئے اور ان کو خوب ڈانٹا کہ تم صرف پانی ہی نہیں بلکہ مسجد ومدرسہ کا پانی ضائع کر رہے ہو جو مال وقف ہے۔ میں اس وقت بمشکل آٹھ سال کا تھا، میں اور میرے بھائی محمد طیب دونوں حضرت کے ساتھ ایک بستر میں سوتے تھے۔ حضرت رات کے وقت بلند آواز سے حزب البحر پڑھتے، بچپن کا حافظہ اور یادداشت اچھی ہوتی ہے، حضرت سے روزانہ سنتے سنتے حزب البحر ہمیں حرف بحرف یاد ہو گئی تھی۔

جب میرے والد صاحب، تایا جان یا حضرت استاذ صاحبؒ کے چچا جنہیں ہم کاکا صاحبؒ کہتے تھے، کراچی تشریف لاتے تو حضرت بنوریؒ ایک وقت کے کھانے کے لیے ضرور ہمارے کمرے تشریف لاتے، یہ حضرت الاستاذ پر آپ کی خاص شفقت اور تعلق محبت کی علامت تھی۔ اسی طرح مفتی محمود صاحبؒ جب جامعہ تشریف لاتے، تو کمرہ میں حضرت کے پاس چائے پینے تشریف لاتے، اور فرماتے کہ آپ لوگوں کی چائے پی کر میری ساری تھکاوٹ دور ہو

جاتی ہے۔ حضرت مولانا حبیب اللہ مختار صاحبؒ تو کثرت سے کھانے پر تشریف لاتے، معمول یہ تھا کہ آ کر ہم بچوں کو گھر بھیجتے کہ وہاں سے کھانا لائیں، حضرت کے گھر میں بڑا عمدہ اور نفیس کھانا پکتا تھا اور جس دن آپ حضرت استاذ صاحب کے ساتھ مل کر کھاتے اس دن خاص اہتمام ہوتا، اس لیے ہم حضرت کے گھر سے چیزیں لاتے لاتے تھک جاتے۔ یہ ان بزرگوں کی باہمی محبت کے معمولی مظاہر تھے۔

استاذ صاحبؒ کے کمرے میں ہر قسم کی اشیا پڑی رہتیں۔ رقم، کتابیں، پھل، خشک میوہ جات وغیرہ۔ مگر میں نے کبھی بھی کسی چیز کو از خود ہاتھ نہیں لگایا حالانکہ بچپنا تھا لیکن یہ حضرت کی صحبت کی برکت تھی کہ سونا پڑا ہوتا تب بھی اس کی طرف التفات نہ ہوتا، اسی وجہ سے استاذ صاحب نے مجھے امانت دار کا لقب دیا تھا۔

کراچی کے قیام میں ایک عجیب بات یہ دیکھی کہ استاذ صاحب کے پاس کثرت سے کچھ مجذوب حضرات آتے تھے، اور گھنٹوں آپ کے پاس بیٹھے رہتے۔ وہ لوگ استاد صاحب سے بہت محبت کرتے تھے اور استاذ صاحب بھی ان کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ان میں سے دو کا آنا جانا تو بہت کثرت سے رہتا تھا۔ ان میں سے ایک عالم دین بھی تھے اور حضرت مولانا مفتی ولی حسن ٹونکیؒ کے ہم جماعت تھے۔ ان کا عجیب مزاج تھا، کبھی بہت گہری علمی گفتگو فرماتے اور تصوف کے عجیب رموز واسرار بیان کرتے اور کبھی کبھار ایسی گالیاں بکتے کہ غصہ آنے لگتا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا کہ کبھی کبھی اپنے آپ کو چہرہ پر مارنا شروع کرتے جیسا کہ میت پر نوحہ کرنے والی منہ پیٹتی ہیں اور اپنے آپ کو مخاطب کرتے کہ خبیث! تم نے ابھی تک ایک حدیث یاد نہیں کی۔ ساری عمر یوں ہی ضائع کردی۔ اور جب اس جذب کی حالت سے نکلتے تو فرفر زبانی ایسی احادیث سنانا شروع کرتے کہ ہم حیرت میں ڈوب جاتے۔ ہم استاذ صاحب سے پوچھتے کہ اس کو کیا ہو جاتا ہے، اتنا اچھا عالم ہے، پھر بھی گالیاں دیتا ہے اور اپنے آپ کو مارتا ہے تو استاذ صاحب ہمیں سمجھانے کے لئے فرماتے کہ زیادہ محنت کی وجہ سے ان کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

ایک اور مجذوب تھا جس کا نام محمد قاسم تھا، یہ روزانہ حضرت کی ملاقات کے لئے آتا اور ہر روز کوئی نہ کوئی چیز تحفے، ہدیے میں اپنے ساتھ ضرور لاتا۔ اکثر اعلیٰ قسم کی خوشبو حضرت کو پیش کرتا۔ حضرت کراچی سے جب اپنے علاقہ تشریف لائے تو قاسم یہاں بھی آتا تھا۔ حضرت استاذ صاحبؒ ان کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے، کھانے پینے کا انتظام فرماتے اور ان کی آرام وراحت کی فکر کرتے۔ استاذ صاحبؒ کبھی کبھار بطور مزاح فرماتے کہ میرے خیال میں میں بھی دیوانہ ہوں کیونکہ الجنس یمیل الی الجنس والی بات ہے۔

حضرت استاذ صاحبؒ کو میری تلاوت بہت پسند تھی اور میری سعادت تھی کہ اکثر تراویح اور نمازوں میں مجھے

امامت کا حکم دیتے۔ فرماتے کہ تمہاری قرأت بے تکلف ہے اور مجھے فطری طور پر تکلفات سے نفرت ہے اس لئے آپ کی تلاوت میں توجہ خوب برقرار رہتی ہے اور ذہن یکسو رہتا ہے۔

ایک سعادت یہ بھی حاصل رہی کہ حضرت کو جب بھی کوئی پریشانی لاحق ہوتی تو مجھے بلاتے۔ میں کوشش کرتا کہ ہنسی مذاق اور ہلکے پھلکے انداز میں مسئلہ کا بوجھ کم کردوں۔ استاذ صاحب فرماتے کہ آپ کے سامنے پریشانی ذکر کرتے ہیں تو آپ پریشانی رفع کردیتے ہیں اس میں اضافہ نہیں کرتے، بعض ساتھی ہاں میں اس طرح ہاں ملاتے جاتے ہیں کہ پریشانی مزید بڑھ جاتی ہے۔ بہت سے مواقع پر استاذ صاحبؒ بہت پریشان نظر آتے، میں ازخود آکر وجہ دریافت کرتا، حضرت پریشانی بتلاتے تو میں مختصر، سادہ اور ہلکے پھلکے الفاظ میں مسئلہ کا حل نکال دیتا۔ ساتھ کوئی ہنسی مذاق کی بات کرکے ماحول کو خوشگوار بنا دیتا اس سے استاذ صاحب خوش ہوجاتے اور دعا سے نوازتے۔

مجھے حضرت کے ساتھ سفر عمرہ میں شرکت کی سعادت بھی ملی۔ اس سفر میں حضرت کی خدمت کا موقع ملا اور ان کے ذوق عبادت، آہ وزاری، عاشقانہ اداؤں، ادب واحترام، خوف خدا اور عشق نبوی کے وہ نظارے دیکھنے میں آئے کہ ان کو بیان کرنے کی سکت نہیں۔ حرمین میں یکسوئی اور عبادت کو بہت ترجیح دیتے تھے۔ دن تو مکہ مکرمہ کے قیام میں سارا حرم میں اور مدینہ طیبہ کے قیام میں مسجد نبوی میں گزرتا۔ رات کا اکثر حصہ بھی حرمین میں گزارتے ۔نصف شب کے بعد اقامت گاہ پر تشریف لاتے۔ انتہائی کم کھاتے اگر کہوں کہ محض قوت لایموت کی مقدار ہوتی تو مبالغہ نہ ہوگا۔ یہ اس لیے کہ قضائے حاجت کی ضرورت کم سے کم پیش آئے کیونکہ آپ کا یہ عجیب ذوق تھا کہ حرمین میں قضائے حاجت سے سخت بوجھ پڑتا اور اسے بے ادبی تصور کرتے۔ انتہائی کم سوتے، چوبیس گھنٹوں میں بمشکل ڈھائی گھنٹے نیند کرتے۔ لوگوں کے ساتھ اختلاط اور ملاقاتوں سے حتی المقدور بچتے۔ اپنے آپ کو چھپا کر رکھنے کی کوشش کرتے اور نگاہ نیچی رکھتے۔ روضہ طیبہ پر حاضری کا منظر ایسی وارفتگی کا ہوتا جیسے سالوں کا بچھڑا ہوا بچہ ماں کی آغوش میں جا رہا ہو اور وہاں ادب و عاجزی اور تواضع وانکساری کا یہ عالم ہوتا جیسے دربار رسالت کی حسی حاضری ہو رہی ہو۔

ایک دن مدینہ منورہ میں بارش ہوئی تو اس دن استاذ صاحب بہت ہشاش بشاش تھے، چہرہ سے مسرت وخوشی کے اثرات ٹپک رہے تھے، میرا ارادہ تھا کہ میں ضرور وجہ پوچھوں گا کہ آج اتنے نشاط اور خوشی کی کیا وجہ ہے مگر آخر تک پوچھنے کا موقعہ نہ مل سکا۔

پھر جس دن حرم شریف سے رخصتی تھی وہ بہت ہی عجیب دن تھا، ہمارے اندر حضرت کے چہرے کی طرف دیکھنے کی طاقت نہیں تھی۔ غم، پریشانی اور الم کی جو کیفیت آپ کے چہرے پر عیاں تھی، اس کی صحیح تصویر کشی کے لئے

میرے پاس الفاظ نہیں۔حرم شریف سے اسلام آباد تک چہرہ پر افسردگی اور آنکھوں سے وقتاً فوقتاً دھیمے دھیمے آنسو ٹپک رہے تھے۔ایسا لگتا تھا کہ جیسے آج گھر سے کسی عزیز از جان کا جنازہ اٹھ رہا ہو۔جب میں استاذ صاحبؒ کے چہرے کی طرف دیکھتا تو میری بھی حالت غیر ہو جاتی۔

استاذ صاحب کی بڑی خوبی یہ تھی کہ ہر چیز میں اتباع سنت کو ملحوظ رکھتے۔حنفیت کو سنیت کی اصح تشریح سمجھتے۔حرم شریف میں اکثر مقام ابراہیم کی طرف بیٹھتے،میرے استفسار پر بتایا کہ سعودی حکومت سے قبل یہاں کی ترتیب کچھ یوں تھی کہ مذاہب اربعہ والوں کے لئے اپنے اپنے حصے مقرر تھے،یہ حصہ احناف کے لئے مقرر تھا۔حضرت بتاتے کہ فلاں محدث نے فلاں کتاب کی تکمیل یہاں پر کی تھی۔فلاں نے اپنے کتاب کے بارے میں یہاں مراقبہ کیا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے حرم شریف میں وہاں نوافل پڑھیں جہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام مدفون ہے،نوافل کے بعد دل میں یہ خیال آیا کہ یہ ایک قسم کی بے ادبی ہوگئی۔استاذ صاحبؒ سے عرض کیا تو فرمانے لگے کہ اس میں کوئی بے ادبی نہیں بلکہ اس سے انہیں خوشی ہوتی ہے۔

استاذ صاحب کی واضح کرامت بندہ نے یہ دیکھی کہ ایک دفعہ آپ کے ایک متعلق کو بعض دہشت گردوں نے اغوا کر لیا تھا،عشاء کے بعد کا وقت تھا کہ اس کے گھر والے آئے،حضرت نے مجھے بلا کر فرمایا کہ اس کو فلاں فلاں نے اٹھایا ہے۔حضرت نے جو نام لیے وہ خطرناک دہشت گرد تھے،لیکن آپ نے یہ اندازہ کیسے لگایا کہ اس کا اغوا ان لوگوں کا کام ہے،مجھے اس کا علم نہ ہو سکا۔پھر آپ نے مجھے فرمایا کہ ان کے ٹھکانے پر چلے جاؤ اور کہہ دو کہ استاذ صاحب کہہ رہے ہیں: مجھے یہ شخص چند گھنٹوں میں زندہ سلامت چاہیے،اسے میرے حوالے کردیں،ورنہ آپ لوگ باقی نہیں رہیں گے۔وہ ایسے لوگ تھے کہ ان کے سامنے بات تو درکنار ان کا سامنا خطرے سے خالی نہ تھا،لیکن حضرت کا حکم تھا میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے چلا گیا،یقین جانیے وہ ایسے مرعوب ہوئے کہ فی الفور انہیں میرے ساتھ روانہ کیا،اور معافی مانگنے لگے،حالانکہ ہم نہتے لوگ ان کا کیا بگاڑ سکتے تھے۔

ایک دن پشاور قصہ خوانی بازار میں کتب کی خریداری کے لئے گئے۔وہاں ایک غیر مقلد سربلند صاحب کتابوں کے تاجر ہیں،ان کے پاس بیروت کی کتابوں کا بڑا اچھا ذخیرہ ہوتا تھا،استاذ صاحب اکثر ان سے کتابیں خریدتے۔ انہوں نے ایک کتاب کے بارے میں حضرت سے پوچھا کہ آپ نے مطالعہ کی ہے۔استاذ صاحب نے فرمایا: ہاں، الحمد للہ کئی مرتبہ یکسوئی کے ساتھ مطالعہ کی ہے۔اس پر انہوں نے کہا کہ آپ پھر بھی غیر مقلد نہیں ہوئے۔استاذ صاحبؒ نے جواب میں فرمایا کہ جب بھی مطالعہ کی ہے،حنفیت پر مزید شرح صدر اور اپنے مذہب پر مزید استحکام نصیب ہوا ہے۔

استاذ صاحب سے جب ہم شرح النقایہ پڑھتے تھے تو بڑے افسوس کے ساتھ فرماتے کہ لوگ اول سے آخر تک ہمارے مدارس میں پڑھتے ہیں، آخر کار غیر مقلد ہو جاتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم اولیٰ سے آخر تک فقہ کی تمام کتابیں پڑھاتے ہیں، پھر طالب علم جب احادیث کی کتابیں پڑھنے بیٹھتا ہے اور اس میں محدثین کی ترجیحات دیکھتا ہے تو چونکہ وہ سارے غیر حنفی ہیں اس لئے اس کا حنفیت پر اعتماد کمزور ہو جاتا ہے اور غیر مقلدین کے ہاتھ چڑھ جاتا ہے۔ شرح النقایہ میں کمال یہ ہے کہ اس میں اپنے مذہب کے ہر مسئلہ پر احادیث کے دلائل قائم ہیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ اگر کسی نے شرح النقایہ پڑھی تو وہ کبھی غیر مقلد نہیں ہو سکتا۔

الحمدللہ مجھے یہ سعادت حاصل ہوئی کہ حضرت نے سلسلہ چشتیہ میں بیعت فرمایا۔ حضرت کے بعد اب کسی کی طرف بالکل التفات نہیں ہوتا۔ چشتیہ کے ان اسباق میں بہت لذت محسوس ہوتی ہے۔ جب آخری سبق سمیع بصیر علیم [illegible] کی تلقین فرمائی، تو فرمایا کہ اس کے ساتھ توجہ بہت ضروری ہے۔ سمیع میں یہ تصور کہ اللہ تعالیٰ میرا ہر حال دیکھ رہے ہیں۔ علیم میں یہ تصور کہ اللہ تعالیٰ میرے دل میں جو کچھ ہے اس سے واقف ہیں۔ ایک بار فرمایا کہ جس کا گزشتہ کل آج سے بہتر ہو اور آج گزشتہ کل کی نسبت خراب ہو تو اسے اپنے آخری انجام پر خوف کرنا چاہیے۔ ان اسباق کا مقصد یہ ہے کہ ایمانی کیفیت میں ترقی ہو جب یہ حالت نہ ہو، تو پھر اپنے حالت پر ترس کھائیں، در حقیقت تصوف کا مقصد یہی ہے۔

استاذ صاحب اسراف سے حد درجہ نفرت فرماتے تھے۔ کراچی میں شدید قسم کی گرمی تھی مگر استاذ صاحب پنکھا بالکل معمولی رفتار سے چلاتے تھے۔ جب بھی حضرت مولانا حبیب اللہ مختار حضرت کے کمرے میں تشریف لاتے تو ہمیں بہت خوشی ہوتی کیونکہ وہ آنے کے ساتھ ہی پنکھے کی رفتار تیز کرتے تھے۔ آپ کی مہمان نوازی، حیا، مروت، بغض فی اللہ، حق پرستی اور خیر خواہی کا جذبہ معاصرین میں ضرب المثل تھا۔ آپ کی شہادت سے علم وعمل کا ایک تابندہ آفتاب غروب ہو گیا۔ میرے پیارے بیٹے عبدالرحمان بھی حضرت کے ساتھ بمباری میں شہید ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے چچا جان کی شہادت ہم سب کیلئے شفاعت کا ذریعہ بنائے اور میرے پیارے بیٹے کی شہادت بھی قبول فرمائے۔ آمین

سنگ پارس

حاجی محمد شاہد اورکزئی

رب ذوالجلال مختار کل اور قادر مطلق ہے، وہ ہر دور میں اپنی قدرت کے عجیب وغریب مظاہر پیدا فرماتے ہیں۔ ہمارے پسماندہ علاقے میں حضرت استاذ صاحبؒ کا ورود کسی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت سے کم نہیں، یہ بھی ناز کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حضرت جیسے سعادت مند انسان کے خاندان میں پیدا فرمایا۔ استاذ صاحبؒ سنگ پارس تھے، جس کا بھی تعلق ہوا ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے نوازا ہے اور سونا بنایا ہے۔ حیا و وفا کا پیکر اور اخلاص وخلوص کا مجسمہ تھے۔ خیر و برکت کی نشانی، چین وسکون اور امن واطمینان کی علامت تھے۔

استاذ صاحب میرے نہایت مشفق، والد سے زیادہ مہربان وشریں چچا جان تھے۔ مجھے اپنی اولاد جیسا عزیز سمجھا۔ آپ کے ہاں محبت کا معیار دولت یا غریب یا چھوٹا و بڑا نہ تھا، بس ہر ایک کے ساتھ خلوص دل سے محبت کرتے تھے۔ عزیز اور اقربا بھی استاذ صاحب سے حد درجہ کی محبت رکھتے تھے۔ ہم سب استاذ صاحب سے مرعوب بھی رہتے تھے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو انتہائی رعب اور جلال بخشا تھا، اتنی محبت کے باوجود ہمارے لئے آپ سے آمنا سامنا مشکل ہوتا تھا، دور سے دیکھنے پر انسان پر گھبراہٹ آتی، مگر جب قرب ملتا تو پھر ان کی محبت سے سیرابی نہ ہوتی۔

بندہ اپنے کاروبار کے سلسلے میں ۱۹۹۳ء سے پشاور میں ہوتا ہے۔ جب میں پشاور سے آتا تو استاذ صاحب سے شرم کی وجہ سے ادھر اُدھر چھپنے کی کوشش کرتا، کیونکہ ایک دور میں وضع قطع سنت کے مطابق نہ تھی لیکن استاذ صاحب دور سے آواز دے کر بلاتے اور مصافحہ ومعانقہ کے لئے خود آگے بڑھتے۔ اس پر میں مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتا۔ صحیح بات ہے کہ آپ کی محبت وشفقت ہم نے اپنے والد صاحب سے بھی زیادہ پائی ہے۔

عیدین کے موقع پر خاندان کے ہر فرد کو ہدیہ وتحفہ وغیرہ دینے میں اس کی شان ومرتبہ کے مطابق معاملہ فرماتے، اس طرح چھوٹوں کو نقدی دیتے تھے، معمولی ہدیہ یا رقم کیوں نہ ہو مگر جس انداز سے دیتے وہ بہت پیارا ہوتا۔ عید کے دن صبح عیدگاہ جانے سے قبل اعلیٰ قسم کی عطر اپنے مبارک ہاتھوں سے ہر ایک کو لگاتے۔ ہم میں سے ہر ایک کی کوشش ہوتی کہ محروم نہ رہ جاؤں۔ ہر دن ان کی ادائیں یاد آکر رلاتی ہیں، ان جیسی شخصیت کو دیکھنے کی شاید آرزو کرتے کرتے مرجائیں گے لیکن ان جیسا کوئی ملے گا نہیں۔

استاذ صاحبؒ کا فراق ہمارے لئے قیامت صغریٰ سے کم نہیں۔ اگرچہ ان کی شہادت کے بعد ہر طرف فتوحات ہی فتوحات ہیں، مگر زندگی کا وہ لطف نہیں جو استاذ صاحب کی حیات میں میسر تھا۔ آج پوری قوم کو استاذ صاحب کی جدائی کا احساس ہے، قدم قدم پر ان کی کمی محسوس کی جارہی ہے۔ بذات خود مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میرے سر پر جو سائبان تھا اب وہ نہیں رہا۔ ہر وقت اپنے آپ کو تنہا سا محسوس کرتا ہوں۔

والد گرامی حاجی مسلم الدین صاحب نے کم عمری ہی سے مجھے پشاور میں اپنے بھٹہ خشت پر مامور کردیا تھا۔ ان کے ضعف کی وجہ سے بندہ کو کام کی نگرانی کرنی پڑتی۔ جب بھی استاذ صاحبؒ پشاور تشریف لاتے تو چند منٹوں کے لئے سہی میرے پاس ضرور تشریف لاتے۔ کئی مرتبہ رات کے قیام کے لئے بھی تشریف لائے۔ اس وقت میرا نوعمری کا زمانہ تھا، بزرگوں کے مقام واحترام کا کوئی سلیقہ نہ تھا، بازار بھی دور تھا، کوئی اچھے کھانے پینے کا انتظام بھی نہ ہوسکتا تھا۔ بھٹہ میں ویسے بھی ہر چیز غبار آلود ہوتی ہے۔ صفائی کی کمی ہوتی ہے، سہولیات نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ ہمارا دفتر بھی استاذ صاحبؒ کے استعمال کے قابل نہ تھا۔ مزدوروں کے میلے کچیلے برتن، خراب بیت الخلاء اور وضوخانہ بھی نہ تھا، اس کے باوجود آپ ہمارے ساتھ قیام کو ترجیح دیتے۔ حالانکہ استاذ صاحبؒ کے تعلقات کسی سے مخفی نہیں، ہم سے چند قدم آگے ہمارے دادا کے قدیم ساتھی حاجی احمد صاحب کا گھر اور حجرہ تھا۔ ان کے ہمارے ساتھ گھریلو تعلقات تھے، وہ استاذ صاحب کی زیارت کے لیے بے تاب رہتے تھے، حاجی صاحب کے گھرانے کا ہر فرد استاذ صاحب سے عشق کی حد تک محبت رکھتا تھا۔ آپ پشاور میں کسی اچھے سے اچھے ہوٹل میں بھی قیام کرسکتے تھے، مگر آپ بھٹہ کے گرد آلود ماحول میں صرف صلہ رحمی اور ہماری دلجوئی کے لئے تشریف لاتے۔

بھٹہ کے مزدوروں کا سارا عملہ استاذ صاحب سے بہت متاثر تھا۔ استاذ صاحبؒ جب تشریف لاتے، ہمارے ساتھ کام کرنے والے سارے عملہ کی کوشش ہوتی کہ ہم استاذ صاحبؒ سے مصافحہ کریں، بھٹہ کے مزدوروں کی حالت ولباس کو وہی لوگ جان سکتے ہیں جنہوں نے کبھی دیکھا ہو، پھر بھی استاذ صاحب ہر ایک کے ساتھ کھڑے ہو کر مصافحہ فرماتے۔ ہم نے دفتر میں راستے کی طرف ایک کھڑکی اس لئے رکھی تھی کہ استاذ صاحبؒ آتے ہوئے پہلے سے نظر آجائیں، تاکہ کسی کی ٹوپی وغیرہ نہ ہو تو پہن لیں۔

میں بہت سارے اسفار میں بھی ساتھ شریک رہا ہوں، دوران سفر میرا انتہائی خیال رکھتے، کھانے پینے میں مجھ سے ابتدا کرتے۔ اپنے ہاتھوں سے کھانا ڈال کر دیتے، اسی طرح پھلوں کے چھلکے خود اتار کر دیتے۔ بار بار پوچھتے کہ تھک تو نہیں گئے۔ سفر شروع کرنے کے بعد اول اپنے معمولات کو پورا فرماتے، پھر شرکائے سفر کی دل جوئی فرماتے، حالات اور علاقوں کی مناسبت سے اچھے اور دلچسپ واقعات سناتے، یہ یاد نہیں کہ حضرت کی وجہ سے ہمیں سفر میں

کوئی پریشانی ہوئی ہو، یا آپ کے ساتھ سفر میں کبھی تھکاوٹ محسوس ہوئی ہو، حضرت کے ساتھ سفر میں لذت ہوتی اور ان کی معیت میں خوشی محسوس ہوتی۔

آپ محرمات کے ارتکاب پر ناراض ہوتے اور مکروہات پر چشم پوشی فرماتے، اصلاح ضرور کرتے مگر اصلاح میں حکمت ومصلحت کا خیال رکھتے، بعض امور سے اس طرح منع کرتے کہ بظاہر زبان سے کچھ نہیں فرماتے، بلکہ اپنے عمل سے وہ تعلیم دیتے کہ آپ کی یہ چیز مجھے پسند ہے یا نہ پسند۔ حضرت کی ناراضگی بھی کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ صرف ناراضگی سے ایسا انقلاب لاتے جو کسی دوسرے کے لئے سالہا سال کی محنت میں بھی ممکن نہ ہوتا۔ آپ کی ناراضگی کے ڈر سے علاقے میں کوئی ٹی وی لگانے یا شادی میں تماشہ وغیرہ کرنے کی جرأت نہ کرتا۔ اہل علاقہ حضرتؒ سے جو حیا کرتے، شاید اس طرح حیا وہ اپنے والدین سے بھی نہ کرتے ہوں۔ جب استاذ صاحبؒ مدرسہ سے روانہ ہوتے تو لوگ احترام کی وجہ سے کھڑے ہوجاتے، یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بیکار قسم کے لوگ راستہ چھوڑ کر ادھر ادھر ہوجاتے اور استاذ صاحبؒ سے اپنے آپ کو چھپاتے۔

استاذ صاحب نفسیات کے اتنے ماہر تھے کہ چہرہ پر نظر پڑتے ہی پریشانی اور اندرونی حالت کا اندازہ لگالیتے۔ پھر پوچھتے کہ بھائی کوئی بات یا کوئی پریشانی تو نہیں، اگر کوئی اظہار کرتا تو کھڑے کھڑے مسئلہ کا حل بتادیتے اور تسلی بخش جملوں سے اطمینان دلا کر چلے جاتے۔ حساس اتنے تھے کہ بہت دور سے چیزوں کو محسوس کرتے۔ ایک دن میں گھر سے نکل آیا، آپ مدرسہ میں ہمارے والد صاحب کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ مجھے بلا کر پوچھا: کیا بیماری ہے؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت کالا یرقان ہے، کافی علاج بھی کرچکا ہوں مگر ٹیسٹوں میں پھر بھی بتایا جاتا ہے کہ اب تک یرقان باقی ہے، اس وجہ سے پریشان ہوں۔ فرمانے لگے کہ بیماری ایک قسم کی نعمت خداوندی ہے، مگر ضعف کی وجہ سے اللہ رب العزت سے عافیت کا سوال کرنا چاہیے، اس میں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ان شاء اللہ تعالیٰ اچھی صحت سے نوازے گا۔ پھر آپ نے ایک تعویذ لکھ کر دیا، اس کے بعد سے آج دس سال ہوگئے کہ دوبارہ یرقان کی شکایت نہیں ہوئی۔

اس طرح ایک دن ہمارے رشتہ داروں میں ایک عورت پر فالج کا حملہ ہوا، استاذ صاحبؒ سے دم کروانے اسے ہمارے گھر لایا گیا بے چاری چلنے پھرنے کے قابل نہ رہی تھی، بچوں نے چارپائی پر اٹھا کر گاڑی میں لایا تھا۔ مگر جیسے ہی استاذ صاحب نے دم کیا، حیرت انگیز طور پر اٹھ کر اور اپنے قدموں پر چل کر گاڑی میں سوار ہوئی۔ ان کے ساتھ آئے ہوئے لوگ اور ہم سب حیرانی کا شکار تھے۔ کہ یہ کیسے ہوگیا، لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کچھ بھی بعید نہیں وہ اپنے محبوب بندوں کے کلام میں تاثیر ڈال دیتا ہے۔

ہمارے والد حاجی مسلم الدین صاحب بچپن ہی سے تجارت کرتے ہیں ،انہیں اور مجھے اس بات کی خصوصی تاکید کی کہ امانت و دیانت کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھیں اور تجارت میں جھوٹ اور دھوکہ دہی سے بچیں۔فرمایا کہ تاجر صادق کے بارے میں بہت فضائل منقول ہیں۔ان ہدایات کی بدولت ہمارے کام کی جو مانگ ہے ،پورے پشاور میں اس کی مثال نہیں ،ٹھیک ہے کہ کمائی میں ہمیں منافع کم ملا ہے،مگر اس کمائی میں جو برکت آئی ہے ،وہ ہمارے ذہنوں سے بالاتر ہے۔الحمدللہ اس بات پر اللہ تعالیٰ کا بڑا شکر ہے کہ ساٹھ سال سے تجارت کرتے ہیں مگر اب تک کسی نے استاذ صاحب کو ہماری کوئی شکایت نہیں لگائی ۔اکثر استاذ صاحب فرماتے کہ عبادات بہت آسان ہیں،مگر معاملات بہت مشکل ہیں،جس کے معاملات اچھے ہوں ان شاء اللہ ان کی آخرت بھی اچھی ہوگی۔

استاذ صاحب میں کمال کی بات یہ تھی کہ دینی امور کے ساتھ دنیاوی امور میں بھی کافی مہارت رکھتے تھے،اکثر دنیاوی امور میں ہمیں ہدایات دیتے تھے،اس طرح کرنا چاہئے اور یہ نہیں کرنا چاہئے۔شہادت سے چند دن قبل مجھے اپنے گھر بلایا اور فرمایا کہ میں بہت زیادہ پریشان ہوں ،علاقہ سے جانا چاہتا ہوں ،بس زندگی کے چند دن باقی ہیں کہ ان کو صرف عبادت خداوندی میں گزار دوں۔ادھر کوئی عبادت کے لئے نہیں چھوڑتا۔خاص کر یہ جو فتنہ (مسلح تحریکیں) رونما ہوا ہے،ان کا ہر کام مزاج کے خلاف ہے،اگر برداشت کرتا ہوں تو روزِ قیامت پکڑ سے ڈرتا ہوں، اگر کچھ کہتا ہوں تو خاندان کے بارے میں بے چین ہوتا ہوں کہ یہ ظالم لوگ مجرم اور غیر مجرم میں تمیز نہیں کرتے۔

استاذ صاحب اس بارے میں بہت سخت تھے کہ مسجد و مدرسہ کی کوئی چیز ضائع ہو،اس پر صرف ناراض نہیں بلکہ غصہ بھی ہوجاتے ،ایک دن کسی سے معمولی نلکا کھلا رہ گیا،اس پر استاذ صاحب نے ایسی تنبیہ فرمائی کہ ہم لرز اُٹھے۔ فرماتے کہ مسجد و مدرسہ کی چیز گھر میں استعمال کرنا ہلاکت ہے اور گھر کی چیز مسجد و مدرسہ میں استعمال کرنا سعادت ہے، ایک بار مدرسہ کے کنویں کی کھدائی سے جو مٹی نکلی وہ ہمارے خاندان کے کسی فرد نے اٹھا کر لے جانا چاہی تو اسے سختی سے روکا کہ یہ مدرسہ کی مٹی ہے اس کا ذاتی استعمال جائز نہیں۔

جب استاذ صاحب اور میرے گیارہ سالہ بھتیجے عبدالرحمن شہید ہوگئے تو ان دونوں کی لاشیں ہمارے گھر میں رکھی ہوئی تھیں ،بعض قریبی رشتہ داروں نے کافی ساری تصویریں کھینچیں۔مگر میرے بھتیجے کی تصویریں تو آئیں تھیں لیکن استاذ صاحب کی ایک تصویر بھی نہیں آئی تھی ،حالانکہ استاذ صاحب اور عبدالرحمن شہیدؒ دونوں کی لاشیں ساتھ ہی رکھی ہوئی تھیں،عبدالرحمن کی تصویر کے ساتھ استاذ صاحب کی تصویر کی جگہ بالکل سفید ہوتی۔یہ بعد الموت آپ کی عجیب کرامت تھی۔جس طرح زندگی میں اللہ تعالیٰ نے منکرات سے بچائے رکھا بعد از مرگ بھی اللہ تعالیٰ نے لاج رکھی۔

جنازہ بھی علاقائی سطح پر ایک تاریخی نوعیت کا حامل تھا۔علاقہ میں بڑے بڑے لوگ فوت ہوئے مگر اتنی کثیر تعداد

پھر کبھی نہیں دیکھی۔ بغیر اعلانات کے اور راستوں میں جگہ جگہ ناکہ بندی ہونے کے باوجود ہر طرف سر ہی سر نظر آرہے تھے، پتہ نہیں اتنے لوگ صرف مختصر سے وقت میں سخت کشیدہ حالات کے اندر کیسے پہنچ آئے۔ اہل علاقہ کے لئے بھی یہ انوکھا واقعہ تھا کہ ڈھائی گھنٹوں میں اتنی بڑی شخصیت کی تدفین عمل میں آئی۔

شہادت کے چند دن بعد قبر مبارک سے ملحق ہوئی عجیب وغریب منور قندیلیں اور روشنی کے دھارے لوگوں نے دیکھے ہیں۔ ایک رات میں نے خود دیکھا کہ استاذ صاحب کی قبر کے اوپر ایک چراغ جیسی چیز فضا میں کھڑی نظر آرہی ہے۔ میں نے ایک دوسرے رشتہ دار کو بھی بتایا۔ صبح کے وقت گاؤں سے لوگوں کی آمد شروع ہوئی کہ استاذ صاحب کی قبر مبارک سے اس قسم کے نظارے اٹھ رہے ہیں۔

آج بھی لوگ ہمیں استاذ صاحب کی نسبت کی وجہ سے عزت وعظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہنگو کے ایک شخص نے مجھے فون کیا کہ ہمیں آپ کے بھٹہ خشت کی اینٹیں چاہئیں۔ اُس وقت ہمارے ہاں نہیں تھیں، میں نے معذرت کر لی۔ آگے سے وہ کہنے لگے کہ آپ کے بھٹہ خشت کی اینٹیں ہماری تعمیر میں لگ جائیں، یہ ہمارے لئے سعادت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ استاذ صاحب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجات نصیب فرمائے، دنیا میں ان کی برکات تو ہم سمیٹ رہے ہیں اللہ تعالیٰ آخرت میں ان کی شفاعت ومعیت سے محروم نہ فرمائے۔

مناسب سمجھا کہ اپنے چھوٹے بھتیجے عبدالرحمن کا بھی کچھ تذکرہ کروں، کیونکہ ان کا شمار بھی ''اہم دہشت گردوں'' میں ہوا ہے۔ یہ ہمارے بڑے بھائی مولانا محمد طاہر صاحب کے گیارہ سالہ بیٹے تھے۔ نہایت سلیم الطبع، سمجھدار، خاموش مزاج، نیک فطرت، ادب وحیا کے پیکر تھے۔ مولانا صاحب کے الحمدللہ اس کے علاوہ دیگر بیٹے بھی ہیں، مگر ان میں سب سے اچھا اور سب کا منظور نظر، نیکوکار بیٹا یہ تھا۔ بچپن ہی سے نماز باجماعت کا پابند۔ چھوٹا بچہ تھا، اس کے باوجود مسجد میں سب سے پہلے آنا، نوافل پڑھنا، فارغ وقت میں قرآن مجید اٹھا کر تلاوت میں معروف رہنا، چھوٹوں اور بڑوں کا منظور نظر، خاندان کے ہر فرد کی ان سے محبت تھی، ہر زبان پر ان کے لئے تعریفی کلمات ہوتے تھے۔ شہادت سے چند دن قبل سکول میں اول پوزیشن لی تھی۔ تقسیم انعامات کے پروگرام میں مجھے بھی شرکت کا موقع ملا تھا، ہر استاذ اس سے متأثر اور مطمئن تھا اور ہر ایک کے زبان پر یہ کلمات تھے کہ ماشاءاللہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ عبدالرحمن بھی استاذ صاحب کا ہم سفر بن کر دنیا سے رخصت ہوجائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے چچا جان اور بھتیجے کے درجات بلند فرمائے اور ہمارے خاندان کے ہر بچے کو استاذ صاحب کا صحیح جانشین بنائے۔

سرِ تکوین کا محرمِ راز

حاجی اعظم خان

استاذ گرامی، سید المحدثین، قدوۃ المحققین حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ کی شخصیت اتنی ہمہ جہت و ہمہ گیر ہے کہ کم از کم میرے جیسا خامکار ان کی شخصیت کے کسی ایک پہلو کو بھی واضح کرنے سے قاصر ہے۔

داماں نگہ تنگ وگل حسن تو بسیار
گل چین بہار تو داماں گلہ دارد

لیکن خریداران یوسف میں نام لکھوانے کا موقع ملا ہے تو اسے گنوانا بھی مناسب نہیں سمجھتا، اس لئے یہ چند منتشر سطور پیش خدمت ہیں۔

حضرت استاذ صاحبؒ رشتہ میں میرے ماموں تھے، جب آپ نے دورۂ حدیث شریف کرلیا تو خاندان کے کئی بچوں کو دینی تعلیم کے واسطے اپنی نگرانی اور سرپرستی میں لیا۔ یہ فقیر بھی اُن خوش قسمتوں میں تھا، گو کہ اپنی نااہلی اور گھر والوں کی عدم دلچسپی کے باعث میں حضرت کی توقعات پر پورا نہ اُتر سکا اور تحصیل علم کی سعادت عظمیٰ سے محروم رہا۔ اس صدمے سے ایک عرصہ تک میرا قلب و دماغ متاثر رہا۔ بہرحال حضرت نے عمر بھر شفقت ومحبت کا سابقہ معاملہ رکھا اور ان کی خواہش رد کرنے کے باوجود' جس کا اُنہیں سخت صدمہ بھی تھا' کبھی اُنہوں نے ہمارے خاندان سے بیزاری کا رویہ اختیار نہیں فرمایا۔ اُن خطوط کو پڑھ کر آج سوائے افسوس اور آنسو بہانے کے کچھ سمجھ نہیں آتا۔ حضرت ہمارے کتنے خیر خواہ تھے، ہمارے لئے کتنے کڑھتے تھے، ہمارے مفاد کی خاطر کیسے بے چین رہتے تھے۔ اُن خطوط کی ایک ایک بات ایسی ہے کہ بار بار پڑھ کر اپنی محرومی پر ہاتھ ملتا ہوں، اُن میں سے ایک خط اس مضمون میں بھی شامل کیا گیا ہے اُمید ہے، قارئین اُسے پڑھ کر میرے تاثرات کی تصدیق کریں گے۔

حضرت جب فراغت کے بعد تشریف لائے تو حافظ عبدالحمید کوہاٹی' جو کہ آپ کے دیرینہ ساتھی تھے' کے خسر نے اُنہیں کوہاٹ کے مضافات میں ''محمد زئی'' نامی گاؤں کی عیدگاہ میں مدرسہ قائم کرنے کے لئے بلایا۔ حضرت مجھے ، برادرم مولانا محمد حبیب اللہ خان اور مولانا رفیع اللہ خان کو بھی ساتھ لے گئے۔ ہم تین اقامتی طلبہ تھے، باقی مقامی تھے۔ یہاں میں نے حضرت سے پنج گنج، تحفۂ نصائح اور بعد ازاں قدوری کا کچھ حصہ پڑھا۔ دو ماہ بعد حضرت مولانا

یوسف بنوریؒ کا حضرت کے نام خط آیا کہ آپ اور حافظ عبدالحمید دونوں جامعہ آجائیں، حضرت چلے گئے۔ ہمیں گھر بھیج دیا، پتہ چلا کہ حضرت نے تخصص میں داخلہ لے لیا ہے۔ اگلے سال حضرت مجھے بھی ساتھ کراچی لے گئے۔ ہم جب پہنچے تو جامعہ میں داخلے مکمل ہو چکے تھے، حضرت مولانا ادریس میرٹھیؒ ناظم تعلیمات تھے، انتہائی اُصول پسند آدمی تھے۔ استاذ صاحب نے بہتیری کوشش کی لیکن اُنہوں نے میرے داخلے سے عذر فرمایا۔ بالآخر حضرت نے رہائش وطعام کی مد میں، معاوضہ پر میرے لئے جامعہ میں رہنے کی اجازت حاصل کی۔ اُس وقت میں جامعہ میں واحد خارجی طالب علم تھا۔ حضرت استاذ صاحب کے تخصص کا دوسرا یعنی مقالے والا سال تھا۔ میں متخصصین حضرات کے ساتھ کمرے میں رہتا، اُنہی کے ساتھ کھاتا اور حضرت مولانا حافظ عبدالحمید صاحب مجھے پڑھاتے۔ مدرسہ کی طرف سے رہائش اور طعام کے عوض استاذ صاحب آٹھ آنے یومیہ یعنی پندرہ روپے ماہوار جمع فرماتے تھے۔ دوران سال میری طبیعت خراب ہوئی، کراچی کا پانی شاید راس نہ آیا، بس یہی طبیعت کی خرابی مدرسہ چھوڑنے کا ظاہری سبب بنی ۔ مجھے حضرت نے گھر بھیج دیا، ایک سال تک علاج چلتا رہا، طبیعت سنبھلی تو والدین دوبارہ بھیجنے پر راضی نہ ہو سکے۔ میں اُس وقت تک ایک دن بھی سکول نہیں گیا تھا، لیکن حضرت کی تعلیم کی برکت تھی کہ سکول کے اساتذہ نے امتحان لے کر تیسری جماعت تجویز کر لی۔ استاذ صاحب کی بڑی تمنا تھی کہ میں پڑھ لوں، لیکن مقدر میں نہ تھا، آپ نے اس موقع پر والد گرامی کو جو خط لکھا وہ قارئین کے نذر کرنا چاہوں گا، جس کی ایک ایک سطر آج رلاتی ہے سرنامہ کے بعد لکھتے ہیں:

''دیگر حال یہ ہے کہ ہم نے اپنے تعلیمی دور کا ایک سال پورا کر کے دوسرے میں قدم رکھا ہے اور الحمد للہ حسب توفیق کام میں مشغول ہیں۔ شاید میں نے اس سے پہلے بھی لکھا تھا کہ مجھے خاص طور سے ایک نہایت اہم کام سپرد کیا گیا ہے جس کو سرانجام دے رہا ہوں۔ آپ حضرات خلوص سے دعا فرمایا کریں کہ اللہ تعالیٰ مزید توفیق حسنات نصیب فرمائے اور ہماری ناچیز کوششوں کو خلعت قبول بخشے۔ کافی مدت گزر گئی کہ آپ کی طرف سے کسی قسم کا خط وغیرہ نہیں آیا، میں نے غالباً عید سے کچھ دن پہلے آپ اور برادر حسین الدین صاحب کے نام خطوط بھیجے تھے مگر آپ کے جواب سے محروم رہا ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ مجھے جہاں تک علم ہے اعظم خان کو آپ نے باوجود تندرست ہونے کے اپنے پاس رکھا ہے اور میرے ناچیز مشوروں کو قبول نہیں کیا، ان باتوں سے مجھے شدید صدمہ ہے اور سوائے درد دل کے میرے دامن میں کچھ ہے ہی نہیں۔ میرے ذمہ کلمۂ خیر کہنا تھا کہہ چکا ہوں اور اب بھی کہتا ہوں کہ اس لڑکے کو دینی تعلیم سے محروم نہ کرو، اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں سب کچھ ہے وہ جس کو چاہے زندہ رکھے، جس کو چاہے مار دے، جس کو چاہے مال و دولت دے، جس کو چاہے

گدا وفقیر بنائے، جس کو چاہے صحت بخشے جس کو چاہے بیمار کردے، جس کو چاہے عزت بخشے اور جس کو چاہے رسوا کردے۔ اس لئے آپ کا اگر یہ خیال ہے کہ دینی تعلیم کی وجہ سے لڑکا بڑا ہو کر مفلس اور فقیر ہوگا یا یہ خیال ہے کہ باہر بھیجنے سے بیمار ہوگا یا اس کی عزت میں نقصان آئے گا تو یہ سارے خیالات بے جا ہیں۔ رب تعالیٰ جب کسی کام کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کے حکم کے سامنے زمین وآسمان کی طاقتیں ہیچ ہیں۔

میرے عزیز برادر! آپ کا مجھ پر احسان ہے، اس لئے پورے اخلاص سے میں یہ مشورہ دے رہا ہوں کہ اس فانی دنیا اور فانی لذتوں سے نظر قطع کر کے آخرت پر نگاہ رکھیے اور خدائے برتر سے اپنے کیے ہوئے وعدہ کے مطابق اپنے اس فرزند کو خدا کی راہ میں وقف کیجئے، یہی تیرے کام آئے گا۔ تفصیل کا موقع نہیں کہ میں اس بارے میں سید المرسلین، شفیع المذنبین، خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی تحریر کروں۔ اجمالاً اتنا کہوں گا کہ اعظم خان کا حافظ، عالم دین اور صالح عمل بننا رب جلیل کی پاک ذات کی قسم تیرے لئے اس سے زیادہ بہتر ہے کہ وہ کرسی اقتدار پر بیٹھے۔

میرے محترم! آپ خود ہوشیار ہیں، ذرا تو سوچیے کہ آخر یہ دنیا ہمیشہ رہنے کی جگہ تو نہیں ہے، پھر یہ کون سی عقلمندی ہے کہ ہم صرف دنیا ہی کو اپنا مقصود بنالیں اور آخرت کے کاموں میں سستی کریں۔ آخرت کی زندگی لافانی ہے اور اس لافانی زندگی والی دنیا میں چند دن کے بعد ہم سب کو آگے پیچھے جانا ہے۔ فرض کرو کہ اگر اعظم خان دینی تعلیم کے وجہ سے غریب بھی ہو گیا تو کیا ہوا؟ چند دن تکلیف ہوگی اور یہ چند دن کی تکلیف یقیناً اللہ تعالیٰ کے ہاں ہمیشہ باقی رہنے والی زندگی کی مسرتوں اور آسائشوں کی بہت کم قیمت ہے، اگر آدمی جانتا ہو۔ پھر علم دین کی یہ خصوصیت ہے کہ سچے علم سے آدمی کا دل غنی ہو جاتا ہے۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میں بے علم بھی ہوں اور بے عمل بھی، مگر باوجود اس کے خدا کے فضل سے میرے دل میں کبھی یہ نہیں آتا کہ کاش! مجھے فلاں جیسا مکان یا دوکان یا روپیہ یا عزت نصیب ہو جائے، ہاں ایک آرزو ہے کہ دین کی صحیح خدمت کریں، اپنے مہربان مولیٰ سے ملوں در آنحالیکہ وہ مجھ سے راضی ہو۔ خداوند کریم کی رضا پر دنیا کی حکومتیں اور خزانے بلکہ زمین وآسمان قربان ہوں۔

میرے محترم بھائی! میں آپ سے اور کچھ نہیں چاہتا سوائے اس کے کہ اپنے اس بچے کو ضائع اور ہلاک مت کرو۔ کل اللہ جل شانہ کے ہاں آپ ہی سے اعظم خان کیا اپنے سارے بچوں کے متعلق سوال ہوگا، قرآن حکیم کا ارشاد ہے: "یاایھا الذین امنوا قوا انفسکم واھلیکم نارا۔" الآیۃ

اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔

جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہوں گے اور جس کے پہرے دار سخت گیر اور نہایت طاقتور ہوں گے اور ہمارے

پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔" (تم میں سے ہر ایک اپنے ماتحت پر نگران ہے اور قیامت کے دن ہر ایک سے اس کے ماتحت کے بارے میں سوال ہوگا۔)

میرے پیارے بھائی! اگر آپ انبیاء کرام کی سیرت اور تاریخ اسلام کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کتنی بڑی تعداد میں اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والوں نے خدا کی رضا کے لئے اپنے رشتہ دار، بھائی بیٹے وغیرہ قربان کیے۔ دنیا میں خدا سے تعلق انسان کا دو چیزوں کی وجہ سے کٹ جاتا ہے: اولؔ مال دوسریؔ اولاد۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "یاایھا الذین اٰمنوا لاتلھکم اموالکم ولااولادکم عن ذکر اللہ ومن یفعل ذلک فاولٓئک ھم الخسرون"۔ (اے ایمان والو تمہارے مال و دولت اور بال بچے تمہیں خدا کی یاد سے غافل نہ بنادیں اور جس نے اپنی مال واولاد کی وجہ سے خدا کو بھول دیا تو بے شک وہی زیان کار ہے اور خسارہ و نقصان میں پڑ گیا ہے۔) اور فرماتے ہیں: "انما اموالکم واولادکم فتنۃ" (بے شک تمہارا مال اور اولاد تمہارے لئے امتحان کی چیز ہے۔)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی احادیث اس بارے میں موجود ہیں جن کے نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ جل شانہ ہم سب کو صحیح علم دے اور نیک عمل کی توفیق دے۔

باقی میرا تو خیال تھا کہ آپ ہمیشہ کے لئے میرے ہمدرد ہیں مگر کئی مہینوں سے آپ نے خط و کتابت چھوڑ دی تو مجھے اپنے خیال کے غلط ہونے کا اندیشہ ہوا، آپ یقین رکھیں کہ اگر آپ میرے ساتھ ہر قسم کے تعلقات ختم کردیں تب بھی میں اپنے پرانے رویہ اور محبت میں فرق نہیں لاؤں گا۔ میرے حبیب مدنی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "صل من قطعک" جو آپ سے کٹنا چاہے، آپ اس کے ساتھ تعلق قائم رکھیں۔

آپ کے اس طرز عمل کی کوئی وجہ بھی نظر نہیں آتی، اگر کوئی قصور ہے تو مطلع فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔ ہمدردی کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے آدمی میں اگر کوئی عیب نظر آئے تو اس کو بتائیں تاکہ وہ اصلاح کی فکر کرے، باقی میں آپ کو تیسرا بھائی تصور کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ دل میں نہ کسی سے ڈر ہے سوائے اللہ تعالیٰ کے اور نہ کسی سے کسی قسم کا طمع اور خوف۔ طمع صرف خدا سے ہے اور خدا تعالیٰ کے بغیر کسی سے طمع کرنا یا ڈرنا شرک ہے وہ مؤمن ہی نہیں جو خدا کے سوا کسی سے خوف اور طمع دل میں رکھے۔ اگر کوئی آدمی ملا تو اعظم خان کا بستر چادر بھیج دوں گا اور کوئی خاص خدمت ہو تو تحریر فرمائیں ان شاء اللہ تعالیٰ پورا کروں گا۔"

ہائے کاش! مجھے ماموں جان کی خواہش پوری کرنے کی توفیق ہوجاتی لیکن مقدرات ٹلا نہیں کرتیں، میری قسمت میں پڑھنا نہ تھا، میں نہ پڑھ سکا لیکن ماموں جان کی توجہات میں کوئی کمی نہیں آئی۔

حضرت نے اپنے تخصص کا مقالہ رف کے طور پر کچے پنسل کے ساتھ لکھا تھا، جب چھٹیوں میں تشریف لائے تو

اُسے قلم کے ساتھ کاغذات پر نقل کرنے کا کام شروع کیا۔ وہ مقالہ عربی میں ہے۔ میں نے حضرت کے پاس ایک سال پڑھا تھا لیکن الحمد للہ استعداد اتنی بن گئی تھی کہ تیسری جماعت میں حضرت کو وہ عربی عبارت املا کرواتا۔ ایک بار حضرت عمرو بن العاصؓ کے اسم گرامی پر آکر میں رُک گیا، حضرت نے پوچھا کہ کیوں؟ میں نے عرض کیا: حضرت! ''عمر'' کے ساتھ غلطی سے آپ نے ''واؤ'' لکھ دیا ہے۔ فرمایا: بھانجے! غلط نہیں ہے،''عمروؓ'' کے ساتھ''واؤ'' لکھا جاتا ہے، یہیں سے مجھے''عمرؓ'' اور''عمروؓ'' کا کتابتی فرق سمجھ میں آیا۔

استاذ صاحبؒ کا معمول تھا کہ ہمیں مختلف اولیاء اللہ کے پاس لے کر جاتے تھے۔ میں نے آپ کے ساتھ اسفار میں کئی علما اور بزرگان کی زیارتیں کی ہیں۔ ایک بار مجھے خلیفہ غلام رسول صاحبؒ کے پاس لے گئے۔ وہاں ان بزرگوں کی تصوف کے موضوع پر بڑی اُونچی باتیں ہوتی رہیں، موضوع گفتگو یہ تھا کہ سلسلہ سہروردیہ ختم ہورہا ہے اور اس کے طریقِ تربیت سے استفادہ کرنے والے اب باقی نہیں رہے۔ مجلس کے آخر میں خلیفہ صاحبؒ نے حضرت استاذ صاحبؒ کے''خلافت'' کا اعلان کیا، حضرت نے قبول کرنے سے معذرت کی اور بار بار معذرت کی۔ یہاں تک کہ ہم جب مدرسہ واپس آئے تو خلیفہ صاحب نے خادم سے فون کروایا کہ وہ اعلان نافذ العمل ہے، لیکن حضرت استاذ صاحبؒ نے بڑی لجاجت سے معذرت کرلی، اس کے بعد پشاور کی ایک مجلس میں خلیفہ صاحب نے دوبارہ آپ کی خلافت کا اعلان فرمایا، پتہ نہیں استاذ صاحب کا پھر کیا جواب ہوگا؟ بہر حال اب تو خلیفہ صاحب کے خلفا کی مطبوعہ فہرست میں بھی آپ کا نام چھپنے لگا ہے۔

خلیفہ صاحب کی زیارت کے لئے دوسرے سفر میں بھی میں ہمراہ تھا، کوہاٹ پہنچ کر اطلاع ملی کہ خلیفہ صاحب انتقال فرما گئے ہیں۔ وہی سفر زیارت کی جگہ جنازے میں حاضری کا بن گیا۔ استاذ صاحب کا معمول تھا کہ کسی مجمع میں پہنچتے تو سر پر چادر ڈال دیتے جس سے عمامہ چھپ جاتا اور چادر کا ایک پلو منہ میں پکڑ لیتے جس سے آدھا چہرہ چھپ جاتا، اس طرح کوئی آسانی سے پہچان نہ پاتا۔ آپ حسب معمول سر پر چادر ڈال کر زمین پر عام مجلس میں بیٹھ گئے۔ ہزاروں لوگ جمع تھے اور پیر عزیز الرحمن صاحب کا بیان چل رہا تھا، پتہ نہیں پیر صاحب نے کیسے حضرت کو پہچان لیا، لاؤڈ اسپیکر ہی پر کہہ دیا کہ اوہ ہو! یہ تو استاذ صاحب آگئے ہیں اور اس کے ساتھ ہی درمیان بیان میں مائیک چھوڑ کر سیدھے استاذ صاحب کے پاس تشریف لے آئے۔ مصافحہ و معانقہ کیا، استاذ صاحب نے بیان جاری رکھنے کا فرمایا تو دوبارہ واپس تشریف لے گئے۔ مجھ سے استاذ صاحب نے آہستہ سے کہا کہ'' پیر صیب لانجہ جوڑہ کڑہ'' (پیر صاحب نے پریشانی بنادی ہے) اور واقعتا ایسا ہی ہوا، بیان ختم ہوتے ہی لوگوں کا ہجوم حضرت کی طرف اُمڈ آیا اور طویل وقت تک مصافحوں اور معانقوں کا تھکا دینے والا سلسلہ جاری رہا، چونکہ صحت کی کمزوری کی وجہ اس کا تحمل

بھی نہ تھا، دوسری طرف مروت کی وجہ سے کسی کو منع بھی نہیں کرتے تھے، اس لئے اپنے آپ کو چھپا کر رکھنے کا درمیانی راستہ اختیار کرتے۔

ایک سفر بندہ نے حضرت مولانا سراج الیوم (گڑھئی بابا جی) کی قبر پر حاضری کا ساتھ کیا تھا، آپ بڑی دیر تک قبر پر مراقب رہے۔ سر اُٹھا کر فرمایا: بھانجے! حضرت نے سلام کا جواب ایسے دیا ہے جیسے زندہ دیتے ہیں۔

جب آپ افغانستان کے سفر سے واپس تشریف لائے تو میں نے عرض کیا: ماموں جان! صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قبروں پر گئے تھے۔ فرمایا: بھانجے! یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ بندہ کابل جائے اور صحابہ کرام کی قبروں پر حاضری دیئے بغیر چلا آئے۔ میں نے عرض کیا: حضرت! قبروں پر کھڑے ہو کر کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ صحابہ کرامؓ کی ہیں؟ فرمایا: بھانجے! عجیب بات کرتے ہو، اُس راہ سے گزرتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں صحابہ کرامؓ مدفون ہیں، قبر کے پاس کھڑا ہونا تو دور کی بات۔ آپ فرماتے تھے کہ اہل اللہ کی قبروں پر انوارات کی بارش ہوتی ہے اور ان انوارات کا مشاہدہ ماموں جان جیسے لوگوں سے کوئی بعید نہ تھا۔ ایک بار مجھے فرمایا کہ ٹھٹھہ میں ایک جگہ کے بارے میں کسی نے بتایا کہ وہاں فلاں قبر صحابی کی ہے، میں وہاں حاضر ہوا لیکن وہ انوارات نہ پائے جو کابل میں صحابہ کی قبور پر تھے۔

آپ کی بعض باتوں اور کاموں سے اندازہ ہوتا کہ ''سر تکوین'' کا کشف والہام اللہ رب العزت آپ کو اپنے فضل سے فرماتے تھے۔ تکوینی مشائخ اور بزرگوں کے ایسے احوال سناتے کہ اگر آج بیان کیے جائیں تو لوگ مانیں گے ہی نہیں کیونکہ اب تو اہل علم کی بھی تصوف سے وہ دلچسپی نہیں رہی جو ان باتوں کا ادراک کرسکیں۔ نہ ذہنی سطح اتنی اُونچی اور مضبوط ہے کہ ان باتوں کی حقیقت تک رسائی ہو۔ لہٰذا میں آپ کی ایسی دقیق باتوں سے بچنا چاہتا ہوں، جس سے کسی کوتاہ بین اور حقائق ناشناس کے فتنے میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو۔ صرف ایک بات ذکر کرنے پر اکتفا کروں گا۔ ایک بار میں نے تکوینی مشائخ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے امور سپرد کیے جانے کے بارے سوال کیا۔ آپ اس پر بحث فرماتے رہے، پھر حضرت مدنیؒ کا تذکرہ چھڑ گیا، آخر میں مجھ سے فرمایا: بھانجے! جو مدارس توکل اور اخلاص پر چلتے ہیں اور مخلوق کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے بچتے ہیں، تکوینی طور پر ان کا انتظام آج بھی حضرت مدنیؒ کے سپرد ہے۔

آپ کے پاس کثرت سے مجاذیب کی آمد رہتی تھی، ان میں سے ایک مجذوب قاسم صاحب کراچی کے رہنے والے تھے۔ حضرت جب کراچی میں مدرس تھے تو اس زمانہ میں شعبان ورمضان کی تعطیلات میں گاؤں تشریف لائے تھے۔ جہاں آج کل جامعہ یوسفیہ کی عمارت ہے اس جگہ روڈ تک گھنا جنگل تھا، اس میں ایک چھوٹا سا مختصر راستہ جس پر بمشکل ایک آدمی چل سکتا تھا ہمارے گھروں سے روڈ تک نکلتا تھا۔ دن کے وقت مختصر ہونے کی وجہ سے ہم

اسے استعمال کرتے تھے۔ایک دن میں عشا کے قریب کھاناوغیرہ کھاکرگھر سے مسجد کی طرف آنکلا،ابھی عشا کی اذان میں کچھ وقت تھا،اچانک اسی چھوٹے راستے سے ایک لمباتڑنگا نوجوان برآمد ہوا جس کی خوبصورت داڑھی، گھنگریالے پراگندہ بال تھے اورلباس سے مجنون لگ رہا تھا۔تیزی سے انگلیاں چٹخاتا ہوامیرے قریب آیا تو میں ڈر گیا۔اس نے اردوزبان میں پوچھا کہ مولوی امین صاحب یہاں ہوتے ہیں؟میں نے کہا: جی یہیں ہوتے ہیں، میں انہیں بلاتا ہوں۔یہ کہہ کرمیں گھر کی طرف بھاگ گیا۔جاکر ماموں سے کہا کہ ایک طویل القامت نوجوان ہے جوشکل اور لباس سے پاگل لگتا ہے،باہر کھڑا آپ کا پوچھ رہا ہے۔ماموں نے کہا:اوہ!کہیں قاسم نہ ہو۔اتنا کہہ کر جلدی سے جوتے پہن کر باہر آئے اور مجھے کھانالانے کا حکم دیا۔میں نے کھانالایا تو حجرے کی چارپائی پر ماموں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ماموں نے بتایا کہ یہ مجذوب ہے اورکراچی میں رہتا ہے۔اس نے ماموں کے ساتھ تنہائی میں کچھ باتیں کیں اور چلا گیا۔مجھے حیرت تھی کہ ہنگو سے ہمارے گاؤں ''وام'' تک اس وقت نہ سڑک تھی نہ گاڑیاں چلتی تھیں،یہ پیدل اس اندھیرے میں کیسے آیا،رہنمائی کس نے کی۔پھرسب سے زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ جنگل کا وہ مختصرراستہ تو ہمارے گھرانے کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا اس پر کیسے آگیا حالانکہ وہ روڈ سے نظر بھی نہیں آتا تھا۔

ایک بار قاسم صاحب کے ساتھ میں جنگل میں باہر نکلا تو انہوں نے اچانک رک کر زمین سے دو کنکر اٹھائے اور انہیں گھورنے لگا پھر تھوڑی دیر بعد پھینک دیئے۔میں نے ان سے پوچھا کہ دو کنکر اٹھاکر گھورنے اور پھینکنے میں کیاراز ہے لیکن بار بار تنگ کرنے پر انہوں نے کچھ نہ بتایا۔بعد میں ماموں جان سے یہ واقعہ بیان کیا تو آپ نے مجھے منع کیا کہ انہیں اس طرح تنگ نہ کیا کریں۔

میرے بھائی پشاور سے کراچی بڑا ٹینکر چلاتے تھے۔ایک بار حیدرآباد میں ایک تیل اسٹیشن پر اچانک قاسم انہیں مل گیا اور کہا کہ تم مولانا امین کے بھانجے ہو،اب انہوں نے کبھی زندگی میں بھی اسے نہیں دیکھا تھا،یہ حیران و پریشان کہ یہ مجنون کون ہے اور ماموں کو کیسے جانتا ہے،پھر اسے میرا کس نے بتادیا ہے؟ بہرحال بھائی نے جواب دیا کہ جی!میں ان کا بھانجا ہوں،آپ کو کوئی کام ہے؟ قاسم نے کہا کہ مجھے ساتھ ٹینکر میں لے چلو۔ان کے ساتھ سوار ہوکر کوہاٹ تک آیا اور وہاں اتر گیا۔بھائی کہتے ہیں کہ میں نے بڑی کوشش کی کہ انہیں کوہاٹ سے ہنگو کی گاڑی میں بٹھلاؤں لیکن وہ نہ مانے اور اکیلے ہی چلے گئے۔

میں ہنگو میں سوزوکی چلایا کرتا تھا۔ایک دن اچانک قاسم ٹل کی بس میں ڈرائیور کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا نظر آیا، میں نے شیشے کے قریب جاکر پوچھا کہ آپ یہاں کیا کررہے ہیں؟ کہا کہ ٹل سے آرہا ہوں،میں نے پوچھا: کرایہ ہے؟ کہا:تم دے دو۔میں نے جیب سے پانچ روپے نکال کردیئے تو کنڈیکٹر کو بلاکر تھمادیئے۔اب پتہ نہیں یہ ٹل

میں کراچی سے کس کام کے لئے آیا تھا۔

ایک بار قاسم استاذ صاحبؒ کے پاس آیا ہوا تھا، مجھے کہا کہ میں حج پر جارہا ہوں، اب ایک تو حج کے ایام بالکل قریب تھے، اس کے پاس نہ شناختی کارڈ، نہ پاسپورٹ، نہ ٹکٹ... میں نے سوچا: قاسم نے ویسے ہی جذب میں کہہ دیا ہے، یہ حج پر کہاں جاسکتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ حج سے واپس آنے والے بعض احباب نے بتایا کہ ان کی وہاں حج میں قاسم سے ملاقات ہوئی ہے۔ مجاذیب کی کائنات بھی کیا عجیب ہے، ہم ظاہر بینوں کی نگاہ اور سمجھ سے بالکل بالاتر۔ ۲۰۰۰ء کے بعد پھر قاسم کی آمد حضرت کے پاس بند ہوگئی۔ پتہ نہیں کہ اب زندہ ہوں گے یا اس دارفانی سے کوچ کر گئے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ انہیں ہر حال میں خوش رکھیں۔

ٹھٹھہ کے قبرستان میں ایک مجذوب رہتا تھا، حضرت کی اس کے پاس بھی آمدورفت رہتی تھی۔ فرماتے کہ میں ہمیشہ ان سے تنہائی میں ملتا تھا، ایک بار مفتی ولی درویشؒ کو ساتھ لے گیا، تو سخت غصے ہوئے کہ اسے ساتھ کیوں لائے ہو؟ میں نے اس کے عتاب سے بچنے کے لئے عرض کر دیا کہ جی! یہ قرآن بہت ہی اچھا پڑھتا ہے، اس کی قرأت آپ کو سنانے کی غرض سے ساتھ لایا ہوں۔ یہ سنا تو اچھل کر بیٹھ گئے اور کہا: اچھا، پھر تو سناؤ۔ اس پر مفتی صاحبؒ نے ایک رکوع انہیں سنایا، جسے بڑے سرور اور وجد سے سنتے رہے اور پسند کیا۔ جب روس کے ابتدائی حملے میں افغانستان کا کافی سارا نقصان ہوا تو حضرت فرماتے تھے کہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ جی! ان حالات کو اب بدلنا چاہیے۔ فرمایا: نہیں، کچھ اور پسنے دو۔

ایک بار میں نے حضرت سے حزب البحر کی اجازت مانگی، فرمایا: بھانجے! زبانی یاد کرلو، اجازت دے دوں گا۔ میں رات کو سویا تو ایک بزرگ کی زیارت کی جو حزب البحر تلقین کر رہے تھے، میرے دل میں آیا کہ یہ حضرت مولانا بہاء الحق صاحبؒ ہے۔ مولانا دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور اونچے درجے کے اولیا میں سے تھے۔ صبح میں نے حضرت سے ان کا حلیہ عرض کر کے پوچھا کہ یہ بہاء الحق صاحب تھے؟ فرمایا: بھانجے! اگر آپ نہ بھی بتاتے تو میں خواب سن کر بتادیتا کہ یہ مولانا بہاء الحق صاحبؒ تھے، پھر فرمایا کہ اللہ والے کسی کا دل توڑنے سے بہت بچتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ کسی کی سبکی نہ ہو۔ اس پر مولانا بہاء الحق صاحبؒ کا ایک واقعہ سنایا کہ ایک دفعہ میں ان کی زیارت کو جارہا تھا کہ راستہ میں مجھے ایک آدمی نے مدرسہ کے لئے پچاس روپے چندہ دیا۔ میں نے جیب میں رکھ لیا کہ واپسی پر مدرسہ کی مد میں شامل کر کے لکھ لوں گا۔ مولانا سے رخصت لیتے وقت میرا ہدیہ دینے کا معمول تھا، جب جیب میں ہاتھ ڈال کر رقم دینی چاہی تو سختی سے انکار فرمایا جو کہ خلاف معمول تھا کیونکہ وہ میرا ہدیہ بڑی بشاشت سے قبول کرتے تھے۔ مجھے سخت تعجب ہوا کہ کیا وجہ ہوسکتی ہے، مدرسہ واپس آیا، دیکھا کہ وہی پچاس روپے کا نوٹ دینے

کے لئے میرے ہاتھ میں آیا تھا جو ایک صاحب نے چندہ کے لئے دیا تھا۔ فرمایا: بھانجے! اس پر حیرت نہ تھی کہ طیب وخبیث کا فرق کیسے کر لیا؟ یہ تو اہل اللہ نظر باطنی سے فوراً پہچان لیتے ہیں۔ حیرت مجھے اس پر ہوئی کہ حقیقت کو جان کر افشانہ کیا، ضبط فرمایا اور میری رسوائی نہ فرمائی کہ کون سا مال ہدیہ میں دے رہا ہے؟ کمال وہ کرامت نہیں کمال یہ تھا کہ میری حقیقت مجلس میں نہیں کھولی اور لوگوں کے سامنے یہ نہیں کہا کہ دیکھو! اجتماعی مال سے ہدیہ دے رہا ہے۔

بندہ نے حضرت الاستاذؒ کی بعض عجیب دعائیں قبول ہوتی دیکھی ہیں۔ ایک بار ہمارے دوست حاجی سید رضا کو دبئی میں رہائشی گھر کی ضرورت تھی، انہوں نے استاذ صاحب سے کہا کہ میرے مدیر کے نام ایک سفارشی خط لکھ دیں تاکہ مجھے کمپنی کی طرف سے مفت گھر مل جائے۔ بظاہر ایسا ممکن نہ تھا کیونکہ حاجی صاحب کی پوسٹ اتنی اہم نہیں تھی، جس پر گھر کی سہولت مہیا ہوتی۔ اب استاذ صاحب ان کے مدیر کو کیا جانیں اور اس مدیر کو کیا پتہ کہ استاذ صاحب کون ہیں؟ لیکن حاجی صاحب کا استاذ صاحب سے سخت اصرار رہا۔ آپ نے سمجھایا بھی کہ بھئی! میری سفارش کا کیا مطلب؟ وہ مجھے کہاں جانتے ہیں۔ لیکن جب حاجی صاحب نے ضد نہ چھوڑی تو آپ نے دعا کی اور مدیر کے نام سفارش کے چند سطور لکھ دیئے۔ اللہ کی شان کہ مدیر نے وہ خط پڑھ کر فوراً ان کے لئے گھر کی منظوری دے دی۔

ہمارے علاقے کے ایک انتہائی غریب آدمی تھے، ایک دن وہ تنہائی میں کمرہ کے اندر حضرت کے ساتھ چلا کر بول رہے ہیں کہ استاذ جی! کیا میرا آپ پر کوئی حق نہیں؟ اور یہ جملہ بار بار کہہ رہے ہیں۔ استاذ صاحب جواب میں کہہ رہے ہیں کہ بھئی حق کیوں نہیں، ضرور ہے۔ تو وہ کہتے ہیں کہ پھر دعا کر دیں کہ میری یہ غربت ختم ہو جائے۔ آپ نے دعا کر دی۔ اس دعا کی برکت تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر رزق کے ایسے دروازے کھولے کہ اب وہ علاقہ کے امیر کبیر لوگوں میں شمار ہوتا ہے۔

نامعلوم یہ معاملہ صرف میرے ساتھ تھا یا باقی لوگ بھی اسے محسوس کرتے تھے کہ دل میں ذرہ برابر کوئی غلط خیال یا آپ سے قدرے ناراضگی پیدا ہوتی تو فوراً کشف ہو جاتا، فرماتے: بھانجے! خیریت تو ہے، کیوں یہ خیال دل میں آ رہا ہے؟ لیکن یہ سب تنہائی میں ہوتا، کبھی کسی کے سامنے ایسا نہیں فرمایا۔ آپ کی صحبت میں بیٹھ کر چند منٹ بعد اندازہ ہونے لگتا کہ آپ اس دور کے نہیں بلکہ پانچویں چھٹی صدی کے صوفیا میں سے ہیں۔

میں نے حضرت کے شاگردوں اور معاصرین کو آپ کا بہت ہی زیادہ اکرام اور احترام کرنے والا پایا، ایک دفعہ مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ کی شہادت کے بعد اس مسئلہ پر جامعہ محمدیہ اسلام آباد میں علما کنونشن منعقد ہوا، حضرت مجھے بھی ساتھ لے گئے، پہلے ہم قاری سعید الرحمن صاحبؒ کے مدرسہ جامعہ اسلامیہ راولپنڈی صدر حاضر ہوئے۔ وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ ہم برآمدے میں بیٹھ گئے، اس اثنا میں ایک لمبے تڑنگے آدمی، کالا جبہ پہنے، ہاتھ میں نمائشی

کھونٹی لیے باڈی گارڈ اور خدام کے جلوس میں مسجد کے اندر داخل ہوئے۔ میں سمجھا کہ کوئی بہت بڑے لیڈر اور عالم ہیں جو اس پروٹوکول سے تشریف لا رہے ہیں۔ میں نے استاذ صاحبؒ سے پوچھا کہ ماموں جان! یہ بزرگ کون ہیں؟ حضرت نے دیکھا تو فرمایا: اوہ! یہ تو مولانا زرولی خان صاحب آ گئے ہیں۔ اس دوران مولانا زرولی صاحب کی بھی نگاہ آپ پر پڑ گئی۔ بس نگاہ پڑنی تھی کہ کھونٹی بائیں ہاتھ پر لٹکا کر تیزی سے دوڑتے ہوئے حضرت کے پاس آئے اور عاجزانہ لپٹ گئے، مجھے بے چارے کی کیفیت اور متواضعانہ دوڑ دیکھ کر ان پر رشک آیا کہ کس انکساری کے ساتھ یہ مشقت برداشت کی ہے۔ اُس دن پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ مولانا زرولی خان صاحب حضرت کے شاگرد ہیں۔

ماموں جان کی ایک چیز میں نے یہ بھی مشاہدہ کی کہ جس طرح آپ کو ماحول میں انوارات کا مشاہدہ ہوتا، اسی طرح نحوست اور تاریکی بھی مشاہدہ کر لیتے، ایک بار پنڈی سے واپسی پر جنڈ (اٹک) میں ایک جگہ میں نے دوائی کھانے کے لئے ہوٹل پر گاڑی روکی۔ ماموں جان گاڑی میں بیٹھے رہے، میں نیچے آیا اور ہوٹل کے ایک کونے میں جا کر ڈرم سے پانی کا گلاس بھرا، اسی کونے میں دوسری طرف ایک ملنگ سیاہ لباس میں ملبوس، انتہائی گندا اور بدبودار، بڑے بالوں اور خوفناک مونچھوں والا زنجیریں لپیٹ کر بیٹھا ہوا تھا۔ اندھیرے میں بیٹھنے کی وجہ سے مزید بھی ڈراؤنا لگ رہا تھا۔ مجھے بھی اُسے دیکھ کر ڈر سا لگا۔ جلدی جلدی پانی پی کر گاڑی میں واپس آیا۔ بیٹھتے ہی حضرت نے فرمایا: بھانجے! شیطان بیٹھا ہوا تھا؟ مجھے سخت حیرت ہوئی کیونکہ وہ تو روڈ سے مکمل اوجھل تھا بلکہ ہوٹل کے اندر جا کر بھی بمشکل دکھائی دے رہا تھا۔ یہ حضرت کو کیسے پتہ چل گیا، مجھے اندازہ ہوا کہ یہ کوئی بددین جادوگر ہے اور اس کی ظلمت اردگرد پھیلی ہوئی ہے، جس کا حضرت کو مشاہدہ ہو گیا ہے۔

بہر حال حضرت کی زندگی پوری کی پوری کرامت تھی، آپ کی سب سے بڑی کرامت احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے لئے عمر بھر جدوجہد تھی، ساری زندگی سراپا جہد گزاری، تعلیم وتدریس کے ساتھ مختلف دینی تحریکات کی سرپرستی کی۔ بدعات ورسومات کے خلاف جہاد کیا، علاقے میں جہالت اور رسم ورواج کے اندھیروں کو ختم کرنے کے لئے اپنی کوششیں صرف کیں۔ عوامی فلاح وبہبود کے لئے اپنا اثر ورسوخ استعمال کیا اور ملک میں قیامِ امن کے لئے سخت محنت کی۔ آپ کی مظلومانہ شہادت سے حق کی آواز خاموش ہو گئی، زندگی بھر کسی ظالم وجابر کے سامنے کمزور بات نہیں کہی، ہر بات بڑی ہی جامع اور بے لچک ہوتی تھی۔

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں
یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

میرے ماموں جان شہیدؒ

محمد عمران اورکزئی

ازل سے ابد تک باطل کو لرزہ براندام کرنے اور حق کی شمع روشن رکھنے کے لئے مردان حق کے قافلوں کا سفر جاری ہے، رسم وفا کے راہرو شہادت کی کعبہ الفت میں قدم رکھ کر حق وفا ادا کرتے چلے آئے ہیں۔ ان کے خون کے صدقے زندگی کی تاریک راہوں میں حق کا نور جلوہ گر ہوتا ہے اور انہی کی آبلہ پائی کے عوض شاہراہ زندگی کے مسافروں کو سکون واطمینان نصیب ہوتا ہے۔ حق و باطل کے ٹکراؤ میں اسلام کا پھریرا انہی وفا شعار اور خدامست مجاہدوں کے سروں پر لہراتا آیا ہے اور تاریخ کے اوراق میں انہی کو اصحاب دعوت وعزیمت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ماموں جان حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ اسی قافلہ سخت جان کے مجاہد فی سبیل اللہ تھے، علم کے بلند مینار، عمل کے کوہ گراں، کردار کا روشن اُفق، تقویٰ وطہارت کا چشمہ صافی اور فہم وفراست کا بحر بیکراں ....افسوس! کہ علم وعمل سے اپنی تہی دامنی اُن کے مقام کی معرفت کی راہ میں بہت بڑا حجاب بنی رہی۔ نہ تو اُن کے علم سے مستفید ہو سکے اور نہ ہی اُن کے کمال تقویٰ سے کچھ سیکھ سکے، اُن کی وسعت ظرفی تھی کہ ہمارے خالص دنیادارانہ مزاج کے باوجود اُنہوں نے ہمیں اپنے دامن شفقت میں جگہ دیئے رکھی اور اپنی صحبت سے محروم نہ ہونے دیا۔

ماموں جان کی ساری زندگی عزیمت کی تصویر تھی، رات کے آخری پہر نالۂ نیم بائے شب سے معمولات کا آغاز ہوتا، نماز اور ذکر وتلاوت کی حلاوت سے سرشار اشراق تک کا وقت بجز باجماعت نماز کے خلوت کا ہوتا۔ مہمان نہ ہوتے تو گھر ناشتہ کر کے مدرسہ آجاتے، دن بھر درس وتدریس، مطالعہ، تصنیف وتالیف، خطوط کے جوابات، معاشرتی وخاندانی تنازعات کے تصفیے، سماجی معاملات میں قومی وعلاقائی رہنماؤں سے ملاقاتیں، جرگے، جنازوں میں شرکت مریضوں کی عیادت، مدرسہ وگھر کا نظم وانتظام، عامۃ الناس کے مسائل کے حل کے لئے دعا اور دم تعویذ سے لے کر سفارشوں اور بذات خود بھاگ دوڑ تک کی کوششیں اور مہمانوں کے ہجوم کا اکرام وانتظام جیسے کام آپ کے روزمرہ معمولات کا حصہ تھے۔ رات گئے کہیں فراغت ملتی تو پھر خلوت میں چلے جاتے اور اللہ تعالیٰ سے راز ونیاز میں

مشغول ہو جاتے۔ میں نے اپنی زندگی میں آپ سے بڑھ کر قلیل الطعام اور قلیل المنام شخص نہیں دیکھا، اس کے باوجود آپ کی نشاط و تازگی ہمارے لئے قابل رشک ہوتی۔

ماموں جان کی زندگی کے ہمہ گیر پہلو بیان کرنا مقصود ہے نہ میں اس کا اہل ہوں، بس اپنے ساتھ وابستہ کچھ یادیں قلم برداشتہ نقل کرنے کی کوشش کروں گا، اللہ تعالیٰ میرے اور قارئین کے لئے مفید بنائے۔ (آمین)

أحب الصالحين ولست منهم

لعل الله يرزقني صلاحاً

میں سیکنڈ ائیر کا طالب علم تھا، عمر بمشکل کوئی اٹھارہ سال ہوگی، میرا نومولود بچہ محب اللہ، اللہ تعالیٰ کو پیارا ہو گیا، صدمہ تو تھا لیکن اس کا احساس والدین کو زیادہ تھا اس لئے خاندان کے لوگ اُنہی کے پاس افسوس کرنے آتے رہے، میں یومیہ معمول کے مطابق کالج جانے کے لئے نکلا تو دیکھا کہ ماموں جان تشریف لا رہے ہیں۔ فرمایا: بھانجے! میں تو آپ سے ملنے آیا تھا، مجھے اس کا اندازہ نہ تھا کہ یہ مجھ سے میرے بچے کی تعزیت کریں گے، کیونکہ ایک تو چند دن کا چھوٹا بچہ تھا جس کی تعزیت کے لئے ماموں جان جیسی مصروف ترین شخصیت کا آنا میرے حاشیہ خیال میں بھی نہ تھا، پھر تعزیت کا سلسلہ والدین اور خاندان کے بڑوں کے ہاں جاری تھا لیکن مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ آپ کی آمد خاص مجھے تسلی دینے کے لئے ہے۔ ''فرمایا: بھانجے! وہ نومولود تیرے لئے آخرت کا ذخیرہ بن گیا، کل قیامت میں تیرے لئے اللہ تعالیٰ سے جھگڑا کرے گا، انسان کا بہترین سرمایہ وہی ہے، جو اسے آخرت کی سختیوں میں کام دے۔ میں انتہائی کوتاہ عمل ہوں، اپنے دامن میں ایسا کوئی عمل نہیں پاتا جس پر اللہ تعالیٰ کے حضور بخشش کی اُمید رکھ سکوں، تاہم میرا بھی ایک چھوٹا بیٹا 'محمود' اللہ تعالیٰ کے ہاں پہنچ چکا ہے، مجھے اُمید ہے کہ وہ میرے لئے مغفرت کا ذریعہ بن جائے گا۔'' اس گفتگو میں ماموں جان نے مجھے تسلی دینے کے ساتھ یہ عجیب نکتہ بھی سمجھا دیا کہ اگر اتنا بڑا عالم اور متقی بزرگ اپنے دامن کو کسی ایسے عمل سے خالی پاتا ہے جو مغفرت کا سبب بن سکے تو ہم کیونکر اپنے اعمال پر مطمئن ہو کر بیٹھ سکتے ہیں۔

ماموں جان کی ایک نمایاں خصوصیت دوسروں کو راحت دینا اور ان کے کام آنا تھا، ایک بار میں آپ کے ساتھ پشاور گیا ہوا تھا، قصہ خوانی بازار کی ایک مسجد میں نماز ادا کرنے کے بعد نکلے تو میرے جوتے غائب تھے۔ میں پریشانی میں ادھر اُدھر تلاش کر رہا تھا کہ ماموں جان بھی آگئے۔ فرمایا: بھانجے! خیریت ہے؟ میں نے عرض کیا: ماموں! جوتے کھو گئے ہیں، فرمایا: میں ادھر دیکھتا ہوں، آپ ذرا دوسری طرف تلاش کریں۔ غرض مجھے دوسری طرف مصروف کر کے آپ آہستہ سے مجھے احساس دلائے بغیر مسجد سے نکلے۔ میں ابھی جوتے ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ

آپ جوتوں کا نیا عمدہ جوڑا ہاتھ میں لئے باہر سے تشریف لائے اور میرے سامنے رکھ کر فرمایا: بھانجے! اسے پہن لیں۔ اس واقعہ پر میں گھنٹوں حیران سوچتا رہا کہ آخر مجھے خود بھی تو باہر بازار بھیج سکتے تھے اور بھی کئی صورتیں ہو سکتی تھیں لیکن خود جا کر جوتے خرید لانا اور پھر ایک عام دنیا دار آدمی کے سامنے اپنے ہاتھوں سے کھول کر رکھنا، تواضع، عاجزی اور انکساری کی ایسی مثال تھی کہ کم از کم میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی۔

ماموں جان کی صلہ رحمی اور پڑوسیوں کا خیال بھی ہمارے لئے سبق آموز تھا، جب کوئی خاندانی معاملہ درپیش ہوتا تو باوجود اس کے کہ آپ کا فیصلہ حرف آخر تصور کیا جاتا، آپ سارے خاندان کو جمع کرتے، حتیٰ کہ مجھ جیسے کمترین اور کم عمر کو بھی بلا لیتے۔ چھوٹے سے چھوٹے آدمی کو بھی اہمیت دیتے تھے اور ہر ایک سے اس کی رائے بالتفصیل سنتے، جب فیصلہ فرماتے تو کوئی حاکمانہ انداز نہ ہوتا تھا، بلکہ بڑی عاجزی سے سب کی آرا کو سراہتے تھے، چاہے وہ کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہوں۔ آخر میں فرماتے کہ اگر اس طرح یہ کام ہو جائے تو آپ حضرات کا کیا خیال ہے؟ یہ آپ کی اپنی رائے ہوتی تھی، دیکھئے! کتنی عمدہ تعبیر اختیار کرتے، آپ کی بات اتنی وزنی ہوتی تھی کہ کون اس کا انکار کر سکتا تھا لیکن دوسرے پر جتلانے یا مسلط کرنے کا انداز کبھی اختیار نہیں کرتے تھے۔ آپ کے اسی طرز نے ہمارے خاندان کو عمر بھر جوڑے رکھا اور کبھی کوئی بڑی دراڑ یا اختلاف پیدا نہیں ہوا۔

ایک بار سردیوں کی راتیں تھیں، ماموں جان کے پڑوسی حاجی نور اکبر کی اہلیہ کے انتقال کی خبر ملی، ان کا گھر تقریباً ایک کلومیٹر دور تھا، ہمارے ہاں چونکہ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر ایک خاندان مل کر آباد ہوتا ہے، اس لئے پڑوس کا دائرہ بھی وسیع ہوتا ہے، اس سردی اور اندھیرے میں آپ بارہ بجے ہی ان کے حجرے میں تشریف لے گئے اور ان کی تسلی کے لئے قرآن وحدیث کی روشنی میں دنیا کی زندگی کی بے ثباتی، اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا شوق مصائب و آلام پر صبر کی فضیلت اور آخرت کے دار البقا اور اصلی گھر ہونے کو کھول کر بیان کیا، حتیٰ کہ حاضرین اس غم کے موقع پر یاد خدا سے سرشار ہو گئے۔ آپ کئی گھنٹے ان کی تسلی کے لئے وہاں رہے اور رات قریباً ساڑھے تین بجے وہاں سے واپسی فرمائی۔ یہ معاملہ آپ کا ہر پڑوسی کے ساتھ تھا کہ اس کی غمی خوشی کی خبر پاتے ہی تشریف لے جاتے اور حسب موقع ترغیب وتسلی کے کلمات ارشاد فرماتے۔

ماموں جان کو اللہ تعالیٰ نے مخلوق سے استغنا اور سخاوت و وسعت ظرفی کی دولت خوب عطا فرمائی تھی، ایک بار میرے ایک دوست کسی مسئلے کے لئے تعویذ لینے ماموں کے پاس آئے، میں بھی حاضر تھا، ماموں نے تعویذ لکھ کر دے دیا، میرے دوست سے یہ غلطی ہوئی کہ اس موقع پر آپ کو ہدیہ میں کچھ رقم دینی چاہی، اس پر سخت غصہ ہوئے اور ناراضگی کا اظہار فرمایا کیونکہ آپ نے علاقہ میں جعلی تعویذ گروں سے لوگوں کو محفوظ رکھنے کے لئے مجبوراً دم تعویذ کا

کام شروع کیا تھا، آپ فرماتے کہ یہ کوئی پیشہ نہیں ،جس پر پیسے کمائے جائیں ، بلکہ مخلوق خدا کی خدمت کی نیت سے جس قدر ہو سکے، اللہ تعالیٰ سے فضل کی اُمید رکھتے ہوئے کر لینا چاہیے،تعویذوں اور دموں پر پیسے لینا سخت ناگوار تھا ۔میرے دوست نے عرض کیا کہ حضرت! میں تعویذ کا معاوضہ نہیں دینا چاہتا، یہ تو میں نے ہدیہ کی نیت سے لائے تھے، اگر تعویذ نہ بھی ملتا تو تب بھی میں نے پیش کرنے تھے۔آپ نے فرمایا کہ یہ موقع ہدیہ دینے کا نہیں ہوتا، جب اپنی ضروت سے آیا کریں تو ہدیہ ہرگز نہ لایا کریں، میں ایسے وقت میں قبول کرنے سے معذور ہوتا ہوں، اس سے آپ کی دل شکنی بھی ہوتی ہے لیکن یہ میرے اُصول کے خلاف ہے۔

سخاوت کا یہ عالم تھا کہ جب میرے بڑے بھائی سعودیہ جاتے تو آپ ضرور پشاور تک گاڑی میں ساتھ تشریف لے جاتے اور راستہ کے سارے اخراجات خود برداشت کرتے۔اسی طرح جب آپ مولانا فضل محمد سواتی صاحبؒ کے ہاں سوات جاتے تو ہم سارے نوجوان بھی گھومنے پھرنے کے شوق میں ساتھ ہوجاتے۔حضرت ہمارے لئے فلائنگ کوچ کا انتظام کرتے،سارے راستے میں کھانے پینے کے اخراجات خود اُٹھاتے،ہمارے مزاج اور طبیعت کا پورا خیال رکھتے،ہم سارے راستے میں گپ شپ،ہنسی مذاق اور کھیلتے کودتے جاتے،لیکن کبھی اسے محسوس نہیں فرمایا اور نہ ہی ہمیں روکا، بلکہ جائز حدود میں تفریح کی کھلی اجازت دی۔

آپ کا معمول تھا کہ عید کے موقع پر ہماری والدہ' جو آپ کی بڑی بہن تھیں' کے لئے کپڑے جوتے اور نقدی ضرور لاکر پیش کرتے۔سال بھر مختلف مواقع پر ہدایا اور نقد رقم دینے کا معمول تھا،حالانکہ خود غریب آدمی تھے، کسمپرسی کی زندگی تھی،لیکن سخاوت اتنی تھی کہ ہم حیران رہ جاتے۔آپ کی زندگی سے بندہ نے یہ سبق اخذ کیا کہ سخاوت مال کی محتاج نہیں، یہ ایک خوبی ہے، جسے اللہ تعالیٰ عطا کردے وہ غربی میں بھی دل کھول کر لوگوں پر خرچ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے غیبی خزانوں سے اُس کا بندوبست فرماتے رہتے ہیں۔

میرے کالج کے ساتھی میرے ساتھ آتے تو اکثر اوقات پینٹ شرٹ میں ہوتے یا داڑھی منڈے ہوتے،لیکن اُن کے ساتھ ملتے جلتے کبھی ایسا طرز اور رویہ اختیار نہیں فرمایا کہ تحقیر یا نظر انداز کرنے کا پہلو نمایاں ہو، بلکہ اُنہیں پوری توجہ دیتے اور دیگر مہمانوں کی طرح اُن کا بھی خوب اکرام فرماتے۔ایک دفعہ فرانسیسی میڈیا کے کچھ اہل کار آئے تھے، اُن فرانسیسیوں سے آپ کا رویہ اتنا مشفقانہ اور کریمانہ تھا کہ یہ تاثر ہی نہیں مل رہا تھا کہ یہ غیر مسلم ہیں ، بلکہ اُن کی خوب ضیافت کی،اچھی طرح ملے،بٹھلایا اور اُن کی باتوں کے جوابات دیتے رہے۔آخر میں اُنہوں نے ترجمان کے ذریعے اس بات کا اعتراف کیا کہ آپ کا ہمارے ساتھ جو رویہ اور اکرام کا معاملہ رہا، یہ ہمیں بہت کم جگہوں پر دیکھنے کو ملا ہے، یہاں ہم نے یوں محسوس کیا جیسے ہم ایک قدیم دوست کے ہاں آئے ہوں اور یہ ہماری اپنی

جگہ ہو۔ بعد میں اُنہوں نے مدرسے کے مختلف شعبہ جات کا دورہ کیا اور بہت ہی متأثر ہو کر لوٹے۔

ماموں جان کا دستر خوان صبح وشام مہمانوں سے آباد رہتا، آپ کے دستر خوان پر میں نے ایسے ایسے پھل کھائے ہیں جن کو نہ میں نے پہلے دیکھا تھا، نہ اُن کا نام آتا تھا اور نہ ہی ہمارے صوبے میں وہ ملتے تھے، بلکہ آج تک میری معلومات کے مطابق ہمارے ملک میں بھی شاید وہ نہ ملتے ہوں، پتہ نہیں کہ آپ کے ہاں کہاں سے آجاتے، کبھی کبھی مجھے یہ گمان ہوتا کہ ماموں کے پاس یہ چیزیں جنات لاتے ہوں گے۔ دستر خوان خود بچھاتے، مہمانوں کے ہاتھ دھلواتے اور اپنے ہاتھ سے کھلاتے، دستر خوان پر اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ مؤقر میزبان اور اتنے اُونچے درجہ کے عالم ہیں یا ایک عام خادم۔

میرا ایک تجربہ یہ بھی ہے کہ دینی معاملات تو درکنار اگر دُنیاوی معاملات میں بھی ہم نے ماموں جان کی بات ماننے میں کسی قسم کی غفلت کی ہے تو اُس کا سخت نقصان اُٹھایا ہے۔ ایک بار ہمارے بھائیوں کے مابین گھروں کی تقسیم کا معاملہ تھا، ماموں جانؒ نے مشاورت کے بعد فیصلہ کیا کہ اس طرح تقسیم ہونی چاہیے۔ افسوس کہ میرے والد صاحب نے اس فیصلہ پر توجہ نہیں دی اور اُسے ماننے میں ٹال مٹول سے کام لیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ یہ ٹھیک نہیں ہو رہا اور پھر میرا خدشہ اُس وقت درست ثابت ہوا جب ماموں کے فیصلہ کے خلاف کرنے میں ہمارے خاندان کو شدید مشکلات اور بڑے نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ وہی معاملہ اتنا بگڑا کہ ناقابل تلافی نقصانات سامنے آئے، جب اس کے حل پر از سر نو سوچا جانے لگا تو وہی قابل عمل حل تھا جو ابتدا میں ماموں جان نے تجویز کیا تھا۔

جب ہمارے خطے کے حالات خراب سے خراب تر ہونے لگے تو ماموں جان اس پر انتہائی رنجیدہ تھے، ایک رمضان میں دوران اعتکاف افطاری کے وقت ہم ماموں کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی شخص نے آکر یہ خبر دی کہ فلاں علاقے میں دو پولیس والوں کو کسی نے ذبح کیا ہے اور ان میں سے ایک کے جیب میں مسواک و تسبیح تھی اور وہ حافظ قرآن تھا۔ اس پر ماموں کی طبیعت اتنی سخت خراب ہوئی کہ رو پڑے۔ قاتلوں کے لئے عین وقت افطاری میں منہ سے سخت بددعا کے کلمات نکلے۔ اُس دن رنج کی وجہ سے آپ نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ آپ نے ان حالات میں مثبت کردار ادا کرنے کی بھی بھرپور کوشش کی، لیکن ظالموں کو آپ کی یہ کاوشیں کب پسند تھیں، وہ تو پاکستان کو جلتا اور اجڑتا دیکھنے کے لئے ان امن پسند علما کو راستے کی دیوار سمجھتے تھے اور انہیں راستے سے ہٹانا اپنا مشن بنا چکے تھے۔ آپ کو بدنام کرنے کے لئے ایک عرصہ تک شاہو خیل کے آس پاس علاقوں میں بوری بند لاشیں پھینکنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس پر یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ چونکہ اس علاقہ میں آپ کا کامل اثر ورسوخ ہے اور آپ کے اشارہ کے بغیر پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا، اس لئے یہ سب کچھ آپ کے اشاروں پر ہو رہا ہے۔ حالانکہ ہم روزانہ ساتھ بیٹھنے والے اور

خدمت کرنے والے تھے، ہمیں خوب علم تھا کہ آپ ان تمام کاموں پر سخت کڑھتے تھے اور اس بدامنی کو ملک کے خلاف سازش قرار دیتے تھے۔

ایک دفعہ میرے ایک صحافی دوست نے مجھے کہا کہ حضرت کے خلاف بہت زیادہ پروپیگنڈا کی کوشش کی جارہی ہے اور افسران بالا تک غلط اطلاعات پہنچائی جارہی ہیں، حضرت سے کہہ دیں کہ ایک پریس کانفرنس بلالیں، ہم حضرت کا موقف میڈیا پر لاکر ان غلط پروپیگنڈوں کا توڑ کرنا چاہتے ہیں اور واقعی صورتحال سامنے لانا چاہتے ہیں۔ میں ماموں جان کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ حضرت! باہر اس طرح لوگ غلط باتیں پھیلا رہے ہیں کہ اس قتل وغارت میں آپ کا ہاتھ ہے۔ آپ اپنی صفائی میں بیان جاری کردیں۔ تو آپ نے فرمایا: بھانجے! اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ میرے ہاتھ تو کیا میرا دل بھی اس قسم کے خیالات سے پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ قلوب کا مالک ہے کل قیامت میں فیصلہ ہوجائے گا، میں اپنی ذات کی صفائیاں نہیں دے سکتا، نہ ہی صفائیاں دینے کا طریقہ کار مجھے اچھا لگتا ہے۔ باقی رہا غلط پروپیگنڈا، تو اس سے تو انبیاء کرام علیہم السلام، صحابہ کرامؓ اور اسلاف اُمت جیسی مقدس ہستیاں بھی نہیں بچ سکیں، لوگوں نے اُن کے خلاف بھی پروپیگنڈا کیا، بعض کے بارے میں وہ پروپیگنڈے تاریخ کا بھی حصہ بنے، انبیا کے ورثا پر بھی یہ حالات یقیناً آئے ہیں، اس لئے ان سے نہیں گھبرانا چاہیے، بہرحال آپ کسی طرح رضامند نہ ہوئے۔ اس کے چند ہی دن بعد آپ کو ظلماً شہید کردیا گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

ماموں جان کی شہادت ہمارے خاندان کے لئے ایک عظیم ترین سانحہ تھا، آپ کے جانے کے بعد اندازہ ہوا کہ آپ کی شخصیت ہمارے لئے حوادث زمانہ سے کتنی بڑی آڑ تھی، اللہ تعالیٰ آپ کو کروٹ کروٹ راحتیں نصیب فرمائے اور ہمیں آپ کی برکات سے محروم نہ فرمائے۔ (آمین ثم آمین)

والد گرامی کے نام چچا جان کے خطوط

چند اہم شذرات

مولانا ضیاء الدین

بھائیوں کے مابین محبت اور خلوص ایک فطری امر ہے۔ چچا جان حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ اور والد گرامی حاجی عین الدین صاحب مدظلہم کی باہمی محبت اور خلوص دیکھنے والے اب بھی سینکڑوں ہیں۔ چچا جان چھوٹی عمر میں طلب علم کے لیے گھر سے مسافر ہو گئے۔ جب فراق، دوری، غربت ومسافرت میں ایک دوسرے کی یاد آتی تو بے ساختہ قلم وکاغذ کا سہارا لیا جاتا اور خط کے ذریعے ملاقات کی تشنگی کا سامان کیا جاتا۔ والد صاحب کے نام چچا جان کے خطوط کی تعداد سینکڑوں میں تھی، جن میں گھریلو امور کے مشوروں سے لے کر قومی وبین الاقوامی مسائل تک زیر بحث آئے، لیکن افسوس کہ ان خطوط کا ایک بڑا حصہ ۱۹۹۰ء میں والد صاحب سے ایک ناگہانی حادثہ میں ضائع ہو گیا، گھر میں دستیاب خطوط میں اکثر حصہ نجی اور خاندانی امور ومسائل سے متعلق ہے، تاہم جو اہم باتیں ان میں ملیں، انہیں مرتب کیا گیا، شاید کوئی پہلو قارئین کے لئے کارآمد ہو۔

تحریک ختم نبوت: حضرت کی سیاسی بصیرت

۷۴ء کے ختم نبوت کی تحریک میں ہر مؤمن کا جذبہ ایمان دیدنی تھا، اس وقت اورکزئی ایجنسی سے منتخب بعض سیاسی نمائندے قادیانیت کے خلاف آواز اٹھانے میں لیت ولعل سے کام لے رہے تھے، چچا جان نے والد گرامی کو اس حوالے سے علاقہ کے علما کے نام ایک اہم پیغام لکھا:

> ''باقی قادیانیوں کے خلاف تحریک جاری ہے، اسمبلی کی کارروائی کی جو تفصیلات اب تک سامنے آئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ نعمت اللہ شنواری اور ملک جہانگیر نے حزب اختلاف کے قرارداد پر دستخط کیے تھے لیکن کرم (ایجنسی) کے صالح خان اور ہمارے جمالدار کا ذکر نہیں تھا، اس سلسلے میں مولانا معین خان صاحب کو میرا سلام پہنچائیں اور پھر بتائیں کہ تیراہ کے علما کے ساتھ اس سلسلہ میں صلاح مشورہ کر لیں، اس تحریک میں

حصہ لینا ہر مسلمان کا فرض ہے ، جمالدار کو عوامی اور قومی طاقت کے ذریعے سے مجبور کریں کہ وہ کھل کر قادیانیت کے خلاف آواز اٹھائیں اور اگر وزارت راستہ میں حائل ہے تو استعفیٰ دیں ، ورنہ کم از کم تیراہ میں اس کے مکان کی اینٹ سے اینٹ بجادیں ۔ حکومت نہایت منافقانہ رویہ اختیار کیے ہوئے ہے ، ایک طرف امریکہ وغیرہ کا دباؤ ہے دوسری طرف عوام کے جذبات ہیں ، جہاں تک میرا خیال ہے حکومت اپنے روایتی جھوٹ اور فریب پر مبنی پالیسی سے کام لے کر عوامی جذبات کو مختلف حیلوں بہانوں سے سرد کرنے کی کوشش میں ہے ، اگر یہ پالیسی ان کی ناکام ہوئی تو شیعہ سنی ، بریلوی دیوبندی اختلافات کو فروغ دے کر انتشار پیدا کرنے کی کوشش کرے گی ، اگر یہ حربہ بھی ناکام رہا تو پھر فوج اور پولیس کی طاقت سے کام لے گی لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل عمیم اور رحمت واسعہ سے توقع ہے کہ وہ اپنے پیارے حبیب سید الاولین والآخرین خاتم الانبیاء والمرسلین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی کے صدقے دشمن کے منصوبے خاک میں ملا دے گا ۔

انه علی کل شیء قدیر''

کثرت مال کا خطرناک نتیجہ

ایک قریبی رشتہ دار کراچی گئے لیکن حضرت الاستاذؒ سے ملنا گوارا نہ کیا ، وجہ یہ تھی کہ وہ بے چارے مال ودولت ملنے پر اپنے قریب ترین خصوصاً غریب رشتہ داروں سے ذرا بے نیاز سے ہو گئے تھے ، چچا جان نے اس حوالے سے والد صاحب کے نام گلہ کا ایک خط لکھا ، جس میں کئی پہلو ہمارے لیے بصیرت افروز ہیں :

''البتہ .... بزرگوار کے کراچی آنے پر ملال ہوا ، کم از کم اسے ایک بار تو آنا چاہیے تھا ، لیکن یہ میری کوتاہ فہمی ہے اور بھول ہے ، دنیادار سے چاہے بھائی ہی کیوں نہ ہو الفت اور مروت کی توقع عبث ہے خصوصاً ایسے آدمی کے ساتھ جس سے دنیوی غرض وابستہ نہ ہو ، میں ایک فقیر ہوں اور وہ مجھ سے ملنے کا خواہاں ہو تو کیسے ہو جبکہ ان کا قبلۂ سفر الگ ہے اور میرا الگ ، افغانوں کے درویش مفکر عبدالرحمن بابا رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ مسئلہ بہت پہلے حل کیا تھا لیکن افسوس ہے کہ ہم اپنے اکابر کی تعلیمات سے یا تو جاہل ہیں یا پھر غافل ، انہوں نے اپنے بھائی عزیز خان سے کبیدہ خاطر ہو کر فرمایا تھا :

نشی ملنگانو د خانانو سره کلي

چرته عزیزخان چرته ملنگ عبدالرحمن

یقین کیجئے کہ آپ دکان کے حساب کتاب کی اطلاع جب دیتے ہیں تو دعا کرنے لگتا ہوں لیکن معاً یہ خیال آتا ہے کہ اگر برادر مکرم عین الدین صاحب بھی مالدار ہو گئے تو کہیں وہ بھی اپنی نظر عنایت سے محروم نہ کر دے اس لئے کہ ہر چیز کی ایک طبعی تاثیر اور خاصیت ہوتی ہے ، کثرت مال اور فراوانی اسباب کا لازمہ ہے کہ انسان غربا

[کو] نظرِ حقارت سے دیکھنے لگتا ہے اور حقوق اللہ اور حقوق العباد سے سرتابی اختیار کرلیتا ہے، ارشاد ہے: "کلا ان الانسان لیطغی أن راہ استغنی" اور فرمایا: "ولو بسط اللہ الرزق لعبادہ لبغوا فی الارض" اس قسم کے کلیات اور عام قوانین سے مستثنیات بھی ہوتے ہیں لیکن شاذ ونادر۔"

نیز ایک دوسرے خط میں بعض رشتہ داروں کی بے جا تعمیرات پر تنبیہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"میرے عزیز بھائی! مالداری اور سرمایہ داری کا یہ لازمی نتیجہ ہے، ان .... کے پیٹ چونکہ بھر گئے ہیں، اب اس قسم کے فضول کاموں میں الجھ کر شاید ہضم کرنا چاہتے ہیں، ورنہ موجودہ مکانات ہمارے لئے تو کیا کم از کم ہماری ایک نسل کے لیے کافی ہیں، میرے علیم وحکیم پروردگار نے سچ ارشاد فرمایا: ولو بسط الرزق لعبادہ لبغوا فی الارض، اور بالکل بجا فرمایا: "ان الانسان لیطغی ان راہ استغنی" دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں شرِ نفس اور شرِ شیطان سے محفوظ رکھے۔"

دنیا کی خاطر بیرون ملک سفر پر ناپسندیدگی کا اظہار

چند رشتہ داروں کا سعودیہ کام کاج کے لیے جانے پر اظہار ناپسندیدگی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"......... صاحب کے بارے میں آپ نے تو کچھ بتلایا نہیں، عزیزم .... خان کے خط سے اور آج ملک صاحب کے زبانی معلوم ہوا کہ انہوں نے سعودی عرب کا ویزہ حاصل کیا، غالباً ..... خان نے نو ہزار کا لکھا تھا، خدا کرے کہ ان حضرات کی یہ حرکات باعث خیر ہوں، سعودی عرب جانا آج بہت آسان ہے، نو ہزار تو کیا مفت میں لوگ جاتے ہیں، ہمارے شیخ مولانا بنوری دامت برکاتہم کو سعودی سفیر نے ایک ملاقات میں بتلایا کہ سعودی گورنمنٹ کو آٹھ لاکھ افراد کی ضرورت ہے اور ہم پاکستانی کو ترجیح دیتے ہیں، پاکستانی نہ ہو تو دوسرے ممالک کے لوگ بلاتے ہیں، لیکن کام بہرحال مزدوری کا ہے، جو صاحب کے بس کا نہیں، شکر ہے کہ آپ کو اور اس فقیر کو اپنے صوابدید کے مطابق اللہ تعالیٰ نے صحیح مشورہ دینے کی توفیق دی، منوانا بندہ کی اختیار کی بات نہیں، منوانے کی قوت تو صرف ذات حق ہی کو حاصل ہے: "انک لاتھدی من احببت ولکن اللہ یھدی من یشاء" پھر مقدرات الٰہیہ کو ٹالنے والا کوئی نہیں، تقدیر کا تدبیر پر غالب رہنا ایک بدیہی حقیقت ہے۔"

ایک اور خط میں رقم طراز ہے:

"آپ کے قطر جانے کے ارادے کو منسوخ کرنے پر خوشی ہوئی، تاہم .... خان کے بھیجنے پر تشویش ہے، مگر اس کا کام آپ اور میرے دائرۂ اختیار سے باہر ہے، لوگوں کا اللہ تعالیٰ کے رازقیت پر ایمان یا تو رہا نہیں یا بالکل کمزور ہو چکا ہے، اس قسم کے سفر پر وہ لوگ بچے بھیجتے ہیں جن کا وطن پر کوئی کاروبار نہ ہو، بہرحال ہر شخص مرضی کا مالک ہے۔" [اقتباس از مورخہ ۲ ستمبر ۱۹۷۲ء]

کتابیں خریدنے کا شوق

چچا جان کو نایاب اور اہم کتابیں خریدنے کا جنون کی حد تک شوق تھا، والد صاحب کے نام مختلف خطوط کے یہ شذرات اسی شوق کا آئینہ دار ہیں:

''پشاور میں ایک کتاب جو قرآن کریم کا بہترین انڈیکس ہے، ہاتھ آئی، خرید کر یعقوب خان کے حوالے کی ہے، اس کتاب کی مدد سے قرآن مجید کا ایک لفظ مثلاً ''ظلم'' جہاں جہاں استعمال ہوا ہے ایک منٹ میں معلوم کر سکتے ہیں، بڑی کام کی چیز ہے، ۱۵۰ روپیہ پر لے لی، غالباً مہنگی نہیں ہوگی۔''

''کتابوں کے خریدنے کا شوق میرے لئے مرض بن گیا ہے، تقریباً ساڑھے تین سو روپیہ کی کتابیں خرید چکا ہوں، دعا فرمایئے۔'' [اقتباس از خط مورخہ ۴ رمحرم الحرام ۱۳۹۳ھ]

''ہاں ایک کام ضرور کر چکا ہوں معلوم ہو کر شاید آپ کو خوشی ہوگی وہ یہ کہ ایک انتہائی اہم کتاب فتح القدیر شرح الہدایہ ۷۰۰ روپے میں خرید چکا ہوں، دو ڈھائی سو روپیہ کی کچھ اور کتابیں لے لی ہیں۔'' [اقتباس از خط مورخہ ۴ رجون ۱۹۷۶ء]

'' ...... صاحب چند دن پہلے تشریف لائے تھے، انہوں نے گھر رقم بھیجنے کی نصیحت کی اور گھر سے آتے وقت جناب ...... صاحب نے بھی فرمایا کہ آپ ہم سے امداد کی توقع نہ رکھیں بلکہ کتابیں خریدنا بند کریں اور گھر کے اخراجات کیلئے کچھ امداد بھیجا کریں۔ او کما قال۔ مجھے اس ذہنیت پر شدید افسوس ہوتا ہے مگر کیا کیا جائے اور کیا کہا جائے، فصبر جمیل، اگر کتابوں کا خیال مجھے نہ ہوتا تو آپ یقین کیجئے مدرسہ سے ڈیڑھ سو سے زائد ایک روپیہ بھی شاید نہ لیتا، کیونکہ کراچی میں میرے ذاتی اخراجات کیلئے ڈیڑھ سو کی رقم کافی ہے۔ اس سے زائد میرے لئے حرام ہوتا اور پچاس روپیہ گھر کیلئے گزارہ الاؤنس کا حضرت مولانا سے مطالبہ کرتا اور بس۔''

مسافرت کی وجہ

سفر میں قریبی رشتہ داروں کی یاد اکثر ستاتی ہے، حضرت بھی اس مرحلے سے گزرے، لیکن آپ کا سفر عظیم مقصد کے پیش نظر تھا، ایک خط میں اپنی مسافرت کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مجھے خود بھی سب سے بڑھ کر چچا صاحب اور آنجناب جیسے مایۂ فخر بزرگان عظام اور مشفقان کرام کی دید کا شدید اشتیاق ہے مگر ایک عظیم مقصد نے سفر پر مجبور کیا۔ میرے عزیز بھائی! شاید بعض لوگ سوچتے ہوں گے کہ ملا صاحب کو کراچی میں جسمانی راحت میسر ہے یا چند ٹکے ملتے ہیں یا سنگدل ہے، اس لئے اس قدر طویل سفر کر رہا ہے۔ کاش! یہ لوگ دل ناتواں کے وہ گہرے زخم بچشم سر یا بدیدۂ دل دیکھ لیتے جو فراق و ہجران کے ہاتھوں فقیر کو سہنے پڑ رہے ہیں۔''

گھریلو امور کے لیے ہدایات

حضرت الاستاذؒ والد صاحب کو تمام اہم گھریلو معاملات میں مکمل ہدایات اور مشوروں سے نوازتے ، والد صاحب بھی کوئی کام ان کے مشورے کے بغیر نہ کرتے ،اس کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

''آپ کے خط سے کنویں کے پکا ہونے کا علم ہوا لیکن میری خواہش تو یہ ہے کہ کام تسلی بخش اور پورا ہونا چاہیے یعنی پورا کا پورا پکا کر دیتے تو اچھا ہوتا ، بالٹی کے ادھر ادھر لگنے سے نیز دوسرے اسباب کی وجہ سے مٹی وغیرہ چیزیں پانی میں گرتی ہیں اور اس سے گدلا کر دیتی ہیں ،کیا ہی اچھا ہو کہ صاف ستھرا پانی نکلتا جائے ، اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہیں ، پیسہ کا خیال نہ کریں ، ایسے کاموں کیلئے غائبانہ انتظام ہوتا رہتا ہے بس خلوص شرط ہے ، للّٰہیت ہونی چاہیے۔ مستقبل قریب میں یا پھر آتے وقت ان شاء اللہ تعالیٰ میں کچھ اور رقم مہیا کر دوں گا ، مسجد کے برآمدے اور چار دیواری اور اس سے بھی زیادہ غسل خانوں ، استنجا خانوں اور وضو خانوں کے بنانے کی ضرورت ہے ، حجرہ کی بات بھی ضروری ہے ، لیکن جو کام شروع ہوا ہے وہ ایک حد تک پہنچ جائے تو بہتر رہے گا۔ مسجد کے فرش وغیرہ کا انتظام اگر مؤخر ہو جائے تو بری بات نہیں لیکن چار دیواری اور مذکورہ بالا چیزوں کا بننا زیادہ ضروری ہے ، حجرہ کے بارے میں میری شخصی رائے یہ بھی ہے کہ اگر سیمنٹ کا صاف ستھرا بن جائے تو اچھا رہے گا ، پھر بنانے اور ڈھانے کی ضرورت شاید پیش نہیں آئے گی۔''

بڑے بھائی کی خاطر داری

حضرت الاستاذؒ باوجود علمی وتحقیقی مصروفیات کے اپنے بھائیوں کا کاروبار وغیرہ میں حتی الوسع تعاون کرتے ، آپ کے بڑے بھائی حاجی مسلم الدین صاحب اکثر کراچی سے گاڑیوں کے فریم منگواتے ، یہ ساری بھاگ دوڑ حضرت ہی کرتے ، لیکن بعض اوقات مارکیٹ کے ماحول سے نامانوسی کے باعث دقت ہوتی ، ایک خط میں لکھتے ہیں:

''فریم کے بارے میں بھائی صاحب کی فرمائش کے مطابق پہلے ایک خط میں پوری تفصیلات لکھ چکا ہوں ، ملا ہوگا ، مجھے ایک تو فرصت نہیں ہے ، پھر ہر ماحول کے اپنے لوگ ہوتے ہیں ، آپ کو بخوبی علم ہے کہ تہذیب و شرافت آج عنقا ہے ، ڈیلروں اور کمپنی والوں کے پاس مجھ جیسا فقیر جب جاتا ہے جب کہ اس کی جیب میں رکشہ کا کرایہ بمشکل ہوتا ہے تو وہ لوگ مزاح اڑاتے ہیں ، اس لئے بجائے خود جانے کے برادر نمر گل کو دو دفعہ جانے کی تکلیف دی۔''

حضرت بنوری کی پرخلوص خدمت

ہمارے علاقے میں چار پائیوں کے لیے عمدہ 'بان' ملتا ہے ، حضرت بنوری قدس سرہ بھی حضرت الاستاذؒ سے بان

منگوانے کا فرماتے اور یہ خدمت عموماً والد صاحب کے سپرد ہوتی، ایک بار بان کچھ اچھا نہ تھا، اس پر والد صاحب کو تنبیہ کرتے ہوئے لکھا:

''باقی 'بان' آپ نے اچھا کیا کہ بھیج دیا، لیکن افسوس ہے کہ جیسے بھیجنا چاہیے تھا ویسا نہیں ہے، اب آ جانے کے بعد تو دوسری صورت جو آپ نے لکھی ممکن ہی نہیں اس لئے کہ حضرت مولانا دامت برکاتہم سراپا مروت اور شرم وحیا ہیں، وہ اس سے بھی اگر گھٹیا درجے کا ہوتا تب بھی مسترد نہیں فرماتے۔ حضرت نے پہلے سے مجھے بتلایا تھا کہ اس کی رقم لینا پہلی شرط ہے، سو روپے دیئے ہیں فی الوقت تو لے لیے ہیں، پھر کسی مناسب موقع پر واپس کرنے کی کوشش کروں گا۔''

ایک اور خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت شیخ کا بان اگر بھائی صاحب پہنچا دیتے تو اس کی سعادت ہوتی، حضرت کی خدمت کیلئے تو بڑے بڑے لوگ ترستے ہیں، حتی کہ وزیر وسفیر بھی، یہ تو حضرت حق جل مجدہ کا احسان ہے کہ ہمیں یہ اعزاز نصیب فرمایا۔ کاش! بھائی کو اس کا احساس ہوتا، غالباً مینہ خان اور نور اکبر آنے والے ہوں گے، نور اکبر کے نام ایک خط اسی لفافہ میں رکھ کر بھیج رہا ہوں، انہی کے ہاتھوں بان بھیج دیں تو اچھا ہوگا۔''

حضرت بنوری کے فراق پر اظہار غم

حضرت بنوری قدس سرہ کے انتقال پرملال پر لکھتے ہیں:

''بعد وعرض اینکہ چند دن پہلے ایک تالۂ غم روانہ کر چکا ہوں اور عرض کر چکا ہوں کہ حضرت والا کے ارتحال سے کمر ہمت ٹوٹ گئی ہے اور تو اور خط لکھنے کے بھی قابل نہیں رہا، قلم اٹھانے کیلئے بار با سوچتا ہوں، اور قلم اٹھانے کے بعد پھر کچھ لکھنے کیلئے دوبارہ بار بار سوچنے کی ضرورت پڑتی ہے، اس لئے شدید ضرورت نہ ہو تو خطوط کا سلسلہ رکا ہی رہتا ہے، برادرم حاجی مسلم الدین صاحب گزشتہ بدھ کے دن یہاں پہنچے تھے، اچھا ہوا تھا حضرت کے صاحبزادے سے تعزیت کا اظہار کیا اور حضرت الشیخ نور اللہ تعالیٰ مرقدہم کے مزار اقدس پر حاضری دی۔ حضرت الاستاذ رحمہم اللہ تعالیٰ کے فراق کا درد روز افزوں ہے، سوچتا ہوں تو کچھ نہ کچھ تسلی اس بات سے ہوتی ہے کہ یار پہلو میں اگر نہیں تو غم یار بھی غنیمت، اللہ تعالیٰ ہمیں صالحین کی صحیح محبت اور اتباع نصیب فرمائے۔''

بینک کے سود کا مسئلہ

والد صاحب اہل علاقہ کو درپیش بعض دینی مسائل حضرت الاستاذؒ سے دریافت فرماتے، اسی طرح کے ایک مسئلہ کا جواب لکھتے ہیں:

''بینک کے سود کے بارے میں ہمارے اکابر دیوبند کی رائے یہ ہے کہ بینک کے لیے نہ چھوڑے اس لئے کہ اس سے سود خور کے ساتھ مالی تعاون لازم آتا ہے، وصول کر کے فقراکو دیدے لیکن نیت صدقہ، خیرات اور ثواب کی نہ کرے ورنہ گناہ گیا بلکہ بقول بعض کفر لازم آئے گا، اس لئے کہ یہ حرام مال ہے اور حرام مال کا صدقہ جائز نہیں، نہ اس پر ثواب مل سکتا ہے۔ ان اللہ طیب لا یقبل الا الطیب اور ولا صدقة من غلول وغیرہ حدیثیں اس پر دال ہیں، قرآن مجید نے بھی فرمایا: وانفقوا مما رزقنکم حلالا طیبا ولا تیمموا الخبیث۔ کتب خانہ میں امداد الفتاویٰ موجود ہے اس میں ابواب الربو میں تفصیل دیکھئے، بہر حال ثواب کی نیت کیے بغیر مساکین کو دے دیں اور اس میں شریعت کی اتباع کی نیت کریں اس طرح سے آپ ثواب عظیم کے مستحق ہو جائیں گے، یعنی شریعت کا حکم ہے کہ اس گندے اور خبیث مال کو اپنے مال سے اور اپنے آپ سے الگ کرو، اس لئے اس کو الگ کرتا ہوں تو اس نیت سے بڑا ثواب ہوگا۔''

مشکاۃ شریف پر تحقیقی کام کی اطلاع

''میں نے بھی مشکاۃ شریف پر کام شروع کیا ہے، اللہ تعالیٰ تکمیل کی توفیق دے اور اخلاص نصیب فرمائے۔ حضرت مولانا غورغشتویؒ والا مشکاۃ مجھے یہاں مل گیا، آپ تکلیف نہ فرمائیں، البتہ اگر پشاور جانا ہوا تو مولوی رحیم اللہ صاحب کے توسط سے اسی مشکاۃ کا اچھا سا نسخہ جو ذرا واضح ہو اور کاغذ عمدہ ہو خرید کر اپنے ساتھ گھر لے جائیں۔''

''مشکاۃ شریف پر کام جاری ہے اگرچہ رفتار بہت سست ہے حق تعالیٰ توفیق نصیب فرمائے۔''

بعض سیاسی باتیں

خطوط میں کچھ سیاسی امور پر تبصرے بھی ملتے ہیں، ایک دو نمونے ملاحظہ ہوں:

''یہاں خیر خیریت ہے، بھٹو کے انجام کا انتظار ہو رہا ہے، لوگوں میں کوئی ہیجان اور اشتعال نہیں ہے، کچھ مفاد پرست خفیہ سرگرمیوں میں مصروف ہیں، رائے عامہ ٹھیک ہے، سرحد کے احمقوں کی ذہنیت البتہ کچھ اور معلوم ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ ہدایت دے۔''

''حضرت مفتی (محمود) صاحب کے دورۂ کراچی کی تفصیلات تو اخبارات میں پڑھ لیں ہوں گی، بڑا کامیاب دورہ رہا، خلاف توقع شاندار استقبال ہوا اور جمعہ کو ہماری مسجد میں اتنا بڑا اجتماع تھا کہ حرم شریف کے امام صاحب کے گزشتہ سے پہلے سال جمعہ پڑھانے کے علاوہ کبھی دیکھنے میں نہیں آیا، برآمدوں، باغیچوں یہاں تک کہ استنجا خانہ کے پاس بھی لوگ نماز پڑھنے پر مجبور ہوئے۔''

مسجد میں مکتب کے بارے رائے

''مسجد میں مکتب کے بارے میں پوچھا تھا، مکتب میں اگر مذہبی تعلیم دلانا مقصود ہے تو بسر وچشم منظور ہے اور اگر اسکول کی صورت میں ہو تو خدا کی پناہ، میرے پیش نظر خود بھی یہی مقصد ہے کہ وطن پر مقیم ہونے کی صورت میں زندگی کے باقی ماندہ چند دن اپنے مسجد میں بیٹھ کر بچوں بچیوں کو کچھ سکھانے میں گزار دیں گے ممکن ہے مغفرت اور نجات کا سامان بن جائے۔''

اولیاء اللہ کی صحبت اور تعلق کا شوق

حضرت الاستاذؒ ساری عمر اولیاء اللہ اور اہل علم سے وابستہ رہے، والد صاحب کو بھی اسی کی ترغیب دیتے تھے، ان اقتباسات سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

''چند دن ہوئے ہمارے مدرسہ میں ایک بزرگ تشریف لے آئے تھے، مجذوبانہ شان رکھتے تھے اور عمر تقریباً ایک سو دس سال سے زائد ہوگی، دیکھنے میں زیادہ سے زیادہ پچاس کے نظر آتے ہیں، حیدر آباد میں مقیم ہیں، باتوں میں بجلی کا سا اثر تھا، اپنے حضرت (بنوریؒ) کے انتقال کے بعد تجدید بیعت کا ارادہ تھا لیکن دل کو اطمینان کسی پر نہیں ہو رہا تھا، اس شخص نے اپنی طرف کافی حد تک کھینچ لیا ہے، مزید تحقیق کر رہا ہوں، ہوسکتا ہے کہ اسی بزرگ کے ہاتھ مبارک میں ہاتھ دے دوں، دعا فرمائیے حق تعالیٰ [خط میں مٹا ہوا] نصیب فرمائے جو دنیا وعقبیٰ میں خیر کا باعث ہو اور حق تعالیٰ کی رضامندی کا بہتر ذریعہ ہو۔''

''ایک بڑی سعادت خدا کے فضل وکرم سے یہ حاصل ہوئی کہ حضرت مولانا فضل محمد صاحب زید مجدہم حج کی نیت سے تشریف لے آئے تھے اور قیام فقیر کے پاس رہا، پانچ چھ دن اللہ تعالیٰ کا احسان تھا یہ شرف حاصل رہا کل سات اکتوبر کو عازم حجاز مقدس ہوئے۔''

''ایک ضروری بات یہ عرض کرنی ہے کہ ان شاء اللہ ۱۴ رمئی کو ہمارے حضرت الشیخ مولانا بنوری صاحب زید مجدہم پشاور تشریف لا رہے ہیں، پشاور جا کر ملاقات کیجئے اور دعا کی سعادت سے دامن بھر دیں، زیادہ اصرار نہ کریں لیکن عاجزانہ طور پر اپنے ہاں تکلیف فرما کر آنے کی درخواست کریں، قبول کی تو سعادت کی انتہا ہوگی، قبول نہیں فرمایا تب بھی خوش ہو کر دعا فرمائیں گے۔''

''کراچی تشریف لانے کا امکان بھی آپ کے مکتوب سے ظاہر ہو رہا تھا، خدا کرے کہ یہ امکان عمل کا جامہ جلدی پہن لے۔ خدا کی شان ہے کہ گزشتہ دو ہفتوں میں کئی ایسے حضرات سے ملاقات ہو چکی جن کے دیکھنے سے آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں، برادرم محمد جمیل صاحب کے بڑے بھائی جو ہمارے طالب علمی کے زمانے کے ساتھی ہیں، تبلیغی سلسلہ میں آئے ہوئے ہیں، ان سے ملاقات ہوئی، حکیم صاحب کا غیر متوقع طور پر کراچی آنا ہوا، جناب صاحبزادہ محمد حسین صاحب جو نہایت پاک سیرت انسان ہیں اور فقیر کے مخلصین میں سے ہیں،

سے ملاقات نصیب ہوئی۔ قلات کے ایک عالم جو فرشتہ سیرت ہیں ان دنوں آئے ہوئے ہیں، حضرت درخواستی دامت برکاتہم اور حضرت مولانا صاحب زید مجدہم کی زیارت سے مشرف ہوئے، کچھ بعید نہیں چند دن بعد اللہ تعالیٰ آپ سے ملاقات کا موقع عنایت فرمادیں۔"

ضرورت مندوں کی مدد

حضرت رشتہ داروں کی خصوصاً اور اہل علاقہ کی عموماً خبر گیری رکھتے اور پریشانی یا ضرورت کے موقع پر حتی الوسع ان کا تعاون فرماتے، پھر آپ کی عادت طیبہ یہ تھی کہ اس احسان کو ہمیشہ اخفا میں رکھتے، چونکہ شیخ محقق تھے اس لیے دوسرے کے ساتھ تعاون کا انداز بھی ایسا ہوتا کہ کسی غریب کے احساس کمتری کا باعث نہ ہو، ایک خط میں لکھتے ہیں:

"آج ایک ہزار روپیہ کا ڈرافٹ آپ کے نام بھیج رہا ہوں۔ یہ رقم ...... کیلئے ہے۔ معلوم ہوا کہ ان کے والد زخمی ہوکر پشاور میں زیر علاج ہیں اور ...... کی اہلیہ ہنگو میں داخل ہے، اس رقم کا تذکرہ آپ کسی سے نہ کریں اس لئے کہ اختیاری اور یقینی چیز نہیں، ہمارے دوسرے غریب اعزہ کا خیال ہوگا پھر اور ہمارے پاس کچھ ہوگا نہیں اس لئے اس کو صیغۂ راز ہی میں رکھیں۔ .... کو میں نے جو خط لکھا ہے آپ کے خط کے ساتھ ہے، وہ بھی اس کے حوالہ کردیں اور زبانی طور پر آپ بھی اسے سمجھائیں کہ والد صاحب کی خدمت کیلئے دوسرا بھائی وہاں رہے، خود وہ سبق کا ناغہ نہ کرے بلکہ پڑھتا رہے۔"

حقوق العباد میں احتیاط

ایک خط میں والد صاحب کو حقوق العباد کی تلقین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مسجد کے بارے میں تفصیلات معلوم کرنے کی شدید خواہش ہے، برادرم .....صاحب نے بتلایا کہ مستریوں کو آپ جواب دے چکے ہیں، میرا خیال ہے کہ جو کچھ ہوا تھا وہ تو ہو چکا، اب مستریوں سے کچھ کام لیتے، فرش کی صفائی ان کی نگرانی میں مزدوروں کے ذریعہ ہوتی تو اچھا ہوتا، مزید یہ معلوم ہوا کہ آپ نے انہیں مزدوری بھی نہیں دی، یہ اور بھی بری بات ہے جو حق ان کا ثابت ہو چکا اس کا دینا ضروری ہے، مہربانی فرما کر پہلی فرصت میں ان کا حق ادا کریں، حقوق العباد میں سخت احتیاط کی ضرورت ہے، انہوں نے جو بد دیانتی کی ہے، اللہ تعالیٰ ان سے انتقام لے گا اور اس کا انتقام بڑا سخت ہوتا ہے، اعاذنا اللہ تعالیٰ منہ۔"

طبی مشورہ

ایک خط میں طبی مشورہ دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"آپ نے دماغی کمزوری کی شکایت کی تھی، اس دفعہ خالص میرے مشورہ پر اللہ تعالیٰ کی رحمت پر بھروسہ

کرتے ہوئے ایک ڈیڑھ مہینہ تک ہلیلہ کا مربہ رات کو سوتے وقت ایک دو دانہ استعمال کریں، امید ہے فائدہ ہوگا۔''

وقت کی قدر و قیمت

حضرت کی مروت اور مہمان نوازی ضرب المثل تھی، اس کے باوجود انہیں اپنے کام اور وقت کے ضائع ہونے کا کتنا احساس تھا، اس کا اندازہ اس اقتباس سے لگائیں:

''کافی دنوں کے بعد آج صبح قلم برداشتہ ایک عریضہ آپ کی خدمت میں لکھنے کا ارادہ کیا تھا، ابھی بسم اللہ بھی نہیں کی تھی کہ ہمارے ''مہربان'' ملک...... صاحب آپہنچے، علیک سلیک کے بعد اس کو کمرہ میں سلا کر خط لکھنے بیٹھ گیا، لیکن سارا نشاط اتر گیا اور بغیر نشاط کے میرے لئے دو سطر لکھنا بھی مشکل ہوتا ہے، میں حیران ہوں کہ آخر یہ لوگ احساس سے اس قدر محروم کیوں ہیں، ادھر کل قطر سے ان حضرات کا خط ملا، ۱۴ رجون کو بذریعہ بحری جہاز ان کی ان شاء اللہ روانگی ہوگی اور بیس تک یہاں پہنچنے کا احتمال ہے، الغرض ایک ہفتہ دس دن میرے کام اور وقت کا بیڑا غرق ہوکے رہے گا، والی اللہ المشتکیٰ''

احباب سے حسن سلوک

حضرت مولانا حبیب اللہ مختارؒ اور ان کی اہلیہ محترمہ کی کچھ رقم حضرت الاستاذؒ نے والد صاحب کے پاس چائے کے کاروبار کے لیے رکھوائی تھی، مروت و حسن سلوک کی تاکید پر مشتمل یہ شاہکار اقتباس ملاحظہ ہو:

''اگر آپ کو یہی کاروبار پسند ہو تو آپ مولانا کے حساب کو تھوک ہی تک محدود رکھیں، اسی چائے سے آپ دکان کیلئے مبنی مناسب منافع پر خرید کر پرچون اپنے لئے فروخت کیا کریں، غلہ وغیرہ کا سٹاک رکھنا شرعاً جائز نہیں اور بغیر سٹاک کے خاص فائدہ نہیں ہوتا، بہرحال جو بھی کام ہو وہ ایسا ہونا چاہیے کہ نفع کی امید کے ساتھ ساتھ اس کا حساب بھی صاف ہو اور آپ کو زیادہ وقت اور تکلیف بھی نہ اٹھانی پڑے، میں نے مولانا سے شرم کی وجہ سے اب تک یہ معلوم نہیں کیا کہ یہ معاملہ نصف منفعت یا چوتھائی پر ہوگا یا کیا ہوگا، اور اگر آپ اتفاق فرمائیں تو اس کام کو میرے ایک انتہائی شریف اور فاضل دوست اور جلیل القدر شیخ کی صاحبزادی جو خاندان نبوت سے تعلق رکھتی ہیں، کی خدمت سمجھ کر محض لوجہ اللہ تعالیٰ سرانجام دیا کریں، حق تعالیٰ کی رحمت کے خزائن میں کمی نہیں، مجھے اس کی ذات اقدس سے جو کرم کرم ہی ہے، یہ قوی امید ہے کہ اخروی اجر کے ساتھ ساتھ دنیا میں بھی وہ اجر سے محروم نہیں فرمائے گا۔''

بچوں کے حوالے سے چند اہم باتیں

''.........خان کا خط ملا ہے، اسی مایوسی کا مظہر ہے، انسان اگر خود دل سے کام کرنا چاہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کے عزم کے سامنے رکاوٹ نہیں بن سکتی، مگر خوئے بدرا بہانہ بسیار، مجھے افسوس ہے کہ میرے بھتیجے یا تو ذہانت کے لحاظ سے پڑھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے یا پھر صحت کے لحاظ سے، عزیزم نصیر الدین اخلاق وسیرت کے لحاظ سے قابل قدر بچہ ہے لیکن ذہین بھی نہیں اور صحتمند بھی نہیں جبکہ تحصیل علم کیلئے یہ دونوں چیزیں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، عزیزم محمد طیب کے حالات کا جائزہ لیتا ہوں تو اسے ذہن تو بے شک اللہ تعالیٰ نے اچھا دیا ہے مگر صحت اس کی بھی خراب ہے اور پھر اخلاقی طور پر اس میں ننھیال کے اثرات مشاہدہ میں آتے ہیں، مزید براں عمر بھی اتنی نہیں کہ سفر کر سکے، عزیزم طاہر کی صحت تو غنیمت ہے لیکن بے وقوف ہے اور چھوٹا بھی، ان اسباب کی بنا پر میری نگاہیں اعظم خان کی طرف بار بار اٹھتی ہیں مگر اب مایوس ہو گیا اور اب شاید عمر بھر پھر ا سے دعوت نہیں دوں گا اور کیا لکھوں کراچی میں گرمی کافی ہے، جس طرح بنی آدم کے اطوار بدل گئے اسی طرح پوری کائناتی نظام میں عجیب ردوبدل ہو رہا ہے، کراچی جو زمانہ سے اعتدال کے ساتھ مشہور تھا اب گرمی بھی اس میں زیادہ پڑنے لگی ہے اور سردی بھی۔''

طلبہ میں یرقان کی وبا پھیلنے پر اظہار تشویش کا خط:

''مجھے خود بھی تقریباً پندرہ بیس دن کافی پریشان ہونا پڑا، مدرسہ میں بلکہ پورے کراچی میں یرقان کا مرض پھیل گیا تھا، ساتھی مریض تھے، ان کی پریشانی تھی کہ اپنے محمد طیب بھی اس کے شکار ہوئے، خدا خدا کر کے دم دوا پرہیز سب کچھ سے کام لیا حق تعالیٰ نے احسان فرمایا، صحت یاب ہو گئے، دسواں پارہ ختم ہونے والا ہے اور آیندہ ہفتے کو ششماہی امتحان بھی ہوگا، صحت وعافیت کیلئے اور ان کی کامیابی کیلئے دعا کرتے رہیں۔ مجھ پر خود بھی خفیف سا اثر یرقان کا ظاہر ہونے لگا ہے، مگر حق جل مجدہ کا کرم ہے، پھر دفع ہو جاتا ہے، کراچی میں تو گرمی کی ابتدا ہونے لگی ہے، پنکھے ظہر عصر کو چلتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی عجیب شان ہے۔''

یہ چند منتخب شذرات پیش کر دیئے، مقصود تو عہد کہن کی یادیں تازہ کرنا ہے، اگر قارئین کو بھی کام کی کوئی بات ملے، تو دگنا فائدہ ہوا، اللہ تعالیٰ چچا جان کی کروٹ کروٹ مغفرت فرمائے، اور ہمیں آپ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

والد صاحب کے دو ہم سفر

مولانا محمد یوسف

رب ذوالجلال کی عجیب سنت ہے کہ اپنے خصوصی بندوں کو بچپن ہی سے اعلیٰ قسم کی صفات، عادات اور خوبیوں سے نوازتے ہیں، بدقسمتی سے ان کا احساس تب ہوتا ہے جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہو کر دار فانی سے دار البقاء کی طرف چلے جاتے ہیں، پھر ان کی ایک ایک خوبی اور ایک ایک ادا رلاتی ہے، والد ماجد نے اپنے دائمی سفر سے چند دن قبل بندہ کو ایک خواب سنایا تھا کہ میں ایک طویل ترین سفر پر جا رہا ہوں، میرے ساتھ دو ہم سفر ساتھی اور بھی ہیں، ان میں ایک ہمارے خاندان کے ہیں اور دوسرے کے بارے میں معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کون ہے۔ بندہ کے استفسار پر حضرت نے فرمایا کہ خاندان والا جب میرے ساتھ ہمسفر ہوگا تب آپ لوگوں کو معلوم ہو سکے گا۔ بالآخر وہ دن بھی آ گیا کہ والد صاحب پوری تیاری کے ساتھ ہمیشہ کے سفر پر جانے لگے اور آپ کے ساتھ دو ننھے منھے مسافر بھی ہمیں الوداع کہہ کر رخصت ہو گئے۔ ایک وہ خوش قسمت بچہ جو عبدالرحمن اور دوسری وہ سعادت مند بچی جو حدیقہ کے نام سے یاد کی جاتی ہے، المظاہر کی خصوصی اشاعت میں اپنے عظیم والد ماجد کے ساتھ ان دونوں کا تذکرہ بھی ضروری سمجھا۔

عزیزم عبدالرحمن میرے تایازاد بھائی مولانا محمد طاہر صاحب کے لاڈلے صاحبزادے اور خاندان میں ہر ایک کے منظور نظر تھے، نہایت خدمت گار، ملنسار، ذی وقار، نیک سیرت وصورت اور بچپن ہی سے عبادت گزار تھے۔ اذان فجر کے بعد سب سے پہلے مسجد پہنچتا، ہمیشہ چہرے پر تبسم اور مسکراہٹ سجائے رکھتا، نماز باجماعت ادا کرتا، خاندان میں کوئی بھی کام کا کہہ دیتا تو قطعاً انکار نہ کرتا، کھیل کود چھوڑ کر ضرورت پوری کرتا بلکہ خدمت اس کا خاص مشغلہ تھا۔ چھوٹے بڑوں کے ساتھ سلام ومصافحہ کرنے کی عادت تھی، خوش طبع اور شریف مزاج تھا، بچپن کی

فضولیات اور گالی گلوچ کی قطعاً عادت نہ تھی، خاندان کے باقی بچوں سے کافی مختلف تھا۔ اگر کسی کے ساتھ مزاح بھی کرتا تو اس میں سنجیدگی ضرور ہوتی۔ اکثر بچے ابتدا میں بے ادب ہوتے ہیں، مگر عبدالرحمن نہایت مؤدب اور مہذب تھا، خاص کر علما کا بہت احترام کرتا تھا، آخری ایام میں دین کی رغبت بہت بڑھ گئی تھی، اساتذہ سے اعمال صالحہ خصوصاً نماز کی معلومات اور بعض دینی مسائل کے بارے میں پوچھتا اور نوافل ذکر واذکار کے فضائل معلوم کرتا ۔سکول میں امتیازی حیثیت حاصل تھی، ہر امتحان میں پوزیشن لیتا، اساتذہ آپ کے مثالی ادب کے انتہائی معترف تھے۔ عبدالرحمن کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ ہمارے بڑے تایا جان یعنی اپنے دادا کی بہت زیادہ خدمت کرتا، نماز عشا کے لئے تایا جان جب تشریف لاتے تو یہ ساتھ ٹارچ جلا کے آتا۔ ایک عجیب عادت یہ تھی کہ سارے نمازیوں کے جوتے سیدھے کرتا۔ ان کی شہادت کے بعد اس طرح مرتب جوتے پھر مسجد میں کبھی نہیں دیکھے۔

ایسی عادات کے مالک تھے کہ ہر ایک کی نظر ان کی طرف مبذول ہو جاتی۔ دلیری اور شجاعت سے بھی اللہ تعالی نے نوازا تھا، اکثر چھوٹے بچے رات کے اندھیرے میں خوف کی وجہ سے گھر سے نہیں نکل سکتے مگر عبدالرحمن ان چیزوں سے بالکل خوف نہیں کھاتا تھا، آذان سنتے ہی مسجد کی طرف دوڑ کر آجاتا بلکہ اور بچوں کو ترغیب دے کر مسجد کی طرف دعوت دیتا تھا، قرآن مجید کی تلاوت بھی انتہائی خوش الحانی سے کرتا۔ دلیری کا یہ عالم تھا کہ لمبے لمبے درختوں پر اتنا اوپر چڑھ جاتا جہاں تک انسان کا چڑھنا مشکل ہوتا اور خود کہتا کہ جس شاخ پر بلی چڑھ سکتی ہے، وہاں تک میں بھی چڑھ سکتا ہوں، یہ صرف دعویٰ نہیں تھا بلکہ عملاً ایسا کر کے دکھلاتا۔ ایک دفعہ اپنے گھر کے تقریباً بیس فٹ بلند چھت سے چھلانگ لگائی اور فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا۔ افطاری کے وقت سب سے پہلے مسجد پہنچ کر دسترخوان بچھانا، اس پر ترتیب سے سامان رکھنا ان کا معمول تھا۔ فضائل اعمال کی تعلیم میں آگے بیٹھنا اور نماز سے قبل نوافل پڑھنا گویا عادت تھی۔ سکول اور مدرسہ بروقت پہنچنا عادات حمیدہ میں شامل تھا۔ اللہ تعالی نے اچھی ذہانت اور قابلیت سے بھی نوازا تھا، بہت ذہین تھے، ایک کام ایک دفعہ دیکھنے سے ہی یاد ہو جاتا، ایک کام کے بارے میں بار بار کہنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی، شہادت سے قبل پورے سکول میں اول پوزیشن حاصل کی تھی، اور حسن کارکردگی پر بھی انعام حاصل کیا تھا، گھر کے تمام کام کاج خود کرتے تھے، شہادت کے دن صبح سڑک کے کنارے کھڑے تھے، میں نے گاڑی روک کر پوچھا کہ اگر میرے ساتھ جانا چاہتے ہو تو آجاؤ۔ اس نے کہا کہ شاہو کو ہم ملنگو تم ہے، میں گندم 'شاہو خیل' کی آٹا مشین میں پسوانے کے لیے لے کر جا رہا ہوں۔ شہادت سے چند منٹ قبل شاہو سے پسا ہوا آٹا واپس لے کر گھر آ گئے، والدہ نے چائے سامنے رکھی، پیالہ ہاتھ میں تھا کہ اس دوران جہاز نے پہلا بم گرایا، چھوٹے عبدالرحمن نے یہ سب کچھ چھوڑ کر مدرسہ دوڑ لگادی اور کہا کہ'' ملا کا کا'' (ہمارے خاندان والے حضرت الاستاذ کو 'ملا کا کا' کہتے تھے

) پر بمباری ہوگئی۔ بس آنا فانا میں گھر والوں کی نظروں سے غائب ہوگئے اور پھر لاش گھر واپس آئی۔ گیارہ سالہ عبدالرحمن کی مظلومانہ شہادت پر کل قیامت کو یہ سوال تو ضرور ہوگا کہ بایّ ذنب قُتِلَتْ۔

دوسرے ہمسفر سے میری مراد برادر کبیر مفتی عظمت اللہ صاحب کی ننھی منھی صاحبزادی حدیقہ ہے، اس ننھی منھی مظلومہ کی عمر تقریباً ساڑھے تین سال تھی، اللہ تعالیٰ نے نایاب صفات سے نوازا تھا، انتہائی ہنس مکھ تھی، اکثر اوقات مدرسہ میں ہوتی، تمام اساتذہ کرام سے اتنی مانوس تھی کہ جو بھی استاذ دفتر میں موجود ہوتا اس کے ساتھ بغیر کسی جھجک کے بولتی رہتی، اساتذہ بھی ان کی پیاری باتوں سے محظوظ ہونے کیلئے اس کو دفتر بلاتے، زیادہ باتیں کرنے کی وجہ سے مفتی صاحب اس کو باتونی کے لقب سے پکارتے، انداز گفتگو اتنا دلچسپ تھا کہ ہر استاذ کی کوشش ہوتی کہ میں ان سے کچھ باتیں کرلوں، مفتی صاحب بھی ہر روز ان کی نئی نئی باتیں سناتے کہ کل حدیقہ نے مجھ سے یہ مسئلہ پوچھا تھا یا آج حدیقہ نے یہ بات کہہ دی وغیرہ، حضرت والد صاحب شہیدؒ سے اتنی محبت تھی کہ جب آپؒ گھر تشریف لے جاتے تو یہ استاذ صاحب کی زیارت کے لئے اپنے گھر کے دروازے پر منتظر کھڑی رہتی، جوں ہی استاذ صاحب قریب ہوجاتے تو حدیقہ آگے بڑھ کر مصافحہ کرتی، پھر خوشی سے دوڑ کر گھر میں سب کو بتاتی کہ میں نے ''لالکی'' (ہم بہن اور بھائی حضرت الاستاذ کو 'لالکی' کہتے تھے) کے ساتھ ہاتھ ملایا ہے۔ اساتذہ کرام سے مانوس ہونے کی وجہ سے اکثر کھانے پینے کے اوقات میں دفتر میں موجود رہتی۔ شہادت کے دن بھی چائے کے وقفہ میں موجود تھی۔ ان دنوں میں اس ننھی گڑیا نے دو ترانے یاد کیے تھے، جس کو وہ اکثر اساتذہ کی فرمائش پر سناتی تھی، بعض نے اس کو ریکارڈ کر کے محفوظ بھی کیا تھا، اس نظم کا اہم مصرعہ یہ تھا: سرہ سرہ پر ہر ونہ، سرے سرے وینے تپین بدن باندے کسی کو کیا معلوم تھا کہ اس کا نازک اور خوبصورت بدن اس کا مصداق بننے والا ہے۔

چنانچہ اس دن مفتی صاحب نے حدیقہ کو بسکٹ دے کر فرمایا کہ بیٹی گھر چلی جاؤ، وہ جیسے ہی دفتر سے نکلی، یکایک اسی دوران ظالموں نے بمباری کردی، گرد وغبار کے طوفان میں آگ وآہن کی بارش ہونے لگی، بمباری کے بعد افراتفری، نیز حضرت الاستاذ کی المناک شہادت کی بنا پر کسی کو اس ننھی گڑیا کا خیال نہ آیا، کافی دیر کے بعد جب اطلاع ملی کہ حدیقہ نہیں ہے تو تلاش بسیار کے بعد اس مظلومہ کی لاش عمارت کے ملبے اور اینٹوں کے ڈھیر سے اس طرح ملی کہ اس کا سر تن سے جدا تھا، اس کی چہچہاتی زبان اب بند ہوچکی تھی، ہاتھ، پاؤں وغیرہ کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں تھیں، اس کا نازک اور سفید بدن سرخ خون سے رنگین ہوچکا تھا، اس کے زخموں سے چور چور بدن پر نظر پڑتے ہی ہر ایک کی زبان پر خود بخود بد دعائیہ کلمات جاری ہوجاتے، اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو ان جیسی ہولناکیوں سے محفوظ فرمائیں، کیا ان جیسے معصوم بچوں کو دہشت گرد قرار دینا تاریخ کی بدترین دہشت گردی کے مترادف نہیں، بس ہم

اپنے دل کو اس قرآنی جملے سے تسلی دیتے ہیں کہ روز محشر یہ معصوم بچے اپنی مظلومیت کے ساتھ رب کائنات کے دربار میں حاضر ہوں گے، پھر بأی ذنب قتلت ☐ کی صدا لگے گی، اس دن فیصلہ احکم الحاکمین کے ہاتھ میں ہوگا، اے ظالمو! بتاؤ تمہیں اس دن کہاں پناہ ملے گی؟؟؟

مولانا محمد امین اورکزئی شہید انوری سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ہیں۔ آپ حضرت بنوریؒ کے تربیت یافتہ تھے۔ ان کی صحبت میں رہے اور ان کی زیر نگرانی علمی سفر طے کیا جس نے آپ کی دبی صلاحیتوں کو اجاگر کر کے بام عروج تک پہنچایا اور آپ آسمان علم وعمل کا تارہ بن کر چمکے۔ کئی سالوں تک وہاں مدرس بھی رہے۔ حضرت بنوری کی وفات کے بعد عشق بلالی نے مزید وہاں رہنے نہ دیا استاد کا مسند اور گزرگاہ خالی دیکھنا گوارا نہ کر سکتے تھے کہ بالآخر مادر علمی کو خیر باد کہہ دیا اور اپنے آبائی علاقے شاہو وام ہنگو تشریف لائے اور ہنگامہ دنیا سے کنارہ کش ہو کر دین کی خدمت میں مشغول ہوئے۔

مولانا اورکزئی شہیدؒ ایک غیر معمولی عالم دین تھے۔ وہ بیک وقت علوم حدیث کے شناور بھی تھے اور علم تفسیر کے آفتاب بھی۔ وہ منقولات میں وسیع معلومات رکھتے تھے اور معقولات پر بھی اسے کامل دست گاہ حاصل تھی۔ وہ فقہی بصیرت اور ذوق کے بھی حامل تھے اور تصوف میں بھی ان کی ایک شان تھی۔

آثار امین

تصانیف وتحقیقات، علمی افادات، درسی شذرات اور مبہم آثار کا تعارف وتجزیہ

تصنیفات و تحقیقات

مولانا محمد امین اورکزئیؒ کا شرح طحاوی میں منہج واسلوب

مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ

حضرت مولانا یوسف لدھیانویؒ نے محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری قدس سرہ پر ماہنامہ بینات کی خصوصی اشاعت کے لیے ''حضرت شیخ اور طحاوی'' کے عنوان سے ایک گراں قدر مضمون تحریر فرمایا تھا، جس میں حضرت بنوریؒ کی ایماء اور خواہش پر تحریر کردہ حضرت الاستاذ مولانا محمد امین اورکزئیؒ کی شرح طحاوی ''نثر الازہار'' کے منہج واسلوب کا تفصیلی تعارف بھی کرایا، ذیل میں وہی مضمون ایک نئے عنوان سے پیش خدمت ہے۔ (ادارہ)

حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری نور اللہ تعالیٰ مرقدہ کو حق تعالیٰ شانہ نے جن خصوصی انعامات سے نوازا، ان میں سے ایک خاص الخاص انعام علوم حدیث اور انفاس نبویہ کی خدمت ہے، تعلیم سے فراغت کے بعد حق تعالیٰ شانہ آپ سے کسی نہ کسی طرح حدیث کی خدمت لیتے رہے، قریباً نصف صدی تو حدیث شریف کی تدریس میں گزری، اس کے علاوہ آپ نے علم حدیث پر جو علمی آثار چھوڑے ہیں ان کی مختصر سی تفصیل یہ ہے:

۱: بخاری شریف کی مشہور شرح 'فیض الباری' جو آپ کے شیخ انورؒ کے افادات کا مجموعہ ہے، اسے مرتب تو حضرت مولانا سید بدر عالم میرٹھی ثم مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا، لیکن اس کی تالیف میں بھی حضرت بنوریؒ کے مشورے اور علمی افادات شریک رہے، اس سلسلہ میں حضرتؒ بعض عجیب لطائف بھی سنایا کرتے تھے، اور پھر اس کی طباعت اور تقدیم کا سارا کام حضرتؒ نے خود کیا اور قریباً ایک سال تک اس میں منہمک رہے۔

۲: جامع ترمذی کی شرح 'معارف السنن' تالیف فرمائی۔

۳: اپنے ادارہ میں تخصص فی الحدیث کا شعبہ قائم فرمایا جو اپنے کام کی نوعیت کے اعتبار سے شاید پورے عالم میں منفرد مقام رکھتا ہے، تخصص فی الحدیث کے شرکا سے حدیث کے انتہائی اہم موضوعات پر مقالات لکھوائے جن کی اہمیت وافادیت کا صحیح اندازہ اشاعت کے بعد ہی امت لگا سکے گی۔

۴: جامع ترمذی کی تقریر 'العرف الشذی' کی تصحیح بھی فرمائی جس کا نسخہ محفوظ ہے۔

۵: جامع ترمذی کے 'وفی الباب' کا کام شروع فرمایا، جس کی تکمیل آپ کے تلمیذ رشید مولانا حبیب اللہ مختار صاحب فرمارہے ہیں۔

۶: سنن ابوداؤد کے مشکل مقامات پر تعلیقات وحواشی بھی تحریر فرمائے، یہ غیر مطبوعہ شکل میں محفوظ ہیں۔

۷: نصب الرایہ کی طباعت، تقدیم اور تحشیہ کی خدمت۔

۸: امام طحاویؒ کی شرح 'معانی الآثار' کی خدمت کا آغاز فرمایا، ذیل میں اسی کا تعارف مقصود ہے۔

حضرت شیخ نور اللہ تعالیٰ مرقدہ امام طحاویؒ کی عبقریت اور فقہ وحدیث میں ان کی مہارت وحذاقت کے بڑے مداح تھے، فرماتے تھے کہ ان کے معاصرین میں بھی کوئی ان کا ہمسر نہیں تھا اور بعد کے محدثین میں سے بھی کسی کو ان کے مقام رفیع تک رسائی نصیب نہیں ہوئی، حضرتؒ نے تخصص فی الحدیث کے بعض شرکا کو مقالہ نویسی کے لئے یہ موضوع دیا تھا: ''الامام الطحاوی ومیزانہ بین معاصریہ'' یعنی امثال ونظائر سے یہ ثابت کیا جائے کہ امام طحاویؒ کو ابن جریرؒ، ابن خزیمہؒ، محمد بن نصرؒ وغیرہ معاصرین پر کن کن امور میں فوقیت حاصل ہے۔ حضرتؒ فرماتے تھے کہ دارقطنیؒ، بیہقیؒ اور خطیبؒ تینوں مل کے حدیث میں طحاویؒ کے ہم سنگ ہوتے ہیں مگر تفقہ اور عقلیت میں طحاویؒ کا پلہ پھر بھاری رہتا ہے۔

امام طحاویؒ کی تالیفات میں 'شرح معانی الآثار' امت کے سامنے موجود ہے جو فقہ وحدیث کا 'مجمع البحرین' ہے، مگر افسوس ہے کہ اب تک دیگر کتب احادیث کی طرح اس کی خدمت نہیں ہوسکی اور اگر ہوئی ہو تو امت کے سامنے نہیں۔ حافظ بدرالدین عینیؒ نے مدۃ العمر اس کا درس دیا اور اس کی تین شرحیں لکھیں، لیکن حیرت ہے کہ ان میں سے کوئی بھی حلیہ طباعت سے آراستہ نہیں ہوئی اور بھی کئی نامور اہل علم نے اس پر کام کیا مگر کسی کی محنت منظر عام پر نہیں آئی۔ حضرت محسوس فرماتے تھے کہ اس پر مندرجہ ذیل پہلوؤں سے کام کرنے کی ضرورت ہے:

الف: رجال سند کی تحقیق۔ جس کی روشنی میں حدیث کا مرتبہ متعین ہوسکے۔

ب: متون کی تخریج۔ جس سے ایک طرف تو امام طحاویؒ کی ہر روایت کے متابعات وشواہد سامنے آجائیں، اور

امام طحاویؒ کی احادیث کے قبول کرنے میں بعض لوگوں کو جو کھٹکا ہوتا ہے وہ دور ہو جائے، دوسرے حدیث کے متعدد طرق میں وارد شدہ الفاظ بیک نظر سامنے آنے سے حدیث کی مراد بھی واضح ہو جائے، اسی کے ساتھ دیگر کتب حدیث میں اس حدیث کی نشاندہی کرنے سے ان کتابوں کی شروح کی طرف مراجعت آسان ہو جائے۔

ج: امام طحاویؒ ائمہ احناف کے مسلک کی تصریح کر جاتے ہیں اور دیگر مجتہدین کے مذاہب کی طرف اجمالاً اشارہ کر جاتے ہیں، مگر ہر مذہب کے قائلین کی تصریح نہیں فرماتے، ضرورت ہے کہ اس اجمال کو رفع کیا جائے۔

د: امام طحاویؒ نے قریباً ہر مسئلہ میں احادیث و آثار کے علاوہ ’’وجہ النظر‘‘ کے ذیل میں عقلی دلیل کا التزام فرمایا ہے جو خاصی دقیق اور مشکل ہوتی ہے، اس کی تہذیب و تنقیح کر کے مقصد کی توضیح کی جائے۔

ہ: حضرات متقدمین کے کلام میں اکثر طوالت ہوتی ہے جس سے بعض دفعہ مبتدی کو فہم مطالب میں دقت پیش آتی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ طحاوی کے ہر باب کے مقاصد کی تلخیص کی جائے، یہ کام متقدمین میں حافظ زیلعیؒ کر چکے ہیں لیکن ان کی تالیف دستیاب نہیں اور ماضی قریب میں حضرت مولانا حسین علی صاحبؒ نے بھی اس کی تلخیص کی مگر بہت زیادہ اختصار کی وجہ سے مفید عام نہ ہو سکی۔

و: یہ بھی ضرورت ہے کہ ہر باب کی احادیث و آثار کی فہرست مرتب کر دی جائے کہ اتنی مرفوع ہیں، اتنی مراسیل، اتنی موقوف اور اتنی مکرر۔

ز: اور سب سے اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ شرح معانی الآثار کے متن کی تصحیح کی جائے، کیوں کہ اس میں بکثرت اغلاط ہیں، بعض اغلاط تو ایسے ہیں جن سے عبارت ناقابلِ فہم بن گئی ہے یا مفہوم بالکل مسخ ہو چکا ہے اور تعجب ہے کہ حافظ جمال الدین زیلعیؒ اور ان جیسے دوسرے اکابر بھی بعض جگہ ان غلطیوں سمیت نقل کرتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سامنے جو نسخہ تھا اس میں بھی یہ اغلاط موجود تھے۔

حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ چاہتے تھے کہ مندرجہ بالا امور کو پیش نظر رکھ کر طحاوی شریف پر کام کیا جائے، چنانچہ آپ نے اپنے تلمیذ سعید مولانا محمد امین صاحب کو اس کام پر مامور فرمایا، شروع میں رجال کی تحقیق پر بھی کام ہوتا رہا۔ چنانچہ کتاب الطہارۃ تک کوئی ہزار کے قریب رجال کی چھان بین ہوئی، لیکن چونکہ طحاویؒ کے رجال عموماً صحاح ستہ کے رجال ہیں اور ان پر بھی کافی کام ہو چکا ہے اس لئے تحقیق رجال کا کام فی الحال رکوا دیا۔

اب مولانا موصوف طحاوی شریف پر جو کام کر رہے ہیں اس کا انداز یہ ہے:

اولاً: ہر باب کی تلخیص۔

ثانیاً: اسی تلخیص کے ضمن میں مذاہب ائمہ کا بیان۔

ثالثاً: ائمہ اربعہ کے مذاہب ان کی کتب فقہ سے بقید حوالہ نقل کرنا۔

رابعاً: زیر بحث باب کے آثار کی تعداد اور تفصیل۔

خامساً: نمبر وار باب کی ہر حدیث کی تخریج۔

سادساً: اصل کتاب کی حتی المقدور تصحیح۔

سابعاً: حضرت اقدسؒ کے آخری ایام زندگی میں خواہش کے مطابق ہر باب کے آخر میں بحث سے متعلق حنفیہ کی مؤید احادیث اور آثار کا اضافہ کیا جو شرح معانی الآثار میں نہیں۔

مناسب ہوگا کہ مولانا موصوف کی تلخیص کا ایک نمونہ یہاں نقل کر دیا جائے۔ طحاوی شریف میں تین طلاق بیک وقت دینے کی بحث کئی صفحات پر محیط ہے، اس کی تلخیص صرف ایک صفحہ میں کی گئی جس میں ائمہ کے مذاہب و دلائل بھی آگئے ہیں، حدیثی و فقہی ابحاث کو بھی سمیٹ لیا گیا ہے اور اس باب کی احادیث کی تعداد کے ساتھ مذاہب کی کتابوں کے حوالے بھی دیئے گئے ہیں۔ تلخیص کا نمونہ حسب ذیل ہے:

باب الرجل يطلق امراته ثلاثاً معاً

زعم اهل الظاهر والزيدية ان من طلق امراته ثلاثاً في طهر لا جماع فيه فهي واحدة ويحكى ذلك عن طاوس، وعطاء، وعمرو بن دينار، وابي الشعثاء وابن جبير وابن اسحق، وابن ارطاة، وابن مقاتل، وغيرهم واحتجوا بحديث ابن عباس ﷺ: "كان الثلاث يحتمل واحدة على عهد النبي ﷺ وابي بكر ﷺ وثلاثاً من امارة عمر ﷺ" ولأن التطليق ثلاثاً خلاف ما امر الله تعالى به فلا ينفذ، كما اذا امر رجل رجلاً ان يطلق امراته كذا على صفة كذا فخالف امره۔ وعند الجمهور تقع الثلاث وبه قالت الاربعة، والاوزاعي، والثوري واسحق، وعامة فقهاء الامصار، والعقد عليه اجماع الصحابة ﷺ في عهد عمر ﷺ۔ وصح عن غير واحد من الصحابة ﷺ، منهم ابن عباس ﷺ راوي حديثهم ذلك، ثم في حديثه: فلما كان زمان عمر ﷺ قال: "أيها الناس قد كان لكم اناءة وانه من تعجل اناءة الله تعالى في الطلاق الزمناه" فخاطب بذلك الناس جميعاً وفيهم من علم ماثبت في ذلك عن النبي ﷺ ولم ينكر عليه منكر، فكان ذلك اكبر حجة على نسخ ما كان، لان اجماعهم على فعل كما يكون حجة فكذالك اجماعهم على القول، وكما ان اجماعهم في النقل معصوم عن الخطاء فكذالك اجماعهم على رأى محفوظ عن الزلة۔ ونظائر ذلك كثيرة، منها: تدوين الداوين، والمنع عن بيع ام الولد، والتوقيت في حد الخمر، وكل ذلك لم يكن في اول الامر، ثم اجمعوا عليها لسنوح دليل يرشدهم الى ذلك۔ وقد اجيب عن حديثهم بأجوبة اخرى، منها: ضعفه من حيث الاسناد۔ ومنها: انه في طلاق البتة فجعلها بعض الرواة ثلاثاً حسب رأيه۔ والجواب عن نظرهم ان الواجب

بالمخالفة انما هو التالم, واذا لاينافي ان نلزمهم ما التزموه۔ لانهم فعلوا مافعلوه لانفسهم, بخلاف الوكيل فانه يفعل مايفعل عن الموكل ويحل في افعاله محله فاذا فعل خلاف ماامره لم ينفذ۔ وقد رأينا أشياء نهى الله تعالى عنها اثم او جب على من ارتكبها احكاماً, كالظهار, فانه منكر من القول وزور, ومع ذلك تحرم به المرآة وتجب الكفارة۔ ونهى رسول الله ﷺ عن طلاق الحائض ثم امر ابن عمرؓ بالرجوع لما طلقها۔ والرجوع لايكون الا بعد الوقوع۔ وهذا بخلاف امر النكاح, فانه لاينعقد اذا كان على خلاف ماامر الله تعالى كالنكاح في العدة لان النكاح وكذا سائر العقود لايمكن الدخول فيها الا كما امر۔ واما الخروج عنها فيمكن بغير ماامر ايضاً كالصلوة لا يدخل فيها الا كما امره, ويخرج منها باكل وشرب وكلام وغير ذلك مماينافي الصلوة, فمن فعلها خرج من صلوته وان كان أثماً للمخالفة هذا۔ والله سبحانه اعلم۔ وجميع مافي الباب(۲۰) اثراً, المرفوع منها خمسة والثلاثة منها معلقة وغيرها موقوفة۔ وراجع للمذهب المعالم ۳/۲۳۸۔ ۲۳۹۔ والمبسوط للسرخسي ۶/۵۷۔ وبداية المجتهد ۲/۶۰۔ والمغني ۷/۱۰۳۔ ثم اعلم ان في المسئلة مذهبا ثالثاً وهو مذهب الامامية فانهم قالوا: لايقع شيء

اس تلخیص کے بعد باب کی ایک ایک حدیث کی تخریج شروع ہوتی ہے اور اس ضمن میں حدیث کے طرق صحیحہ، ضعیفہ اور معللہ پر بھی تنبیہ کر دی گئی۔ تخریج کے سلسلہ میں یہ بتانا بھی ضروری ہوگا کہ مرفوع احادیث تو اکثر و بیشتر صحاح، سنن، مسانید اور معاجم میں مل جاتی ہیں اور ان کی تخریج کی جا سکتی ہے مگر طحاوی شریف میں آثار صحابہؓ بھی بکثرت ہیں اور کتب حدیث سے ان کے مآخذ تلاش کرنے میں بڑی مشکل پیش آتی ہے، اس لئے کہ کتب احادیث میں آثار کی تخریج بہت کم ہوئی ہے۔ مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ، سنن سعید بن منصور وغیرہ میں آثار صحابہؓ و تابعین کا اچھا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے، لیکن مؤخر الذکر دونوں اہم مراجع مکمل صورت میں شائع نہیں ہوئے۔ مؤلف نے آثار کے تتبع میں ایک طرف تو ان کتابوں کی مراجعت کی، دوسری طرف سنن بیہقی، سنن دارقطني، المحلی لابن حزم، جامع البيان في تفسير القرآن للطبریؒ وغیرہ سے فائدہ اٹھایا اور اس پر مستزاد یہ کہ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل دفاتر کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔

۱۔ تاریخ بغداد: خطیب بغدادی: ۱۴ مجلدات ۲۔ حلیۃ الاولیاء: ابو نعیم اصفہانی: ۱۰ مجلدات... ۳۔ طبقات: ابن سعد: ۸ مجلدات..... ۴۔ تاریخ کبیر: امام بخاری: ۸ مجلدات..... ۵۔ الکنی: ابو بشر دولابی: ۲ مجلدات .....۶۔ معجم صغیر: طبرانی: ۱ جلد .....۷۔ تاریخ جرجان: حمزہ سہمی: ۱ جلد۔

اور پھر ان سات / ۷ کتابوں کی تمام احادیث و آثار کو کتب حدیث وفقہ کی ترتیب پر مرتب کیا، مولانا موصوف

نے تو صرف اپنی تخریج کے لئے یہ کام کیا تھا مگر یہ بجائے خود ایک ایسا علمی کارنامہ ہے جس پر علمی دنیا کو ممنون ہونا چاہیے، اور اگر یہ محنت مطبوعہ شکل میں سامنے آجائے تو اہل علم کے لئے گراں قدر تحفہ ہوگا۔

حافظ بدرالدین عینیؒ کی شرح طحاوی کا نسخہ مصر میں موجود تھا اور حضرتؒ ایک مدت سے اس کے حصول کے لئے کوشاں تھے۔ الحمدللہ کچھ عرصہ پہلے اس کی مائیکروفلم پہنچ گئی ہے، اور اب مولانا محترم اپنی تخریج کا حافظ بدرالدین کی تخریج سے مقابلہ کر رہے ہیں، تاکہ اگر اپنے کام میں نقص ہو تو اس سے اس کا تدارک کرلیا جائے۔ مناسب ہوگا کہ اس مقابلے کا بھی ایک نمونہ قارئین کے سامنے آجائے۔

''باب سورالہر'' میں حدیث ابی قتادہؓ کے لئے حافظ عینیؒ نے ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، صحیح ابن حبان، مستدرک حاکم، ابن خزیمہ اور ابن مندہ کا حوالہ دیا ہے۔ جب کہ ہمارے مولانا محمد امین صاحب مندرجہ ذیل حوالوں سے اس حدیث کی تخریج کر چکے تھے:

(۱) مؤطا امام مالک، ص:۸۔ (۲) مؤطا امام محمد: ص: ۸۳۔ (۳) کتاب الام للشافعی: ج:۱، ص:۶۔ (۴) مصنف عبدالرزاق: ج:۱، ص:۱۰۱۔ (۵) مسند احمد: ج:۵، ص: ۳۰۳، ۳۰۹۔ (۶) ابوداؤد: ج:۱، ص:۱۱، ۱۲۔ (۷) نسائی: ج:۱، ص:۳۶ (۸) ابن ماجہ: ص: ۳۰۔ (۹) مسند حمیدی: ص: ۴۳۰۔ (۱۰) ابن خزیمہ: ج:۱ ص:۵۵۔ (۱۱) ابن سعد: ج:۸، ص:۴۷۸۔ (۱۲) ابن ابی شیبہ: ج:۱، ص:۳۱۔ (۱۳) ابن حبان: بحوالہ مواردالظمآن: ص:۶۱۔ (۱۴) ابن جارود: ص: ۳۰ (۱۵) بیہقی: ج:۱، ص:۲۴۵، ۲۴۶۔ (۱۶) بغوی: ج:۲، ص:۶۹۔ (۱۷) ابن مندہ بحوالہ نصب الرایہ: ج:۱، ص:۱۳۷ (۱۸) دارمی: ص:۱۰۔

اور ہر حوالہ کی تخریج کے ساتھ اس کے طرق اور متن کے الفاظ کی طرف بھی مختصراً اشارہ کیا گیا ہے، یہ اس باب کی اٹھارہ احادیث میں سے صرف ایک حدیث کی تخریج کی مثال ہے۔ اس سے مؤلف کی محنت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، بحمداللہ تعالیٰ اب تک یہ کام کتاب المناسک تک ہو چکا ہے، حق تعالیٰ اس کی تکمیل فرمادے اور یہ امت کے سامنے آجائے تو یہ ایک عظیم علمی وفقہی اور حدیثی خدمت ہوگی، اور یہ حضرت الشیخ بنوری رحمہ اللہ تعالیٰ کے مآثر کا صرف ایک گوشہ ہے۔

نثر الأزهار علی شرح معانی الآثار

چند خصوصیات و امتیازات

مولانا جمیل احمد، کراچی

سرزمین ہند میں علامہ علی متقی ہندی، علامہ محمد طاہر پٹنی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہم اللہ کی جدوجہد کے نتیجے میں علم حدیث کی ترویج وارتقا کے بعد رونما ہونے والے تجدیدی کارنامے علمائے برصغیر کا وہ طرۂ امتیاز ہے جس نے علمائے حجاز کے مکاتب حدیث میں پہلی مرتبہ ایک بڑی سطح پر علمائے ہند کے تفوق فی علوم الحدیث کی صدائے بازگشت سنوائی، یوں تو مذکورہ نمایاں شخصیات کے علاوہ محدث عطاء اللہ سندھی، امام ابوالحسن سندھی اور ملا اکرم نصرپوری جیسی نابغہ روزگار شخصیات بھی سرزمین ہند ہی کا سرمایہ افتخار تھیں، لیکن ایک طویل عرصے بعد وسیع دائرے میں ہونے والی تبدیلی میں شاہ عبدالحق محدث دہلوی اور خانوادہ شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ کے بعد جو امتیاز شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ کے تلامذہ کو حاصل ہے وہ اسلامی دنیا میں اپنی مثال آپ ہے، پھر حضرت شیخ الہند کے تلامذہ میں حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے سینہ بہ سینہ پر خانوادۂ نبوت سے تعلق رکھنے کی بنیاد پر ہونے والی معونات بھی تکوینی طور پر ایک لطیفہ خداوندی کا مظہر ہیں، جس سے ایک طرف علوم حدیث کا فیضان، سبک رفتاری سے اہل ہند کے قلوب میں جاں گزیں ہوا، وہیں حضرت امام اعظم رحمہ اللہ کی مذہب حنفیت پر اٹھنی والی 'مخالفت فی الحدیث' کی مسموم ہوائیں بھی موافقت میں تبدیل ہوگئیں، چنانچہ علوم کشمیری خدا کی عطا کردہ امانت تھی جس کا تحفظ ان کے تلامذہ نے ایک بڑی حد تک کیا، لیکن جس معیار پر حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ

نے حق امانت ادا کیا، اس پر یقیناً خود علامہ کشمیری بھی فخر کرتے ہوں گے۔ رحمهما الله رحمة واسعة۔

بہر حال حضرت بنوریؒ، جانشین کشمیریؒ کی حیثیت سے پاک وہند میں علوم حدیث کی ترویج کے حوالے سے رکن رکین تھے۔ "معارف السنن" میں حضرت کا اختیار کردہ انداز بیان واستدلال تحقیق کے دریچوں کے در یچے وا کرتا ہے، بلاشبہ اگر صاحب کتاب کا نام، کتاب کے سرورق سے حذف کر دیا جائے تو ایک سنجیدہ اور محقق طالب علم کو ایک لمحے ضرور یہ کھٹکتا ہے کہ مصنف کتاب ضرور حافظ جمال الدین زیلعی یا ابن الہمام رحمہما اللہ کے پائے کا کوئی عالم ہوگا، پھر حضرت بنوری رحمہ اللہ کے علوم سے استفادہ کرنے والے تو بلاشبہ ہزاروں میں ہیں، لیکن حضرت بنوری کے مزاج کے مطابق ان کے علوم کے حامل تلامذہ کا حلقہ بہت محدود ہے، ان میں سرفہرست امین علوم محدث العصرؒ، حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہید رحمہ اللہ کی ذات باسعادت ہے، حضرت بنوری کو حضرت شہید پر جس قدر اعتماد تھا وہ اس پر پورا اترے، رسمی طالب علمی کی تکمیل کے بعد حضرت شہید نے حضرت بنوریؒ سے جو استفادہ کیا وہ پہلے سے کہیں بڑھ کر تھا، جس نے انہیں بہترین نقاد ومحقق کے ساتھ عصر حاضر کے محدثین میں ایک نمایاں مقام تک پہنچایا، 'معارف السنن' کی تصنیف کے زمانے میں حضرت بنوری کے مکمل اعتماد کی بنا پر حضرت شہید ان کے علمی معاون اور شریک کار تھے۔ حضرت بنوری رحمہ اللہ کی صحبت نے حضرت شہید کے مزاج ومذاق اور سوچ وفکر میں وہ بلندی پیدا کی جس کی بنیاد پر وہ ایک عظیم شیخ کے عظیم شاگرد قرار پائے، چنانچہ خود حضرت بنوری رحمہ اللہ بے پناہ صلاحیتوں اور قابل قدر خدمات کو دیکھتے ہوئے حضرت مولانا حبیب اللہ مختار شہید اور حضرت شہید رحمہا اللہ کے بارے میں بارہا فرمایا: "هما جناحاي في التصنيف" (تصنیفی میدان میں یہ دونوں میرے دست وبازو کی حیثیت رکھتے ہیں)۔ پھر تو یہ جملہ ان شیخین کے لیے گویا لقب کی حیثیت اختیار کر گیا، حضرت بنوری رحمہ اللہ یکتائے روزگار اور محقق مزاج عالم تھے، اس لیے ان کی زبان سے اپنے شاگردوں کے حق میں یہ جملہ معنی رکھتا ہے، اس بلند پایہ تعریفی وسندی جملے کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح پرندہ کی آزادانہ پرواز اس کے پروں کے بل بوتے پر ہوا کرتی ہے، اسی طرح شیخین کریمین، حضرت کے فیوض ومعارف کی نشر واشاعت کے حوالے سے ان کا سرمایہ تھے اور پھر وقت نے یہ بات ثابت کر دی کہ واقعتاً جن پتوں پر اعتماد تھا وہ سچا ثابت ہوا، اور "كشف النقاب" اور "نثر الازهار" جیسی مفید اور شاہکار تحقیقات اس فیض علمی کا منہ بولتا ثبوت ہے، ذیل میں ہم" مشتے نمونہ از خروارے" کے طور پر نثر الازھار سے چند اہم نکات مع امثلہ پیش کریں گے، جن سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شہید اپنے تحقیقی منہج میں "معارف السنن" کی راہ پر ہی گامزن تھے۔

امام طحاوی رحمہ اللہ کی ''نظر''

(۱) امام طحاویؒ اپنی مایہ ناز کتاب "شرح معانی الآثار" میں اختلافی مباحث سے اعتنا کرتے ہوئے خالص حدیثی وفنی امور کے ساتھ ساتھ الزامی طرز کا عقلی استدلال بھی پیش کیا کرتے ہیں، جو بلاترتیب مقدمات، روایت سے درایت کی طرف رجوع کا نمونہ ہوا کرتا ہے، اس اسلوب کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ امام طحاوی رحمہ اللہ ایک ایسے ماحول کے فرد تھے جہاں علم حدیث کے درایتی پہلو سے اعتنا کم تھا، پھر اس زمانہ کا عمومی مزاج بھی ایسا ہی تھا، انہوں نے اس بند باب کو کھولتے ہوئے، مسائل حدیثیہ میں ترجیح کی ایک نئی راہ اختیار کی، اس پہلو سے بلاشبہ وہ اپنے دور میں منفرد ہے، فقہ حنفی کی تائید میں ''نظر طحاوی'' کا ایک اہم کردار ہے، لیکن ترتیب مقدمات میں منطقی اسلوب کا اس زمانے میں رواج نہ تھا، اس لیے بعض اوقات ''نظر طحاوی'' گنجلک ہو کر عام ذہنوں کے لیے قیاس مع الفارق کی شکل اختیار کر جاتی ہے، اگرچہ گہرائی وگیرائی سے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو بات درست ہوتی ہے۔ مثلاً: "باب فرض الرجلین فی وضوء الصلاۃ" میں شیعہ امامیہ کی طرف سے عقلی شبہ پیش کیا جاتا ہے کہ: ''قدمین کا حکم پانی کی موجودگی کی صورت میں مسح کا ہونا چاہئے، جیسا کہ وجود ماء کی صورت میں مسح علی الراس کا حکم ہے، اس لئے کہ عدم ماء کی صورت میں دونوں اعضاء کا حکم ایک ہے نہ کہ چہرہ اور بدن کی طرح کہ دونوں کا حکم عدم ماء کی صورت میں بدل کی طرف منتقل ہوتا ہے''۔ امام طحاویؒ اس شبہ کا نظری جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں: ''خارج میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ شے کا حکم وجود ماء کی صورت میں غسل کا ہو، لیکن عدم ماء کی صورت میں اس کا حکم بلا کسی بدل کے رہ جاتا ہے، مثلاً غسل جنابت کا حکم وجود ماء کی صورت میں پورے جسم کا دھونا ہے، لیکن عدم ماء کی صورت میں حکم صرف چہرہ اور ہاتھوں کا مسح ہے نہ کہ پورے بدن کا مسح، اس سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ جس چیز کا حکم عدم ماء کی صورت میں بغیر کسی بدل کے ہو تو یقیناً وجود ماء کی صورت میں اس کا حکم مسح کا ہوگا''۔ لیکن اس پر بعض محققین نے اشکال کیا ہے (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا عبدالحی لکھنویؒ بھی انہیں اہل علم کی تائید کرتے ہیں، اس لئے کہ علامہ موصوف "التعلیق الممجد" میں جہاں امام طحاوی کے قدردان نظر آتے ہیں، وہیں میدان تحقیق میں ان سے اختلاف کا اظہار بھی کرتے ہیں) اس اشکال کا حاصل یہ ہے: ''معترضین نے جو تک بندی کی ہے، اس میں یہ کہا گیا ہے کہ سر اور رجلین کا حکم جب عدم ماء کی صورت میں متحد ہے تو وجود ماء کی صورت میں بھی متحد ہونا چاہئے، اس نے اپنے اعتراض میں یہ شق شامل ہی نہیں کی کہ جب دونوں وجود ماء میں متحد ہیں تو عدم ماء کی صورت میں دونوں کا حکم مسح ہے''، گویا کہ معترض کا اصل منشا کلی تطبیق دینا ہے، جزوی قضیہ کی بنیاد پر مابہ الاشتراک کو ثابت کرنا نہیں ہے۔

ان اہل علم کا یہ اعتراض بظاہر بڑا جاندار معلوم ہوتا ہے، لیکن حضرت رحمہ اللہ کی بالغ نظری دیکھئے کہ "نثر الازھار" میں اس باب کے تحت "تلخیص" میں کچھ یوں رقم طراز ہوتے ہیں کہ اعتراض کی بنیاد ہی ڈھے جاتی ہے، حضرت لکھتے ہیں: "یہ جو اعتراض کیا گیا کہ: "بلا کسی بدل کے پانی موجود نہ ہونے کی صورت میں رجلین کا حکم ساقط ہو کر رہ جاتا ہے"، اس کا مقتضیٰ تو یہ ہے کہ پانی موجود ہونے کی صورت میں دونوں کا حکم یکساں ہو، حالانکہ یہ بات قبول نہیں ہوسکتی، کیونکہ حالت جنابت میں پانی پر قدرت نہ ہونے کی صورت میں باقی بدن کے ساتھ ساتھ رجلین کا دھونا بھی تیمم علی الوجہ والیدین سے تبدیل ہو کر رہ جاتا ہے، حالانکہ قدرت علی الماء کی صورت میں بالاتفاق جنبی کے لیے پاؤں کا دھونا ضروری قرار دیا گیا ہے، لہٰذا پانی نہ ہونے کی صورت میں کسی عضو کا حکم اگر بغیر کسی بدل کے رہ جائے تو اس سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا ہے کہ پانی موجود ہونے کی صورت میں اس کے مسح کا حکم ہوگا"۔ گویا حضرت نے اعتراض کی اصل منشا کو ظاہر کرنے کے بعد معترض کو حقیقت حال پر غور کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ (نثر الازھار، ۱: ۶۸ المکتبہ الیوسفیۃ)

(۲) اس باب میں امام طحاوی رحمہ اللہ نے بظاہر صرف ایک نظر پیش کی ہے، حالانکہ روایات کے تسلسل میں انہوں نے ایک اور نظری پہلو کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، جس کو صرف حضرت رحمہ اللہ نے محسوس کیا ہے اور اس کی وضاحت بھی کی ہے: "نظر بھی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ دونوں پاؤں دھوئے جائیں، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل الرجلین کی فضیلت کو متعدد احادیث میں بیان فرمایا ہے اور یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب کہ پاؤں کا وظیفہ "غسل" ہو نہ کہ مسح، اور اس کی احترازی مثال "مسح علی الرأس" ہے کہ جس کے "غسل" کے بارے میں کوئی فضیلت والی روایت موجود نہیں ہے۔ (ایضا)

نقل مذاہب میں احتیاط

نقل مذاہب کے حوالے سے بھی حضرت اورکزئی رحمہ اللہ کی تحقیق قابل ستائش ہے، جس میں احتیاط کے پہلو کو خاصا ملحوظ رکھا گیا ہے اور نہایت جامعیت کے ساتھ حضرت نے مذاہب نقل کیے ہیں، اس سلسلے میں دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

(۱) مذکورہ باب میں "تلخیص" کے تحت امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ کے حوالے سے مشہور مغالطے کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں: لوگوں کے درمیان مشہور ہے کہ امام موصوف مسح علی القدمین کے قائل تھے، حالانکہ ہرگز ایسا نہیں اور یہ بہت بڑی غلطی ہے"۔ مزید فرماتے ہیں: "تفسیر طبری میں انہوں قائلین مسح پر مضبوط رد کیا ہے اور حافظ ابن کثیر

نے بھی ان کے مذہب کو صحیح پر نقل کیا ہے، لیکن باوجودیکہ یہ دونوں تفسیریں لوگوں میں معروف ومتداول ہیں، پھر بھی غلطی کرنے سے محفوظ نہ رہ سکے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ مفسرین نے اس بے بنیاد حقیقت کی بنیاد پر ان کو رافضی تک کہہ دیا ہے۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون! (ایضا)

(۲) نقل مذاہب میں احتیاط کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیں: "باب الرجل یخرج من ذکرہ المذی کیف یفعل؟" کے تحت "شرح معانی الآثار" میں یہ عبارت مذکور ہے:

"قال ابو جعفر: فذهب قوم الی ان غسل المذاکیر واجب علی الرجل اذا امذی و اذا بال"۔

اس عبارت کے تحت علامہ بدرالدین عینی رحمہ اللہ "نخب الافکار" میں یوں رقم طراز ہیں:

"اراد بالقوم هنا الزهری و بعض المالکیة و الحنابلة، فانهم اوجبوا غسل المذاکیر اذا امذی"۔

ان "اذا بال" کے لفظ پر حافظ رحمہ اللہ کی طرف سے کوئی توضیح منقول نہیں، یہ بات چونکہ متن کی ہے، اس لئے سنجیدگی کا پہلو مزید بڑھ جاتا ہے، حضرت شہید رحمہ اللہ کی باریک بینی نے اس اہم پہلو کو محسوس کرتے ہوئے انہیں توضیح کرنے پر مجبور کردیا، چنانچہ "تلخیص" میں لکھتے ہیں:

''اطلاعاً عرض ہے کہ "اذا بال" کے لفظ سے علما کے اختلاف کا جو تاثر ملتا ہے، اس بارے میں ہم نہیں جانتے، اور درحقیقت اس میں کوئی اختلاف ہے بھی نہیں، بول کی صورت میں "غسل جمیع المذاکیر" اتفاقی مسئلہ ہے''۔

پھر امام طحاوی رحمہ اللہ کا دفاع کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "لعله من زیادة النساخ، و الله اعلم"۔ (ص: ۹۴)

رواۃ حدیث کے بیان میں احتیاط

رواۃ حدیث کے حوالے سے بھی حضرت نے تحقیقی ذوق کا مظاہرہ فرمایا ہے:

(۱) "باب المسح علی الخفین کم وقتا للمسافر و المقیم" (ص: ۱۸۲) میں حضرت ابوزید انصاری رضی اللہ عنہ کے تحت لکھتے ہیں:

''شاید یہ عمرو بن اخطب بن رفاعہ خزرجی ہیں، جو کنیت سے مشہور ہوئے، لیکن اس کنیت کے ساتھ اور صحابہ رضی اللہ عنہم بھی ہیں، جیسے جامعین قرآن میں سے ابوزید انصاری، لیکن اس بات کی حقیقت اللہ ہی جانتا ہے کہ ابوزید سے امام طحاوی کی مراد کون ہیں؟ حافظ عینی نے یہاں بیاض چھوڑ دی ہے اور تعیین نہیں کی اور ان کے نسخہ میں "عن رجل" "عن" کی زیادتی کے ساتھ آیا ہے، لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے، جیسے سنن ابو مسلم کجی کی روایت اس پر دلالت کرتی ہے''

یقیناً یہ تحقیق بہت اہم ہے، جس میں اغماض کے بجائے وضاحت سے کام لیا گیا ہے۔

(۲) ایک اور مثال بھی حضرت شہید رحمہ اللہ کے شاندار اسلوب تحقیق پر دلالت کرتی ہے، "باب مس الفرج هل يجب فيه الوضوء ام لا؟" (ص: ۱۵۲) کے تحت لکھتے ہیں:

" ربیعہ سے روایت کرنے والے راوی کے بارے میں نسخوں کا اختلاف ہے کہ ربیعہ سے مراد کون راوی ہے؟ تمام مطبوعہ نسخوں اور "کشف الاستار" میں "زید عن ربیعہ" ہے، حافظ عینی والے نسخے میں "ابو زید عن ربیعہ" ہے اور اس کی تائید مطبوعہ نسخہ کی ایک دوسری روایت سے ہوتی ہے، اور صاحب السعایہ (مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ) نے "ابن یزید" کہا ہے، پھر اس کی تعیین میں بھی اختلاف ہے، حافظ عینی نے اسامہ بن زید لیثی کو مصداق قرار دیا ہے، "صاحب الکشف" نے زید بن الحباب، "صاحب الامانی" نے عبدالرحمن بن زید اور علامہ محمد ایوب سہارن پوریؒ نے یونس بن یزید الایلی کو مصداق قرار دیا ہے اور بندہ ضعیف کی بھی یہی رائے ہے"۔

راویوں کی تحقیق میں اس قدر دقت کا مظاہرہ "فن اسمائے رجال" میں ان کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

مسئلہ "نبیذ تمر" کی تحقیق

فقہائے حنفیہ کو عموماً ایک اہم معرکہ جو پیش آتا رہتا ہے، وہ ان مسائل کی تحلیل ہے جن میں بیشتر ظاہر بینوں کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ حضرت امام اعظم رحمہ اللہ نے صریح قیاس اور شعور عقلی کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے عمل بالحدیث کے پہلو کو یکسر نظر انداز یا کم از کم ثانوی حیثیت دے کر منشائے شریعت کے خلاف عمل کو روا رکھا ہے، مثلاً: "بیع مصراۃ" کا مسئلہ اور "نبیذ تمر" کے استعمال میں بجائے حرمت کے حلت کو ترجیح دینا، اگرچہ امام صاحب سے منقول ہزاروں مسائل کی بنیاد حدیثی استدلال پر مبنی ہے اور یہ حقیقت بھی واشگاف ہے کہ امام صاحب نصوص کے الفاظ کو بجائے خود تسلیم کرتے ہیں، لیکن ان کے ہاں مقاصد شریعت کا فہم ہی اصل منہج ہے، یہی وجہ ہے کہ امام صاحب آثار صحابہ کو مقاصد شریعت تک رسائی کے لیے ماخذ قرار دیتے ہیں، اس لئے کہ صحابہ کو صاحب وحی کی قربت نے فہم شریعت عطا کر دیا تھا، اور یقیناً وہ رموز و اسرار شریعت کے ساتھ احکام شریعت کو خوب سمجھتے تھے۔

بہر کیف حضرت مولانا رحمہ اللہ، امام صاحب کی فقہی گہرائی و گیرائی سے واقف تھے، اس لئے "ابواب الطھارۃ" میں "نبیذ تمر" کے مسئلہ میں ان کا قلم امام طحاوی رحمہ اللہ کی موافقت نہیں کر پایا اور انہوں نے بلا جھجک اختلاف کو ترجیح دیتے ہوئے "نبیذ تمر" میں امام صاحبؒ کے مذہب کی تائید کرتے ہوئے دفاعی انداز اختیار کیا ہے، مختصراً چند امور قابل ذکر ہیں:

"نبیذ تمر" کے مسئلہ میں فقہائے احناف عموماً احتیاط کے پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے امام صاحب کی طرف رجوع

کا قول بھی منسوب کرتے ہیں، لیکن "معارف السنن" میں حضرت بنوری رحمہ اللہ نے امام صاحب کی اصل رائے کی تائید ودفاع میں علمی بحث کا حق ادا کیا ہے، حضرت شہید بھی اسی پر عمل پیرا رہے، البتہ استاد وشاگرد میں تفصیل واختصار کا فرق ضرور ہے، مضمون کی طوالت سے اجتناب کرنے کے لیے ہم صرف حضرت اورکزئی رحمہ اللہ کی طرف سے امام صاحب کے مذہب پر وارد اعتراضات کے جوابات نقل کرتے ہیں:

۱۔لفظ "الماء" کو قرآن نے آیت تیمم میں سیاق نفی میں ذکر کیا ہے جو عموم کا فائدہ دیتا ہے اور لسان نبوت "نبیذ" کو "الماء" قرار دے چکی ہے۔

۲۔"وضو بالنبیذ" کی روایت کو حضرت ابن مسعودؓ سے پندرہ راویوں نے نقل کیا ہے۔

۳۔اتنی بڑی تعداد میں روایات سے "نسخ الکتاب" یا کم از کم کتاب اللہ پر زیادتی کی گنجائش پیدا ہوتی ہے۔

۴۔آیت تیمم میں "الماء" مذکور ہے، جو "عام مخصوص منہ البعض" ہے، لہٰذا قیاس بھی اس کے لیے "مخصص" ہوسکتا ہے، چہ جائیکہ حدیث حسن صحیح بھی اس کی تائید کرتی ہو۔

۵۔حدیث نبیذ کے رواۃ پر جرح ناقابل قبول ہے، اس لئے کہ ان کی تعدیل بھی ثابت ہے۔

۶۔"لیلۃ الجن" چھ مرتبہ ثابت ہے، لہٰذا نفی کو ترجیح نہیں دی جاسکتی۔

۷۔جب احتمال کا ثبوت پیدا ہوگیا ہے تو ابن مسعودؓ کے فرزند ابوعبیدہؒ کا استدلال باطل قرار دیا جاسکتا ہے۔

۸۔یہاں امام صاحب نے آثار مرفوعہ کو منشائے شریعت قرار دیا ہے، جن کی بڑی تعداد ہے (اس بات کی طرف اشارہ ہوچکا ہے)۔

۹۔ثبوت نسخ کے لیے کوئی دلیل شافی موجود نہیں۔

امام طحاویؒ کی "نظر" کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ وہ نظر تو مقبول نہیں ہوسکتی، اس لئے کہ نظر میں حضر اور سفر کے فرق کو عمل اجماعی قرار دیا گیا ہے، حالانکہ کبھی پانی کی موجودگی کی صورت میں بھی تیمم جائز ہوتا ہے تو اجماع صرف دعویٰ تک محدود ہے، حقیقت اجماع ہرگز موجود نہیں۔

مذکورہ بالا نکات حضرت شہید رحمہ اللہ کی "تلخیص" کی روشنی میں رقم کئے گئے ہیں، اور اس مقام کے پیش نظر ہم نے اختصار کو ترجیح دی ہے، اگر کہیں پیچیدگی محسوس ہو تو قارئین اصل کتاب کی طرف رجوع فرماسکتے ہیں، اس تحقیق کے بعد حضرت شہید رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "مذکورہ سطور حصول صواب کے لیے کافی ہیں اور یقیناً حق بھی وہی ہے جو امام صاحب نے فرمایا ہے، اس لیے کہ:

اذا قالت حذام فصدقوها

فان القول ماقالت حذام (نثر الازھار ص: ۲۰۳ و ۲۰۴)

حضرت رحمہ اللہ کی علمی زندگی مذکورہ بالا تحقیقات سے معمور نظر آتی ہے، یہی حضرت کی ذات اقدس کے لیے سرمایہ حیات بھی ہے اور سرچشمہ حیات بھی، حضرت کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے مختلف احوال کو ان کی علمی زندگی کے اس نوع کے زندہ و تابندہ کارناموں کے ساتھ جوڑا جائے تو عاملین شریعت اور حاملین اسرار نبوت سے مزین ایک رجل باصفا دکھائی دیتا ہے، جو غیرت وحمیت میں اپنے آباؤ اجداد کی اسلامیت پسندی کا پرتو تھا، مشتاق نگاہیں ان کے وجود مثالی کا تصور کر کے ذاتی اوصاف کے پہلو سے ان جیسے مردان کار سے زمانے کو تہی دامن پاتی ہیں، اللہ تعالی حضرت رحمہ اللہ کی کامل مغفرت فرمائے اور ان کے علمی سرچشموں کو یونہی رواں دواں رکھے، آمین!

نثر الأزھار علی شرح معانی الآثار

ایک تعارفی جائزہ

مولانا نور البشر

امام ہمام ابوجعفر احمد بن محمد بن سلامۃ الطحاوی المصری رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی علوم حدیث سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے غیر معروف نہیں۔ امام ابوجعفر الطحاوی رحمۃ اللہ علیہ مشہور قول کے مطابق ۲۳۹ھ میں مصر میں پیدا ہوئے، اجل محدثین خصوصاً اصحاب ستہ کی معاصرت انہیں حاصل ہوئی، بلکہ تقریباً چھتیس شیوخ میں ان حضرات کے ساتھ امام طحاوی رحمہ اللہ علیہ بھی شریک رہے، آپ کی وفات ۳۲۱ھ میں ہوئی۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی ثقاہت، فقاہت، علم حدیث میں امامت، تصانیف میں براعت پر اہل علم کا اجماع ہے، چنانچہ ابن یونس، ابن عساکر، مسلمہ بن القاسم، ابن عبد البر، سمعانی، طبرانی، حمیدی، خطیب بغدادی، ابن الجوزی، حافظ ذہبی، ابو اسحاق شیرازی، مورخ صفدی، حافظ سیوطی، سبط ابن الجوزی، حافظ عینی، علامہ کشمیری، علامہ کوثری، علامہ محمد بن یوسف بنوری رحمہم اللہ کے اقوال ان کی مدح میں معروف ہیں، البتہ امام بیہقی، امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن حجر رحمہم اللہ نے ان پر بھی معمولی امور کی وجہ سے کچھ کلام کیا ہے لیکن درحقیقت ان حضرات کا یہ سارا کلام

مردود ہے۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کثیر التالیف اور جید التصنیف بزرگوں میں سے ہیں، آپ کی تصنیفات میں شرح معانی الآثار، شرح مشکل الآثار، العقیدۃ الطحاویۃ، کتاب فی النحل واحکامھا، احکام القرآن، سنن الشافعی، صحیح الآثار، الرد علی کتاب المدلسین للکرابیسی، جزء فی التسویۃ بین حدثنا واخبرنا، شرح الشافعی، صحیح الآثار للامام محمد، المختصر الکبیر، المختصر الصغیر، اختلاف العلماء، الشروط الکبیر، الشروط الاوسط، الشروط الصغیر، شرح الجامع الکبیر، شرح الجامع الصغیر، النوادر الفقھیۃ، جزء فی حکم أرض مکۃ، جزء فی قسم الفیٔ والغنائم، کتاب الأشربۃ، جزء فی الرد علی عیسی بن ابان، جزء ان فی اختلاف الروایات علی مذھب الکوفین، جزء الرزیۃ، المحاضر والسجلات، الوصایا والفروض، الخطابات فی الفروع، التاریخ الکبیر، النوادر والحکایات، الرد علی ابی عبید شامل ہیں۔

ان کتابوں میں اکثر کتابیں نایاب ہیں۔صرف شرح معانی الآثار، شرح مشکل الآثار اور العقیدۃ الطحاویۃ مطبوع ومتداول ہیں۔البتہ "اختلاف العلماء" کی تلخیص امام ابوبکر الجصاص الرازی نے کی ہے، وہ کتاب عرصہ قبل جدہ یونی ورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر عبداللہ نذیر احمد کی خدمت اور تعلیق "مختصر اختلاف الفقھاء" کے نام سے مطبوع ہوکر آئی ہے۔ان تمام تصانیف میں شرح معانی الآثار کا مرتبہ سب سے بڑھا ہوا ہے اور روز تالیف سے لے کر آج تک علما میں مقبول اور متداول رہی ہے، برصغیر میں تو یہ کتاب درس نظامی میں بھی شامل ہے، اگرچہ حضرت کشمیری کے بقول ابوجعفر کے ساتھ کبھی انصاف نہیں ہوا۔

شرح معانی الآثار کی قدیماً وحدیثاً کافی خدمت ہوئی ہے۔اس کتاب کی خدمت کرنے والوں میں امام ابن عبدالبرؒ، حافظ زیلعیؒ صاحب نصب الرایہ، ابن رشد مالکیؒ، حافظ عبدالقادر قرشیؒ، حافظ بدرالدین عینیؒ اور قاسم قطلو بغا رحمہم اللہ جیسے اساطین حدیث شامل ہیں، آخری دور میں حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی اور حضرت مولانا عاشق الٰہی بلند شہری رحمہا اللہ نے بھی اس کی شرح لکھ کر گراں قدر خدمت کی ہے۔

حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ پاکستان کے علما میں ایک نامور عالم دین اور علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے انتہائی لائق فائق شاگردوں میں سے تھے۔حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے حکم اور اصرار پر مولانا موصوف نے انتہائی جانفشانی اور عرق ریزی سے شرح معانی الآثار کی تصحیح وتعلیق وتخریج کا عظیم علمی کارنامہ انجام دیا ہے۔مولانا موصوف کے کاموں کا خلاصہ درج ذیل ہے:

ا۔احادیث پر نمبر شمار لگانے کا اہتمام فرمایا ہے، لیکن یہ نمبر مسلسل ڈالنے کے بجائے ہر ایک باب کی احادیث پر الگ الگ ڈالے گئے ہیں۔

۲۔سند حدیث کے درمیان میں ہی راویوں کے مختصر مگر جامع ترین اوصاف پر مشتمل حالات نقل کر دیئے ہیں اور اصل اور اضافی کی تمیز چھوٹے اور بڑے حروف کے ذریعہ ہو جاتی ہے، یعنی اصل کے حروف موٹے (بولڈ) ہیں اور اضافی عبارت کے حروف چھوٹے ہیں پھر ان کو بریکٹ [ ] کے درمیان کر دیا ہے۔

رجال سند پر کلام کے لئے ائمہ رجال حافظ مزی، ذہبی، خزرجی، عسقلانی، عینی وغیرہ کی کتابوں سے مدد لی ہے۔ صرف تقریب التهذیب یا الکاشف پر انحصار نہیں کیا۔

راویوں کے سن وفات ذکر کرنے کا التزام کیا ہے، البتہ کسی کی تاریخ وفات معلوم نہ ہو تو حافظ ابن حجر کے ذکر "طبقات" کی اتباع کی ہے۔

۳۔شرح معانی الآثار کے جو نسخے اب تک چھپتے آئے ہیں، ان میں اغلاط کی کثرت ہے، اس سلسلہ میں علامہ محمد یوسف کاندھلوی کے علاوہ، مولانا محمد ایوب سہارنپوری رحمہما اللہ نے نہایت گراں قدر کام کیے تھے، مولانا محمد امین صاحبؒ نے ان حضرات کی خدمت کو سامنے رکھتے ہوئے متن شرح معانی الآثار کی تصحیح بھی فرمائی ہے۔

۴۔پھر تعلیقات میں سب سے پہلے ہر باب کے شروع میں "التلخیص" کا عنوان قائم فرمایا ہے، اس عنوان کے تحت انہوں نے ائمہ مجتہدین کے مذاہب کو توسع کے ساتھ نقل کیا ہے، مذہب کو نقل کرتے ہوئے عبارت کی تسہیل اور سلاست کا خاص خیال رکھا ہے تاکہ فہم مقاصد میں مشکل نہ پیش آئے۔

پھر نقل مذاہب کے سلسلہ میں اصحاب مذاہب کی اصل معتمد کتب کے حوالے 'جلد وصفحات کی قید کے ساتھ' درج کیے ہیں۔ نیز اس "تلخیص" کے اواخر میں ہر باب کی احادیث وآثار کا مکمل احصا کر کے یہ بتا دیا کہ اس میں کتنی حدیثیں مرفوع ہیں اور کتنی موقوف۔

۵۔احادیث کی نہایت توسع کے ساتھ تخریج کی ہے، پھر حوالہ دینے میں بھی انتہائی احتیاط کی ہے، چنانچہ:

کوئی حدیث بعینہ انہی الفاظ کے ساتھ دوسری کتابوں میں یا خود شرح معانی الآثار میں موجود ہو تو اس کے لئے "اخرجه فلان مثله" یا "رواه فلان مثله" کے جملے لائے ہیں۔

اگر بعینہ الفاظ نہ ہو بلکہ اختلاف ہو تو پھر تھوڑا سا اختلاف ہو تو "اخرجه بمثله" فرماتے ہیں اور اگر اختلاف زیادہ ہو تو حسب مراتب "اخرجه نحوه" یا "بنحوه" یا "بمعناه" کے الفاظ لاتے ہیں۔

بعض اوقات "لم اقف علیه" کے الفاظ لاتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مخصوص طریق کا علم نہیں

ہوسکا، مطلقاً عدم اطلاع مراد نہیں الا نادرا۔

۶۔ اب تک اس کتاب کی صرف ایک جلد منظر عام پر آسکی ہے، جو بڑے سائز کے چھ سو صفحات پر مشتمل ہے، دوسرے ایڈیشن میں اس کو دو متوسط جلدوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ان میں کتاب الطہارۃ مکمل اور کتاب الصلوۃ باب القرأۃ فی رکعتی الفجر تک کی احادیث آگئی ہیں۔

اس جلد کی ابتدا میں ان مراجع ومصادر کی ایک نا تمام فہرست بھی دی ہے، جن سے تعلیق وتخریج میں مدد لی گئی۔ جب کہ آخر میں فہرست عنوانات کے علاوہ ان راویوں کی فہرست بھی دے دی ہے جن کے تراجم اس جلد میں ہیں، یہ کل ۱۵۶۷ ر راوی ہیں۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کی بقیہ جلدیں جلد منظر عام پر لانے کی سبیل پیدا فرمادیں۔ (آمین)

مسانید الامام ابی حنیفہ کا تعارفی جائزہ

مولانا سمیع اللہ سعدی

خاتمۃ المحدثین حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کی خدمات علمیہ حدیث نبوی کی خدمت اور حنفیت کی ترجیح واستحکام سے عبارت تھیں، آپ کے اخص الخاص تلمیذ رشید محدث العصر حضرت مولانا یوسف بنوریؒ اس مزاج میں اپنے شیخ کی ہو بہو عکس تھے۔ معارف السنن کی شاہ کار شرح ایک طرف اگر حدیث واصول حدیث کے رموز سے لبریز ہے تو دوسری طرف حنفیت کی ترجیح اور مختلف فیہا مسائل میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مواقف فقہیہ کے دلائل وترجیحات کا خزانہ ہے، محقق العصر حضرت مولانا امین اورکزئی شہید رحمہ اللہ بھی اپنے شیوخ کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا تھے۔ نثر الازہار کی شکل میں حدیث وفقہ حنفی کی مالاترتیب دی تو مسانید امام ابوحنیفہ کی صورت میں امام الہمام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی حدیثی خدمات کی دستاویز لکھی، اس کتاب کے اہم مندرجات اور اس پر مختصر تبصرہ پیش خدمت ہے۔

اس کتاب کا نام 'مسانید الامام ابو حنیفۃ وعدد مرویاتہ من المرفوعات والآثار' ہے۔ نام سے یہ بات واضح

ہوتی ہے کہ کتاب میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی مسانید اور آپ کی روایات کی تعداد کا بیان ہوگا، ۱۹۰ رصفحات کا یہ مقالہ بنیادی طور پر تین فصول پر مشتمل ہے:

فصل اول: امام اعظمؒ کے مختصر حالات اور محدثانہ مقام کے بیان میں ۷۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

فصل دوم: امام اعظمؒ کی مسانید، اربعینات ووحدانیات کے تعارف کے ساتھ ساتھ ان کے جامعین ورواۃ کے تراجم کے بیان میں تقریباً ۹۰ صفحات کو محیط ہے۔

فصل سوم: میں امام صاحبؒ کی مرفوع، مسند، مرسل، موقوف وغیرہ روایات کی علیحدہ علیحدہ تعداد کو شمار کیا گیا ہے اور آخر کتاب میں ۱۱۸ رمراجع ومصادر اور پھر موضوعات کی فہرست ہے۔

اس مقالہ کے تعارفی جائزہ سے قبل بہتر ہوگا کہ یہاں اس کی جامعیت پر محدث، ناقد محمد عبدالرشید نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ کے وہ کلمات بعینہٖ نقل کردیے جائیں جو اس کتاب کے پہلے صفحے پر مذکور ہیں:

"طالعت هذه المقالة الثمينة للاستاذ العالم الشيخ محمد امين الاوركزئي، فوجدته قد وفى البحث حقه، وتكلم على جميع أنحاء الموضوع، وأتى بغرر النقول، واجتنب الهذر والفضول مع الوجازة وحسن البيان، فلله دره، وعليه اجره۔"

ان مختصر توثیقی کلمات کے اندر مولانا نعمانیؒ نے مقالہ کی پانچ خصوصیات کا ذکر کیا ہے:

(۱) ایفاء البحث حقه (۲) الکلام على جميع انحاء الموضوع (۳) الاتيان بغرر النقول (۴) اجتناب الهذر (۵) الوجازة وحسن البيان۔

فصل اول سے پہلے ایک مقدمہ ہے، جس میں کتاب لکھنے کی وجہ اور اس کے ساتھ صحابہ میں فقہ وتفقہ کی مختصر تاریخ کا بیان ہے، کتاب لکھنے کی وجہ بتاتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ یہ کتاب میں نے اپنے دو اساتذہ محدث العصر مولانا یوسف بنوریؒ اور مولانا محمد ادریس میرٹھیؒ کے حکم وایما پر لکھی، دراصل یہ مولانا اورکزئیؒ کے تخصص فی الحدیث کا مقالہ ہے جو انہوں نے دوران تعلیم لکھا ہے۔ قرن اول میں فقہ واجتہاد کی تاریخ بیان کرتے ہوئے تفقہ وملکہ اجتہاد اور مشاغل علمیہ کے اعتبار سے ایجاز واختصار کے ساتھ صحابہ کی اقسام بیان کی ہیں، لکھتے ہیں:

"ومع اختلافهم في الملازمة اختلفت اذواقهم، فمنهم من كان يكثر في التحديث بما سمعه وحفظه، ومنهم من كان يقل في ذلك ورعا واحتياطا، لذلك تراهم متفاوتين في الرواية قلة وكثرة ثم بعد هذا الاختلاف في الذوق كانوا متباينين في الحفظ والفهم لما يسمعون، فمنهم من كان يسمع ولا يحفظ لفظه بل يروي معناه ومنهم من كان جيد الفهم والحفظ معا ومنهم الوسط بين ذلك، كما ترى ذلك التفاوت بينهم

فی فهم القرآن الحکیم۔ (ص:۳)

الفصل الاول فی ترجمۃ الامام

عمدہ مقدمہ کے بعد فصل اول کے مباحث کا آغاز کیا ہے، اور سات عناوین میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مفصل حالات بیان کیے ہیں۔ سب سے پہلے کوفہ کی علمی اہمیت اور مرکزیت پر گفتگو کی ہے، خاص طور پر کوفہ میں علم حدیث کے نشوونما وارتقا کے حوالے سے جامع بحث کی ہے۔ کوفہ میں حدیث وفقہ کی مختلف درسگاہوں میں خصوصی طو پر حضرت علی وابن مسعود رضی اللہ عنہما کے حلقات درس اور ان سے فیضیاب ہونے والے اساطین کا ذکر کیا ہے، کیونکہ اسی چشمۂ صافی سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے علمی پیاس بجھائی تھی۔ کوفہ کی مرکزیت علمی کے بیان کے بعد "مشائخ الامام" کا عنوان باندھ کر آپ کے اہم مشائخ واساتذہ کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے معروف اساتذہ کے مختصر تراجم بھی بیان کیے ہیں۔ بیان اساتذہ کے بعد "الامام ابو حنیفه و مکانته فی الحدیث" کے عنوان سے آپ کی محدثانہ شان پر گفتگو کی ہے، اس طویل اور پامال موضوع کو چھ اہم مقدمات میں بیان کیا ہے، ان چھ مقدمات کو اگر اس موضوع کی جامع تلخیص کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کے بعد "ثناء الائمه الاعلام علی ابی حنیفه فقیه الاسلام" کے دل آویز عنوان سے ائمۂ کرام واساطین امت سے امام ابوحنیفہ کی عظمت میں منقول اقوال ذکر کیے ہیں۔ اس میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی اہم خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ وہ واحد مجتہد ہیں، جن کی سوانح بقیہ تینوں مسالک کے علما نے لکھی ہے۔ بیان مدائح کے بعد امام صاحب پر ہونے والے مطاعن کی طرف اشہب قلم کو موڑا ہے، اور "کلمة فیمن یطعن فی هذا الامام الجلیل" کے عنوان سے مطاعن پر عمدہ گفتگو کی ہے، اس سلسلے میں جملہ مطاعن کو تین اقسام میں محصور کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

و جل ما نقموه من الامام رحمه الله ثلاثه امور: الاول قلة الحدیث و ضعفه فیه، و الثانی الارجاء و ما یتعلق فیه، الثالث الرأی و تقدیمه علی النصوص۔

ان تینوں امور پر بحث کی ہے، خاص طور پر ارجا پر بحث کرتے ہوئے ایمان کی حقیقت اور اس میں اہل سنت و دیگر معروف فرق اسلامیہ کے نظریات ومذاہب بیان کیے ہیں۔ رائے کے حوالے سے رائے کا معنی ومفہوم اور اس کے مختلف مصادیق بیان کیے ہیں، اس کے بعد امام صاحب کے حوالے سے رائے کی کثرت وتقدیم والے الزام کا مختصر وجامع جواب دیا ہے۔

الفصل الثانی فی بیان مسانید الامام

دوسری فصل میں کتاب کا اصل موضوع بیان کیا ہے، مسانید امام کے بیان سے پہلے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی

شرائط حدیث پر بحث کی ہے اور امام صاحب کی سوانحات میں منقول مختلف روایات اور دیگر قرائن سے امام صاحب کے نزدیک قبولیت حدیث کی درجہ ذیل شرائط بیان کی ہیں:

۱۔ راوی عادل وثقہ ہو۔

۲۔ روایت کتاب اللہ وسنت مشہورہ کے خلاف نہ ہو۔

۳۔ راوی کا عمل حدیث کے موافق ہو۔

۴۔ راوی فقیہ ہو، لیکن مصنف کے نزدیک یہ شرط قبولیت حدیث کے لئے نہیں ہے بلکہ امام صاحب کے نزدیک تعارض کی صورت میں فقہ راوی وجوہ ترجیح میں سے ایک اہم وجہ ترجیح ہے۔

۴۔ روایت عموم بلوی کے خلاف نہ ہو۔

۶۔ روایت صحابہ کرام کے مباحثوں اور اختلافی مسائل میں استدلال میں پیش کی گئی ہو، اگر روایت صحابہ کرام میں ہونے والے اختلافات فقہیہ سے متعلق ہو اور کسی صحابی نے بھی اس سے استدلال نہ کیا ہو تو یہ اس حدیث کے قابل رد ہونے کے قرائن میں سے ایک مضبوط قرینہ ہے۔

۷۔ روایت توارث وتعامل کے خلاف نہ ہو۔

۸۔ راوی اگر مبتدع ہو تو روایت اس کے مذہب کی مؤید نہ ہو۔

۹۔ وقت سماع سے لے کر وقت ادا تک راوی کو روایت یاد ہو، درمیان میں حفظ کے اعتبار سے انقطاع نہ آیا ہو۔

قبولیت حدیث کی شرائط کے بعد مصنف نے امام صاحب سے مختلف طرق سے مروی کتاب الآثار کو ابواب فقہیہ کی ترتیب پر حدیث کی سب سے اولین تصنیف قرار دیا ہے، مصنف کے بقول اس کے بعد امام مالک نے مؤطا ،امام ثوری نے جامع اور امام وکیع ودیگر محدثین نے اپنی کتب لکھی ہیں۔ اس کے بعد امام صاحب کی روایات پر مشتمل درج ذیل ۴۰ کتب ومسانید کا تعارف کروایا ہے:

۱۔ کتاب الآثار بروایة زفر... ۲۔ کتاب الآثار بروایة ابی یوسف... ۳۔مسند الامام ابی حنیفة لابی یوسف... ۴۔ کتاب الآثار بروایة محمد... ۵۔مسند الامام ابی حنیفة لامام محمد... ۶۔ کتاب الآثار بروایة الحسن بن زیاد... ۷۔ کتاب الآثار بروایة حماد بن ابی حنیفة... ۸۔ کتاب الاثار بروایة حفص بن غیاث... ۹۔مسند الامام لمحمد بن خالد الوهبی... ۱۰۔مسند الامام للحارثی... ۱۱۔مسند الامام لطلحه العدل... ۱۲۔مسند الامام للحافظ بن المظفر... ۱۳۔مسند الامام لابن العدی... ۱۴۔مسند الامام لحافظ ابی نعیم... ۱۵۔مسند الامام لابی بکر محمد بن عبد الباقی الانصاری... ۱۶۔مسند الامام لقاضی ابی

الحسن الاشنانی... ۱۷۔مسند الامام لابن الخسرو... ۱۸۔مسند الامام لحافظ ابن العوام... ۱۹۔مسند الامام للعباس ابن عقدة... ۲۰۔مسند الامام للحافظ ابن المقری... ۲۱۔مسند الامام لشیخ الاسلام الانصاری... ۲۲۔مسند الامام لحافظ الدوری... ۲۳۔مسند الامام للحافظ دار قطنی... ۲۴۔مسند الامام للحافظ ابن شاهین... ۲۵۔مسند الامام لابی علی البکری... ۲۶۔مسند الامام لابی بکر الکلاعی... ۲۷۔مسند الامام للحافظ ابن عساکر... ۲۸۔مسند الامام للحافظ السخاوی... ۲۹۔مسند الامام للحصکفی... ۳۰۔جامع المسانید للخوارزمی... ۳۱۔مسند االامام للشیخ عیسی المغربی... ۳۲۔مختصر المسند لابن الشماع... ۳۳۔مختصر المسند للقونوی... ۳۴۔مختصر المسند لابی البقاء المکی... ۳۵۔مختصر المسند للخلاطی... ۳۶۔مختصر المسند للشیخ محمد بن اسماعیل... ۳۷۔مختصر المسند للشیخ الاوغانی... ۳۸۔عقود الجواهر المنیفة للزبیدی... ۳۹۔ترتیب مسند الامام للشیخ عابد السندی... ۴۰۔ترتیب المسند للحافظ قاسم۔

ہر مسند کے بیان کے ذیل میں اس کے مرتب اور جامع کے مکمل حالات بھی ذکر کیے ہیں۔اس طرح سے کتاب میں کبار علمائے احناف کے تراجم بھی آگئے،اس کے علاوہ مسند اگر مطبوع یا مخطوط نہیں،تو ان مصادر کا ذکر کیا ہے، جس میں اس مسند کا ذکر آیا ہے۔

بیان مسانید کے سلسلے میں محققین کی آراء سے اختلاف

حافظ ابن حجر کی رائے سے اختلاف

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے مسند الامام لابن عبدالباقی الانصاری کا انکار کیا ہے، جب کہ مصنف نے مختلف قرائن اور علمائے احناف سے اس مسند کو ثابت کیا ہے اور حافظ کے انکار پر تعجب وحیرت کا اظہار کیا ہے۔(ص ۵۲۱، ۶۲۱)

محقق ابوالوفاالافغانی کی رائے سے اختلاف

مسانید میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ سے مروی کتب کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے ان کی دو کتب کتاب الآثار اور مسند الامام ابی حنیفہ کا ذکر کیا ہے، جبکہ محقق افغانی نے کتاب الآثار کے مقدمے میں ان دو کتب کو ایک قرار دیا ہے ،مصنف نے اس پر گرفت کرتے ہوئے ان دونوں کے الگ الگ ہونے کو راجح قرار دیا ہے اور اس پر قرائن بھی ذکر کیے ہیں۔مصنف لکھتے ہیں:

"تنبیه:ذکر العلامة ابو الوفاء الافغانی رحمہ اللہ فی مقدمة "کتاب الآثار" ماحصله "أن الخوارزمی روی هذا الکتاب الخ۔۔۔۔۔۔پھر چند سطور بعد اپنی رائے پیش فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں:" والذی یراه هذا العبد

الفقیر وفقه الله سبحانه لما یحب ویرضاه أقرب الی الصواب أن أبا یوسف ﷺ روی "کتاب الآثار" عن الامام أبی حنیفة ﷺ مع تصرف فیه فنسب الیه"

صفحہ کے آخر تک اپنی رائے اور اس پر مدلل قرائن پیش کرنے ، اور علامہ زاہد الکوثریؒ کی موافقت بھی اپنی رائے کی تائید میں مل جانے کے بعد لکھتے ہیں:

ثم بعد تسوید هذه السطور اطلعت علی حسن التقاضی للکوثری فوجدته قد صرح فیه أن لأبی یوسف کتابین "المسند" و "الآثار" فلله الحمد۔ (ص۸۷)

محقق عبدالرشید نعمانی کی رائے سے اختلاف

مولانا عبدالرشید نعمانی نے ابن ماجہ اور علم حدیث میں ایک اصول بیان کیا ہے کہ جو بھی مسانید امام ابو یوسف ، امام محمد اور امام حماد کی طرف منسوب ہیں ، یہ کتاب الآثار کے مختلف نسخے ہیں ، اس اصول سے بھی مصنف نے اختلاف کیا ہے اور کتاب الآثار اور مسند کو الگ الگ کتب قرار دیا ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:

و أما یذکره المحقق الشهیر العلامة محمد عبد الرشید النعمانی زید مجدهم فی مؤلفاته ، ان المسانید المنسوبة الی الامام أبی یوسف ﷺ والامام حماد ﷺ والامام محمد ﷺ هی نسخ "کتاب الآثار" لا أنها مسانید مستقلة غیره ، فهو مما لا یوافق علیه ، والذی أدی الیه نظری القاصر ان هؤلاء الائمة رووا "کتاب الآثار" عن الامام رحمه الله تعالی ثم جرد کل واحد منهم الاحادیث المرفوعة من مرویات شیخهم الاجل فی مسند کما تدل علیه القرائن وعبارات القوم"۔ (ص۴۹)

الفصل الثالث فی عدد مرویات الامام

اس فصل میں مصنف نے امام صاحب سے مروی کل روایات وآثار کی تعداد کو موضوع بحث بنایا ہے ، اور لکھا ہے کہ امام صاحب کی طرف منسوب مسانید کا بیشتر حصہ چونکہ تاریخ کے حوادث کی نذر ہو گیا ، اس لئے ان تمام مسانید میں مروی روایات کا احاطہ ناممکن ہے ، اس کے علاوہ علمائے احناف کی کتب میں بہت سی روایات وآثار امام صاحب سے فقہی ابحاث کے ضمن میں مروی ہیں ، ان کو شمار کرنا بھی تفصیل طلب کام ہے ، اس لئے امام صاحب سے مروی کل روایات کو کما حقہ جاننا ناممکن سی بات ہے ، ان مشاکل واعذار کی بنا پر صرف خوارزمی کی جامع المسانید میں مروی روایات کی تعداد بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے ، جامع المسانید میں روایات کی تعداد کی تفصیل مصنف کے بقول کچھ یوں بنتی ہے:

کل روایات: ۱۷۰۱...... مرفوع احادیث: ۹۱۶...... مرفوع مسند احادیث: ۳۵۶...... موقوف آثار: ۷۹۴

اس کے ساتھ مرفوع میں مرسل ومنقطع اور مکررات کی تعداد بھی بیان کی ہے اور مختلف صحابہ سے مروی روایات بھی تعداد کے اعتبار سے الگ کی ہیں، جب کہ موقوف میں صحابہ وتابعین کے آثار کی تعداد الگ الگ کی ہے اور پھر معروف صحابہ وتابعین میں سے ہر ایک کے اقوال وآثار کی تعداد بھی بیان کی ہے۔

اسی طرح اس مقالہ کے اہم امتیازات میں سے یہ بھی ہے کہ اس میں محدث العصر مولانا بنوریؒ کے وہ فوائد بھی بکھرے ہوئے ہیں جو مصنف نے اپنے شیخ سے خود سن کر محفوظ کیے، مثلاً صفحہ ۶ پر لکھتے ہیں:

"وقد سمعت شيخي الأجل العلامة السيد محمد يوسف البنوري ﷺ متعنا الله بفيوضهم وبركاتهم غير مرة في دروس البخاري يقول: "ان لفقهاء الاسلام منة عظيمة على الامة الاسلامية حيث" الخ

جیسا کہ صفحہ ۱۲۳ پر ایک اور فائدہ بھی ذکر فرماتے ہیں، جو مصنف نے المحدث العلام ابوالوفاء الافغانی سے ان کی کراچی کی آمد کے موقع پر دوران ملاقات سنا، مسند "ابی نعیم" کے نسخے اور اس کی اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے صفحہ ۱۲۳ پر مصنف لکھتے ہیں:

"ونسخة هذا المسند كانت موجودة بالهند عند الشيخ المحقق، الفقيه المحدث، ابي الوفاء الافغاني كما أخبرني بذلك الشيخ الموصوف نفسه، وسمعته يقول: ان مسند الامام للحافظ أبي نعيم اجود المسانيد مع صغر حجمه، وسيطبع عن قريب ان شآء الله تعالى بتصحيح العلامة أبي الوفاء وتحقيقه، جزاه الله سبحانه عنا وعن جميع المسلمين خيرا"

اس کے علاوہ بھی کئی منفرد تحقیقی آرا اور متعدد فوائد ایسے ہیں جو خاص مصنف کے فکر ونظر کا نتیجہ ہیں، مثلاً ملاحظہ ہو صفحہ ۲۱، ۳۰، ۶۰، ۸۱، ۸۷، ۹۴، ۱۲۳، ۱۳۷، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۶۳، ۱۶۹، ۱۷۳۔

دوسری طرف یہ حقیقت بھی مسلمات میں سے ہے کہ انسانی کوشش جتنی ہی مضبوط ومتقن ہو اس کا تسامح سے محفوظ رہنا شاید ناممکن ہے، اور اسلاف کے اس ارشاد "وما منا الا رد ورد عليه، ألا صاحب هذا القبر صلى الله عليه وسلم" میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے، جب کہ اہل علم ونظر کے نزدیک تو اکابر کے ان اجتہادی تسامحات کے لئے "رقية عين الكمال" کی تعبیر ہی اس کا صحیح عنوان ہے، غرض یہ کرنا ہے کہ انہی حقائق کے پیش نظر جب مذکورہ کتاب پر تحقیقی پہلو سے نظر کی گئی تو صفحہ ۱۵۴ پر ایک تسامح ظاہر ہوا، وہ یہ کہ ابوسعید الخوارزمی کے تذکرہ میں مولانا "حافظ" سے نقل کرتے ہیں: وذكر الحافظ قاسم ﷺ انه سمع محمودا۔ الزمخشري وقدم بغداد" الخ عبارت ہذا میں مولانا کا محمود کی تعیین "الزمخشری" سے کرنا محل نظر ہے، کیونکہ "الخوارزمی" کی ولادت ۵۹۳ھ، "الزمخشری" کی وفات ۵۳۸ھ ہے، پس اس بعد زمانی کے باوجود خوارزمی کا سماع زمخشری سے ناممکن ہے۔

حضرت اورکزئی شہیدؒ کے حواشی شرح النقایہ

مولانا سمیع اللہ سعدی

'النقایہ' آٹھویں صدی ہجری کے معروف عالم، فقیہ، اصولی ومتکلم صدر الشریعہ عبید اللہ بن مسعود المحبوبی کی تصنیف ہے، جو در اصل مصنف کے دادا تاج الشریعہ محمود المحبوبی کی کتاب 'وقایۃ الروایۃ فی مسائل الھدایۃ' کا اختصار ہے، مصنف نے اپنے دادا کی کتاب پر ایک مفصل شرح 'حل المواضع المغلقۃ من وقایۃ الروایۃ فی مسائل الھدایۃ' کے نام سے لکھی، جو شرح الوقایہ کے نام سے معروف ہے، اور آج تک داخل نصاب ہے، دوسرا اس کا ایک عمدہ اختصار 'النقایۃ' کے نام سے لکھا، اختصار نے بعض اسباب کی بنا پر اصل کتاب سے زیادہ شہرت پائی اور اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں، جس میں سب سے معروف شرح محدث کبیر ملا علی قاری کی 'فتح باب العنایہ فی شرح النقایہ' ہے، جسے مختصراً شرح النقایہ کہا جاتا ہے، ملا علی قاری اصلاً ایک محدث تھے، اس لیے یہ شرح نصوص وروایات کا خزانہ ہے۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی سوانح نقش دوام کے مطابق آپ ملا علی قاری کی تمام کتب میں سے

بہترین کتاب شرح النقایہ کو سمجھتے تھے۔ شیخ عبد الفتاح ابو غدہ نے بھی 'النقایۃ' اور' شرح النقایۃ' کی اہمیت اور خصوصیات کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے، آپ لکھتے ہیں:

لما كان كتاب "النقاية" لباب كتاب "الوقاية" الذي هو لباب كتاب "الهداية": كان بحق لباب اللباب. ومن أجل هذا تبارى جهابذة فقهاء الحنفية في خدمته و شرحه، واستيفاء مقاصده واظهار فرائده ـ وكان اعلاهم في هذا المضمار كعباً، وأبلغهم في نيل مقصده أرباً: المحدث على القارى الهروى. فقد نظم في شرحه: "فتح باب العناية" المزايا المنثورة في كتب من تقدمه من الأئمة، مثل كتاب "المبسوط" للسرخسي، و "البدائع" للكاساني، و "الهداية" للمرغيناني، و "الاختيار" للموصلي، و "تبيين الحقائق" للزيلعي، و "شرح الوقاية" لصدر الشريعة، و "العناية" للبابرتي، و "البناية" للعيني، و "غنية المتملي" لابراهيم الحلبي، و "حلبة المجلي في شرح منية المصلي" لابن امير الحاج الحلبي، و "فتح القدير" للكمال بن الهمام، وغيرها.

بل يمكن أن يقال: انه لخص في كتاب "فتح القدير" من معارك المناقشات والخلافات، ويسر أسلوبه، وفتح عبارته، وجاء به سهلاً سائغاً عذباً لميرا. كما أنه استخلص زبدة شروح "النقاية" التي سبقت شرحه هذا، فكانت شرحه حقاً: فتح باب العناية" وأفضل الشروح جمعاً، كما أنه أنقاها لغة، وأسلها عبارة، وأوفاها استدلالاً، وأحسنها تعليلاً (مقدمہ فتح باب العنایہ بحوالہ مقدمہ التحقیق شرح النقایہ ص ۱۴، ۱۵)

شیخ عبد الفتاح ابوغدہؒ کی عبارت سے 'النقایہ وشرح النقایۃ' کی درج ذیل خصوصیات سامنے آتی ہیں:

۱۔ نقایہ ہدایہ کے مسائل کی مختصر ترین تلخیص ہے۔

۲۔ نامی گرامی علما نے نقایہ کی شروح لکھی ہیں اور حواشی کی صورت میں اس کی خدمت کی ہیں۔

۳۔ ان شروحات میں سے سب عمدہ اور بہترین شرح ملا علی قاری کی فتح باب العنایہ ہے۔

۴۔ فتح باب العنایہ (شرح النقایہ) فقہ حنفی کے بنیادی متون وشروح کے مباحث پر مشتمل ہے۔

۵۔ اس میں شارح نے خاص طور پر فتح القدیر کے مباحث آسان اسلوب اور سلیس تعبیرات کے ساتھ سمونے کی کوشش کی ہے۔

۶۔ یہ شرح، نقایہ کی دیگر شروح کا بہترین خلاصہ ہے۔

۷۔ شرح میں استدلالات اور مسائل فقہیہ کی تعلیلات اور وجوہ سلیس عبارت اور عمدہ طرز بیان کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔

انہی خصوصیات کی وجہ سے حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہید رحمہ اللہ اس کے بڑے مداح تھے، اپنے تشکیل کردہ نصاب میں شرح الوقایہ کی جگہ شرح النقایہ رکھی تھی اور خود کئی سال تک اس کا درس دیا، دوران درس حضرت نے اس پر اختصار کے ساتھ کچھ نوٹس لکھے تھے، یہ تعلیقات اگرچہ مختصر ہیں، لیکن حل کتاب اور اہم فوائد کو متضمن ہونے کی وجہ سے خاصی اہمیت کی حامل ہیں، ان تعلیقات کا ایک طائرانہ جائزہ اور ان میں بیان کیے گئے اہم فوائد ونکات پیش خدمت ہیں:

۱۔ شریعت، طریقت اور حقیقت میں فرق

حضرت بعض مقامات پر فقہ باطنی (تصوف) کے رموز کی طرف اشارہ کرتے ہیں مثلاً یہ تعلیق ملاحظہ ہو:

الفرق بین الشریعة و الطریقة و الحقیقة ان الشریعة عبارة عن احکام الشرع فاذا صارت معمولة فهی الطریقة و اذا تکیفت بکیفیة الاحسان عند العمل سمیت حقیقة۔ (ص ۱۱)

ترجمہ: شریعت، طریقت اور حقیقت میں فرق یہ ہے کہ شریعت احکام الٰہیہ کا نام ہے، جب ان احکام کو عمل میں لایا جاتا ہے تو اسے طریقت کہتے ہیں، اور احکام شریعہ پر عمل جب احسان کی کیفیت سے متصف ہو جائے، تو اسے حقیقت کہتے ہیں۔

۲۔ ماءِ مستعمل کی طہارت پر ایک مشہور دلیل کا عمدہ جواب

ماءِ مستعمل کی طہارت پر عام طور پر وہ احادیث پیش کی جاتی ہیں، جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کرتے وقت گرتے ہوئے پانی پر صحابہ کرامؓ کی چھینا جھپٹی منقول ہے اور صحابہ کرامؓ اس پانی کو زمین پر چھوڑنے کی بجائے اپنے ہاتھوں اور چہروں پہ ملنے کی کوشش کرتے اور ایک دوسرے سے اس بارے میں سبقت ومقابلہ کرتے، اس کا جواب دیتے ہوئے حضرت لکھتے ہیں:

قلت و فیه نظر لانهم صرحوا بطهارة الفضلات من الانبیاء علیهم الصلوة و السلام فما ظنک بما یستعملونه سیما سیدهم افضل الخلائق خیر البریه اطهر خلق الله و اکملهم صلوات الله و سلامه علیه (ص ۹۳)

ترجمہ: میں کہتا ہوں: اس دلیل میں اشکال ہے، کیونکہ علما نے تصریح کی ہے کہ انبیا کے فضلات پاک ہیں، تو انبیا کا مستعمل پانی کیسے پاک نہیں ہوگا؟ خصوصاً سید الانبیا اور اللہ کی مخلوق میں پاکیزہ ترین ہستی نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا استعمال کردہ پانی کیسے پاک نہیں ہوگا۔

۳۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے ایک مسئلے میں منقول متعدد اقوال کی دقیق توجیہ

قد يظن في امثال هذا البحث ان الفقيه الدقة ابي حنيفه قال باقوال متخالفة في موضوع واحد و حاشاه ان يقول باقوال متنقاضه انما يظهر بالامعان في امثال هذه المباحث انه رحمه الله يراعي احوال الناس فيفتي للكملة بحكم و للمتوسطين باخر و للعامه بغيرهما۔ (ص ۸۴)

ترجمہ: ان جیسے مباحث میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے ایک مسئلے میں متضاد آرا دی ہیں، اس جیسے تضاد سے امام ابوحنیفہ بری ہیں، ان جیسے مباحث میں غور وفکر سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کاملین کے لیے ایک حکم کا فتویٰ دیتے ہیں، متوسط لوگوں کے لیے دوسرا حکم تجویز کرتے ہیں اور عامۃ الناس کے لیے ان کے مطابق کوئی اور حکم بتاتے ہیں۔

۴۔ مصنف پر گرفت اور اس کی رائے سے اختلاف

حضرت اورکزئی شہید رحمہ اللہ نے کئی مقامات پر مصنف کی رائے سے اختلاف کیا ہے اور ان کی رائے پر گرفت کی ہے۔ بطور مثال چند مقامات ملاحظہ ہوں:

۱۔ شارح اذان کے وقت کانوں میں انگلیاں ڈالنے کے حوالے سے کئی احادیث نقل کرنے کے بعد صاحب ہدایہ کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: واما قول صاحب الهدايه و ان لم يفعل يعني جعل اصبعيه في اذنيه فحسن لأنها ليست بسنة اصلية ففيه نظر لما تقدم من الاحاديث۔

اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے حضرت حاشیے میں رقمطراز ہیں: والجواب ان صاحب الهدايه لم ينكر سنيته بل نفي التاكد عنه و قد علل صلى الله عليه و سلم امره بمصلحة العباد بأن ذالک ارفع للصوت و مثل هذا الامر يسمى امر ارشاد يثبت به الندب (ص ۲۳۱)

ترجمہ: اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ صاحب ہدایہ نے اس عمل کی سنیت کا انکار نہیں کیا، بلکہ اس میں تاکید کا انکار کیا، چونکہ حدیث میں خود آپ علیہ السلام کی زبانی اس کی وجہ رفع صوت بیان ہوئی ہے، اور اس جیسے اوامر، جن میں بندوں کا فائدہ ملحوظ ہوتا ہے، امر ارشادی کہلاتے ہیں، جن سے ندب اور استحباب ثابت ہوتا ہے۔

۲۔ ماتن نے نماز کے لیے تلفظ بالنیۃ کو افضل قرار دیا، اس پر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قلت لا يخفى ما في هذا التعبير من البشاعة فان التلفظ بالنية لم ينقل عن النبي صلى الله عليه و سلم و لا عن الصحابة و لا التابعين و تبعيهم و لا عن الائمة الاربعة المجتهدين فكيف يفضل معمول على معمول لهم و قد عدها من البدعات الحافظ ابن تيمية و ابن القيم و مال الى قولهم ابن الهمام كما يظهر من الفتح و قد بالغ الامام الرباني المجدد للالف الثاني رحمه الله في ذم التلفظ بالنية و صحح انه بدعة سيئة ليس فيها من الحسن شئ

(۱۴۷)۔

ترجمہ: میں کہتا ہوں، اس تعبیر میں کمزوری مخفی نہیں کیونکہ تلفظ بالنیۃ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم ،صحابہ، تابعین اور تبع تابعین میں سے کسی سے بھی منقول نہیں ہے،تو بعد والا معمول ان کے معمول پر کیسے افضل ہوسکتا ہے؟ابن تیمیہ اور ابن قیم نے اسے بدعت قرار دیا ہے،اس کے بدعت ہونے کی طرف ابن ہمام بھی مائل ہیں،جیسا کہ فتح القدیر سے ظاہر ہوتا ہے،مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے اس کی خوب مذمت کی ہے اور اسے بدعت سیئہ قرار دیا ہے،جس میں کسی قسم کی کوئی خوبی نہیں ہے۔

۳۔فاتحہ خلف الامام کے ترک سے نماز فاسد ہوتی ہے یا نہیں؟اس سلسلے میں صحابہ کے اقوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:القول بالفساد فاسد۔

حضرت اس تعبیر پر گرفت ہوئے لکھتے ہیں:قلت و نسبة الفساد الی ما ثبت من اجلة الصحابة اولی بالفساد (ص۸۸۱)۔

ترجمہ: میں کہتا ہوں کہ کبار صحابہ سے منقول اقوال کی طرف فساد کی نسبت کرنا خود فساد کے لائق ہے(یعنی کبار صحابہ کے اقوال کو فاسد کہنے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ اس قائل کے قول کو فاسد کہا جائے)۔

۴۔مصنف نے مسئلہ محاذات میں بنیادی حدیث "اخروھن من حیث اخرھن اللہ" پر ابن دقیق العید کا قول نقل کیا ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے،اس پر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قلت لا نسلم وقف الحديث فان الحكم المذكور فيه غير مدرك بالقياس فله حكم الرفع ثم لفظه من حيث اخرهن الله كالصريحة في الرفع فان اسناد التاخير الى الله تعالى لا يعرف بدون الوحي على انه قد رواه رزين في مسنده عن حذيفة وعبسة مرفوعا كما في جامع الاصول۔ (ص۴۰۲)

ترجمہ: میں کہتا ہوں کہ اس حدیث کا موقوف ہونا ہمیں تسلیم نہیں ہے کیونکہ اس میں بیان شدہ حکم غیر مدرک بالقیاس ہے،اس لیے بظاہر موقوف ہوتے ہوئے بھی یہ مرفوع کے حکم میں ہے۔اس کے علاوہ روایت کا یہ جملہ "اخروھن من حیث اخرھن اللہ" رفع پر صراحت ہے،کیونکہ اللہ کی طرف نسبت بغیر وحی کے معلوم نہیں ہوسکتی،نیز رزین نے اسے اپنی مسند میں حضرت حذیفہ وعبسہ سے مرفوع بھی نقل کیا ہے،کمافی جامع الاصول۔

۵۔مصنف نے مکی کے لیے استقبال قبلہ کے حوالے سے علامہ عینی کا قول نقل کیا ہے اور اسے غرابت سے موصوف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:واغرب العيني في قوله وفرض عين الكعبة للمكي بالاجماع حتى لو صلى المكي في بيته ينبغي ان يصلي بحيث لو ازيلت الجدار ان يقع استقباله على شطر الكعبة۔

حضرت رحمہ اللہ علامہ عینی کا دفاع کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قلت: لاغرابة في مقال البدر العيني فان اللام في قوله للمكي للعهد المراد به هو المعاين و في قوله حتى لو صلى المكي المراد منه غير المعاين كما يظهر من صنيعه من وضع المظهر موضع المضمر فلا غرابة في دعوى الاجماع۔۔۔ ثم هذه المقالة ما انفرد بها بدر العلماء و المحدثين بل اتى بنحوها المحقق ابن الهمام في الفتح و ابن نجيم في البحر و غيرهما۔ (ص ۴۴۱)

ترجمہ: میں کہتا ہوں کہ بدر عینی کی بات میں کوئی غرابت نہیں ہے، کیونکہ مکی میں لام عہد کے لیے ہے اور اس سے مراد وہ مکی ہے جو بیت اللہ کا مشاہدہ کر رہا ہو، اور آگے والے جملے میں مکی سے مراد غیر معائن ہے، جیسا کہ دونوں جگہ اسم ظاہر لانے سے مترشح ہوتا ہے، لہٰذا اجماع کے دعویٰ میں کوئی غرابت نہیں ہے۔ پھر اس بات میں علامہ عینی منفرد نہیں ہے بلکہ اسی مفہوم کی حامل بات ابن ہمام نے فتح القدیر اور ابن نجیم نے بحر و دیگر کتب میں کہی ہے۔

۵۔ اغلاط و اخطا کی نشاندہی

حضرت نے بہت ساری جگہوں پر متن و شرح میں موجود اخطا کی نشاندہی کی ہے، جن میں سے بعض سہو ناسخ کا نتیجہ ہیں، بعض خود مصنف کے تسامحات ہیں، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ مصنف نے میت کو قبر میں رکھتے ہوئے بسم اللہ وعلی ملۃ رسول اللہ کہنے پر حدیث پیش کی اور اس حدیث میں صاحب ہدایہ کے تسامح کا بھی ذکر کیا کہ صاحب ہدایہ نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابا دجانہ کو قبر میں رکھتے ہوئے یہ کلمات کہے تھے، حالانکہ وہ صحابی ابا دجانہ نہیں تھے بلکہ البجادین تھے۔ حضرت اس پر حاشیہ میں لکھتے ہیں:

هذا ايضا مصحف و الصواب ذو البجادين و اسمه عبد الله بن عبد نهم المزني رضي الله عنه كما في الاصابة۔ (ص ۹۲۳)

ترجمہ: البجادین بھی غلط ہے، ذو البجادین ہے، جن کا نام عبداللہ بن عبدنہم مزنی ہے۔

۲۔ زکاۃ میں جانوروں کی تعداد پر بحث کرتے ہوئے مصنف نے ایک حدیث پیش کی، جس میں حضرت معاذؓ کے یمن سے لوٹنے کا ذکر ہے، اور پھر خود اس پر اشکال کیا کہ اس سے لگتا ہے کہ حضرت معاذ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے یمن سے آگئے تھے، یوں پھر دو دفعہ حضرت معاذ کے یمن بھیجنے کو ماننا ہوگا، کیونکہ یہ بات طے ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت حضرت معاذ یمن میں تھے۔ حضرت اس پر تعلیقات میں لکھتے ہیں:

الصواب من الشام و اخطا بعض الرواة بذكر اليمن كما حققه المحققون من المحدثين (ص ۶۵۳)

ترجمہ: درست بات یہ ہے کہ جب حضرت معاذؓ شام سے لوٹے، یمن کا ذکر بعض رواۃ کی غلطی ہے، جیسا کہ

محقق محدثین نے اس کی نشاندہی کی ہے۔

۳۔مصنف نے باب الزکوٰۃ میں نسائی، ابوداؤد اور مسند احمد کے حوالے سے ''عن مسعر'' کہہ کر ایک حدیث ذکر کی ہے، اس پر حضرت لکھتے ہیں: الصواب سعر (بفتح السین او کسرها) بن دیسم او ابن سوادة کما فی الاصابة والمختصر للمنذری وهو کذلک فی السنن لابی داؤد والنسائی فی ابواب الزکوٰة المجلد الثانی من المسند۔ (ص ۳۵۷)

ترجمہ: درست سعر ہے، سین کے فتحہ یا کسرہ کے ساتھ، جب کہ باپ کا نام دیسم یا سوادہ ہے، اصابہ اور منذری کی مختصر میں اسی طرح ہے، نیز نسائی اور ابوداؤد کی ابواب الزکوٰۃ اور مسند احمد کی دوسری جلد میں بھی مسعر کی بجائے سعر ہے۔

اس طرح کی باریک غلطیوں پر تنبیہ حضرت کی وسعت نظر اور تحقیقی ذوق کی آئینہ دار ہے۔

۴۔مصنف ایک جگہ لکھتے ہیں: فسر الروایة الاخیرة فی الصحیح۔

حضرت کی نحوی حس اس پر بیدار ہوتی ہے اور حاشیہ میں لکھتے ہیں:

فی العبارة سقط او رکاکة والصواب فسرته الروایة الاخری فی الصحیح۔ (ص ۱۹۷)

۵۔مصنف نے عید الفطر میں مسنون اعمال کے ضمن میں طبرانی سے ایک حدیث نقل کی ہے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اعرابی کے مانگنے پر اپنا نیا جوڑا اسے دیا اور خود دو پرانی چادریں اوڑھ لیں، پرانے کپڑوں کے لیے مصنف نے بحوالہ طبرانی ''دعا بمقعد تین'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں، اس پر گرفت کرتے ہوئے حضرت حاشیہ میں لکھتے ہیں: قلت هذا تصحف من الناسخ فقد ذکره الهیثمی فی مجمع الزوائد بحوالة الطبرانی ''فدعا بمعقدتین'' وهذا ایضاً اظنه مصحفا والصواب ما وقع فی الکنز من حدیث سهل بروایة ابن جریر وفیه ''دعا بمعوذین'' المعوذ هو الثوب الخلق کما فی النهایة (ص ۳۰۰)

میں کہتا ہوں: یہ ناسخ کی غلطی ہے، ہیثمی نے بحوالہ طبرانی بمعقدتین کے الفاظ ذکر کیے ہیں اور یہ بھی غالباً تصحیف ہے، صحیح لفظ کنز میں حدیث سہل میں آیا ہے، بمعوذین۔ معوذ پرانے کپڑے کو کہتے ہیں جیسا کہ النہایہ میں مذکور ہے۔

بطور نمونہ کے صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا، ورنہ ہر دوسرے تیسرے صفحے پر اس طرح کی تصحیفات، اخطا اور تسامحات کی نشاندہی کی گئی ہے، یہ تصویبات حضرت کی باریک بینی اور کتب احادیث وفقہ پر محققانہ نگاہ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

۲۔مبہمات کی توضیح اور مشکل الفاظ کی تشریح

حواشی میں جا بجا شرح کے مغلق مقامات کی تسہیل، مبہم الفاظ و اسا کی توضیح اور مشکل الفاظ کی تشریح کی گئی ہے، چند مقامات ملاحظہ ہو:

۱۔مصنف نے سنن اربعہ اور ابن قطان سے ایک روایت نقل کی ہے، ابن قطان کی توضیح کرتے ہوئے حضرت لکھتے ہیں: هو ابو الحسن علی بن محمد بن عبد الملک الفاسی الكتامی المعروف بابن القطان صاحب بيان الوهم والايهام وشارح الاحكام لعبد الحق الاندلسی وصاحب التاليفات الاخرى المتوفى ۶۲۸ھ (ص ۱۹)

۲۔کتاب الصلوۃ میں ایک جگہ مصنف طحاوی سے ایک روایت نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وفی الطحاوی ان ابن جريج قال لابی هريرة۔

ابن جریج کی وضاحت کرتے ہوئے حاشیہ میں حضرت لکھتے ہیں:

المراد منه عبيد بن جريج المدنی التابعی الثقة من الثالثه لا ماهو المعروف بهذا الاسم اعنی عبد الملک بن عبد العزيز بن جريج كما هو مصرح فی شرح معانی الآثار (ص ۱۱۵)

۳۔مصنف ایک مقام پر مسئلہ ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: كذا فی الحصر۔

حضرت حصر کی توضیح کرتے ہوئے حاشیہ میں رقمطراز ہیں:

المراد بالحصر حصر المسائل تاليف الامام ابی الليث نصر بن محمد السمرقندی الفقيه و هو فی الفروع ذكر خليفة فی الكشف وقد ورد ذكره فی السراجية وغيرها من الكتب۔ (ص ۲۳۵)

۵۔مصنف ایک جگہ چند مقامات کے نام ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ذات الرقاع و بطن نحل و عسفان و ذی قرد بفتحتين موضع قرب المدينة والسكينة۔

ان مقامات کی تشریح میں حضرت لکھتے ہیں: ذات الرقاع شجرة بنجد و قيل: اسم جبل فيه بياض و حمرة وقيل لكونهم عصبوا ارجلهم بالرقاع، و بطن نحل قرية قريبة من المدينة على طريق البصرة، وعسفان منهل بين جحفة و مكة، و ذی قرد يقال: ذو قرد ما على نحو يوم من المدينة مما يلی غطفان، السكينة الصواب المسكينة و هو من اسماء المدينة المنورة كما فی تاج العروس (ص ۳۴۲)

۶۔ایک روایت میں الحجل و اليعاقيب کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الحجل (چکور) و اليعاقيب جمع يعقوب و هو طائر معروف (ص ۵۲۷)

۷۔ایک روایت میں يخبط لا باعر کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یخبط ای یضرب الشجر بالعصا لیتناثر اور اقہ و اباعر جمع بعیر (ایضا)

آخری گزارش

یہ چند مقامات مشتے نمونہ از خروارے ہیں، یہ حواشی اس قابل ہیں کہ انہیں باقاعدہ شرح النقایہ کے ساتھ چھاپ دیا جائے، یقیناً بہت سے مقامات کی توضیح میں ممد ہوں گے، اس کے علاوہ فقہ وحدیث کے بیش بہا موتی الگ سے ہاتھ آئیں گے۔ حواشی میں اختصار کا پہلو غالب ہے، البتہ چند اہم مقامات پر بسط سے بھی کام لیا گیا ہے، (مسئلہ فساد صلوٰۃ بمحاذاۃ المرأۃ، فاتحہ خلف الامام ومسئلہ المیاہ وغیرہ) امید ہے کہ حضرت کے صاحبزادگان، متوسلین اور تلامذہ اس علمی سرمایے کو محفوظ کرنے اور اسے بقیہ نسلوں تک پہنچانے کے لیے کردار ادا کریں گے۔

تعلیقات تاریخ الاسلام ذہبی پر ایک نظر

مولانا صفی اللہ، کوہاٹ

تاریخ الاسلام ذہبیؒ کا شمار تاریخ کے معتبر مراجع میں ہوتا ہے جس میں دور نبوی سے لے کر آٹھویں صدی کے نصف تک حالات قلم بند ہیں۔ چونکہ یہ تاریخ ذہبیؒ جیسے نقاد کے قلم سے لکھی ہوئی ہے اس لیے اس میں کافی حد تک احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ مبالغہ آمیز واقعات کی صحیح منظر کشی کی گئی ہے اور بہت سی شخصیات جو سیاسی اور مسلکی عناد کی بھینٹ چڑھ گئی تھیں ان کے بارے میں محتاط اور منصفانہ تجزیہ آگیا ہے۔

ہمارے پیش نظر تاریخ اسلام کا جو نسخہ ہے، یہ ۵۲ جلدوں پر مشتمل ڈاکٹر عمر عبدالسلام تدمری کی تحقیق کے ساتھ چھپا ہے، حضرت نے ۲۰۰۱ء میں دو ماہ سے کم مدت میں اس کا مطالعہ مکمل کیا۔ مطالعہ کے ساتھ ساتھ آپ تعلیقات کا کام بھی کرتے تھے۔ آپ کے سرعت مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ روزانہ قبیل از نماز عصر ایک جلد منگواتے تھے اور نماز مغرب تک اس کو مع تعلیقات مکمل کرتے۔ حضرت الاستاذ کی یہ تعلیق عمدہ علمی نکات اور فوائد پر مشتمل ہیں، ذیل میں

اس کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں جس سے کام کا پورا تعارف ان شاء اللہ سامنے آجائے گا۔

(۱) دفاع حنفیت:

حنفیت وہ مظلوم مسلک ہے جس کو اپنوں اور غیروں سب نے آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ حافظ ذہبی اور ابن حجر عسقلانی بھی اس معاملے میں دامن بچا کر نہ گزر سکے۔ تاریخ اسلام میں بھی ایسے کئی مواقع ہیں جہاں امام ذہبی نے حنفی مذہب کے بارے میں عجیب وغریب قسم کی باتیں نقل کر کے اور بلاتنقید چھوڑ دیں۔ اسی طرح کئی حنفی رجال ہیں جن پر انہوں نے بے جا تنقید کی ہے یا اگر تنقید نہیں کی تو عام رجال کی طرح ان کے مفصل حالات نقل نہیں کیے۔ حضرت الاستاذؒ نے جا بجا اس کی توضیح کی ہے۔ ذیل میں اس کے چند نمونے پیش خدمت ہیں:

۱۔ مذہب حنفیت اور حدیث مصراۃ:

تاریخ اسلام میں ذہبیؒ نے ابو الطیب طبریؒ کے حوالے سے یہ واقعہ نقل فرمایا ہے کہ ہم مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، ایک خراسانی نوجوان آیا اور مصراۃ بکری کا مسئلہ بمع دلیل دریافت کیا۔ مجمع میں بیٹھے ایک شخص نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت پیش کی تو اس نے کہا: ابو ہریرہ کی احادیث (نعوذ باللہ) قابل قبول نہیں۔ وہ ابھی اپنی بات پوری نہیں کر پایا تھا کہ چھت سے سانپ گر پڑا۔ لوگ دوڑے اور وہ نوجوان بھی دوڑا۔ یہ سانپ اس کے پیچھے ہو لیا۔ کسی نے نوجوان کو آواز دی توبہ نکال، توبہ نکال، نوجوان نے جوں ہی توبہ نکالا، سانپ غائب ہو گیا۔ اس واقعہ پر تعلیق کرتے ہوئے تاریخ اسلام طبع دار الکتاب العربی کے محقق عمر عبد السلام تدمری نے سیر اعلام النبلاء سے ذہبیؒ کا یہ کلام نقل کیا ہے: ''ابو هريرة اليه المنتهى فى حفظ ما سمعه من الرسول عليه السلام واداءه بحروفه، وقد ادى حديث المصراة بالفاظ، فوجب علينا العلم به، وهو اصل برأسه۔''

حضرت الاستاذ کی تعلیق:

حضرت الاستاذ فوجب علينا العلم به پر تعلیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اقول: وغاية مايقال فيه: انه خبر صحيح من الآحاد ليس بمشهور، ولا متواتر۔ فهو صحيح و أصل، لكن لا كنص الكتاب العزيز، وامرنا ان ننزل كلاً منزله، والحنفية يعملون بحديث المصراة ويجعلونه من قبيل مكارم الاخلاق۔ [تاریخ الاسلام سنہ ۴۳۱ھ۔۔۔ ۴۶۰ھ ج:۳۰ ص:۳۵۴]

۲۔ سلطان محمود غزنوی کی حنفیت چھوڑنے کا پس منظر:

سلطان محمود غزنوی حنفی تھے۔ لیکن ایک عرصہ بعد اس کو خیر باد کہا۔ اس کا پس منظر کیا ہے۔ امام الحرمین جوینی کے حوالے سے ذہبیؒ اسے یوں بیان کرتے ہیں: سلطان محمود غزنوی حنفی تھے۔ احادیث کا انہیں بہت شوق تھا۔ علما سے

احادیث پوچھتے تھے۔ اکثر مسائل میں ان کو احادیث امام شافعیؒ کے مذہب کی تائید میں ملتیں۔ اس سے ان کے دل میں حنفیت کے بارے میں خدشہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے مرو میں ایک دن حنفی اور شافعی علما کو جمع کیا اور ان کو اپنے مذہب کی ترجیح پر بات کرنے کی دعوت دی۔ لیکن اتفاق اس پر طے پایا کہ ان کے سامنے دونوں مکاتب فقہ کے طریقہ پر نماز پڑھی جائے گی تا کہ خلیفہ خود ہی فیصلہ کرلے۔ چنانچہ ابو بکر قفال شافعی نے پہلے شافعی طریقہ پر نماز ادا کی۔ طہارت، ستر، قبلہ وغیرہ کی رعایت رکھی اور ارکان اور فرائض ادا کئے جس کے بغیر امام شافعیؒ کے نزدیک نماز نہیں ہوتی۔ پھر امام ابوحنیفہؒ کے طریقہ پر نماز پڑھی اور وہ اس طرح کہ کتے کا دباغت شدہ چمڑا پہنا جس کا چوتھائی حصہ نجاست سے آلودہ تھا۔ نبیذ تمر سے وضو کیا۔ گرمیوں کا موسم تھا، مکھیاں اور مچھر اس پر بھنبھنانے لگے اور وضو بھی الٹ طریقے سے کیا۔ پھر یوں تکبیر تحریمہ کہا: ''دو برگ سبز''۔ پھر مرغ کی طرح دو ٹھونگیں ماری جس میں رکن کی تمیز دوسرے رکن سے نہیں تھی۔ نہ سجدہ صحیح طریقے سے کیا اور نہ رکوع۔ اور آخر میں سلام کی نیت کیے بغیر با آواز ریح خارج کر کے نماز پوری کر دی اور کہا کہ یہ ابوحنیفہ کی نماز ہے۔ سلطان نے کہا کہ اگر یہ امام ابوحنیفہ کی نماز ثابت نہ ہوئی تو میں آپ کا سر قلم کر دوں گا۔ مجلس میں بیٹھے حنفی علما نے اس نماز سے انکار کیا۔ قفال نے امام ابوحنیفہ کی کتابیں لانے کا کہا۔ [سلطان نے دونوں مذہبوں کی کتابیں منگوائیں] اور ایک نصرانی کاتب کو بلوا کر اس سے دونوں مذاہب پڑھوائے۔ چنانچہ انہوں نے کتابوں میں نماز کا وہی طریقہ پایا جو قفال نے عملاً کیا تھا۔ اس پر سلطان نے حنفی مذہب چھوڑ کر شافعی مذہب اختیار کیا۔

حضرت الاستاذ کی تعلیق:

حضرت الاستاذؒ اس پر تعلیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں: **ولا ریب انہا اکذوبۃ من الاکاذیب اختلقہا من لم یشم رائحۃ الدین ولا رزق شمۃ الحیاء، فہل یمکن ان یضرط فی حفلۃ العامۃ فی بلاد خراسان ذو دین وحیاء، وقد رد ہذا الاسطور المحقق الناقد البصیر الامام الکوثری فی التانیب باہلغ رد۔**

۳۔ حدود؛ اور شبہات سے ان کا اسقاط:

حنفیہ کا یہ معروف ومشہور مسلک ہے کہ شبہ پیدا ہونے کی وجہ سے حد ساقط ہو جاتی ہے۔ تاریخ اسلام میں ذہبیؒ اس اصل کے انہدام پر واقعہ نقل کرتے ہیں: ''عبدالرحمن بن مہدی فرماتے ہیں: عبدالواحد بن زیاد نے مجھے یہ خبر دی ہے کہ ایک دن زفرؒ کے ساتھ میری ملاقات ہوئی، میں نے اس سے کہا کہ تم حنفیہ لوگوں کی ہنسی اور تعجب کی داستان بن گئے۔ زفرؒ نے پوچھا: وہ کیسے؟ میں نے کہا: تم اول یہ کہتے ہو کہ شبہات سے حدود ساقط کرو۔ اور پھر خود ایک بڑی ''حد'' کی طرف آتے ہو اور اس کے بارے میں کہتے ہو کہ شبہات کی وجہ سے یہ قائم ہوگی۔ زفرؒ نے کہا: وہ کون سی حد

ہے؟ میں نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کافر کو مسلمان کے بدلے میں قتل نہیں کیا جائے گا اور تم کہتے ہو کہ قتل کیا جائے گا۔ زفرؒ نے کہا: میں آپ کو یہیں گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے اس مسئلہ سے رجوع کرلیا"۔

[تاریخ الاسلام: سنۃ ۱۴۱ھ تا ۱۶۰ھ]

حضرت الاستاذ کی تعلیق:

[قلنا يقتل مسلم بكافر]؛لحديث دمائهم كدمائنا، ولاتفاق الاجلة من الصحابةعليه ، وماذكره الحديث محمول على غير الذمي، فلاتعارض ولاشبهة۔

۴۔ حنفی رجال اور ذہبیؒ کا طرز عمل:

حنفی رجال کے بارے میں ذہبیؒ غیر جانب دار نہیں رہ سکے ہیں، کہیں تو ان کے حالات ہی بالکل مختصر نقل کیے ہیں اور کہیں انہیں اپنے تبصرہ کے ساتھ دھندلا کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ یحیٰ بن معین کے حالات میں ابراہیم بن عبداللہ کے حوالے سے تاریخ اسلام میں نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے یحیٰ بن معین سے پوچھا: "کہ آدمی کس کا قول اختیار کرے۔ امام شافعی کا یا امام ابوحنیفہ کا؟ انہوں نے جواب دیا: میں کسی مسلمان کو یہ مشورہ نہیں دوں گا کہ وہ امام شافعی کی رائے اختیار کرے۔ امام ابوحنیفہ کی رائے اختیار کرنا مجھے زیادہ محبوب ہے"۔

یحیٰ بن معین کے اس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے ذہبیؒ لکھتے ہیں: "میں کہتا ہوں: یحیٰ نے یہ بات اس لیے کہی ہے کہ وہ حنفی ہیں۔ اور امام شافعیؒ کے مذہب سے ان کے انحراف کا معروف واقعہ ہے۔ انصاف اس زمانے میں ناپید ہے"۔ [تاریخ اسلام: ج:۱۷، ص:۴۰۹، سنۃ ۲۳۰ھ]

حضرت الاستاذ کی تعلیق:

ذہبیؒ کے اس تبصرہ پر تعلیق کرتے ہوئے حضرت الاستاذ لکھتے ہیں: نعم الانصاف عزيز حتى عندكم ايضاً، وكم من كلمات قاسية في الحنفية من بعض المنتحلين الى الحديث المتشبهين بالمجسمةفي تاريخكم هذا، ليس لها منشا الاالانحراف والتعصب قد ذكرتموها ولم تعلق عليها شيئا واقلقكم كلام ابن معين هل كليمته هذه، والله يقول الحق وهو يهدى السبيل۔

....

ابواسحاق فزاریؒ کے واسطے سے اوزاعیؒ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے: ہم ابوحنیفہ پر تنقید اس لیے نہیں کرتے کہ وہ قیاس سے کام لیتے ہیں۔ قیاس تو ہم سب کرتے ہیں۔ لیکن ابوحنیفہ حدیث کے ہوتے ہوئے بھی اس کی مخالفت اور قیاس کرتے ہیں۔

حضرت الاستاذ کی تعلیق:

کلا، ولایمکن ذلک لعامة المؤمنین فکیف ساغ لامام ائمتهم ،ما خالف ابو حنیفة ولا غیره من ائمة الدین ماثبت وصح عن النبی ﷺ، بل خالف مالم یثبت ولم یصح عنه ﷺ او فهم منه غیر مافهمه الخصم ،فخالف مافهمه المخالف لا الحدیث۔

....

احمد بن ابراہیم بن محمد حنفی جلیل القدر حنفی عالم ہیں۔ ان کا ترجمہ اور تعارف ذہبیؒ نے ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے:

ترجمة الحاکم وقال: مات فی رمضان واجتمع الخلق الکثیر لجنازته

حضرت الاستاذ کی تعلیق:

حضرت الاستاذ اس پر لکھتے ہیں: لیت المؤلف العلام وفق لتوفیة الحق فی تراجم الحنفیة۔[تاریخ الاسلام، سنہ ۳۸۱ھج ـــ ۴۰۰ھج]

یوسف بن قزغلی بن عبداللہ کے حالات میں لکھتے ہیں: وحظی عند الملک المعظم الی غایة، وکان حنبلیاً فانتقل حنفیاللدنیا، وورع وبرع وافتی وصنف[تاریخ الاسلام: سنة ۶۵۱ھج ـــ ۶۶۰ھج]

حضرت الاستاذ کی تعلیق:

حضرت الاستاذ فانتقل حنفیا للدنیا کے الفاظ پر تعلیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں: واللہ سبحانه یتولی السرائر وهو علیم بذات الصدور والظن اکذب الحدیث۔

☆☆☆

(۲) رافضیت کا تعاقب

رافضیت اور شیعیت کے ساتھ حضرت الاستاذ کا براہ راست واسطہ اور ٹکراؤ تھا۔ آپ نے اس سلسلے میں علمائے اہل سنت اور علمائے شیعہ کی بہت سی کتابیں کنگالی تھیں۔ اور ان کے مذہب کے جزئیہ جزئیہ اور فرد فرد کا آپ کو علم تھا۔ اس لیے تاریخ اسلام میں جہاں رافضیت اور شیعیت کے حوالے سے کوئی تذکرہ ہوا ہے حضرت الاستاذؒ نے وہاں اپنی قیمتی اور دلچسپ تعلیقات بھی درج کی ہیں۔ ذیل میں اس کے چند نمونے ملاحظہ فرمالیں:

۱۔عبیداللہ المہدی کے حالات اور تعارف پیش کرتے ہوئے حافظ ذہبیؒ آخر میں لکھتے ہیں:

وکانت دولة عبیداللہ بضعاً وعشرین سنة. ویا حبذا لو کان رافضیاً ولکنه زندیق۔[تاریخ

الاسلام: سنہ ۳۲۱۔۔۔ ۳۳۰|

حضرت الاستاذ کی تعلیق:

اس پر حضرت الاستاذ تعلیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں: رافضہ درحقیقت زنادقہ ہیں، بلکہ اسلام کے حق میں ان سے بھی زیادہ ضرر رساں ہیں۔

۲۔عباسی خلیفہ مامون کے بارے میں ذہبیؒ لکھتے ہیں: وكان مامون يبالغ في التشيع ولكن لم يتكلم في حق الشيخين بسوء بل كان يترضى عنهما ويعتقد امامتهما رضي الله عنهما [تاریخ الاسلام: سنہ ۲۱۱ ھ تا ۲۲۰ ھ]

حضرت الاستاذ کی تعلیق:

قلت : تكلمه بتفضيل سيدنا على رضى الله عنه على الشيخين رضى الله عنهما مستلزم لتكلمه في الشيخين بسوء، اعني: غصب حق الخلافة، وقول احمد كما في كتاب السنة: ان من فضل علياً على عثمان فقد ازدرى بجماعة الصحابة الذين اختاروه على علي للخلافة، واما الترضى عنهما فهو محمول على التقية، فانها شعار الرافضة ودثارهم وسلاحهم۔ فليحذر المسلمون۔۔۔

۳۔اسماعیل بن زکریا خلقانی کے ترجمہ میں عقیلی کے حوالے سے اس کی طرف منسوب چند کفریہ عقائد اور کلمات نقل کرنے کے بعد ذہبیؒ لکھتے ہیں: قلت اسنادها مظلم، ولعل اسماعيل شقوصا هذا اخر زنديق لعين غير صاحب الترجمة، فان هذا الكلام لا يصدر من رافضي فضلاً عن مسلم مبتدع۔ [سنة ۱۷۱ هج۔۔۔ ۱۸۰ هج]

حضرت الاستاذ کی تعلیق:

لا یصدر من رافضی پر تعلیق کرتے ہوئے حضرت الاستاذ لکھتے ہیں: قلت: بل للرافضة اقوال افظع وابشع واخبث منه۔

☆☆☆

(۳) مسئلہ صفات میں ذہبیؒ پر نقد:

مسئلہ صفات خبریہ (مثلاً اللہ تعالیٰ کے صفات ید، ساق وغیرہ) میں چار اقوال ایسے ہیں جو اہل سنت کے دائرے میں آتے ہیں:

۱۔تفویض: ایسی صفات ظاہر پر رکھی جائیں، نہ ان کی تاویل کی جائے اور نہ ان کے ظاہری معنی بیان کیے جائیں۔

۲۔تاویل: ایسی صفات میں تاویل کی جائے۔ مثلاً ید سے قدرت مراد لیا جائے وغیرہ

۳۔اثبات:ایسی صفات کا ظاہری معنی مراد لیا جائے اور چونکہ اس اثبات سے باری تعالیٰ کا نقص کے ساتھ اتصاف لازم آتا ہے؛اس لیے اس سے بچنے کے لیے پھر اس کی کیفیت تفویض کی جائے۔مثلاً ید سے مراد آلہ جارحہ ہے،لیکن کما یلیق بشانہ

۴۔جمع بین التفویض والتاویل: جہاں بلا تکلف تاویل ہو سکے اور عربی محاورات کے موافق ہو تو وہاں تاویل کریں گے اور جہاں ایسا نہ ہو سکے تو تفویض کریں گے۔

ان چار آرا کو اہل سنت والجماعت کے دائرے میں لا سکتے ہیں۔لیکن متقدمین اسلاف نے عموماً تفویض ہی کو اختیار کیا ہے اگر چہ کچھ مقامات پر ان سے بھی تاویل منقول ہے۔جب کہ اس کے برعکس متاخرین حضرات عموماً تاویل کرتے ہیں۔اور ایسا کرنا حالات کے پیش نظر تھا۔حقیقت میں ان صفات کا انکار نہیں تھا جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔اور چوتھی رائے انہی دونوں کا مجموعہ ہے۔البتہ تیسری رائے ایسی ہے کہ جس کے بارے میں متقدمین اسلاف سے (چند محتمل نصوص کے سوا) کوئی صریح اور واضح نص منقول نہیں۔امام ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ ہی اس کے علمبردار نظر آتے ہیں۔ذہبیؒ سے تفویض اور اثبات اگر چہ دونوں آرا منقول ہیں تاہم حق بات یہ ہے اس مسئلہ میں یہ اپنے استاذ امام ابن تیمیہ کے ہم نوا ہیں۔جیسا کہ ان کی کتاب العلو سے معلوم ہوتا ہے۔چنانچہ تاریخ اسلام میں بھی انہوں نے کئی ایسے واقعات نقل کیے ہیں جن سے بظاہر 'اثبات' کی ترجیح معلوم ہوتی ہے۔حضرت الاستاذ نے جا بجا اس پر گرفت کی ہے اور گراں قدر دلائل سپرد قلم کیے ہیں:

باری تعالیٰ کے لیے اثبات جہت کے بارے میں ایک مشہور مغالطہ:

تاریخ اسلام میں ہے:وذکر محمد بن الطاهر ان المحدث ابا جعفر الهمذاني حضر مجلس وعظ ابی المعالي ،فقال:كان الله ولا عرش،وهو الآن على ما كان عليه،فقال ابو جعفر:اخبرنا يا استاذ عن هذه التي نجدها؟ما قال عارف قط:"يا الله" الا وجد من قلبه ضرورة تطلب العلو،لا تلتفت يمنة ولا يسرة ،فكيف ندفع هذه الضرورة عن انفسنا؟او قال:فهل عندک دواء لدفع هذه الضرورة التي نجدها؟فقال:يا حبيبي!ما ثم الا الحيرة،ولطم على راسه ونزل،وبقي وقت عجيب،وقال في ما بعد:حيرني الهمذاني۔

حضرت الاستاذ کی تعلیق:

قلت للهمذاني :انا نجد من انفسنا عند الاضطرار وضع الجبهة على الارض والانخفاض اليها،فهل عندک من دواء لدفع هذا ،تطلّب العلو عند الدعاء والنداء انما هو لاعتقادنا ان محل القبول العرش على الرتبة،تعالى عن الجنس والجهات،وتطلب الانخفاض لاعتقادنا انا عبيد اذلاء وكمال الذل في السجود۔

اہل سنت کے ہاں ''علو'' کے اثبات کا صحیح محمل:

ذہبیؒ بڑے شدومد کے ساتھ علو کا اثبات کرتے ہیں اور اس کو اہل سنت و جماعت کا مسلک سمجھتے ہیں۔ اور اس کی مخالفت کرنے والوں کو جہمیہ میں سے قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کی اس موضوع پر مستقل کتاب بھی ہے۔ لیکن اہل سنت نہ تو علو کا اس معنی میں اثبات کرتے ہیں جو ذہبیؒ کے ہاں ہیں اور نہ جہمیہ کی طرح مطلقاً اس کا انکار کرتے ہیں۔

ابن کلاب کے تذکرے میں ذہبیؒ رقم طراز ہیں: **وقد صنف کتبا کثیرۃ فی التوحید والصفات، وبین فیھا ادلۃ عقلیۃ علی فساد قول الجھمیہ، وبین ان علو اللہ تعالیٰ علی عرشہ ومباینتہ لخلقہ معلوم بالفطرۃ والادلۃ العقلیۃ، کمادل علی ذلک الکتاب والسنۃ۔**

حضرت الاستاذ کی تعلیق:

حضرت الاستاذ اس پر تعلیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں: **تامل فیہ وتثبت، فانہ من مزال الاقدام، فان العلو فی الجھۃ غیر ثابت عقلاً ولا نقلاً، ومعنی قول السلف :"الاستواء معلوم" ان اتصافہ سبحانہ وتعالیٰ بھذا الوصف ثابت ومعلوم تدل علیہ نصوص الکتاب والسنۃ، لاان معناہ المراد ومصداقہ معلوم کمایتبادر۔**

☆☆☆

(۴) بے جا جرح پر تنقید

تاریخ اسلام میں جہاں بے جا جرح ہوئی وہاں حضرت الاستاذ نے خصوصیت کے ساتھ نشان دہی کی ہے۔ ذیل میں اس کی چند مثالیں درج کی جاتی ہیں:

۱۔ عبداللہ بن محمد بن یعقوب بن حارث بن خلیل کے بارے میں ذہبیؒ لکھتے ہیں: **قال حمزۃ السھمی: سالت عنہ اباز رعۃ احمد بن الحسین الرازی فقال ضعیف۔** [سن ۳۲۱۔ ۳۴۰ھ]

تعلیق حضرت الاستاذ:

وھو جرح مبھم، لا یسمع فی عامۃ الرواۃ فضلاً عن الائمۃ الاجلۃ۔

۲۔ ابراہیم نخعی کے بارے میں ذہبیؒ نقل کرتے ہیں: **وقال حماد بن زید: ما کان بالکوفۃ رجل اوحش رداً للآثار من ابراھیم لقلۃ ماسمع۔**

تعلیق حضرت الاستاذ:

من ورث علم الاسود وعلقمۃ ومسروق وخلائق ممن ورثوا علم عمر وعلی وعائشۃ وابن مسعود وغیرھم یکون قلیل السماع، فیا للبخس والتطفیف۔ قاتل اللہ العصب۔

۳۔عبدالرحمن خربی کا قول نقل کرتے ہوئے ذہبیؒ لکھتے ہیں:قول ابی اسحاق الفزاری احب الی من قول ابراهیم۔

تعلیق حضرت الاستاذ:

و این الثری من الثریا؟ولنعم ما قیل :الناس اعداء لما جهلوا،مایدری المسکین الخریبی ابراهیم من هو؟ و کل یمیل الی مجانسه۔

(۵)جرح وتعدیل اور تصحیح وتضعیف حدیث میں اختلاف:

تاریخ اسلام میں کئی مقامات ایسے ہیں جہاں حضرت الاستاذ نے حدیث کی تصحیح وتضعیف اور راوی پر جرح و تعدیل کے متعلق اپنی رائے سپردقلم فرمائی ہے۔اس سے حضرت کی حدیث میں عبقری شان وضاحت ہوتی ہے۔

۱۔حضرت الاستاذ کی رائے یہ ہے کہ صحیحین کی بعض احادیث متن کے لحاظ سے معلول اور نا قابل حجت ہیں خصوصاً جن سے کسی صحابی کی تنقیص کا پہلو نکلتا ہے، چنانچہ تاریخ اسلام میں حضرت معاویہؓ کے مقولہ ''من احق بهذا الامر منا'' پر تعلیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وردت هذه المقالة معزیة الی سیدنا معاویة فی الصحیحین وغیرهما باسناد صحیح مع ما فی متنها من النکارة،والذی یظنه هذا العبد الفقیر ان مدارها علی معمر بن راشد وکان له ابن اخ رافضیا یخون فی کتب عمه،فهذه الروایة اظنها من جنانته یده الآثمة والله سبحانه اعلم۔

۲۔حارث بن عبداللہ اعور کے بارے میں ذہبی مختلف ائمہ کی رائے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وقال الشعبی وعلی بن المدینی وابو خیثمه: الحارث کذاب،قلت[القائل: الذهبی]:هذا محمول من الشعبی علی انه اراد بالکذب الخطأ،والافلای شیء یروی عنه[سن ۶۱۔۸۰ھ]

تعلیق حضرت الاستاذ:

قلت الکذوب قد یصدق،وانما یعرف صدقه من کذبه من له بصر،وخبر، و مهارة کمال المعرفة بالمخبر واخباره،والشعبی جامع لهذه الصفات مع الزوائد۔

۳۔احمد بن علی بن مسلم کے بارے میں ذہبیؒ لکھتے ہیں:

قال الخطیب: کان ثقة حافظا متقنا حسن المذهب[سنة ۲۸۱۔۲۹۰]

تعلیق حضرت الاستاذ:

قلت :قد کشف العلامه البحاله الکوثری ﷺ عن الاهار هذا،وذکر انه کان متعصبا وماجورا یطع

الاخبار بالاجرة، وكان يروى عن المجاهيل وكل من هب ودب، فتنبه وتيقظ ولاتغتر بتوثيق الخطيب۔

۴۔ اسد بن عمر البجلی کے بارے میں لکھتے ہیں:

قال ابن معين: كان قد سمع من ربيعة وجماعة ولم يكن به باس، وقال البخارى: ضعيف، وقال غيره: ليس بقوى وقال ابن عدى: لاسد احاديث كثيرة، ولم ار له شيئا منكرا، وليس فى اصحاب الراى بعد ابى يوسف اكثر حديثا منه، قال الخطيب: وكان ثقة ان شاء الله| سن ۱۸۱ھ۔ ۱۹۰ھ |

تعلیق الاستاذ:

حضرت الاستاذ امام بخاری اور دیگر حضرات کی جرح پر تعلیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں: لا عبرة لهذه الجروح المبهمة، وناهيك توثيق ابن معين وابن عدى والخطيب له۔

۵۔ ابوالعالیہ الریاحی کے تذکرہ میں ذہبیؒ لکھتے ہیں:

قال ابو حاتم: ثنا حرملة: سمعت الشافعى يقول: حديث ابى العالية الرياحى رياح، وقال ابو حاتم: يعنى الذى يروى عن النبى ﷺ فى الضحك فى الصلاة ان على الضاحك الوضوء۔

تعلیق الاستاذ:

امام شافعیؒ کے مقولہ پر تعلیق کرتے ہوئے حضرت الاستاذ لکھتے ہیں: للحديث شواهد من المرفوعات والآثار، ولايخفى ما فى هذا التعبير من الشدة، وانت تعلم "ان من الرياح ما هى رحمة"۔

☆☆☆

(۶) اقوال ائمہ کی توجیہ

تاریخ اسلام میں کچھ مقامات پر ائمہ دین اور علمائے امت کی طرف کچھ ایسے اقوال منسوب ہیں جو بظاہر احادیث کے خلاف معلوم ہوتے ہیں۔ حضرت الاستاذ نے ایسے عمدہ انداز میں ان کی توجیہ کی ہے کہ احادیث کے ساتھ اس کا ٹکراؤ بھی ختم ہوجاتا ہے اور ائمہ دین سے بدظنی بھی دور ہوجاتی ہے۔ مثلاً: حضرت عبداللہ بن مبارک کے بارے میں منقول ہے کہ انہوں ایک شخص 'جوایک دن روزہ رکھتا تھا اور ایک دن افطار کرتا تھا' کے بارے میں یہ کہا: کہ اس بے چارے کو معلوم نہیں کہ اپنی آدھی زندگی 'جس میں وہ روزے نہیں رکھ رہا ہے' ضائع کررہا ہے۔ اس پر ذہبیؒ تعلیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "قلت فلعل عبدالله لم يمر له حديث "افضل الصوم صوم داؤد"| سن ۱۸۱۔ ۱۹۰ھ |

تعلیق حضرت الاستاذ:

قلت: ولعله اشار الی اختیار الغزو والجهاد، فان المجاهد کالصائم لایفطر والقائم لایفتر، وذلک هو الظن بعبدالله، فانه هو هو، وهو الذی خاطب فضیلاً: یاعابد الحرمین لو ابصرتنا۔۔۔

☆☆☆

(۷) بنوامیہ کے خلاف مبالغہ آمیز روایات کی تردید:

بنوامیہ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے عام تاریخ کی کتابوں میں خوب تعصب کا اظہار کیا گیا ہے۔ تردیدی مواد میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے اور بعض واقعات ایسے منسوب ہیں جن کا وقوع بظاہر بالکل ناممکن ہے۔ تاریخ اسلام اگرچہ کافی حد تک اس قسم کے مبالغہ آمیز واقعات سے پاک ہے تاہم کچھ باتیں اس قسم کی آگئی ہیں۔ حضرت الاستاذ نے جابجا ان پر گرفت فرمائی ہے۔

۱۔ حجاج کے متعلق ذہبیؒ نقل کرتے ہیں:

وقال هشام بن حسان: احصوا ماقتل الحجاج صبراً فبلغ مأة الف وعشرين الفا۔

تعلیق الاستاذ:

لاعبرة لمثل هذه المبالغات، فانها لو صحت لکانت عار علی جم غفیر من الامة المسلمة فی خیر قرونها، والانصاف والاعتدال خیر ما انصف به الرجال۔

۲۔ محمد بن ابی بکر کے نام خط کے مورد الزام مروان کو ٹھہراتے ہوئے ذہبیؒ لکھتے ہیں: ان مروان کان من اکبر الاسباب التی دخل بها الداخل علی عثمان، لانه زور علی لسانه کتابا فی شان محمد بن ابی بکر۔ [س: ۷۰ ج]

حضرت الاستاذ کی تعلیق:

قلت: حدیث تزویر الکتاب احدوثة بل اکذوبة لا یساوی ذرة فی میزان التحقیق روایة ودرایة واکبر الاسباب انما هو نفاق السبائیین وتزویرهم وانخداع بعض المخلصین۔

☆☆☆

(۸) اوہام کی نشان دہی:

تاریخ اسلام میں جہاں جہاں اوہام ہیں حضرت نے اپنی تعلیقات میں اس کی بھی نشان دہی کی ہے۔ مثلاً: سلیم بن عامر کے متعلق ذہبیؒ لکھتے ہیں:

وقال ابن عساکر: شهد فتح القادسیة۔ [س ۱۸۱ھ۔ ۲۹۰]

تعلیق حضرت الاستاذ:

اشتبه علی کثیر من اهل العلم کالمؤلف ابو عامر هذا و ابو عامر سلیم بن عامر الاخر، و الذی ادرک النبی ﷺ ولم یصحبه وصلی خلف ابی بکر وشهد فتح القادسیة، هو غیر الخبائری۔ راجع التاریخ الکبیر للبخاری وغیرہ۔

☆☆☆

(۹) تصحیفات کی وضاحت

تاریخ اسلام میں جہاں اسماء میں تصحیف ہوئی ہے۔ حضرت الاستاذ نے اس کی نشان وہی کا التزام کیا ہے۔ مثلاً:

عبداللہ بن الحسن بن عبدالرحمن بن الشجاع کے بارے میں ذہبیؒ لکھتے ہیں: ابو بکر المروزی، الفقیه الحنبلی۔

تعلیق حضرت الاستاذ:

وظنی انه مصحف او سبق قلم، والصواب: الحنفی ان شاء اللہ تعالی

★★★

(۱۰) تصحیح متن:

جہاں طباعت کی اغلاط ہیں حضرت الاستاذ نے ان کی درستگی کا بھی اہتمام کیا ہے۔ مثلاً: تاریخ اسلام میں ایک جگہ ذہبیؒ نقل کرتے ہیں:

روی علی بن مسهر عن الثوری قال: حفاظ الناس اربعة: یحی بن سعید الانصاری، واسماعیل بن ابی خالد، وعاصم الاحول، وعبدالملک بن ابی سلیمان، قلت: الثوری و الاعمش؟ فابی ان یحفظه معهم۔

تعلیق حضرت الاستاذ:

الصواب: قلت للثوری: والاعمش؟ فابی، کما یظهر من السیاق

بطور نمونہ اس نفیس تعلیق کی دس جہات پیش کر دی ہیں، اگر مجموعی مواد پر مزید غور کیا جائے تو اس تنوع کا دائرہ مزید وسیع ہو سکتا ہے۔ یہ صرف ایک کتاب پر حضرت کی تعلیقات کا نمونہ ہے، آپ کے مکتبہ میں موجود بیسیوں کتب پر آپ کے ایسے ہی شاہکار رقم ہیں جو مستقل خدمت کے متقاضی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس سارے ذخیرے کو جلد از جلد منظر عام پر لانے کی سبیل پیدا فرمائیں۔ آمین

ارشادالحلیم...... چندتعارفی جواہر ریزے

مولانا محمد انظار رفیق، کراچی

اللہ تعالیٰ کے اپنے محبوب نبی سیدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی سیدالامم امت پر عظیم انعامات میں سے جہاں قرآن کریم (جو سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا دائمی و ابدی معجزہ ہے) اور احادیث نبویہ کا عظیم سرمایہ ہے (جسے درحقیقت صرف قرآن ہی نہیں، بلکہ پورے دین اسلام کی ایک کامل شرح مانا گیا ہے) اسی طرح اس امت مرحومہ میں مفسرین قرآن اور حقائق قرآنیہ کے ایسے ترجمان جماعت صحابہ اور تابعین و تبع تابعین کی صورت میں اور صاحب ''جوامع الکلم صلی اللہ علیہ وسلم'' کے معجزاتی فرامین مبارکہ کے ایسے شارحین ورثائے انبیاء، جو اس کتاب مجید کی ایک ہی آیت یا ایک ہی واقعہ سے بے شمار احکام ومسائل اور ہزاروں احادیث کے ذخیرے میں سے کسی ایک ہی حدیث سے سینکڑوں احکام ومسائل، اصول وفروع، فضائل ومسائل، قواعد وضوابط، احکام وحکم، اسرار ورموز کا استنباط اپنی کسبی و وہبی مجتہدانہ صلاحیتوں سے استنباط فرما گئے ہیں۔ پھر یہ بھی منشاء خداوندی وحکمت ربانی ہی کا تقاضا ہوا کہ جس آخرالانبیاء کو ''جوامع الکلم و بدائع الحکم'' عطا فرمائے ہیں، تو اسی کی آخرالامم میں ایسے شارحینِ علوم وحی اور عارفین مذاق نبوت پیدا کئے جائیں جو ان آیاتِ رحمانیہ وکلماتِ محمدیہ کی جامعیت وبدیعت کو ایسے کامل پیرائے سے اس امت امیہ کے لئے واضح کردیں کہ جو ان کے لئے بھی نشانِ کرامت وشرافت ہو۔ ان علمائے راسخین میں سے ایک مشہور محدث ونقاد حافظ علائی۔ جنہوں نے ''نظم الفرائد'' کے نام سے ایک ہی روایت جو ''حدیث ذوالیدین'' سے مشہور ہے کی شرح پر ایک مجلد تصنیف فرمادی، اسی میدانِ حدیث کے ایک اور نامور محدث امام ابن دقیق العید نے اپنی معروفِ زمانہ کتاب ''الالمام فی احادیث الاحکام'' میں حضرت ابن عازبؓ کی ایک ہی

روایت "امرنا رسول اللہ ﷺ بسبع ونہانا ان سبع" سے ۴۱۳ مسائل کا استخراج فرماتے ہیں، پھر آٹھویں صدی کے ایک محدث عز الدین ابن خضر الھکاری" نے بھی" رمضان کے روزے میں اپنی زوجہ سے قربت کر بیٹھنے والی ایک ہی حدیث سے ایک ہزار ایک فوائد علمیہ استنباط فرمائے ہیں۔ گیارہویں صدی کے شیخ عبدالحئی الکتانی "التراتیب الاداریۃ" ۱۵۰/۲" میں رقمطراز ہیں:

"معروف شارح حدیث ابن الصائغ" سنن ترمذی" کی ایک مختصر حدیث "یاابا عمیر مافعل النغیر" کی شرح کرتے ہوئے اپنے ایک ہی درس میں چار سو فوائد املاکرواگئے ہیں۔"

ان ہی مشائخ ورجال حدیث میں صاحب" نثر الازھار" علوم نبوی کے امین استاذ نا المکرم حضرت مولانا محمد امین اورکزئی صاحبؒ بھی ہیں اور آپ کا یہ رسالہ بنام" ارشاد الحلیم الی آداب التعلیم" بھی اسی صنف تصنیف اور سلسلہ شرح وتفسیر کی ایک سنہری کڑی ہے جو واقعتہ "فلیو جد فی الانہار مالایو جد فی البحار" اور" بقامت کہتر بقیمت بہتر" کا کامل وعمدہ مصداق ہے جس میں حضرت رحمہ اللہ نے پندرہویں سپارے کی سورہ کہف کی بائیس آیات میں مذکور حضرت موسیٰ وحضرت خضر علیہما السلام کے ایک مشہور واقعہ سے ۲۸۹ فوائد اصولیہ ومسائل علمیہ کا استنباط فرمایا ہے جو اہل علم ونظر کے نزدیک درحقیقت حضرت الاستاذؒ کی قرآن فہمی کی گہرائی وگیرائی، سلف وخلف کے عربی واردو ذخیرہ تفاسیر پر وسیع نظر، تفسیری وحدیثی آثار ومرویات کے پختہ استحضار اور نصوص قرآن وحدیث سے عمیق استخراج اور ملکہ استنباط کی ایک واضح مثال ہے۔ راقم کی ان سطور کا مقصد بھی حضرت کے اس رسالہ کے چند خواص ومزایا اور جواہر ریزوں کو قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی اپنی سی سعی ناتمام ہے۔ اہل علم کے نزدیک یہ امر مسلم ہے کہ کسی بھی علمی کتاب کی اہمیت وکمال کا اندازہ لگانے کے لئے چند امور بطور خاص قابل لحاظ ہوتے ہیں:

(۱) مصنف کا فضل وکمال (۲) کتاب کا مواد اس کے مراجع ومصادر کی روشنی میں (۳) جمع کردہ مواد سے مطلوبہ نتائج کا استخراج اور موضوع کا تجزیہ (۴) استیعاب موضوع اور حسن ترتیب (۵) اور قبولیت عام۔ ان میں سے امر اول یعنی حضرت کے علمی کمال اور عملی مقام کے کچھ امتیازات جاننے کے لئے تو راقم قارئین کو سہ ماہی المظاہر کی اس خصوصی اشاعت اور آپ رحمہ اللہ کی تصانیف اور ان مقالات علمیہ، مکاتیب امینیہ (جو عنقریب شائع ہوجائیں گے ان شاء اللہ) کے مطالعہ کا حوالہ دینے کے بعد اس طویل الذیل موضوع کے لئے اسی اشارے پر اکتفا کرتا ہے۔

امر ثانی (یعنی مواد اور مراجع) کے استناد وحسن کو جاننے کے لئے ایک طریقہ تو یہی ہے کہ یہاں ان تمام عربی و اردو تفاسیر، صحاح وسنن وغیرہ احادیث کے مجموعوں کے اسما کی فہرست ذکر کیے جائیں جن سے اس رسالے کے فوائد کثیرہ کے استخراج وانتخاب میں مدد لی گئی ہے، مگر اس فہرست کی طوالت کا یہ مقام متحمل نہ ہونے کی بنا پر یہاں اس کا

اندازہ لگانے کے لئے فقط چند اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔اول یہ کہ استاذ صاحب اپنے غیر معمولی ذوق مطالعہ سے جامعہ بنوری ٹاؤن کے نوادرات علمیہ سے بھرپور کتب خانے میں موجود تقریباً تمام تر ذخیرہ تفاسیر واحادیث کا تحقیقی مطالعہ شب وروز فرماتے ہی رہتے اور جامعہ کے طلبہ کو ترجمہ وتفسیر قرآن کی تدریس کے سلسلے میں توخصوصاً اس امر کا التزام فرماتے کہ مکتبہ جامعہ میں موجود ودستیاب تمام تفاسیر زیرِ مطالعہ رہیں (جس کا ذکر آپؒ نے خود بھی راقم سے ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا تھا) رسالۂ ہٰذا بھی درحقیقت حضرتؒ کے انہی ایام تدریس کی سعی باکمال ہے،اگرچہ اس کی ترتیب وطباعت کے مراحل بتقدیر الٰہی اس وقت انجام نہ پاسکے۔پھر تیسرا امر یعنی مواد سے متعلقہ نتائج کے استخراج کا کمال کا فیصلہ آپ خود ہی کیجئے اور مندرجہ ذیل فوائد ملاحظہ کیجئے:

۲۳۔تعلیم وتعلم کا مقصد چلنے پھرنے سے بھی حاصل ہوسکتا ہے "فانطلقا"الایۃ ایک جگہ ٹھہرنا ضروری نہیں۔

۳۶۔اپنے شیخ کی کامل اتباع ہوحتیٰ کہ افکار،اقوال واعمال میں اس کا عکس جمیل ومظہراتم بننے کی کوشش کرے۔ کمایفهم من حذف المتعلقات فی قوله:هل اتبعک۔

۴۷۔طالب اور مسترشد کی ناکامی کے دو بڑے سبب ہیں: اول عدم استقلال،دوم نافرمانی،اس لئے کسی شیخ کی صحبت اختیار کرتے وقت ان دونوں موانع سے الگ رہنے کا پختہ عزم کرے۔"ستجدنی ان شاء اللّٰہ صابرا"، "ولا اعصی لک امرا"

۸۱۔امر خداوندی کے تحت سعی میں تعب وتھکان محسوس نہیں ہوتا۔ کماورد فی الحدیث الصحیح فی سیاق هذه الواقعة۔

۱۰۱۔علمی موضوعات پر آپس میں بحث وتمحیص ہونی چاہیے۔ کما جاء فی الصحاح من مکالمة سیدنا ابن عباس والحربن قیس فی صاحب موسیٰ من هو؟

۱۰۷۔مستند ماخذ کے بجائے غیر مستند ماخذ سے علم لینا طریقہ نامرضیہ ہے اور موجب عتاب بلکہ عذاب بن سکتا ہے۔فان نوفا قال ماقال مقتبسا من اخبار الاحبار والکتب المحرفة مع وجود القرآن الحکیم والسنة السنیة واکابر الصحابة فاستحق الملام۔

یہ تو چند مثالیں بطور" مشتے ازنمونہ خروارے" ذکر کردی گئی ہیں،ورنہ درحقیقت یہ پورا ہی رسالہ استخراج فوائد کثیرہ کا ایک عجیب شاہکار ہے۔

پھر استیعاب موضوع کے سلسلے میں دو باتیں پیش نظر رہنی چاہئیں،پہلی بات یہ کہ اس رسالہ کا موضوع جیسا کہ معلوم ہوچکا ایک واقعہ قرآنیہ ہے (جو تقریباً بیس آیات فرقانیہ پر مشتمل ہے) سے چند آداب تعلیم وتعلم کا استنباط

ہے جس میں نہ مصنف کے پیش نظر استقصا مقصود ہے اور نہ ہی ایسے موضوعات میں دعوائے استیعاب ممکن ہے، کہ جس کتاب کی یہ آیات ہیں اس کتاب ذی شان کی شان خود صاحب کتاب صادق ومصدوق صلی اللہ علیہ وسلم ان الفاظ سے بیان فرماگئے ہیں: "القرآن ذوشجون و ظهور و بطون لاتنقضی عجائبه ولاتبلغ غايته"۔ جس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے جو علامہ طاہر ابن عاشور نے اپنی وقیع تفسیر "التحرير والتنوير" ۱/۴۲ کے مقدمہ میں قاضی ابن العربیؒ کے حوالے سے ذکر فرمائی ہے کہ انہوں نے اسی قصۂ موسیٰ وخضر علیہما السلام سے آٹھ سو مسائل علمیہ املا کروائے تھے۔ فرحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ، اور دوسری بات یہ کہ ابتداً تالیف رسالہ سے آپ کا مقصد تمنائے شیخ الہندؒ کی تکمیل اور اس قصہ قرآنیہ سے محض آداب تعلیم وتعلم کو اخذ کرنا تھا لیکن اس واقعہ کی ہمہ گیری، متعلقہ آیات کی جامعیت اور حضرت کے ذوق وفکر کی وسعت وعمق نے متعلقہ بات کے علاوہ بھی مزید ابواب علمیہ کے متعدد فوائد کو شائقین علم کے لئے ایک قیمتی علمی سوغات کی صورت میں ظاہر فرمادیا۔

مصنف کے کمال کا اقرار واعتراف تو ہر منصف قاری رسالہ ہذا کے بغور مطالعہ سے ہی کرنے پر مجبور ہوگا، تاہم ذیل میں چند فوائد ذکر کئے جاتے ہیں، جس سے صاحب رسالہ کی دقت نظری اور ملکہ استنباط میں مہارت عیاں ہے:

اس واقعہ کی بیس قرآنی آیات اور ان سے متعلقہ روایات وآثار سے طالب وطلب علم کے تقریباً ۴۵ آداب استخراج فرمائے ہیں، دیکھئے: فائدہ، ۷ تا ۸، ۱۴ تا ۱۶، ۲۰، ۲۱، ۲۳ تا ۵۱، ۵۷، ۸۶، ۱۵۸، ۱۶۰، ۱۶۹، ۲۸۳،

ان میں سے یہ تین فوائد پڑھئے:

۱۴۔ طالب علم کو عالی ہمت اور قوی العزم بننا چاہئے گویا کہ علم کے لئے وہ یا تن رسد بجانان یا جان زتن برآید کا مصداق ہو۔ او امضی حقبا اس پر دال ہے۔

۲۴۔ متعلم کو چاہئے کہ طلب میں صادق ہو، فان موسى عليه السلام امر على الاتباع مع انكار الشيخ وتخويفه له عن المكاره۔

۴۸۔ سعی پیہم کے ساتھ صحیح سمت کی طرف رخ ہونا اور حزم واحتیاط بھی کامیابی کے لئے ضروری ہے، فارتدا على آثارهما قصصا۔

اور تقریباً تیس ۳۰ فوائد علم تصوف سے متعلق ہیں، جن میں متعدد مسائل فن کی طرف لطیف اشارات ومحاکمات بیان ہوئے ہیں، جبکہ آداب الشیخ والمرید ان کے علاوہ ہیں دیکھئے: ۷۸، ۸۱، ۸۲، ۸۷، ۹۳، ۹۵، ۱۲۰، ۱۴۶، ۱۵۶،

۱۶۱، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۷۰، ۱۷۷، ۲۰۳، ۲۱۰، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۴۰، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۴۴، ۲۴۷، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳،

۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۷۱، جن میں سے تین فوائد یہ ہیں:

۱۵۶۔ اہل دل کی صحبت حیات آفرین ہوتی ہے، لان حیاۃ الحوت المیت کانت بجوار الخضر علیہ السلام فی مجمع البحرین۔

۱۶۴۔ رحمت خاصہ اور علم لدنی کے حصول کا قوی ذریعہ تخلی للعبادۃ ہے، سماہ اولا "عبدا" لم وصف بما وصف۔

۱۶۶۔ ذکر ومراقبہ کے وقت تنہائی میں سبز چادر اوڑھنا سنت خضر و یہ ہے، اور ابلغ فی الخلی ہے: "اذا رجل ملتف فی کسانہ، مسبحی بثوبہ الحدیث، وفی بعض الروایات ان لونہ کان خضرا۔

اور تقریبا ۲۲ فوائد علم کلام سے متعلق ہیں۔ دیکھئے: ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۵۱، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۳۶، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۸۰، ۱۸۸، ۲۱۶، ۲۲۸، ۲۴۳، ۲۷۰، ۲۷۳، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۷، جس میں سے تین فوائد یہ ہیں:

۱۵۱۔ امور اختیاریہ کی طرح اضطراریہ میں بھی شیطان کا دخل ہوسکتا ہے، (ایضا)

۲۷۰۔ شیطان کے اثر سے وسوسہ ونسیان منافی عصمت نہیں، فنسیا حوتہما" والتحقیق یقتضی التفصیل ولیس ھذا محلہ۔

۲۸۱۔ حق تعالیٰ کی صفت ارادہ اور صفت امر الگ الگ ہیں، تکوین کا اپنا ارادہ ہے اور تشریع کا اپنا۔

اور پانچ اور فوائد ولغویہ میں لغوی نکات ذکر فرمائے ہیں۔ دیکھئے: ۴۶، ۱۳۳، ۱۹۶، ۲۲۹، ۲۸۲، ان میں سے دو فوائد یہ ہیں:

۱۳۳۔ غلام کی اضافت مخلوق کی طرف کرنی ہو تو عبد کے بجائے فتی کا لفظ استعمال کیا جائے، وقد ذھب بعض المفسرین الی ان المراد من الفتی ھو العبد، وندب الحدیث الشریف الی ھذا الادب فی التحاور۔

۱۹۶۔ شہر پر قریہ کا اطلاق ہوسکتا ہے، اتیا اھل قریۃ لغلامین یتیمین فی المدینۃ۔

اور فن بلاغت سے متعلق دیکھئے چار فوائد ۱۹۰، ۲۰۵، ۲۳۲، ۲۳۳، ہیں جن میں سے دو یہ ہیں:

۲۳۲۔ مجاز عقلی ولغوی قرآن حکیم میں بکثرت وارد ہے، وشواھدہ فی ھذہ القصۃ کثیرۃ۔

۲۳۳۔ تغلیب منافی صدق نہیں، "فکان ابواہ مؤ[illegible] منین"۔

اور چھ فوائد علم اصول فقہ سے متعلق ذکر فرمائے ہیں۔ دیکھئے: ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۸، ۲۹۰، ان میں سے دو فوائد یہ ہیں:

۲۲۹۔ کل وغیرہ میں استغراق کا حقیقی ہونا ضروری نہیں، جیسا کہ "کل سفینۃ" ظاہر ہے کہ دنیا بھر کے سفینوں کو

شامل نہیں۔

۲۳۰۔ صورۃ مطلق کبھی معنیٰ مقید ہوتا ہے، کل سفینة ای صالحة سلیمة بقرینة قوله: ان اعیبها اهل قریة یعنی انطاکیه علی اشهر الاقوال۔

پھر فائدہ ۱۱۳، میں علم اصول تفاسیر کا ایک ضابطہ ذکر فرماتے ہوئے، رقم طراز ہیں:

۱۱۳۔ قرآن حکیم کے مجمل کی تفسیر اخبار احاد سے جائز ہے، اور دوسری تفسیروں سے زیادہ مستند ہوتی ہے، کما یدل علیه صنیع سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ والحر بن قیس رضی اللہ عنہ۔

اور فائدہ ۲۶۹ میں علم الجرح والتعدیل کا ایک اصول اسی واقعہ کی ایک آیت سے استخراج فرماتے ہیں:

۲۶۹۔ جرح وتعدیل میں دامن احتیاط ہاتھ سے نہ چھوٹے، انک لن تستطیع معی صبرا، سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے مطلق صبر کی نفی نہیں فرمائی بلکہ "معی" کے قید کے ساتھ مقید کر کے فرمائی۔

فائدہ ۱۱۲ میں اصول حدیث کے ایک معرکۃ الآراء مسئلہ سے متعلق ایک ضابطہ ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:

۱۱۲۔ خبر واحد حجت ہے جب راوی ثقہ ہو فان ابن عباس رضی اللہ عنہ قد احتج بخبر ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ علی الحر بن قیس رضی اللہ عنہ

ان علوم سبعہ کے فوائد کے علاوہ بیسیوں مسائل شرعیہ اور فقہی جزئیات اور بیسیوں معاشرتی آداب اور ایک داعی کے اوصاف واصول دعوت بھی ان فوائد میں جابجا استنباط فرمائے گئے ہیں اور جب صاحب رسالہ نے ہی ایک مقام پر غیر مستند ماٰخذ سے حصول علم کے موجب عذاب ہونے کی طرف لطیف تنبیہ فرمائی ہے اور اس وعید وحرمت کو اسی واقعہ کی جزئیات وتفصیلات سے اخذ فرمایا ہے تو پھر آپ سے ہی اس امر محظور کا ارتکاب کیونکر متوقع ہوسکتا ہے؟ فائدہ ۱۰۷ کے تحت حضرت رقم طراز ہیں:

۱۰۷۔ مستند ماخذ کے بجائے غیر مستند ماخذ سے علم لینا طریقہ نامرضیہ ہے اور موجب عتاب بلکہ عذاب بن سکتا ہے، فان لو قال ماقال مقتبسا من اخبار الاحبار والکتب المحرفة مع وجود القران الحکیم والسنة السنیة واکابر الصحابة فاستحق الملام۔

دوسرا قرینہ یہ ہے کہ پورے رسالے میں جتنے اصول وفوائد مذکور ہیں، ہر ایک کے بعد اس کے ماخذ ومصدر کا حوالہ اس قصہ کی بیس آیات میں سے کسی کامل آیت یا آیت کے کسی ایک ہی لفظ کے بارے اعرابی حالت، ترکیبی حیثیت سے اور کبھی اس واقعہ سے متعلقہ روایات میں سے کسی روایت کا حوالہ کہیں صراحتاً کہیں اشارتاً ضرور دیا ہے اور بنظر ظاہر اگر کسی فائدہ کے ساتھ کا حوالہ متصلاً مذکور نہیں، تو اسی سے متصل پہلے یا بعد میں مذکورہ فائدہ کا حوالہ اسی

سابقہ فائدہ کا بھی حوالہ ہوتا ہے۔لہٰذا اس سے بھی یہ امر بالکل واضح ہوا کہ رسالہ میں مذکور تمام فوائد کا مصدر و ماخذ قرآن کی کوئی آیت یا احادیث صحیحہ سے کوئی مستند روایات ہی ہے۔

اس گراں قدر رسالہ کے تاحال دو ایڈیشن چھپے ہیں،حال ہی میں اسے مکتبہ عمر فاروق کراچی نے بہت ہی خوبصورت حلیہ میں پیش کیا ہے،اس کا فارسی ترجمہ مولانا معتصم طالقانی اور عربی ترجمہ مولانا عمر فاروق پشاوری نے کیا ہے،پہلا ترجمہ کراچی سے چھپ چکا ہے جب کہ دوسرا ترجمہ بھی عنقریب چھپنے والا ہے۔ان شاء اللہ

حضرت الاستاذ کا اسلوب مکالمہ

'مکاتیب ہدایت' کی روشنی میں

محمد طفیل کوہاٹی

ابوالاعلی مودودی صاحب کا نام گزشتہ صدی کے اہم مفکرین میں شمار کیا جاتا ہے،آپ نے اپنے فطری ملکہ تحریر سے کام لیتے ہوئے ایک بڑے حلقے کو اپنے فکر کا اسیر بنایا،چونکہ آپ کی فکری بنیادوں میں جمہور اہل سنت سے انحراف کے بڑے ٹھوس اجزا شامل ہیں،اس لیے ان کی ترویج کا نتیجہ فکری انتشار کی شکل میں ظہور پذیر ہوا۔مودودی صاحب نے قرآن مجید کی تفسیر پر بھی طبع آزمائی کی اور اس میں سلف کے طرز سے انحراف کرتے ہوئے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے متعلق بعض نازیبا تعبیرات استعمال کیں،اسی طرح اپنی کتاب خلافت وملوکیت میں اجل صحابہ کرامؓ کے خلاف قابل ترک تاریخی ذخیرے کی بنیاد پر گمراہ کن خیالات کا اظہار کیا۔ان تحریروں کے پیچھے مودودی صاحب کا یہ عقیدہ کارفرما تھا کہ معاذ اللہ حضرات انبیاء کرام سے عصمت کا انفکاک ہو سکتا ہے اور صحابہ کرام محفوظ عن الخطاء نہیں۔چونکہ مولانا کے فکر کی پشت پر ایک مضبوط جماعت تھی،اس لیے اس شاذ فکر کو جماعتی قوت ملنے پر ایک نیا مکتب فکر وجود میں آیا اور ایک طویل عرصہ تک امت کے ذہین طبقے کی صلاحیتیں اور مالی وسائل ان مباحث کی نذر ہوتے رہے اور یہ افکار بحث ومباحثہ اور مکالمہ کا موضوع بنتے رہے ہیں۔عرصہ بعد خود جماعت کے بعض منصف مزاج حضرات کو مودودی صاحب کی کج فکری کا دفاع وبال دوش دکھائی دینے لگا اور انہوں نے تفہیم القرآن

کی اکثر عبارتوں کی تعبیرات بدل دیں، نیز جماعت کے منشور سے وہ شق نکالنے کی بھی فکر کی جس کے رو سے صحابہ کرامؓ کی عدالت مجروح ہوتی ہیں گو کہ وہ تاحال موجود ہے۔

ہمارے خطے میں مولانا معین الدین مرحوم (کرک) اور بعض دیگر بڑے علما کی مولانا مودودی صاحب کی جماعت اسلامی سے وابستگی نے اس فکر کو خاصا عام کیا۔ ہنگو، کوہاٹ، ٹل وغیرہ کے علاقوں میں جماعت کے فکر سے وابستہ سینکڑوں تعلیم یافتہ حضرات کے شب و روز کا مشغلہ جماعتی فکر کی ترویج تھی، اس میں ان متنازعہ افکار کی تبلیغ بھی شامل تھی، ظاہر ہے کہ محقق اہل علم ''تفرقہ'' کے اس ناسور کو کہاں پھیلنے دے سکتے تھے، اس لیے اس پر باہم طویل مکالمے ہوئے۔ ہمارے استاذ گرامی حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ کا بھی اس فکر کے حامل علما سے کئی بار تحریری و تقریری مکالمہ ہوا، ان مکالموں کا آغاز اس وقت ہوا جب آپ کوہاٹ میں درجہ خامسہ کے طالب علم تھے، اس زمانے میں آپ نے اپنے استاذ مولانا معین الدین مرحوم کے مضامین پر جمعیت علمائے اسلام کے آرگن ''ترجمان اسلام'' میں بھرپور نقد لکھا، نیز ''جائزہ'' نامی کتاب پر فاضلانہ تنقید رقم کی۔ جامعہ بنوری ٹاؤن سے مستقل ہنگو تشریف لانے کے بعد ۱۹۸۵ء میں آپ کی ایک مشہور مکاتبت مولانا محمد سلیم مرحوم (ہنگو) اور مولانا داؤد صاحب (ٹل) کے ساتھ ہوئی جو بعد میں ''مکاتیب ہدایت'' کے نام سے مرتب ہوئی اور پریس جانے کے لیے تیار تھی کہ اس دوران مولانا سلیم صاحب کا انتقال ہوگیا، حضرت الاستاذؒ نے مخاطب کے دنیا سے رحلت کے بعد اس کی اشاعت کو گوارا نہیں فرمایا اور اپنے صاحبزادے مولانا یوسف صاحب مدظلہ کو اس کی اشاعت سے روک دیا، یہ مجموعہ تاحال غیر مطبوع ہے، اس میں خاص مخاطب سے متعلق گفتگو کو اگر حذف بھی کر دیا جائے، تو پھر بھی متعلقہ موضوع کے بیش بہا فوائد کا خزینہ ہے۔ ان شاء اللہ کوشش کی جائے گی کہ اسے نئے لبادے میں زیور طباعت سے آراستہ کیا جائے۔ پیش نظر تحریر میں اسی مکاتبت کی روشنی میں آپ کے اسلوب مکالمہ کا مختصر تعارفی جائزہ پیش خدمت ہے۔

مولانا مودودی کے فکر سے تعارف اور مکالمہ کا آغاز

جماعت اسلامی کے ارباب فکر سے مکالمہ کے آغاز کے بارے میں آپ زمانہ طالب علمی میں لکھے ہوئے اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں:

> ''۷۵ء میں غالباً دارالعلوم عربیہ ٹل میں بندہ بغرض تحصیل علم دین داخل ہوا، انہی ایام میں دارالعلوم کی جانب سے ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس میں دیگر علمائے کرام کے علاوہ رئیس المحققین علامہ شمس الحق افغانی مدظلہ العالی کو بھی دعوت دی گئی تھی ...آپ نے اپنی تقریر میں فرق ضالہ کی نقاب کشائی کرتے ہوئے مولانا

مودودی صاحب کی جماعت کے متعلق بھی کچھ کہا، اس پر ایک صاحب نے' جو جماعت کے متعلقین میں سے تھے' دوران تقریر کھڑے ہوکر بدتہذیبی کی مگر علامہ ممدوح نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ صبح جب اجتماع کی دوسری نشست شروع ہوئی تو حاضرین سے مولانا سید گل بادشاہ صاحب نے خطاب کیا اور پوری تقریر میں جماعت کی حقیقت کو واضح کیا، اس وقت سے بندہ نے مولانا مودودی کے نام اور ان کی جماعت سے آگاہی پائی مگر چونکہ یہ تحصیل علم دین کا ابتدائی زمانہ تھا، اس لئے ان کی پوری حقیقت سے واقفیت کی استعداد نہ تھی۔
جب بندہ ۱۹۶۲ء میں انجمن تعلیم القرآن کوہاٹ میں داخل ہوا تو ۱۹۶۳ء میں ایسے حالات پیش آئے جن کی وجہ سے ہم نے مولانا کے نظریات اور ان کی جماعت کے افکار سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی، مولانا کی بعض تصانیف مطالعہ کیں اور جماعت کے بعض رسائل پڑھے، نیز ان کے نظریات کی تردید میں بعض حضرات نے جو رسائل لکھے تھے ان کا بھی مطالعہ کیا، مطالعہ کے بعد جو فیصلہ ہمیں اپنے ضمیر نے دیا وہ یہ تھا کہ اس جماعت سے تعلق اور وابستہ ہونے سے پرہیز مناسب ہے۔ اس فیصلہ کے بعد ہم نے ان کی تصانیف اور ان کے مخالفین کے رسائل دیکھنا چھوڑ دیے۔
۱۹۶۳ء کے اواخر میں جب کہ ہماری تعطیلات قریب تھیں، بندہ مع اپنے دو عزیز القدر رفقا کے نماز عصر کے بعد کمپنی باغ کوہاٹ میں بیٹھا تھا، کہ جماعت کے ناظم صاحب تشریف لائے اور ہمارے ساتھ زمین پر بیٹھ گئے، ان دنوں جماعت نے بنیادی حقوق کے حصول کے لئے لوگوں سے دستخط کرانے کی مہم شروع کر رکھی تھی، ناظم صاحب نے ہم سے دستخط کی استدعا کی، ہم نے دستخط کردیئے۔ اس کے بعد ناظم صاحب نے موضوع سخن بدل کر فرمایا کہ آپ جماعت اور ان کے امیر کی مخالفت کیوں کرتے ہیں؟ آخر آپ کا مولانا پر کیا اعتراض ہے؟ ہم نے عرض کیا کہ ہمارا اُن کے ساتھ اختلاف ضرور ہے مگر اس وقت اس کے ذکر سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا، مگر انہوں نے باصرار فرمایا کہ افہام وتفہیم سے کام بنتا ہے، آپ اپنے شکوک کا کھل کر اظہار کریں۔ اس کے بعد ہم نے اپنے کچھ خیالات کا اظہار کیا، ناظم صاحب نے جواب دینے کی کوشش کی، صحابہ کرام کے معیار حق ہونے اور تقلید واجتہاد وغیرہ مسائل پر گفتگو ہوئی مگر کچھ فائدہ مرتب نہ ہوا، نہ اُس نے ہماری مانی نہ ہم نے اس کی۔ آخر میں فرمایا کہ کل آپ ہمارے دفتر آجائیں، وہاں تفصیلاً گفتگو ہوگی۔ صبح جمعہ کا دن تھا، ہماری چھٹی تھی، تقریباً ساڑھے نو بجے بندہ ان کے دفتر مع اپنے رفقا کے حاضر ہوا۔ دفتر میں جناب مولانا ۔۔۔۔۔۔ صاحب' جو ایک جید عالم دین اور مثالی ذہن کے مالک ہیں اور جماعت میں ان کو بلند ترین مقام حاصل ہے' تشریف فرما تھے۔ حضرت سے ہمارا پہلے سے نیازمندی کا تعلق تھا، ہم اپنے دل میں آنے پر پشیمان ہوگئے، لیکن ادب کے ساتھ ان کی خدمت میں بیٹھ گئے۔ سوا گھنٹہ گزرا ہوگا کہ ناظم صاحب نے

مولانا سے فرمایا کہ یہ طالبعلم مولانا مودودی صاحب اور ہماری جماعت کے متعلق کچھ شبہات رکھتے ہیں، آپ ان کا ازالہ کیجئے۔ مولانا نے ہم سے دریافت فرمایا کہ آپ کے کیا شبہات ہیں؟ لیکن ان کے علمی مقام و احترام کے باعث ہم نے شرم وحیا کے مارے کچھ نہیں کہا۔ خیر حضرت نے خود بحث کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا کہ ہماری جماعت کے دستور کا ایک دفعہ یہ ہے کہ رسول خدا کے بغیر کسی کو معیار حق نہ سمجھو اور رسول خدا کے بغیر کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھو۔ دستور کے اس دفعہ پر مولانا مدنیؒ نے گرفت کی اور اس کے متعلق ایک رسالہ لکھا، مولانا مدنیؒ کے اعتراضات کو نقل کرنے کے بعد مولانا نے جوابات کا سلسلہ شروع کیا، مگر طرز سخن سخت اور آزردہ دل بنانے کا باعث تھا۔ بہرحال آپ نے صحابہ کرام کے معیار حق نہ ہونے پر طویل تقریر فرمائی ،حضرت مدنیؒ کے دلائل نقل کرکے رد کرنے میں کافی وقت لگایا۔ تقریر کے خاتمے پر ہم نے کچھ عرض کیا مگر آپ نے تحقیق کے مسئلہ سے زیادہ زور مولانا مدنی مرحومؒ اور مولانا لاہوریؒ کے ذوات پر حملے کرنے میں صرف کیا، ساڑھے بارہ بجے تک گفتگو جاری رہی، بعد ازاں ہم رخصت ہوگئے ،اس مجلس سے پہلے ہمارا ظن جماعت کے بارے میں یہ تھا کہ ان کے ارکان اور متعلقین زبردست باسلیقہ لوگ ہیں اوران کی گفتگو مہذب ہوتی ہے، مگر اس واقعہ کو دیکھنے کے بعد معاملہ برعکس نظر آیا، الغرض یہ بحث وتمحیص بھی نتیجہ نہ ہوئی ،صرف اتنی بات ہوئی کہ ناظم صاحب سے ہمارا تعارف بڑھ گیا اوران کے ساتھ مکالمے میں دلچسپی بڑھ گئی۔''

مکاتیب ہدایت: مکالمہ میں آپ کا منہج واسلوب

آپ کے مکالمہ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ آپ تحت الموضوع بحث کرتے ہیں، خروج عن البحث سے خود بھی احتراز کرتے ہیں اور مخاطب کو بھی اس جانب راغب کرتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ آپ اپنے موقف کو تقویت دینے کے لیے جملہ بازی، طعن وتشنیع یا دوراز کار تاویلات کا سہارا نہیں لیتے۔ عموماً یہ ضرورت وہاں پیش آتی ہے جہاں دلائل کا سقم چھپانا مقصود ہو لیکن آپ کے ہاں اس کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا۔

آپ کا طرز تحریر اور لب ولہجہ مخاطب کے انداز بیان پر بدلتا رہتا ہے، جہاں اسلوب بیان میں نرمی کا تقاضا ہوتا ہے وہاں آپ کا قلم جمال کا مرقع ہوتا ہے، لیکن جب زائغین کی عنادی روش زوروں پر ہو اور لب ولہجہ میں تحقیر دین کا پہلو سامنے آرہا ہو تو آپ کے قلم کا جلال ایسے گمراہ افکار کو خاکستر بنانے میں ذرا برابر تساہل نہیں برتتا۔

آپ کی ایک نمایاں خصوصیت جامعیت واختصار ہے، ایسے دلائل جنہیں پیش کرنے کے لیے لوگوں کو دفتر درکار ہوتے ہیں وہ آپ سطروں میں پیش کردیتے ہیں اور اس باب میں جملہ منقولات ومعقولات کو کام میں لاتے ہیں۔ عموماً ایسے دلائل کا انتخاب کرتے ہیں جو شخص اپنے اصولوں پر پورے نہ ہوں بلکہ مخاطب کے ہاں بھی مسلم ہوں۔

آپ کے پیش کردہ دلائل سے واضح ہوتا ہے کہ آپ کو گہرے تجزیہ وتحلیل کا ٹھوس ملکہ حاصل تھا، نیز موضوع پر انشراح قلبی اور مناسبت تامہ کی وجہ سے دلائل کی نادر تعبیرات اور ان سے استنتاج میں دقت بھی آپ کا نمایاں خاصہ ہے۔

آپ کے طرز مکالمہ کی ایک اور اہم خصوصیت درجہ اختلاف کو اس کے متعینہ دائرے میں رکھ کر بات کرنا ہے۔ فروعی اختلافات پر کبھی اصولی اختلاف کی طرح شدت نہیں دکھاتے، نہ ہی ہر گمراہ فکر کو تکفیر کے دائرے تک پہنچاتے ہیں بلکہ پوری طرح جادۂ اعتدال پر قائم رہتے ہیں۔

پیش نظر 'مکاتبت' کی بنیادی وجہ جماعت اسلامی کے حضرات کی طرف سے 'وضاحت' نامی پمفلٹ پر اعتراضات بنے، یہ پمفلٹ حضرت الاستاذ کا مرتب کردہ تھا، جس میں عصمت انبیا، عدالت صحابہ اور اجتہاد وتقلید جیسے مسائل میں مولانا مودودی صاحب کا اہل السنۃ سے انحراف واضح کیا گیا تھا، یہ مکاتبت سات خطوط پر مشتمل ہے جن کے مندرجات حسب ذیل ہیں:

۱۔ پہلے خط میں عصمت انبیا اور عدالت صحابہ سے متعلق مولانا مودودی صاحب کے مؤقف پر ان کی کتابوں سے حوالہ جات پیش کیے گئے ہیں۔

۲۔ دوسرے خط میں مخاطب کے مغالطوں کی وضاحت، متعلقہ موضوع پر ان کے پیش کردہ دلائل کا جواب، عدالت کی تعریف اور کتب عقائد سے عدالت صحابہ کرام کے متعلق اہل السنۃ کے مؤقف کی وضاحت پیش کی گئی ہے۔

۳۔ تیسرے خط میں مخاطب کے زلات کی گرفت، مغالطوں کی وضاحت، ہندو مسلم قومیت کے مسئلہ پر حضرت مدنیؒ کے مؤقف کا دفاع اور مودودی صاحب کی متنازعہ عبارات کے بارے قاضی حسین احمد صاحب مرحوم کا مؤقف واضح کیا گیا ہے۔

۴۔ چوتھے خط میں فکر مودودی کے مطالعہ کی سرگزشت، رد مودودیت سے متعلق قاضی مظہر حسین صاحبؒ کی کتاب پر اعتراضات کے جوابات، اور مولانا مودودی کے افکار سے متعلق مولانا نصیر الدین غورغشتویؒ کے فتوی سے رجوع کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔

۵۔ پانچویں خط میں مسئلہ عصمت انبیا پر مودودی صاحب کے موقف کا بھرپور ناقدانہ جائزہ لیا گیا ہے، اور لزوم ذاتی ووصفی کی حقیقت اور وصف عصمت کے لزوم اور عدم انفکاک کو عقلی ونقلی دلائل سے مبرہن کیا گیا ہے۔ نیز حضرت آدم علیہ السلام کے لیے "عصی" کی قرآنی تعبیر کی وضاحت اور ارادہ ومشیت الٰہی میں فرق کرنے پر مخاطب کی علمی گرفت کی گئی ہے۔

۶۔ چھٹے خط میں مخاطب کے مغالطوں کی وضاحت، رفع عصمت انبیا پر مخاطب کی پیش کردہ آیات کا جواب اور بعض شخصیات کے حوالے سے حضرت الاستاذ کی آرا تفصیلاً آگئی ہیں۔

۷۔ ساتویں خط میں دوران مکالمہ بعض مواقع پر اپنے زجر فی القول کی توجیہ اور زبانی مکالمہ کی خواہش کا اظہار ہے۔ اس مفید مکالمے کے بعض اہم گوشے افادۂ قارئین کی خاطر پیش خدمت ہیں:

(۱)......تعیین دعویٰ:

آپ کا اسلوب یہ ہے کہ بحث کے آغاز سے قبل اپنے دعویٰ کو وضاحت سے پیش کر دیتے ہیں جیسا کہ دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

''(۱) اہل سنت کا یہ اجماعی عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ خلعت نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد عصمت لازم اور دائم ہے جبکہ تفہیمات حصہ دوئم میں مودودی صاحب نے عصمت کے لزوم اور دوام کی نفی کی ہے۔

(۲) اہل سنت کے نزدیک صحابہ کرام کی جماعت موصوف بالعدل ہے اور ان پر جرح وتنقید جائز نہیں، جبکہ مودودی صاحب کی خلافت وملوکیت اس نظریہ وعقیدہ کے خلاف عبارات سے لبریز ہے۔''

اپنے دعویٰ کی وضاحت وتنویر کے لیے مودودی صاحب کی عبارات بھی پیش کرتے ہیں، ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

مولانا مودودی لکھتے ہیں: ''عصمت دراصل انبیا کے لوازم ذات میں سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب نبوت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرنے کے لئے مصلحتاً خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ فرمایا ہے۔ ورنہ اگر اللہ تعالیٰ کی حفاظت تھوڑی دیر کے لئے بھی ان سے منفک ہوجائے تو جس طرح عام انسانوں سے بھول چوک اور غلطی ہوتی ہے اسی طرح انبیا سے بھی ہوسکتی ہے۔ اور یہ ایک لطیف نکتہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بالارادہ ہر نبی سے کسی نہ کسی وقت اپنی حفاظت اٹھا کر ایک دو لغزشیں سرزد ہوجانے دی ہیں تاکہ لوگ انبیا کو خدا نہ سمجھ لیں اور جان لیں کہ یہ بشر ہیں خدا نہیں ہیں''۔ (تفہیمات حصہ دوم، ص: ۵۶، طبع حادی عشر ۸۴ء)

ابو البشر سیدنا حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں لکھتے ہیں: ''بس ایک فوری جذبے نے جو شیطانی تحریص کے زیر اثر ابھر آیا تھا ان پر ذہول طاری کر دیا اور ضبط نفس کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی وہ طاعت کے مقام بلند سے معصیت کی پستی میں جا گرے''۔ (تفہیم القرآن جلد: ۳، ص: ۱۳۳ طبع اول ۶۲ء)

اور حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں لکھا کہ ''ان سے جو فعل صادر ہوا تھا اس کے اندر خواہش نفس کا کچھ دخل تھا، اس کا حاکمانہ اقتدار کے نامناسب استعمال سے بھی کوئی تعلق تھا اور وہ کوئی ایسا فعل تھا جو حق کے ساتھ حکومت کرنے والے کسی فرمانروا کو زیب نہ دیتا تھا''۔ (تفہیم القرآن جلد: ۴، ص: ۳۲۷، طبع گیارہواں ۸۱ء)

اور حضرت یوسف وحضرت یونس وحضرت نوح وغیرہ جلیل القدر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں ان کی تحریریں آپ ہی کے پاس موجود مودودی صاحب کی تالیفات میں موجود ہیں، یہ اوراق نقل کے متحمل نہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے بارے میں بھی مودودی صاحب کی عبارتیں ڈھکی چھپی نہیں کم از کم خلافت وملوکیت تو ہر جگہ دستیاب ہے۔ حضرت معاویہؓ جیسے جلیل القدر صحابی پر نہایت مکروہ بدعت کے ارتکاب (ص: ۱۷۴)، مال غنیمت کی تقسیم کے معاملہ میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی صریح خلاف ورزی (ص: ۱۷۴)، استلحاق زیاد کے سلسلہ میں شریعت کے ایک مسلم قاعدے کی خلاف ورزی (ص: ۱۷۵) اور اپنے عہد میں سیاست کو دین پر بالا رکھنے اور سیاسی اغراض کے لئے شریعت کی حدیں توڑ ڈالنے (ص: ۱۷۹) وغیرہ کے الزامات صریحاً عقیدۂ عدالت اور 'کف اللسان عن ذکرھم الا بخیر' کے عقیدہ کے منافی ہیں، حضرت عثمانؓ، حضرت عمرو بن عاصؓ، حضرت مغیرہؓ وغیرہ اکابر کے خلاف زبان درازی اس کے علاوہ ہے قلت فرصت تفصیل سے مانع ہے۔''

مودودی صاحب کے دعاوی سے نتیجہ نکالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''مودودی صاحب نے تفہیمات کی عبارت میں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے حفاظت خداوندی کے اٹھائے جانے پر تصریح کی ہے اور یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ حفاظت عصمت سے اولاً تو اعم ہے ورنہ مساوی ہونے میں تو شبہ کی گنجائش ہی نہیں۔ دونوں صورتوں میں حفاظت کا رفع ہونا عصمت کے رفع ہوجانے کو مستلزم ہے استلزام رفع الاعم رفع الاخص واستلزام رفع المساوي رفع مثله نبوت کے بعد نبی کا معصوم نہ ہونا چاہے ایک لحہ کے لئے کیوں نہ ہو اجماع کے خلاف ہے۔ جیسا کہ عصمت حاصل ہونے کے بعد اس کا منفک ہوجانا خلاف اجماع ہے اور مودودی صاحب تفہیمات کی محولہ عبارت میں ان دونوں اجماعی عقیدوں سے انحراف کر چکے ہیں۔''

(۲)...... تنقیح دعویٰ:

آپ بعض مقامات پر مخاطب کے مغالطے اور آپ کے موقف کی درست تفہیم نہ کر سکنے کے باعث اپنے دعویٰ کی تنقیح بھی کرتے ہیں، جیسا کہ اس عبارت سے واضح ہوتا ہے:

''حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی عصمت سے متعلق تین امور ہیں:

اول اینکہ اس کا حصول قبل از نبوت ہوتا ہے یا بعد از نبوت؟

دوم عصمت انہیں کن امور سے حاصل ہے؟

سوم عصمت انہیں حاصل ہوجانے کے بعد ان سے منفک ہوسکتی ہے یا نہیں؟

امر اول کے بارے میں محققین اہل سنت کی رائے یہ ہے کہ انہیں عصمت قبل از نبوت بھی حاصل ہے اور بعد از نبوت بھی، پیدائش سے لے کر انتقال فرمانے تک وہ معاصی سے معصوم رہتے ہیں اور اہل علم کے بہت سے حلقوں کی رائے یہ ہے کہ عصمت نبوت کا خاصہ ہے اس لئے نبوت کے ساتھ وہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو نصیب ہوتی ہے گویا نبوت سے پہلے عصمت کا حصول تو مختلف فیہ ہوا اور بعد از نبوت عصمت کے ثبوت پر اجماع منعقد ہے۔

امر دوم کے بارے میں بھی اختلاف ہے بعض کا کہنا ہے کہ عصمت صرف کبائر سے انہیں حاصل ہے اور بعض کا قول ہے کہ صغائر کے ارتکاب سے بھی وہ معصوم ہیں، اکابر حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ صغائر و کبائر دونوں قسم کے معاصی و ذنوب سے انہیں عصمت حاصل ہے اور یہی امام ابوالحسن اشعریؒ اور امام ابومنصور ماتریدیؒ جیسے ائمہ کا مذہب ہے اور اہل تشیع و روافض کے نزدیک وہ زلات سے بھی معصوم ہیں۔ جب کہ اہل سنت کا اجماع ہے کہ عصمت زلات سے تحفظ نہیں دیتی۔ یعنی زلات سے محفوظ نہ ہونے پر اہل سنت کا اجماع ہے اور زلت سے مراد زلت عن الطاعۃ الی المعصیۃ نہیں بلکہ من الافضل الی الفاضل مراد ہے۔

امر سوم کے بارے میں پوری امت کا اجماع ہے کہ عصمت حاصل ہو جانے کے بعد پھر منفک نہیں ہو سکتی اور وہ علی وجہ اللزوم والدوام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو حاصل رہتی ہے گو لزوم کی نوعیت میں تفصیل ہے کہ عقلی ہے یا سمعی لیکن نفس لزوم پر سب کا اتفاق ہے۔ البتہ شیعہ حضرات کے نزدیک انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے بطور تقیہ، معاصی تو کیا کفر کا صدور بھی عیاذاً باللہ ہو سکتا ہے۔ یہ ہے عصمت کے مسئلہ کی کچھ تفصیل جو کلام، اصول فقہ اور تفسیر کی قابل اعتماد کتب سے لی گئی ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ نبوت کے بعد انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی عصمت اجماعی امر ہے اور عصمت کے حصول کے بعد چاہے قبل از نبوت ہو یا بعد از نبوت پھر انفکاک کا عدم جواز جس کی تعبیر لزوم اور دوام کے ساتھ کی جاتی ہے، اجماعی مسئلہ ہے اور اسی طرح زلات سے معصوم نہ ہونا بھی مجمع علیہ عند اہل السنۃ ہے۔ اس تنقیح کے بعد ہم اپنا الزام دہراتے ہیں کہ مودودی صاحب نے نبوت کے بعد ارتفاع عصمت کا نظریہ پیش کر کے اجماع کے خلاف کیا ہے۔ صرف اجماع ہی نہیں بلکہ دوسرے اجماع کی خلاف ورزی کی، بلکہ اگر مودودی صاحب کے بعض نادان دوستوں کی بات قبول کی جائے کہ مودودی صاحب ایک دو لغزشوں کو مستثنیٰ کر کے دیگر زلات سے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی عصمت کے قائل ہیں تو اس طرح شیعیت کا مزید قرب تو حاصل کر لیں گے مگر عصمت کے مسئلے میں اہل سنت، اہل حق کے ایک تیسرے اجماع کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوں گے۔''

اپنے عقیدے کی تصریح اور مابہ النزاع کی تعیین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ذاتی طور پر میرا عقیدہ علامہ ابن حزمؒ، قاضی ابوبکر العربی شیخ اکبرؒ، علامہ شعرانیؒ، عارف دباغ، علامہ محدث قاریؒ، سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ، حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ اور دیگر محققین کی طرح یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام قبل از نبوت اور بعد از نبوت ہر معصیت سے صغیرہ ہو یا کبیرہ ہو پاک اور معصوم ہیں لیکن مودودی صاحب پر ہم یہ گرفت نہیں کر رہے ہیں کہ آپ نے محققین کے مسلک کے خلاف عندیہ دیا ہے بلکہ ہمارا اعتراض یہ ہے کہ معصوم بننے کے بعد عصمت کے انفکاک اور حفاظت خداوندی کے بعض اوقات اٹھائے جانے کا نظریہ پوری امت مسلمہ کے سلف سے موروثی اجماعی عقیدہ کے خلاف ہے۔''

(۳) دعاوی مخاطب کا لاجواب عقلی رد

حضرت الاستاذؒ نے مودودی صاحب کے مزعومات کو جن ٹھوس عقلی دلائل سے رد کیا ہے، اس سے جہاں ان افکار کی عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے وہاں آپ کی معقولات پر غیر معمولی گرفت کا بھی اندازہ ہوتا ہے، ملاحظہ ہو:

''مولانا...... نے لوازم کی تقسیم کا سہارا لیا اور یہ ظاہر کیا ہے کہ مودودی صاحب عصمت کو لازم تو مانتے ہیں لیکن لوازم صفات میں سے نہ کہ لوازم ذات میں سے، اس لیے کہ لوازم ذات تو ذات سے کسی ظرف میں منفک نہیں ہو سکتے، تو عصمت دونوں صورتوں میں یکساں طور پر ثابت ہوگی۔ مولانا کی یہ تاویل بوجوہ فاسد ہے:

اول: اس لیے کہ عصمت کو منطقی معنی میں لوازم ذات میں سے کسی نے نہیں مانا تو نفی تحصیل حاصل ہے۔

دوم: تفہیمات کی اس عبارت کا سیاق ہے کہ ''اوریا کی بیوی کے متعلق حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف منسوب باتیں بعض اہل علم اس لیے صحیح تسلیم نہیں کرتے کہ عقیدہ عصمت کے منافی ہیں''۔

مودودی صاحب ان اہل علم کی رائے کو رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''ان حضرات نے شاید غور نہیں کیا کہ عصمت دراصل انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے لوازم ذات میں سے نہیں''۔ الخ

مذکورہ اہل علم پر مودودی صاحب کا یہ رد تب ہی صحیح ہو سکتا ہے کہ لوازم ذات کو عام لیا جائے یعنی وہ لوازم جو کسی کے ذات اور شخص کے ساتھ ہمیشہ کے لئے لگے ہوں چاہے باقتضائے ذات ہوں یا باقتضائے غیر۔ ورنہ اہل علم مذکورین کہہ سکتے ہیں کہ عصمت اگر لوازم وجود میں سے ہے۔ تب بھی حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف منسوب باتوں کے منافی ہے تو لوازم ذات میں نہ ہونے کا ہماری رائے پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ کما لا یخفی

سوم: عصمت کے لوازم صفات میں سے ہونے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ بتوسط صفات، صفات کی طرح ذات کے ساتھ قائم ہو۔ اور ظاہر ہے کہ یہ واسطہ فی الثبوت صفت نبوت ہی ہو سکتی ہے، جیسا کہ مودودی صاحب کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے: ''بلکہ اللہ تعالیٰ نے منصب نبوت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرنے کے لئے مصلحتاً خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ فرمایا۔'' (تفہیمات)

اور واسطہ فی الثبوت بکا قسمیہ کی صورت میں ذوالواسطہ موصوف بالوصف حقیقتاً ہوا کرتا ہے۔ بنابریں متصف بالعصمۃ نبی کی ذات سمجھی جائے گی، نبوت علت اتصاف ہے اور نبی کے ساتھ نبوت کے لزوم میں تو کلام نہیں اور یہ بھی مسلمات میں سے ہے کہ معلول کا اپنی علت سے تخلف محال ہے۔ تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ عصمت نبی کی ذات کے ساتھ لازم ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ یہ لوازم صفات کے ہوں، یعنی صفات کے ساتھ قائم ہوں۔ اس صورت میں ایک تو قیام العرض بالعرض کا استحالہ لازم آتا ہے۔ دوسرا اس صفت مثلاً نبوت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ وہ ذات کے ساتھ 'لازم غیر منفک' ہے یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو کفی بہ کفرا صریحا و بواحا اور اگر اثبات میں ہے تو ''لازم اللازم لازم'' کے کلیہ کے مطابق عصمت بھی ذات کے لوازم میں سے ہوگی۔

لوازم صفات کا ایک تیسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے جو کہ انتہائی مستبعد ہے مگر علمی اصطلاحات سے بے خبران بزرجمہروں سے مستبعد نہیں کہ یہی ان کی مراد ہو۔ وہ یہ کہ یہ لوازم تخلیقی وطبعی نہیں ہیں، بلکہ عطائی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ذاتیات نہیں عرضیات ہیں، جیسا کہ مودودی صاحب کی پچھلی عبارت میں'' اللہ نے۔۔۔۔ محفوظ فرمایا ہے'' اور اگلی عبارت'' ورنہ اگر اللہ تعالیٰ کی حفاظت تھوڑی دیر کے لئے بھی ان سے منفک ہوجائے'' کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے۔ اور مولانا۔۔۔۔۔ نے صراحتاً لکھا کہ'' عصمت عطائی چیز ہوتی ہے، نہ تخلیقی وطبعی۔'' تو عصمت کے لوازم ذات بمعنی ذاتیات میں سے ہونا تو مسلم ہے لیکن ذاتیات پر لوازم کا اطلاق تحریف فی الاصطلاح ہے۔ لازم قسم ہی عرض کی ہے، اس صورت میں عموم القسم من المقسم کے فساد کا لزوم بین ہے۔ نیز عصمت کا عطائی ہونا تو اس کے لزوم کے ساتھ منافی نہیں، حتیٰ کہ مودودی صاحب کا اہل علم مذکورین پر رد صحیح ہوجائے۔ علاوہ ازیں جب آپ کا گروہ حفاظت خداوندی کے بالفعل اٹھ جانے کی بات کرتا ہے اور چھوٹے میاں لکھتے ہیں کہ'' عصمت عطائی چیز ہوتی ہے نہ کہ تخلیقی وطبعی تو پھر عصمت منفک کیوں نہیں ہوسکتی، کیا آپ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ عصمت نبی کی ذات کے ساتھ لازم علی الدوام رہتی ہے''۔

تو باوجود انفاک اور ارتفاع کے لزوم کہاں رہا؟ لوازم صفات قرار دینے کے بعد پھر اس کے اٹھ جانے کی بات اور منفک ہوجانے پر اصرار ایک طرف اگر لزوم کے معنی سے جاہل ہونے کی دلیل ہے، تو دوسری طرف تضاد بیانی کا ایک شاہکار نمونہ بھی ہے۔ خدا کے بندے سباحت کا فن سیکھے بغیر سمندر میں کھودنے کا نتیجہ ہلاکت ہی ہوتا ہے۔ آپ کو کس حکیم صاحب نے مشورہ دیا کہ علمی مباحث میں حصہ لو اور اس سے بھی بڑھ کر منطقیانہ اور فلسفیانہ زبان میں بات کرو۔

خلق الله للحروب رجالا

ورجالا للقصعة والثريد

چو در بسته باشد چه داند کسے

که جوهر فروش است یا پیله ور

کاش مرشد سعدیؒ کی وصیت ہی قبول کرتے۔

چہارم: تفہیمات کی اس عبارت کا سیاق بھی بتلا رہا ہے کہ مودودی صاحب عصمت کو لازم ہی نہیں مانتے اس لئے اگلی عبارت میں انہوں نے عصمت کے لوازم ذات میں سے نہ ہونے پر تفریع کی ہے کہ ان کی مزعومہ حکمت اور مصلحت کی وجہ سے ہر نبی سے کبھی کبھی یہ حفاظت اٹھالی گئی ہے۔ یہ تفریع تب ہی صحیح ہوسکتی ہے کہ لوازم سے مطلق لوازم مراد لیے جائیں اور ذات بمعنی شخص ہو، نہ بمعنی ماہیت وطبیعت، ورنہ اگر عصمت لازم وجود ہو تو تب بھی اس کے ارتفاع اور انفکاک کا امکان کہاں؟

پنجم: اس لیے کہ تفہیمات منطق اور فلسفہ کے نصاب کی کتاب نہیں بلکہ عامۃ الناس کے افادہ کے لئے اردو زبان میں لکھی گئی ہے۔ اردو محاورات میں ذات کا لفظ شاذ ونادر ہی شاید کہیں ماہیت اور طبیعت کے معنی میں استعمال ہو۔ عموماً یہ لفظ شخص کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، یہ میرا ذاتی کام ہے۔ یہ آپ کا ذاتی مکان ہے۔ یہ میری ذاتی چیزیں ہے۔ ان کی ذات کو نشانہ بنایا۔ ان کی ذات سے مجھے کد نہیں وغیر ذالک سینکڑوں محاورے اس کے شہود عدل ہیں اور کبھی ذات نسل ونسب کا معنی بھی دیتا ہے۔ مودودی صاحب نے اس عبارت میں یہ لفظ یقیناً عام محاورہ کے مطابق شخص کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ نہ کہ ماہیت کے معنی میں، جیسا کہ مودودی صاحب کے کلام کے سیاق وسباق سے ہم نے پہلے یہ بات واضح کردی ہے۔

ششم: آپ نے اپنی تاویل کے لئے جو دلیل دی ہے کہ ''عصمت اگر ان کی ذات کے لئے مانی جائے تو ضروری امر ہے کہ عصمت دونوں حالتوں میں یکساں طور پر بالاتفاق ثابت ہو''۔ یہ دلیل ہی بودی اور فاسد ہے۔ محققین اہل حق جو عصمت کو قبل از نبوت وبعد از نبوت یکساں طور پر ثابت مانتے ہیں وہ اگر عصمت کو آپ کے فہم کے مطابق ذات کے لئے لازم مان لیتے ہیں تو ان پر آپ کے الزام کا کیا اثر پڑسکتا ہے؟ آپ کی یہ دلیل تو صرف ان حضرات کے خلاف ایک حد تک کارگر ثابت ہوسکتی ہے، جو عصمت کو وصف نبوت کا خاصہ لازمہ سمجھتے ہیں، نہ کہ ان حضرات کے خلاف جو نبوت کی طرح عصمت بھی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے خواص لازمہ میں سے شمار کرتے ہیں۔

لوازم کی بحث کے خاتمہ میں ہم جناب مولانا۔۔۔۔۔ سے استفسار کرتے ہیں کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی

نبوت بالفعل ان کے لوازم ذات میں سے ہے، یا لوازم صفات میں سے۔ اگر لوازم ذات میں سے ہے تو بقول آپ کے قبل از نبوت بھی ان کو نبی ماننا پڑے گا، وھل ھذا الا القول بالمتنافیین لا یمکن ان یتفوہ بہ عاقل۔ اگر لوازم ذات میں سے نہیں لوازم صفات میں سے ہے اور عطائی چیز ہے، نہ کہ تخلیقی و طبعی تو آپ ہی کے الفاظ میں عصمت کی طرح نبوت بھی منفک کیوں نہیں ہو سکتی۔ فماھو جوابکم فھو جوابنا بل جوابنا اسھل وایسر عند من رزق الفھم للخیر والھم للرشد والحمدللہ"

(۴)......دلائل مخاطب کا تجزیہ:

مخاطب بعض اوقات اپنے مدعا پر قرآن مجید اور عبارات ائمہ سے استدلال کی کوشش کرتے ہیں، حضرت الاستاذ نے ایسے تمام استدلالات کا بھر پور اور مسکت تنقیدی جائزہ لیا ہے، بطور نمونہ ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

''سورۃ اسراء کی آیت کریمہ ولولا ان ثبتنک لقد کدت ترکن الیھم شیئا قلیلا [الاسراء:۷۴] کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ آیت انفکاک (العصمۃ عن الانبیاء) پر واضح دلالت کرتی ہے، صدق اللہ العظیم۔''

سورۃ بنی اسرائیل کی یہ آیت مقام عصمت اور وحی کی عظمت وطہارت کو اجاگر کرنے کی کتنی بڑی اور واضح دلیل ہے، اس کا اندازہ اہل ایمان اس آیت کے ایک ایک لفظ سے لگا سکتے ہیں، مگر بد باطن قسم کے لوگوں کے زیغ میں یہ اضافہ کا سامان بن گئی ہے، یہ آیت کتنی قوت اور شدت کے ساتھ عصمت اور اس کے لزوم وعدم انفکاک پر دال ہے، ذرا ملاحظہ فرمائیں:

اولا: اہل ایمان حضرات غور فرمائیں کہ آیت کریمہ کی ابتداء ''لولا'' سے ہوئی ہے جو بالاتفاق دال ہوتا ہے، امتناع جزاء پر شرط کے وجود کی وجہ سے جس سے ثابت ہوا کہ جزا یعنی رکون الیھم ممتنع ہے۔

ثانیا: ''لو'' کا استعمال ہوتا ہے فرض ممتنع کے لئے جس سے ظاہر ہوا کہ عدم تثبیت اور انفکاک عصمت وانتفاء توفیق ناممکن اور ممتنع ہے، تو تثبیت اور عصمت واجب ہے، اس لئے کہ کسی چیز کے عدم کا امتناع جانب وجود کے وجوب اور ضرورت کو مستلزم ہوتا ہے۔

ثالثا: ثبتنا باب تفعیل سے ہے جس کا ایک خاصہ تکثیر ہے اور مصدر کو بصورت فعل ذکر فرما چکے ہیں تو معلوم ہوا کہ تثبیت تجددی نہ بھی ہو تو فی الجملہ ثبات طبعی پھر بھی رہے گا۔

رابعا: ''قد'' کا اضافہ فرمایا ہے، جو کبھی مفید تحقیق ہوتا ہے، اور کبھی مفید تقلیل۔

خامسا: پھر ''کدت'' فرمایا جو بجائے مباشرۃ بالفعل کے قرب اور دنو خبر کے لئے وضع ہے، اور پھر

سادسا: ''ترکن'' ''رکون'' کے مادہ سے خبر لے آئے جس کا معنی کچھ میل اور جھکاؤ ہے پورا نہیں اور مزید

سابعا: مبالغہ فی التقلیل کے لئے ''شیا'' کا ذکر فرمایا اور

ثامنا: وہ بھی منکر برائے تحقیر اور تقلیل اور

تاسعا: پھر اسے قلیلا کے ساتھ تاکید مزید کے طور پر موصوف بنایا اور پھر

عاشرا: اس اقل قلیل 'رکون' کی تعبیر کے لئے حق یہ ہے کہ ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں، یہ قرآن حکیم کا معجزانہ اسلوب بلاغت ہے کہ اس نے 'رکون' کے اس جزء لا یتجزی کی تعبیر پیش کی۔ اس درجہ کا 'رکون' عامۃ الناس کے حق میں اصغر الصغائر کا درجہ بھی نہیں رکھتا مگر سبحان اللہ! ساحت نبوت کی طہارت، رداء رسالت کی نظافت، پیغمبرانہ کردار کے شفاف آئینہ کی صفائی اور نزاکت کا کیا ٹھکانہ ہے کہ یہ نظر نہ آنے والا چھینٹا اور ذرا سا لطیف سا دھند بھی نا قابل برداشت ہے اور ارتکاب کی صورت میں صرف وعید ہی نہیں شدید ترین تحدید سنائی جارہی ہے، جس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ تلک عشرۃ کاملۃ

اور اس پر مستزاد گیارہویں وجہ دلالت یقینی طور پر وعید مذکور فی الآیۃ کے وقوع کا محال ہونا ہے، اس لئے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ جنت اور انعام کا غیر مشروط وعدہ ہے اور اس کی خبر بھی دی گئی ہے اور خلف فی الوعد عند اہل سنت قطعیۃ محال عقلی ہے، جیسا کہ کذب فی خبرہ تعالیٰ ممتنع ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ وعید تعلیق بالمحال کے قبیل سے ہے۔

اور بارہویں تاکید اس پوری مضمون کو قسم محذوف کے ساتھ مقرون کر کے ذکر فرمایا ہے، جس پر "لقد کان" کا لفظ دلالت کر رہا ہے۔ راسخ الایمان حضرات کے بعد اب ہم اپنے کلام کا رخ ذرا دوسرے طائفہ کی طرف موڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر یہ آیت 'انفکاک' پر دال ہے تو انفکاک کے بعد اس پر مرتب جزاء یعنی 'رکون الیہم' ضرور واقع ہوگا۔ ورنہ عیاذ اً باللہ یہ شرطیہ کاذب ثابت ہوجائے گا اور اس جزاء کے وقوع کی صورت میں سزائے مذکور کا وجود میں آنا ضروری ہے، ورنہ کذب فی الخبر وخلف فی القول لازم آئے گا۔ تعالیٰ اللہ عما **یقولون ویفترون علوا کبیرا کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم ان یقولون الا کذبا**، اور سزائے مذکور کے وقوع کا دعویٰ بدترین کافر بھی نہیں کرسکتا۔ فمالکم الی نصرفون"

مخاطب کے تمام دلائل کا اسی منہج واسلوب پر رد کیا گیا ہے، اس رد کو تفسیری، کلامی، عقلی، نحوی، صرفی اور بلاغی پہلو سے دیکھا جائے، تو ان سب علوم وفنون میں حضرت الاستاذ کی عبقریت روز روشن کی طرح سامنے آتی ہے۔ فجزاھم اللہ عنا وعن سائر المسلمین۔

(۵)......زلات مخاطب کی گرفت:

مخاطب بعض اوقات دلیل قائم کرتے ہوئے تعبیر یا فہم کی سخت غلطی کا شکار ہوجاتے ہیں، جس کی وجہ سے بے احتیاط عبارتیں لکھ بیٹھتے ہیں، حضرت الاستاذ ایسے تمام مواقع پر کڑی گرفت فرماتے ہیں، بطور نمونہ چند مقام پیش

خدمت ہیں:

''عصمت کا معنی بین القوسین ''نگرانی'' لکھا ہے۔اب سوال یہ ہے کہ نگرانی اور حفاظت میں فرق کی دلیل آپ کے پاس کیا ہے۔جبکہ محاورات میں ہر ایک کا استعمال دوسرے کی جگہ ہو رہا ہے،کم از کم فیروز اللغات ہی کو اٹھا کر دیکھئے کہ نگرانی کی تفسیر حفاظت سے اور حفاظت کی نگرانی سے کر چکے ہیں جبکہ عصمت کی تفسیر پارسائی اور پرہیزگاری سے کی ہے،اور بر تقدیر فرق یہ حق آپ کو کس نے دیا کہ عصمت کا معنی نگرانی بتلائیں اور حفاظت اس سے اخص قرار دیں،جبکہ یہ دونوں لفظ عربی زبان کے ہیں اور تمام معتمد علیہ ثقہ اہل لغت عصمت کا اصل معنی ''منع'' یعنی دفاع اور بچاؤ بتلاتے ہیں،اور منجملہ اس کے معانی کے لزوق اور لزوب بھی ہے،جو تقریباً لزوم کا معنی دیتا ہے،اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ''حفاظت'' جس کا معنی حراست ونگرانی ہے' کی بجائے امت نے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے لئے 'عصمت' کا لفظ اختیار کیا،اس لئے کہ حراست اور نگرانی کی صورت میں اس بات کا توہم ہوسکتا ہے کہ نبی مائل بہ معصیت ہوجاتا ہے،مگر نگرانی ایسا کرنے نہیں دیتی، بخلاف بچاؤ اور دفاع کے لفظ کے کہ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ نبی تو اپنی پاکیزہ سرشت اور فطرت کی وجہ سے مائل بہ معصیت نہیں ہو رہا لیکن باہر سے معصیت حملہ آور ہوکر اگر ان کے قریب آنے کی کوشش کرتی ہے،تو لطف خداوندی اس معصیت کو اپنے محبوب ومقرب کے قریب نہیں آنے دیتی بلکہ اس کو دھکیل کر دور پھینک دیتی ہے،سورۃ یوسف میں کذالک لنصرفہ عن السوء کے بجائے لنصرف عنہ السوء والفحشاء کی تعبیر اختیار فرمانے میں اس طرف لطیف اشارہ پایا جاتا ہے،جسے فخر ملت فخر رازیؒ نے محسوس کیا اور اس پر تنبیہ فرمائی۔مزید یہ کہ یہ لفظ ساتھ ساتھ لزوم پر لغۃً دال ہے،بخلاف حفاظت کے۔لغات القرآن پر اپنی لاثانی اور شہرہ آفاق تالیف 'المفردات' کی وجہ سے عالمی شہرت یافتہ،ثقہ اور معتمد علیہ امام لغت علامہ راغبؒ فرماتے ہیں:

عصمۃ اللہ الانبیاء حفظۃ ایاھم بماخصھم بہ من صفاء الجوھر ثم بما اولاھم من الفضائل الجسمیۃ النفسیۃ ثم بالنصرۃ وتثبیت اقدامھم ثم بانزال السکینۃ علیھم وبحفظ قلوبھم والتوفیق(تاج العروس،ج:۸،ص:۳۹۹)

اور علامہ مناویؒ وغیرہ نے عصمت کی تفسیر ملکۃ اجتناب المعاصی مع التمکن منھا سے جو کی ہے تو وہ مجمل ہے،اور علامہ اصفہانیؒ کی تفسیر مفصل ہے،اجمال وتفصیل کے علاوہ کوئی بنیادی اور جوہری فرق دونوں میں نہیں بہرحال از روئے لغت بھی مولانا۔۔۔۔۔کی بات کا بطلان آفتاب نیمروز کی طرح واضح ہے،اور علمائے دین کی اصطلاح کے بارے بھی مولانا۔۔۔۔۔کا فرق ممکن نہیں اس لئے کہ محفوظ کا اطلاق غیر انبیا پر بلا نکیر ہوتا ہے،جبکہ عصمت کا اطلاق غیر انبیا پر نہیں ہوتا،یہی وجہ ہے کہ اہل سنت نے ائمہ اثنا عشریہ پر معصوم کا اطلاق

کرنے سے انکار کیا ہے۔"

ایک جگہ مشیت وارادۂ خداوندی میں فرق کی بے احتیاط عبارت پر لائق شان تنبیہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آپ نے لکھا ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے لغزشیں بارادہ خداوندتعالی ہوئی ہے، نہ کہ مشیت خداوندی سے، اور پھر اپنے جہل مرکب کی بنا پر مجھے مخاطب کر رہے ہو کہ ارادہ خداوندی اور مشیت خداوندی میں فرق تو آپ کو بخوبی معلوم ہوگا۔ قلم چاہتا ہے کہ دین اور علم کی اس غربت اور مظلومیت پر ماتم ہی کرتا رہے، قرآن حکیم کی تقریباً ڈھائی سو نصوص میں مصرح صفت مشیت کو یہ لوگ کس طرح تختہ مشق ستم بنا رہے ہیں۔ قرآن حکیم کی نصوص محکمہ صریحہ ہیں:

وماتشاءون الا ان یشاء اللہ ط ان اللہ کان علیما حکیما۔ [الدھر: ۳۰]

وماتشاءون الا ان یشاء اللہ رب العلمین ۔ [التکویر: ۲۹]

من یشا اللہ یضللہ ط ومن یشا یجعلہ علی صراط مستقیم۔ [الانعام: ۳۹]

ذلک ھدی اللہ یھدی بہ من یشاء ط ومن یضلل اللہ فما لہ من ھاد۔ [الزمر: ۲۳]

وربک یخلق مایشاء ویختار۔ [القصص: ۶۸]

ان اللہ یفعل مایشاء ۔ [الحج: ۱۸]

ان اللہ یفعل مایرید۔ [الحج: ۱۴]

قل اللھم ملک الملک تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء وتعز من تشاء

وتذل من تشاء ۔ [آل عمران: ۲۶]

بل اللہ یزکی من یشاء۔ [النساء: ۴۹]

مازکی منکم من احد ولکن یزکی من یشاء۔

ماکانوا لیؤمنوا الا ان یشاء اللہ۔ [الانعام: ۱۱۱]

ولو شاء اللہ ما اشرکوا۔ [الانعام: ۱۰۷]

ولو شاء اللہ مافعلوا۔ [الانعام: ۱۳۷]

ولاتقولن لشایء انی فاعل ذلک غدا۔ [الکھف: ۲۳]

اور انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کی یہ شہادت قرآن مجید ہی نے نقل فرمادی:

ومایکون لنا ان نعود فیھا الا ان یشاء اللہ ربنا۔ [الاعراف: ۸۹]

قالت لھم رسلھم ان نحن الا بشر مثلکم ولکن اللہ یمن علی من یشاء من عبادہ ۔ [ابراھیم: ۱۱]

ستجدنی ان شاء اللہ صابرا۔ [الکھف: ۶۹]

ستجدنی ان شاء اللہ من الصبرین۔ [الصافات: ۱۰۲]

ستجدنی ان شاء اللّٰہ من الصّٰلحین۔ [القصص: ۲۷]

کہاں تک لکھتا جاؤں۔ یہ آیات قرآنیہ، حجج فرقانیہ، براہین قطعیہ، پوری صراحت کے ساتھ ثابت کر رہی ہیں کہ حق تعالیٰ کی مشیت کے بغیر راہیابی یا گمراہی، لغزش ہونا یا لغزش سے بچنا وغیرہ اعمال وافعال تو درکنار کسی فعل کا ارادہ و مشیت بھی ممکن نہیں۔ تو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے لغزشوں کے صدور کو مشیت خداوندی کے بغیر کہنا، کیا ان نصوص صریحہ کی تکذیب کے مترادف نہیں۔ تو اس کفر بواح وصراح کا ارتکاب بقائی ہوش و حواس کوئی مسلمان کر سکتا ہے؟ رہی مشیت الٰہی اور ارادہ الٰہی میں فرق کی بات۔ تو اس امت مسلمہ میں کرامیہ کے علاوہ کوئی نہیں کرتا اور کرامیہ بھی یہ فرق کرتے ہیں کہ مشیت کو ازلی اور ارادہ کو صفۃ حادثہ مانتے ہیں، جو آپ کے مدعا سے کوسوں دور ہے، صرف مخلوق کے ارادہ و مشیت میں فقہا نے فرق کیا ہے کہ ارادہ میں تراخی ممکن ہے اور مشیت میں نہیں جس پر طلاق کے کچھ مسائل متفرع ہیں۔ خالق جل وعلیٰ کی مشیت وارادہ کو وہ بھی ایک مانتے ہیں اس سلسلے میں ائمہ کلام وفقہ کی چند تصریحات ملاحظہ ہوں:

والارادۃ والمشیۃ وھما عبارتان عن صفۃ فی الحی توجب الخ (شرح عقائد نسفی ص: ۱۱۳)

یہ عبارت صاف بتلا رہی ہے کہ ارادہ و مشیت ایک ہی صف کے دو نام ہیں اس لئے علامہ نسفیؒ نیچے لکھتے ہیں:

وھما مترادفان۔

اور علامہ احمد جندؒ شرح عقائد کی شرح (ص ۱۱۷) میں لکھتے ہیں:

لافرق بین المشیۃ والارادۃ الاعند الکرامیۃ۔

اور خود علامہ تفتازانیؒ شرح مقاصد (جلد: ۲، ص: ۹۶) پر لکھتے ہیں:

ولافرق بین المشیۃ والارادۃ الاعند الکرامیۃ۔

اور علامہ عبدالعزیز پرہارویؒ نبراس کے (ص: ۲۱۰) پر تحریر فرماتے ہیں:

لفظان مترادفان لغۃ واصطلاحا عند الجمھور وزعمت الکرامیۃ ان الارادۃ صفۃ حادثۃ والمشیۃ صفۃ قدیمۃ۔

محقق شہیر علامہ علی القاریؒ کا شرح فقہ اکبر (ص: ۲۲) پر ارشاد ہے:

وھی (ای الارادۃ) والمشیۃ واحدۃ عندنا فی حق اللّٰہ تعالیٰ امافی جانب العباد فیفترقان۔

علامہ زبیدیؒ کی تاج العروس (ج:۱، ص: ۸۳) پر یہ تحقیق ہے:

قال الجوھری رحمہ اللہ المشیۃ الارادۃ ومثلہ فی المصباح والمحکم واکثر المتکلمین لم یفرقوا بینھما۔

امام راغب اصفہانی المفردات (ص: ۲۷۳) پر قمطراز ہیں:

المشیۃ عند اکثر المتکلمین کالارادۃ سواء وعند بعضھم ان المشیۃ فی الاصل ایجاد الشیٔ واصابتہ

فمن اللہ الایجاد و من الناس الاصابۃ و فی العرف تستعمل موضع الارادۃ باختصار ما۔

امام بخاری نے کتاب التوحید میں یہ ترجمہ لکھا: باب المشیۃ والارادۃ اور اس باب میں تقریباً ۱۶ احادیث نبویہ اور چار آیات قرآنیہ لائے۔ اسی باب کے شرح میں شیخ الاسلام حافظ ابن حجر حضرت امام شافعیؒ سے نقل فرماتے ہیں:

المشیۃ ارادۃ اللہ و قد علم اللہ خلقہ ان المشیۃ لہ دونہم الخ (فتح الباری، ج: ۱۳، ص: ۳۸۳)

اور صحیح بخاری کے ایک اور مالکی المذہب شارح علامہ ابن بطالؒ کا قول نقل کرتے ہیں:

غرض البخاری اثبات المشیۃ والارادۃ وهما بمعنی واحد الخ (فتح الباری، ج: ۱۳، ص: ۳۷۵)

اور خاتمۃ المحققین کمال الدین ابن الہمام فتح القدیر شرح الہدایہ (ج: ۳، ص: ۴۲۴) پر لکھتے ہیں:

المشیۃ والارادۃ فی صفۃ العباد مختلفان و فی صفۃ اللہ تعالی مترادفان۔ الخ

اور علامہ اکمل الدین بابرتی کا عنایہ شرح الہدایہ (ج: ۳، ص: ۴۳۳ علی ہامش فتح القدیر) پر ارشاد ہے:

فان قیل ذهب علماؤنا فی اصل الدین الی ان الارادۃ والمشیۃ واحدۃ فما هذہ التفرقۃ؟ فالجواب انہ یجوز ان یکون بینهما تفرقۃ بالنسبۃ الی العباد والتسویۃ بالنسبۃ الی اللہ تعالی لان ما شاء اللہ کائن لا محالۃ و کذا ما یریدہ بخلاف العباد۔

اور علامہ جلال الدین کرمانی اپنی شرح کفایہ بذیل فتح القدیر (ج: ۳، ص: ۴۳۳) پر یوں درافشاں ہیں:

فان قیل الیس الارادۃ والمشیۃ شیئان عند اهل السنۃ۔ قلنا: جاز ان یکون بینهما تفرقۃ نظرا الینا وتسویۃ نظرا الی ربنا۔

ہم اس بحث کا خاتمہ شہرآفاق محدث وفقیہ ومتکلم امام طحاوی کی عبارت پر کرتے ہیں:

و کل شیء یجری بتقدیرہ و مشیئتہ تنفذ لا مشیۃ العباد الا ما شاء لهم، فما شاء لهم کان و ما لم یشا لم یکن۔

امام طحاویؒ کے ان ایمان افروز کلمات کی شرح میں متعدد آیات کریمہ کے نقل کرنے کے بعد ان کے شارح لکھتے ہیں:

الی غیر ذالک من الادلۃ علی انہ ما شاء اللہ کان و ما لم یشاء لم یکن و کیف یکون فی ملکہ ما لا یشاء و من اضل سبیلا واکفر ممن یزعم ان اللہ شاء الایمان من الکافر والکافر شاء الکفر فغلبت مشیۃ الکافر مشیۃ اللہ تعالی عما یقولون علوا کبیرا۔ (شرح العقیدۃ الطحاویہ، ص: ۹۱)

اہل خبر واصحاب نظر جانتے ہیں کہ شارح کی اس عبارت میں 'الایمان' اور 'الکفر' اور 'الکافر' کا ذکر تمثیلاً ہے۔ برائے احتراز نہیں۔"

اس عالمانہ گرفت کے ایک ایک لفظ سے گہرا علم مترشح ہے، اہل علم ہی اس سے حظ اٹھا سکتے ہیں۔

منطق کی معروف اصطلاح میں غلطی پرتنبیہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بزعم خویش اپنی منطق دانی اور درحقیقت اپنی جہالت کا مظاہرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:' جب تک آپ یہ متعین نہ کرلیں کہ'لزوم بین بمعنی الاخص' ہے تو'مشروط عامہ' کیسے بنے گا؟''

سبحان اللہ!مشروط عامہ کے وجود کولزوم کے بین بمعنی الاخص ہونے کے ساتھ مشروط کرنے کی تحقیق انیق کی خبر پاکر ابن سینا سے لےکر مولانا فضل امامؒ تک مناطقہ کی ارواح کا کیا حال ہوا ہوگا، کیونکہ ان حضرات نے مشروط عامہ کے تحقق کے لئے ضرورت وصفی کو کافی قرار دیا ہے۔ چاہے فی زمان الوصف ہو یا بشرط الوصف یا لاجل الوصف ہو، ان کے نزدیک تو مشروط میں لزوم کا بین ہونا بھی ضروری نہیں، چہ جائیکہ بمعنی الاخص ہو۔''

مخاطب کی پیش کردہ مولانا مودودی کی ایک تحریر میں اجتماع نقیضین پر تنبیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آگے چل کر مولوی صاحب اپنے امام کا واضح تضاد پر مشتمل نظریہ بڑے فخر وطمطراق کے ساتھ نقل کرتے ہوئے عقل ودانش کا منہ چڑاکر لکھتے ہیں کہ'انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام پیدائش سے لےکر مرتے دم تک کبائر وصغائر، لغزشوں اور مکروہات سے محفوظ ومصئون ہیں لیکن یہ صیانت اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطائی ہے۔ ہاں! اس کی حکمت کا تقاضا ہو تو کوئی فعل سرزد ہونے دیتا ہے۔'

جاننے والے جانتے ہیں کہ ازروئے مفہوم ومدلول مودودی صاحب اور مولانا۔۔۔۔۔کے اس کلام کا پہلا جز سلب کلی پر مشتمل ہے اور آخر حصہ میں ایجاب جزئی کا ذکر ہے، اجتماع نقیضین کا یہ اعجوبہ دیکھئے کتنی ڈھٹائی کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے پھر عطائی ہونے کے ساتھ یہ کیا ضروری ہے کہ وہ سلب بھی ہوجائے۔''

(۶)......مخاطب کے تساہل پرتنبیہ:

مخاطب بعض اوقات عبارات سے استنتاج میں تساہل کا مظاہرہ کرتے ہیں، ایسے کئی مقامات پر حضرت الاستاذ نے گرفت فرمائی ہے، ذیل کی عبارت میں آپ مخاطب کے اسی طرح کی ایک غلط فہمی کی حقیقت واشگاف کرتے ہیں
:

''آپ لکھتے ہیں: محترم استاذ نصیرالدین غورغشتویؒ نے شیعہ حضرات کو سواد اعظم میں شامل کررکھا ہے۔ ذرا آپ مشکوٰۃ المصابیح کھول کر حدیث فاتبعوا اسواد الاعظم کے مقام پر حاشیہ دیکھیں۔''

جناب والا! سبحانک ہذا بہتان عظیم آپ کے ارشاد کی تعمیل میں ہمیں مشکوٰۃ شریف (ص:۳۱) کی گیارہویں سطر کے آخر میں اتبعوا السواد الاعظم کے الفاظ ملے اور حاشیہ نمبر:۷ میں شمس العارفین رأس الصالحین حضرت مولانا نصیرالدین غورغشتویؒ کی یہ عبارت ملی، جو سواد اعظم کی تشریح ہے:

''یعبر بہ عن الجماعۃ الکثیرۃ والمراد اکثر المسلمین وھم اھل السنۃ والجماعۃ فان ماعداھم من فرق

اهل القبلة قليلة بالنسبة اليهم وآهل السنة في زماننا آصحاب المذاهب الاربعة وأهل الظاهر الذين لايكفرون أصحاب المذاهب الاربعة ولا يسبون الائمة المجتهدين ولا يعيبونهم"

یہ عبارت پڑھ کر ایک طرف مولانا غور غشتوی کی بہترین خداداد فہم وبصیرت اور علمی وتحقیقی ذوق کو داد دینی پڑی۔ دوسری طرف جناب والا کے بارے میں بے ساختہ زبان پر یہ آیا کہ

چه دلاور هست وزدے که بکف چراغ دارد"

اسی طرح ایک مقام پر مخاطب آپ کی عبارت سے غلط نتیجہ اخذ کر کے الزام دھرتے ہیں، جس کی وضاحت کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

''میں نے اپنے سابقہ مکتوب میں لکھا تھا: ''اہل سنت کا مسلمہ اجماعی عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ خلعت نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد عصمت لازم اور دائم ہے۔ جبکہ تفہیمات حصہ دوم میں مودودی صاحب نے عصمت کے دوام اور لزوم کی نفی کی ہے۔''

مولانا میری عبارت سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں: ''میرے دل ودماغ کی خواہش کے مطابق مولانا محمد امین صاحب کا عقیدہ باجماع اہل سنت دو جز پر مشتمل ہے: پہلا جز یہ کہ عصمت نبی صلی اللہ علیہ وسلم خلعت نبوت کے سرفراز ہونے کے بعد ملتی ہے۔ دوسرا جز یہ کہ عصمت نبی سے کسی وقت بھی منفک نہیں ہوسکتی۔''

مولوی صاحب! ایک مرتبہ پھر میری عبارت پڑھ لیں اور دیگر ناظرین بھی ملاحظہ فرمالیں۔ آپ کا بیان کردہ جز اول کہ باجماع اہل سنت عصمت نبی کو خلعت نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد ملتی ہے۔ نہ تو میرا عقیدہ ہے اور نہ میری عبارت کا مطلب ہوسکتا ہے۔ عبارت کا واضح مطلب یہ ہے کہ بعد از نبوت انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ عصمت کے لزوم اور دوام پر اہل سنت کا اجماع ہے۔ قبل از نبوت انہیں عصمت حاصل ہے یا نہیں؟ اس عبارت میں نفیاً یا اثباتاً بالکل اس سے تعرض نہیں کیا گیا۔ اس لئے کہ قبل از نبوت عصمت کے حاصل ہونے میں علماء اہل سنت کا اختلاف رہا ہے اور مجھے عصمت کے بارے میں اہل سنت کے اعتقاد کا اجماعی حصہ نقل کرنا تھا، جس کی مخالفت کر کے مودودی صاحب خرق اجماع کے مرتکب ہوئے ہیں، اس لئے آپ کا ذکر کردہ جز اول آپ کے دل ودماغ کی خواہش کا اختراع تو ہوسکتا ہے۔ میرا عقیدہ یا میری عبارت کا مطلب ہرگز نہیں ہوسکتا۔''

(۷)......استشہاد از عبارات ائمہ:

حضرت الاستاذ کا اسلوب یہ ہے کہ جو مقدمہ قائم کرتے ہیں اس پر ائمہ اسلاف کی کتب سے کئی ایک حوالے پیش فرماتے ہیں، اس کا ایک نمونہ پیش خدمت ہے:

''خدارا! آپ ہی اگر انصاف کی رتی بھی دل میں رکھتے ہوں تو بتائیں کہ خلافت وملوکیت وغیرہ تالیفات میں حضرت عثمانؓ، حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ وغیرہم کا ذکر جس انداز میں کیا گیا ہے، یہ وہی ذکر خیر ہے جس کی تلقین امام الائمہ فقیہ الامت حضرت امام ابوحنیفہؒ نے کی: ولا نذکر احداً من اصحاب رسول اللہ ﷺ الا بخیر (شرح فقہ الاکبر: ۸۵)

آخر میں ایک جلیل القدر فقیہ، محدث، متکلم امام اعنی ابا جعفر طحاویؒ کی عبارت پر سلسلہ تحریر ختم کر دیتا ہوں شاید دیدہ عبرت وا ہو اور راہ ہدایت کھل جائے اور

اتر جائے تیرے دل میں میری بات

امام موصوف اپنی مایہ صد ناز تالیف العقیدۃ الطحاویہ میں رقمطراز ہیں:

ونحب اصحاب رسول اللہ ﷺ ولا نفرط فی حب احد منهم ولا نتبرأ من احد منهم ونبغض من يبغضهم وبغير الخير يذكرهم ولا نذكرهم الا بخير وحبهم دين وايمان واحسان و بغضهم كفر ونفاق وطغيان۔ (شرح العقیدہ الطحاویہ: ۴۶۶)

مزید ارشاد فرمایا:

ومن حسن القول فی اصحاب رسول اللہ ﷺ علیه وسلم وازواجه الطاهرات من كل دنس وذرياته المقدسين من كل رجس فقد برئ من النفاق۔ (العقیدۃ الطحاویہ مع شرحہا: ۴۹۱)

آگے چل کر حکمت وایمان سے بھرپور گوہر افشانی ہوتی ہے:

وعلماء السلف من السابقين ومن بعدهم من التابعين اهل الخبر والاثر واهل الفقه والنظر لا يذكرون الا بالجميل ومن ذكرهم بسوء فهو على غير السبيل۔ (ایضاً، ص: ۴۹۲)

اس آخری عبارت کے بعد شارح لکھتے ہیں:

وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ م بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ط وَسَآءَتْ مَصِيْرًا [النساء: ۱۱۵]

عدالت کی تعریف میں بھی کئی ائمہ کی کتابوں کا حوالہ دیتے ہوئے رقم طراز ہے:

''عدالت کی تعریف تو آپ ابو یوسفؒ (شرح النقایہ، ج:۲، ص:۲۶۰) امام غزالیؒ (المستصفی، ج:۱، ص:۱۰۷) علامہ ابن حاجبؒ (مختصر الاصول، ج:۲، ص:۶۳) محدث الشرق خطیب بغدادیؒ (الکفایہ فی علوم الروایۃ، ص:۸۰، ۸۲) محقق ابن صلاحؒ وسید الحفاظ زین عراقیؒ (التقیید والایضاح شرح المقدمۃ لابن الصلاح، ص:۱۳۶) شیخ الحنفیہ ابن الملک (شرح المنار، ص:۲۱۴) امام نوویؒ وعلامہ سیوطیؒ (التقریب مع شرح التدریب، ج:۱، ص:۳۰۰) عمدۃ المحققین سید شریف جرجانی (التعریفات، ص:۹۸) امام صدر

الشریعۃ (التوضیح، ص: ۴۸۳) علامہ تفتازانی (التلویح، ص: ۴۷۳) علامہ قاضی عضد (شرح المختصر ج:۲، ص: ۶۳) رأس المحققین فاضل بہاریؒ و بحر العلومؒ (مسلم الثبوت مع شرح فواتح الرحموت، ج:۲، ص: ۱۵۵) علامہ مرتضیٰ زبیدی (☐ ﷺ تاج العروس، ج:۸، ص:۹) علامہ امیر صنعانیؒ (توضیح الافکار، ج:۲، ص:۱۱۸) اور مولوی یعقوب (شرح الحسامی، ج:۱، ص: ۲۹۳) اور اس طرح کے دیگر سینکڑوں ائمہ دین اور اکابر امت کی زبانی خود ہی سنئے، ان تمام اکابر کی عبارات وتعبیرات میں یہ قدر مشترک ہے کہ عدالت فسق کی ضد ہے اور اس کے تحقق کے لئے اجتناب عن الکبائر وعدم اصرار علی الصغائر شرط ہے۔''

(۸)......اسلوب بیان میں شدت کی توجیہ:

حضرت الاستاذؒ نے بعض مقامات پر علمی وقار ملحوظ رکھتے ہوئے زجر فی القول کا مظاہرہ فرمایا ہے، یہ کسی ذات پر کیچڑ اچھالنے کی شکل میں نہیں بلکہ دلیل وبرہان کو تقویت دینے اور مخاطب کے موقف کی شناعت واضح کرنے کے لیے ہے، ایسے علمی مکالموں میں اس کا وجود ضروری ہوتا ہے، لیکن پھر بھی حضرت الاستاذؒ مخاطب کے سامنے اس کی توجیہ پیش کرتے ہیں:

''یہ حقیقت حال بھی واضح کرنا چاہتا ہوں کہ فقیر کی تحریر میں نرمی یا گرمی اور لہجہ میں رقت یا شدت کا مدار مخاطب کے رویہ پر ہوتا ہے، جب تک مخاطب انصاف ودیانت کا دامن تھامے رہتا ہے، ہم اسے نرم لب ولہجہ اور ادب واحترام کا مستحق سمجھتے ہیں اور جوں جوں وہ تمرد اور تعنت، تعصب اور تعسف کا راستہ اختیار کرتا جاتا ہے تو ہمارے انداز تخاطب میں فطری طور پر تبدیلی آتی رہی ہے۔ ؎

صفحنا عن بني ذهل وقلنا القوم اخوان

فلما صرح الشر وامسى وهو عريان

فلم يبق سوى العدوا ن دناهم كما دانوا

شرفا کا یہی تاریخی کردار رہا ہے اور اس قسم کے معاندین کے بارے میں واغلظ علیہم کی قرآنی تلقین موجود ہے، نیز جب دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک شخص دیدہ ودانستہ انبیاء عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ذوات قدسیہ اور نفوس ذکیہ کی درپے آزار ہے، تو بغض فی اللہ، حمیت دینی اور غیرت ایمانی کا تقاضہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے شخص کو کسی قسم کی رورعایت کا مستحق نہ سمجھا جائے۔''

(۹)......بعض شخصیات پر تبصرہ:

ان مکاتیب میں بعض شخصیات کے حوالے سے جابجا حضرت کا موقف بھی سامنے آیا ہے جیسا کہ حضرت مولانا

عبیداللہ سندھیؒ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی طرف منسوب کچھ خرافات کا آپ نے ذکر کیا ہے، ذرا یہ بتلائیں کہ یہ ملفوظات آپ نے مولانا مرحوم سے خود سنی ہیں یا کسی ثقہ راوی کے ذریعہ آپ تک پہنچی ہیں یا یہ پروفیسر سرور جیسے گمراہ اور زائغ شخص کی فراہم کردہ معلومات ہیں؟ مولانا مرحوم کے سب سے ثقہ قابل اعتماد شاگرد علامہ موسیٰ جار اللہؒ کی تالیفات وامالی ہمارے سامنے ہیں، ان میں آپ کے ذکر کردہ خرافات کے بالکل خلاف مواد پایا جاتا ہے، جو مولانا مرحوم کی طرف منسوب ہیں اور مولانا مرحوم کے بقید حیات تلامذہ میں مولانا محمد طاہر صاحب آف پنج پیر ہیں اور سندھ کے حضرت مولانا محمد صدیق صاحب مولانا مرحوم کے ثقہ اور قابل اعتماد شاگرد ہیں، (اب یہ حضرات بھی وفات پاچکے ہیں) آپ ان سے ذرا تحقیق کرلیں کہ کیا واقعی حضرت مولانا سندھیؒ کے یہی افکار تھے۔ علامہ صدیق صاحب سے بارہا میری خود اس موضوع پر گفتگو ہوئی انہوں نے ہمیشہ حضرت مولانا مرحوم کے دامن کو ان کفریات سے مبرا قرار دیا ہے اور اس پر دلائل وشواہد پیش کیے۔''

(۱۰)......مکالمہ کا پس منظر، مخاطب کی غلط فہمی کا ازالہ:

مخاطب کو غلط فہمی تھی کہ حضرت الاستاذ کا ان سے اختلاف سیاسی مقاصد کے تحت ہے، اس غلط فہمی کا ازالہ فرماتے ہوئے مکالمہ کے اصل پس منظر کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مذہبی بحث کو عصری سیاسیات سے بالکل بالاتر رکھیں۔ مولانا ......صاحب کے نام ہمارے خطوط اس کے شاہد عدل ہیں۔ ہم نے ان سے انتخابات کے موقع پر بھی مطالبہ کیا تھا اور آج بھی ان سے، آپ سے اور پوری جماعت سے ہماری یہ دردمندانہ گزارش ہے کہ آپ حضرات مودودی صاحب کی غلطیوں کو (جو صرف لغزشیں نہیں بلکہ دین کے بعض بنیادی عقائد سے انحراف کے مترادف ہیں) کو غلطیاں تسلیم کرلیں، خلافت وملوکیت جیسی رافضیانہ فکر پھیلانی والی کتاب کی اشاعت روک دیں اور دوسری کتابوں سے جمہور اہل سنت اور اہل حق کے نزدیک قابل گرفت عبارتیں نکال دیں، اپنے دستور سے وہ خطرناک الفاظ نکال دیں جس سے صحابہ کرام علیہم الرضوان پر تنقید کی گنجائش پیدا ہوتی ہے اور ان کے معیار حق نہ ہونے کا اظہار ہوتا ہے اور ان کی اتباع کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ تو کم از کم ہم جیسے سیاسیات اور وقت کے ہنگاموں سے گوشہ نشین رہنے والے لوگوں کو آپ سے کوئی شکایت نہیں رہے گی اور نہ ہماری مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا، آخر اس منصفانہ گزارش کو قبول کرنے سے مانع عصبیت جاہلیہ اور شخصیت پرستی کے علاوہ اور کون کی بات بن سکتی ہے۔ ہمیں اپنے معزز دوست مولانا فضل الرحمان صاحب کی بہت سی پالیسیوں سے اختلاف ہے اور یہ اختلاف ہم نے کبھی چھپایا بھی نہیں، اس طرح دیگر سیاسی جماعتوں کے بہت سے سیاسی فیصلے ہمارے نزدیک غلط ہیں جن میں جماعت اسلامی بھی

شامل ہے، جیسا کہ ابن الوقت ارباب اقتدار سے ہمیں اختلاف ہے لیکن ان اختلافات کی بنا پر کبھی بھی ہم نے کسی کو گمراہ کہا ہے، نہ مذہبی لحاظ سے اپنی جماعت سے خارج کیا۔ خود جماعت اسلامی سے وابستہ چند افراد ہمارے علم میں ہیں کہ انہوں نے مودودی صاحب کے غلط نظریات کی نہ صرف یہ کہ مدافعت کبھی نہیں کی بلکہ اپنی براءت کا اظہار کرتے رہے اور مودودی صاحب کی کتابوں سے اب آئندہ ایڈیشنوں میں کافی قابل اعتراض مواد نکال کر دبی زبان سے گویا علماء حق کے موقف کی صداقت اور صحت کا اعتراف کیا جانے لگا ہے۔''

یہ ساتوں مکاتیب علمی نکات کے خزینے ہیں، ہم نے مشتے نمونہ از خروارے مجلت میں ان سے چند منتخب شذرات ذکر کر دیئے ہیں، ان شاء اللہ عنقریب ان خطوط میں سے جملہ علمی مواد کو ایک نئے جامہ میں پیش کیا جائے گا۔

حضرت مولانا محمد امین اورکزئیؒ کے بعض علمی افادات

مولانا صفی اللہ

مولانا انور شاہ کشمیریؒ ماضی قریب کے وہ عہد ساز شخصیت گزرے ہیں کہ جن کی نظیر زمانہ حال میں تو کجا، متقدمین میں بھی خال خال ملتی ہے۔ علامہ اقبال نے سچ کہا ہے: مجھے گذشتہ پانچ صدیاں عالم اسلام میں اس جیسی شخصیت سے خالی نظر آتی ہیں۔ قدرت نے آپ میں مختلف صفات اور کمالات ودیعت رکھے تھے۔ آپ علم و عمل، فضل و کمال، جود وسخا، شجاعت وایثار اور تواضع اور للّٰہیت کے جامع تھے۔ آپ کی علمیت اور تحقیقات میں متقدمین کی شان جھلکتی تھی۔ عربیت میں ادب جاہلیت کی چاشنی محسوس ہوتی تھی اور خلوص اور صفائے نفس میں اسلاف کے پرتو معلوم ہوتے تھے، آپ کی یہی چھاپ آپ کے شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں پر بھی نمایاں نظر آتی ہے جنہوں نے علم کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنا دیا اور دین کی نشر واشاعت اور علمی محاذ پر اسلام کے دفاع کے لیے اپنی جانوں کو وقف کر دیا تھا۔

مولانا محمد امین اورکزئی شہید اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ہیں۔ آپ حضرت بنوریؒ کے تربیت یافتہ

تھے۔ان کی صحبت میں رہے اوران کی زیر نگرانی علمی سفر طے کیا جس نے آپ کی دبی صلاحیتوں کو اجاگر کر کے بام عروج تک پہنچایا اور آپ آسمان علم وعمل کا تارہ بن کر چمکے۔کئی سالوں تک وہاں مدرس بھی رہے۔حضرت بنوری کی وفات کے بعد عشق بلالی نے مزید وہاں رہنے نہ دیا استاد کا مسند اور گزرگاہ خالی دیکھنا گوارا نہ کر سکتے تھے کہ بالآخر مادرعلمی کو خیر باد کہہ دیا اور اپنے آبائی علاقے شاہو وام ہنگو تشریف لائے اور ہنگامہ دنیا سے کنارہ کش ہو کر دین کی خدمت میں مشغول ہوئے۔

مولانا اورکزئی شہیدؒ ایک غیر معمولی عالم دین تھے۔وہ بیک وقت علوم حدیث کے شناور بھی تھے اور علم تفسیر کے آفتاب بھی۔وہ منقولات میں وسیع معلومات رکھتے تھے اور معقولات پر بھی اسے کامل دست گاہ حاصل تھی۔وہ فقہی بصیرت اور ذوق کے بھی حامل تھے اور تصوف میں بھی ان کی ایک شان تھی۔درج ذیل سطور میں حضرت کی مختلف علمی موضوعات پر علمی تحقیقات کی ایک جھلک دکھائی جاتی ہے، جسے غیر مطبوع مسودات سے اخذ کیا گیا ہے۔امید ہے اس سے حضرت کے علمی مقام ومرتبہ کا اندازہ لگایا جا سکے گا:

اہل بدعت کا ایک اہم استدلال اور اس کا رد:

اہل بدعت بدعات کے اثبات میں عام طور پر یہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ عدم نقل حجت نہیں بلکہ نقل عدم حجت ہے یعنی اگر قرآن وحدیث میں کسی امر کا ذکر نہیں اور صحابہ اور خیر القرون میں اس کا تعامل نہیں تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ مشروع بھی نہیں۔مشروع اس وقت نہ ہوگا جب ان مصادر سے اس کی ممانعت کی کوئی دلیل پیش کی جائے۔بات چونکہ معقول بھی ہے اور اسلاف کی کتابوں میں بھی جا بجا ملتی ہے اس لیے علی الاطلاق اس کا رد کرنا بھی درست معلوم نہیں ہوتا۔لیکن یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ اس کو اسی طرح مطلق رکھا جائے اور اس کی تنقیح نہ کی جائے تو دین کی ساری عمارت بدعات کے ملبے تلے آ جائے گی اور ہر بات کو یہ کہہ کر دین میں داخل کیا جائے گا کہ اس کی ممانعت کہاں آئی ہے۔مثلاً قبروں کے گرد طواف جائز قرار دیا جائے گا، اس لئے کہ اگر بیت اللہ کے طواف کا ذکر ہے لیکن اس کی ممانعت تو نہیں ہے۔عید کی نماز کے لیے اذان مشروع ہوگی؛ اس لیے کہ اگر نقل نہیں تو ممانعت بھی تو نہیں آئی ہے۔نماز جنازہ میں رکوع اور سجدہ جائز ہوگا اس لیے اس کی ممانعت کہیں نہیں آئی ہے۔حضرت الاستاذ شہیدؒ کے نزدیک علی الاطلاق یہ قاعدہ اس طرح پیش کرنا درست نہیں۔بلکہ اس میں تفصیل ہے:

دو صورتوں میں عدم نقل حجت نہیں:

۱۔استقرا تام نہ ہو۔

۲۔ یا اس امر کا اصل (مقیس علیہ) موجود ہو۔

تین صورتوں میں عدم نقل حجت ہے:

ا۔ عموم بلویٰ ہو، لیکن منقول نہ ہو۔

۲۔ دواعی ہونے کے باوجود امر منقول نہ ہو۔

۳۔ استقرا تام ہونے کی صورت میں بھی عدم نقل حجت ہے۔

☆☆☆

(۲) دوام اور التزام کا فرق:

دوام اور التزام میں کیا فرق ہے؟ یہ ایک منطقی موضوع ہے۔ اس کا احکام شریعت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ چونکہ احکام شریعت میں دونوں کا نتیجہ ایک نکلتا ہے اس لیے عام طور پر اس باریک فرق کو ملحوظ ہی نہیں رکھا جاتا۔ چنانچہ فقہ حنفی کے اس جزئیہ ''مستقل طور پر کسی متعین جگہ کی تلاوت کرنا مکروہ ہے'' کے ذیل میں فقہا کے کلام سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہوتی ہے۔ لیکن کچھ رواج اور بدعت پسند منطقی علما اسے اپنے دلائل میں سرفہرست رکھتے ہیں اور نماز جنازہ اور سنتوں کے بعد مستقل طور پر اجتماعی دعا کے جواز کے دفاع کیلئے اسے ڈھال کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ حضرت الاستاذ اس کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''ا۔ اولاً تو یہ بات ہی غلط ہے کہ ہم صرف دوام کرتے ہیں التزام نہیں کرتے۔ اس سے زیادہ التزام اور کیا ہوگا کہ اگر کوئی اس کو چھوڑ دے تو یہ اس کے خلاف طوفان برپا کر دیتے ہیں اور اسے وہابی اور ہیچ پیری کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ ۲۔ ثانیاً یہ کہ منطقی اعتبار سے بھی یہ بات درست نہیں: اس لیے کہ سلم العلوم میں اس کی تصریح موجود ہے کہ دوام کے ضمن میں لزوم نسبی ضرور پایا جاتا ہے۔''

☆☆☆

(۳) اصحاب الروایہ کے مابعد مصنفین کا تفرد:

حدیث کی کتابوں کو عموماً محققین دو ادوار پر تقسیم کرتے ہیں:

(۱) عصر الروایۃ والتدوین: یہ تقریباً چوتھی صدی کے ربع تک ہے۔

(۲) عصر المتاخرین: اس کے مابعد زمانے کو کہتے ہیں۔ جن میں حاکم، طبرانی، خطیب بغدادی وغیرہ آتے ہیں۔ ان میں پہلے دور کے ثقہ کا تفرد عام طور پر مقبول ہوتا ہے اور دوسرے دور کے ثقہ کا عام طور پر مقبول نہیں ہوتا۔ اس دور کے فرائد پر نکارت کا غلبہ ہے۔ محدثین نے مختلف اسالیب اور پیرائے میں یہ بات بیان کی ہے

۔حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے محدثین کی کتابوں کو چار طبقات میں تقسیم کیا ہے اور اس قسم کو چوتھے طبقے میں شمار کیا ہے ۔اس کے متعلق آپ لکھتے ہیں:

''اس طبقے میں وہ حدیثیں داخل ہیں جن کا قرون اولی (دور صحابہ وتابعین) میں نام ونشان نہیں ملتا مگر متاخرین علما نے ان حدیثوں کو نقل کیا ہے،ان کے متعلق دو ہی صورتیں ممکن ہیں:

۱۔یا تو سلف نے ان کی چھان بین کی ہے،اور انہیں ان کی کوئی اصل نہیں ملی کہ وہ ان کو روایت کرتے۔

۲۔یا ان کی اصل تو پائی،مگر ان میں علت اور قباحت کو دیکھ کر روایت سے گریز کیا۔بہر حال دونوں صورتوں میں ان حدیثوں سے اعتماد اٹھ گیا،اور وہ اس قابل نہیں رہیں کہ کسی عمل یا عقیدہ کے ثبوت کے لیے انہیں دلیل بنایا جائے۔اس قسم کی حدیثوں نے بہت سے محدثین کو غلطی میں مبتلا کیا ہے اور ان کتابوں میں حدیثوں کی بکثرت سندیں دیکھ کر دھوکہ کھا گئے،اور ان کے متواتر ہونے کا حکم لگا بیٹھے،اور جزم ویقین کے مواقع پر طبقہ اولی اور ثانیہ کی حدیثوں کو چھوڑ کر اس قسم کی حدیثوں کو سند قرار دے کر ایک نیا مذہب بنایا ہے۔اس قسم کی حدیث کی کتابیں کثرت سے تصنیف ہوئی ہیں۔چند کتابوں کے نام درج ذیل ہے:

کتاب الضعفا،از ابن حبان،تصانیف حاکم،کتاب الضعفا،از عقیلی،کتاب الکامل از ابن عدی،تصانیف ابن مردویہ،تصانیف خطیب۔۔۔۔۔'' [فوائد جامعہ برعجالہ نافعہ: ۱۴۷]

اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں کہ ماضی قریب کے مشہور متشدد غیر مقلد محدث ناصر الدین البانیؒ کا معاملہ بھی یہی ہے۔حضرت الاستاذ شہیدؒ مستدرک حاکم کی اسی قسم کی ایک روایت کے متعلق لکھتے ہیں جس میں مردے کے گھر کھانے کا ثبوت ملتا ہے:

''اولا: تو یہ روایت مستدرک للحاکم کی ہے۔امام حاکم اور ان کی کتاب دونوں پر اہل علم کا کلام مخفی نہیں۔خصوصاً ریحانۃ الہند حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی عجالہ نافعہ میں مذکورہ تحقیق کے پیش نظر اس طبقہ کی کتابوں سے استدلال میں کیا جان ہوتی ہے؟''

☆☆☆

(۴) مخل علت:

علل الحدیث کا علوم حدیث میں ایک نمایاں مقام ہے۔علت کا مطلب یہ ہے کہ بسا اوقات حدیث کی سند ظاہری لحاظ سے بالکل صحیح ہوتی ہے اور اس کے تمام رواۃ ثقہ ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود اس کی سند یا متن میں ایسی خرابی ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ حدیث ناقابل استدلال ہوتی ہے۔یہ خرابی معلوم کرنا ہر کس وناکس کا کام نہیں

بلکہ اس کے مخصوص رجال ہوتے ہیں جن کی علوم حدیث کے ساتھ ممارست ہوتی ہے، رجال پر ان کی گہری نظر ہوتی ہے اور مسلسل مزاولت کی وجہ سے ان کا حدیثی ذوق بن جاتا ہے، ایسے افراد ہی اس کو بھانپ سکتے ہیں۔

سند میں علت کا پایا جانا اتفاقی بات ہے لیکن کچھ حضرات متن میں علت کے وجود سے انکار کرتے ہیں۔ حضرت الاستاذ کی رائے یہ ہے کہ جس طرح علت سند میں پائی جاتی ہے اسی طرح متن میں بھی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث پر گفتگو کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

> ''علاوہ ازیں اس حدیث کے متن پر درایۃً غور کیا جائے تو اس کا ضعف اس پہلو سے بھی نہایت نمایاں نظر آتا ہے، اس لئے کہ بعض روایات میں اس شخص کے بارے میں آتا ہے کہ "انما هو عظم عليه جلدة" اور "لو حملناه اليک لتفسخت اعضاؤه" اور "لو ضربناه مائة مات أو قتلناه" کیا عقلاً وعادۃً ایسے شخص سے زنا کا صدور متوقع ہوسکتا ہے۔ علامہ ہیثمیؒ نے اس حدیث کے بعض طرق کے رجال کی جو توثیق کی ہے، وہ متن کی صحت کو مستلزم نہیں کما لا يخفى على من له خبرة بالحديث وعلومه۔''

(۴) اسرائیلیات اور صحابہ:

اسرائیلیات کے بارے میں اسلام کا یہ واضح موقف رہا ہے کہ:

۱۔ اگر اسرائیلی روایات شریعت کے موافق ہوں تو ان کا نقل اور روایت جائز ہے۔

۲۔ اگر یہ شریعت کے کسی حکم کے متصادم ہوں تو ان کی روایت بالکل جائز نہیں ہے۔

۳۔ اگر شریعت سے اس کا تعلق نہیں بلکہ عام واقعات ہیں تو ان کی روایت جائز ہے لیکن ان کی نہ تصدیق کی جائے گی اور نہ تکذیب۔

شریعت کے انہی اصولوں پر صحابہ کرامؓ اور تابعین چلے آئے ہیں اگر کوئی اسرئیلی روایت ہمارے مذہب کے موافق ہے تو صحابہ نے اس کو لیا ہے، اگر وہ ہمارے کسی حکم کے خلاف ہے تو صحابہ نے اس کی تکذیب کی ہے۔ اور اگر نہ موافق ہے اور نہ مخالف اور اس پر کوئی فائدہ موقوف بھی ہے تو اس کو نقل تو کیا ہے لیکن نہ اس کی تصدیق کی ہے اور نہ تکذیب۔ خصوصاً حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے اس قول کے بعد تو کسی طرح نہیں کہا جاسکتا کہ صحابہ استنباط احکام اور تفسیر قرآن میں اسرائیلی روایات سے مدد لیتے تھے۔ یہ روایت بخاری شریف میں مذکور ہے فرماتے ہیں: **يا معشر المسلمين كيف تسالون اهل الكتاب وكتابكم الذى انزل على نبيه ﷺ احدث الاخبار بالله، تقرأونه لم يشب، وقد حدثكم الله ان اهل الكتاب بدلوا ما كتب الله وغيروا بأيديهم الكتاب، فقالوا هو من عند الله ليشتروا به ثمنا قليلا، الا ينهاكم ما جاء كم من العلم عن مسألتهم، ولا والله ما رأينا منهم رجلا قط يسألكم عن**

الذی انزل علیکم۔[الصحیح للامام البخاری:۲۶۸۵]

یہ ہے حقیقت صحابہ کے مؤقف کی، اس سلسلے میں مستشرقین اور جدت پسند حضرات نے صحابہ کرام اور تابعین پر جو کیچڑ اچھالا ہے کہ انہوں نے استنباط احکام اور قرآن کے سمجھنے میں اسرائیلی روایات سے بہت مدد لی ہے لیکن اپنے الفاظ کا جامہ پہنا کر اسے چھپانے کی کوشش کی ہے، سراسر جھوٹ ہے۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ کتب تفسیر میں بہت سی ایسی روایات ہماری نظر سے گزرتی ہیں جو اسرائیلی ہیں اور ہمارے اسلامی اصولوں سے وہ ٹکراتی ہیں اور ان صحابہ کرام کی طرف منسوب ہیں۔ اس لیے یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے انہیں صحابہ کی طرف منسوب کرنا درست نہیں۔

۱۔ اولاً: اس لیے کہ اکثر ایسی روایات بالکل بے سروپا ہیں، یہ صحابہ پر گھڑی گئی ہیں انہوں نے روایت نہیں کی ہیں۔

۲۔ ثانیاً: اگر بالفرض ان کی سند صحیح بھی ہو تو متن کے اعتبار سے ان میں نکارت ہے۔ جو ان کے ساقط ہونے کی دلیل ہے۔ اسی پس منظر میں حضرت الاستاذؒ کی درج ذیل تحریر پڑھیے:

> ''اگر طاوس کا یہ اثر موصول بھی ہو جیسا کہ علامہ سیوطیؒ کا اصرار ہے، پھر بھی یہ ثابت نہیں کہ اثر میں مذکور مضمون انہوں نے کسی صحابی سے سنا ہے اور انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ جیسا کہ غیر مدرک بالرائی ہونے کی بنا پر علامہ سیوطیؒ کا دعویٰ ہے۔ کیا عجب کہ انہوں نے اہل کتاب سے یہ بات لے لی ہو، جیسا کہ تابعین بلکہ صحابہ کرامؓ کی سیرت سے واقف حضرات پر مخفی نہیں کہ کتنی غیر مدرک بالرائی اخبار ان حضرات نے اہل کتاب سے روایت کی ہیں، غیر مدرک بالرائی بات کو رفع پر حمل نہیں کیا جاتا، خصوصاً جب کہ صحابہؓ اور تابعینؒ سے اس میں اختلاف منقول ہو۔''

☆☆☆

(۵) حیلہ کی مشروعیت پر مشہور استدلال اور اس کا رد:

'حیلہ' داؤ اور فریب کو کہتے ہیں۔ لغوی معنیٰ سے ہی اس کی حیثیت معلوم ہو جاتی ہے کہ شریعت اسلامی جس کا ہر حکم دو ٹوک اور واضح ہے اس میں اس کی اجازت کیسی دی جا سکتی ہے؟! ہماری اسلامی فقہ میں اگرچہ اس عنوان سے مستقل مباحث ملتے ہیں لیکن اس سے مراد حکم شریعت کا ابطال اور تلاعب نہیں۔ بلکہ اس سے مقصود حرمت اور محذور سے بچنے کی جائز تدبیر ہے۔ یہاں صرف عنوان وہی ہے حقیقت شریعت پر عمل ہی ہے۔ لیکن کچھ حضرات نے اس ظاہری عنوان سے اس کا جواز سمجھا اور اس کا دروازہ چوپٹ کھول دیا ہے۔ یہ ایک معرکۃ الآراء مسئلہ ہے۔ بہت سی کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح، ابن قیمؒ نے اعلام الموقعین، حافظ ابن تیمیہ نے اپنے

فتاویٰ ، ابن بطہ عکبری نے ابطال الحیل اور جصاصؒ اور سرخسیؒ نے اپنی تالیفات میں اس پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ مجوزین کی ایک بڑی دلیل حضرت ایوب علیہ السلام اور ان کی بیوی کا واقعہ ہے۔ منکرین نے اس استدلال کے بہت سے جوابات دیئے ہیں، لیکن حضرت الاستاذؒ نے اس پر منفرد انداز میں بحث کی جس سے آپ کی علمی عبقریت اور شان معلوم ہوتی ہے۔ ذیل میں یہ بحث ملاحظہ فرمائیے:

''حیلوں کی مشروعیت پر عموماً'' سورۂ صٓ'' کی آیت "وخذ بیدک ضغثا فاضرب بہ ولا تحنث" سے استدلال کیا جاتا ہے مگر یہ استدلال بوجوہ خالی از اختلال نہیں۔

اولاً: نص میں جو حکم وارد ہو اس کو'' حیلہ'' نہیں کہا جا سکتا:

لأنها الحذق في تدبير الامور وتقليب الفكر حتى يهتدي الى المقصود كما صرح به ابن نجيم ﷺ في الاشباه [۴/۲۱۹]۔

سیدنا حضرت ایوب علیہ السلام کی شریعت میں یمین کا کفارہ مشروع نہیں تھا:

كماذكره ابن العربي ﷺ في الاحكام، وماذكره القرطبي ﷺ في الردعليه فهو مردود. وابن القيم في الاغاثة والاعلام والحفيﷺ في الروح وغيرهم في غيرها وشهدله قوله تعالى: "قدفرض الله لكم تحلة ايمانكم"۔

بتقدیر صحت واقعہ یمین حضرت ایوب علیہ السلام کے لیے بر متعین تھا، حق جل مجدہ نے آپ اور آپ کی اہلیہ کے کمال عبدیت واخلاص کی وجہ سے حکم میں تخفیف فرمائی اور یہی آپ کے لئے حکم شرعی ٹھہرا، اس میں حیلہ کا معنی کہاں سے آ گیا؟ امت مسلمہ کے لیے وضو واغتسال کا حکم تھا، فقدان القدرۃ کی صورت میں تخفیف نازل ہوئی، تیمم کی اجازت ملی، اس کو'' حیلہ'' کا نام کیسے دیا جا سکتا ہے؟ بعض محرمات قطعیہ کا استعمال عند الاضطرار جائز قرار دیا گیا اس رخصت وتخفیف کو احتیال وحیلہ کا نام کون دے سکتا ہے؟ لیلۃ الاسراء میں پچاس نمازیں فرض ہوئیں، بعد میں تفصیلا فرمایا گیا:

"هي خمس وهي خمسون لايبدل القول لدیّ" [صحیح البخاری ۱/۵۱]

اس کو کون حیلہ کہنے کی جسارت کرے گا؟

الغرض جسے حق تشریع حاصل ہے وہ جیسا چاہے حکم دے، مکلف پر بلا چوں وچرا اس کی تعمیل فرض ہے، چاہے وہ معصوم سیدنا اسماعیل علیہ السلام کے ذبح کرنے کا حکم ہو یا نابالغ غلام کے قتل کرنے کا امر ہو یا مٹی سے بنائے گئے مخلوق کے سامنے نورانی مخلوق کو سربسجود ہو جانے کا حکم ہو یا سو درہ مارنے کے بجائے ایک دستۂ حشیش سے مارنے کا اُثر ہو،'' لایسئل عما یفعل وھم یسئلون'' شارع کا حکم دین اور شریعت ہے، اس کا حیلہ واحتیال

سے دور کا بھی تعلق نہیں۔

ثانیاً: شرائع من قبلنا ہمارے لئے تب حجت بن سکتے ہیں جب کہ ہماری شریعت میں اس پر نکیر نہ ہو، شریعت اسلامیہ میں حیلوں کی مذمت نصوص صریحہ وصحیحہ میں وارد ہے، اس لئے بھی واقعۂ مذکورہ قابل استدلال نہیں۔

ثالثاً: حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت مجاہدؒ، حضرت عطاءؒ بقول بعض دیگر اجلہ اہل علم رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اس واقعہ کے حضرت ایوب علیہ السلام کے ساتھ یا انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اختصاص کے قائل ہیں تو احتمالِ اختصاص کے ہوتے ہوئے اس استدلال میں کتنا وزن باقی رہ جاتا ہے؟

سیدنا ابن عباسؓ فرماتے ہیں:

"ولا یجوز ذلک لأحد بعد أیوب علیه السلام الا الانبیاء علیهم السلام" (درمنثور ۵/ ۳۱۷)

رابعاً: حضرت ایوب علیہ السلام کے بارے میں یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ واقعہ یمین کا تھا یا نذر کا، پھر محلوف علیہ یا منذور کی نوعیت کیا تھی؟ لسانِ نبوت علی صاحبہ الصلاۃ والسلام سے نہ صحیح روایت میں اور نہ ضعیف میں کچھ بھی منقول نہیں، اس سلسلہ میں صحابہؓ اور تابعینؒ کے آثار کے مأخذ اسرائیلی روایات ہی ہو سکتی ہیں تو ایسی ضعیف بنیاد پر پوری کتاب الحیل کی عمارت کھڑی کر دینے کو قرین انصاف قرار دینا مشکل امر ہے۔

خامساً: اس واقعہ کی تفصیلات سے متعلقہ آثار میں شدید اضطراب پایا جاتا ہے جو بجائے خود اس کے بے اصل ہونے کی بڑی واضح نشانی ہے: ولو كان من عند غير الله لوجدوا فيه اختلافا كثيرا۔ اور ترجیح یا توفیق بغیر تحکم یا تعسف کے ممکن نہیں کما لا یخفی علی المتتبع۔

سادساً: حضرت ایوب علیہ السلام کی طرف منسوب واقعہ کی ہو بہو مماثل صورت اب اگر پیش آئے تو کوئی فقیہ اس صورت کا وہی حکم نہیں بتلاتا جو سیدنا حضرت ایوب علیہ السلام کے لیے بیان کیا جاتا ہے پس دیگر مواد مختلفہ کے احکام میں اس کو مستدل کیسے بنایا جا سکتا ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ کی نوعیت کچھ اور تھی یا یہ حکم ان کے لیے خاص ہے۔

سابعاً: حضرت ایوب علیہ السلام کی مشہور اور منصوص خصوصیت ان کا بے مثل صبر وتحمل تھا اس واقعہ کی تفصیلات کو صحیح ماننے سے اس کی نفی ہوتی ہے یا کم از کم اس پر یقیناً زد پڑتی ہے۔ غیرت حق وغیرہ تعبیرات سے اس کا مداوا نہیں ہو سکتا کما لا یخفی علی المحقق۔

ثامناً: حضرت ایوب علیہ السلام کے لئے مذکورہ تخفیفی حکم کی علت ان کا کمال صبر اور اہلیہ کی وفا شعاری اور بے گناہی بھی بیان کی گئی ہے، کیا یہ مدارِ حکم دوسرے مواد میں متحقق ہو سکتا ہے؟

تاسعاً: اپنی بیوی کو معمولی لغزش پر سو درے مارنا کیا از روئے شرع جائز ہے، بلکہ کوئی بھی تعزیر شرعی حد کی حد تک پہنچائی جا سکتی ہے اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو سیدنا حضرت ایوب علیہ السلام کو بلا ثبوت قطعی اس کا مرتکب

کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے؟

عاشراً: امام فخر الدین رازیؒ نے حضرت ایوب علیہ السلام کے مرض کی تفصیلات کے بارے میں وارد بعض آثار کو مقام نبوت کے تقاضوں کے خلاف قرار دے کر رد کر دیا ہے تو جو روایتیں حضرت ایوب علیہ السلام یا کسی دوسرے نبی کی عصمت کے خلاف ہوں تو بلا تردد ان کو رد ہی کیا جائے گا۔''

☆☆☆

(۶) تحقیق کا ایک اہم اصول:

حدیث کی کتابوں کو بنیادی طور پر دو قسموں پر تقسیم کیا جاتا ہے:

(۱) مصدر اصلی: یہ ان کتابوں کو کہا جاتا ہے جن میں مصنف نے اپنی سند کے ساتھ احادیث کی تخریج کی ہو۔ جیسے صحاح ستہ، مسند احمد، شرح معانی الآثار، موطا امام مالک وغیرہ

(۲) مصدر فرعی: یہ ان کتابوں کو کہا جاتا ہے جن میں مصنف نے کسی دوسری کتاب کی احادیث نقل کی ہوں۔ جیسے: مشکاۃ المصابیح، الترغیب والترہیب اور زوائد واطراف پر لکھی گئی کتابیں۔

ان کے بارے میں اصول یہ ہے کہ ذاتی مطالعہ کے لیے تو مصدر اصلی اور فرعی دونوں کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے لیکن تخریج، تحقیق اور استدلال کے لیے اصل مصدر کی رجوع ضروری ہے۔ یہ اصول صرف حدیث ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر علم کے لیے ہے۔ دنیائے علم میں ایسی بہت سی اغلاط ہیں جن کا سبب مصدر اصلی کی طرف عدم رجوع ہے۔ مشکاۃ المصابیح کی اسی قسم کی ایک غلطی پر گرفت کرتے ہوئے حضرت الاستاذؒ لکھتے ہیں:

''مشکاۃ شریف کی اصل اور متقدمین کی کتابوں کی طرف مراجعت کے بعد یہ یقین کئے بغیر چارہ نہیں کہ مشکاۃ شریف میں ''امرأتہ'' کا لفظ اضافت الی الضمیر کے ساتھ صحیح نہیں یا تو یہ کاتب کی غلطی ہے یا صاحب مشکوٰۃ کا ذہول ہے۔ مشکاۃ شریف کے شارحین ہوں یا دوسرے بعد کے اہل علم حضرات ان کا قول متقدمین کے نقول کے مقابلہ میں ہرگز قابل اعتبار نہیں۔''

☆☆☆

(۷) عبارات فقہا میں ''لا بأس بہ'' کا مطلب

فقہائے کرام کتب فقہ میں احکام شرعیہ واضح کرنے کے لیے مختلف تعبیرات استعمال کرتے ہیں جن میں ایک لا بأس بہ بھی ہے۔ اس تعبیر کا مقصد واضح کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

''وما روی عن الامام محمد بن الفضل رحمہ اللہ من أنہ لا بأس بالدعاء بعد الجنازۃ فمحمول علی الکراھیۃ

التنزيهية وقد صرح الامام النسفي ﷺ في كشف الاسرار وغيره من المحققين أن لفظ "لابأس به" "الى هذا كان يشير العارف بالله الفقيه المتفرد الشيخ رسول شاه المعروف به[ذو ذهبے استاذ] رحمه الله تعالى بالافغانية: لابأس خپے توبے نه او باسه" يدل على الكراهية وأن ما يقابله من السنن الزوائد فلاخلاف بينه وبينهم في أصل الكراهة۔"

☆☆☆

(۸)مختلف کتب کے بارے میں حضرت الاستاذ کی آرا:

مستشرقین کے شائع کردہ مخطوطوں کی حیثیت:

عالم اسلام کا یہ علمی المیہ رہا ہے کہ مغرب کے استیلا کے بعد مسلمانوں سے ان کا علمی ورثہ چھین لیا گیا اور یورپ کے کتب خانوں کی طرف منتقل کیا گیا۔ایک عرصہ تک یہ ذخیرہ زاویہ خمول میں پڑے رہنے کے بعد گذشتہ کچھ عرصے سے مستشرقین نے اسے شائع کرنا شروع کر دیا ہے۔مستشرقین کے اس سے کوئی نیک مقاصد وابستہ نہیں ہیں بلکہ علمی خدمات کے لبادے میں اس میں دخل اندازی مقصود ہے۔اس وجہ سے ہمارے محتاط علماء اسلام ایسی کتب کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور اس پر اندھا اعتماد درست نہیں سمجھتے ہیں۔طبقات ابن سعد کا بھی یہی معاملہ ہے، جو ایک عرصہ تک نایاب ہونے کے بعد مستشرقین نے شائع کی۔اس میں بہت سی ایسی متنازع روایات اور واقعات موجود ہیں جن سے دیگر اسلاف کی کتابیں یکسر خالی ہیں اور نہ اسلاف میں کسی نے جن کے پاس طبقات ابن سعد موجود تھی' ان کا ذکر کیا ہے۔چنانچہ طبقات ابن سعد کی ایک روایت کے متعلق آپ لکھتے ہیں:

''یہ روایت طبقات ابن سعد سے لی گئی ہے جو صدیوں تک یورپین کے ہاں مخطوطہ کی صورت میں رہی اور پھر چھپی بھی سب سے پہلے لیڈن سے، جب کہ'' طبقات'' تاریخ ہی کی کتاب ہے جس کی روایت پر عقائد تو کیا اعمال کی بنیاد بھی نہیں رکھی جاسکتی''۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب دیوان کی حقیقت:

حضرت علیؓ کی طرف منسوب دیوان کے بارے میں آپ لکھتے ہیں:

''صائم صاحب کی چوتھی دلیل حضرت علیؓ کی طرف منسوب اشعار ہیں، جب کہ اس پورے دیوان کے بارے میں اہل علم کا فیصلہ ہے کہ من گھڑت ہے۔خود ان اشعار کی رکاکت بھی شہادت دے رہے ہیں کہ یہ حضرت علیؓ جیسے فصیح وبلیغ ہاشمی کا کلام نہیں ہوسکتا''۔

التذکرۃ للقرطبی کی حیثیت:

احوال آخرت پر اسلاف نے مستقل طور پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں سیوطی کی البدور السافرۃ۔ شرح الصدور اور قرطبی کی کتاب التذکرۃ باحوال الموتی وامور الآخرۃ معروف ہیں۔ حضرت الاستاذؒ اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

''اہل علم حضرات جانتے ہیں کہ خود تذکرۂ قرطبی کس نوعیت کی کتاب ہے۔ بلا مبالغہ اس کتاب کا اکثر حصہ واہیات وحکایات پر مشتمل ہے''۔

الفردوس للدیلمی اور حاشیۃ الصاوی کے بارے میں آپ کی رائے:

الفردوس حافظ ابوشجاع شیرویہ بن شہردار بن شیرویہ بن فناخسرو دیلمی شافعی کی تالیف ہے۔ جس میں آپ نے دس ہزار کے قریب احادیث جمع کی ہیں اور ان کی سندیں نقل نہیں کی ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے تسدید القوس فی مختصر الفردوس کے نام سے اس کا اختصار بھی کیا جو اس کے ذیل میں شائع شدہ ہے۔ لیکن اس کتاب کا اکثر حصہ ضعیف، واہی اور موضوع روایات پر مشتمل ہے۔ جب کہ حاشیۃ الصاوی جلالین کی شرح ہے۔ حل جلالین کے لحاظ سے یہ ایک عمدہ شرح ہے لیکن اس میں اسرائیلیات، ضعیف اور شاذ اقوال کی بھرمار ہے۔ جس نے اس کی افادیت کو دھندلا بنا دیا ہے۔ اس لیے اہل علم طبقے میں ان دونوں کا شمار اپنے موضوع کی ضعیف تر کتابوں میں ہوتا ہے۔ حضرت الاستاذؒ ان کے متعلق فرماتے ہیں:

''اہل علم جانتے ہیں کہ فن حدیث میں فردوس دیلمی کی مسند کا حوالہ جس طرح حدیث کی ضعف کی کافی شہادت ہے، اسی طرح علم تفسیر میں صاویؒ کا حوالہ روایت کے ضعف کا گواہ ہے''۔

الزھد للامام احمد:

زہد سے احادیث کی وہ کتب مراد ہیں جو دنیا کی بے ثباتی اور اس سے بے رغبتی کی احادیث پر مشتمل ہوں۔ اسلاف کا اس پر ایک بڑا ذخیرہ پایا جاتا ہے۔ جن میں چند کتب مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) کتاب الزھد لوکیع بن الجراح۔ (۲) کتاب الزھد لھناد بن السری۔ (۳) کتاب الزھد لابی مسعود المعافی۔ (۴) کتاب الزھد لاسد بن موسی۔ (۵) کتاب الزھد لابن ابی عاصم (۶) کتاب الزھد لابن المبارک۔ (۷) کتاب الزھد لاحمد بن حنبل۔ (۸) کتاب الزھد للخطیب البغدادی۔ (۹) کتاب الزھد الکبیر للبیھقی (۱۰) الزھد والورع لابن تیمیہ۔

ان کے علاوہ بھی اسلاف کے اس موضوع پر متعدد کتابیں ہیں۔ چونکہ اس میں اکثر دنیا کی بے ثباتی، آخرت کے احوال، جنت اور جہنم کے تذکرے اور ترغیب وترہیب ہوتی ہے؛ اس لیے محدثین اس قسم کی احادیث کے اسناد

میں تسامح برتتے ہیں اور اس میں وہ کڑی شرطیں ملحوظ نہیں رکھتے جس کا اہتمام احکام کی احادیث میں کرتے ہیں۔لیکن اگر اس کی کسی حدیث سے کوئی حکم شرعی ثابت ہو رہا ہوتو اسے احادیث احکام کے معیار پر پرکھنا ضروری ہے۔امام احمد بن حنبل کی جلالت قدر اپنی جگہ۔اوران کے مسند کی اہمیت بالکل مسلم ہے لیکن الزہد کا وہ مرتبہ نہیں جو مسند کا ہے۔چنانچہ حضرت الاستاذؒ اس کے متعلق فرماتے ہیں:

''کتاب الزہد کو ائمہ علم حدیث نے قابلِ استناد واستدلال کتب حدیث کا درجہ نہیں دیا''۔

یہ حضرت الاستاذ کے مآثر علمیہ سے چند منتخب افادات تھے،اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان غیر مطبوعہ اسفار کی طباعت کا بندوبست اپنے غیبی خزانوں سے فرمائیں تا کہ اہل علم اس چشمہ صافی سے سیراب ہوں۔آمین

خوانِ بنوریؒ سے امین الملۃؒ کی خوشہ چینی

محمد طفیل کوہاٹی

حضرت الاستاذ مولانا محمد امین اورکزئیؒ نے اپنے بعض اساتذہ کے علوم ومعارف اہتمام سے محفوظ فرمائے،ان میں حضرت مولانا محمد یوسف بنوری قدس سرہ اور حضرت مولانا عبدالغفار کوہاٹیؒ سرفہرست ہیں۔آپ نے حضرت بنوریؒ کے درس بخاری اور مولانا عبدالغفارؒ کے درس بیضاوی کو اہتمام سے قلم بند کیا۔یہ سچ ہے کہ لکھے ہوئے افادات یا تقاریر سے کسی استاذ کی درسی عبقریت کے ظہور کے لئے شاگرد میں ملکہ ضبط کا درجہ کمال چاہیے۔بہت سے نامی گرامی لوگوں کی درسی تقاریر میں وہ شان دکھائی نہیں دیتی جو ان کے بارے زبان زدعام ہوتی ہے اس کی بنیادی وجہ آخذین کا ان کی علمی سطح سے فروتر ہونا ہوتا ہے۔حضرت الاستاذؒ چونکہ خود بھی ذہن رسا کے مالک تھے اس لئے آپ کا اخذ بھی حد درجہ کامل ہے اور اس سے حضرت بنوری کی علمی شان بخوبی پتہ چلتی ہے۔ذیل میں حضرت بنوری قدس سرہ سے سنے ہوئے جواہر پاروں سے چند منتخب شذرات پیش خدمت ہیں،امید ہے اہل علم کے علمی ذوق کی تسکین کا

سامان ثابت ہوں گے۔

☆فرمایا: نبی نبأ سے مشتق ہے اور نبأ کے معنی میں تین چیزیں شامل ہیں: ایک تو یہ کہ خبر ہو اور وہ بھی غیب کی، پھر اس میں عظیم الشان فائدہ بھی ہو۔ لہٰذا نبی کا معنی وہ معصوم ذات جو غیب کی ایسی خبریں دے جو عظیم الشان فوائد کی حامل ہوں۔ دنیا کے کسی زبان میں نبی کے لفظ کا پورا ترجمہ نہیں ہو سکتا، جتنے بھی ترجمے ہیں وہ ناقص ہیں، فارسی کا پیغمبر ہو، یا انگریزی کا ریفارمر۔

☆فرمایا: بخاریؒ جو آیات قرآنیہ تراجم میں لائے ہیں ان میں دو جہتیں ہیں: ایک جہت سے وہ باب میں مذکور دعویٰ پر آیت کو بمنزلہ دلیل گردانتے ہیں اور دوسری جہت سے اس کو بمنزلہ متن بنا لیتے ہیں اور باب میں مذکور احادیث اس کے لئے بمنزلہ شرح کے لاتے ہیں۔

☆فرمایا: حضرت آدم وشیث اور ادریس علیہم السلام نوح علیہ السلام سے پہلے گذر چکے ہیں، ایک حدیث میں آیا ہے کہ سب سے پہلے پیغمبر سرزمین پر نوح علیہ السلام تھے، اس سے بعض حضرات کو غلط فہمی ہوئی اور حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت سے انکار کر بیٹھے۔ یہ عجیب ہے کہ ایک مظنون خبر کی بنا پر ایک مقطوع امر کا انکار کیا جائے۔ بے شک حضرت نوح علیہ السلام قوم کفار کی طرف سب سے پہلے مبعوث نبی ہیں، یہی حدیث کا مصداق ہے اور اس وجہ سے آیت کریمہ میں حضرت نوح علیہ السلام سے وحی کی ابتدا کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

☆فرمایا: سب سے پہلے تراجم پر الحافظ ابوعبداللہ محمد بن عمر بن رشید الفہری السبتی اور حافظ ناصر الدین ابن المنیر الاسکندرانی اور حافظ ابوعبداللہ محمد بن منصور السلجاسی نے کتابیں لکھیں جو غیر مطبوع ہیں۔ ہمارے سامنے دو کتابیں ہیں جو آخری دور میں لکھی گئی ہیں: ایک شاہ ولی اللہؒ نے جو کتاب کے ساتھ مطبوع ہے، اور تمام بھی، دوسری حضرت شیخ الہندؒ کی ناتمام کتاب ہے جو حقیقت میں تمام ہے، اگر یہ کتاب کامل ہو جاتی تو بخاری کے تراجم کا حق ادا ہو جاتا۔

☆فرمایا: بدء اور بدو دو نسخے ہیں۔ اولیٰ اور ذوق کے مطابق بدء ہے کیونکہ بخاریؒ نے اور بھی کئی جگہ یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ اور پھر بدائت کتاب کے ساتھ بھی لفظ بدء ہی مناسب ہے، بدو کا نسخہ تجنیس خط کے بنا پر کسی نے خواہ مخواہ بنا لیا ہے۔

☆فرمایا: وحی کی ایک حقیقت شرعی ہے اور ایک حقیقت لغوی۔ اسی طرح دوسرے بھی بہت سے الفاظ ہیں، مثل صلوٰۃ وغیرہ......وحی کا لغوی معنی ہے: الاشارۃ خطیۃ بسرعۃ۔ کمافی:

یرمون بالخطب الطوال وتارۃ

وحی الملاحظ خیفة الرقباء

اور کتاب کے معنی میں بھی مستعمل ہے: کما فی قول لبید فی المعلقة الرابعة:

فمدافع الریان عری رسمها

خلقا کما ضمن الوحی سلامها

ان الفاظ کے جو حقائق لغویہ ہیں ان کی حقائق شرعیہ کے ساتھ گہری مناسبت ہے اور اکثر دونوں میں عام اور خاص یا مطلق ومقید کا تعلق ہوتا ہے۔

☆ فرمایا: ابن تیمیہؒ نے کتاب النبوات میں لکھا ہے کہ جو پیغمبر کفار قوم کی طرف مبعوث ہو جائے وہ 'رسول' ہوتا ہے اور جو کفار کی طرف خصوصی طور پر مبعوث نہ ہو وہ 'نبی' ہوتا ہے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے متعلق لکھا ہے کہ وہ قبیلہ بنی جرہم کی طرف مبعوث تھے اور اسی قوم سے عرب مستعربہ پیدا ہوئے۔ ابن تیمیہؒ کی یہ تعریف جامع اور اچھی تعریف ہے۔ اس کے علاوہ جو بھی فروق بیان ہوتے ہیں، وہ صحیح نہیں، منقوض ہیں۔

☆ فرمایا: متوسط طبقہ کے مصنفین میں مجھے دو مصنف پسند ہیں: ایک ابن رجب حنبلیؒ اور دوسرا ابن قیم حنبلیؒ۔ اتفاق سے دونوں حنبلی ہیں۔ یہ دونوں جس موضوع پر لکھتے ہیں اس سے متعلقہ جملہ مواد کو جمع کر لیتے ہیں اور بسط وشرح کے باوجود ان کا کلام حشو وزوائد سے پاک ہوتا ہے۔

☆ فرمایا: علمی ذوق پیدا کرنے کے لئے شیخ عبدالقاہرؒ کی دلائل الاعجاز سے بڑھ کر کتاب نہیں۔

☆ فرمایا: ابن رجب حنبلیؒ نے اربعین نوویؒ کی شرح لکھی ہے، انہوں نے اربعین پر اپنی طرف سے مزید دس احادیث کا اضافہ کیا ہے، یہ پچاس احادیث کی شرح ہے، اس کا نام انہوں نے 'جواہر الحکم' رکھا ہے۔ اس میں انہوں نے حدیث انما الاعمال الخ کی شرح میں عجیب وغریب نکات لکھے ہیں۔ اس حدیث کی شرح دیکھنا چاہتے ہو، تو اس کا مطالعہ کرلو، ایسی شرح آپ کو کہیں نہیں ملی گی۔

☆ فرمایا: حدیث انما الاعمال بالنیات الخ میں ایک واقعہ کی طرف تعریض موجود ہے جو سنن سعید بن منصورؒ اور معجم الطبرانی میں مذکور ہے کہ ایک شخص نے ایمان لا کر ایک عورت سے شادی کرنی چاہی مگر وہ مدینہ چلی گئی، تو یہ شخص بھی مدینہ چلا گیا تاکہ شادی ہو سکے، او الی امرأة میں اس طرف اشارہ ہے۔ حدیث کا سوق اس واقعہ پر نہیں ہوا جس نے یہ کہا، اس نے فاش غلطی کی۔ اس عورت کا نام ام قیس تھا اس لئے وہ شخص 'مہاجر ام قیس' کے نام سے مشہور ہوا اور نام کا کسی کو پتہ نہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ کسی صحابی سے اگر کوئی نامناسب کام ہو گیا تو اس کا نام مبہم رکھا گیا۔

☆ فرمایا: ''فی سلسلة الجرس'' کے متعلق شاہ ولی اللہؒ کی تعبیر سب سے پسندیدہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ دراصل

فیضانِ وحی کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عالمِ شہادت سے غائب ہوکر عالمِ غیب کے ساتھ رابطہ پیدا ہوجاتا تھا اور ایسے موقع پر آپ کے سمع کو معطل کردیا جاتا تو اس تعطل کے دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کان میں جو کیفیت ہوتی تھی، اسے سلسلۃ الجرس سے تعبیر فرمایا ہے۔ فرمایا کہ یہ بات معقول بھی ہے اور مانوس بھی۔ اولیاء اللہ کو اس کا تجربہ ہوتا ہے اور میں اس کی تفصیل کرسکتا ہوں مگر کرتا نہیں۔

☆ فرمایا: انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے قویٰ بدنیہ اور روحیہ عام انسانوں کے قویٰ سے بالاتر ہوتی ہیں، ان میں ساری صلاحیتیں فوق العادۃ رکھی جاتی ہیں، امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں غالباً سورۃ انبیاء کی تفسیر کرتے ہوئے اس کی تفصیلات لکھی ہیں۔ اس لئے ان میں تلقی عن الغیب کی قوت بطریق اتم موجود ہوتی ہے۔ لیکن باجود اس کے اللہ جل شانہ ان کو نبوت کا خلعت عطا فرمانے سے پہلے مختلف قسم کے مجاہدات اور ریاضات سے گزارتے ہیں تاکہ ان کی عالمِ غیب کے ساتھ وابستگی مضبوط سے مضبوط تر ہوسکے، ان مجاہدات اور ریاضتوں کے بعد اللہ تعالیٰ ان کو نبوت کے مقام ومنصب پر فائز فرمادیتے ہیں۔ انہی مافوق العادۃ صلاحیتوں کی بنا پر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے علوم فطری ہوتے ہیں، ترتیب مقدمات وغیرہ سے حاصل نہیں ہوتے۔

☆ فرمایا: متابعت سے کلام میں تقویت آتی ہے۔ متابعت فی الاسناد دو قسم پر ہے: ایک تامہ جو ابتداء اسناد سے ہو اور قاصرہ جو وسط اسناد سے ہو۔ پھر ان میں سے ہر ایک دو دو قسم پر ہے: (۱) متابع مذکور ہو (۲) غیر مذکور ہو، اس طرح متابع عنہ مذکور ہو یا غیر مذکور۔

متابعت میں چار چیزیں ہوتی ہیں، متابِع بالکسر، متابَع بالفتح، متابع عنہ، متابع علیہ، **کما یقال تابعہ فلان عن فلان علی کذا** تو پہلا فلاں متابِع ہے اور ضمیر مفعول کا مرجع متابَع ہے، اور دوسرا فلاں جو دونوں کا شیخ ہے، وہ متابع عنہ اور کذا سے جس بات کی طرف اشارہ ہے متابع علیہ ہے۔

☆ فرمایا: وحی کے نزول کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ تین کام تھے: سماع، تلفظ، تدبر اور نزول وحی کے وقت جو شدت ہوتی تھی وہ اس پر مزید، چنانچہ آپ کو کافی مشقت اٹھانی پڑتی تھی، اس لئے اللہ جل شانہ نے آپ کے ذمہ سے دو کام اٹھا کر اپنے ذمہ لیے، یاد کروانا اور اس کے مضمون کو سمجھانا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ صرف سننا ہی رہ گیا۔

☆ فرمایا: یہ بات رکھنی چاہیے کہ جہاں اسناد میں کنی آتے ہیں، ان کے اسماء کو یاد کرنا ضروری ہے، اسماء کے لئے کنی کا معلوم کرنا اتنا ضروری نہیں اور نہ ہر کسی کے بس کی بات ہے۔ کنی مستقل فن ہے، اس پر محدثین بخاری ومسلم وترمذی وغیرہ نے کتابیں لکھیں جو غیر مطبوع ہیں، البتہ حافظ ابو بشر دولابی نے جو کتاب لکھی ہے وہ

مطبوع ہے اور اچھی کتاب ہے۔ غالباً یہ کتاب پہلے ائمہ کے کتابوں سے بہتر ہوگی کیونکہ یہ فقیہ ہے، متاخر بھی ہے اور طحاویؒ کے شیخ ہیں۔ فرمایا: اس فن میں حافظ ذہبیؒ جو رجال کے بہت بڑے امام ہیں کو بھی امتحان دینا پڑا۔ حافظ ذہبیؒ کی حافظ ابن دقیق العیدؒ سے ملاقات ہوئی تو پوچھا کون ہو؟ تو فرمایا کہ ذہبی۔ فرمایا شمس الدین ذہبی؟ قال :نعم۔ تو فرمایا: من ابو محمد الہلالی؟ تو ذہبیؒ نے تبسم فرماتے ہوئے کہا کہ سفیان ابن عیینہؒ، حافظ ابن دقیق العیدؒ نے فرمایا کہ انت الذہبی۔

☆ فرمایا: حضرت ابن عباسؓ کی اکثر روایات مرسل ہیں۔ مسند صرف سترہ تک روایتیں ہیں، اس لئے آپ حدیث السن تھے۔

☆ فرمایا: قرآن کریم کی آیات کی ترتیب توقیفی ہے، حدیث سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے اور یہی جمہور کی رائے ہے۔ چند حضرات نے یہ رائے قائم کی ہے کہ قرآنی آیات میں ربط وتناسب ضروری نہیں، شاہ ولی اللہؒ کی بھی یہی رائے ہے، تعجب ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ سطحی رائے کیسے اختیار کرلی۔

نظم الدرر فی ربط الآیات والسور للبقاعی اس موضوع پر بہترین کتاب ہے، اس جیسی کتاب بقول علامہ کشمیریؒ اس موضوع پر ابھی تک نہیں لکھی گئی، یہ کتاب غیر مطبوع ہے اور ہندو پاک کے کتب خانوں میں موجود نہیں۔ مخطوط مصر واستنبول کے کتب خانوں میں موجود ہے۔

☆ فرمایا: شوافع کے نزدیک عموم مشترک جائز ہے اور حنفیہ وغیرہ حضرات کے ہاں جائز نہیں فرمایا اور حنفیہ کا یہ انکار میرا خیال ہے صرف احکام کے دائرہ میں ہے، احکام کے علاوہ دوسرے مقامات پر اگر عموم مشترک لیا جائے تو مضائقہ نہیں ہے۔

☆ فرمایا: نجوم کے دو کام ہیں: ایک تو اھتداء: وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ، جہات کا معلوم کرنا اور اوقات مواسم کا معلوم کرنا، قدیماً وحدیثاً بحری سفروں میں نجوم کے ذریعہ سے راستہ معلوم کیا جاتا ہے، اسی طرح اکثر بری علاقوں میں تاروں کے ذریعہ سمت کا تعین کیا جاتا ہے۔ اس علم کا نام معرفۃ النجوم رکھا جائے تو بہتر ہوگا۔

دوسرا کام ان کی تاثیر فی النحوسۃ والسعادۃ ہے، اس کی نفی بہت مشکل ہے۔ ان کی تاثیر ہوتی ہے، اگرچہ شریعت نے ممانعت کی ہے مگر ممانعت سے یہ لازم نہیں کہ ان کا فی الواقع کوئی اثر نہیں۔ ہمارے اکابر میں سے شاہ رفیع الدینؒ بھی اس کے قائل تھے، اس کی تفصیلات اتحاف السادۃ المتقین شرح احیاء علوم الدین میں ملاحظہ کیجئے۔ سید مرتضیٰ زبیدی نے اس کتاب میں اس موضوع پر بہترین مواد جمع کیا ہے۔

☆ فرمایا: ایمان صرف معرفت قلبی سے عبارت نہیں، بلکہ ایمان اذعان قلبی، تصدیق اور عقد قلبی کا نام ہے۔ ورنہ

صرف معرفت تو یہود کو بھی حاصل تھی: یعرفونہم کما یعرفون ابنائھم۔

☆ فرمایا: ایمان کے متعلق سات مذاہب ہیں: ان میں سے دو اہل حق کے ہیں اور بقیہ پانچ اقوال اہل ہوا اور گمراہ فرقوں کے ہیں۔ پہلا قول جمہور محدثینؒ کا ہے کہ ایمان عبارت ہے، عقد قلبی اور اقرار لسانی اور عمل بالجوارح سے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ایمان صرف عقد قلبی کا نام ہے اور بقیہ اعمال واقرار کمال ایمان کے لئے بمنزلہ شرط ہیں، شطر اور جزء نہیں۔ یہ مذہب امام ابوحنیفہؒ اور متکلمین کا ہے۔ بظاہران دو اقوال میں تعارض نظر آتا ہے مگر حقیقت میں کچھ تعارض نہیں بلکہ اعتبار کا فرق ہے۔

امام ابوحنفیہ اور محدثین کے درمیان اختلاف کا منشا یہ ہے کہ امام صاحبؒ کی طبیعت میں تنقیح اور تدقیق کا مادہ رچا ہوا تھا، وہ ہر مسئلہ میں اپنے اسی منہج کے مطابق رائے قائم کرتے تھے، اس بنا پر آپ نے جب قرآن وسنت میں غور کیا تو قرآن میں تقریباً تیس آیات ایسی ہیں جو اس بارے میں آپ کے اختیار کردہ مسلک پر دال ہیں اور بہت سی آیات میں ایمان کا محل قلب بتلایا گیا ہے۔ اسی طرح احادیث میں بھی ایمان اور اسلام کے درمیان فرق واضح کیا گیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ امام صاحبؒ کے دور میں فتنہ خروج واعتزال کا غلبہ تھا۔ آپ نے بار بار ان کے ساتھ مناظرے کیے۔ بیس مرتبہ خوارج کے ساتھ مناظرہ کی غرض سے بصرہ کا سفر کیا۔ چونکہ امام صاحب اور متکلمین کے سامنے خوارج اور معتزلہ کے مسلک کی تردید بھی تھی اس لئے انہوں نے وہ تعبیر اختیار کی اور محدثین کے زمانہ میں مرجیہ کا فرقہ عروج پر تھا چونکہ محدثین کے پیش نظر ان کی تردید تھی اس لئے عمل کو ایمان کا جز قرار دیا۔ [کیونکہ معتزلہ کے ہاں ایمان قول، عقد اور عمل کے مجموعہ کا نام ہے اور مرجیہ کے ہاں ایمان محض قول وعقد کا نام ہے۔ عمل کی کوئی ضرورت نہیں۔] دونوں فریق حنفیہ اور محدثین اس پر متفق ہیں کہ تارک عمل کافر نہیں بلکہ مؤمن ہے اور جہاں امام احمد وغیرہ نے بعض اعمال کے تارک کو کافر کہا ہے تو اس سے کفر صوری مراد ہے، یا اس سے کفر دون کفر مراد ہے، کفر مخرج عن الملۃ مراد نہیں۔

☆ فرمایا: امام صاحب کو سب سے پہلے نافع بن الارزق خارجی نے مرجی کہا۔

☆ فرمایا: امام صاحبؒ نے عثمان بتی کے ساتھ جو علمی مراسلت اور مکاتبت کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اہل حق کی طرف سے فرقہ مبتدعہ کے خلاف برسرپیکار تھے۔ یہاں ایک لطیفہ ہے: امام صاحبؒ کا عثمان بتی کے ساتھ تعلق تھا اور مباحثے بھی ہوئے، عثمان بتی آپ سے کچھ عرصہ پہلے انتقال کر گئے تھے۔ ایک موقع پر امام صاحبؒ نے فرمایا کہ اگر بتی زندہ ہوتے تو وہ میری رائے کی اتباع کرتے، اس روایت میں ہمارے کرم فرما خطیب بغدادی نے بتی کے لفظ سے ''نبی'' بنا کر العیاذ باللہ کہ امامؒ کے الحاد کا سامان کر دیا۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون

☆فرمایا: صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج، صوم وغیرہ الفاظ مختلف معانی کے لئے مستعمل تھے، شریعت نے ان کو ایک خاص معنی کیلئے استعمال کیا جس کی تشریح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے فرمائی۔ ان مخصوص اعمال اور ہیئات کے لئے ذخیرۂ لغت میں ان سے زیادہ مناسب اور موزوں الفاظ موجود نہیں تھے لہٰذا اب شریعت میں ان الفاظ کا استعمال انہی مخصوص حقائق کے لئے ہوگا۔ اور شرعی حقائق کے بجائے ان سے لغوی مفاہیم مراد لینا تحریف اور الحاد فی الدین ہوگا۔

☆فرمایا: خصائل ایمان کے بارے میں تین کتابیں مشہور ہیں: ایک ابن حبانؒ کی جو شعوب الایمان کے نام سے معروف ہے۔ دوسری ابوبکر بیہقیؒ کی شعب الایمان ہے اور تیسری ابوعبداللہ حلیمیؒ کی کتاب ہے۔ عینیؒ نے ابن حبان کی کتاب سے اپنی شرح عمدۃ القاری میں شعب الایمان نقل کیے ہیں۔

☆فرمایا: عبداللہ بن محمد الجعفی المسندی یہ پہلا شخص ہے جس نے ماوراء النہر خراسان کے علاقہ میں مسند لکھی ہے اسی وجہ سے اس کو المسندی کہتے ہیں۔ بعض نے یہ بھی کہا کہ آپ کو مسانید سے زیادہ دلچسپی تھی اور مرسلات وغیرہ کو زیادہ ذکر نہیں کرتے تھے۔

☆فرمایا: بضع کا لفظ مأتہ کے ساتھ بالاتفاق نہیں آتا۔ عشرہ کے ساتھ بالاتفاق آتا ہے اور ما بین عقود کے ساتھ آنے میں اختلاف ہے۔

☆فرمایا: شرح المواہب الدنیہ للزرقانی اور نسیم الریاض شرح الشفاء للقاضی عیاض للخفاجی سیرت ومحبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر بہترین کتابیں ہیں ان کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

☆فرمایا: احادیث آیات کریمہ سے مقتبس ہیں صراحۃً یا کنایۃً۔ معمولی غور سے معلوم ہوجاتا ہے کہ حدیث حب الانصار آیت وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ سے مقتبس ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں عام مفسرین کہتے ہیں کہ یہاں تضمین ہے، تقدیریوں ہے: والذین تبوء الدار و الفوا الایمان مگر یہاں تضمین کی ضرورت نہیں بلکہ آیت کا معنی یہ ہے کہ انصار نے اپنا ظاہری مسکن تو مدینہ کو بنالیا اور معنوی مسکن ایمان کو بنالیا۔

☆فرمایا: بسا اوقات بخاری اپنی طبعی مشکل پسندی کی بنا پر کچھ کہہ جاتا ہے اور شراح وغیرہ مشکل میں پڑ جاتے ہیں، حالانکہ اگر وہ ایک لفظ اور بڑھاتے تو مقام حل ہوجاتا، مگر ایسا کرتے نہیں۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے تھے کہ متکلم عموماً مخاطب کی خاطر اپنے شان سے نیچے نہیں اترتا تاکہ اگر مخاطب جاہل ہو تو اس کے فہم کے لئے اس کی سطح کی بات کردے۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ یہ صرف قرآن کا اعجاز ہے کہ اس سے ہر شخص بقدر حیثیت فائدہ اٹھاتا ہے، عاصی شخص بھی اس کو پڑھ کر اپنے راہنمائی کا سامان پاتا ہے اور عالم جب پڑھتا ہے تو لاتنقضی عجائبہ کی شان رکھتا

ہے۔

☆ فرمایا: ہر شخص کو اپنے مسلک کی تقویت اور اثبات کے لئے استدلال کا حق حاصل ہے مگر یہ نہایت غلط اور خلاف ذوق بلکہ ظلم کی بات ہے کہ آدمی حدیث میں ایسے قیود کا اضافہ کرے جس سے حدیث حنفی یا شافعی بن جائے کیونکہ یہ طریقہ درحقیقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے مقام رفیع اور رتبہ شامخہ و بازغہ سے نیچے اتار کر لانا ہے۔ والعیاذ باللہ۔ حدیث کو حدیث رسول رہنے دو، بعد میں دیکھو کہ حدیث آپ کے مسلک کی تائید میں ہے یا خلاف ہے، اگر مؤید ہے تو فبہا، ورنہ جواب دیجئے، یہ اصولی اور اہم بات ہے اس کو ملحوظ نظر رکھنا چاہیے۔ اس بنا پر قسطلانی نے "او بحق الاسلام" کے ساتھ "کترک الصلوۃ متعمدا" کی قید لگا کر حدیث کو شافعی بنانے کی جو کوشش کی ہے، وہ ناپسندیدہ ہے۔ یہ ایک ظنی اور اختلافی مسئلہ ہے، اس کو حدیث کا مصداق بنانا کسی طرح بھی صحیح نہیں اور "من ترک الصلوۃ" (حدیث) میں تارک صلوٰۃ کو اگرچہ کافر کہا گیا ہے مگر اس کی کیا دلیل ہے کہ اس کافر کا حکم بھی قتل ہے۔

☆ فرمایا: "باب علامۃ المنافق" کی مناسبت پر کسی نے خاص توجہ نہیں دی۔ میرا خیال ہے کہ بخاری نے اپنی جامع صحیح میں قرآنی ترتیب کو ملحوظ رکھا ہے، قرآن حکیم نے سب سے پہلے مؤمنین پھر کفار پھر منافقین کا ذکر فرمایا ہے، ابتدا میں بخاریؒ نے بھی اسی نہج پر اسی ترتیب کے ساتھ طوائف ثلثہ کا ذکر کیا ہے۔ **فجزاہ اللہ خیرا وللہ در الشیخ ماالطف ذوقہ وادق نظرہ۔**

☆ فرمایا: نفر، نفذ، نفص، نفت، نفس، نفی، نفیر، نفاق، نفقہ وغیرہ اس قسم کے دوسرے کلمات جن کے ابتدا میں 'ن، ف' ہوتے ہیں، ان کے معنی میں ذہاب کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

☆ فرمایا: اعراب جمع ہے اس کا مفرد من لفظہ نہیں اور کبھی اس کے برعکس مفرد ہوتا ہے اور اس کا جمع نہیں آتا اور کبھی جمع ہوتا ہے تثنیہ اس کا نہیں آتا اور کبھی علی العکس ذالک۔ اس موضوع پر ابن خالویہ نے مستقل کتاب لکھی ہے جس کا نام 'کتاب لیس' ہے۔

☆ فرمایا: اللہ تعالیٰ کے علم میں ماضی، حال واستقبال کا کوئی اعتبار نہیں۔ وہ تغیرات وانقلابات سے وراء الوریٰ ہے۔ کبھی کبھی اللہ جل شانہ کے علم کا عکس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر ہوجاتا، جس کی بنا پر مستقبل کے واقعات آپ کے سامنے پیش آتے رہے، آج کے جدید انکشافات اور علوم وفنون کی ترقی سے بہت سے حقائق شرعیہ جو ناقابل فہم تھے اب سہل الفہم ہوگئے اور سمجھنے میں دقت نہیں رہی۔

☆ فرمایا: ایک حدیث جب اسناد نازل واعلیٰ کے ساتھ منقول ہو تو متن عالی کے تابع ہوگا، جب تک محدث تصریح نہ کرے کہ متن بسند نازل مروی ہے۔

☆ فرمایا: حضرت شاہ عبد القادرؒ جو حضرت شاہ ولی اللہ کے چھوٹے صاحبزادے ہیں انہوں نے دہلی کے اکبری مسجد میں ۴۰ سال تک اعتکاف کر کے قرآن کا ترجمہ لکھا اور یہ آپ کا اس امت پر عظیم احسان ہے، حضرت شیخ الہندؒ فرماتے تھے کہ یہ ترجمہ الہامی ہے اور فرماتے تھے کہ اگر قرآن اردو زبان میں نازل ہوتا تو حضرت شاہ صاحب کے ترجمہ کے ٹکڑے ٹکڑے اس میں ہوتے۔ حضرت شاہ صاحب کشمیری فرمایا کرتے تھے کہ بسا اوقات حضرت شاہ صاحب کے ترجمہ سے وہ مشکلات حل ہو جاتی ہیں جو عربی کی بیس تفسیروں سے حل نہیں ہوتیں۔ حضرت شاہ عبد القادر کے بعد لوگوں نے اردو میں ترجمہ قرآن شروع کیا بعد میں جتنے بھی آئے ان کے خوشہ نشین ہیں۔ امام شافعیؒ نے فرمایا: الناس کلهم عیال في الفقه علی ابي حنیفة۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ میں کہتا ہوں کہ: الناس کلهم في ترجمة القرآن [بالاردية] عیال علی الشاه عبد القادر رحمه الله تعالی رحمة واسعة

☆ فرمایا: 'عہد' کا لفظ جنگ وغیرہ کے بعد جو معاہدہ اور صلح نامہ ہوتا ہے، اس کے لئے استعمال ہوتا ہے اور وعدہ عام ہے شخصی عہد اور میعاد کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

☆ فرمایا: ابتدا میں مذاہب متبوعہ فقہیہ چھ تھے۔ چار تو مشہور ہیں اور بقیہ دو مذہب سفیان ثوریؒ اور امام اوزاعیؒ کے تھے جو صدی ڈیڑھ صدی کے بعد ختم ہو گئے۔ سفیان کا مذہب حنفی میں مدغم ہو گیا اور اوزاعی کا مذہب مالکی مذہب میں ادغام ہو گیا۔

☆ فرمایا: 'بیت المقدس' میں اگر 'مقدس' مفعول کا صیغہ ہو تو پھر اضافۃ الموصوف الی الصفۃ کی تاویل کرنی پڑے گی اور اگر 'مقدس' مصدر میمی ہے بمعنی قدس، تو تاویل کی ضرورت نہیں، یہی اولیٰ ہے۔ آج بھی بیت المقدس کی طرف نسبت میں مقدسی کہا جاتا ہے۔

☆ فرمایا: خبر واحد جب محفوف بالقرائن ہو تو مفید قطع ہوتا ہے۔ کمافي کتب المصطلح

☆ فرمایا: اتمام واکمال میں فرق یہ ہے کہ اتمام بحسب الاجزاء ہوتا ہے اور اکمال بحسب الاوصاف۔ اس فرق کو شرح عقود الجمان میں بیان کیا گیا ہے۔

☆ فرمایا: صیام جمع جو آتا ہے وہ صائم کی ہے نہ کہ صوم کی، اور صیام بمعنی مصدر ی صوم کے معنی میں آتا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے۔

☆ فرمایا: ابو ہریرہؓ سے راوی 'محمد' جب بھی غیر منسوب ہوگا تو مراد ابن سیرین ہوں گے۔

☆ فرمایا: قیراط کا لفظ اضداد جیسا ہے، اس کا اطلاق ادنیٰ سے ادنیٰ چیز پر بھی ہوتا ہے، یعنی تولے کا چوبیسواں حصہ اور اس کا اطلاق بڑی سے بڑی چیز پر بھی ہوتا ہے جیسا کہ جنازہ پڑھنے اور دفنانے میں شریک ہونے والے کے

لئے حدیث میں اجر کے بیان میں وارد ہے۔

☆ فرمایا: انبیاء علیہم السلام کا سب سے عظیم کمال یہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ فرمایا، اس پر عمل بھی کیا۔ میرے نزدیک عالم اسباب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کا بہت بڑا ذریعہ یہ بنا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو جو پیغام دیا اس پر عمل کر کے دکھایا۔

☆ فرمایا: نقشبندیہ کے کلمات عشرہ کی بے نظیر شرح حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ نے اپنی کتاب ''انفاس رحیمیہ'' میں کی ہے وہاں ملاحظہ کریں۔ حضرت شاہ عبدالرحیمؒ ہمارے جدامجد کے ایک واسطہ سے مرید ہیں۔

☆ فرمایا: نعمان بن بشیرؓ کی حدیث ان چار بنیادی احادیث میں سے ہے جس پر سارے دین کا مدار ہے۔ یہ نہایت اہم حدیث ہے ہر کسی میں اس کی شرح کی اہلیت نہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ باوجود اتنی اہمیت کے افسوس ہے کہ کسی نے اس کی کماحقہ تشریح نہیں کی۔ اس کی شرح کا حق امام محمدؒ اور امام شافعیؒ جیسے بلند پایہ ائمہ کو حاصل تھا، شوکانیؒ نے جو کچھ لکھا ہے وہ مثل تنکے کے ہے اور حضرت شاہ صاحب فرماتے تھے کہ اس پر کچھ عمدہ بحث حافظ ابن دقیق العیدؒ نے 'شرح احکام الاحکام' میں کی ہے اور نفیس فوائد لکھے ہیں۔ فرمایا کہ معالم السنن للخطابی میں بھی اس حوالے سے عمدہ بحث ہے لیکن مطبوعات کے ذخیرہ میں سب سے منقح، مبسوط اور عمدہ بحث شیخ طاش کبریٰ زادہ نے اپنی کتاب مفتاح السعادۃ میں کی ہے۔ من شاء فلیراجعہ

☆ فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زبان فیض ترجمان سے علوم نبوت کے مختلف چشمے جاری ہیں، اور آپ کے مشکوٰۃ نبوت سے متنوع علوم کا فیضان جاری ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ جو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تلامذہ تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے ذوق کے موافق احادیث جمع کی ہیں۔ صحابہ میں سے حضرت ابوبکر صدیقؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اور صفات کے مظہر اتم تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم وکمالات کا عکس جمیل آپؓ پر پورا پڑ گیا تھا اس لئے آپؓ علوم نبوت کے جامع ترین شخص تھے، آپؓ کے بعد دوسرے صحابہؓ نے اپنے ذوق کے موافق احادیث جمع کیں حضرت حذیفہؓ نے احادیث فتن کو جمع کیا۔ حضرت ابوذرؓ نے مال کی مذمت اور فقر کی ترغیب والی احادیث بیان کی ہیں اور حضرت نعمان بن بشیرؓ نے امثال وعید والی احادیث زیادہ بیان فرمائی ہیں اور حضرت ابن مسعودؓ ان احادیث کو زیادہ جمع کیا جن پر احکام کا مدار ہے۔ اور تفقہ پر مشتمل ہیں اور جس کا کوئی اختصاصی ذوق نہیں تھا، اس نے ہر قسم کی احادیث جمع کی ہیں جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ۔

☆ فرمایا: یرفع اللہ الذین 'الآیۃ' سے بظاہر علما کی فضیلت ثابت نہیں ہوتی اس لئے کہ ''اوتوا العلم'' معطوف ہے ''الذین امنوا'' پر۔ تو جو کچھ علما کے درجات ہیں وہی ''الذین امنوا'' کے ہیں۔ کسی نے تو یہ کہا ہے کہ یہاں

تقدیر یوں ہی: یرفع اللہ الذین امنوا منکم درجۃ والذین اوتوا العلم درجات مگر قرآن کریم کی معجزانہ فصاحت اس کی مقتضی ہے کہ اس قسم کے تکلفات بار دو نہ کیے جائیں۔ یہاں صحیح بات حضرت ابن مسعودؓ کے اثر سے معلوم ہوتی ہے کہ آیت کا مقصود یہ ہے کہ یہ درجات ان لوگوں کے لئے ہیں جو کمال الایمان والعلم کے جامع ہوں۔ بغیر ایمان کے علم کی کوئی وقعت نہیں جیسا کہ شیطان باوجود بڑا عالم ہونے کے مردود ہے تو جس طرح اعمال صالحہ بغیر ایمان کے مفید نہیں اسی طرح علوم نافعہ بغیر ایمان کے مقبول ومفید نہیں ہوسکتیں اور درجات کے ابہام میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ایمان اور علم جیسا کہ مختلف ہیں، اس طرح درجات میں بھی تفاوت ہوگا۔

☆ فرمایا: نبوت کمالات انسانی میں معراج کا درجہ رکھتی ہے، نبوت کے بعد پھر دوسرا کوئی کمال نہیں، لہٰذا نبوت خاتمۃ الکمالات ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت خاتمۃ النبوات ہے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت اور ختم نبوت کی عظیم نعمت ملنے کے بعد بھی تلقین کی جارہی ہے کہ قل رب زدنی علما۔ یعنی علم ایسی نعمت ہے کہ نبوت کے بعد بھی اس کی ضرورت ہے۔

☆ فرمایا: شجر ان کلمات میں سے ہے جن میں مفرد اور جمع کا فرق تا، کے ساتھ ہوتا ہے، مفرد شجرۃ جمع شجر کتمر وتمرۃ ونمل ونملۃ وکلم کلمۃ ،لغویین اور نحویین کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ جمع ہے یا جنس۔

☆ فرمایا: طغرائی خط کی یہ خصوصیت ہے کہ جو اوپر والا لفظ ہوتا ہے وہ بعد میں پڑھا جاتا ہے اور جو حرف نیچے ہوتا ہے وہ پہلے پڑھا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتم کا نقش اسی خط کے مطابق تھا اور فرمایا کہ میں جب تقریباً چھ سال کا بچہ تھا، اس وقت گھر میں ایک کتاب جس کا نام ثبوت خلافت تھا اسی خط کے موافق لکھا تھا۔ میں نے خلافت ثبوت پڑھ لیا۔ والد صاحب نے کہا کہ نہیں! یہ 'ثبوت خلافت' ہے اور یہ قاعدہ بتلا دیا جو ابھی تک یاد ہے۔

☆ فرمایا: تابعین میں ایسے حضرات ملتے ہیں جو فقہ میں بعض صحابہ کرام سے زیادہ ہیں اور افقہ ہیں اگر چہ ہر صحابی کو فضلیت صحبت حاصل ہے مگر فقہ علیحدہ چیز ہے اور یہ تفاضل بعض تابعین کا بعض صحابہ پر تفقہ میں مشاہد اور محسوس ہے، ویشیر الی ذالک الحدیث

☆ فرمایا: شیخ عبد القاہر جرجانیؒ نے اپنی کتاب دلائل الاعجاز میں لکھا ہے کہ "انما" حصر کے لئے استعمال ہوتا ہے مگر ایسے مقام پر جبکہ متکلم مدخول انما کے بداہت کا مدعی ہو اور یہ چیز ما والا میں نہیں پائی جاتی۔ یہ بہت عمدہ کتاب ہے اگر یہ کتاب اور ان کی دوسری کتاب اسرار البلاغۃ وجود میں نہ آتی تو فن بلاغت ومعانی مدون مرتب نہ ہوتا۔ بلاغت ومعانی کا ذوق پیدا کرنے کے لئے شیخ کی ان کتابوں کا مطالعہ لازمی ہے، اس فن میں عمدہ کتابیں یہ ہیں: شرح عقود الجمان للمرشدی اور الطراز المتضمن لاسرار البلاغۃ والاعجاز اور عروس الافراح شرح

تلخیص المفتاح، یہ تین کتابیں آپ کے پاس ہوں تو کسی دوسرے کتاب کی ضرورت نہیں رہے گی۔

★لو کنا نسمع او نعقل کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ نسمع میں درجہ تقلید کی طرف اشارہ ہے اور نعقل میں اجتہاد وتحقیق کی طرف اشارہ ہے معلوم ہوا کہ تقلید بھی حجت ہے جب اجتہاد کی صلاحیت نہ ہو۔

☆وعظ کے لئے خاص دن مقرر کرنے کے متعلق جو حدیث وارد ہے اس کو شروع کرتے ہوئے فرمایا کہ مدارس میں جو تعطیلات ہوتی ہیں، اس کی اصل یہ حدیث ہے۔

☆فرمایا: تفقہ فی الدین شرعاً مطلوب ہے اور اس کے لئے جو چیزیں مفید ہوں وہ بھی مطلوب ہیں کیونکہ مقدمۃ الواجب واجب ہوتا ہے لہٰذا تفقہ کے لئے جن علوم کی ضرورت ہے جس میں علوم عربیہ وغیرہ آتے ہیں، مطلوب ہوں گے الغرض مقاصد کی طرح وسائل بھی مطلوب ہوتے ہیں۔ اس سے معروف اصطلاحی فقہ مراد نہیں بلکہ مراد وہ عام معنی ہے جو حضرت امام ابوحنیفہؒ نے بیان فرمایا ہے کہ **الفقہ معرفۃ النفس مالھا و ما علیھا**

☆فرمایا: علما آج کل داڑھی نہیں منڈاتے، نہ دیگر ظاہری معاصی میں مبتلا ہیں، وجہ یہ ہے کہ ماحول ایسا ہے جس میں اس قسم کے معاصی کے ارتکاب کی گنجائش نہیں مگر دوسرے طرف باطنی معاصی میں گرفتار ہیں۔ علما آج تین قلبی امراض میں خاص طور سے مبتلا ہیں: (۱) حب جاہ (۲) حب مال (۳) بغض وحسد اور اسی طرح خانقاہوں میں رہنے والے صوفی بھی الا ماشاء اللہ۔ **اعاذنا اللہ و العیاذ باللہ**

☆فرمایا: نعمتیں دو قسم کی ہیں: ایک مادی، ایک روحانی۔ مادی نعمتوں میں قابل غبطہ نعمت وہ مال ہے جو راہ حق میں خرچ کیا جائے اور روحانی نعمتوں میں قابل غبطہ نعمت وہ علم ہے جو نافع اور منتفع ہو۔ مجرد مال اور مجرد علم میں کوئی کمال نہیں۔

☆فرمایا: غیث عربی لغت میں بارش کو کہتے ہیں اور اسی طرح مطر بھی۔ لیکن قرآن وحدیث کی اصطلاح اور استعمال میں عموماً غیث باران رحمت کے لئے آتا ہے اور عذاب کے موقع پر مطر کا استعمال ہوتا ہے۔ حدیث میں غیث کا لفظ جو آیا ہے اس میں بھی علوم نبوی کے رحمت ہونے کی طرف اشارہ ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث کے الفاظ محفوظ ہوتے چلے آئے ہیں اور روایت بالمعنی نہیں کیا گیا ہے۔

☆فرمایا: جدب بفتح الاول ضد الخصب بکسر اولہ، ایسی بہت سے کلمات ہیں جو کہ اضداد میں سے ہوتے ہیں اور ایک مکسور الاول دوسرا مفتوح الاول ہوتا ہے۔ **و منھا الجدب و الخصب و العلم و الجھل**

☆فرمایا: الجزائر کے ایک عالم نے جو ایک سو سال پہلے گذر چکے ہیں ایک کتاب لکھی ہے **اللالی و الدرر فی المحاکمۃ بین الحافظ العینی** رحمہ اللہ **و الحافظ ابن حجر** رحمہ اللہ جس میں انہوں نے حافظ عینی اور حافظ ابن

حجر کے درمیان مختلف فیہ مقامات پر محاکمہ کیا ہے یہ کتاب اب لیبیا سے چھپ گئی ہے۔

☆ فرمایا: بخاری نے فضل العلم کے عنوان سے جو باب باندھا ہے، حافظ عینیؒ نے فضل بمعنی فضیلۃ لیا ہے اور حافظ ابن حجرؒ نے بمعنی زیادۃ کے لیا ہے۔ یہاں پر بات حافظ ابن حجرؒ کی زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے اور علامہ عینی کی بات کمزور ہے لہذا اتفق له الموافقات بکثرۃ۔

☆ فرمایا: حضرت عمرؓ کا مزاج تشریعی تھا اور آپؓ اشبہ الناس تھے برسول اللہ ﷺ فی علمه و کان الصدیق من اشبهم فی خلقه ﷺ وقال علیه السلام بعثت لاتمم مکارم الاخلاق، فکان الصدیق اولی بالخلافة، فتفطن۔

☆ فرمایا: عرف واستعمال میں 'کان' جب فعل پر داخل ہوتا ہے تو مفید استمرار ہوتا ہے مگر محدثین اور علم حدیث کی اصطلاح میں 'کان' استمرار کے لئے نہیں آتا بلکہ اگر کوئی ایک دفعہ بھی واقع ہو چکا ہو تو وہاں بھی 'کان' لے آتے ہیں۔

☆ فرمایا: حدیث متواتر کی تعریف میں پھر اس کے وجود میں علما کا اختلاف ہے بہرحال احادیث کے ذخیرہ میں اگر کوئی حدیث متواتر ہو سکتی ہے تو وہ حدیث "من کذب علی متعمدا" الحدیث ہے جس کے راوی تقریباً ایک سو صحابہ ہیں۔ حافظ سیوطی وغیرہ نے تساہل کیا ہے اور ہر اس حدیث کو جس پر تعامل چلا آرہا ہو اس کو متواتر کہا۔ سیوطیؒ نے ایک کتاب لکھی جس کا نام "الازھار المتناثرۃ فی الاخبار المتواترۃ" رکھا ہے اور اس میں طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ جس حدیث کے راوی دس تک صحابہ ہوں اس کو متواتر کہا، اس لئے ان کا کافی ذخیرہ اس کو ہاتھ آیا۔

☆ فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر کوئی خواب میں دیکھے اور اسے اطمینان اور یقین ہو جائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں تو ٹھیک ہے اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔ شمائل میں جو حلیہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان ہوا ہے اس صورت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہی شخص دیکھ سکتا ہے جس کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے شدید اور صحیح تعلق ہو اور اس کے علاوہ ہر شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی استعداد کے موافق صورت میں دیکھتا ہے، شیطان کو یہ قدرت نہیں دی گئی کہ وہ آپ کے نام اور صورت سے نیند میں آ جائے تفصیلات شفاء قاضی عیاض اور وفاء الوفاء اور شروح شفا میں ملاحظہ ہوں، خلاصہ یہ کہ رائی کے دل میں یقین آئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو بس کافی ہے۔

☆ فرمایا: حدیث میں جو آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آج جو لوگ زندہ ہیں سو سال بعد ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں رہے گا، محدثین نے اس کے عموم سے فائدہ اٹھا کر خضر علیہ السلام کی وفات پر استدلال کیا ہے مگر یہ استدلال قوی نہیں ہے، اس لئے کہ ایک تو مامن عام الا وقد خص عنه البعض، دوسری یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب صحابہ تھے مطلب یہ تھا کہ آپ میں سے [یعنی عالم شہادت میں زندہ اور موجود لوگوں میں سے] سو سال

بعد کوئی زندہ نہیں رہ سکے گا۔ اور حضرت خضر کا تعلق عالم شہادت سے نہیں وہ درحقیقت رجال الغیب میں سے ہے، تو حدیث کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، تو ممکن ہے کہ وہ زندہ ہوں اور یہی صوفیاء کرام کا مذہب ہے۔

☆ فرمایا: روح کے بارے میں امام رازیؒ نے کتاب لکھی ہے جس کا نام "لطائف القدس بمعرفۃ النفس" ہے اور شاہ ولی اللہ نے بھی اس طرز پر "الطاف القدس" فارسی زبان میں لکھی، شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ میں بھی کچھ نامکمل تفصیلات لکھی ہیں۔ شاہ صاحبؒ کی رائے یہ ہے کہ قرآن نے روح کی حقیقت کو معلوم کرنے سے روکا نہیں اور اس کی حقیقت کو پہنچنا ممکن ہے، انبیاء علیہم السلام نے تفصیلات اس لئے بیان نہیں کی ہیں کہ اس وقت کے لوگوں اور آئندہ آنے والی نسلوں کے عامۃ الناس کے اذہان اس کے ادراک سے قاصر تھے۔ شاہ انور شاہؒ کی رائے یہ ہے کہ روح عالم خلق میں سے نہیں بلکہ عالم امر میں سے ہے۔ اس کے بارے میں جو کچھ لکھا جائے یا کہا جائے، تحقیقات کی جائیں تو وہ کم ہوں گی، اس کی حقیقت کو پانا مشکل ترین امر ہے۔ اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔

☆ فرمایا: مسجد کے اندر علوم دینیہ کا درس دینا جائز ہے، غیر دینی علوم پڑھانا جائز نہیں تو اس بنا پر مسجد میں فلسفہ اور اشعار جاہلیت کی تعلیم دینا جائز نہیں، اگرچہ علم دین کے لئے وسیلہ ہیں چنانچہ ہمارے اکابر دیوبند اس سے احتراز کیا کرتے تھے۔ منطق کا پڑھانا جائز ہے کیونکہ اس میں کفریات وخرافات نہیں ہیں اگرچہ بعض محدثین مثلاً ابوعمر وابن صلاحؒ اور علامہ سیوطیؒ وغیرہ کی شاذ رائے ہے کہ منطق بھی ان علوم میں سے ہے جن کا حاصل کرنا حرام ہے مگر یہ رائے قابل اعتبار نہیں۔

☆ فرمایا: حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب کشمیریؒ [المتوفی ۱۳۲۳ھ] حضرت انور شاہ کشمیریؒ کے استاذ تھے اور دارالعلوم دیوبند میں مسلم شریف وغیرہ کا درس دیا کرتے تھے، بعد میں وہ مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ وہاں کے لوگوں نے آپ سے کہا کہ ہمیں منطق کی تعلیم دیں تو آپ نے فرمایا کہ منطق کی جو مدون کتب ہیں ان کو تو نہیں پڑھاؤں گا البتہ خود کتاب لکھ کر وہ پڑھادوں گا، چنانچہ انہوں نے خود ایک کتاب لکھی جس میں امثلہ قرآن وحدیث سے لیں۔ وہ کتاب چھپی ہے، اور میں نے اس کا قلمی نسخہ بھی دیکھا ہے۔

☆ فرمایا: کتاب العلم میں امام بخاریؒ نے ۱۰۳ مرفوع احادیث ذکر کی ہیں جن سے تقریباً ۱۵۰ تک مسائل کا استنباط کیا ہے جو علم، عالم اور متعلم کے آداب سے متعلق ہیں۔ فجزاہ اللہ خیرا

☆ فرمایا: آیت وضو کے نزول (جو غزوۃ المریسیع کے موقع پر نازل ہوئی تھی) سے اٹھارہ برس پہلے وضو کی تشریع آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ہوئی ہے اور پھر اٹھارہ برس بعد قرآن نے اس کی تائید کی۔ اس سے ایک اصولی بات معلوم ہوتی ہے کہ شرائع الٰہیہ کا مدار نبوت اور انبیا کی تعلیمات پر ہوتا ہے اصل میں نبی کے قول وفعل وغیرہ سے

امور شرعیہ کا ثبوت ہوتا ہے اور تشریع امور قرآن کے نزول پر موقوف نہیں۔

☆ فرمایا: تضمین کا معنی یہ ہے کہ دو متقارب المعنی فعلین کے دو معمول ہوں تو احد الفعلین کو حذف کر کے اس کے معمول کو دوسرے فعل کے معمول پر عطف کر دیا جائے تو اس طرح دو معمولین عاملین مختلفین کے ایک عامل کے تحت آجائیں گی، جیسا کہ علفنا ھاتبنا و ماء بارداً اور فزججن العیون والحواجب۔

☆ فرمایا: اطالۃ الغرۃ والی حدیث کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن اللہ جل شانہ امت محمدیہ کے افراد کے اعضائے وضو پر نور ظاہر فرمادیں گے اور یہ اعزاز صرف اسی امت کو حاصل ہوگا، کہ ان کے وضو کا اثر اس صورت میں ظاہر ہو جائے گا۔ کیونکہ وضو پہلی امتوں کے لئے بھی تھا مگر ان کے وضو پر یہ اثر مرتب نہیں ہوگا۔

☆ فرمایا: کہ بعض روایات کے بارے میں امام ترمذیؒ نے اپنے شیخ امام بخاریؒ کی رائے سے اختلاف کیا ہے اور اپنی روایت کو بخاری کی روایت پر ترجیح دی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ امام بخاری کی رائے ہر جگہ واجب التسلیم نہیں اور نہ یہ ضروری ہے کہ بخاری کی ہر روایت ترمذی وغیرہ کی ہر روایت سے اصح ہو، اس لئے اگر کسی حنفی محقق نے بخاری کی رائے سے کہیں اختلاف کیا یا ترمذی وغیرہ کی روایات کو بخاری کی روایات پر ترجیح دی تو اس پر چراغ پا ہو کر برسنا اور چیخنا حماقت ہے۔

☆ فرمایا: حنفیہ کی چار شخصیتیں ایسی ہیں جن کی تصنیفات سے کوئی محقق عالم مستغنی نہیں ہوسکتا: (۱) امام طحاویؒ کی شرح معانی الآثار اور مشکل الآثار (۲) ابو بکر جصاصؒ کی احکام القرآن اور الفصول فی الاصول (۳) علامہ ماردینیؒ کی الجوھر النقی فی الرد علی البیھقی (۴) حافظ زیلعیؒ کی نصب الرایۃ، یہ چار شخصیات تحقیق کے بارے میں حنفیہ کے ائمہ اربعہ ہیں، ابن الہمام کی فتح القدیر میں جتنا ذخیرہ احادیث کا ہے وہ نصب الرایہ سے ماخوذ ہے اور حافظ عینی کے عمدۃ سے بھی، حنفی محدث بخاری کا پڑھانے والا اس سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔

☆ فرمایا: صیغہ تمریض کے ساتھ بخاری جب کسی حدیث کا تذکرہ کرتے ہیں تو وہاں حدیث یا تو ساقط ہوتی ہے یا ضعیف ہوتی ہے یا پھر اس حدیث سے استدلال اپنے موضوع پر کمزور ہوتا ہے۔

☆ فرمایا: زاد المعاد فی ہدی خیر العباد اچھی اور نفیس کتاب ہے، اس میں بہت سارے نفائس اور عمدہ ابحاث ہیں۔ ابن القیمؒ بہت ہی وسیع المطالعہ کثیر التصانیف شخصیت تھے، وکان جماعاً للکتب اور کہا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی سالہا سال تک اسی کی کتابیں بکتی رہیں مگر تعجب یہ ہے کہ ان کی ساری تصانیف میں نفائس کے ساتھ عجائب بھی ہوتے ہیں، زاد المعاد میں عمدہ اور نفیس مباحث کے ساتھ بعض غلط اور سطحی قسم کی باتیں بھی ملتی ہیں۔

حضرت شیخ نے اس پر ایک لطیفہ سناتے ہوئے فرمایا کہ شیخ (حضرت کشمیریؒ) نے فرمایا کہ ایک دن میں حضرت

شیخ الہندؒ کے پاس بیٹھا تھا، ان کے ہاتھ میں زاد المعاد تھی، مطالعہ کے دوران ان پر کچھ تعجب اور حیرت کی کیفیت طاری ہوگئی، تو میں نے عرض کیا: حضرت کیا بات ہے؟ فرمایا کہ بہت اوپری باتیں کررہا ہے، یعنی آپ کو تعجب ہوا کہ ایسا ذہین اور وسیع النظر شخص کس طرح اس قسم کی سطحی بات کہنے پر اتر آتا ہے۔ دراصل اس قسم کی باتیں اس وقت انسان کرجاتا ہے جب تعصب اور محبت کے جذبہ میں آجاتا ہے، سچ ہے: حبک الشئی یعمی ویصم۔

☆ فرمایا کہ اعلام الموقعین بعض پہلوؤں سے اچھی کتاب ہے لیکن بعض پہلو اچھے نہیں۔

☆ فرمایا: بخاری، ص:۶۱، ج:۱، قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم لعن اللہ الیہود: ترجمہ میں مذکور دعویٰ کے لئے یہ تعلیل بظاہر بہت دقیق ہے، اس لئے شارحین نے اس کو حل نہیں کیا اور جو کچھ لکھا ہے وہ ناقابل فہم ہے۔ بخاریؒ کا مدعا یہ ہے کہ قبر کی موجودگی میں نماز پڑھنا ناجائز ہے۔ جب تک نبش نہ کی جائے نماز ناجائز ہوگی۔ دلیل یہ ہے کہ حضرات انبیا خود بھی واجب الاحترام ہیں اور ان کی قبور بھی قابل احترام ہیں، ان کی قبر کے پاس نماز پڑھنا اور ان کو سجدہ گاہ بنانا جائز نہیں تو مشرکین وغیرہ کی قبور کے پاس بغیر نبش کے کیسے نماز جائز ہوسکتی ہے۔

☆ فرمایا: عہد نبوت کے دس سالہ مدنی دور میں اصحاب صفہ کی مجموعی تعداد تین سو بتالیس تک پہنچی ہے۔ ابونعیم اصفہانی نے اس پر ایک کتاب لکھی ہے۔

☆ فرمایا: شملہ میں ایک موقع پر حضرت مولانا عثمانیؒ، حضرت مولانا حبیب الرحمنؒ، حضرت مولانا خلیل احمدؒ، حضرت مولانا تھانویؒ اور حضرت شاہ صاحبؒ جمع ہوئے، بعض لوگوں نے تقاضا کیا کہ قرآن کے اعجاز پر تقریر ہو، اس کے لئے حضرت شاہ صاحبؒ منتخب ہوئے۔ تقریر سے پہلے حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اعجاز قرآن پر میری تقریر اس شخص کے سمجھ میں آئے گی جس کو بارہ ہزار اشعار دورِ جاہلیت کے یاد ہوں اور بلاغت وفصاحت کے قواعد پر عبور ہو۔ بہرحال آپ نے ڈیڑھ یا دو گھنٹہ تقریر کی، تقریر کے خاتمہ پر حضرت مولانا تھانویؒ نے فرمایا: سبحان اللہ! آج ہمیں اپنے جہل کا علم ہوا۔

☆ فرمایا: بنی اللہ لہ بیتا فی الجنۃ: یہ حدیث تقریباً بیس صحابہ سے منقول ہے اور معناً تواتر تک پہنچی ہے، اس میں جو اشکال ہے اس کی دس توجیہات کی گئی ہیں، ایک توجیہ جو میں نے کی ہے وہ سب سے ظاہر ہے، وہ یہ کہ بانیین میں فرق اور مبنیٰ میں فرق اور دارین میں فرق ہے تو مماثلہ فی البناء بالمعنی المصدری میں ہے، نہ کہ بناء مبنی للمفعول میں۔ فرمایا کہ میں نے ڈابھیل میں حضرت مولانا عثمانیؒ کو یہ توجیہ سنائی، تو خوش ہوئے اور دعا دی اور فرمایا کہ تعجب ہے! سب سے اچھی توجیہ یہ ہے اور ظاہر بھی پھر کیسے لوگوں کی نظروں سے غائب رہی۔

☆ فرمایا: جب امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ ایک قول پر متفق ہوں تو وہ من حیث الحدیث اقویٰ ترین مذہب ہوگا۔

امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ جس قول پر متفق ہوں تو وہ من حیث التعامل اقویٰ ترین مذہب ہوگا اور جب امام ابوحنیفہ اور امام شافعیؒ ایک قول پر متفق ہوں تو وہ من حیث التفقہ اقویٰ ترین مذہب ہوگا۔

☆ فرمایا: فان شدۃ الحر من شدۃ فیح جھنم اس پر یہ سوال ہوتا ہے کہ دنیا کے تمام ممالک میں یہ مشاہدہ ہے کہ گرمی وسردی اور صیف وشتاء کا مدار سورج کے قرب وبعد پر ہوتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شدۃ حر کا باعث اور سبب ذات شمس میں ہے۔ اس کا جواب اجمالاً تو یہ ہے کہ شارع علیہ السلام تعلیم شرائع کے لئے مبعوث ہوئے تھے، جن کا ادراک عقول عامہ سے باہر ہے، رہے وہ امور جو ظاہری اسباب پر مبنی ہوں، تو انبیاء ایسی چیزوں اور اس کے اسباب سے بحث نہیں کرتے۔ اس جواب کی تفصیل یہ ہے کہ یہ بات مشاہدہ کی ہے کہ شدت گرمی کا سبب سورج کا قریب آجانا ہے اس لئے یہ بات تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے شان سے بعید تر ہے کہ وہ اس ظاہری سبب کو بیان فرماتے بلکہ آپ کا منصب تو یہ ہے کہ جو چیز دوسروں کے نظروں سے مخفی ہے اور ان کے عقول سے ماوراء ہے اس کو ظاہر فرمادیں۔ دنیا کے تمام اہل عقل اس پر متفق ہیں کہ اس عالم میں کرۂ شمس سے گرم ترین کوئی چیز نہیں، اگر درمیانی فضا میں موانع نہ ہوتے، تو حجر وشجر، ضرع اور زرع سب جل جاتے، کوئی بھی متنفس زندہ نہ رہ سکتا، مگر سورج کے کرہ میں یہ حرارت کہاں سے آئی، اس حقیقت کے ادراک سے سب کے سب قاصر ہیں۔ اب یہ پیغمبر کا مقام تھا کہ اس نے وحی کے ذریعہ سے بتادیا کہ سورج میں یہ حرارت ذاتی نہیں بلکہ مستفاد ہے جہنم سے، اللہ تعالیٰ نے کرۂ شمس میں یہ قوت جاذبہ اور خاصہ پیدا کردیا ہے کہ وہ جہنم سے حرارت کو جذب کر لیتا ہے اور پھر شعاع شمس کے انعکاس سے یہ حرارت دنیا کو پہنچتی ہے اور اس کو متوازن بنانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہوا وغیرہ کے کرات بنادیئے۔ اب دنیا کا نظام اس حرارت سے چل رہا ہے۔

☆ فرمایا: مدینہ منورہ میں ایک بزرگ رہتے تھے جو بھیڑ بکریاں پالتے تھے اور خود دودھ نکالتے تھے، ایک دن اتفاق سے وہ بکری سے دودھ نکالنے میں مصروف تھے کہ میں آگیا، اس نے مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا: و کان رسول اللہ ﷺ یحلب شاتہ تو میں نے کہا: نعم و کان یکنس بیتہ اور پھر ارتجالاً میں نے یہ شعر کہا:

الایا صاحب الشاۃ و الغنم

ھیألک سنۃ ھادی الامم

☆ فرمایا: حضرت صدیقؓ اعلم الصحابہ تھے بلکہ افضلہم بھی تھے باجماع الصحابہ اور آپؓ کی افضلیت بالکل بدیہی تھی دلیل کی محتاج نہ تھی۔ اس لئے مسلمان تو کیا کفار مکہ جاہلیت کے زمانے میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپؓ کا مرتبہ قرار دیتے تھے۔ ابوسفیانؓ نے احد کے موقع پر کہا: ھل فیکم محمد قال لاتجیبوہ قال ھل فیکم

ابن ابی قحافة قال لا تجیبوه قال هل فیکم ابن الخطاب۔

☆ فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رخِ انور کی تشبیہ صفائی میں ورقِ مصحف سے دی گئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک چہرے پر دھبے وغیرہ نہ تھے، یا رخِ انور میں ایسی جاذبیت تھی جیسا کہ اوراقِ مصحف کلامِ الٰہی کی وجہ سے جاذبِ نظر ہوتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ کو بھی قرآن سے تعبیر کیا گیا: کان خلقه القرآن لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیرۃ اور صورت دونوں کے لحاظ سے قرآن کے مظہر تھے۔

☆ فرمایا: بخاری شریف کو تین سال میں پڑھایا جائے، وقت بھی دو گھنٹے ہو، روزانہ ایک ورق تک مقدار خواندگی ہو اور فتح الباری، عمدۃ القاری، ارشاد الساری، خیر الجاری، توشیح اور تنقیح سارا سامان پیشِ نظر ہو، تب کچھ کام ہوگا۔

☆ فرمایا: شیخ طوسی کا قلمی نسخہ بخاری میرے پاس ہے، بہت عمدہ ہے اور تین سو سال کا لکھا ہوا ہے اور بہت اچھا لکھا گیا ہے۔ حضرت شیخ نے فرمایا کہ میں نے معارف السنن میں کوشش کی ہے کہ تلخیص اور تنقیح کے ساتھ تعبیر اور ترتیب بھی ایسی رکھی ہے کہ مدرس کے لئے آسان ہو تو تصنیف میں تدریس کا کام بھی کیا۔

☆ فرمایا: حضرت مولانا عثمانیؒ کو اللہ تعالیٰ نے تقریر میں ایسا عجیب ملکہ عطا فرمایا تھا کہ مختلف مواد کو تقریر میں ایسا جوڑ دیتے تھے کہ ہم حیران رہ جاتے، مگر تصنیف میں یہ حسنِ ترتیب نظر نہیں آتی اور ہمارا معاملہ بالعکس ہے۔ فرمایا کہ مولانا عثمانیؒ کی تقریر کا یہ حال تھا کہ وہ اگر صرف اتنی بات کہنا چاہتے کہ ''میں دیوبند سے ڈابھیل پہنچا'' تو اس کے لئے کم از کم آدھ گھنٹہ وقت چاہیے ہوتا اور ایسے دلکش انداز میں یہی بات آدھ گھنٹہ میں بیان کرتے کہ سامع پر بالکل شاق نہ گزرے۔ [یہ تقریر حضرت نے اس بات پر فرمائی کہ نماز میں اتباعِ امام کے بارے میں ائمہ کی کیا آراء ہیں تو فرمایا:] عند الثلثه علی المعاقبة اور عند الحنفیه علی سبیل المقارنة۔

☆ فرمایا: التحقیق فی احادیث الخلاف لابن الجوزی [ ] رحمہ اللہ اور التنقیح [تلخیص التحقیق فی احادیث التعلیق] لابن عبد الهادی الحنبلی رحمہ اللہ و کلاهما لم یطبعا۔ دونوں نفیس کتابیں ہیں۔ ابن الجوزی بڑے محقق عالم ہیں اور منصف مزاج ہیں، اپنی حنبلیت میں متعصب نہیں، فرمایا کہ موضوعات پر ان کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے متشدد ہیں اور عجیب یہ ہے کہ اپنی ایک کتاب ''المدہش'' میں جو وعظ اور نصیحت کے موضوع پر ہے ایسی واہیات اور موضوعات ذکر کی ہیں جن پر خود انہوں نے موضوع کا حکم لگایا ہے۔ اس پر شیخ عثمانیؒ فرماتے تھے کہ ابن الجوزیؒ پر یہ مواخذہ ہوا کہ وہ احادیث کے بارے میں متشدد ہیں اور مواعظ وغیرہ میں سخت متساہل ہیں۔

☆ فرمایا: قمر کے نور کے مستفاد ہونے پر تو سب کا اتفاق ہے، اس طرح اگر حرارتِ شمس کو بھی مستفاد من الغیر

مان لیں، تو اس میں کوئی استبعاد نہیں۔ ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ پہاڑ اور چوٹیوں کے سرے چونکہ شفاف فضا میں ہوتے ہیں، اس لئے ان پر گرمی کم ہوتی ہے اور کثیف زمین پر جب شعاعیں پڑتی ہیں، تو درو دیوار اور سطح زمین گرم ہو جاتی ہے اور حرارت پھر اوپر کی طرف لوٹ جاتی ہے اور ہوا بھی گرم ہو جاتی ہے، یہ وجہ ہے کہ پہاڑیوں اور اونچے مقامات پر گرمی کم اور نچلے مقامات پر زیادہ ہوتی ہے۔

ایک دوسرے صاحب کے جواب میں فرمایا کہ جہنم کو اگر زیر زمین تسلیم کیا جائے یا محیط علی العالم تو اس میں کوئی استحالہ نہیں کہ صرف شمس اس کے حرارت کو جذب کر رہا ہے اور دوسری اشیا کو اس کی گرمی نہ پہنچتی ہو، ریڈیو دور سے آواز کھینچ لیتا ہے اور ہمارے کان اس کو قریب سے بھی نہیں سنتے، اس طرح مقناطیس لوہے کو کھینچ لیتا ہے، اور دوسری چیزیں اس کو نہیں کھینچتی۔ خود میرا مشاہدہ ہے ایک ہندو حکیم دوست نے ایک دوا تیل کی بنائی تھی کہ ہتھیلی پر ڈال کر مقام درد کو جذب کے ذریعے پہنچتی تھی اور ہتھیلی کو نہیں جلاتی تھی اور جب اس میں پتھر، لکڑی وغیرہ کوئی چیز ڈالتے تو وہ فوراً جل جاتی، اسی طرح آتشی شیشہ جسم کو نہیں جلاتا اور کپڑے کو جلا دیتا ہے پھر خصوصاً سیاہ کپڑے کو جلدی آگ لگا دیتا ہے بہ نسبت سفید کے، الغرض یہ ممکن ہے کہ یہ صرف سورج کا خاصہ ہے کہ وہ جہنم کی حرارت کو جذب کر لیتا ہے اور عالم کے دوسرے اشیا جہنم کی حرارت کو محسوس نہیں کرتے۔

☆ فرمایا: اسفار فجر اور تاخیر عصر پر حنفیہ کے لئے سب سے عمدہ دلیل قرآن کریم کی آیت کریمہ ہے: فسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل غروبها اور صحیح حدیث میں طلوع صبح کی تفسیر نماز فجر اور قبل غروب کی نماز عصر کے ساتھ وارد ہے اور اب اگر فجر کی نماز تغلیس اور عصر کی مثل ثانی میں پڑھ لی جائے تو قرآن کریم کی تعبیر اس کے موافق نہیں ہوگی۔

☆ فرمایا: حضرت مولانا عثمانیؒ کے واسطہ سے ہمارے شیخ المشائخ مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندیؒ کا ایک جملہ سنا ہے، وہ فرماتے تھے کہ قرآن کریم کے کسی آیت کریمہ میں اگر اشارہ موجود ہو تو وہ مجھے صحیح حدیث سے زیادہ پسند ہے اور صحاح ستہ کی احادیث میں اشارہ غیر صحاح کی احادیث صریحہ سے زیادہ پسند ہے، یہ آپ کا ذوق تھا اور بہت لطیف اور نفیس بات فرمائی ہے۔

☆ فرمایا: بعض روایات میں مختلف تعبیرات آتی رہتی ہیں اور ایک مضمون مختلف طریقوں سے ادا کیا جاتا ہے، اس موضوع پر تنبیہ فرماتے ہوئے حضرت شیخ نے کہا کہ بخاری میں ادب کا کافی ذخیرہ ہے اگر آدمی غور کرے۔ فرمایا کہ حضرت شیخ مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ فرمایا کرتے تھے کہ کسی شیعی نے کہا ہے کہ مسلمانوں کے پاس ادب کے تین کتابیں ہیں، قرآن کریم، صحیح بخاری، ہدایہ۔ فرماتے تھے کہ شیعی فاضل نے ٹھیک کہا ہے۔

☆فرمایا: حضرت شیخ مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ فرمایا کرتے تھے کہ مجھ سے ایک عالم نے پوچھا کہ آپ فتح القدیر جیسی کتاب لکھ سکتے ہیں، تو میں نے کہا: ہاں، پھر پوچھا کہ ہدایہ جیسی؟ تو میں نے کہا: چھ سطر بھی نہیں۔

☆فرمایا: ولیمہ خوشی کے موقع پر طعام کو کہتے ہیں۔ اور وضیمہ مصیبت وغمی کے موقع پر بنائے گئے طعام کو کہتے ہیں، عجالہ وہ طعام جو جلدی سے تیار کیا گیا ہو اور نزل باہر سے آئے ہوئے مہمان کے لئے بنائے گئے طعام کو کہتے ہیں ،اس طرح طعام کے کل پندرہ نام ہیں۔ تفصیلات فقہ اللغۃ للثعالبی میں دیکھئے۔

☆فرمایا: حضرت ابن عباسؓ کے آثار کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کبھی ایسی چیز پر سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اطلاق فرماتے ہیں، جس کے لئے سنت میں کوئی اصل ہو، اگر چہ اس کے ساتھ آپؓ کی اپنی رائے کا امتزاج بھی ہو، اس لئے صحابی جب کہے کہ یہ سنت رسول ہے تو اس میں بڑے احتیاط کی ضرورت ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ اصل سنت کیا ہے اور صحابی کی اپنی رائے کا اس میں کتنا دخل ہے؟

قلت: وهذا من دأب شيخنا العلام يسمح بمثل هذه الدرر والغرر ويجود بمثل هذه الفوائد والفرائد كانها الحذف والحصى غير مبال بها وكانه يتكلم بما يعرفه الناس كافة

☆فرمایا: حدیث میں تقدیم عشاء علی العشاء کا جو حکم ہے تو وہ صحابہ جیسے فاقہ کشوں کے لئے ہے اور ہم جو روزانہ چار مرتبہ کھاتے ہیں، ہمارے لیے اس کی گنجائش نہیں۔

☆فرمایا: حدیث ابن عباس بخاری [ص:۱۰۶] [قرء النبی ﷺ فیما امر وسکت فیما امر وما کان ربک نسیا۔ حجیت حدیث کے بارے میں بہت عمدہ اور قوی دلیل ہے۔

☆فرمایا: انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے اجساد تو بنص صحیح قبور میں محفوظ ہوتے ہیں، یہ ان کے لئے قانون کلی ہے، انبیاء کے علاوہ دوسرے صلحاء کے اجساد بھی عموماً محفوظ ہوتے ہیں، چنانچہ بارہا مشاہدہ ہوا ہے اور یہ بطور اکرام و اعزاز کے ہوتا ہے۔ اس بارے میں تاریخی وقائع لا تعد ولا تحصی ہیں ولا یمکن ان فرد۔ وفاء الوفاء للسمہودی وغیرہ میں ہے کہ حضرت عمرؓ کا پاؤں ایک سو سال کے بعد ایک موقع پر محفوظ دیکھا گیا ہے اور جنت البقیع میں موتی کے تدفین کے مواقع پر عموماً یہ مشاہدہ ہوتا ہے اور سنا ہے کہ حضرت مولانا بدر عالمؒ کی ٹانگ بھی چھ مہینے کے بعد سالم پائی گئی۔

☆فرمایا: عرب کو ''امیین'' کہنے کی وجہ بعض نے یہ لکھی ہے کہ منسوب ہے ام القری کی طرف مگر صحیح توجیہ وہی ہے جو کہ حدیث میں وارد ہے کہ نحن امة امية لا نكتب ولا نحسب یعنی عرب عام طور پر حساب و کتاب سے نابلد تھے، بخلاف یہود و نصاریٰ وغیرہ اقوام کے کہ وہ ان چیزوں میں ماہر تھے۔

☆فرمایا: فطرۃ سے مراد انسان کی وہ فطری اور خلقی صلاحیت اور استعداد ہے جس کی بنا پر وہ حق کو قبول کر سکے،

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان یہودی اور نصرانی ہونے کے باوجود بھی مکلف ہوتا ہے اور تکلیف اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں قبول اسلام کی استعداد موجود ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ انسان کی استعداد کے اعتبار سے تین مراتب ہیں: ایک تو یہ کہ ولادت کے بعد وہ اس صحیح توحید اور اسلام کے عقیدہ پر پیدا ہوتا ہے، جس کی تلقین اس کو عالم ذر میں کی گئی تھی اور اس حالت میں اس میں قبول حق کی استعداد قریبہ موجود ہوتی ہے، پھر آگے ماحول کے اعتبار سے اور غلط تربیت کی وجہ سے بعض اوقات غلط راستہ اختیار کر لیتا ہے اور اس وقت بھی اس میں قبول حق کی استعداد موجود ہوتی ہے، مگر بعید اور کمزور۔ اور تیسرا مرتبہ ختم علی القلب اور طبع علی القلب کا ہے کہ انسان اپنی ضد اور تعنت کی وجہ سے اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اپنی استعداد اور صلاحیت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے [اس مرتبہ میں بھی استعداد بالکلیہ مسلوب نہیں ہوتی کیونکہ تکلیف اس وقت بھی بحال ہوتی ہے مگر ضعف اور شدتِ بُعد کی وجہ سے کالعدم قرار دی جاتی ہے۔]

☆ فرمایا: وضع جریدہ کے متعلق حدیث وارد ہے اور اس پر بخاریؒ نے جو باب باندھا ہے اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بخاریؒ اس فعل کو عام سنت بتلانا چاہتے ہیں۔ مگر آگے فسطاط کے بنانے کی اثر کو لا کر شبہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ فعل بے فائدہ ہے۔ اس لئے شراح کو بخاری کی مراد سمجھنے میں دقت پیش آئی اور کوئی واضح مقصد اس کا متعین نہیں ہوا۔ [شاید بخاری جریدہ اور غیر جریدہ میں فرق کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ وضع جریدہ تو مسنون اور اس کے علاوہ غیر مفید ہے۔] بہر حال اصلی بات یہ ہے کہ وضع جریدہ عام سنت نہیں، یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی، اس لئے کہ جس مقصد کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جریدہ رکھا تھا اس کا حاصل ہونا امت کے لئے ناممکن الحصول ہے کیونکہ جریدہ رکھنے والے کے لئے ضروری ہے کہ اس کو یقینی علم ہو کہ صاحب قبر معذب ہے اور پھر خود بھی وہ اس مقام کا آدمی ہو کہ اس کے دست کی برکت سے تخفیف فی العذاب متوقع ہو اور ظاہر بات ہے کہ اگر یہ عام سنت ہوتی تو سارے صحابہ اس پر عمل کرتے، سوائے بریدہؓ کے تمام صحابہ کا تعامل اس پر دلیل ہے کہ یہ عام سنت تشریعی نہیں تھی، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کے ساتھ خاص تھی۔

☆ فرمایا: قاتل عمد اور قاتل نفس کے متعلق خلود فی النار کے وعید تغلیظاً وارد ہے، ورنہ یہ دونوں کبائر میں سے ہیں جس سے آدمی کافر نہیں ہوتا اور نص شاہد ہے کہ شرک کے علاوہ تمام گناہ قابل عفو ہیں، اصل بات یہ ہے کہ اعمال صالحہ ہوں یا سیئہ، ان کے متعلق احادیث میں جو سزا و جزا اور وعد وعید کا ذکر ہے وہ اس خاص عمل کا اصل مزاج اور خاصیت ہے، لیکن یہ عمل جب دوسرے اعمال کے ساتھ مل جاتا ہے تو اپنی خاصیت پر باقی نہیں رہتا بلکہ اس کے مزاج اور اثر میں تبدیلی آجاتی ہے، جیسا کہ کتب طب میں مفردات کے خواص مذکور ہیں، لیکن جب ان کو آپس میں ملا کر مرکب تیار کیا جائے، تو پھر اس کا اثر بالکل علیحدہ ہو جاتا ہے، یہ عمدہ اور سہل تقریر ہے اس قسم کے مواقع کے حل

کرنے کیلئے۔

☆ فرمایا: مرنے کے بعد بعثت تک برزخ میں جو عبوری اور درمیانی دور ہے، اس کے لئے ''عذاب القبر'' کا عنوان ہے، مرنے کے بعد انسان جس حالت میں ہو، جہاں بھی ہو، ذرۂ خاک ہو، قطرۂ خون یا رماد ہو، بر میں ہو یا بحر میں ہو، وہ اللہ تعالیٰ کے ملک اور علم اور قدرت سے باہر نہیں، اس لئے اس کو راحت یا عذاب دینا آسان ہے، عذاب قبر کے مسئلہ پر اہل السنۃ اور اہل الاعتزال کا اجماع ہے سوائے بشر مریسی اور ذوارۃ بن عمرو کے، کہ صرف یہ دونوں اس کے منکر ہیں۔ قرآنی آیات تقریباً اس بارے میں قطعی الدلالت ہیں اور احادیث متواتر ہیں۔ عذاب قبر کا منکر کافر ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اگر اصل عذاب سے مطلقاً انکار کرے تو کفر میں شک نہیں اور تفصیل وکیفیت میں اختلاف ہو تو کفر نہیں ہوگا۔ باقی معصیت اور طاعت جسم وروح دونوں کے اشتراک سے ہوتے ہیں اس لئے عذاب اور راحت بھی دونوں کو ہوگا اور دونوں کے درمیان موت کے بعد بھی رابطہ قائم ہوتا ہے، موت سے انفصال تو ہو جاتا ہے مگر انقطاع کلیۃً نہیں ہوتا۔ علما نے روح کے جسم کے ساتھ تعلق کے پانچ اقسام لکھے ہیں: ایک بحالت جنین جو سب سے کمزور تعلق ہے، دوسری ولادت کے بعد، پھر یہ دو قسم کا ہے: ایک بحالت یقظہ دوسرا بحالت نوم۔ چوتھی قسم برزخ میں، اور پانچویں بعثت کے بعد حشر میں اور یہ سب سے اقویٰ ہے، ابن القیمؒ نے کتاب الروح اور ہمارے ملا علی قاریؒ نے شرح فقہ اکبر میں اس کی تفصیل لکھی ہے۔

☆ فرمایا: انفاق اور اسراف کے درمیان حد یہ ہے کہ راہ حق میں صرف ہو تو انفاق ہے اگرچہ سب کچھ صرف کردے اور اگر غیر حق میں ہو تو اسراف ہے، اگرچہ شئی قلیل ہو۔

☆ فرمایا: حدیث میں سات آدمیوں کا ذکر ہے، جن کو سایہ عرش میں جگہ ملے گی، سات میں حصر مقصود نہیں۔ ان کے بغیر اوروں کا بھی روایات میں ذکر آیا ہے، اور علما نے ان پر اور بھی بڑھا دیئے، حافظ ابن حجرؒ اور علامہ سیوطیؒ نے اور بھی کئی لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ عدد میں مفہوم مخالف کا اعتبار نہیں ہوا کرتا حتی کہ قائلین بالمفہوم کے نزدیک بھی۔

☆ فرمایا: بخاریؒ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ید علیا سے مراد 'منفقہ' ہے اور سفلی سے آخذہ، مگر موطا وغیرہ کی روایات میں آیا ہے کہ اخذۃ متعففۃ (غیر سائلہ) علیا ہے اور سائلہ سفلی ہے، جمع یوں ہو سکتا ہے کہ علیا کے دو درجے ہیں: ایک تو منفقہ کا ہے اور دوسرا اخذہ متعففہ کا، واللہ تعالیٰ اعلم۔

☆ فرمایا: اقط، قرط (پشتو) کو کہتے ہیں، نہ کہ پنیر کو جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے۔

☆ فرمایا: یہ میری قطعی رائے ہے کہ جدہ سے احرام نہیں باندھا جا سکتا خلافاً للمفتی محمد شفیع۔ ہماری اس پر اٹھارہ گھنٹے بحث ہوئی لیکن مفتی صاحب کے دلائل سے اطمینان نہ ہوا، وہ دلائل کمزور ہیں۔ درحقیقت وہ اس شخص کے

بارے میں ہیں جس کا میقات مجہول ہو اور محاذات میقات بھی نامعلوم ہو ایسا شخص حرم سے دو مرحلہ کے فاصلے سے احرام باندھے گا۔ اس مسئلہ میں میں، مفتی ولی حسن صاحب اور مفتی رشید احمد متفق ہیں۔

☆ فرمایا: ذات عرق کی توقیت کے بارے میں علما حیران ہیں کہ اس کی توقیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کی یا حضرت عمر فاروقؓ نے کی ہے، غزالی، نووی اور ابن حجرؒ سب حیران ہیں اور ہر ایک نے دو قول پیش کیے ہیں، ایک کتاب میں ایک قول لکھا دوسری میں دوسرا قول لکھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اس کی حقیقت واضح فرمائی ہے وہ یہ کہ توقیت ذات عرق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمائی تھی، اہل عراق کے لئے۔ رہا یہ سوال کہ عراق تو فتح نہیں ہوا تھا۔ تو یہ سوال وارد نہیں ہوتا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں مصر و شام بھی فتح نہیں ہوئے تھے، حالانکہ ان کے لئے میقات متعین فرمایا، حقیقت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی معلوم تھا اور قرآن کریم کی آیت یاتوک رجالا علی کل ضامر یاتین من کل فج عمیق سے بھی معلوم ہو رہا تھا کہ یہ علاقے فتح ہوں گے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کے لئے میقات کا تعین فرمایا تھا، مگر عراق کے بعض حصوں کے لوگ جو نجد کے ساتھ ملحق ہیں ان کو اشکال ہوا کہ چونکہ ہم نجد کے تابع ہیں اس لئے ہمارا میقات قرن المنازل ہونا چاہیے، لیکن وہ ان لوگوں سے بہت دور تھا۔ اس اشکال کو انہوں نے حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کیا تو آپ نے محاذات کا اعتبار کرتے ہوئے ان لوگوں کو ذات عرق سے احرام باندھنے کا فتویٰ دیا، یعنی ذات عرق کی توقیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کی تھی، مگر اس خاص خطہ کے لوگوں کے لئے اس کی تعیین حضرت عمرؓ نے کی۔

☆ فرمایا: چھ گز کے فاصلے پر حطیم کعبہ کا جز ہے باقی نہیں، علما نے ایسا ہی لکھا ہے البتہ نماز میں اس کی طرف استقبال ناکافی ہے اس لئے کہ اس کی جزئیت خبر واحد سے ثابت ہے جو کہ مظنون ہے لہٰذا اس سے فرض مقطوع ادا نہیں ہوسکتا۔

☆ فرمایا: امام ابو یوسفؒ کے پاس مرض الموت کی حالت میں ایک شخص آیا تو آپؒ نے پوچھا کہ رمی کے بعد وقوف مسنون ہے یا نہیں، اس نے جواب دیا کہ مسنون ہے۔ آپ نے پوچھا کہ مطلقاً؟ کہا: ہاں۔ آپ نے فرمایا کہ غلط۔ اس نے پھر کہا کہ غیر مسنون ہے تو آپ نے فرمایا کہ غلط، پھر مسئلہ بتلایا کہ جس رمی کے بعد دعا ہو تو اس کے بعد وقوف مسنون ہے اگر دعا نہیں تو وقوف بھی مسنون نہیں، وہ شخص دروازہ تک پہنچا ہی تھا کہ آپ کا وصال ہو گیا۔

اسی طرح حضرت عمرؓ کے پاس شہادت سے چند لمحے پہلے ایک اعرابی عیادت کے لئے آیا جب واپس ہونے لگا تو آپؓ نے واپس بلایا اور فرمایا کہ ارفع ازارک فانہ اتقی لربک و القی لثوبک یہ شان ہوتی ہے اہل علم اور اہل دین حضرات کی کہ ہر وقت دین کے لئے سوچتے ہیں۔

☆ فرمایا: مدینہ منورہ کو چھوڑ کر دوسرے بلاد میں جانے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اظہار ناراضگی فرمایا ہے، اور یہ اس صورت میں کہ جب اسلام اکناف ارض میں پھیلے گا اور عراق وشام کے متمدن علاقے زیرنگین آئیں گے چونکہ ان علاقوں کی بود و باش امیرانہ تھی اور زندگی راحت وآرام کی تھی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے سے ہدایت فرمائی کہ تنعم اور تعیش کی خاطر مدینہ منورہ کو لوگ چھوڑ جائیں گے۔ لیکن اگر وہ صحیح علم رکھتے تو ان کے لئے مدینہ بہتر تھا۔ اگرچہ وہاں ضیق معاش اور تنگی ہے اور دیگر بلاد میں آسائشیں میسر ہیں، رہا یہ کہ جہاد اور اشاعت اسلام کے لئے باہر جانا تو اس حدیث کے دائرہ سے باہر ہے خود ارشاد نبوی ہے: لغدوة او روحة في سبيل الله خير من الدنيا وما فيها آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اور دیگر صحابہؓ نے مدینہ سے باہر جا کر اسفار کیے۔

پہلے اہل حجاز کے ہاں مشہور تھا کہ جس کو دین مطلوب ہو تو وہ مدینہ میں رہے اور جس کو خالص دنیا مطلوب ہو وہ جدہ میں رہے اور جس کو دین و دنیا دونوں مطلوب ہوں وہ مکہ معظمہ میں رہے، حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ آج کل تو مدینہ میں بھی اتنی تجارت ہوتی ہے کہ آدمی حیران ہو جاتا ہے، آج تو مدینہ میں بھی دین و دنیا دونوں میسر ہیں۔

☆ فرمایا: روضة من رياض الجنة کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اخلاص کے ساتھ اس ٹکڑا میں پہنچ گیا، مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل فرمادے گا۔ کیونکہ جنت میں جب آدمی داخل ہو جائے تو پھر اس کو نکالا نہیں جائے گا۔ یہ حضرت شیخ کی توجیہ ہے [اور نفیس بھی ہے]

☆ فرمایا: الصيام جنة (روزہ ڈھال ہے) ڈھال چونکہ آدمی کے بائیں ہاتھ میں ہوتا ہے اور اس سے بچاؤ کا انتظام کرتا ہے، تو روزہ بھی انسان کے لئے قبر میں عذاب سے نجات کا باعث بنے گا۔ چنانچہ صحیح ابن حبان میں حدیث موجود ہے کہ قبر میں انسان جب رکھا جائے گا تو دائیں جانب سے نماز عذاب کو روکے گی اور بائیں جانب سے روزہ عذاب کو روکے گا۔

حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ ہمارے شیخ [حضرت کشمیریؒ] رمضان شریف میں تلاوت فرمارہے تھے، ان کی عادت تھی کہ بہت غور و خوض سے تلاوت فرمایا کرتے تھے، بسا اوقات فجر کی نماز کے بعد ایک پارہ شروع کیا تو عصر تک ختم ہو جاتا تھا۔ بہر حال آپؒ تلاوت فرمارہے تھے، میں قریب بیٹھا کام کر رہا تھا۔ آپؒ نے فرمایا کہ سامنے الماری میں کتاب [فتح الباری، ج:۳] ہے ایک دو کو چھوڑ کر تیسری لے آؤ۔ میں نے اٹھالی، فرمایا کہ کتاب الجنائز میں دیکھیں کہ یہ حدیث [کہ قبر میں نماز دائیں اور روزہ بائیں طرف سے عذاب کو روکیں گے] مسند احمد کے حوالہ سے ہے یا صحیح ابن حبان کے حوالہ سے۔ [سبحان اللہ]

شربت الحب كأسا بعد كأس

فما نفد الشراب ومارویت

☆ فرمایا: 'ایلۃ' وہی شہر ہے جسے آج کل 'عقبہ' کہتے ہیں، جس پر حال میں اسرائیل نے قبضہ کیا ہے۔ ایک 'ابلۃ' ہے، وہ بصرہ کے قریب واقع ہے۔ دونوں کی طرف رواۃ منسوب ہیں۔ الایلی بھی ہیں اور الابلی بھی۔

☆ اپنے عزیز صاحب زادے محمد صاحب کو سبق پڑھاتے ہوئے فرمایا کہ بقرۃ، لوذۃ، تمرۃ، دجاجۃ، حمامۃ میں تاء وحدت کے لئے ہے تانیث کے لئے نہیں۔

☆ حضرت شیخ نے اپنے استاذ امام العصر حضرت شاہ صاحب کشمیری کا یہ مقولہ نقل فرمایا کہ فلاسفہ اور حکما کے علوم پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ جتنا آپ ان میں غور کریں گے وہ سمٹتے چلے جائیں گے اور حضرات انبیا کے علوم مختصر ہوا کرتے ہیں، لیکن ان میں جتنا غور کیا جائے وہ پھیلتے چلے جائیں گے۔

☆ حضرت نے فرمایا کہ قرآن حکیم کے بعض بدیہیات بھی اتنی مشکل ہوتی ہیں کہ میں ان کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔ ان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ مختصری آیت ہے، جس میں بظاہر کوئی اشکال نہیں لیکن مختلف تفاسیر کے مطالعہ اور کافی غور کے بعد بھی اطمینان نہیں ہوا۔ البتہ تفسیر مظہری میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے کچھ اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

☆ مدرسہ عربیہ اسلامیہ کے دارالتصنیف میں احقر اور برادر مکرم مولانا محمد حبیب اللہ صاحب مختار کو مخاطب فرماتے ہوئے کہا کہ مدینہ منورہ میں مجمع البحار کا ایک نسخہ ملا، قیمت تیس ریال تھی، میرے پاس رقم نا کافی تھی، صرف خرچہ کی رقم تھی، پریشان تھا، چھوڑنا بھی جی نہیں چاہتا تھا اس لئے کہ ہندوستان میں اس کی قیمت دوسو روپیہ تھی، اس حالت میں ایک شخص ملا، اس نے کہا کہ فلاں صاحب نے یہ دس پونڈ آپ کے لئے دیئے ہیں جس کے سو ریال بنتے تھے، اس طرح یہ کتاب میں نے لے لی۔ فرمایا: اس طرح محنت سے ہم نے یہ کتابیں جمع کی ہیں اور فرمایا کہ یہ بائیس سال پہلے کا واقعہ ہے جب کہ میں وہاں اس وقت کسی سے متعارف بھی نہیں تھا۔

☆ فرمایا: حضرت مولانا شاہ عطاء اللہ بخاریؒ نے حضرت شاہ کشمیری صاحبؒ کے متعلق فرمایا کہ ''صحابہ کا قافلہ آگے بڑھا یہ پیچھے رہ گئے'' اور فرمایا کہ حضرت شاہ انور شاہ صاحبؒ اگر گناہ کرنا چاہیں تو کر نہیں سکتے، آپ کو گناہ کرنا آتا ہی نہیں۔

☆ فرمایا: حضرت مولانا تھانوی صاحبؒ جب کہ وہ حکیم الامۃ بن چکے تھے علمی مسائل میں حضرت شاہ صاحبؒ سے مراجعت فرمایا کرتے تھے جب کہ حضرت شاہ صاحب اس وقت نوجوان اور مولوی انور شاہ تھے۔ حضرت تھانویؒ نے ایک خط میں استدعا کرتے ہوئے لکھا کہ آپ اس مسئلہ میں روایت یا درایت کے لحاظ سے جو فیصلہ ہو کیجئے۔

☆ فرمایا: حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے تھے کہ دس جلدوں کے مطالعہ کے بعد صرف ایک نیا مسئلہ سامنے آجاتا ہے تو خوشی ہوتی ہے کہ محنت ضائع نہیں ہوئی۔

☆ حضرت مولانا غلام نبی کاموئیؒ کا مقولہ حضرت الشیخ نے نقل فرمایا کہ جتنے بڑے بڑے علما ہم نے دیکھے ہیں اگر چاہیں تو ہم ان جیسے عالم بن سکتے ہیں، الا انور شاہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

یہ چند چیدہ افادات تھے جو حضرت الاستاذ کے ہاتھ سے لکھے ہوئے ایک رجسٹر سے نقل کیے گئے، اس رجسٹر میں اور بھی جواہر پارے موجود ہیں لیکن ان میں سے زیادہ تر کا تعلق بخاری شریف کے متن کے حل سے ہے، ان شاء اللہ جب حضرت الاستاذ کے درسی افادات کی ترتیب وتدوین کی جائے گی تو اس عجالہ کو بھی مکمل پیش کیا جائے گا۔

فتنہ انکار حدیث کی تردید میں مولانا اورکزئی کا منہج واسلوب

محمد طفیل کوہاٹی

برصغیر میں انکار حدیث کا فتنہ چند صدیوں سے منظر عام پر آیا ہے۔ اس کی بعض صورتیں ایسے صریح انکار حدیث

پر مبنی ہیں جس کے حامل کا اسلام سے کوئی تعلق باقی نہیں رہ پاتا۔ اس فتنہ کے بنیادی اسباب میں دین سے لاعلمی، غیر مسلم تہذیب سے مرعوبیت اور سیاسی وفکری محکومی سرفہرست ہیں۔ یہ پڑھے لکھے تجدد پسند حضرات کا فتنہ ہے، جو علوم اسلامیہ سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے اسلام اور اس کے اوامر ونواہی سے جذباتی عقیدت رکھتے ہیں، نہ ان کا جذبہ ایمانی کوئی قابل رشک ہوتا ہے۔ برصغیر میں مغرب کی فکری بالادستی اس فتنہ کا بنیادی محرک رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں آٹھ سو سال اسلامی حکومت رہنے کے باوجود انکار حدیث کی ابتدا اس دور میں ہوئی جو انگریز کی غلامی کا دور ہے۔ برصغیر میں اس فتنہ کی ابتدا سرسید احمد خان نے کی جو مسلمانان برصغیر کو انگریز کی محکومیت اور فکری مرعوبیت تسلیم کرانے والے پہلے نمایاں فرد تھے۔ چند دہائیاں قبل فتنہ انکار حدیث کا مرکزی کردار جس شخص نے ادا کیا، وہ غلام احمد پرویز تھا جو انگریزی حکومت کا ملازم اور فکری طور پر ان کی علمی برتری کا قائل تھا۔ موجودہ دور میں بھی انکارِ حدیث کی زمامِ کار جن کے ہاتھوں میں ہے، ان میں اکثر انگریزی علوم وفنون کے پروردہ ہیں، ان کی ذہنی ساخت میں یورپ کی علمی رفعت رچی ہوئی ہے۔

صدرِ اسلام میں یہ فتنہ معتزلہ میں شروع ہوا اور اس وقت اس کی وجہ یونانی فلسفہ سے مرعوبیت تھی۔ محدثین کی زبردست کوششوں سے اس فتنہ کا استیصال ہوا۔ اس کے بعد تیرہویں صدی ہجری میں یورپ کی یلغار کے بعد انکارِ حدیث کے جراثیم نے دوبارہ جنم لیا۔ اس سلسلہ میں مستشرقین کی کوششیں بھی شامل ہیں اور اکثر منکرین حدیث انہی کے افکار کے خوشہ چین ہیں۔

برصغیر میں فتنہ انکار حدیث کی تاریخ مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم یوں بیان کرتے ہیں:

''یہ آواز ہندوستان میں سب سے پہلے سرسید احمد خان اور ان کے رفیق مولوی چراغ علی نے بلند کی، لیکن انہوں نے انکار حدیث کے نظریہ کو علی الاعلان اور بوضاحت پیش کرنے کی بجائے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جہاں کوئی حدیث اپنے مدعا کے خلاف نظر آئی، اس کی صحت سے انکار کر دیا خواہ اس کی سند کتنی ہی قوی کیوں نہ ہو۔ اور ساتھ ہی کہیں کہیں اس بات کا بھی اظہار کیا جاتا رہا کہ یہ احادیث موجودہ دور میں حجت نہیں ہونی چاہئیں اور اس کے ساتھ بعض مقامات پر مفید مطلب احادیث سے استدلال بھی کیا جاتا رہا۔ اسی ذریعہ سے تجارتی سود کو حلال کیا گیا، معجزات کا انکار کیا گیا، پردہ کا انکار کیا گیا اور بہت سے مغربی نظریات کو سند جواز دی گئی۔ ان کے بعد نظریہ انکار حدیث میں اور ترقی ہوئی اور یہ نظریہ کسی قدر منظم طور پر عبداللہ چکڑالوی کی قیادت میں آگے بڑھا اور یہ ایک فرقہ کا بانی تھا، جو اپنے آپ کو اہل قرآن کہتا تھا، جیراج پوری نے اہل قرآن سے ہٹ کر اس نظریہ کو اور آگے بڑھایا، یہاں تک کہ پرویز غلام احمد نے اس فتنہ کی باگ ڈور سنبھالی اور اسے

منظم نظریہ اور مکتب فکر کی شکل دے دی۔ نوجوانوں کے لئے اس کی تحریر میں بڑی کشش تھی، اس لئے اس کے زمانہ میں یہ فتنہ سب سے زیادہ پھیلا۔'' (درس ترمذی، ج:۱، ص:۲۶)

ہمارے خطے خصوصاً ہنگو میں منکرین حدیث کا فتنہ جڑیں پکڑ رہا تھا، اور غلام احمد پرویز کا طلوع اسلام یہاں کے سکولز، کالجز میں بڑی دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا۔ حضرت الاستاذ نے اس فتنے کی نہ صرف تقریر و مناظرہ سے سرکوبی کی، بلکہ اس کے خلاف علمی فتاویٰ و مکاتیب بھی تحریر فرمائے، ذیل میں آپ کی کاوشوں کے اسلوب و منہج کا تعارفی جائزہ پیش خدمت ہے:

اسلام کے خلاف دو بڑے فتنے:

فتنہ انکار حدیث کا علم بردار سب سے منظم گروہ پرویزیت کا تعارف اور اس کے بارے علمائے امت کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' دین اسلام خداوند متعال کا سچا دین ہے اور ان کی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت آقائے نامدار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یہ نعمت انسانیت کو ملی اور آپ ہی نے اپنے کردار و گفتار کے ذریعہ اس کی تفسیر کی، مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق یہ دین تا قرب قیامت اپنی جامعیت اور کمال کے ساتھ باقی رہے گا۔ اعداء اسلام نے اسے ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر مشیت ایزدی کے سامنے ان کا ہر حربہ بے اثر ثابت ہوا۔ برصغیر میں دین اسلام کے خلاف متعدد تحریکیں اٹھیں ان میں خطرناک تحریکیں وہ رہیں جو دین کا نام لے کر دین کے خلاف مصروف پیکار رہیں، اس قسم کی تحریکوں میں زیادہ شہرت ماضی قریب کے دو فتنوں کو حاصل ہوئی ایک قادیانیت دوسرا پرویزیت، قادیانیوں نے ختم نبوت کے بنیادی عقیدہ پر ضرب لگا کر دین حق کی پوری عمارت کو تہہ و بالا کرنے کی کوشش کی اور پرویزیوں نے نبوت اور رسالت کی حقیقت کا انکار کر کے اس عمارت کو مسمار کرنا چاہا، علماء حق جو دین کے محافظ ہیں ہر دور میں اپنا فریضہ ادا کرتے ہوئے ان فتنوں کے خلاف سینہ سپر رہے۔ اپنے اس اہم ترین فریضہ کی ادائیگی کے سلسلہ میں انہیں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں بلکہ دار و رسن کو چومنے تک بار ہا نوبت پہنچی اور اسلامی تاریخ کا شاید سب سے بڑھ کر روشن باب یہی ہے، فتنہ قادیانیت کی تدفین کی طرح علماء حق نے فتنہ پرویزیت کے استیصال کا بھی انتظام فرمایا، تاکہ عامۃ المسلمین ان ایمان کے ڈاکوؤں سے محفوظ رہیں الحمدللہ تعالیٰ انہیں اپنے مقصد میں کافی حد تک کامیابی نصیب ہوئی اور یہ فتنہ فرو ہوا تاہم علمائے امت کے پرویز کے بارے میں واضح اور متفقہ فتویٰ کفر کے باوجود بھی انہوں نے خلاف اسلام کوششیں جاری رکھیں چنانچہ ضرورت محسوس ہوئی کہ علماء امت کے متفقہ فتویٰ کو ایک بار پھر سامنے لایا جائے'' لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ''۔ (مولانا محمد امین

اورکزئی، پرویزی افکار کا شرعی فیصلہ، ص:۱، غیر مطبوع)

تکفیر کی نزاکت اور اہل علم کی ذمہ داری: چند اہم اصول

کسی کی تکفیر انتہائی مشکل اور نازک امر ہے، اس میں ذرا بھر تساہل خود مفتی کے متاع ایمان کے لیے عظیم خطرہ ہے۔ دین دشمنوں کی تکفیر پر عموماً بعض طبقات اہل علم کو مطعون بھی کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اہل علم کا مشغلہ ہی یہی ہے، اس لیے یہ کام انتہائی ناگوار اور مشکل ہے، لیکن بایں ہمہ اس اہم ذمہ داری کو ادا کیے بغیر بھی کوئی چارہ نہیں، کیونکہ اگر علمائے امت حق و باطل میں امتیاز کرنا چھوڑ دیں تو حق و باطل کا التباس اس سے بھی زیادہ ناگوار امر ہے، جس کی شناعت محتاج بیان نہیں۔ حضرت الاستاذؒ نے گمراہ فرق کی تکفیر اور اس حوالے سے علما اور حکومت کے دائرۂ کار کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے، ان حقائق پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''۱......کسی مدعیٔ اسلام پر کفر کا فتویٰ احتیاط کا متقاضی ہے اس لئے خدا ترس علمانے اس ناگوار فریضہ کی ادائیگی کے وقت ہمیشہ احتیاط کے دامن کو پوری قوت کے ساتھ تھامے رکھا۔

۲...... مسلمان بننے اور رہنے کے لئے صرف عقائد اسلامیہ کا اعتقاد ہی کافی نہیں بلکہ غیر اسلامی عقائد سے براءۃ اور ان کے بطلان کا عقیدہ بھی ضروری ہے، سلب و ایجاب اور نفی و اثبات دونوں لائن ساتھ ہی چلتے ہیں، اسلام کے دین فطرت ہونے کا تقاضا تب پورا ہو سکتا ہے کہ حق کو حق ماننے کے ساتھ باطل کو باطل مانا جائے، جیسا کہ اسلام کو کفر اور مسلم کو کافر کہنا اور سمجھنا بدترین جرم اور بلاشبہ کفر ہے اسی طرح کفر کو اسلام سمجھنا اور کافر کو مسلم سمجھنا بھی بدترین جرم اور یقینی کفر ہے۔

۳......عام طور پر علما کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کا مشغلہ ہی فتویٰ تکفیر ہے اور لوگوں کو کافر بنانا ہے، جاننا چاہیے کہ علمائے دین کا ہمہ وقتی وظیفہ لوگوں کو مسلمان بنانا اور اسلام پر قائم رکھنا ہے، وہ اپنے فتویٰ سے کسی کو کافر بناتے نہیں بلکہ جو کافر ہو گیا ہے اسے لوگوں کو بتلاتے ہیں کہ یہ کافر ہے، کیا چور اور ڈاکو کی نشاندہی کرنا کسی بھی قانون کے رو سے جرم قرار دیا جا سکتا ہے یا کسی معاشرہ میں اس کو معیوب سمجھا جا سکتا ہے اگر چور، ڈاکو کی نشاندہی ملک وملت کے ہر وفادار کا فریضہ ہے تو غدار دین وملت کی نشاندہی کرنا اس سے بڑھ کر فریضہ ہے۔

۴......غلطی اور لغزش سے کوئی بشر مستثنیٰ نہیں، مفتیان دین بھی اس کلیہ سے بالاتر نہیں ہیں مگر بعض افراد کی شخصی اور وقتی طور پر غلطی کرنے پر فتویٰ کا دروازہ تو بند نہیں کیا جا سکتا اور نہ بعض غیر محتاط حلقوں کے فتویٰ نویسی میں لغزش سے فقہائے امت کے تمام فتاویٰ پر اعتماد ختم ہو سکتا ہے۔ ایسا سمجھنے والا یقیناً خود فریبی کا شکار ہے اور پرلے درجے کی حماقت کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ آخر بعض ڈاکٹروں، جج حضرات، انجنیئر صاحبان کی غلطی کی وجہ سے یہ سارے شعبے ناقابل اعتماد بن گئے ہیں اور ان حضرات کی ہر رائی قابل رد ہے۔

۵..... صحیح اسلامی نظام حکومت ہو، تو اس قسم کے ملحدوں کے بارے میں صرف فتویٰ کفر دینے سے شرعی تقاضے پورے نہیں ہوتے بلکہ فہمائش کے نتیجہ خیز نہ ہونے کی صورت میں ان کے گردن اڑانے کا حکم ہے فیصلہ نبوی پر حرف زنی کرنے والے کے لئے امت کے شہرۂ آفاق عادل حکمران سیدنا فاروق اعظمؓ نے یہی علاج تجویز ہی نہیں فرمایا بلکہ اس پر عمل بھی فرما چکے۔'' (مولانا محمد امین اورکزئی، پرویز انکار کا شرعی فیصلہ، ص: ۲، غیر مطبوع)

اس آخری شق میں کھلے لفظوں میں واضح کر دیا کہ اہل علم کی ذمہ داری محض باطل کی وضاحت ہے اور اس کی سرکوبی حکومت وقت کی ذمہ داری ہے، جس میں کوتاہی پر وہ عنداللہ جواب دہ ہوگی۔ ذیل میں ہم آپ کے اسلوب و منہج کو سمجھنے کے لیے پرویز کی صرف دس تحریرات پر بطور نمونہ آپ کے تنقیدی تبصرے نقل کرتے ہیں، یہ جملہ تبصرے پرویزیت سے متعلق آپ کے غیر مطبوع فتویٰ اور مضامین سے ماخوذ ہیں:

(۱)..... قرآن میں اللہ و رسول سے مراد

غلام احمد پرویز کا کہنا ہے:

''قرآن کریم میں جہاں بھی اللہ و رسول کا نام آیا ہے اس سے مراد مرکز، نظام حکومت اور مسلمانوں کا امام ہے۔''
[معارف القرآن از پرویز ج/ ۴۔ ص/ ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۳۰، ۶۳۱]

اس مؤقف کا ناقدانہ جائزہ لیتے ہوئے حضرت الاستاذ رقم طراز ہیں:

''یہ کھلی ہوئی تحریف اور الحاد ہے، لفظ ''اللہ'' اور ''رسول'' کی دلالت اپنے معنی پر ظاہر اور قطعی ہے، اسے چھوڑ کر دوسرے معنی مراد لینا الحاد و زندقہ کے سوا کچھ نہیں، لفظ کی دلالت اپنے معنی پر لغوی ہوتی ہے یا عرفی یا اصطلاحی ''اللہ'' اور ''رسول'' کی دلالت مرکز ملت پر ان تینوں میں سے کوئی بھی نہیں، قرآن کریم اس زبان میں نازل ہوا ہے جو عرب میں بولی سمجھی جاتی تھی، یہ زبان آج بھی زندہ ہے، اللہ و رسول کے الفاظ اس میں قدیم سے مستعمل چلے آتے ہیں، پرویز نے اللہ اور رسول کا جو مفہوم اپنے ذہن سے متعین کیا ہے اس کے ثبوت میں عربی نظم و نثر کا کوئی حوالہ پیش نہیں کیا جا سکتا اور نہ عہد رسالت سے لے کر آج تک کسی مسلمان نے اس کے یہ معنی سمجھے۔''

یہاں پرویز کے مزعومات کو رد کرنے کے لیے آپ نے منطقی اسلوب بیان میں عقل عام اور لغت عرب کو اپنے استدلال کی بنیاد بنایا ہے۔

(۲)..... اطاعت رسول سے مراد حکومت کی اطاعت

غلام احمد پرویز کا کہنا ہے:

''اللہ و رسول کی اطاعت سے مراد مرکزی حکومت کی اطاعت ہے، رسول کو قطعاً یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی سے

اپنی اطاعت کرائے، رسول کی حیثیت صرف اتنی ہے کہ وہ اس قانون کو انسانوں تک پہنچانے والا ہے۔ اسے حق نہیں کہ کسی پر اپنا حکم چلائے، بہ حیثیت مرکز ملت آپ کی اطاعت فرض تھی، آپ کی وفات کے بعد آپ کی اطاعت کا حکم نہیں۔" [معارف القرآن: ج/۴ ص/۶۱۲۔۶۳۱۔۶۸۶۔ اسلامی نظام: ص/۸۶۔۱۱۰۔۱۱۱۔۱۱۲۔ سلیم کے نام خط: ج/۲ ص/۳۴۔۱۰۳۔۱۲۰۔ مقام حدیث: ج/۱ ص/۱۹]

پرویز کے ان مزعومہ عقائد کے تار پود بکھیرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ان عبارات میں تحریف اور الحاد و زندقہ کی بدترین مثالیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اسلام کی اساس اولین ہے جس پر دین کی پوری عمارت قائم ہے۔ اس لئے قرآن کریم میں اس کا مکرر بتاکید حکم دیا گیا ہے اور اس سے انحراف کو کفر قرار دیا ارشاد ہے:

"قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ [ال عمران ۳۲]"

اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی طرح اطاعت رسول بھی دین کے مسلمات میں سے ہے، رسول پر ایمان لانے کا مطلب ہی اس کی اطاعت ہے اور یہ تمام امتوں کا مشترکہ اور متفقہ وظیفہ رہا ہے:

"وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ [نساء: ۶۴]"

اور رسول کی اطاعت کر کے ہی اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہو سکتی ہے:

"وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ [نساء: ۸۱]"

اور اتباع رسول ہی اللہ تعالیٰ کی محبت کا معیار ہے:

"وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا [نور: ۵۴]"

بلکہ مدار ایمان ہے:

"فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا [نساء: ۶۵]"

رسول کے فیصلہ کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں:

"وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ [احزاب: ۳۶]"

رسول کے حکم سے سرتابی عذاب الٰہی کو دعوت دینے کے مترادف ہے:

"فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ [النور: ۶۳]"

اور جہنم کو ٹھکانا بناتی ہے:

"وَمَنْ یُشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ م بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَہُ الْھُدٰی وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّہٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِہٖ جَھَنَّمَ ط وَسَآءَتْ مَصِیْرًا [نساء:۱۱۵]"۔

رسول کو صرف پیغام رسانی سمجھنا بھی قطعاً کفر ہے۔اس سے ان حیثیات کا انکار لازم آتا ہے جو قرآن نے نہایت صراحت کے ساتھ رسول کو دی ہیں۔قرآنی تصریحات کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وسلم معلم، مزکی، شارح کتاب الٰہی، امت کے تمام معاملات اور فیصلوں میں قاضی اور حکم اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تشریعی اختیارات کے حامل تھے اور امت کے لئے ہر شعبہ میں آپ کی زندگی قابل تقلید بلکہ واجب الاتباع نمونہ ہے :

"لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ ☐ [احزاب:۲۱]"۔

چونکہ پرویز کے ہاں قرآن مجید ہی دین کی واحد اصل ہے،اس لیے حضرت الاستاذ نے'اطاعت رسول' کی جملہ جہات کو براہ راست قرآن مجید سے بیان کیا ہے۔

۳......احکام غیر دائمی ہیں

غلام احمد پرویز کا کہنا ہے:

''قرآن کریم کے احکام وراثت، قرضہ، صدقہ خیرات، زکوۃ وغیرہ دائمی نہیں بلکہ عبوری دور کے لئے ہیں۔ ہر دور کی شریعت وہ ہے جسے اس عہد کا مرکز ملت اور مجلس شوری مرتب ومدون کرے، مرکز ملت کو اختیار ہے کہ وہ شریعت کے ہر باب میں حتی کہ عبادات مثلاً نماز وغیرہ میں رد و بدل کرے۔'' (نظام ربوبیت: ص ر ۲۵۔ ۱۹۷، ومقام حدیث: ج ر ا ص ر ۳۹۱۔ ۳۲۴، وج ر ۲ ص ر ۲۹۲۔ ۲۹۳، وقرآنی فیصلے: ص ر ۱۴۔۱۵، سلیم کے نام دوسرا خط: ج ر ا ص ر ۳۲)

پرویز کے اس گمراہ کن نظریے کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ بھی کفر صریح ہے قرآنی احکام کی ابدیت قطعی ہے ان کے وقتی ہونے کے متعلق تصریح تو کجا اشارہ تک موجود نہیں:"وَتَمَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ [انعام:۱۱۵]"۔

شرائع میں رد و بدل صرف نبی اللہ تعالی کے اذن سے کر سکتا ہے، یہ حق کسی مرکز ملت ومجلس شوری کو دینا در حقیقت ختم نبوت کا انکار ہے اور الحاد وزندقہ ہے۔قرآن کریم نے صاف صاف غیر مبہم الفاظ میں دین اسلام کے ابدی ہونے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری نبی ہونے کا اعلان فرمایا:

"اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا [مائدہ:۳]"۔

"وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ وَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ [آل عمران:۸۵]"

اس صاف اور صریح اعلان کے بعد کیسے اس کا امکان باقی رہ سکتا ہے کہ قرآنی احکام ملت اور عبوری دور کے لئے ہیں۔ پرویز کی کفریات میں اور کچھ بھی نہ ہوتا تو اس کی تکفیر کے لئے بس یہی بات ہی کافی ہے۔ یہ بھی واضح ہو کہ پرویز دراصل اشتراکی اور کیمونسٹ ذہن رکھتا ہے، قرآنی احکام مثلاً زکوۃ، صدقہ، وراثت وغیرہ سے کیمونزم کی جڑ کٹتی ہے اس لئے وہ ان احکام کو عبوری دور کے لئے ماننے پر مجبور ہو گیا، جبکہ قاعدہ ہے کہ برائی برائی کو جنم دیتی ہے۔ ایک کفر کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ہزار بار کافر بننا لازمی ہے۔''

اس تبصرے میں بھی آپ نے سابقہ منہج کو برقرار رکھا ہے، نیز پرویز کی انفعالی نفسیات کو اس کی بنیادی کجی کا سبب بتلایا ہے۔

۴......حدیث عجمی سازش ہے

غلام احمد پرویز کا کہنا ہے:

''حدیث عجمی سازش اور جھوٹ ہے جو مسلمانوں کا مذہب ہے، تعلیمات نبویہ کا استہزا ہے۔'' [مقام حدیث: ۱/۴۲۱، ۲/۱۲۵]

پرویزی دین کی اس اساس کا اپنے سابقہ منہج کے مطابق محاکمہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''حدیث کو عجمی سازش کہہ کر انکار سنت کرنا کفر محض ہے۔ نصوص قطعیہ اور امت کے غیر منقطع تعامل و توارث سے اس کا حجت ہونا ثابت ہے:

"وَاَنزَلنَآ اِلَيكَ الذِّكرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيهِم [النحل: ۴۴]" اور

"مَا قَطَعتُم مِّن لِّينَةٍ اَو تَرَكتُمُوهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُولِهَا فَبِاِذنِ اللّٰهِ ۔ [الحشر: ۵]" اور

"قَالَت مَن اَنبَاَكَ هٰذَا قَالَ نَبَّاَنِيَ العَلِيمُ الخَبِيرُ [التحریم: ۳]

وغیرہ نصوص سے سنت کے حجت اور وحی ہونے کا واضح ثبوت ملتا ہے، اس موضوع پر مبسوط اور مفصل کتابیں لکھی گئی ہیں، تفصیلات کے لئے ان کا مطالعہ کیا جائے۔ محققین امت کی تصریحات موجود ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی ایک سنت ثابتہ کا استخفاف کرنا، مذاق اڑانا سراسر کفر ہے۔''

۵......موجودہ اسلام حقیقی نہیں

غلام احمد پرویز کا کہنا ہے:

''آج جو اسلام دنیا میں رائج ہے وہ مجوسیت وغیرہ مذاہب باطلہ کی نظریات کا مجموعہ ہے، قرآنی دین سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔'' [سلیم کے نام پندرھواں خط: ص ۱/۵۱، ۲/۵۲، ۲/۲۷، ۲/۶۶۔ قرآنی فیصلے: ص ۱/۹۰۔ سلیم

کے نام اٹھارواں خط: ۲/ ۱۵۔ سلیم کے نام سینتیسواں خط: ۳/ ۱۹۷۔ ۱۹۹]

اس سطحی فکر کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ بھی صریح کفر ہے کیونکہ اس طرح اسلامی عقائد، اعمال، اخلاق الغرض پورے دین کو زمانہ جاہلیت کا دین بتلایا جارہا ہے، اور سارے مسلمانوں کو بشمول صحابہؓ، تابعینؒ، فقہاؒ، اولیاؒ سب کو کافر کہا جارہا ہے۔ ظاہر ہے اس سے بڑھ کر کفر کیا ہوگا۔ دین کے ہر شعبہ میں تحریف کا عقیدہ قرآن پاک کی تکذیب ہے۔ ارشاد ہے:

''انّا نحن نزّلنا الذّکر وانّا لہٗ لحٰفظون۔[الحجر: ۹]

یہ وعدۂ حفاظت صرف قرآن پاک کے الفاظ کے لئے نہیں بلکہ اس کے معانی ومفہومات کو بھی شامل ہے، اور پوری امت کو گمراہ قرار دینا بھی قرآن مجید کا انکار ہے:

''کنتم خیر امّۃ اخرجت للنّاس[آل عمران: ۱۱۰]''، ''وکذٰلک جعلنٰکم امّۃ وّسطا لّتکونوا شھدآء علی النّاس[البقرۃ ۱۴۳]'' وَمنْ یّشاقق الرّسول من م بعد ما تبیّن لہ الھدٰی ویتّبع غیر سبیل المؤمنین نولّہٖ ما تولّٰی ونصلہ جھنّم۔[النساء: ۱۱۵]

حضرت الاستاذ کے استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ دین کی حفاظت کا ذمہ تو اللہ تعالیٰ نے خود لیا ہے، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ پوری امت چودہ سو سال سے اس ''غلط موقف'' کی پیروی کررہی ہو جو صحابہ وتابعین سے مروی ہے، اس کا لازمی نتیجہ تو یہ ہے کہ خود صحابہ کرام یا ان سے نقل کرنے والے تابعین بھی معاذ اللہ ''اسلام'' کی جگہ ''مجوسیت'' کی تبلیغ وتعلیم کا فریضہ ادا کرتے رہے۔ حالانکہ قرآن مجید نے ان کو 'خیر امت'، 'امت وسط' اور 'سبیل مؤمنین' کا علم بردار کہہ کر ان کی راہ سے روگردانی کفر قرار دی ہے۔

۲......خدا صفات کا نام ہے

غلام احمد پرویز کا کہنا ہے:

''خدا عبارت ہے ان صفات عالیہ سے جنہیں انسان اپنے اندر منعکس کرنا چاہتا ہے اس لئے قوانین خداوندی کی اطاعت درحقیقت انسان کی اپنی فطرت عالیہ کی نوامیس کی اطاعت ہے۔'' [معارف القرآن: ۴/ ۴۲۰]

ذات باری تعالیٰ کے بارے پرویز کے فکر کا مسلمہ کلامی اصول کے تحت جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ چند اخلاقی صفات کا نام نہیں بلکہ وہ ذات متصف بجمیع المحامد ہے جس کی توصیف وتعریف سے قرآن بھرا پڑا ہے، سارے ادیان سماویہ کا دارومدار اللہ تعالیٰ کی ذات کے ماننے پر ہے، جس طرح اس کی صفات پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح اس کی ذات پر بھی۔ پرویز کی مذکورہ عبارت میں اللہ تعالیٰ سے

صریح انکار ہے، اور اپنی اس عبارت کی تردید یا اس سے برأت کا اعلان پرویز نے کبھی نہیں کیا۔"

۷......فرشتہ اور آدم (علیہ السلام) کی حقیقت

غلام احمد پرویز کا کہنا ہے:

"جبرئیل انکشاف حقیقت کی روشنی کا نام ہے، فرشتے نفسیاتی محرکات ہیں یا کائناتی قوتیں، جنت اور جہنم مقامات نہیں انسانی ذات کی کیفیات ہیں۔ آدم کا کوئی شخصی وجود نہیں بلکہ اس سے مراد نوعِ انسانی ہے انسان کی پیدائش آدم وحوا سے نہیں بلکہ ڈارون کے نظریۂ ارتقا کے مطابق ہوئی ہے۔" [ابلیس وآدم: ص ۶۳، ۶۴، ۲۸۳۔ لغات القرآن: ۱/ ۲۱۴، ۲۴۴، ۴۳۹]

اس بے سروپا موقف پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قرآن حکیم میں وارد مذکورہ حقائق کی وہ تشریح جو پرویز نے کی ہے سراسر کفر والحاد ہے۔ قرآن مجید کی بے شمار نصوص سے اس کی تردید ہوتی ہے اور امت مسلمہ کے نزدیک مسلمہ اور متفق علیہ معانی سے انحراف لازم آتا ہے، یہ ایک ایسا کفر ہے جس کے سمجھنے کے لئے زیادہ علم کی ضرورت نہیں۔ اس بدیہی کفر کا احساس ہر صحیح العقیدہ عام مسلمان بھی کرسکتا ہے، اہل تعلیم کی تصریح کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت سے انکار کفر ہے تو اس کے وجود سے انکار تو بدترین کفر ہوگا، نسل انسانی کی ابتدا حضرت آدم وحوا علیہما السلام سے نہ ماننا بھی قرآن پاک کی شہادت کو رد کرنا ھے: "يَآيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً [نساء: ۱]"۔

۸......عبادات کی حقیقت

غلام احمد پرویز کا کہنا ہے:

نماز 'پوجا پاٹ'، روزہ 'برت'، حج 'یاترا'، صدقۂ فطر 'ڈاک ٹکٹ'، زکوٰۃ 'ٹیکس' ہے۔ قرآن مجید سے پانچ نمازیں نہیں بلکہ صرف دو نمازیں ثابت ہوتی ہیں، حج 'بین الاقوامی' کانفرنس اور قربانی شرکاء کانفرنس کے لئے صرف 'راشن' ہے۔" [قرآنی فیصلے: ص ۲۶،۱۲، ۲۷، ۴۷، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۵، ۵۶، ۶۳، ۶۷، ۶۵، لغات القرآن: ۲/ ۴۷۴، ۳/ ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، معارف القرآن: ۴/ ۳۲۸، نظام ربوبیت: ص ۸۷، رسالہ قربانی: ص ۳، سلیم کے نام: ج ۱/ ص ۷۷، ۷۸]

اس گمراہ کن عبارت کی رد میں رقم طراز ہیں:

"اسلامی عبادات کے بارہ میں ایسا کہنا سراسر کفر اور ارکان اسلام کا استخفاف ہے:

'قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ [توبہ: ۶۵]"

نصوص قطعیہ قرآنیہ میں تحریف اوران سے کھلا ہوا انکار ہے، امت کے اجماعی متواتر مسلک کو رد کرنا ہے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اصولی عبادات میں سے ہیں ارکان دین ہیں، صدقۃ الفطر واجبی عبادت ہے، قربانی سنت ابراہیمی ہونے کی وجہ سے قدیم اور اہم ترین عبادت ہے ان عبادت کا انکار اور تمسخر اور مفہومات میں رد و بدل کفر در کفر کے دبیز ظلمانی طبقات ہیں۔''

۹......معجزہ اور تلاوت کا حکم

غلام احمد پرویز کا کہنا ہے:

''قرآن مجید کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی حسی معجزہ نہیں دیا گیا اور معراج کا انکار اور قرآن کی تلاوت عہد سحر کی یادگار ہے۔'' [معارف القرآن: ۴/ ۳۱۷۔ ۳۶۷، سلیم کے نام: ۳/ ۹۳۔ ۹۱۔ ۹۲، قرآنی فیصلے ص/ ۱۰۴]

مذکورہ عبارت پر تنقید کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید کے علاوہ بھی بہت سارے حسی معجزات دے گئے، اسلامی عقائد کی کتابوں میں اس کی تصریح موجود ہے۔ قرآن حکیم نے بھی متعدد حسی معجزات کا ذکر فرمایا، اس لئے حسی معجزات سے انکار اسلامی عقیدہ سے انحراف اور کفر ہے اور قرآن مجید کی تلاوت کو عہد سحر کی یادگار کہنا بھی الحاد و زندقہ ہے تلاوت کلام پاک ایک مستقل عبادت ہے خود قرآن نے اس کا حکم دیا:

"اتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ [عنکبوت]"

اور پیغمبرانہ فرائض میں سے ایک فریضہ ہے:

"يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ"۔ "وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا"۔ "فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ"۔

۱۰......حرام اشیا کی تعداد

غلام احمد پرویز حرام اشیا کو چار میں محصور کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''صرف چار چیزیں حرام ہیں: مردار، بہتا خون، لحم خنزیر، اور غیر اللہ کی طرف منسوب چیزیں باقی حلال و حرام کی جو طولانی فہرستیں ہیں وہ سب انسانوں کی خود ساختہ ہیں۔'' [طلوع اسلام مئی ۵۲ء ص/ ۶۹]

پرویز کے اس کمزور موقف کا ناقدانہ جائزہ لیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''یہ دعویٰ بھی کھلی گمراہی ہے، کیونکہ یہ ان تمام محرمات کے انکار پر مشتمل ہے جن کی حرمت صریح قرآن و حدیث میں وارد ہے کیونکہ کتا، بلی، شیر، گیدڑ، بندر، سانپ، شراب، پیشاب، براز وغیرہ سب چیزیں حلال ہو جاتی ہیں۔''

یہاں بھی آپ نے منطقی طرز استدلال سے کام لیتے ہوئے پرویز کے" دعویٰ حصر" کو باطل کیا ہے۔

آپ کے منہج میں چند باتیں نمایاں ہیں:

ا۔ایجاز واختصار اور علمی طرز بیان:

آپ مخاطب پر غیر ضروری تنقید سے احتراز کرتے ہوئے اس کے باطل مزعومات کو مختصر اور جامع الفاظ میں رد کرتے ہیں اور اپنے اسلوب بیان کو انتہائی ٹھوس اور عالمانہ رکھتے ہیں۔

۲۔وقار وتحمل:

اپنے دین سے ہر انسان کو عشق اور جذباتی وابستگی ہوتی ہے، جس کی وجہ سے دین کی بنیادوں پر وار کرنے والے کسی فرد کے بارے اشتعال میں آنا بعید نہیں۔ایسے وقت میں قلم جذبات کی رو میں بہہ پڑتا ہے اور وہ صرف فکر کی تردید تک خاص نہیں رہتا بلکہ مخاطب کے نجی اور ذاتی احوال کو بھی رگید دیتا ہے۔حضرت کی تردید میں" گمراہ فکر" کو تو انتہائی شدت سے رد کرنے کا عنصر ہے جو ضروری ہے، لیکن مخاطب کی ذاتیات پر حملے یا رکیک جملوں کا قطعاً استعمال نہیں۔

۳۔استدلال بالقرآن والعقل:

جب ہم حدیث کو حجت مانتے ہیں تو اصولاً اس سے استدلال بھی کر سکتے ہیں لیکن حضرت نے پرویزی افکار کی تردید میں صرف قرآن مجید اور مسلمہ عقلی دلائل سے استدلال کیا ہے، تا کہ مخاطب کو یہ کہنے کی گنجائش نہ ہو کہ مستدل میرے ہاں حجت نہیں۔

یہ تحریر حضرت الاستاذؒ کے غیر مطبوعہ قلمی مسودات سے مرتب کی گئی ہے، ان شاء اللہ عن قریب اس حوالے سے آپ کی اصل تحریرات کو شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

حضرت الاستاذؒ کے فقہی بصائر

مفتی وصی اللہ، اسلام آباد

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ لمجلس کنت اجالسہ عبداللہ أوثق فی نفسی من عمل سنۃ(سیر اعلام النبلاء، ۱/ ۴۲۸) ترجمہ: ایک مجلس جس میں میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیٹھا تھا میرے نزدیک ایک سال کے نیک عمل سے زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔

بعینہٖ اس طرح فقہی بصائر ولطائف پر مشتمل حضرت الاستاذ کی مجلس بھی ایک انمول موتی کی دریافت سے کم نہیں تھی، آپ کی مجلس میں کوئی علمی وفقہی دقیقہ زیر بحث لایا جاتا، تو آپ سیلِ جرار کی طرح اس کے خس وخاشاک کو کنارے لگا کر مسئلہ کی جذور تک لمحوں میں رسائی کروا دیتے۔ اس جیسی ایک مجلس میں بندہ نے حسب حال موقع پا کر دریافت کیا حضرت! تفقہ فی الدین کے لئے کون سی کتاب مطالعہ کروں؟

ارشاد فرمایا: تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق" علامہ زیلعی رحمہ اللہ کی، کہ یہ اپنے پڑھنے والے کو فقیہ بنا دیتی ہے، پھر فرمایا: یہ وہ "نصب الرایۃ" والے زیلعی نہیں بلکہ ان کے استاذ محترم ہیں جو کہ فخر الدین الزیلعی عثمان بن علی (المتوفی ۷۴۳ھ، ۱۳۴۳م) سے مشہور ہیں جب کہ صاحب نصب الرایہ تو جمال الدین الزیلعی عبداللہ بن یوسف (المتوفی ۷۶۲ھ ۱۷۶۰م) سے معروف ہیں۔

اس ارشاد کی حقانیت راقم الحروف نے بارہا دیکھی، بالخصوص فقیہ الشام علامہ شامی کو فتاویٰ شامی (ردالمحتار) میں کثرت سے یہ حوالہ دیتے ہوئے پایا وفی شرح الکنز، یا وفی التبیین کہہ کر متن کنز کی شرح نقل کرتے ہیں۔

متعدد مقامات پر علامہ شامی کا شرح زیلعی سے استشہاد محتاج تعارف نہیں، یوں تو کنز کی شروح اور بھی بہت ہیں مگر حضرت الاستاذ شہید کا انتخاب دیکھئے کہ کوئی متروک وغیر متداول شرح کی نشاندہی نہیں کی بلکہ مقبول ومتداول بین الفقہاء کی جانب توجہ مرکوز کروائی! جزاہ اللہ عن العلم واھلہ خیرا، اور اس میں بھی شک نہیں کہ آنجناب کا حدیثی رنگ فقہی رنگ پر غالب تھا مگر باوجود اس کے جب ہم آپ کی فقہی موشگافیوں کی جستجو کرتے ہیں تو آپ کے حدیثی شہ پاروں کے پس پردہ بھی ایک خاص فقہی ذوق نمایاں نظر آتا ہے، آپ کے رشحاتِ قلم اس کا شاہد صدق ہیں۔ شاید وباید کہ یہی وجہ تھی کہ آپ تعامل صحابہ کے بڑے گرویدہ تھے اور یہ ذوقِ تعامل امام طحاوی صاحب رحمہ اللہ کی مشہور زمانہ کتاب "شرح معانی الآثار" پر آپ کی محدثانہ خدمت کی مرہونِ منت تھا۔

علاقائی سطح پر آپ کی فقہی اصلاحات:

آپ علاقائی سطح پر واقعی یگانہ روزگار تھے، آپ کی فقہی بصیرت پر تمام اہل علم وفضل نے سرِ خم تسلیم کرلیا تھا ،صرف آپ کے قلمی شاہکاروں کی وجہ سے ہی نہیں کیونکہ ان کا علم تو صرف اہل علم کو تھا بلکہ اگر میں یوں کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ بہت سارے اہل علم بھی آپ کے علمی رتبہ سے ناواقف رہے اور ناقدری میں بھی کسی قسم کا دریغ نہیں کیا (سامحھم اللہ القدیر) تاہم "مشک آن است کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید " پھر بھی آپ نے صبر واستقامت، ہمت وعزم کے دامن کو نہ چھوڑا، برابر عوام الناس اور بالخصوص علماء کرام کے فقہی اصلاحات کے لیے کوشاں رہے۔ ذیل میں ان فقہی اصلاحات کی چند ایک مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

(۱)......توقیت صلوات کا مسئلہ:

سالہا سال سے علاقے کے مؤذنین اور ائمہ کرام کو درپیش مسئلہ "توقیت صلوات " ایک اہم اور نازک مسئلہ تھا جس پر عوام الناس کے صلوات اور افطار وسحور جیسے مہم مسائل موقوف تھے، حضرت موصوف وقتاً فوقتاً اپنی توجیہات سے ائمہ اور مؤذنین اور اہل علم وفضل کو مطلع کرتے رہے۔ بالآخر آپ نے اس اہم سنگین مسئلہ کی نزاکت کے پیش نظر برسوں کے تجارب اور مشاہدات کی روشنی میں تمام مروجہ کلینڈرز کا جائزہ لیا اور حضرت مولانا ایوب جان بنوریؒ کے مرتبہ نقشہ اوقات صلوٰۃ کو راجح قرار دیا، یوں اس سنگین مسئلہ سے عوام ہی نہیں بلکہ اہل علم کو بھی آپ کی توجیہات کے ثمر سے بہرہ ور ہونا پڑا۔

(۲)......نماز جنازہ کے بعد ذکر بالجہر پر آپ کی نکیر:

آپ موصوف نے بعض اہل علم کے مدعو کرنے پر جنازہ میں شرکت کی، جس میں ذکر بالجہر کیا گیا، واپسی پر آپ نے اپنے مسترشدین طلبہ واساتذہ کو مخاطب کرتے ہوئے اس پر نکیر فرمائی اور اس پر بس نہیں کیا بلکہ آپ نے ان اہل علم کی طرف ایک مکتوب لکھا جنہوں اس عمل کو سراہا تھا، اس مکتوب میں آپ نے اس حوالے سے فقہاء کرام کی صریح نصوص پیش کر کے منع کرنے کی تجویز دی، بحمد اللہ علاقائی سطح پر اس فقہی اصلاح کی برکت سے یہ بدعت سرے سے ختم ہوگئی۔

(۳)......علاقائی سطح پر بدعات ورسومات کی بیخ کنی:

عوام الناس میں عقائد کو سمجھنے کا شعور اجاگر کرنا، بدعات اور رسومات کا سد باب کرنا، اور اس کو مباح قرار دینے والے اہل علم حضرات کے ساتھ جس دنداں شکنی سے آپ نے مقابلہ کیا، اس کی داستانیں آپ کے مکتوبات میں ثبت ہیں، بالخصوص حضرت مولانا رفیع محمد صاحب کے ساتھ طویل مکاتبت رہی، جس میں مندرجہ ذیل مسائل پر عالمانہ مکالمہ ہوا، ان مسائل پر مشتمل آپ کے ناقدانہ مقالات منظر عام پر آچکے ہیں:

(۱) مروجہ حیلہ اسقاط کی شرعی حیثیت۔ (۲) میت کے گھر صدقہ کی شرعی حیثیت۔ (۳) دعا بعد صلوٰۃ الجنازۃ

الحمدللہ آپ کی کوششوں سے علاقہ بھر سے ان بدعات ورسومات کا خاتمہ ہوا۔

ایسے ہی جماعت اسلامی کے بعض احباب کے ساتھ بنام ''مکاتیب ہدایت'' جو مکاتبت رہی، وہ تو ۱۵۰ صفحات پر مشتمل ہیں، اس کا بنیادی موضوع ''عصمت انبیا'' اور ''عدالت صحابہ'' ہے، اس مکاتبت کے بعض اہم علمی افادات اسی باب میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

اس کے علاوہ اورکزئی ایجنسی میں نماز استسقا کا سرے سے رواج نہ تھا، بلکہ اس کی جگہ ایک جاہلی رسم رائج تھی، تمام لوگ کھلے میدان میں نکل آتے اور ڈھول بجاتے، آپ نے اس قبیح رسم کا خاتمہ کیا۔ اسی طرح مزارات پر چڑھاوے، مرادیں مانگنا، ہفتہ بھر عورتوں کا میت کی قبر پر حاضری، تیجا، چالیسواں، گیارھویں اور مروجہ میلاد وغیرہ کی جملہ رسومات اور بدعات آپ کی کوششوں سے ختم ہوئیں۔

اس فکر میں رہتا ہوں دن رات اکبر
یہ کیا ہورہا ہے یہ کیوں ہو رہا ہے

جبکہ آپ نے ان سب کی بیخ کنی کے سلسلہ میں جس جان فشانی سے شب وروز ان تھک محنت اور جس عرق ریزی سے کام کیا شاید وباید کہ آج ہم اسی کا ثمر کھا رہے ہیں۔

حضرت الاستاذؒ کے فقہی مکاتیب:

آپ نے بعض حضرات پر ناقدانہ اور بعض حضرات کے استفسار پر طویل فقہی خطوط لکھے ہیں، جن میں سے ہر خط متعلقہ مسئلہ میں ایک جامع رسالہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ذیل میں ان میں سے چند مکاتیب کا تذکرہ پیش خدمت ہے:

۱۔ انجکشن سے روزہ ٹوٹنے کا مسئلہ، بنام مفتی مختارالدین صاحب کربوغوی

۲۔ اذان جمعہ کا مسئلہ، بنام مفتی مختارالدین صاحب کربوغوی

۳۔ غیر مقلدین کے ساتھ مختلف فیہ فقہی مسائل، یہ خط غیر مقلدین حضرات کے اشکالات کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ بنام مولانا محمد زاہد کوہاٹی

۴۔ حیلہ اسقاط کی شرعی حیثیت، یہ خط استاذ صاحب نے اپنے کسی استاذ کو لکھا ہے، مکتوب الیہ کا ذکر القابات سے کیا گیا ہے، نام درج نہیں۔

۵۔ زمین میں قبضہ اصل ہے یا انتقالی کاغذات اور ہبہ مشاع کا حکم، بنام مولانا رشید احمد سواتی

مقاصد شریعت پر حضرت اورکزئی کی نگاہ:

ارباب فقہ ونظر کو بخوبی معلوم ہے کہ برصغیر میں مقاصد شریعت پر لکھنے والی پہلی شخصیت مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کی مشہور زمانہ اور نافع کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' اس باب میں اپنی مثال آپ ہے اور جسے حضرت شاہ صاحب کی ایجاد اور الہامی کتاب سمجھا جاتا ہے، چونکہ حضرت شاہ صاحب نے شروع مقدمہ میں ہی اس بات کی صراحت کردی کہ جسے مصالح ومقاصد کا علم نہیں اور صرف آیات الاحکام واحادیث الاحکام ہی کو احکام کی جولان گاہیں سمجھتے ہیں اور بس۔ تو ان کے علم کی مثال اس سوئی کے پانی سے زیادہ نہیں ہے، جو سمندر میں بھگو کر نکالی جائے، نیز ان کی نگاہیں ظاہر شریعت سے ہٹ کر ان اسرار وحکم تک نہیں پہنچ سکتیں جو شریعت مطہرہ میں مطلوب ہیں۔ (حجۃ اللہ البالغۃ، ص ۷، اطبع قدیمی کتب خانہ)

جبکہ موصوفؒ کی رائے گرامی یہ تھی کہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی یہ ابکار ہی نہیں ہے جیسا کہ شاہ صاحب کے مقدمہ سے واضح ہورہا ہے، بلکہ حضرت شاہ صاحب نے اپنی اس شاہکار میں مصر کے چیف جسٹس فقیہ، اصولی، عزابن عبدالسلام الشافعی المتوفی ۶۶۰ھ کی مشہور آفاق کتاب "قواعد الاحکام فی مصالح الانام" (جبکہ موجودہ چھپائی جو دارالقلم دمشق سے دو محققوں کی تحقیق سے چھپی ہے، اس کے سرورق پر اس کا نام "قواعد الاحکام فی اصلاح الانام" نقش ہے) سے استفادہ کیا ہے، عجیب بات یہ ہے کہ حضرت اورکزئی کی پیشن گوئی کی تصدیق موجودہ چھپائی کے مقدمہ میں محققان نے ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں ان جگہوں کی بھی نشاندہی کردی جہاں شاہ صاحب نے عزابن عبدالسلام سے استفادہ کیا ہے۔ بلکہ کوئی صاحب علم اگر اس کا مکمل مقارنہ، وموازنہ کردے تو شاید اور بھی بہت سارے نصوص سامنے آسکتے ہیں، جو ہمارے مدعیٰ کے لیے دلیل کا کام دیں اور شاہ صاحب رحمہ اللہ نے نہ صرف یہ کہ "حجۃ اللہ البالغۃ" میں مذکورہ بالا کتاب سے استفادہ کیا ہے بلکہ "المسوی شرح موطا" میں بھی اقتباس کیا ہے۔

راقم آثم کے خیال ناقص میں حضرت کا یہ ارشاد قرین قیاس بھی ہے، کیونکہ شاہ صاحب رحمہ اللہ نے جس زمانہ میں حرمین شریفین کا سفر فرمایا اور معتد بہ عرصہ تک حرمین شریفین کے شیوخ سے استفادہ کیا، بالخصوص جن شیوخ سے صحاح ستہ کی سند اور خرقۂ تصوف حاصل کیا ان میں سے اکثر شافعی المسلک تھے، اس کی تصدیق آپ کی تالیف لطیف "انسان

العین فی مشائخ الحرمین" سے ہوتی ہے، پس لہٰذا عین ممکنات میں سے ہے کہ اس دوران عزابن عبدالسلام کی کتاب

سے بھی استفادہ کیا ہو۔

فقہی مصنفات وتعلیقات:

آپ کے فقہی رنگ میں ایک گہرا اثر آپ کے استاذ محترم محدث العصر حضرت العلامۃ محمد یوسف البنوری رحمہ اللہ کا ہے کہ آپ پر ایک خاص اعتماد تھا اور علمی تصنیفی میدان میں آپ کی خداداد صلاحیتوں کو آشکارا کرانے میں حضرت بنوری رحمہ اللہ کو فراموش نہیں کیا جا سکتا، راقم الحروف نے خود حضرت الاستاذ سے بنفس نفیس سنا کہ: "معارف السنن" کی تالیف میں حضرت بنوری رحمہ اللہ نے مجھ سے اور حضرت العلامۃ حبیب اللہ مختار شہید رحمہ اللہ سے کافی کام لیا، حوالہ جات طلب فرماتے اور ہم کتاب حاضر کر کے مطلوبہ صفحہ سامنے رکھتے، حضرت بنوری رحمہ اللہ کا قوتِ اخذ بہت سریع تھا، دیکھ کر کتاب واپس بھجوا دیتے، ساتھ ہی ساتھ اس حوالے کو قید قرطاس میں ثبت فرماتے۔'' اس نص سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت بنوری رحمہ اللہ نے تصنیفی میدان میں بھی آپ موصوف کو عملی تربیت دی اور شاید اسی جانثاری کا صلہ تھا کہ حضرت بنوری رحمہ اللہ نے آپ کو ایک اہم ترین کام سپرد کیا۔ جس کی تفصیل بزبان حضرت علامہ محمد یوسف لدھیانوی رحمہ اللہ اسی باب میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

مذکورہ حکم کی تعمیل ارشاد میں حضرت موصوف کی 'نثر الازھار علی شرح معانی الآثار' محققانہ اسلوب میں عصر حاضر کے جدید تحقیقی تقاضوں کے مطابق زیور طباعت سے پہلی مرتبہ ایک جلد میں اور دوسری مرتبہ دو جلدوں میں آراستہ ہوئی، اور یہی ایک جلد والا نسخہ حضرت موصوف نے راقم الحروف کو اپنے مبارک ہاتھوں سے پہلی ملاقات میں بطور ہدیہ پیش کیا تھا۔

اسی طرح آپ کی فقہی تعلیقات جو آپ نے "شرح نقایہ" از ملا علی قاری رحمہ اللہ، کے حواشی پر ثبت فرمائے ہیں، نہایت اہمیت کے حامل ہیں اور دیگر شذرات جو آپ نے مختلف مواقع پر مختلف سوالوں کے جوابوں میں بطور نوٹ کے قلم بند کیے ہیں، انہیں بھی اگر جمع کر لیا جائے تو اچھے خاصے افادات ومقالات کی صورت میں چھپ سکتے ہیں۔ اسی طرح آپ کے مختلف کتابوں پر مقدمات بالخصوص" دلائل الخیرات " پر آپ کا شاندار مقدمہ، اور اس پر کیے جانے والے اشکالات کے جوابات، اور سلسلہ اجازت جو آپ" دلائل الخیرات " کے دیا کرتے تھے بیش بہا علمی میراث ہے، راقم الحروف کو بھی بحمد اللہ حضرت ہی کی خود نوشت قلم سے اجازت حاصل ہے۔" الحزب الاعظم "(مولفہ ملا علی القاریؒ) پر آپ کا مقدمہ اور اجازت کا سلسلہ بھی آپ کے مسترشدین وتلامذہ میں مشہور ومعروف ہے۔

اس کے علاوہ حضرت الاستاذؒ نے بعض اہم فقہی اور اصولی موضوعات پر مختصر مضامین ومقالات اور فتاویٰ بھی

تحریر فرمائے، جن میں ’ووٹ کی شرعی حیثیت‘، ’حج بدل‘، ’ٹیکس کا حکم‘، ’ذکر بالجہر کا شرعی حکم‘، ’یا محمد کہنے اور لکھنے کا شرعی حکم‘، ’خلیفہ اور خلافت کے قیام کا شرعی حکم‘، ’مودودی جماعت کو ووٹ دینے کا مسئلہ‘، ’اجماع مرکب‘ اور ’حقیقت ومجاز‘ وغیرہ شامل ہیں۔ یہ مقالات اپنی اہمیت کے پیش نظر مستقل تصنیف کی شکل میں منظر عام پر لانا حضرت کے متعلقین پر قرض ہے۔ انہیں جتنا جلدی ہو سکے، اہل علم کے نظر نواز کرنا چاہیے۔

فتاویٰ حمادیہ پر حضرت موصوف کی ترغیب وتحریض:

حضرت مولانا مفتی عظمت اللہ صاحب حفظہ اللہ جو کہ جامعہ یوسفیہ میں حضرت موصوف کے زیر تربیت مدرس ومفتی تھے، بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں لائبریری میں بیٹھ کر مطالعہ کر رہا تھا، اتنے میں حضرت موصوف کی آمد ہوئی تو آپ نے استفسار کیا کہ مفتی صاحب! فتاویٰ حمادیہ بھی مطالعہ کیا ہے؟ عرض کیا کہ جی نہیں! ارشاد فرمایا کہ مفتی صاحبان کے لئے تو اس کا مطالعہ کرنا از بس ضروری ہے اور آپ فتاویٰ حمادیہ کے بڑے مداح ہی نہ تھے بلکہ آپ نے جابجا اس پر شاندار تعلیقات بھی کیں۔

فتاویٰ حمادیہ کا مختصر تعارف:

نویں صدی ہجری کے ایک ممتاز عالم، ابوالفتح رکن بن حسام الدین ناگوری نے اپنے بیٹے شیخ داؤد بن رکن ناگوری کے اشتراک اور قاضی القضاۃ جمال الدین احمد بن قاضی محمد اکرم کی خواہش واستدعا پر یہ مجموعۂ فتاویٰ ہندوستانی گجرات کے شہر نہروالہ میں تصنیف کیا۔ مقدمے میں مصنف کی تصریح کے مطابق باپ بیٹا دونوں قضا سے متعلق مسائل کے بارے میں فتویٰ نویسی کی ذمہ داری سرانجام دیا کرتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب قضا کے مسائل سے متعلق عملی تجربہ رکھنے والے حضرات کی تالیف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے فتاویٰ ہندیہ اور حاشیہ ابن عابدین کے ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ نیز مؤلفان نے مقدمہ میں دو سو مصادر ومراجع ذکر فرما کر فتاویٰ حمادیہ کی افادیت کو دوچند کر دیا ہے۔

فتاویٰ حمادیہ کی تخریج وتحقیق کا سبب:

حضرت موصوف شہید رحمہ اللہ نے راقم الحروف سے آخری ملاقات میں دو کتابوں کا مطالبہ فرمایا تھا: (۱) فتاویٰ حمادیہ کی جلد دوم (۲) فوائد جامعہ برعجالہ نافعہ (حضرت محدث العصر سیدی وسندی ڈاکٹر محمد عبدالحلیم النعمانی المعروف چشتی صاحب حفظہ اللہ وعافاہ کی تالیف) مجھے مطلوب ہیں، آسانی سے میسر آسکیں تو مجھے ارسال کر دیں اور پھر آپ نے فتاویٰ حمادیہ کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ نہایت محقق، مستند اور اہم فتاویٰ جات میں اس کا شمار ہوتا

ہے، میرے پاس اس کی جلد اول ہے، جلد دوم کی عرصہ سے طلب ہے۔

راقم آثم نے ان دونوں کی تلاش شروع کردی تاہم اس وقت تک نہ تو فوائد جامعہ برعجالہ نافعہ اس حلتہ قشیبہ میں شائع ہوئی تھی اور نہ ہی فتاوی حمادیہ کا سراغ مل رہا تھا، بالآخر کربوغہ شریف کی طرف ایک علمی رحلت ہوئی، تو وہاں کی جامع مسجد کی جولائبریری تھی، اس میں مجھے فتاویٰ حمادیہ کی جلد دوم میسر آگئی، جس میں سے شروع، بیچ اور آخر کے تصویری عکس میں نے لیے، کہ بوقت ضرورت کام آسکے۔ اور دل ہی دل میں خوشی کا ایک عالم بپا تھا، کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ حضرت الاستاذ کی ایک طلب پوری کرنے میں شاید کسی درجہ میں کامیاب ہوگیا ہوں۔ میں نے بواسطہ بعض اہل تعلق کے ان سے اس کی فوٹو کاپی لینے کی درخواست کی تو عذر پیش کیا گیا کہ یہ مکتبہ کسی ایک صاحب کا نہیں بلکہ بہت سارے اصحاب کا مشترکہ ہے سب سے اجازت لینی پڑے گی، بعد میں دوسری مرتبہ جب کربوغہ شریف جانا ہوا، تو یہ نسخہ مجھے اس لائبریری میں میسر نہیں آیا بلکہ حضرت مفتی کربوغوی صاحب کے ہاں پایا گیا، پھر بھی میں نے دوبارہ فرمائش کی اور اب کی بار فرمائش میں حضرت الاستاذ کی طلب کے علاوہ ہمیں بھی مقارنہ بین النسخ کے لیے اس کی اشد ضرورت تھی کیونکہ ہم اس پر کام شروع کر چکے تھے۔ لیکن شاید اس نسخہ کی اس وقت کوئی خاص ضرورت تھی جس کی وجہ سے اس کی نقل ہمیں نہ مل سکی۔

اب جب کربوغہ شریف کے نسخہ سے ہمیں مایوسی ہوئی، تو عالمی مکتبات میں اس کی تلاش شروع کردی، بالآخر ہمیں اس کے پانچ مزید اہم اور محشیٰ نسخے میسر آئے، جو کہ اول الذکر نسخے سے کئی گنا عمدہ خط وحواشی سے معمور تھے۔ بس اسی بہانے راقم الحروف اور ان کے ہم سفر وہم رکاب، رفیق کار مولانا محمد عاصم صاحب حفظہ اللہ کے تعاون سے تبییض شروع کردی گئی، اس وقت تک ہمیں حضرت الاستاذ کا نسخہ بھی میسر نہیں تھا، بلکہ قدیم مطبوع نسخہ جو انٹرنیٹ پر مکتبہ اسکندریہ سے ہمیں میسر آیا تھا، اسی سے تبییض شروع ہوئی، پھر حضرت الاستاذ کے نسخہ سے اس کا مقارنہ، تصحیح النصوص اس اہم فتاوی کی اشاعت مجوزہ اہداف میں سے ایک اہم ہدف ہے، رب العالمین سے جلد از جلد پایہ تکمیل تک پہنچانے کے خواہاں ہیں، وہی اس کی توفیق بخشنے والا ہے اور بس۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ حضرت الاستاذ کی بال بال مغفرت فرمائے اور متعلقین، ومسترشدین کو آپ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین

مولانا امین اورکزئی شہید رحمہ اللہ

تعلیمی نظریات، تشکیل کردہ نصاب اور اس کی خصوصیات

مولانا سمیع اللہ سعدی

اکابر دیوبند میں خاتمۃ المحدثین حضرت مولانا انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ اپنے علمی ذوق، شوق مطالعہ اور تعلیم و تعلم میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے، آپ کا یہ ذوق آپ کے تلامذہ میں منتقل ہوا، حضرت بنوری رحمہ اللہ آپ کے اخص الخاص شاگردوں میں ہونے کی وجہ سے آپ کے علمی ذوق کے بجا طور پر امین تھے، حضرت بنوری رحمہ اللہ نے نصاب، درس و تدریس کے رموز اور مدارس دینیہ میں علمی ذوق اجاگر کرنے پر ضخیم مواد چھوڑا ہے جو آپ بینات کے معروف سلسلے" بصائر وعبر" میں لکھتے تھے۔ حضرت مولانا امین اورکزئی شہید رحمہ اللہ آپ کے عاشق زار تلامذہ میں سے تھے۔ اپنے عظیم استاد کے علمی ذوق کا ہو بہو عکس تھے۔ مدارس دینیہ کے مدرسین اور طلبا کا کتاب سے رشتہ جوڑنے اور ان میں علمی مزاج پیدا کرنے کے لئے آپ نے قابل قدر خدمات سرانجام دی ہیں، اس موضوع پر آپ کا تحریری سرمایہ اگرچہ کم ہے لیکن" بقامت کہتر بقیمت بہتر" کا صحیح مصداق ہے، تعلیم و تعلم، درس و تدریس، نصاب اور اس کی تجدید کے حوالے سے آپ کے تحریری ذخیرے کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ درس نظامی میں بعض اہم تبدیلیوں پر مشتمل آپ کا تشکیل کردہ نصاب

۲۔ مدارس دینیہ میں تعلیم و تربیت کے حوالے سے آپ کے تحریر کردہ خطوط

۳۔ حضرت موسیٰ و حضرت خضر علیہما السلام کے واقعے سے تعلیم و تعلم کے آداب پر مشتمل اپنی نوعیت کا منفرد رسالہ "ارشاد الحلیم الی آداب التعلیم"

آپ کا تشکیل کردہ نصاب، اس کی خصوصیات اور درس نظامی سے تقابل

حضرت اورکزئی شہید رحمہ اللہ نے اپنے قائم کردہ مدرسہ جامعہ یوسفیہ کے لئے موجودہ درس نظامی میں بعض اہم تبدیلیوں پر مشتمل نیا نصاب بنایا تھا اور اس نصاب کو اپنے جامعہ میں عملی طور پر نافذ بھی کیا تھا، ہم اس پورے نصاب کو قارئین کے سامنے پیش کر کے اس کی بعض امتیازی خوبیوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں، یہ نصاب آپ نے بالتفصیل مولانا قاضی سراج الدین کے استفسار پر انہیں ایک خط میں بھی لکھا تھا مناسب ہے کہ اس خط کا حصہ نقل کر لیا جائے۔

حضرت لکھتے ہیں:

''ہمارے ہاں حسب ذیل نصاب کا ایک حصہ مروج ہے۔ یاد رہے کہ ہر درجہ میں لازماً چھ/۶ گھنٹے پڑھائی ہو گی صبح کی وقت میں نہ ہو سکے تو بعد از ظہر دو/۲ گھنٹے رکھیں۔

درجہ اعدادیہ:

ہمارے ہاں چونکہ امتحانات تحریری ہوتے ہیں اس لئے اردو یا فارسی یا پشتو میں نوشت وخواند ضروری ہے۔ اس لئے درجہ اعدادیہ کے نام سے یہ درجہ رکھا گیا ہے۔ نیوٹاؤن وغیرہ مدارس عالیہ میں بھی یہ درجہ موجود ہے، جو بچے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے ان کو اسی درجہ میں داخلہ دیا جائے۔ ہم حسب ذیل مضامین اس درجہ میں پڑھاتے ہیں:

(۱) اردو دوم، سوم ہو سکے تو چہارم بھی۔ اردو کی ضرورت اور اہمیت محتاج بیان نہیں۔

(۲) حساب دوم، سوم ہو سکے تو چہارم کی، حساب کا جاننا بھی عالم دین کے لئے از حد ضروری ہے خصوصاً میراث کے مسائل کیلئے۔

(۳) عربی **الطريقة العصرية لتعليم اللغة العربية** کے نام سے بالکل ابتدائی آسان سی کتاب پڑھائی جاتی ہے تا کہ کچھ شد بد پیدا ہو۔

(۴) فارسی پنجم اور ششم کی، ہو سکے تو ہفتم کی بھی۔ ضرورت اور اہمیت واضح ہے۔

(۵) تعلیم الاسلام مکمل بہتر ہے کہ حفظ کرائیں، سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر آسان چھوٹی مختصر سی کتاب۔ ہم نے فی الحال "سیرۃ الرسول ﷺ" للشاہ ولی اللہ ؒ" مترجم اردو کا انتخاب کیا ہے۔ نیوٹاؤن میں بھی مروج ہے۔ اس سے بھی زیادہ آسان اور مختصر کتاب کی تلاش میں ہیں۔ عربی کا مضمون جب ختم ہو تو آخری سہ ماہی میں صرف بہائی یا ارشاد الصرف یا اور کوئی صرف کی آسان سی کتاب پڑھائیں اور سیرۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمال القرآن یا صرف عملی مشق تجوید کی رکھیں۔

درجہ اولیٰ:

(۱) نور الایضاح: مکمل ''آخر سال تک مکمل کرائیں''۔

(۲) میزان الصرف: پہلی سہ ماہی میں بعد از اں علم الصیغہ آخر سال تک۔

(۳) صرف میر: ششماہی تک، اس کے بعد قرآن مجید کے پہلے پارہ میں تمرین یعنی عملی مشق صیغوں کا اور قواعد کا اجرا کرائیں۔

(۴) نحو میر اور اس کے بعد شرح مائۃ عامل ترکیب وتمرین کے ساتھ۔

(۵) الطریقۃ الجدیدۃ لتعلیم اللغۃ العربیۃ مکمل دو، ۲ حصے۔

(۶) سورۃ ضحیٰ سے سورۃ ناس تک سورتیں با ترجمہ حفظ کرالیں، سہ ماہی تک بعد ازاں سیرۃ خلفاء الراشدین (اردو) از حضرت لکھنویؒ۔ اسی درجہ میں جمال القرآن یا معارف التجوید پڑھائیں اور آخری سہ ماہی میں تیسیر المنطق یاد کرالیں۔

درجہ ثانیہ:

(۱) مختصر القدوری مکمل (یعنی بشمول معاملات)

(۲) ترجمۂ کلام پاک سورۃ بقرہ فقط چار مہینے میں، بعد ازاں اصول الشاشی آخر سال تک۔

(۳) ہدایۃ النحو: حل کتاب پر اکتفا کر کے چار مہینوں میں، بعد ازاں قطر الندی یا شرح شذور الذہب لابن ہشام النحویؒ سال کے آخر تک۔

(۴) ایسا غوجی، مرقات بعد ازاں متن تہذیب (دور از کار طولانی تقریریں نہ ہوں، مبتدی طلبہ کو صرف کتاب پڑھائیں تو تینوں کتابیں ہوسکتی ہیں)

(۵) نفحۃ العرب چار یا پانچ مہینے، بعد ازاں ''الحادثہ'' جدید عربی کی مصری کتاب یا معلم الانشاء جتنی ہو سکے سال کے اختتام تک۔

(۶) مراح الارواح مکمل، بعد ازاں فصول اکبری صرف خاصیات تک بشمول غایۃ، اور فوائد مکیہ وغیرہ کوئی کتاب تجوید کے لئے وقت نکالیں۔

درجہ ثالثہ:

(۱) کنز الدقائق مکمل۔ (۲) نور الانوار۔ (۳) ترجمۂ قرآن مجید از آل عمران تا یونس۔ (۴) مقامات حریری مع نور الیقین فی سیرۃ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم (۵) اوضح المسالک الی الفیۃ ابن مالک یا شرح ابن عقیل، سال کے آخر میں کافیہ کا کچھ حصہ۔ (۶) شرح تہذیب مکمل، بعد ازاں قطبی جتنی ہو سکے۔

درجہ رابعہ:

(۱) شرح ملا جامی۔ (۲) شرح النقایہ جلد اول کم از کم عبادات۔ (۳) حسامی، بعد ازاں سراجی۔ (۴) سلم العلوم بعد ازاں ہدایۃ الحکمۃ۔ (۵) متنبی، بعد ازاں آخری دو ماہ میں قصیدۂ بدء الامالی فی علم الکلام حفظاً (۶) ترجمہ از یونس تا عنکبوت [اسی درجہ میں تلخیص المفتاح کے لئے بھی کچھ وقت نکالا جائے]

درجہ خامسہ:

(۱) ہدایہ صرف عبادات۔ (۲) مولوی یعقوب تا سنت۔ (۳) کنز یا یا ملاحسن۔ (۴) ہدیہ سعیدیہ بعدہٗ شرح عقائد (۵) ترجمہ از عنکبوت تا آخر (۶) مختصر المعانی تا فن بیان [دیوان حماسہ کیلئے مناسب وقت نکالا جائے]

درجہ سادسہ:

(۱) جلالین شریف (اگر کتاب میسر ہو تو بجائے جلالین کے مدارک) (۲) ہدایہ جزء ثانی از نکاح تا بیوع۔
(۳) میبذی باستثنائے فلکیات۔ (۴) مختصر المعانی از بیان تا آخر (۵) مولوی یعقوب از سنت تا آخر۔
(۶) حمد اللہ بعدہ ملا جلال۔ [شریفیہ یا میراث کی کوئی اور کتاب پڑھائی جائے۔]

درجہ سابعہ:

(۱) مشکوٰۃ شریف وشرح نخبہ مع عقود والجواہر المنیفۃ۔ (۲) بیضاوی شریف ربع اول از جزء اول (کتاب میسر ہو تو تفسیر ابی سعود)، التبیان۔ (۳)۔ ہدایہ ثالث وہدایہ رابع (۴) توضیح تا مقدمات ومسلم الثبوت۔ [علم کلام میں خیالی کے بجائے بعدہ خیالی، اگر ہاتھ آسکے تو اشارات المرام من عبارات الامام أبی حنیفۃ ؒ للبیاضی ☐ ؒ بہت زیادہ مفید ہے۔] (۵) مطول بعدہ دلائل الاعجاز

درجہ ثامنہ:

(۱) دورۂ حدیث شریف۔ دورۂ حدیث میں موطا محمدؒ اور شرح معانی الآثار للطحاویؒ ضرور پڑھائی جائیں۔
تاریخ چونکہ باقاعدہ پڑھانے کا فن نہیں اس لئے باقاعدہ گھنٹہ اس کے لئے کسی درجہ میں نہیں رکھا گیا اور بغیر باعث کے اکثر طلبہ کتابیں دیکھتے نہیں ہیں اس لئے درجۂ خامسہ کے بعد صبح یا شام کچھ وقت نکال کر طلبہ کو تاریخ الخلفاء للسیوطی ؒ، دول الاسلام للذہبی ؒ جیسی مختصر کتابیں پڑھائی جائیں تو بہتر ہوگا اور ساتھ ساتھ دور جدید کے فتنوں (قادیانیت، رفض وشیعیت، بریلویت، پرویزیت، نیچریت، لامذہبیت، وہابیت، مودودیت، کمیونزم، نیشنلزم، کیپٹلزم وغیرہ) کے بارے میں جمعرات وجمعہ کو اساتذہ کرام طلبہ کو ٹھوس بنیادی مواد فراہم کرکے علمی اور تحقیقی رنگ میں رد کرنے کا طریقہ سکھلائیں۔ مناسب استعداد رکھنے والے طلبہ کو رشیدیہ کا پڑھانا بھی مفید ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ"

مذکورہ نصاب کی خصوصیات اور درس نظامی سے تقابلی جائزہ

۱۔ اس نصاب کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا دورانیہ نو سال ہے، جب کہ مروجہ درس نظامی گیارہ سال پر مشتمل ہے، اس میں اعدادیہ کو تین کی بجائے ایک سال کر دیا گیا ہے اور ایک سال میں بنیادی تعلیم دے کر اسے براہ راست درس نظامی میں منتقل کیا جاتا ہے۔

۲۔ سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو نصاب کا باقاعدہ جزو بنایا گیا ہے، اعدادیہ میں شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی کتاب

"سیرۃ الرسول مترجم" اور درجہ ثالثہ میں شیخ خضری کی جامع کتاب "نور الیقین فی سیرۃ سید المرسلین" رکھی گئی ہے، سیرۃ کو سبقاً پڑھنے سے طلبا کی علمی وعملی زندگی پر جو دوررس اثرات مرتب ہوتے ہیں، وہ اہل نظر پر مخفی نہیں۔

۳۔ ترجمہ قرآن کے حوالے سے اس نصاب کی اہم خصوصیت عم یتساءلون کی بجائے پہلے پارے سے ترجمہ کی ابتدا ہے۔ آخری پاروں میں مکی سورتیں ہونے کی وجہ سے فصاحت وبلاغت کا سمندر موجزن ہے، آخری پاروں میں مستعمل الفاظ اور استعارات ایک ماہر مفسر کو بھی چکرا دیتی ہیں، چہ جائیکہ ایک مبتدی طالب علم اس کو آسانی سے سمجھ جائے، اس لئے ابتدائی طلبا کے لئے اس کا بامحاورہ ترجمہ یاد کرنا ایک کٹھن کام ہے، جب کہ قرآن پاک کی ابتدائی سورتیں آخری پاروں کی بنسبت آسان اسلوب بیان کی حامل ہیں، جس کی وجہ سے اس کا ترجمہ یاد کرنا اور اسے سمجھنا مبتدی کے لئے زیادہ وقت والا کام نہیں ہے۔

۴۔ مروجہ درس نظامی میں علم صرف کی صرف دو کتب داخل نصاب ہیں۔ اولیٰ میں علم الصرف یا ارشاد الصرف اور ثانیہ میں علم الصیغہ، جب کہ اس نصاب میں علم صرف کی کل چھ کتب داخل ہیں، اعدادیہ میں صرف بہائی، اولیٰ میں میزان الصرف، علم الصیغہ اور صرف میر مع تمرین اور ثانیہ میں مراح الارواح اور فصول اکبری شامل نصاب ہیں۔ اہل علم جانتے ہیں کہ یہ کتب علم صرف کے مختلف گوشوں تعلیلات، صیغ، قوانین، ابواب صرف اور خاصیات ابواب کا جامع ذخیرہ ہیں۔

۵۔ علم نحو کو بھی اس میں وافر حصہ دیا گیا ہے، ابن ہشام الانصاری کی دو اہم کتب شذور الذہب اور اوضح المسالک کا اضافہ کیا گیا ہے، اس کے ساتھ شرح جامی مکمل داخل نصاب ہے، جبکہ مروجہ درس نظامی میں مرفوعات تا مبنیات نصاب کا حصہ ہے۔

۵۔ منطق کے حوالے سے دو تبدیلیاں کی گئی ہیں:

ایک علامہ تفتازانی کا مشہور زمانہ متن "تہذیب المنطق" اور اس کی شرح "شرح التہذیب" کو الگ الگ سالوں میں پڑھانے کی تجویز دی گئی ہے۔ دوسرا علامہ محب اللہ بہاری کی کتاب "سلم العلوم فی علم المنطق" کو نصاب کا حصہ بنایا گیا ہے، یہ کتاب درس نظامی کا حصہ تھی، لیکن چند سالوں سے اسے نصاب سے خارج کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ اس کا مشہور حاشیہ تحریر کند یا علی سلم العلوم یا شرح ملاحسن" کو بھی نصاب کا جزو بنایا گیا ہے۔

۷۔ فلسفہ کے حوالے سے میبذی اور اس کا متن ہدایۃ الحکمت کو باقی رکھا گیا ہے، میبذی بھی چند سالوں سے نصاب میں کتر بیونت کا شکار ہو کر نصاب سے خارج کی گئی ہے۔

۸۔اصول فقہ کے حوالے سے بھی دو اہم تبدیلیاں کی گئی ہیں:

توضیح تلویح کی بجائے علامہ بہاری کی مشہور زمانہ کتاب مسلم الثبوت کو انتہائی کتاب کے طور پر داخل نصاب کیا گیا ہے۔تلویح کا متن بلاشبہ حنفی اصول فقہ کے اہم ترین متون میں سے ہیں،لیکن علامہ تفتازانی کی شرح نے اسے چیستاں بنا دیا ہے،جس سے طلبا خاطر خواہ فائدہ حاصل نہیں کر سکتے ،جبکہ مسلم الثبوت متکلمین کے طرز پر ایک جامع متن ہے ،تدریسی حوالے سے ایک مفید کتاب ہے لہٰذا توضیح کے ساتھ اسے نصاب کا حصہ بنانا ایک اہم فیصلہ ہے۔اسی طرح حسامی کے ساتھ اس کا مشہور زمانہ حاشیہ"مولوی یعقوب"کو بھی نصاب کا حصہ بنایا گیا ہے اور خاص طور پر اس کا قیاس والا حصہ مستقل رکھا گیا ہے،تاکہ قیاس اور اس کے مباحث سے طلبا کو خوب شناسائی ہو۔

۹۔بلاغت کے حوالے سے مروجہ درس نظامی کا کل سرمایہ دروس البلاغۃ اور مختصر المعانی (الفن الاول والثالث) ہے،جب کہ اس نصاب میں درجہ ذیل اہم اضافے کئے گئے ہیں:

۱۔مختصر المعانی کو دو سالوں میں مکمل داخل نصاب کیا گیا ہے۔

۲۔مطول کو بھی نصاب کا جزو بنایا گیا ہے۔

۳۔علامہ جرجانی کی کتاب"دلائل الاعجاز"اس نصاب میں بلاغت کے حوالے سے اہم ترین اضافہ ہے۔

۴۔بلاغت میں ابتدائی متن کے حوالے سے تلخیص المفتاح کو بھی تجویز کیا گیا ہے۔

۱۰۔فقہ کے حوالے سے دو تبدیلیاں کی گئی ہیں:

۱۔نور الایضاح کو نصاب کا حصہ بنایا گیا ہے،مروجہ درس نظامی میں یہ کتاب بعض مدارس میں پڑھائی جاتی ہے، جب کہ نصاب میں یہ باقاعدہ شامل نہیں ہے۔ ۲۔شرح الوقایہ کی بجائے شرح النقایہ کو نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔ اس کی اہمیت محتاج بیان نہیں۔

۱۱۔عقائد کے حوالے سے ایک اہم اضافہ چھٹی صدی ہجری کے معروف حنفی عالم الفرغانی کا قصیدہ"بدء الامالی" کو نصاب میں داخل کیا گیا ہے،اس قصیدہ میں ماتریدی مکتب فکر کے مطابق تمام اہم عقائد کو بیان کیا گیا ہے۔شرح عقائد سے پہلے عقائد کے حوالے سے ایک متن کا پڑھانا ضروری ہے،کیونکہ شرح عقائد میں دلائل کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر نفس عقائد سے عموماً لاعلمی رہتی ہے۔اسی طرح اشارات المرام کی تجویز بھی انتہائی اہم ہے۔

۱۲۔اس نصاب کی ایک اور اہم ترین خصوصیت جو موجودہ دور میں تمام اہل مدارس کے لئے قابل تقلید ہے وہ عصری فتنوں کے بارے طلبہ کو آگاہ کرنا اور ان سے مکالمہ کے مدلل اسلوب کو سکھانا ہے۔کاش کہ عصر حاضر کی انتہائی اہم ضرورت ہونے کے ناطے اہل مدارس اس طرف توجہ دیں۔

مدارس دینیہ میں تعلیم وتربیت کے حوالے سے آپ کے تحریر کردہ خطوط

درس وتدریس اور تعلیم وتربیت پر حضرت اورکزئی شہید رحمہ اللہ کے تحریری سرمایے میں دوسری اہم چیز مختلف اہل علم کو لکھے گئے آپ کے خطوط ہیں، ان خطوط کی تعداد اگرچہ کچھ زیادہ نہیں لیکن ان کے اندر تعلیم وتربیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے، ان پہلوؤں سے حضرت اورکزئی شہید رحمہ اللہ کے نظریہ تعلیم کی ایک جھلک سامنے آتی ہے، ہم ان خطوط سے چند منتخب اقتباسات قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

۱۔ دینی تعلیمی ادارے کا نصب العین اور ہدف کیا ہونا چاہیے؟

قاضی سراج الدین صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"سب سے پہلے تعلیمی ادارہ کا نصب العین اور مسلک متعین ہونا چاہیے۔ ہمارے نزدیک حق تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے ایک دینی تعلیمی ادارہ کا مقصد علوم دینیہ کی خدمت برائے تحفظ واشاعت دین ہونا چاہیے۔ اس مقصد کے پیش نظر ہر دینی تعلیمی ادارہ کا فرض ہے کہ وہ ایسے تعلیم وتربیت کا انتظام کرے جس سے دین کے ایسے مخلص خادم اور سپاہی تیار ہوں جو کتاب وسنت کے صحیح فہم وشعور کے ساتھ اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ سے بھی آراستہ ہوں، تاکہ نیابت نبوت کے تقاضے تعلیم وتلاوت کتاب، تعلیم حکمت، تزکیہ نفوس کے فرائض صحیح طور پر بجالاسکیں۔

فقیر کے نزدیک مسلک کا تعین بھی از حد ضروری ہے، امت کے دینی انحطاط میں جتنا اثر آزادی اور بے لگامی نے دکھایا ہے شاید کوئی اور عنصر اتنا موثر ہو، چاہے اس بے لگامی کو کتنا ہی خوشنما اور مہذب نام دیا جائے مگر ہے سم قاتل ہی۔"

یہ اقتباس اتنی جامعیت کا حامل ہے کہ ہر ادارہ کو اپنے دستور کی پیشانی پر سجانا چاہیے۔

۲۔ اساتذہ کے فرائض اور ادارہ پر اساتذہ کے حقوق

اسی خط میں اساتذہ کے معیار اور ان کے حقوق کے متعلق لکھتے ہیں:

"نصب العین اور مسلک کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے ہم اپنے اداروں میں ایسے اساتذہ مہیا کریں جو تعلیم وتدریس کو حصول رضائے الٰہی کا ذریعہ مانتے اور جانتے ہوں اور اپنا ایک مذہبی فریضہ سمجھتے ہوں، چاہے ان کی شہرت بھی نہ ہو اور فی سبیل اللہ محصور ہونے کی وجہ سے ادارہ کا فرض بنتا ہے کہ ان کی ضروریات کو پورا کرے، مستحق مصرف ہوں تو زکاۃ کی مد سے، ورنہ غیر زکاۃ کی مد سے، اور ادارہ کے مسلک کے ساتھ ان کی وفاداری غیر متزلزل ہو، تاکہ مشنری جذبے سے کام کرسکیں۔ ادارہ اس بات کا اہتمام کرے کہ اساتذہ کا کردار

صرف ڈیوٹی بجالانے والے ملازم جیسا نہ ہو، بلکہ معلم انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں طلبہ کی تعلیم، تربیت کا ہمہ وقتی فکر اور اپنے بچوں جیسی شفقت ان کے قلوب میں موجزن رہے۔ تعلیمی ادارہ کی کامیابی کا بظاہر مدار معلمین حضرات کے کردار پر ہے، ان کے انتخاب میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے اور بعد از انتخاب ان کے ادب واحترام کو پوری طرح ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی کارکردگی کا جائزہ لینا از حد ضروری ہے۔"

۳۔ دینی ادارہ کے طلبہ کا معیار کیا ہونا چاہیے؟

آج کل مدارس دینیہ نے اپنے ہاں داخلوں کے لئے مختلف شرائط طے کر رکھی ہوتی ہیں، حضرت اورکزئی شہید رحمہ اللہ کے نزدیک طلبہ کو داخلہ دینے کے معیارات طے کرنے کا اصول حضرت کی زبانی ملاحظہ ہو:

"اساتذۂ کرام کے بعد مدرسہ کا دوسرا اہم ستون طالب علم ہے، طلبہ کے داخلہ کے لئے مناسب معیار مقامی حالات کے مطابق وضع ہونا چاہیے اور ایک اخلاقی ضابطۂ عمل مرتب کر کے ان کے سامنے رکھنا چاہیے، اخلاص کے ساتھ جو پابندی کرے، انہیں داخلہ دیں اور پھر انہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کا مہمان تصور کر کے ان کے اکرام وآسائش کی ہر ممکن کوشش ادارہ کی طرف سے ہو۔"

۴۔ طلبہ کی رہائش وخورد ونوش کا معیار

اس سلسلے میں بڑی اہم بات کی طرف متوجہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" کھانے اور رہائش کا انتظام ایسا ہو کہ ان کے وقار اور خودداری کو ٹھیس نہ پہنچے، پوری ہمدردی کے ساتھ ان کی ضروریات کی فکر رکھی جائے، تو ان شاء اللہ وہ از خود مدرسہ کے نظام اور قانون کا احترام کریں گے۔"

۵۔ طلبہ اگر قانون کی خلاف ورزی کریں تو کیا کرنا چاہیے؟

قانون کی خلاف ورزی کرنے والے طلبہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اگر کوئی خلاف ورزی کرتا ہے تو ایک آدھ مرتبہ تنبیہ وفہمائش کے بعد اسے کڑی سزا ملنی چاہیے، پھر بھی ٹھیک نہ ہو تو اس کا اخراج عمل میں لایا جائے کہ مجموعی لحاظ سے یہ بھی ان کی خیر خواہی کا تقاضا ہے۔"

۶۔ سیاست میں طلبہ کا کردار

سیاسیات حاضرہ میں طلبہ کے کردار کے حوالے سے ہمارے ہاں عموماً افراط وتفریط پایا جاتا ہے، بعض مدارس میں سیاست کی اتنی کھلی چھوٹ ہوتی ہے کہ وہ مدرسہ کی بجائے "سیاسی کیمپ" کا منظر پیش کرتا ہے، جب کہ بعض مدارس میں سیاست پر اتنی سخت پابندی ہوتی ہے کہ طلبہ اپنے گرد وپیش اور ملکی وبین الاقوامی حالات سے مکمل بے خبر ہوتے ہیں، حضرت اورکزئی شہید رحمہ اللہ کی دوررس نگاہ نے اس حوالے سے معتدل راستے کی نشاندہی کی ہے۔ لکھتے ہیں:

"طلبہ کی تعلیم وتربیت کے لئے از حد ضروری ہے کہ انہیں غیر تعلیمی مشاغل سے سختی سے روکیں اور ان کی ذہنی سیاسی تربیت کے ساتھ ساتھ عملاً انہیں سیاست سے مکمل طور پر دور رکھیں۔ ہماری تعلیمی تباہی اور اخلاقی زوال کا بڑا سبب مدارس میں سیاست کا داخلہ ہے، ہماری اس رائے سے بہت سے حضرات کو اختلاف ہے، بلکہ چیں بہ جبیں ہیں، لیکن حقائق حقائق ہوتے ہیں، چاہے ان میں کتنی ہی کڑواہٹ ہو۔"

۷۔طلبہ کی تعداد اور آپ رحمہ اللہ کا نظریہ

آج کل مدارس میں ایک دوسرے سے جن چیزوں میں آگے بڑھنے کا رجحان زور پکڑ رہا ہے، ان میں طلبہ کی تعداد بھی ہے اور اسے خاص طور پر مدرسہ کے تعارف میں نمایاں کیا جاتا ہے، حضرت اورکزئی شہید رحمہ اللہ اس حوالے سے فرماتے ہیں:

"طلبہ کے بارے میں ایک نہایت اور ضروری بات یہ عرض کروں کہ کثرت پر ہرگز خوش نہ ہو، خوشی اور اطمینان قابلیت پر ہونی چاہیے۔ عددی لحاظ سے کم اور مختصر لائق طلبہ کی جماعت مہملوں اور آوارگان کے انبوہ عظیم سے زیادہ بہتر ہے۔ پھر نیکی اور صلاح کو غیر صالح ذہانت اور قابلیت پر ترجیح دیں۔ غبی صالح، ذکی غیر صالح سے بدرجہا بہتر ہے۔"

۸۔چندہ کے حوالے سے ایک اہم نکتہ

مدارس میں چونکہ مختلف مدات سے چندہ آتا ہے، اس لئے بسا اوقات چھان بین کی زیادہ ضرورت نہیں سمجھی جاتی ، حضرت اس حوالے سے ایک اہم بات کی طرف توجہ مبذول کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مقصد تب پورا ہوگا کہ انہیں جو غذا میسر ہو، وہ حلال کی ہو، بغیر حیلے اور دوسرے ناجائز ہتھکنڈے کے حق تعالیٰ جو رزق پہنچائے، اسی پر قناعت ہو، جتنی گنجائش ہو اتنے ہی اساتذہ اور طلبہ رکھے جائیں۔"

تعلیم وتربیت کے حوالے سے یہ اہم نکات اور فرمودات قاضی سراج الدین کو لکھے گئے خط سے ماخوذ ہیں۔

۹۔وفاق اور اس کے نصاب ونظام پر مثبت تنقید

حضرت اورکزئی شہید رحمہ اللہ وفاق کے موجودہ نصاب اور نظام سے مطمئن نہیں تھے، اسی وجہ سے آپ نے اپنے جامعہ یوسفیہ کا الحاق وفاق سے ختم کر کے اس میں نیا نصاب جاری کیا تھا، آپ نے صدر وفاق کو دو صفحات پر مشتمل ایک خط بھی تحریر کیا تھا، جس میں وفاق کے نظام اور موجودہ نصاب کی خامیوں کی نشاندہی کی تھی، ہم اس خط کو تاریخ کا حصہ بنانے کے لئے اس سے اہم نکات قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں:

(۱) موجودہ نصاب مدارس کے نصب العین سے مطابقت نہیں رکھتا

"وفاق المدارس کا مجوزہ نصاب تعلیم مدارس اسلامیہ کے نصب العین "علوم دینیہ میں مہارت رکھنے والے افراد پیدا کرنا جو کتاب وسنت کا صحیح فہم وشعور رکھنے کے ساتھ تعلیم وتدریس اور دیگر دینی ذمہ داریاں پوری کرنے کے اہل ہوں" کو حاصل کرنے میں کافی ثابت نہیں ہوسکتا، اصل ہدف کے علاوہ کچھ اور مصالح کا بھی تقاضا ہے کہ نصاب میں کچھ تبدیلیاں لائی جائیں۔"

(ب) امتحانات کے نظام پر تبصرہ

"امتحانات کا نظم ونسق ناقابل برداشت حد تک مختل ہے، سوالات میں توازن کا فقدان ہے، نگرانوں کا انتخاب ناقابل اطمینان ہے، محل امتحان کے تعیین میں تساہل ہے، چھوٹے درجات کے طلبا کا امتحان کے لئے دوسری جگہ لے جانا محل نظر ہے۔"

(ج) سند کی فیس پر فقہی شبہ

"سندات کی فیسوں میں اضافہ غریب طلبہ پر ایک اضافی بوجھ ہے، سند کی حیثیت جب شہادت کی ہے تو کامیاب طلبہ کے اس واجبی حق پر فیس وصول کرنے کی گنجائش کس حد تک ہے؟"

(د) بعض کتب میں ردوبدل کا مشورہ

"نحو اور عربیت کے لئے ہدایۃ النحو کی جگہ شذور الذہب یا قطر الندی رکھی جائے اور کافیہ کے ساتھ اوضح المسالک یا شرح ابن عقیل لازمی ہو۔ علوم بلاغت میں ایک سال میں مختصر المعانی جیسی کتاب کا سر دا ہم ترین فن کی توہین معلوم ہوتی ہے مختصر سے پہلے دروس البلاغہ اور بعد میں دلائل الاعجاز یا اسرار البلاغۃ کا اہتمام ہو۔ فقہ میں آج کے حدیثی ذوق کے پیش نظر بجائے شرح الوقایہ "شرح النقایہ" کو لازم قرار دیا جائے۔ اصول فقہ میں تاسیس النظر اور الاشباہ جیسی کتابوں کو سامنے لانے کی ضرورت ہے۔ جلالین شریف کی بجائے مدارک کو نصاب میں جگہ دی جائے اور بیضاوی کی بجائے ابو سعود کا اختیار ہو۔ کلام میں بدء الامالی، العقیدۃ الطحاویہ، اشارات المرام جیسی آلائشوں سے پاک تالیفات کا اضافہ ہو اور موجودہ فرق باطلہ کے عقائد اور مقاصد سے آگاہی اور رد کا اہتمام کیا جائے۔"

(ر) اختلاف کے باوجود ادارہ وفاق کے لئے نیک تمنا

حضرت اورکزئی شہید رحمہ اللہ نے اگرچہ ان وجوہات کی بنا پر اپنے جامعہ یوسفیہ کا وفاق سے الحاق ختم کیا تھا، لیکن اس اختلاف کے باوجود اس خط کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

"وفاق المدارس ہمارے اکابر کی یادگار تنظیم ہے، علیحدگی کے باوجود ہم اس کے حقیقی ترقی کے متمنی رہیں گے۔

۱۰۔ جامعہ یوسفیہ کا دستور اور آپ کا تعلیمی وژن

حضرت اورکزئی شہید رحمہ اللہ نے اپنے قائم کردہ جامعہ یوسفیہ کا دو صفحات پر مشتمل دستور مرتب کیا تھا، اس میں اکثر چیزیں انتظامی نوعیت کی ہیں، البتہ بعض دفعات تعلیم سے متعلق ہیں، ان سے جہاں آپ کا نظریہ تعلیم واضح ہوتا ہے، وہاں آپکی وسعت فکر اور تعلیمی میدان میں آپ کی گہرائی اور گیرائی سامنے آتی ہے، یہ دفعات پیش خدمت ہیں:

(ا) جامعہ کا نصب العین

"امت مسلمہ کے زوال وانحطاط کا بہت بڑا سبب چونکہ علوم نبوت سے محرومی اور کتاب وسنت سے دوری ہے، اس لئے جامعہ کا نصب العین نیابت و وراثت نبوت کے تقاضوں کو پورا کرنا ہوگا یعنی تلاوت کتاب (بلوازمھا)، تعلیم کتاب اللہ، تعلیم حکمت (بفروعھا) تزکیہ قلوب ونفوس وتربیت اخلاق، ان فرائض کی ادائیگی کے لئے رجال کار مہیا کر کے پیغمبرانہ منہاج، سلف صالحین کا اتباع کرتے ہوئے اصلاح معاشرہ اور امت میں دینی انقلاب برپا کرنا جامعہ کا مقصد اور پروگرام ہے۔"

(ب) مستقبل کے تعلیمی منصوبے

۱۔ جب بھی وسائل مہیا ہوں گے تو علوم دینیہ میں تخصصات کے علاوہ عصر حاضر کے غیر اسلامی دساتیر پر مؤثر فاضلانہ تنقید اور اسلامی شریعت کی بحیثیت دستور حیات ترتیب وتشریح اور دوسرے قوانین پر اس کی برتری اور ترجیح اور اس کے مطابق زندگی کے گوناگوں مسائل کے حل اور فیصلہ کرنے کی تمرین کا مناسب انتظام کیا جائے گا۔ ۲۔ مختلف اسلامی زبانوں بالخصوص اعلیٰ معیاری عربی زبان میں تقریر وخطابت اور تحریر وکتابت کی مشق دی جائے گی۔ ۳۔ عصری علوم سے بقدر ضرورت واقفیت حاصل کرنے کا انتظام ہوگا، جب کہ غیر ضروری قدیم فنون کو نظر انداز کیا جائے گا۔

۱۱۔ مدرسہ میں تعلیم سے زیادہ تربیت اہم ہے

حضرت بنوری رحمہ اللہ کو ایک نیاز مندانہ خط میں لکھتے ہیں: "سالہا سال سے حضرت والا کے سایہ رحمت میں رہ کر حضرت والا کی فرمودات اور طرز عمل کی روشنی میں احقر کو یہ یقین حاصل ہوا ہے کہ ہمارا مدرسہ صرف تعلیم گاہ نہیں، تربیت گاہ بھی ہے، بلکہ تربیت تعلیم سے زیادہ اہم ہے، حضرت کے ارشاد گرامی "مدرستنا ھذہ دار دین قبل ان تکون دار علم" کو پورے نظام کا نصب العین اور مدرسہ کی روح سمجھتا ہوں۔"

۱۲۔ طلبہ کی تعلیم وتربیت میں اساتذہ کی ذمہ داریاں

اسی خط میں تعلیم وتربیت میں اساتذہ کے کردار سے متعلق لکھتے ہیں:

''تجربہ ہے کہ بد اخلاقی عموماً مہملین میں پائی جاتی ہیں۔'' خانہ خالی را دیو میگیرد'' اس لئے اہمال کا ازالہ بے حد ضروری ہے، اس سلسلے میں فقیر کی رائے یہ ہے کہ اساتذہ کا کردار فیصلہ کن ثابت ہوگا:

(الف) اگر نصابی کتب کے تین حصے بنائے جائیں، ایک سہ ماہی تک، دوسرا ششماہی تک، تیسرا سالانہ تک اور باضابطہ طور پر مقررہ مدت میں مقررہ حصہ پڑھایا جائے۔ (ب) اور پڑھانے میں لمبی چوڑی تقریر کی بجائے حل کتاب پر اکتفا ہو۔ (ج) متعلمین کو سمجھانا نصب العین ہو، صرف ڈیوٹی پوری کرنے کا معاملہ نہ ہو۔ (ھ) ہر مہینہ کے آخر میں جمعرات یا ہفتہ کو ہر استاد اپنی کتاب کا مختصر تحریری یا تقریری امتحان لے۔ (و) تساہل برتنے والے لڑکوں پر سختی کرے۔ (ز) غیر حاضری یا دیر سے درس میں آنے پر باز پرس ہو۔''

۱۳۔ کتب فقہ کی تدریس کا طریقہ کار

کتب فقہ کی تدریس کا زریں اصول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فقہ میں مختصر القدوری میں صرف متن کا مسئلہ یاد کرایا جائے اور کتاب پوری ختم ہو، اور کنز میں مفتیٰ بہ قول کے ساتھ اپنے ائمہ کے اختلافات کے ذکر پر اکتفا ہو اور کتاب ضبط کرائی جائے اور الاختیار میں جن مذاہب کے رموز ہیں ان کی تشریح ہو اور مختصر طور پر ہر قول کی دلیل بھی، اور ہدایہ میں تحقیق کا حق ادا کیا جائے تو غالباً مثمر اثرات ہوگا۔ قدوری اور کنز میں اگر تفصیلات ذکر کی جائیں تو نہ صرف یہ کہ لڑکے یاد نہیں کر سکتے، بلکہ یاد کرنے کی بے جا کوشش میں لگ کر فنون کی دوسری ابتدائی کتابوں کے فہم اور ضبط سے محروم ہو جاتے ہیں۔"

۱۴۔ اخلاقیات کو نصاب میں شامل کرنے کی ضرورت

نصاب میں کتب اخلاق کی کمی کا رونا روتے ہوئے مولانا بنوریؒ کے نام لکھتے ہیں:

"ہماری نصابی کتب بے شک اخلاقیات پر حاوی ہیں، لیکن ایک تو اخلاقیات کا حصہ متشخص نہیں، پھر پڑھانے کا انداز وہی علمی ہوتا ہے اصلاحی نہیں، اس لئے فقیر کی رائے ہے کہ حسب امکان تعلیم المتعلم، تنبیہ الغافلین، کتاب الزہد، الادب المفرد، ریاض الصالحین، احیاء العلوم وغیرہ کتابیں صرف اور صرف اخلاقی نقطہ نظر سے پڑھائی جائیں تو یہ خلا پر ہو سکے گا۔

حضرت والا کو بخوبی معلوم ہے کہ موجودہ صورتحال یہ ہے کہ فقہ وحدیث کی کتابیں مناظرانہ انداز میں پڑھائی جاتی ہیں، یا زیادہ سے زیادہ محققانہ انداز میں تفسیر میں فقہی مباحث کے ساتھ لغوی وکلامی مباحث کا اضافہ ہوتا ہے، اور حد یہ ہے کہ قرآن حکیم کے ترجمہ تک میں لغوی، ادبی فقہی اور کلامی مسائل پر زور دیا جاتا ہے، امتحانی سوالات سے اس کا بخوبی پتا چلتا ہے۔ الغرض اخلاقی نقطہ نظر سے پڑھنے پڑھانے کے لئے ہمارے پاس کچھ نہیں۔ کچھ بات اگر کہی بھی جاتی ہے تو واعظ کی حیثیت سے، نہ کہ مصلح مربی کی حیثیت سے۔"

۱۵۔ ہر درجہ کا مسئول ومربی مقرر ہو

تربیت طلبہ کا اہم انتظامی اصول بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"الحمدللہ ہمارے اساتذۂ کرام علم کے ساتھ زیورِ صلاح سے بھی آراستہ ہیں، اگر ایک درجہ کے طلبہ کی تربیت اور اصلاح کی ذمہ داری ایک ایک استاذ کے ذمہ لگائی جائے اور وہ استاذ اس درجہ کا باقاعدہ مسئول ونگران ہو تو ان شاء اللہ تعلیم وتربیت کا کام مؤثر طریقہ پر ہوتا رہے گا اور یہ حضرات بھی "تدریس" کے دائرہ سے نکل آنے پر مجبور ہوں گے۔"

۱۶۔ تخصص فی الافتاء کا نصابی لائحہ عمل

حضرت نے اپنے ہاں تخصص فی الفقہ کا مختصر دورانیہ رکھا لیکن اس میں متخصص کے لئے جو نصابی لائحہ عمل طے کیا وہ ہر اعتبار سے کامل ومکمل ہے۔ اس لائحہ عمل کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تمرین الافتاء و تخصص فی الفقہ کے کام کے تین حصے ہوں گے:

(۱) افتاء وتفقہ کے مبادی اور بنیادی نوعیت کے قواعد وضوابط سے آگاہی دراسۃً یا مطالعۃً، یہ کام پہلے سہ ماہی مرحلے کا ہے اور اس کے لئے عقود رسم المفتی کو اصل بنا کر، النافع الکبیر، ہدایہ وشرح الوقایہ کے مقدمات، نیز تاتارخانیہ اور عین البدایہ کے مقدمات اور علامہ کوثری کی فقہ اہل العراق، بلوغ الامانی، حسن التقاضی، الامتاع وغیرہ رسائل، ردمحتار وطحطاوی وغیرہ کے ابتدائی حصے بطور معاون مطالعہ حاصل کیے جائیں۔

(ب) تاسیس النظر، الاشباہ والنظائر یا شرح القواعد الفقہیہ یا قواعد الفقہ قسم کی کتابوں کی مدد سے قواعد وکلیات کا انضباط اور ان قواعد سے جزئیات کا استخراج یا جزئیات پر انطباق کی مشق، یہ کام دوسرے سہ ماہی میں زیادہ موزوں ہوگا۔

(ج) درمختار کلاً یا بعضاً پڑھنا ردمحتار کے لازمی مطالعہ کے ساتھ اور بدائع الصنائع ومبسوط کو بنظر غائر مطالعہ کرنا اور ہندیہ وبزازیہ کا عربی فتاویٰ جات میں سے سرسری مطالعہ کرنا۔ ہمت ہو تو قاضی خان، تاتارخانیہ، خلاصہ، رحیمیہ، محمودیہ، فتاویٰ دارالعلوم دیوبند اور احسن الفتاویٰ وغیرہ طائرانہ نگاہ سے دیکھی جائیں، یہ کام ابتدا سے آخر تک مسلسل کرنے کا ہے۔

(د) ششماہی کے بعد آخری سہ ماہی میں باقاعدہ سوالات کے جوابات لکھنے کی مشق، چاہے یہ سوالات واقعی ہوں یا تمرین کے لئے تجویز شدہ ہوں۔''

یہ لائحہ عمل اگر بااستعداد اور محنتی طلبہ کے لئے رائج کر دیا جائے تو کم وقت میں انتہائی بہتر نتائج ملیں گے۔

۱۷۔ تخصص فی الحدیث کا نصابی لائحہ عمل

مولانا اورکزئی شہیدؒ نے تخصص فی الحدیث کا بھی عمدہ نصاب تجویز فرمایا اور پھر اسی منہج پر کئی متخصصین تیار کیے۔ تخصص حدیث میں آپ سے استفادہ کے لئے بیرون ملک کے طلبہ کی بھی آمد رہتی۔ حضرت نے اپنے دست مبارک سے عربی میں چار مراحل کے اندر اس نصاب کی تفصیلات تحریر فرمائی ہیں۔ جو پیش خدمت ہیں:

"المرحلة الاولى: مصطلح الحديث

(ا) ينبغي للمتخصص في الحديث أن يحفظ ويضبط متن "نخبة الفكر لابن حجر ؒ" أو "ألفية العراقي ؒ" أو "التقريب للنووي ؒ"

(ب) ويطالع "تدريب الراوي للسيوطي اصالةً بامعان وتدبر ويطالع مع كل مبحث من التدريب سائر كتب المصطلح كالمقدمة لابن الصلاح و فتح المغيث للسخاوي و الكافية للخطيب و التبصرة والتذكرة للعراقي و الباعث الحثيث لابن كثير وتوجيه النظر للجزائري و كوثر النبي للفرهاروي وقواعد التحديث للقاسمي وتوضيح الأفكار للصنعاني وعلوم الحديث للحاكم وعلوم الحديث ومصطلحه للصبحي الصالح والالماع للقاضي عياض وغير ذلك من الكتب المطبوعة الموجودة۔

(ج) ويكتب في مذكرته مايعثر عليه من الفوائد المهمة التي لاتوجد في التدريب ويطالع ايضاً "باب السنة" من كتب الاصول۔

المرحلة الثانية: الجرح والتعديل وأسماء الرجال

وينبغي أن يضبط في هذه المرحلة القاعدة في الجرح والتعديل للسبكي ؒ (ضمن اربع رسائل في علوم الحديث /جمع وتحقيق: عبدالفتاح أبو غدة ؒ) والرفع والتكميل للكنوي ؒ ومايتعلق بهذا الموضوع من كتاب "جامع بيان العلم لابن عبد البر ؒ" ويطالع معه الخلاصة للخزرجي ؒ وتهذيب التهذيب للعسقلاني ؒ وتهذيب الكمال للمزي ؒ ولسان الميزان للعسقلاني ؒ وميزان الاعتدال للذهبي ؒ وتذكرة الحفاظ له مع ذيولها۔ وماتيسر له من كتب الرجال والطبقات مقارناً بين ماجعله أساساً بين هذه الكتب۔ ويكتب في كراسته مايجده من الفوائد وليكن على حذر بالغ في أثناء المطالعة عن سوء الظن بالسلف الصالحين من الصحابة ومن التبعهم باحسان من أئمة العلم ورجال الدين۔

المرحلة الثالثة: مختلف الحديث

يطالع في هذه المرحلة "تاويل مختلف الحديث "لابن قتيبة ؒ الاصالة والمشكل لابن فورك ؒ والمعتصر من المختصر من مشكل الاثار ليوسف بن موسى الحنفي ؒ ومشكل الآثار للطحاوي ؒ وتهذيب الآثار للطبري ؒ وغيرذلك من الكتب المهمة التي فيها شرح

الأحاديث المشكلة والمتعارضة ظاهراً۔

المرحلة الرابعة: تفسير الحديث

ينبغي أن يطالع المقدمة لفتح الباري لابن حجر ﷺ وشروح كتب الحديث المهمة كمعالم السنن شرح سنن أبي داؤد للخطابي ﷺ والمنتقى شرح المؤطا للباجي وبهجة النفوس شرح مختصر البخاري لابن أبي حمزة ﷺ وفتح الباري لابن حجر ﷺ وعمدة القاري للعيني ﷺ والمنهل العذب المورود شرح سنن أبي داؤد لمحمد محمود خطاب السبكي وغيرها على سبيل المقارنة بينها۔"

ان مراحل مطالعہ وتدریب سے اہل فن پر بخوبی واضح ہوگا، کہ اگر اس نصاب کو سنجیدگی سے کماحقہ برتا جائے تو حدیث وعلوم حدیث سے کامل ممارست پیدا ہونا کوئی بعید بات نہیں۔

ارشاد الحلیم الی آداب التعلیم کی روشنی میں آداب تعلیم وتعلم

تعلیم وتعلم اور درس وتدریس سے بے انتہا لگن کا نتیجہ تھا کہ حضرت اورکزئی شہید رحمہ اللہ نے علم التعلیم کی تاریخ میں منفرد اور یکتا کام کیا اور حضرت خضر وحضرت موسیٰ علیہما السلام کے واقعہ سے تعلیم وتعلم کے آداب، علم کی ماہیت و اقسام، علم کی شرائط وموانع، مؤیدات وآفات، معلم ومتعلم کے فرائض وحقوق، علم کے لئے سفر وہجرت کے آداب اور تعلیم وتعلم سے وابستہ دیگر کثیر اور بیش بہا فوائد واصول کا استخراج کیا۔ یہ رسالہ دوسو نوای فوائد پر مشتمل ہے، واقعہ خضر وموسیٰ (علیہما السلام) تقریباً تیئس آیتوں اور دو رکوع میں بیان ہوا ہے، قرآن پاک کے صرف دو رکوع سے پورے علم (علم التعلیم) کا استخراج تفسیر کی تاریخ میں انوکھا اور تاریخی کارنامہ ہے، اس واقعہ کے ضمن میں اگرچہ مفسرین نے تعلیم وتعلم سے متعلق متفرق نکات وفوائد کا ذکر کیا ہے، لیکن وہ پندرہ بیس سے زائد نہیں، یہ حضرت اورکزئی شہید رحمہ اللہ کی قرآن فہمی، تعلیم وتعلم سے مضبوط وابستگی اور اللہ کے کلام میں پوشیدہ حکم واسرار پر طویل تدبرو تفکر کا ثمرہ تھا کہ چند آیات سے سینکڑوں نکات وفوائد مستنبط کیے، یہ رسالہ اس قدر قیمتی خزینہ ہے کہ اسے پورا نقل کرنا چاہیے، لیکن صفحہ قرطاس کی تنگ دامانی کی وجہ سے اس رسالے سے تعلیم وتعلم سے متعلق چند اہم وضروری نکات قارئین کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں، اس سے جہاں قرآن سے معانی وحکم کے استخراج کا اسلوب سامنے آئے گا، وہاں قارئین حضرت کی دور بینی اور قرآن فہمی کی مہارت وگہرائی کی بھی ایک جھلک ملاحظہ کرلیں گے۔

(۱) کمالات مکسوبہ میں علم کا امتیاز

کمالات مکسوبہ میں علم سے بڑھ کر کوئی کام نہیں، سیدنا موسیٰ علیہ السلام اولوالعزم انبیاء کرام میں سے ہیں، حق

تعالیٰ سے شرف ہم کلامی اسے حاصل ہے، تورات جیسی عظیم کتاب ساتھ ہے، بنی اسرائیل جیسی قوم کی سیادت و قیادت ہاتھ میں ہے، جو اس وقت علمی لحاظ سے روئے زمین پر سب سے ممتاز قوم تھی، ان فضائل و کمالات کے باوجود اس واقعہ میں علم کے طالب دکھائی دیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ تاجدار ختم نبوت علیہ الصلوٰۃ والسلام سے فرمایا گیا: قل رب زدنی علماً۔

(۲) علم کی حرص محمود ہے

صرف علم ہی نہیں، بلکہ علم میں اضافہ کاملین کو مطلوب رہا ہے، جیسا کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے کردار سے ظاہر ہے اور "زدنی" کی تعبیر سے اس کی تائید ہوتی ہے اور "منھومان لایشبعان" کی حدیث میں اس کی ترغیب آئی ہے۔

(۳) علم الحقائق والاسرار کی اہمیت

علم الشرائع مدار نجات ہونے کی وجہ سے اگر چہ بلاشبہ اجل العلوم ہیں، تاہم علم الحقائق والاسرار کی عظمت و جلالت بھی ناقابل انکار ہے، مقام امتنان میں "وعلمناہ من لدنا علما" بصیغۃ المتکلم مع الغیر اور "من لدنا" کے اضافہ و تعبیر کے ساتھ اور مفعول ثانی کی تنکیر کے ساتھ ارشاد فرمانا اس کا شاہد صادق ہے۔

(۴) مدن و امصار اور دیہات و سواحل الگ الگ علوم کا محل ہیں

علوم کسبیہ کی تحصیل کے لئے مدن و امصار اور اجتماع زیادہ موزوں ہیں، جبکہ علم الحقائق کی تحصیل و حصول کے لئے براری و سواحل کی فضا زیادہ مناسب ہے، اور تفرید تخلیہ کی ضرورت ہوتی ہے، حضرت موسیٰ و حضرت خضر علیہما السلام کی اقامت گاہوں سے یہ بات بالکل عیاں ہے، انبیاء علیہم السلام عموماً شہری معاشرے میں مبعوث ہوئے ہیں اور صحرائیوں کے بارے میں فرمایا: "واجدر ان لایعلموا احدود ما انزل اللہ"

(۵) تحصیل علم کی بنیاد علم سے مناسبت ہے

جس علم وفن سے انسان کو مناسبت ہو، اسی کی طلب میں رہے، ورنہ طلب زیادہ نتیجہ خیز نہ ہوگی، کما یظھر ذلک من ارتحال سیدنا موسی و ارتکابه المشاق ثم ارتجاعه بادنی تامل۔

(۶) علم کے ساتھ مصائب کا لزوم

طلب علم کے سفر میں مصائب و مصاعب کا پیش آنا عین متوقع امر ہے، والقصة عن آخرها تشهد علیه وقال ابو یوسف ؒ العلم عز لا ذل فیه و یحصل بذل لا عز فیه۔

(۷) تعلم تعلیم سے بہتر ہے

تعلم کو تعلیم پر ترجیح ہونی چاہیے اگر جمع نہ ہو سکیں، ما رجح سیدنا موسی علیه السلام تعلمه عن الخضر علی

تعلیمہ لبنی اسرائیل

(۸) علم کے لئے ادب واطاعت شرط ہے

اور چاہیے کہ (متعلم) ادب شناس ہو، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی درخواست استفہام کے پیرایہ میں پیش کی، پھر درخواست میں اپنے تابع بننے کا ذکر سب سے پہلے فرمایا اور حضرت خضر علیہ السلام کو عالم و معلم ظاہر فرمایا، پھر "مما علمت" کے ضمن میں ان کے سرمایہ علم میں سے کچھ عطا فرمانے کی اپیل کی جیسا کہ فقیر کسی تونگر سے اس کے کچھ مال کا سوال کرتا ہے۔

(۹) استاد کامل کی مکمل اتباع

اپنے شیخ کی کامل اتباع ہو، حتی کہ اقوال واعمال میں اس کا عکس جمیل و مظہر اتم بننے کی کوشش کرے، کما یفهم من حذف المتعلقات فی قوله: هل اتبعک

(۱۰) شیخ کے بظاہر خلاف شرع افعال کی تاویل کرے

بظاہر خلاف شرع کام شیخ سے دیکھنے میں آئے تو حتی الامکان تاویل سے کام لے اور جائز محامل پر حمل کرے، سوء ظن سے بچے۔

(۱۱) عدم امکان تاویل میں شیخ کے منکر کو منکر سمجھے

اگر تاویل سمجھ میں نہ آئے، تو منکر کو منکر ہی سمجھا جائے، شیخ پر نقد و جرح سے احتراز کرے، فان سیدنا موسی مع الانکار علی الفعل واظب علی اتباع الخضر ولم یفارقه بالمرة۔

(۱۲) معلم کے انتخاب میں طبعی مناسبت کی رعایت رکھے

مزاجی مناسبت نہ ہو یا کوئی اور حاجب ہو تو شیخ سے مفارقت کی درخواست کی جائے، ان سألتک عن شیئ م بعدها فلا تصاحبنی۔

(۱۳) تحصیل علم میں دو بڑی رکاوٹیں

طالب علم کی ناکامی کے دو بڑے سبب ہیں: عدم استقلال اور نافرمانی، اس لئے کسی شیخ کی صحبت اختیار کرتے وقت ان دو موانع سے الگ رہنے کا پختہ عزم کرے، ستجدنی ان شاء الله صابرا ولا اعصی لک امرا

(۱۴) تعلیم میں متعلم کی استعداد وظرف کی رعایت

معلم کو چاہئے کہ متعلم کی استعداد وظروف کے مطابق تعلیم دے اور کلم الناس علی قدر عقولهم کے اصول پر کاربند رہے، ورنہ تعلیم مفید ثابت نہ ہوگی، بلکہ مفارقت پر منتج ہوگی، کما کانت العاقبة فی هذه القصة الهامة۔

(۱۵) متعلم سے خدمت لینا جائز ہے

معلم کے لئے متعلم سے خدمت لینا جائز ہے۔قال موسی علیہ السلام لیوشع اتنا غداء نا ,وفی الحدیث أنہ قال لہ: لا اکلفک الا ان تخبرنی بحیث یفارقک الحوت ,و عبر الکتاب العزیز عن یوشع تلمیذ موسی بلفظ الفتی وھو الخادم عرفاً۔

(۱۶) ہر علم کا اظہار مفید نہیں

بعض علوم کا اظہار غیر ضروری بلکہ نامناسب ہوتا ہے ، کما یظھر من تفاصیل ھذہ القصۃ الطریفۃ خصوصاًمن قول الخضر لموسی علیھما السلام یاموسی انی علی علم لا ینبغی ان تعلمہ انت , الحدیث

(۱۷) معلم کوتاہی پر تنبیہ کرے

کوتاہی پر تنبیہ ہونی چاہئے ،قال ألم أقل لک انک لن تستطیع

(۱۸) القابات میں مبالغہ آرائی سے اجتناب کرے

القاب میں مبالغہ آرائی کی بجائے واقعیت کا خیال رکھا جائے ،لفتاہ ,فوجدا عبداً ,وکان أبوھما صالحا۔

(۱۹) انبیاء علیہم السلام کلی علم نہیں رکھتے

ان کو کلی علم حاصل نہیں ہوتا ، نہ وہ ہر جگہ اور ہر وقت حاضر ناظر ہوتے ہیں ،فقد جاوز سیدنا موسی کلیم اللہ و نجیہ عن مکان الخضر و لم یعلم بہ حتی اخبرہ یوشع بالامارۃ ,و الحاضر فی کل مکان لا یتصور منہ السیر و السفر۔

(۲۰) نسیان پر مواخذہ نہیں ہے

بھول چوک پر گرفت کرنا سخت گیری اور تشدد کے دائرے میں آتا ہے ،وَلاتُرھقنی من امری عسرا۔

(۲۱) علم کی تحصیل سے پہلے مشورہ مفید ہے

علمی سفر اپنے سے اعلم کے مشورے اور ارشاد کے مطابق کیا جائے ۔فقد سال موسی ربہ فکیف السبیل؟فارشدہ الیہ۔

(۲۲) تحصیل کا بہترین زمانہ صغر سنی ہے

صغر سنی میں تعلیم زیادہ مفید ہوتی ہے ،لیکن کبر سنی بھی منافی تعلیم نہیں ،فقد خرج موسی لتعلیم بعد ما جاوز اربعین سنۃ و اکثر اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم کانوا کذالک۔

(۲۳) طالب علم میں مخدومیت نہ ہو

طالب علمی کا محرومیت کے ساتھ لگاؤ نہیں ،رکبا فی السفینۃ ،فترک سیدنا موسی خادمہ یوشع علیہ السلام علی احد الروایات ،حین ماوصل الی الشیخ وصاحبہ متعلما۔

(۲۴)اہل علم کو عامۃ الناس کی خدمت قبول کرنی چاہیے

ازراہ اخلاص اگر کوئی عالم یا متعلم کی خدمت کرنا چاہے تو اسے قبول کرنا چاہیے۔فان موسی والخضر علیہما السلام رکبا فی السفینۃ وحملہا اہلہا مجانا کما ورد فی الآثار والاخبار۔

(۲۵)بوقت رخصت طلبہ سے مشفقانہ رویہ رکھے

رخصت کرتے وقت طلبہ کے ساتھ شفقت اور حسن سلوک سے کام لیا جائے ،ھٰذَا فِرَاقُ بَیْنِیْ وَبَیْنِکَ سَأُنَبِّئُکَ۔الآیۃ

(۲۶)استاذ وشاگرد کے طعام میں امتیاز نہ ہو

معلم ومتعلم کے درمیان طعام وغیرہ میں امتیاز نہیں ہونا چاہئے ،بحیثیت خادم بھی ان کے ساتھ" واطعموھم مما تطعمون " پرعمل رہے" اتنا غدائنا""فنسیا حوتہما" کی اضافتیں اس حقیقت کا پتہ دے رہی ہیں ،وقال شعبۃ :من روی عنی حدیثا فھو مولای۔

(۲۷)اہل علم نسیان سے پریشان نہ ہوں

علم سے تعلق رکھنے والے نسیان سے پریشان نہ ہوں کہ یہ لازمہ بشریت ہے حتی کہ انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام بھی اس سے مستثنیٰ نہیں "فنسیا حوتہما""لاتؤاخذنی بما نسیت

(۲۸)داخلہ مشروط رکھنا درست ہے

معلم کو حق ہے طلباء کو ضابطہ تعلیم اور لائحہ عمل کا پابند بنادے ،اور داخلہ کو مشروط رکھے۔ویوخذ ذالک من قولہ فَإِنِ اتَّبَعْتَنِیْ۔الآیۃ

(۲۹)حصول علم بتدریج ہو

علم جو بھی ہو اس کی تحصیل بتدریج ہونی چاہئے :تعلمنی مما علمت ،فان التدریج من خواص التفعیل

بطور نمونہ یہ تیس نکات پیش کردیئے گئے۔اس رسالہ ۲۸۹ نکات میں سے ہر نکتہ آب زر سے لکھنے کا ہے اور غور و تدبر کیا جائے تو اس میں مسلمانوں کے نظام تعلیم کی مکمل پالیسی موجود ہے۔

مولانا محمد امین اورکزئی شہیدؒ

باکمال منتظم اور ممتاز ماہر تعلیم

محمد طفیل کوہاٹی

حضرت الاستاذ مولانا محمد امین اورکزئی رحمہ اللہ ہمارے ملک کے ایک ممتاز ماہر تعلیم تھے، آپ کی پوری زندگی علوم دینیہ کی تدریس وتعلیم میں گزری۔ آپ نے ملک کے ممتاز اہل علم سے کسب فیض کیا اور پھر جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی جیسے ادارے میں سال ہا سال تدریس اور انتظامی امور سے وابستہ رہے۔ ۱۹۸۰ء میں جامعہ سے مستقل واپسی کے بعد اپنی زرعی زمین میں اپنے شیخ ومربی اور محبوب استاذ مولانا محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ کی یاد میں جامعہ یوسفیہ کے نام سے ایک دینی مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ علاقہ میں علم وتحقیق سے ناآشنائی اور تعلیم وتعلم پر عدم ترکیز کی بدولت یہاں ایک کامیاب اور معیاری مدرسہ چلانا انتہائی مشکل کام تھا لیکن آپ کی ہمت اور اخلاص سے جلد ہی جامعہ یوسفیہ نے ایک مستند اور معیاری درسگاہ کی حیثیت حاصل کر لی اور دور دراز حتیٰ کہ بیرون ممالک سے تشنگان علم آپ سے بغرض استفادہ اس ویران جنگل نما بستی میں حاضر ہونے لگے۔

تعلیم وتربیت کے حوالے سے آپ کی شان مجتہدانہ تھی اور مدرسہ کو عام مروجہ طرز سے ہٹ کر عزیمت کے اصولوں پر چلانے کے روادار تھے۔ اس لیے آپ کی زندگی کے اس پہلو میں اہل بصیرت کے لیے سیکھنے کا کافی مواد ہے۔ ذیل میں آپ کی تعلیمی وتربیتی مہارت اور انتظامی شان کے حوالے سے چند سطور پیش خدمت ہیں۔

(۱)......ٹھوس نصاب کی تشکیل

بہترین اور معیاری تعلیم میں نصاب کا بڑا دخل ہے۔ آپ نے درس نظامی، تخصص فی الفقہ اور تخصص فی الحدیث کے لیے ٹھوس اور معیاری نصاب تشکیل دیا۔ درس نظامی کے نصاب کے ایک عمومی جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ فنون میں مغلق متون کے ساتھ رواں اسلوب، مستند اور تفصیلی فنی کتب کو بھی اہمیت دیتے تھے۔ آپ علوم بلاغت میں محض مختصر المعانی کے سرد کو اس فن کے ساتھ ظلم قرار دیتے تھے اور اس بات پر زور دیتے تھے کہ اس سے قبل دروس

البلاغۃ اور اس کے بعد دلائل الاعجاز یا اسرار البلاغۃ کا اہتمام ہو۔ فقہ کو حدیثی تناظر میں پڑھنے اور سمجھنے کے قائل تھے اس لیے آپ شرح الوقایہ کی جگہ شرح النقایہ کو ترجیح دیتے تھے کیونکہ اس میں اس پہلو کا معتد بہ اہتمام ہے۔ آپ نے شرح النقایہ بارہا پڑھائی اور اس پر فاضلانہ تعلیقات رقم فرمائیں، ان تعلیقات کا قلمی نسخہ جامعہ یوسفیہ کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ اصول فقہ میں مروجہ کتابوں کے علاوہ تاسیس النظر، الاشباہ والنظائر اور اصول بزدوی کو مطالعۃً یا دراسۃً پیش نظر رکھنے پر زور دیتے تھے۔ آپ جلالین شریف کی اہمیت کا اعتراف کرتے تھے اور بارہا اس کا درس بھی دیا لیکن اس کی جگہ مدارک اور بیضاوی کی جگہ ابوالسعود کو زیادہ مؤثر سمجھتے تھے۔ علم الکلام میں بھی آپ عقلی موشگافیوں سے بھرپور کتب کی بجائے عقیدہ طحاویہ، اشارات المرام اور قصیدہ بدء الامالی جیسی کتابوں کو سامنے لانے پر زور دیتے تھے، علم صرف میں مروجہ ایک دو کتابوں پر اکتفا بھی گوارا نہ تھا، بلکہ مراح الارواح، میزان الصرف اور فصول اکبری وغیرہ کو بھی پیش نظر رکھنے کا فرماتے۔ نحو میں کافیہ کی اہمیت کے قائل تھے لیکن درجہ ثالثہ کے طلبہ کے سامنے اس کے طرز تدریس نے اس کی نافعیت کا جنازہ نکال دیا ہے، اور اسے نحو کی جگہ فقہ النحو کی کتاب بنا کر رکھ دیا ہے اس وجہ سے آپ کافیہ کی بجائے اوضح المسالک کو ترجیح دیتے تھے، جب کہ ہدایۃ النحو کی جگہ شذور الذہب یا قطر الندی پڑھانے کے قائل تھے۔ حدیث میں اپنے شیخ کی طرح طحاوی کے درس کو اہمیت دینے پر زور دیتے تھے۔

آپ نصاب میں نافعیت کے تو داعی تھے لیکن تخفیف کو مضر سمجھتے تھے، آپ کا کہنا تھا کہ تسہیل وتخفیف طالب علم میں اہمال پیدا کرتی ہیں، طالب علم پر جتنا بوجھ زیادہ ہو، اتنا ہی اس کی صلاحیتوں میں نکھار اور مقصد سے یکسوئی پیدا ہوتی ہے۔ سہولت پسند طبائع عموماً علمی رسوخ سے عاری رہتی ہیں، اسی فکر کے پیش نظر شروع درجات سے آخر تک آپ کے تشکیل کردہ نصاب میں ایک گونہ ثقل محسوس ہوتا ہے اور اسے کماحقہ پڑھنے والا بظاہر سال بھر گوشہ فراغت یا ضیاع وقت کا تصور ہی نہیں کر سکتا۔

خود ہی ایک صاحب کے نام خط میں نصاب کے حوالے سے ارشاد فرماتے ہیں:

> ''آپ نے نصاب کی درجہ بندی کا ذکر فرمایا ہے، خلوص ومحنت کی توفیق کے لئے دعا فرماتے رہیں۔ ہم نے ایک نصاب بے شک مرتب کیا ہے اور تقریباً چھ/ ۶ سال سے اس پر عمل پیرا ہیں، اس نصاب کی خواہش بہت سے حضرات نے ظاہر فرمائی، مگر عملاً اس کو قبول کرنا اساتذہ کرام اور طلبہ کرام سے قربانی اور محنت شاقہ کا مطالبہ کر رہا ہے جو بدقسمتی سے عنقا بنتا چلا جا رہا ہے۔''

نصاب کے مشکل ہونے کا رونا رونے والوں سے آپ فرماتے کہ انسان کی مخفی استعداد یں دو چیزوں سے اچھی طرح کھلتی ہیں، ایک صدمہ اور دوسری مشقت ومحنت۔ اگر طالب علم محنت کو شعار بنا لے تو اس نصاب میں کسی شے

کے مشکل ہونے کا تصور باقی نہیں رہے گا، یہ محنت سے جی چرانے اور نفس کو سہولت پسندی کی مخفی خواہش کا چسکا فراہم کرنے کے بہانے ہیں۔اس موقع پر آپ نے ہمیں ایک حکیم صاحب کا واقعہ سنایا جو اکثر حضرت کے پاس تشریف لایا کرتے تھے، کہ انسانی آنکھ میں لطیف مخلوق کو بھی دیکھنے کی مخفی قوت ودیعت کی گئی ہے لیکن یہ صلاحیت پوشیدہ ہے اور آسانی سے نہیں کھلتی۔ایک دفعہ اس حکیم صاحب کو سر پر شدید چوٹ لگی، شدت درد اور صدمہ سے کچھ وقت کے لیے ان کی آنکھوں میں وہ مخفی قوت ظاہر ہوگئی اور انہوں نے اپنی آنکھ سے گرد وپیش میں جنات وغیرہ لطیف مخلوقات کو کھلی آنکھوں سے دیکھا۔اس واقعہ کو سنانے کے بعد حضرت فرماتے تھے کہ اگر نفس پر اس درجہ بوجھ ڈالا جائے تو اس میں محفوظ مخفی قوتیں کھلنا شروع ہوجاتی ہیں اور علمی رسوخ نصیب ہوجاتا ہے۔

تخصص فی الفقہ اور تخصص فی الحدیث کے لیے آپ کے تشکیل کردہ نظام الاوقات سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ اس میں متخصص کو انتہائی محنت کرنی پڑتی تھی اور وہ اپنا کامل وقت صرف کرکے ہی آپ کے منہج سے مستفید ہوسکتا تھا۔

(۲)......معیاری تعلیم اور نظم وضبط کا التزام

آپ نے جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کے دور انتظام اور جامعہ یوسفیہ کے دور اہتمام میں معیاری تعلیم کے انتظام کو اولین ترجیح دی۔اس کے لیے اساتذہ اور طلبہ ہر دو کو برابر اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے تھے۔

اپنے دور اہتمام میں آپ کتب کی تقسیم خود فرماتے تھے چونکہ اساتذہ عموماً اپنے تلامذہ ہی ہوتے تھے اس لیے چوں چرا اس کی سرے سے گنجائش ہی نہ تھی، دوسرا ہر استاذ کو اس بات کا پوری طرح اندازہ تھا کہ مجھے اپنی صلاحیت اور استعداد کا اتنا اندازہ نہیں جتنا حضرت الاستاذ جانتے ہیں، اس لیے حضرت کے انتخاب پر پوری طرح تسلی رہتی۔آپ کتاب کی تدریس کے لیے انتخاب کے وقت مدرس کی فن کے ساتھ مناسبت، ذوق اور استعداد کا پورا خیال رکھتے تاکہ طلبہ کا حق ضائع نہ ہو۔اگر کسی مدرس کو کتاب کی تبدیلی کی خواہش ہوتی بھی، تو مجلس تقسیم میں اس کا اظہار بے ادبی تصور کرتے، اس کے لیے بعد میں کسی ذریعے سے یا براہ راست استاذ صاحب سے درخواست کرتے، اگر آپ اس میں مدرس کی بہتری سمجھتے تو اس کی خواہش پوری کردیتے ورنہ طے شدہ پر راضی رہنے کی ترغیب دیتے اور اسی میں اس کی بہتری باور کرواتے۔

اساتذہ کو اس بات کی بھرپور تلقین کرتے کہ پڑھانے کو اپنی سعادت اور نصب العین سمجھیں، آپ کے کام میں اس وقت برکت ہوگی جب پڑھانے کے کام کو اپنی شرعی ذمہ داری اور فرض سمجھ کر ادا کریں، محض ڈیوٹی پوری کرنے

کا معاملہ یا تدریس کے ساتھ عام ملازمتوں کا رویہ علم اور اس مقدس پیشے کی ناقدری ہے۔ جس کا وبال دینی و دنیاوی بے برکتی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

ایک خط میں رقم طراز ہیں:

''نصب العین اور مسلک کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے ہم اپنے اداروں میں ایسے اساتذہ کرام مہیا کریں جو تعلیم و تدریس کو حصولِ رضائے الٰہی کا ذریعہ مانتے اور جانتے ہوں اور اپنا ایک مذہبی فریضہ سمجھتے ہوں چاہے ان کی شہرت نہ بھی ہو........ ادارہ اس بات کا اہتمام کرے کہ اساتذہ کا کردار صرف ڈیوٹی بجا لانے والے ملازم جیسا نہ ہو بلکہ معلم انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں طلبہ کی تعلیم و تربیت کا ہمہ وقتی فکر اور اپنے بچوں جیسی شفقت ان کے قلوب میں موجزن رہے۔''

آپ پڑھانے میں کماً وکیفاً اعتدال برتنے کا فرماتے تھے۔ اساتذہ کو اس بات کی ترغیب دیتے کہ لمبی چوڑی تقریروں کی بجائے حلِ کتاب پر اکتفا کریں اور طالب علم کو سمجھانے کی کوشش کریں، ایک خط میں رقم طراز ہیں:

''جو لڑکے سبق سمجھ لیتے ہیں وہ محنت پر آمادہ ہوتے ہیں اور کام شوق سے کرتے ہیں۔ اساتذہ اگر لڑکوں کو سمجھانے پر خاص توجہ دیں تو کامیابی یقینی ہے۔ طولانی تقریریں اور مبتدی کے سامنے منتہیانہ مباحث تنفر کا باعث بنتی ہیں.......... قدوری اور کنز میں اگر تفصیلات ذکر کی جائیں تو نہ صرف یہ کہ لڑکے یاد نہیں کر سکتے بلکہ یاد کرنے کی بے جا کوشش میں لگ کر فنون کی دیگر ابتدائی کتابوں کے فہم اور ضبط سے محروم ہو جاتے ہیں۔''

ہمارے اکابر کا طرز یہی تھا کہ وہ طالب علم کا رشتہ متنِ کتاب سے مضبوط بناتے تھے اور خارجی مباحث کو وقت کا ضیاع اور استعداد بننے کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے تھے۔ اب تو کتابوں کے خطبات میں رٹی رٹائی تحقیقات سنانے پر مہینے صرف ہو جاتے ہیں۔ آج کل پختہ استعدادیں نہ بننے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ خارجی مباحث میں طلبہ کا بہت سارا وقت ضائع کر دیا جاتا ہے۔ جب سال کا آخر آتا ہے تو کتاب کو رمضانی حفاظ کی طرح بھگا کر ختم کر دیا جاتا ہے۔ بعض مدارس میں تو تین تین چار چار اساتذہ مل کر کتاب ختم کروا رہے ہوتے ہیں، ایسے میں کیا خاک طلبہ کی استعداد بنے گی۔

تدریسی کتابوں کی مقدار اور طرزِ تدریس بھی بتا دیتے تھے، مثلاً فقہ کے بارے میں فرماتے کہ

''مختصر القدوری میں صرف متن کا مسئلہ یاد کرایا جائے اور کتاب پوری ختم ہو۔ کنز میں مفتیٰ بہ قول کے ساتھ اپنے ائمہ کے اختلافات کے ذکر پر اکتفا ہو، اور کتاب ضبط کرائی جائے۔ الاختیار میں جن مذاہب کے رموز ہیں ان کی تشریح ہو اور مختصر طور پر ہر قول کی دلیل بھی اور ہدایہ میں تحقیق کا حق ادا کیا جائے۔''

الغرض اساتذہ و طلبہ کی نصابی و ہم نصابی سرگرمیوں کے حوالے سے مکمل رہنمائی فرماتے تھے۔

نظم وضبط آپ کی طبیعت ثانیہ تھی۔ بغیر نظم کے کسی کام کو گوارا نہیں کرتے تھے، فرمایا کرتے کہ مسلمان دو بھی اکٹھے ہوں تو شریعت نماز کے لیے نظم جماعت کا تقاضا کرتی ہے اس میں سبق ہے کہ مؤمن اپنا ہر عمل منضبط بنائے۔

اوقات مدرسہ کی پابندی اور نظم کا خیال خود بھی مثالی درجہ رکھتے تھے اور اساتذہ وطلبہ سے بھی یہی مطالبہ ہوتا تھا۔ بغیر کسی شدید عذر کے نہ ناغہ کرتے اور نہ ہی کسی طالب علم یا مدرس کا ناغہ یا دیر سے سبق میں آنا پسند کرتے۔ بلکہ اپنے قریبی اعزہ کے تو جائز ناغے سے بوجھ پڑتا اور اس کا اظہار بھی کر دیتے۔ ایک خط میں اپنے پھوپھی زاد مولانا رفیع اللہ خان کو لکھتے ہیں، جو جامعہ حقانیہ سے اپنے والد صاحب کی بیماری کی وجہ سے اسباق کی رخصت لے کر گھر آئے تھے:

> ''باقی آپ نے سبق سے ناغہ کا ذکر کیا تھا، مجھے اس کا سخت افسوس ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اعذار اور مجبوریوں کی وجہ سے ناغہ ہو ہی جاتا ہے، مگر پڑھنے کا شوق جب عشق کے درجہ میں ہو تو ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی گرامی قدر والدہ ماجدہ کی تجہیز وتکفین دوسروں کے حوالہ کر کے خود اپنے عظیم استاذ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے درس میں شریک ہو جاتے ہیں۔''

اساتذہ کو پابند بناتے کہ روزانہ کے سبق کا محاسبہ کریں، ہفتہ وار اسباق زبانی سنیں جب کہ ماہانہ اپنی کتاب کا تحریری امتحان لیں۔ جو طالب علم دلچسپی نہ لے، اس کا کڑا احتساب کریں، خصوصاً لایعنی امور میں بالکل مبتلا نہ ہونے دیں۔ مدرسہ کا نظم وضبط ایسا رکھا کہ اساتذہ وطلبہ بنیادی ضروریات سے فارغ البال ہوں۔ کھانا، کتابیں اور رہائش مفت مہیا تھیں۔ روٹی پکانے کے لیے باورچی مقرر کیا، جب کہ سالن حضرت الاستاذ کے گھر والے خود بناتے تھے۔ یہ معمول ۱۹۸۰ء سے تاحال اسی طرح قائم ہے۔

مدرسہ کی اجتماعی اشیا کی حفاظت، بجلی، پانی اور دیگر اشیائے صرف کے استعمال میں ورع واحتیاط کی جو مثالیں حضرت الاستاذؒ کے ہاں نظر آئیں ان کی نظیر کم از کم یہ فقیر کہیں نہ دیکھ سکا۔ اس سے مدرسہ کے مجموعی نظم میں اسراف وتبذیر کی ثقافت کا کوئی عنصر کبھی نظر نہ آیا۔

آج کل مدارس کے نظم میں اختلال کی بڑی صورت مالی وسائل کے استعمال میں درست ترجیحات کی تعین کا فقدان ہے، کون سی چیز مدرسہ اور اساتذہ وطلبہ کے لئے کتنی اہم ہے؟ کس چیز کی کس حد تک ضرورت ہے؟ کون سی چیز ضرورت اور کون سی سہولت میں داخل ہے؟ اس میں عموماً افراط وتفریط کے رویے دیکھنے کو ملتے ہیں، بعض جگہوں پر عمارت پر عمارات کھڑی کی جاتی ہیں لیکن طلبہ کے کھانے پینے کا بندوبست قابل رحم ہوتا ہے۔ کہیں مدرسہ کی رقم پر لاکھوں کے اشتہارات چھاپ کر نمائشی جلسے ہوتے ہیں لیکن مدرسہ میں دس ہزار روپے کی علمی لائبریری موجود نہیں ہوتی، ہم نے حضرت الاستاذؒ سے وسائل مدرسہ میں ترجیحات کے درست تعین کا سلیقہ سیکھا، جو شے جس قدر ضروری اور اہم ہوتی

آپ اس کا بجٹ اسی قدر مقرر فرماتے۔ اس سے تمام شعبہ جات اور ضروریات میں ایک توازن قائم رہتا۔

آپ نے مدرسہ چلانے کے لیے دارالعلوم دیو بند کے اس اصولی منشور کو سامنے رکھا تھا کہ "مدرسہ کی فضا میں ایک گونہ فقر ہونا چاہیے۔" جامعہ یوسفیہ آپ کے زہد وفقر، کفایت شعاری اور استغنا کی عملی صورت تھی۔ پانی کے استعمال سے لے کر تعمیرات تک ہر چیز میں احتیاط اور کفایت شعاری واضح نظر آتی۔ یہ آپ کے نظم ونسق کا کمال تھا کہ اتنا بڑا جامعہ اتنے محدود وسائل میں اس تسلسل کے ساتھ چلتا رہا کہ آج کے پر تکلف دور میں ایک چھوٹا سا مکتب بھی ان وسائل میں چلانا دشوار ہے۔

(۳)......مثالی تربیت

آپ طلبہ کی تربیت میں ذرا بھر تساہل کے روادار نہ تھے۔ خود بھی کڑی نگرانی رکھتے اور اساتذہ سے بھی اس کا اہتمام کرواتے۔ طبیعت میں جلال بھی تھا اس لیے شباب میں زبان سے زیادہ ہاتھ چلا کرتا تھا، جس کے واقعات قدیم طلبہ کو خوب یاد ہوں گے۔

طلبہ میں تہجد کا ذوق پیدا کرتے، بنوری ٹاؤن کے زمانے میں تہجد پڑھنے والے طلبہ کے لیے علیحدہ جگہ مقرر کی، جہاں خود جا کر شفقت سے جگاتے۔ آپ کا کہنا تھا کہ

> "داخلہ میں کثرت پر ہرگز خوش نہ ہوں، خوشی اور اطمینان قابلیت پر ہونی چاہیے۔ عددی لحاظ سے کم اور مختصر لائق طلبہ کی جماعت نکموں اور آوار گان کے انبوہ عظیم سے زیادہ بہتر ہے۔ پھر نیکی اور صلاح کو غیر صالح ذہانت اور قابلیت پر ترجیح دیں۔ غبی صالح، ذکی غیر صالح سے بدرجہا بہتر ہے۔"

طلبہ کے لیے تعلقات کو سم قاتل سمجھتے تھے۔ فرماتے کہ طالب علم کے لیے اس سے زیادہ مہلک ترین چیز اور کوئی نہیں۔ ایک موقعہ پر فرمایا کہ

> "غیر اللہ کے تعلق کو جس قدر گھٹا سکیں گھٹائیں، تعلقات وسیع نہ ہوں تو کم گفتن، کم دیدن اور کم شنیدن جیسے فوائد خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں۔"

ایک موقع پر فرمایا:

> "عزیزو! سلامتی چاہتے ہو تو لوگوں سے کنارہ کش رہو، تعلقات بڑھانے کے بجائے گھٹاتے جاؤ کیونکہ غیر اللہ سے تعلق مصائب ومشکلات کا پیش خیمہ ہے۔"

اساتذہ کو بتاکید کہتے کہ طلبہ میں جہانداری اور یار باشی کا مادہ زیادہ ہے اور یہ چیز انتہائی مہلک ہے، اساتذہ کرام اور نگران صاحبان اس کا خصوصی لحاظ رکھیں۔ طلبہ کے لیے دوران طالب علمی دیگر مشاغل رکھنے کے سخت

مخالف تھے، اس کو استعداد کی تباہی بتلاتے تھے، ایک خط میں اپنے ایک عزیز طالب علم کو لکھتے ہیں کہ

> ''تحصیل علم کے زمانے میں کوئی بھی شغل تباہ کن ہوتا ہے، اپنے آپ کو صرف اور صرف حصول علم کے لیے فارغ رکھیں، علم دین کے اسلحہ سے پوری طرح لیس ہوئے بغیر انسان دین کی صحیح خدمت نہیں کر سکتا اور نہ ہی فرق ضالہ اور الحاد و بے دینی کا مقابلہ کر سکتا ہے۔''

طلبہ کے سبق کا ناغہ یا مطالعہ وتکرار میں سستی زہر قاتل سمجھتے تھے، حتیٰ کہ چھٹیوں کے اختتام پر پہلے دن کا ناغہ آپ کے ہاں قابل اخراج جرم تھا۔ طلبہ میں تعلیمی وتحقیقی ذوق پیدا کرنے کے لیے اکابر کے علمی مجاہدات کثرت سے سناتے، اہم علمی کتابوں کا تعارف کراتے اور مفید ومعتبر کتب کی نشاندہی نیز طلبہ کی ذہنی سطح کے مطابق مطالعہ کی کتب بھی تجویز کرتے۔ اگر کوئی طالب علم تعلیمی اعتبار سے نمایاں کارکردگی دکھاتا تو اس کی خوب حوصلہ افزائی فرماتے اور اسے مزید آگے بڑھانے کی فکر میں رہتے۔

آپ دینی نظام تعلیم میں سکولوں اور کالجوں کے نظام سے در آنے والی خرابیوں پر سخت نالاں رہتے تھے اور طلبہ کو موقع بموقع ان کی مضرت بتلاتے تھے، ان میں ڈگری کے حصول کے گرد اپنی محنت وکاوش کو گھمانا آپ کو سخت ناگوار تھا اور اسے اخلاص کے منافی سمجھتے تھے۔ فرماتے کہ اسی حرص نے امتحانات میں نقل کے سنگین جرم کو راہ بھائی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ درجہ اولیٰ میں جب ہمارا پہلا (سہ ماہی) امتحان تھا تو حضرت الاستاذؒ نے دو تین منٹ کی مختصر ترغیبی گفتگو میں اس پہلو پر سختی سے زور دیا، فرمایا کہ جو قوم اپنے مقاصد کو مستحضر رکھتی ہے، وہ کبھی سندات یا دنیاوی جاہ کے لیے نقل جیسی خسیس حرکت کی مرتکب نہیں ہوتی، اس پر آپ نے اسرائیل کی مثال دی کہ یہود نے اپنی نسلوں کو یہ بات سمجھائی ہے کہ تمہاری بقا قومی اور ملی سطح پر دیانت وامانت کے فروغ میں ہے، لہٰذا وہاں امتحان ہالوں میں کسی قسم کا کوئی نگران مقرر نہیں کیا جاتا کیونکہ ان کا ہر بچہ نقل کرنے کو اپنی ملی وقومی بقا کے لئے زہر قاتل سمجھتا ہے۔

(۴)......مروجہ چندہ سسٹم سے بیزاری

حضرت الاستاذؒ نے مدرسہ کی بنیاد توکل واخلاص پر ڈالی تھی۔ اس سلسلے میں وہ اپنے شیخ اور استاذ مولانا بنوریؒ کے عکس تھے۔ مدرسہ کے کام کے لئے چندہ کی اپیل یا مروجہ طرز کو قطعاً گوارا نہیں فرماتے تھے، بلکہ اسے منصب علم سے خیانت اور وقار ومتانت کے خلاف سمجھتے تھے۔ آپ کا کہنا تھا کہ وسائل جس قدر مہیا ہوں کام کا دائرہ اتنا ہی رکھنا ضروری ہے، ہم قطعاً اس کے مکلف نہیں کہ ایک مستحب امر کے قیام کے لیے سوال کی ذلت اٹھائیں یا طلبہ واہل علم کے وقار کو داؤ پر لگائیں۔ آپ اہل علم کے بڑے قدردان تھے لیکن جو حضرات مروجہ حیلوں بہانوں سے چندے

اکھٹے کرتے ہیں، ان سے طبعاً تکلیف ہوتی۔ ایک بار کسی مدرسہ کے سفیر گاڑی پر لاؤڈ سپیکر لگائے چندہ کے اعلانات کرر ہے تھے۔ وہ الفاظ کچھ ایسے تھے کہ آپ برداشت نہ کر سکے اور باہر نکل کر انہیں سخت ڈانٹ پلادی، کہ بندہ گان خدا جب مدرسہ چلانے کا تحمل نہیں تو کیوں یہ ذلت اختیار کر رہے ہو، آپ لوگوں کے اس عمل سے اہل علم کا پورا طبقہ بدنام ہورہا ہے، اس طرز سے تو گدا گر بھیک بھی نہیں مانگتے جس طرح تم مدرسہ کا نام لے کر مانگ رہے ہو۔

چندہ کے لیے آخر سال میں کسی بڑے خطیب کو بلا کر زیادہ سے زیادہ معاونین کو مدعو کرنا بھی آپ کو گوارا نہ تھا اور اس سے سخت کوفت ہوتی تھی۔ ایک بار کسی مولوی صاحب نے مشورہ دیا کہ حضرت فلاں خطیب صاحب کو جلسہ دستار بندی پر بلالیں گے۔ آپ نے انکار فرمایا اور کہا کہ نہ بھئی! ہمارے جلسوں میں تو ہم گونگے ہی بہتر ہیں۔ ہمیں خوب یاد ہے کہ جب ہمارے زمانہ طالب علمی میں کسی طالب علم کا ختم قرآن ہوتا یا حفظ کی تکمیل ہوتی تو آپ نے کبھی جلسہ نہیں کروایا، نہ ہی مدرسہ کے اموال ان نمائشی چیزوں پر خرچ کرنے کو جائز سمجھا، بلکہ زیادہ سے زیادہ حضرت مولانا عبداللہ صاحب تشریف لے آتے۔ قرآن مجید کے فضائل بیان فرماتے، کچھ اصلاحی گفتگو کر لیتے اور حفظ کرنے والے کی حوصلہ افزائی کر کے دعا کر دیتے۔ اس سے زیادہ اہتمام کبھی نظر نہیں آیا۔

حضرت الاستاذ چندوں کے بے لگام طلب میں اہل مدارس کی سرگردانی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی بتلاتے کہ اب کام کی جگہ نام اور تکلف نے لے لی ہے۔ معمولی سی چٹائی پر ہو سکنے والے کام کے لیے عالی شان دفاتر اور فرنیچر کے لوازمات کا تکلف کیا جاتا ہے، ہمارے اکابر نے جو کام زمین کے کچے فرشوں پر بیٹھ کر کیے تھے، آج کی پر تکلف نسل انہیں سادگی سے کرنے کو تیار نہیں۔ بلکہ بہت سی جگہوں پر تو کام کچھ نہیں ہوتا یا برائے نام ہی ہوتا ہے لیکن دھاک بٹھانے اور معاونین کو متوجہ کرنے کے لیے رنگ روغن خوب چمک رہا ہوتا ہے، اور چھوٹے چھوٹے کاموں کے لئے بھاری بھر کم کمیٹیوں اور ان کے فرضی بجٹ عامۃ الناس کے سامنے پیش کر کے کچھ حاصل کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔

حضرت الاستاذ سے کئی دفعہ بیرون ملک تلامذہ نے آنے کی درخواست کی، لیکن آپ اس وجہ سے بچتے تھے کہ کہیں لوگ چندہ اکٹھا کرنے کی غرض سے جانے کا شبہ نہ کر لیں، حتی کہ اگر تعطیلات میں کراچی جانا ہوتا تو رمضان سے پہلے واپس آنے کی سعی کرتے کیونکہ رمضان میں اہل مدارس وہاں چندے اکٹھے کرنے جاتے ہیں، گویا آپ ان مواضع سے بھی احتراز فرماتے جہاں چندہ وصولی کا شبہ ہو۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کے پاس اگر کوئی کسی ذاتی غرض سے آتا اور اسی مجلس میں چندہ پیش کرتا تو قبول نہ فرماتے، اسی طرح چندہ دینے والوں کے پاس کبھی کسی استاذ یا طالب علم کو نہ بھیجتے، بلکہ اگر وہ خود لا کر پیش کرتے تو قبول فرماتے۔

(۵)......اساتذہ کی تربیت

چونکہ آپ نے اپنے ادارہ میں اکثر ایسے اساتذہ مہیا کیئے جو آپ سے تلمذ کا رشتہ رکھتے تھے، اس لیے طلبہ کے ساتھ ساتھ اساتذہ کی تربیت اور استعداد میں ترقی کی بھی فکر رہتی، مدرسہ کے اجلاسوں میں خصوصاً اور کسی دیگر مناسب موقع پر عموماً ایسی ہدایات سے نوازتے جن سے اساتذہ کی علمی وعملی تربیت ہوتی۔ایک نئے مدرس کے استفسار پر درس کی تیاری کے مراحل کے بارے اہم اصول ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اسباب کے درجہ میں مطالعہ کے بغیر سبق پڑھانا تو درکنار اس کا تصور تک نہ کیا جائے، جتنا پڑھانا ہے اور جو کچھ بتلانا ہے پہلے خود اس کو خوب ضبط کرلیں .قابو یافتہ معلومات کا افادہ اسہل بھی ہوتا ہے اور انفع بھی . خود شرح صدر نہ ہو اور مضمون ضبط نہ ہو تو قدرتی طور پر سامعین نہ محظوظ ہوتے ہیں اور نہ مستفید،مزید برآں اس راہ کے نو وارد کے لئے کتاب کے ایک حاشیہ یا شرح پر اکتفا زیادہ مفید ہوتا ہے۔ہاں جہاں اس حاشیہ یا شرح سے متن حل نہ ہو، یا کسی شبہ کا جواب نہ ملے تو وقتی طور پر دیگر شروح کی طرف مراجعت کی جائے،متعدد شروح کے مطالعہ سے فکری انتشار پیدا ہوتا ہے،نتیجتاً درس کے دوران تقریر مربوط نہیں رہتی۔''

آپ کی کوشش رہتی کہ اساتذہ علمی وتحقیقی سرگرمیوں میں مصروف رہیں۔فرماتے کہ ہر خطا میں ابتلائے عام کے بعد اس سے طبعی کراہت کم ہوجاتی ہے لیکن علما کا مطالعہ وتحقیق کے بغیر وقت گزارنا ایسی خطا ہے کہ میری اس سے طبعی کراہت کبھی کم نہیں ہوئی۔

اگر کسی استاذ میں تعلیم واعمال کے اعتبار سے کمی دیکھتے تو بڑی حکمت وشفقت سے رغبت دلا کر متوجہ کرتے۔ اساتذہ گوکہ سارے اپنے تلامذہ ہوتے لیکن ان کی عزت نفس کا بڑا خیال رکھتے اور اپنے عمل سے معمولی طور بھی کسی کی دل شکنی نہ فرماتے۔اساتذہ میں علمی رجحان پیدا کرنے کے لیے عموماً ایسے کام انہیں حوالے کرتے جو اس حوالے سے انہیں برانگیختہ کرتے ،مثلاً اہم کتب سے کسی خاص موضوع پر حوالہ جات نکالنے پر مامور فرمادیتے۔لائبریری کی کتابوں کو موضوعاتی ترتیب سے مرتب کرنے پر لگادیتے۔علمی تحریرات ومکاتیب نقل کرواتے اور یا کسی مسودہ کی تبییض وغیرہ کا کام سپرد کردیتے۔

علم التعلیم میں آپ کی مہارت تامہ کا شاہکار حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کے واقعہ سے ۲۸۹ علمی وتعلیمی آداب واصول کا استنباط ہے، جو کئی مکتبوں سے اردو، عربی اور فارسی میں طبع ہوا ہے۔اللہ تعالیٰ آپ کے فیوض وبرکات کو مزید قبولیت عطا فرمائے اور ہمیں اس سے مستفید ہونے کی توفیق بخشے۔آمین

یادگار حضرت اورکزئیؒ

جامعہ یوسفیہ کا ایک مختصر تعارفی جائزہ

مولانا ضیاء الدین

اللہ رب العزت نے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اپنے بندوں کے رشد وہدایت کیلئے ہر دور میں ملکوتی صفات کے حامل علمائے کرام کی صورت میں نیابت انبیا کا سلسلہ جاری وساری رکھا ہے اور باطل کے وجود سے حق کو ممتاز اور واضح کرنے کا سلسلہ ہر دور میں رائج رہا ہے۔

چنانچہ ان علمائے کرام نے دین متین کی تعلیمات کو زندہ رکھنے اور ان کی اشاعت کے لیے مثالی قربانیاں پیش کیں۔ دین سے غافل اور نار کو انار سمجھنے والوں کو پیار، محبت اور تدبر کے ساتھ غفلت، کفر وشرک اور بدعات و رسومات سے کھینچ کھینچ کر دین سے جوڑے رکھا۔ خود مصائب اور تکالیف جھیل کر ان کی آخرت سنوارنے کی کوشش کی، اس پرفتن دور میں بھی اللہ رب العزت نے ایسے ایسے جلیل القدر علمائے کرام پیدا فرمائے جنہوں نے صدیوں پہلے کی یادیں تازہ کرادیں اور ہمہ قسم رکاوٹوں اور تکالیف کے باوجود مدارس اسلامیہ کا تابندہ سلسلہ برقرار رکھ کر حق کا بول بالا کیا اور اپنے کردار اور عمل سے یہ اعلان فرماگئے:

وہ مرد نہیں جوڈر جائے حالات کے خونی منظر سے
جس دور میں جینا مشکل ہو اس دور میں جینا لازم ہے

ان مقدس اور برگزیدہ ہستیوں میں شہید اسلام، محدث العصر حضرت مولانا محمد امین صاحب نور اللہ مرقدہ کا نام گرامی قابل ذکر ہے، جنہوں نے ملک کے جید علمائے کرام سے تعلیم حاصل کی، بالخصوص محدث العصر علامہ محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ تعالی سے نہ صرف شرف تلمذ پایا، بلکہ ہمہ دینی خدمات میں ان کے رنگ میں پوری طرح رنگے

نظر آئے۔ تحصیل علم کے بعد آپؒ نے حضرت بنوریؒ کی نگرانی میں مختلف دینی اور علمی خدمات سرانجام دیتے ہوئے جامعہ بنوری ٹاؤن میں ایک مدرس پھر بوجہ اعتماد اور باصلاحیت ہونے کے حضرت بنوریؒ کے انتخاب سے ناظم کی حیثیت سے کام کیا، لیکن اس سعادت کے باوجود (بقول آپؒ کے) آپ کو اپنے علاقہ کے عوام کی بدعات و رسومات اور شرکیات میں ابتلاء عام ہر آن ستاتی رہی۔ علاوہ ازیں چونکہ علاقہ میں دینی تعلیم و تربیت کا شدید فقدان تھا، جو تھی وہ بھی نہ ہونے کے برابر تھی، مدارس کا حال دگرگوں تھا، طلبا کیلئے قیام وطعام اور درجہ بندی کا باقاعدہ انتظام نہ تھا، مزید براں اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ اکثر علمی قیادت اہل بدعت کے ہاتھ میں تھی، آج کل کی طرح دینی تعلیم وتربیت پر بھی بشکل ملازم تنخواہ لینا عام تھا، مگر اس ساری صورتحال کو اپنے محبوب، مشفق اور مربی کی نورانی صحبت کی خاطر برداشت کرتے رہے، حتی کہ حضرت بنوریؒ اس دار فانی سے کوچ فرما گئے۔ فانا للہ و انا الیہ راجعون۔

چنانچہ آپؒ نے اپنے علاقے کی مذکورہ صورت حال کے پیش نظر اپنا فرض منصبی ادا فرماتے ہوئے ایک ایسا ادارہ قائم کرنے کی ٹھان لی جو مذکورہ صورت حال سے نبرد آزما ہو سکے، عوام الناس کو مصلحت اور تدبر کے ساتھ بدعات و رسومات کے اندھیروں سے نکال کر اسلامی تعلیمات کی روشنی سے روشناس کرائے، علاقہ کی مایوس کن علمی فضا میں علم وتحقیق کی نمو کا سبب بنے، دیگر مدارس کیلئے ایک قابل تقلید نمونہ بن کر تعلیم کے ساتھ تربیت پر بھرپور توجہ دے، طلبا کے لیے درجہ بندی اور رہائش کا انتظام ہو، رسمی وظیفہ (گھر گھر کھانا اکٹھا کرنے) کی جگہ مدرسہ کے اندر ہی مطبخ کی سہولت ہو اور اس ادارہ سے وابستہ تمام افراد تنخواہ کے بجائے اخلاص وللّٰہیت کا کامل مظاہرہ کرتے ہوئے حسبۃ للہ یہ ساری خدمات انجام دینے کے جذبہ سے سرشار ہوں۔

چنانچہ آپ اپنے اخلاص وللّٰہیت اور اہل سنت عوام کی ہمدردی کے طفیل تقریباً اپنے مقاصد اور عزائم میں کامیاب رہے اور جامعہ یوسفیہ کے نام سے ایک ادارہ قائم ہو گیا۔ وہ طبقات جنہوں نے اس خطے میں پنجے گاڑ رکھے تھے یا گاڑنے کی کوشش کر رہے تھے اور عامۃ الناس کے دین وایمان سے کھیل رہے تھے، آپ کی حق گوئی کی طاقت نے ان کی بیخ کنی کر کے ان کا اس خطہ سے یا تو صفایا کر دیا یا کم از کم اس پوزیشن میں نہیں رہے کہ مسلمانوں کے سرمایۂ ایمانی پر حملہ آور ہو جائیں، اگر بالفرض استاذ صاحب شہیدؒ کراچی سے نہ آتے اور اپنے مقدس عزائم کو عملی جامہ نہ پہناتے تو آج ہمارا یہ خطہ ایمان کش فتنوں کا گھر ہوتا، جن میں انکار حدیث، رفض اور بدعتی فتنے سرفہرست ہیں۔ اب ہم مختصر طور پر اس عظیم گلشن کا مختصر تعارفی جائزہ قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں واللہ الموفق و المصیب وھو نعم المولی و نعم النصیر۔

تاسیس جامعہ:

حضرت الاستاذ کی پر مشقت محنتوں، پرخلوص کاوشوں، دینی حمیت وغیرت اور تعلیمی ذوق وشوق کے نتیجہ میں جامعہ یوسفیہ نامی یہ ادارہ ۱۹۸۰ء بمطابق ۱۴۰۰ھ کو معرض وجود میں آیا، چونکہ ادارہ کے قیام میں وطن عزیز کے نامور علمائے کرام اور اساطین علم وعرفان کی سرپرستی ونگرانی مخلصانہ مشاورت شامل تھی، لہٰذا جب اس کی تعمیر کا ابتدائی بندوبست ہوا تو ان اکابر نے خود آکر اپنے مبارک ہاتھوں سے اس ادارے کا سنگ بنیاد رکھا، جن میں سے جامع الشریعت والطریقت، شیخ المعقول والمنقول حضرت مولانا فضل محمد صاحبؒ (شیخ الحدیث ومہتمم جامعہ مظہر العلوم مینگورہ سوات)، فخر الاقران، زبدۃ الافاضل حضرت مولانا ڈاکٹر حبیب اللہ مختار صاحب شہیدؒ (کراچی) اور بقیۃ السلف، اسوۃ الخلف حضرت مولانا محمد کریم کا کاخیل صاحبؒ (ہنگو) قابل ذکر ہیں۔

انتساب:

حضرت استاذ صاحب شہیدؒ کو اپنے استاذ شیخ الاسلام والمسلمین حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ سے والہانہ محبت اور نیازمندانہ عقیدت تھی لہٰذا ان کی دینی، علمی اور تعلیمی خدمات نیز ان سے علمی اور روحانی فیض یافتگی کے اعتراف میں حضرت استاذ صاحب نے اپنے اس ادارے کا نام مدرسہ یوسفیہ رکھ کر اس کو حضرت بنوریؒ کی طرف منسوب کیا، نیز اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ''میں نے بیت اللہ شریف کا غلاف مبارک پکڑ کر رب العالمین ذات سے التجا کی تھی کہ یا اللہ! اس ادارہ میں جو بھی نیک اعمال ہوتے ہیں ان کو ہماری طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روح اطہر کیلئے قبول ومنظور فرما۔''

مسلک وموقف:

حضرت الاستاذ اس ادارہ کے مسلک وموقف کی وضاحت کرتے ہوئے غیر مطبوعہ ''دستور'' میں لکھتے ہیں:

''یہ ادارہ بنیادی طور پر چونکہ تعلیمی اور اصلاحی ادارہ ہے اور علاقائی معاملات اور ملکی سیاسیات میں پڑ کر اصلاح اور تعلیم وتربیت کا مقصد حاصل نہیں ہوسکتا جس کی وجہ سے اس ادارہ کے وابستگان خصوصاً معلمین علاقائی اور ملکی وگروہی سیاست سے عملاً مکمل اجتناب کریں گے، نیز شخصی آراء پر مبنی بعض مذہبی تحریکوں سے مکمل اجتناب کیا جائے گا، اس قسم کی تحریکوں سے وابستہ افراد کیلئے ادارہ میں قطعاً گنجائش نہیں۔

حق تعالیٰ کا دین حق اسلام ہے اور سنیت اس کی حقیقی تفسیر ہے جبکہ حنفیت اس کے عملی حصہ کی سب سے بہتر تشریح ہے اور دیوبندیت، سنیت اور حنفیت کی اصل وکامل شکل کا نام ہے، لہٰذا مذہبی اعتبار سے یہ ادارہ مسلک دارالعلوم دیوبند کا پابند رہے گا، جس کی نشاندہی حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ کی تحریر مسلک دار العلوم دیوبند (مطبوعہ) وغیرہ تالیفات اکابر میں کی گئی ہے۔''

بنیادی اغراض ومقاصد:

محدث العصر علامہ بنوریؒ کے رحلت فرمانے کے بعد حضرت استاذ صاحب شہیدؒ نے چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر کراچی کو خیر باد کہتے ہوئے اپنے جنگل نما گاؤں میں پڑاؤ ڈال کر جس دور اندیشی کا ثبوت دیا، اس کے نادر الوقوع ہونے میں کون شک کرسکتا ہے؟ اپنے اخلاص وللّٰہیت سے مجبوری کہہ دیں یا بدعات ورسومات کے شکنجوں میں پھنسے عوام کے ساتھ دلی ہمدردی، بہرصورت یہ انقلابی اقدام حضرت کی گہری فکر ونظر اور نہایت ہی اخلاص کا عکاس ہے۔

جامعہ یوسفیہ کے قیام میں جن ترجیحی اور بنیادی اغراض ومقاصد کو مدنظر رکھا گیا اس کی وضاحت کرتے ہوئے آپ رقم طراز ہیں:

"(۱)...... صحیح اسلامی تعلیم وتربیت کے ذریعے وارثان علوم نبوت اور مخلص رجال کار کی ایسی جماعت تیار کرنا جو دین حق کی حفاظت، ترویج اور اشاعت کے ساتھ امت کی اصلاح اور ہدایت کو ابتغاء لوجہ اللہ تعالیٰ اپنا مقصد زندگی سمجھے۔

(۲)...... جہالت کی پھیلی ہوئی تاریکی کو (جو کہ اکثر کفریات، شرکیات، بدعات اور منکرات کا سرچشمہ ہے) علم کی روشنی پھیلا کر ختم کرنا۔

(۳)...... بے دینی اور بددینی اور فسق وفجور کے طوفان کا عقائد صحیحہ، مکارم اخلاق اور اعمال صحیحہ کی مؤثر تبلیغ واشاعت کر کے روک تھام کرنا۔

(۴)...... عربی مدارس کے نظام میں اصلاحی انقلاب لانا۔

(۵)...... کاملین کی رحلت اور تحصیل کمال میں روز افزوں تساہل وتسامح کے خطرناک رجحان سے علم دین کے مستقبل کو جو مہیب خطرہ لاحق ہے اس کا احساس دلانا اور سد باب کی کوشش کرنا۔

(۶)...... دعوت الی اللہ کے دو اہم ذریعوں تحریر وتقریر میں عملی مشق کرا کر طلبہ کو تربیت دینا۔

(۷)...... سلف صالحین کے ذوق کے مطابق طلبہ کی تربیت واصلاح کا تعلیم سے زیادہ خیال رکھنا۔

(۸)...... تعلق مع اللہ اور اتباع سنت کے رنگ میں رنگنے اور رنگ دینے کی ایسی کوشش کرنا جس سے ہمارے ہر عمل میں اخلاص وللّٰہیت کی روح جاری وساری ہو اور محور زندگی رضائے الٰہی بنے۔

(۹)...... تبلیغ کی طرح اسلام کے تعلیمی شعبہ میں بھی اس کا عملی نمونہ پیش کرنا کہ جس طرح دعوت وتبلیغ کا کام محض رضائے الٰہی کیلئے بغیر کسی مالی معاوضہ اور دنیاوی غرض کے ہوسکتا ہے اسی طرح دین اسلام کی تعلیم وتربیت کا کام بھی محض رضائے الٰہی کی خاطر ہوسکتا ہے۔

(۱۰)...... جب بھی وسائل مہیا ہوں گے تو علوم دینیہ میں تخصصات کے علاوہ عصر حاضر کے غیر اسلامی دساتیر

پر موثر فاضلانہ تنقید اور اسلامی شریعت کی نحیثیت ایک دستورِ حیات ترتیب و تشریح اور دوسرے قوانین پر اس کی برتری اور ترجیح اور اس کے مطابق زندگی کے گوناگوں مسائل کے حل اور فیصلہ کرنے کی تمرین کا مناسب انتظام کیا جائے گا۔

(۱۱) ..... مختلف زبانوں بالخصوص معیاری عربی زبان میں تقریر و خطابت اور تحریر و کتابت کی مشق دی جائے گی

(۱۲) عصری علوم سے بقدر ضرورت واقفیت حاصل کرنے کا انتظام ہوگا جبکہ غیر ضروری قدیم فنون کو نظر انداز کیا جائے گا۔"

شعبہ جات

حضرت الاستاذ نے جامعہ کے شعبہ جات کی تعیین خود فرمائی تھی اور ان کے لائحہ عمل کی وضاحت اور ان کے وظائف کا تعین بھی خود ہی فرمایا تھا الحمد للہ یہ تمام شعبہ جات حضرت کی حیات کے بعد بھی اسی منہج پر مصروف عمل ہیں، انتظامی ضروریات کے پیش نظر مولانا محمد یوسف صاحب مدظلہم مہتمم جامعہ یوسفیہ نے چند نئے شعبہ جات کا اجرا بھی کیا ہے۔ حضرت الاستاذ کے مرتب کردہ دستور کی روشنی میں جامعہ کے شعبہ جات کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے:

(۱) شعبہ مالیات:

حضرت الاستاذؒ نے دستور میں اس کی تفصیلات کچھ یوں بیان فرمائی ہیں:

"جامعہ کا مستقل ذریعہ آمدن نہ ہوگا تا کہ توکل علی اللہ اس کا سب سے بڑھ کر سرمایہ رہے، بغیر اپیل وسفیر کے جو کچھ مخیر حضرات کی طرف سے آئے گا اس کے تین حصے ہوں گے: (۱) صدقات واجبہ جیسے زکوۃ و کفارات۔

(۲) صدقات غیر واجبہ معینہ یعنی جس کا مصرف خود معطی نے معین کر دیا ہو۔ (۳) صدقات غیر واجبہ غیر معینہ۔

قسم اول کو بلا کسی حیلہ کے شرعی مصارف میں تملیک کر کے صرف کیا جائے گا، دوسری قسم بھی حسب منشا معطی صرف ہوگی اور تیسری قسم کو ادارہ کی تعمیر اور خرید کتب وغیرہ ضروریات پر صرف کیا جائے گا۔

جامعہ کے رقوم غیر ضروری امور پر صرف نہیں ہوں گے تکلف اور تعیش کے بجائے سادگی اور زہد کو معمول بنایا جائے گا۔

جامعہ میں تعلیم و تربیت اور دوسرے دینی خدمات خالص لوجہ اللہ تعالیٰ سرانجام دیئے جائیں گے، تا حد امکان بامعاوضہ ملازم رکھنے سے احتراز کیا جائے گا، جبکہ ادارہ کی خدمت میں مصروف حضرات کے ساتھ جس قدر ہو سکے عند الضرورۃ تعاون کیا جائے گا اور خود ان کی ضروریات کا خیال رکھے گا تاہم یہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے کردار" ان

اجری الاعلی للہ" کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں گے۔

دارالعلوم دیوبند کے اساسی اصول ہشتگانہ جامعہ کے اصول ہوں گے، خصوصا سرکاری مراعات لینے سے احتراز کیا جائے گا۔"

(۲) شعبہ نشرواشاعت:

اس شعبہ کے تحت وقتاً فوقتاً دینی اور ملی مفادات کی خاطر اشاعت کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اس شعبہ کے تحت شائع ہونے والی اشیا میں نشر الازھار، مسانید امام اعظم ابو حنیفہؒ، دلائل الخیرات، الحزب الاعظم، حزب البحر، ایک تاریخی نایاب خط، قاعدہ تیسیر القرآن اور خرائط التجوید وغیرہ قابل ذکر ہیں

(۳) الامین ٹرسٹ:

یہ شعبہ اپنی مدد آپ کے اصول کی بنیاد پر مدرسہ کی ترقی اور طلبا کی خدمت کیلئے قائم کیا گیا ہے۔ طلبا کا علاج معالجہ، بجلی وغیرہ کی مرمت، جزوی تعمیراتی امور کی انجام دہی، شعبہ صفائی کا مکمل انتظام وغیرہ تمام امور اس شعبہ کے سپرد ہیں، یاد رہے کہ اس شعبہ کے وسائل کا دارومدار بھی بغیر اپیل اور چندہ کے ہوتا ہے۔

(۴) مکتبہ یوسفیہ:

تقریباً بارہ ہزار کتب پر مشتمل یہ مکتبہ حضرت استاذ صاحب کے علمی شغف، ذوق مطالعہ اور شوق تحقیق کا آئینہ دار ہے، اکثر عربی کتب ایسی ہیں جو ایک عرصہ سے نایاب تھیں، اب تو ماشاء اللہ اشاعتی اداروں کی کثرت سے کافی کتابیں شائع ہو چکیں ہیں، ایک دور وہ تھا کہ دور دور سے اہل علم حوالہ جات کی تلاش میں یہاں آیا کرتے تھے، اب بھی ہمارے خطے میں یہ واحد بڑا مکتبہ ہے جہاں اکثر علوم وفنون کی تمام اہم ماخذ دستیاب ہیں۔ قدیم اور جدید نسخہ جات سے مزین اس تمام تر ذخیرہ کو حضرت شہیدؒ کے مطالعے کا شرف حاصل ہے، جس کی وجہ سے تقریباً ہر کتاب کے سرورق پر اس کے اہم مسائل ومشمولات کی فہرست حضرتؒ کے دست اقدس سے تحریر شدہ ہے، نیز حواشی پر حضرت کی تنقیدات ایسے خاصے کی چیز ہے جو اہل ذوق کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور اہل علم ان میں کھو سے جاتے ہیں۔ یہ مکتبہ اپنی اس علمی انفرادیت اور ندرت میں ایک ممتاز اور جداگانہ حیثیت کا حامل ہے۔ طلبا اور اساتذہ کرام کیلئے مکتبہ میں بیٹھ کر مطالعہ کی اجازت ہے جبکہ باہر کتاب لے جانا نگران کی اجازت پر موقوف ہوتا ہے۔ باہر سے آنے والے تحقیق کے شائقین اور اہل علم کو طعام ورہائش کے علاوہ تحقیق سے متعلقہ دیگر ضروری سہولیات بھی مہیا کی جاتی ہے۔

(۵) تعلیمی وانتظامی ڈھانچہ:

(۱) روزمرہ چھ گھنٹے برائے تعلیم ہوتے ہیں جب کہ بقیہ وقت بشری تقاضوں اور مطالعہ وتکرار میں صرف کرنا ہوتا

ہے،صرف عصر اور مغرب کے درمیان باجازت ادارہ سیر وتفریح کا وقت ہوتا ہے۔

(۲) ہر تین ماہ کے بعد امتحان ہوتے ہیں: یعنی سہ ماہی، شش ماہی اور سالانہ

ادارہ کی تین مجلس ہیں: (۱) مجلس شوریٰ۔ (۲) مجلس انتظامی۔ (۳) مجلس تعلیمی

مجلس شوریٰ...... مجلس شوریٰ کے کل تین ارکان ہیں، جو جامعہ کے تمام شعبوں کے انتظام و انصرام سے متعلق شریعت اسلامیہ کی روشنی میں فیصلے کرتے ہیں۔

مجلس انتظامی...... یہ مجلس سات ارکان پر مشتمل ہے:

(۱)...... مدیر: یہ پورے ادارے کا انتظامی ذمہ دار ہوتا ہے۔

(۲)...... صدر مدرس: یہ اساتذہ اور طلبا کے درمیان جوڑ رکھتا ہے۔

(۳)...... مدیر تعلیم: یہ تمام تعلیمی امور کا ذمہ دار ہوتا ہے اور صدر مدرس نہ ہونے کی صورت میں اس کا نائب ہوتا ہے۔

(۴)...... ناظم الامور: یہ تعلیم کے علاوہ طلبا کے دیگر امور کا نگران ہوتا ہے۔

(۵)...... ناظم مالیات: (خازن) یہ جامعہ کے آمدنی اور خرچہ کے حساب وکتاب کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

(۶)...... نائب مدیر: یہ مدیر کی عدم موجودگی کی صورت میں اس کے فرائض ادا کرتا ہے اور مدیر کے انتقال کی صورت میں ایک سال تک وہی مدیر تصور ہوتا ہے۔

(۷)...... نائب مدیر تعلیم: یہ مدیر تعلیم کی نیابت میں ان کی ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے۔

نصاب تعلیم:

فی الوقت وفاق المدارس کے ساتھ الحاق کی وجہ سے جامعہ میں وفاق کا مرتب کردہ نصاب پڑھایا جاتا ہے، البتہ اس نصاب کے علاوہ بعض دیگر مفید کتب جنہیں حضرت الاستاذؒ نے افادیت کے پیش نظر داخل نصاب کیا تھا، ابھی تک شامل نصاب ہیں، جن میں شرح النقایہ، اوضح المسالک، بدء الامالی اور نور الیقین قابل ذکر ہیں۔

حضرت الاستاذ کے زمانے میں تخصص فی الحدیث کا شعبہ بھی فعال تھا، جس سے اندرون و بیرون ملک طلبہ مستفید ہوتے تھے۔ فی الوقت درس نظامی کی موقوف علیہ تک تعلیم کے علاوہ شعبہ حفظ و تجوید اور تخصص فی الفقہ کا بھی انتظام ہے، ان شعبہ جات میں سینکڑوں طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ طلبہ کی رہائش، طعام، علاج و معالجہ جامعہ کے ذمہ ہے، نیز بنیادی ضروریات کے لیے معقول ماہانہ وظیفہ بھی دیا جاتا ہے۔

جامعہ کا ایک بڑا کارنامہ معیاری تعلیم کے ساتھ ساتھ مکاتب قرآنیہ کا پھیلاؤ ہے، حضرت الاستاذ کو آغاز سے اس

کی بڑی تمنا تھی، کہ یہاں قرآن کے زمزمے گونجے، الحمدللہ جامعہ کے شعبہ حفظ نے علاقہ بھر میں سینکڑوں حفاظ تیار کیے ہیں، جو اس وقت مختلف مقامات پر مکاتب قرآنیہ قائم کر کے خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت الاستاذ کے اس یادگار گلشن کو یونہی شادوآباد رکھے۔ آمین

نامہائے گراں مایہ سے چند منتخب نقوش

مولانا محمد یاسین، کراچی

حضرت الاستاذ رحمہ اللہ سے طویل تعلق اور استاذ صاحب کی بے انتہا شفقتوں اور عنایتوں کا حق یہ تھا کہ حضرت استاذ محترم پر سیاہی قلم سے نہیں بلکہ خون جگر سے مضمون لکھتا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بندہ اس قابل ہی نہیں کہ استاذ صاحب رحمہ اللہ کی عظمت، محدثانہ شان، ولایت کے مقام، یا دیگر اوصاف حمیدہ وکمالات جلیلہ پر قلم اٹھا سکے۔

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

البتہ استاذ محترم کے خطوط جو والد صاحب رحمہ اللہ کے نام یا بندہ کے نام ہیں ان میں جو انمول موتیاں اور نصائح ہیں، افادہ عام کی خاطر قارئین کے سامنے پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں گا۔

بندہ کے مضمون کا اصل لب لباب ہی استاذ رحمہ اللہ کے خطوط ہیں، استاذ صاحب کی تحریر بڑی نفیس تھی، نوک قلم سے نکلنے کے لئے الفاظ وکلمات قطار باندھے منتظر رہتے، الفاظ اور خط دونوں اتنے حسین تھے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا، بلاتصنع عربی الفاظ کو اردو میں اتنے دلکش انداز کے ساتھ استعمال فرماتے کہ پڑھتے ہوئے کوئی اجنبیت محسوس نہ ہوتی، عربی الفاظ کے انتخاب میں منفرد ذوق رکھتے تھے۔ اردو میں آپ ایک مستقل صنف تحریر کے مالک تھے، آپ کی تحریر میں دیگر خوبیوں کے ساتھ ادبی لطافت بھی خوب محسوس کی جاسکتی ہے۔

اتفاق سے مل بھی جاتے ہیں اخلاص ومحبت والے دل
یہ جنس اگرچہ دنیا میں کمیاب تو ہے نایاب نہیں

غالباً ۱۹۶۸ء کو بندہ کراچی آیا اس وقت میری عمر کافی کم تھی، بڑے بھائی محترم مولانا حافظ محمد صاحب زیدت

مکارمہم جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوریؒ ٹاؤن میں زیر تعلیم تھے، میں نے ناظرہ قرآن کریم کھتری مسجد جونا مارکیٹ میں پڑھا جہاں والد صاحب امام تھے، چند پارے یہیں حفظ کیے، تکمیل حفظ کے لیے ۱۹۷۱ء میں جامعہ میں حضرت قاری شریف احمد صاحب تھانوی مدظلہ کے پاس داخل ہوا، جب کچھ شعور پیدا ہوا تو حضرت والد صاحب نور اللہ مرقدہ کو محدث عصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری اور حضرت مولانا فضل محمد صاحب سواتی رحمهما الله کی مجالس کا صرف خوشہ چین ہی نہیں بلکہ ان کا عاشق پایا، حضرت والد صاحب نور اللہ مرقدہ وقتاً فوقتاً جامعہ جا کر حضرت بنوریؒ کے درس اور حضرت مولانا فضل محمدؒ صاحب کی مجلس میں حاضر خدمت ہوتے۔ اس زمانے میں حضرت بنوریؒ کے والد ماجد حضرت آغا جیؒ حیات تھے، حضرت آغا جیؒ کا وصال ۱۳۹۵ھ مطابق ۱۹۷۵ء کو ہوا، والد صاحب حضرت آغا جیؒ صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے اور ان کی خدمت میں بیٹھتے موقع ملنے پر حضرت آغا جی صاحب کے پاؤں دبانے (چاپی کرنے کی) سعادت حاصل کرتے، حضرت آغا جی صاحب بھی والد صاحب سے محبت فرماتے تھے۔

حضرت الاستاذؒ اور والد صاحبؒ کے تعلق کی ابتدا

حضرت الاستاذ صاحبؒ کا ابتدا سے ہی کتابوں کے ساتھ خصوصی تعلق اور عشق تھا، ۱۹۷۰ء کی دہائی میں کراچی میں دینی کتابوں کے محدود کتب خانے تھے، جامعہ علامہ بنوری ٹاؤن کے مین گیٹ پر غرباً صرف ایک ہی دکان تھی جس میں زیادہ تر پرانے طرز کی کتابیں ملتی تھیں، جونا مارکیٹ میں کھتری مسجد کے بالکل سامنے گلی میں 'عباسی کتب خانہ' کے نام سے ایک قدیم اور مشہور مکتبہ ہے، حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کتابوں کے لیے عباسی کتب خانہ تشریف لائے حضرت والد صاحب نے دیکھا اور پہلی ہی نظر میں حضرت الاستاذ کا پرنور چہرہ، سر پر مسنون عمامہ، حمیت وحیا کی غماز آنکھیں اور سچائی ومروت سے روشن جبین دیکھ کر فریفتہ ہی ہو گئے۔ انتہائی عظمت واحترام سے والد صاحب نے کمرہ آنے کی دعوت دی۔ استاذ صاحب کو اپنے کمرہ میں لے گئے، حسب حال اکرام فرمایا۔ ادھر حضرت الاستاذ رحمہ اللہ بھی اس ادا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے کہ شہر اور بازار کے ماحول میں جہاں ہر وقت لوگوں کا کثرت سے آنا جانا رہتا ہے، نفسا نفسی کے عالم میں اس طرح اپنائیت کا اظہار فرمایا، والد صاحب کا حضرت مولانا فضل محمد صاحب سے تو تعلق تھا ہی، حضرت الاستاذ نور اللہ مرقدہ کا بھی اپنے اساتذہ میں محدث عصر حضرت بنوریؒ کے بعد سب سے زیادہ تعلق حضرت مولانا فضل محمد صاحب سے تھا۔ حضرت مولانا فضل محمد صاحب رحمہ اللہ بھی حضرت الاستاذ پر فدا تھے جس کا اندازہ خود استاذ صاحب کے خطوط سے ہوتا ہے جو والد صاحب کے نام پر لکھے گئے ہیں، والد صاحب اور

استاذ صاحب کی اکٹھ کی دوسری جگہ مولانا فضل محمد صاحب کی مجلس بن گئی۔

آخر در جاناں پے دونوں جا ملے

اس طرح یہ تعلق بڑھتا رہا، ۱۳۹۳ھ میں والد صاحب حج کے لیے تشریف لے گئے تو حضرت استاذ صاحب نے والد صاحب کے نام خط لکھا۔ خط کیا ہے "میاں عاشق و معشوق رمزیست" کا مصداق ہے۔ خط کے سر تا ے ئی سے حضرت استاذ محترم کا والد صاحب رحمہما اللہ سے عقیدت و تعلق اور ساتھ ہی کتابوں سے عشق مترشح ہے:

"بسم اللہ الرحمن الرحیم

من العبد الفقير المهين محمد امين الأوركزئي عفا الله سبحانه عنه

الى فضيلة الشيخ المكرم و المولى المحترم أسوة العلماء و الصلحاء و معدن الصدق و الوفاء مولانا محمد لبيز يدت معاليهم و مكارمهم و لازال على رؤوسنا ظل عافيتهم

السلام عليكم ورحمة الله و بركاته!

و بعد فقد تشرف هذا الفقير بمطالعة كتابكم العزيز و سرني مالا أستطيع أن أعبر عن قدره و ما كان الظن أن تفضلوا على الفقير بارسال الرسالة لما شغلكم المشاغل الروحية الطيبة في الديار المقدسة، فكان بلاغ رسالتكم الكريمة نعمة غير مترقبة جالبة سرور و فرح غزير فأحسن الله تعالى العظيم جزائكم على هذا الاحسان و الوفاء و التعطف على مثل هذا الخادم المستجبر و كنت أتفحص عند كل لقاء عن أخي المحترم الحافظ محمد سلمه الله و الأخ الأعز محمد يسين أكرمه الله عن أحوال سيادتكم و مكاتيبكم فأخبراني قبل أيام بوصول مكتوبكم اليهم فعثرت على بلوغكم الى منزل قصدكم و حضوركم في الديار المقدسة سيما بيت الله الحرام أكرمنا الله سبحانه و تعالى كما أكرمكم بلقائه، فحمدنا الله عز وجل على ذلك۔

سيدي المحترم! أقدم في سماحة فضيلتكم عن أعماق قلبي بمناسبة ما أنعم الله تعالى عليكم بزيارة الحرمين الشريفين و وفقكم بمنه و لطفه أداء الحجة و العمرة المبورتين و اني على أمل و اثق من شيمكم الجميلة و سيرتكم الطيبة أنكم ستذكروننا عند كل مقام متبرك بأدعية الخير للصلاح و الفلاح في الدارين و أكبر حاجتي و أعظم مأمولي عن جنابكم الذكر بالدعاء دعاء الخير عند مواجهة بيت ربنا تقدس و تعالى و عند المواجهة بالروضة المطهرة بعد عرض الصلوة و السلام من هذا الحقير لحضرة قدس سيد البشر كافة و خير الخلق عامة صفوة البرية سيدنا و مولانا محمد عليه من الصلوات أفضلها و من التسليمات أكملها و على آله و أصحابه و أتباعه و أحبابه أجمعين۔

و أما ما بشرتموني باشتراء الكتب القيمة للفقير فهذه منة عظيمة من جنابكم و ليست هي بأول منة بل منكم على العبد الفقير متقاطرة من زمان و قد بلغت حدا لا أحصي عدها، و و الله العظيم لست بأهل

لذلک کله ولکنه من کرم طبعکم السعید ولیس عندي ما أکافئکم به بید السؤال من مولاي الکریم أن یجزیکم عني جزاء جمیلا ویفیض علیکم من سماء رحمة أجرا جزیلا ویجعل حجکم وسائر ما وفقتم من أعمال الخیر مقبولة ویرجعکم الی بلادکم سالمین غانمین لربکم حامدین ولیکن هذا ختام کلامي المشتت کلام المعتوه اللعوب فقد طبعت حصة وافرة من ساعاتکم الغالیة وأرجو العفو عن جنابکم والسلام علیکم وعلی من لدیکم من المخلصین وقد بلغت سلامکم الی الأصدقاء الکرام وکلهم یقدمون في حضرتکم السلام ویرجون من جنابکم التذکار بدعاء الخیر۔

وأنا خویدکم الفقیر

محمد امین عفا الله تعالی عنه لیلة الخمیس ۲۲ من ذي الحجة ۹۳"

دوران حج والد صاحب کے نام ایک اور خط میں روضہ اقدس پر نیاز مندانہ سلام پیش کرنے کے لیے آخر میں نوٹ کی صورت میں لکھا:

"پہلے عریضہ میں درخواست کر چکا تھا کہ روضہ اطہر پر حاضری کے وقت اس سیاہ کار، نااہل، نافرمان غلام کا سلام آقائے نامدار جانِ دو عالم سردارِ کونین حبیب خدا حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وصحبہ واتباعہ وبارک وسلم کے بارگاہ اقدس میں عرض فرمائیں اور حق تعالیٰ سے مغفرت کی سفارش کے لیے سوال اس ذات بابرکات کے حضور پیش فرمائیں جس کے در فیض سے کوئی سائل محروم نہیں لوٹ سکتا۔

اس عریضہ میں دوبارہ مکرر ایسی درخواست ہے۔ ۷ محرم ۱۳۹۴ھ"

حضرت استاذ صاحب نور اللہ مرقدہ جب تک جامعہ میں رہے والد صاحب جامعہ جاتے، استاذ محترم سے ملاقاتیں ہوتی تھیں، استاذ صاحب بھی والد صاحب کے پاس مسجد تشریف لاتے تھے، استاذ محترم سالانہ تعطیلات میں گھر جاتے تو خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہتا، پھر جب استاذ صاحب جامعہ سے مستقل تشریف لے گئے، تو یہ سلسلہ تعلق خطوط کے ذریعہ جاری رہا، جامعہ سے جانے کے بعد والد صاحب کے نام پہلے تفصیلی خط میں جامعہ یوسفیہ کی ابتدا اور مستقبل میں اغراض ومقاصد کے متعلق تفصیلاً اپنے خواہشات کا اظہار فرمایا:

"جب سے آیا ہوں رب گواہ ہے کہ آنجناب کے مکتوب گرامی سے پہلے بھی اور بعد میں بھی بارہا چاہا کہ خدمت اقدس میں چند سطور سیاہ کر کے بار خاطر کو کچھ ہلکا کروں مگر قضائے الٰہی ہر حال ہر چیز پر غالب ہے، آج حوصلہ کر کے قلم اٹھایا آنجناب کا نورانی چہرہ سامنے ہے محبت اور شفقت کے وہ سارے اوضاع واطوار چشم تصور سے دیکھ رہا ہوں جو آں محترم کا اس نااہل ننگ احباب کے ساتھ رہے درد دل کے اظہار کا ذریعہ نہیں پاتا بس جاننے والا جانتا ہے، آنجناب کا اس سیاہ کے ساتھ جو حسن تعلق رہا اس کی وجہ سے میرے اس طرح آنے پر جو دکھ اور تکلیف آنجناب کو ہوئی ہے یا ہو رہی ہے اس کے احساس سے بھی بہرہ نہیں ہوں مادر علمی

مدرسہ عربیہ اسلامیہ اپنے محبوب مرحوم شیخؒ کی یادگار اور حضرت اقدسؒ کے جوار کو الوداع کہنا ایسا حادثہ تھا کہ کم ازکم اس سے شمع حیات گل ہونا چاہئے تھا مگر ما کان لنفس ان تموت الا باذن اللہ کتابا مؤجلا تقدیر کا ایک فیصلہ تھا جو نافذ ہوا میرے سمجھ سے بالاتر ہے کہ کیا ہوا اور کیسے ہوا اور مجھ جیسے دوسرے بے شمار ظاہرین بھی انگشت بدندان ہیں اس میں شک نہیں کہ یہ جاں گسل مرحلہ میرے سامنے تھا سالہا سال سے اس کے لیے سوچتا رہا طلبہ اور احباب سے بھی بمرات اس کا ذکر کیا، یکم مارچ کو پردۂ غیب سے ایسے عوامل ظہور میں آئے کہ مجھے انتہائی عجلت کے ساتھ یہ مشکل ترین مرحلہ طے کرنا پڑا، تفصیلات ان شاء اللہ بوقت ضرورت عرض کروں گا۔

آپ سے بھی درخواست ہے اب اس فقیر وحقیر کیلئے پہلے سے بھی زیادہ دعا فرمائیں کہ حق تعالیٰ باقی ماندہ زندگی اپنی رضا کے تحصیل میں صرف فرمائے

اب تک تو دین وایمان بڑی سستی داموں بیچتے رہے خدا کرے کہ اب چند دن اس کے رضا کے حصول کیلئے کچھ کرنے کی توفیق نصیب ہو، یہاں تعلیمی کام کا آغاز کر چکا ہوں کراچی سے ساتھ آئے ہوئے مظلوم اور لٹے ہوئے قافلہ کے ہم سفر ساتھی ساتھ ہیں بچوں کے حفظ کا انتظام بھی الحمد للہ ہو چکا ہے عسی ان تکرھو شیأ و یجعل اللہ فیہ خیرا کثیرا کی تفسیر آنکھوں کے سامنے ہے تصنیف کا کام بھی عنقریب شروع کرنے والا ہوں، کراچی سے سامان آنے کا انتظار ہے، مکرر سہ کرر دعائے خیر کی عاجزانہ درخواست ہے۔

آنجناب کی خوشی کیلئے اتنا عرض کرونگا کہ مجھے یہاں قطعاً کوئی رنج نہیں ماسوائے آپ جیسے کرم فرما مخلصین کے فراق کے، اللہ کا فضل ہے روح اور قلب کو کراچی کے بہ نسبت بہت زیادہ سکون واطمینان حاصل ہے اپنے ہی مسجد میں جس کے جوار میں طلبہ کے رہائش کیلئے پہلے سے کمرے بھی بنائے جاچکے تھے جامعہ یوسفیہ کے نام سے ادارہ قائم کیا جس کے تفصیلات شاید عنقریب خدمت والا میں پیش کرسکوں گا شاید سرحد کے خطہ میں یہ مثالی ادارہ ہوگا اور اس خصوصیت کے اعتبار سے کہ بحیثیت معلم نہ میں خود معاوضہ لونگا اور نہ دوسرے کسی کو معاوضہ ومشاہرہ پر مدرس رکھونگا شاید اس لحاظ سے دنیا بھر میں بینظیر ہو طلبہ کیلئے مطعم کا انتظام کرونگا ان شاء اللہ تعالیٰ، فی الحال ابتدائی چار درجات تک تعلیم کا انتظام ہوگا مستقبل پردہ غیب میں ہے مقاصد تو بڑے اعلیٰ وارفع سامنے ہیں معلوم نہیں توفیق کہاں تک ساتھ دیتی ہے آپ کی مخلصانہ دعائیں شامل حال ہو تو بعید نہیں کہ اپنے تمام تر کمزوریوں کے باوجود کامیابی حاصل ہو۔

وذلک فی ذات الالٰہ وان شیا

یبارک علی اوصال شلو ممزع

والدہ ماجدہ کی خدمت میں سلام عرض ہے اور دعا کی درخواست بھی، مسجد کے مؤذن مولانا صاحب اور

دوسرے احباب سے بھی سلام عرض فرمائیں سب سے دعا کی استدعا ہے۔"

ایک اور خط میں والد صاحب کو جامعہ یوسفیہ کے بارے میں لکھا:

"رمضان شریف کے بعد جامعہ یوسفیہ ان شاء اللہ تعالیٰ عہد طفولیت سے نکل کر شباب کے میدان میں قدم رکھے گا، دعا فرمایا کریں کہ حق تعالیٰ اخلاص نصیب فرمائے، اب تک حضرت مولانا فضل محمد صاحب کی خدمت میں نہ حاضر ہوا ہوں اور نہ عریضہ لکھ سکا ہوں، کل ملنے جانے کا ارادہ ہے، تاخیر کا سبب یہ ہے کہ مجھے پہلے سے معلوم ہوا تھا کہ حضرت مولانا دامت برکاتہم کا ارادہ ہے کہ جب بھی میں کراچی کو چھوڑوں تو مجھے اپنے بے انتہا شفقت کی وجہ سے اپنے پاس بلائیں گے، میرے لئے اب سفر چاہے مینگورہ میں قیام ہی کی صورت میں کیوں نہ ہو باعث پریشانی ہے، اس لئے سوچا کہ پہلے یہاں کام کا آغاز کروں تاکہ حضرت مولانا زید مجدہم کے سامنے عذر پیش کرسکوں۔ آپ کے صحت کے بارہ میں تشویش ہے، دعا کے علاوہ کچھ ہاتھ میں نہیں ہے، یہ فقیر آنجناب کی دعاؤں کا اب پہلے سے زیادہ محتاج ہے، امید ہے محروم نہیں فرمائیں گے۔"

والد صاحب نور اللہ مرقدہ نے خط کا جواب لکھا، اتفاقاً بھیجنے سے قبل میں نے اس کی فوٹو سٹیٹ کاپی کرلی تھی، پشتو زبان میں لکھے گئے اس طویل خط کی تلخیص پیش خدمت ہے۔

سلامی علی من غاب عنی جماله

وما غاب عن قلب الحزین خیاله

(۱) والد صاحب کا حضرت مولانا فضل محمد صاحب اور اپنے ماموں صاحب کی ملاقات جامعہ یوسفیہ اور حضرت استاذ صاحب کی زیارت کے لیے سفر کا عزم۔

(۲) جامعہ یوسفیہ سے تعاون اپنے ذمہ فرض سمجھتا ہوں، جامعہ کے حق میں دعا فرمائی کہ رب العالمین وہاں کی غیر آباد زمین کو آپ کے فیض و برکت سے علم وعمل کا گلستان بنائے اور اطراف عالم کو اس سے سیراب فرمائے۔

(۳) حضرت استاذ کے جانشین برادرم مکرم مولانا محمد یوسف زیدت محاسنہم کی ولادت اسی سال ہوئی تھی مبارک باد و دعا دی اور خوشی کا اظہار فرمایا۔

حضرت الاستاذ کی محنت اکابر کی دعاؤں سے اللہ تعالیٰ نے جامعہ یوسفیہ کو ایک تناور شجر باثمر بنایا اور اس سے دور دور علاقے مستفید ہورہے ہیں، حضرت استاذ محترم کا وجود اور جامعہ یوسفیہ روافض اور باطل قوتوں کیلئے کانٹا بنا رہا۔

والد صاحب جوڑوں کے درد اور شوگر جیسے جاں گسل مرض میں مبتلا تھے، والد صاحب کی بیماری کی وجہ سے استاذ صاحب ہمیشہ فکرمند رہتے تاہم والد صاحب کی یہ دلی تمنا اور خواہش تھی کہ حضرت استاذ محترم کے لگائے ہوئے باغ

کو اپنی آنکھوں سے دیکھے جس کا اظہار استاذ صاحب کے نام لکھے ہوئے خط میں فرمایا تھا، ادھر استاذ محترم کی بھی تمنا تھی کہ والد صاحب جامعہ یوسفیہ شاہو وام ہنگو تشریف لائیں، اس کا اظہار متعدد خطوط میں فرمایا، حضرت مولانا فضل محمد رحمہ اللہ کے بعد سب سے زیادہ حضرت والد صاحب کے آمد کے متمنی رہتے تھے، چنانچہ ایک خط میں لکھا:

''برادرم موصوف نے ایک عنایت نامہ میں کچھ زمانہ پہلے لکھا تھا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ ہم والد صاحب کی معیت میں بہار کے موسم میں شاہو وام آئیں گے، وقت موعود کا شدت سے انتظار رہا، الحمد للہ کہ بہار کی ابتدا تو ہوئی ہے جو مژدہ سنا گیا تھا عملاً وہ سعادت ہمیں کب حاصل ہوگی، آنجناب کی دل کی بات عرض کروں گا کہ جناب کے قدوم مبارک سے جو تسکین اور خوشی تبعاً مجھے حاصل ہوگی میں نہیں سمجھتا کہ وہ حضرت الاستاذ مولانا فضل محمد صاحب زید مجدہم کی تشریف آوری کے علاوہ اور کسی چیز سے حاصل ہو۔''

ایک اور خط میں اپنی خواہش وحسرت کا اس طرح اظہار فرمایا:

''برادرم محمد یٰسین صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کے خطوط وقتاً فوقتاً ملتے رہے ہیں چند دن پہلے بھی انکا ایک گرامی نامہ موصول ہوا آنجناب کی صحت کے بارے میں وہ تسلی دیتے رہتے ہیں مگر کھٹکا پھر بھی دل میں رہتا ہے انہوں نے یہ بھی خوشخبری دی تھی کہ حضرت والد صاحب بدست خود مکتوب تحریر فرمانے والے ہیں جبکہ اس سے پہلے ایک خط میں بتلایا تھا کہ مناسب موقع پر حضرت والد صاحب جامعہ یوسفیہ دیکھنے تشریف لے آئیں گے جب سے سردی ختم ہو چکی ہے فقیر انتظار میں ہے کہ خوشیوں اور مسرتوں سے بھرپور یہ سعید دن کب آئیگا اب گستاخی معاف میری تسلی مکتوب گرامی کی تحریر سے نہیں ہوگی بلکہ اپنے قدوم میمونت لزوم سے ہی اس بے مایہ وبے نوا خادم کے کبیدہ اور رنجیدہ دل کو سکون حاصل ہوگا احقر اپنا شوق کراچی حاضر ہوکر ملاقات سے بھی پورا کر سکتا ہے مگر جامعہ یوسفیہ میں آنجناب کے نزول فرمانے سے جو توقعات وابستہ ہیں وہ ادھوری رہ جاتی ہیں امید ہے کہ قبلہ حضرت ماموں صاحب زید مجدہم کی ملاقات کی نیت سے جب سرحد تشریف لائیں گے تو اس فقیر کو زیارت سے محروم نہیں رکھیں گے۔

الحمد للہ تعالیٰ میری نا اہلی کے باوجود ستار وکریم پروردگار نے توقع سے بڑھ کر مدد فرمائی اور جامعہ کا پہلا سال بخیر وخوبی ختم ہونیوالا ہے تعمیری اخراجات کیلئے جو قرضہ لیا تھا وہ ذرا پریشانی کا باعث ہے باقی بحمد اللہ تعالیٰ کوئی رکاوٹ پیش نہیں جناب والا اور دوسرے مشفق بزرگوں کی مشفقانہ دعائیں اور توجہات مبذول رہیں تو قرضہ اور دوسرے پیش آمدہ مسائل کا حل حق تعالیٰ نکال دیگا جی تو بہت کچھ لکھنا چاہتا ہے مگر مشاغل نے ایسا قلیل البضاعہ بنادیا ہے کہ اپنی تمام تر خواہش اور کوشش کے باوجود وقت نہیں نکال سکتا دسیوں جوابی لفافے پڑے ہیں جو منتظر الجواب ہیں، اللہ تعالیٰ وقت میں برکت عنایت فرمائے اور مرضیات کی توفیق بخشے۔''

حضرت استاذ صاحب اس دوران ایک موقع پر کراچی تشریف لائے، جاتے ہوئے والد صاحب کے نام ایک رقعہ لکھ کر چھوڑ گئے جس میں لکھا:

"ھو الحی القیوم لا الٰہ الا ھو

اتفاق سے مل بھی جاتے ہیں اخلاص محبت والے دل
یہ جنس اگرچہ دنیا میں کمیاب تو ہے نایاب نہیں

حضرت والا کے خلوص ومحبت کے ان مٹ نقوش دل پر ثبت تو تھے ہی، شفقت اور احسان کے مزید مظاہروں نے سر کو ایسا جھکایا کہ اٹھانے کا امکان ہی نہیں رہا۔ جس حالت میں آنجناب کو چھوڑ کر جا رہا ہوں، مروت کے تقاضوں کے سراسر خلاف ہے، مگر مجبور انسان جو اپنی حماقت سے اپنے آپ کو مختار سمجھتا ہے، کیا کر سکتا ہے؟ پوری شرمندگی اور بے مروتی کے ارتکاب کے احساس کے ساتھ روانہ ہو رہا ہوں، حق تعالیٰ محض اپنے فضل و کرم سے اور پھر اپنے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل جناب والا کو شفائے کامل عاجل سے نوازے اور صحت وعافیت کے لباس میں دوبارہ لقاء نصیب فرمائے۔ وہ دن کب آئے گا کہ صحت وسلامتی کے ساتھ حسب ارشاد شاہو خیل وام میں اپنے غریب خانہ پر آنجناب کو خوش آمدید کہنے کی سعادت حاصل کروں۔ واللہ علی کل شئی قدیر وما ذلک علی اللہ بعزیز"

حضرت استاذ محترم کی خواہش وتمنا، ادھر والد مرحوم کی بھی آرزو وحسرت کے باوجود امراض کی وجہ سے استاذ محترم کے لگائے ہوئے باغ جامعہ یوسفیہ کو نہ دیکھ سکے حقیقت ہے:

ما کل ما یتمنی المرء یدرکہ
تجری الریاح بما لا تشتھی السفن

خود استاذ محترم نے ایک خط میں لکھا ہے:

"بے کس وبے بس انسان قضا وقدر کے طاقت ور ہاتھوں کے سامنے کیا دم مار سکتا ہے بے نیاز وغنی پروردگار کے در عظمت پر جبین نیاز رکھ کر رحم وکرم کی درخواست ہی کر سکتا ہے۔"

والد صاحب دیگر گوناں گوں امراض کے ساتھ ہرنیاں کے بھی مریض تھے، لیکن والد صاحب انتہائی برداشت فرماتے، اکابر سے تعلق کی برکت سے طبعاً رضا بالقضاء کے پیکر تھے، تاہم رمضان ۱۴۰۲ھ میں ہرنیاں کا ناقابل برداشت حملہ ہوا، گھریلو آزمودہ تدابیر اختیار کیں مگر بے سود۔ بالآخر جناح ہسپتال لے گئے، وہاں کامیاب آپریشن ہوا، ہم سب خوش مطمئن ہوئے، والد صاحب کے بعض احباب اور رشتہ دار آتے رہے، والد صاحب بھی خوش تھے لیکن اچانک ہسپتال ہی میں دماغ پر فالج کا حملہ ہوا اور کافی ایام بے ہوش رہے، استاذ محترم کو اس دوران اطلاع

ہوئی تو والد صاحب کی عیادت کے لیے تشریف لائے۔ یاد رہے اس وقت سفری سہولتیں اتنی نہیں تھیں، والد صاحب کی عیادت فرما کر ہمیں تسلی دی اور والد صاحب کی ہر خدمت ادا کرنے کی تاکید فرمائی، ساتھ ہی بحیثیت مسلمان اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے کے سامنے سرتسلیم خم کرنے کی ہدایت فرمائی۔

"کل من علیہا فان" اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اٹل ہے بالآخر وہ وقت موعود آپہنچا جس سے کسی کو عذر نہیں۔ یکم ذوالقعدہ ۱۴۰۲ھ کو والد صاحب انتقال فرما گئے: انا للہ وانا الیہ راجعون فان للہ ما اخذ و لہ ما اعطی و کل شئی عندہ باجل مسمی۔ والد صاحب کے انتقال پر استاذ صاحب نے برادرم بزرگوارم مولانا حافظ محمد صاحب زیدت مکارمہم کے نام عربی میں مختصر تعزیت نامہ بھیجا، بعد میں دوسرا تفصیلی تعزیت نامہ بندہ کے نام ارسال فرمایا، تعزیت نامہ کیا ہے؟ پندو نصائح سے لبریز ہر دل مجروح کے لیے مرہم:

"وتوکل علی الحي الذي لایموت ـــ رب المشرق والمغرب لاالٰہ الاھو فاتخذہ وکیلا۔

نوک مژگانم بسرخی بیاض روئے زرد

قصہ دل می نویسد حاجت گفتار نیست

برادر عزیز! الھمک اللہ تعالی الصبر وانزل علیک السکینۃ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ !

حضرت والد نور اللہ مرقدہ کے وصال کو ڈیڑھ مہینہ گذرنے والا ہے، چند دن پہلے چند بے جوڑ کلمات لکھ کر ایک رقیمہ روانہ کر چکا تھا اور تفصیلی مکتوب کا وعدہ کیا تھا، عید کی تعطیلات ہوئیں ایک ہفتہ گزر گیا مگر کچھ لکھنے کی جرأت نہیں ہو رہی، گزشتہ سال حضرت مفتی محمود صاحب رحمہ اللہ پر ترجمان خصوصی ایڈیشن میں احباب نے کچھ لکھنے پر اصرار کیا مگر میری کیفیت یہ تھی کہ ایک سطر بھی لکھنے کی اپنے اندر قدرت نہیں پا رہا تھا، اب حضرت والد صاحبؒ کے فراق پر وہی کیفیت محسوس کر رہا ہوں، نامعلوم مزاج میں یہ انقلاب کیسے آیا، پہلے جب صدمہ ہوتا تھا اور دل طول ہوتا تھا تو قلم کی روانگی اور سیلان پر خود مجھے تعجب ہوتا تھا مگر اب حالت یہ ہے کہ صدمات نے میری نحیف کمر ہی نہیں توڑا بلکہ قلم کی کمر کو بھی توڑ کر رکھ دی۔

میرے عزیز! طبعی صدمہ میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھے آپ حضرات سے زیادہ ہوا ہے، تاہم عقلی طور پر حضرت والد صاحبؒ کے ارتحال کا صدمہ یقیناً میرے لئے آپ سے بڑھ کر ہے، آپ کے لیے تو ماشاء اللہ دعا کنان کی کمی نہیں، ماتم تو یہ محروم بدنصیب کرے گا جس کے لیے پنج وقتہ دعا کے لیے اٹھنے والے ہاتھ نہ رہے، دنیا ہمیشہ رہنے کی جگہ نہیں، جانے کا اتنا صدمہ نہیں ہوتا جتنا کہ جانے والے کے ساتھ اٹھ جانے والی برکات کا ہوتا ہے۔ آپ سے فقیر نے عرض کیا تھا کہ آنے والے طوفان کے لیے اپنا ذہن پہلے سے ہموار بنانے کی کوشش

کریں، آپ کا یہ ناچیز خادم اپنی عمر کے ساتویں سال میں قدم رکھ چکا تھا کہ میرے والد صاحبؒ شہید ہو گئے تھے، جب کہ ہمارے بڑے بھائی بھی اس وقت نابالغ تھے، پھر ٹھیک تین سال بعد مجھ سے چھوٹے بھائی حسین الدین نے جو صحت وتوانائی اور حسن ورعنائی میں فرید تھے، داغ مفارقت دے گئے اور یہ زخم ابھی ہرا ہی تھا کہ ایک سال دو مہینہ بعد والدہ محترمہ کے سایہ عاطفت سے محروم ہونا پڑا۔ آپ تو الحمد للہ جوان ہیں، حفظ کلام پاک کی دولت سینے میں ہے، دینی علوم سے فراغت حاصل ہونے والی ہے، بڑے بھائی عالم و فاضل ہیں اور خداوند تعالیٰ کے فضل وکرم سے خود ابو بن گئے ہیں، آپ پر تو صرف صبر ہی کا نہیں شکر کا وظیفہ لازم ہے۔

میرے عزیز! جس کو دائرہ محبت میں جگہ دیتے ہیں تو پہلے اسے ابتلا کے گزرگاہوں سے گزرنا پڑتا ہی "اذا احب اللہ عبدا ابتلاہ فان صبر اجتباہ وان رضی اصطفاہ" زبانی لاف گزاف اس محبوب بے ہمتا کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتے، صمدیت اس کا کرتا ہے، غنی عن العالمین اس کا ازار ہے اور کبریا اس کا رداء ہے۔ "أحسب النّاس أن يتركوا أن يقولوا آمنا وهم لا يفتنون ولقد فتنا الذين من قبلهم فليعلمنّ الله الذين صدقوا وليعلمنّ الكاذبين" کے پر رعب وجلال خطاب سے کون غافل رہ سکتا ہے؟ ولنبلونكم بشيء [ ] من الخوف والجوع الآیہ، تو ہر قاری کا ورد زبان ہے "ونبلوکم بالشر والخير فتنة۔"

محترما! محبوبانہ استغناء کے ساتھ لطف وجلال کے ملے جلے لہجے میں گایا گیا یہ نغمہ بگوش دل سن لیجئے:

تا بلا بر کسے قضا نہ کنیم ۔ نام او راز اولیاء نہ کنیم
ایں بلا گوہر خزانہ ما است ۔ گوہر خود بہ کس عطا کنیم

اور

ما پروریم دشمن وما میکشیم دوست
کس را نہ رسد چون وچرا در قضائے ما

"من لم يصبر ببلائي ولم يرض بقضائي فليخرج من ارضي وسمائي وليطلب ربا سوائي" حق تعالیٰ ہمارے قلوب کو اپنی محبت کی دولت سے معمور اور ہماری ارواح کو اپنے عشق وولولہ کی شراب سے مخمور فرمائے، پھر کڑواہٹ محسوس نہیں ہوگی "ضرب الحبيب زبيب" کا معاملہ ہوگا، ایسے ہی مستان شراب محبت کا نعرہ ہوتا ہے:

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت
سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

ہمارے ہم وطن افغانی عارف عبدالرحمٰنؒ نے سچ کہا اور درست فرمایا ہے:

پہ تلخئ دمیو مست خلق م خوخ دی

هغه خار چه بونے د گل لری خار نه دی

آپ الحمدللہ! دینی تعلیم سے بہرہ ور ہیں، اس معاملہ کو ایک اور ناحیہ سے بھی دیکھنا چاہیے بلکہ اس ناپائیدار حیات مستعار میں جب بھی ناگوار طبع حادثہ پیش ہو تو اس نسخہ سے فائدہ اٹھانا چاہیے وہ یہ کہ بے شک مشفق و مہربان والد بزرگوار کا ہم سے جدا ہو جانا انتہائی کرب انگیز حادثہ ہے، مگر کیا والدہ ماجدہ، بھائی، ہمشیروں اور دوسرے اعزہ واحباب کی متاع حیات ہمارے اختیار کی چیز ہے یا اسی رحیم وکریم پروردگار کا عطیہ ہے؟ صرف ایک نعمت کے چھین لینے پر اگر ان بے شمار نعمتوں کا استحضار اور اعتراف نہ ہو تو میرا خیال ہے شرافت اور مروت کے معیار پر یہ بڑی کمینگی کا مظاہرہ ہوگا، وہ حمید ومجید ہر حال میں ہمارے حمد وسپاس کے مستحق ہیں والحمدللہ تعالیٰ علی کل حال ہر قسمت کے پہلو میں نعمت ہوتی ہے" وبضدها تتبین الأشیاء" تو مسلمات میں سے ہے۔

خادی هرچرے دغم په اندازه وی

ده هغوبه سه خادی وی چه بے غم شی

اور متنبی کے الفاظ میں تو یہ بات ہر خاص وعام کے سمجھنے کی ہے:

سبقنا الی الدنیا فلو عاش اهلها

منعنامن جیئة وذهوب

اور اسی کا فکر انگیز شعر ہے:

ولا فضل فیها للشجاعة والندیٰ

وصبر الفتی لولا لقاء شعوب

اور اسی جھوٹے نے یہ بھی سچ کہا ہے: (والکذوب قد یصدق)

وللواجد المکروب کی زفراته

سکون عناء او سکون لغوب

میرے عزیز! آپ بڑے عظیم باپ کے فرزند ہیں، اس درویش انسان میں انسانیت کی جو اعلیٰ ترین قدریں پائی جاتی تھیں اس کا عشر عشیر بھی بڑے نامی گرامی مشاہیر میں نہیں ملتا، تقویٰ جو کارخانہ کائنات میں عزیز ترین دولت اور نفیس ترین مال ہے: "ان اکرمکم عنداللہ اتقکم" والد مرحوم ومغفور کا طرہ امتیاز تھا، خلوص ومحبت اور حیاء ووفا ان کے ہر کام اور ہر بات سے عیاں تھی، سرور کائنات حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق ومحبت کا حال تو آپ کو خود ہی معلوم ہے کہ ان کی ذات اقدس (فداہ نفسی وعرضی) کی طرف جو منسوب ہو چاہے مجھ جیسا

کتاہ کیوں نہ ہوان کوسرآنکھوں پر بٹھاتے تھے،مرحوم کی یہ اداد یکھ کرقیس کی حرکات پر کوئی تعجب باقی نہیں رہا، بدقسمتی سے بڑوں کی اولاد عموماً نااہل ثابت ہوتی ہے، آپ سے بجا طور پر یہ توقع ہے کہ دوسروں سے عبرت حاصل کریں گے" السعید من وعظ بغیرہ "اب" پدرم سلطان بود" کا عہد نہیں:

هره غاړې چه بخپله خانسته نه وی

سوک به نے سه کاندی خانست دمور اونیا

علم میں پختگی حاصل کریں، صلاح وتقوی کے زیور سے اپنے آپ کو آراستہ کیجئے، اللہ تعالیٰ کی یاد کو سب سے بڑی دولت سمجھیں، معاشی امور کے لیے ہرگز متفکر نہ ہوں، رب العالمین کی ربوبیت کا غیر متزلزل اعتقاد رکھیں، اس کی تقدیر پر کامل یقین ہو، خود بھی تکلفات سے پرہیز کریں اور گھر میں بھی اس کی تلقین کیجئے، کفایت شعاری آسودہ حالی کنجی ہے۔ آج کل بہت سی چیزیں طعام وشراب، لباس ومسکن وغیرہ میں ہم نے دوسروں کے دیکھا دیکھی ضروری تصور کی ہوئی ہیں حالانکہ وہ بالکل غیر ضروری ہیں" آنچہ ما در کار داریم اکثرش درکار نیست "۔ اس فقیر کے مناسب حال جو کام ہو تحریر فرماتے رہیں، میرا ارادہ عید کی تعطیلات میں حاضر ہونے کا تھا مگر موانع نے روک لیا، تفصیل سے معذور ہوں کہ آپ کو مزید پریشانی ہوگی جناب والدہ ماجدہ ادام اللہ ظلہا اور برادر مکرم حافظ محمد صاحب اور ہمشیرگان اور تمام احباب سے سلام نیاز عرض کیجئے اور تعزیت فرمائیں۔

اخوکم الحزین: محمد امین عفا اللہ عنہ۔"

ایک دفعہ رفیق محترم برادرم عزیز مولانا محب اللہ صاحب زیدت مکارمہم کے ساتھ حج پر جانے کی اللہ نے توفیق دی، بندہ نے حج سے متعلق ہدایات کے لیے گزارش کی تو استاذ صاحب نے ایک خط میں مختصر مگر جامع ہدایات ارسال فرمائیں:

"میرے قابل احترام پیارے بھائی! اللہ سبحانہ فی خلقہ شیئون، اعزاز واذلال بھی اسی کا نمایاں شعبہ ہے، آپ کو بمشکل یقین ہوگا کہ یہ فقیر کل جن حضرات کو اپنا فرزند یا بھائی سمجھتا رہا ان میں سے بیشتر حضرات میرے لیے آج اپنے بزرگ واکابر کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں، والحمد للہ تعالیٰ علیٰ ذلک۔ اللہ انہیں مزید ترقیات سے نوازے اور اس سیاہ کار وسیاہ رو کے لیے یوم الحساب میں نجات کا ذریعہ بنائے، آں محترم نے سفر حج کے موقع پر کچھ لکھنے کی فرمائش کی، اپنی نااہلی اور پھر مذکورہ بالا تصور کی وجہ سے تکلیف بمالا یطاق جیسا محسوس ہوا، آں محترم کے بے انتہا خلوص ومحبت کی وجہ سے یہ صفحہ سیاہ کر رہا ہوں۔ مکتوبات شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنیؒ کے جلد اول میں حضرت کا ایک مکتوب گرامی حج کے سلسلہ میں موجود ہے جو کہ نہایت بصیرت افروز، ایمان افزا حقائق پر مشتمل ہے، نیز حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی کتاب حکایات اولیاء میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی فضیلت کے بارے میں حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ کی ایک تحقیق منقول ہے جو کہ ارکان

اسلام کے بارے میں بے انتہا نفیس معارف کی حامل ہے۔ازکار رفتہ حافظہ کے مطابق اپنے مشفق ومحسن مربی استاذ صاحب نے درس سنن ابی داؤد کے دوران کتاب الحج کی ابتدا میں حضرت مدنیؒ کے اسی مکتوب کا خلاصہ بیان فرمایا تھا، بار بار مطالعہ فرما کر استفادہ مناسب ہوگا جس کریم ورحیم رب نے اپنے ہاں بلانے کا اہتمام فرمایا ہے اس کی رحمت سے قوی امید ہے کہ وہ آداب حضوری کی توفیق بھی عنایت فرمائے گا۔

ہم کیا ہے؟ کیا کچھ ہم سے ہوگا جو کچھ ہوا تیرے کرم سے ہوا، جو کچھ ہوگا تیرے ہی کرم سے ہوگا۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم وایاہ نعبد وایاہ نستعین۔

امرتک الخیر ومالتمرت به

ومااستقمت فماقولی لک استقم

شدت سے قلم رک رہا ہے، اس کے باوجود اتنا عرض کروں گا کہ فطری طور پر حج کی عبادت اگر جذبہ عشق کے ساتھ نہ ہو تو انسان میں عجب اور تعلی، ریا وسمعہ جیسے امراض کا یا ان میں اضافہ کا سبب بنتا ہے، اس لئے متعلقہ نص قرآنی میں "وللہ علی الناس حج البیت" کی تعبیرات خصوصی توجہ کے مستحق ہیں جبکہ اس سے پہلے "البیت" کی عظمت وجلالت کا بیان نہایت موثر اسلوب کے ساتھ فرما چکے ہیں، اس لئے شروع سے آخر تک اس مبارک سفر میں عجز ونیاز کا مجسمہ بننا چاہیے اور قدم قدم پر "رب البیت" اور "البیت" کی عظمت وجلالت کو پیش نظر رکھا جائے تاکہ اپنی کوتاہی اور تقصیر کا احساس دوسروں کی طرف دیکھنے سے مانع رہے، خود بینی وبد بینی دونوں موبقات میں سے ہیں، حق تعالیٰ ہم سب کو تمام مہلکات وموبقات سے اپنی حفاظت میں رکھے، کم خوری اور کم گوئی کے ثمرات محتاج بیان نہیں، اضاعت وقت میں اضاعت مال سے بھی بدرجہا بڑھ کر خسارہ ہے، وقت کی پوری پوری حفاظت ہونی چاہیے، خدمت تو بہت بڑی سعادت ہے ملے تو زہے نصیب نہ ہو تو عزلت کو غنیمت سمجھا جائے۔ حرم الٰہی میں قیام کے زمانہ میں قرآن پاک کی تلاوت بکثرت مناسب ہے اور نفی اور اثبات کا ذکر بھی اس کے جامع مفہوم کے تصور کے ساتھ، چوں میگویم مسلمانم بلرزم کہ دانم مشکلات لاالٰہ الا اللہ، اور حرم نبوی میں درود وسلام کی کثرت زیادہ انسب ہے نیز اپنی تقصیرات پر استغفار اور مواجہہ کے وقت پوری ندامت وشرمندگی کے ساتھ استشفاع کی لجاجت۔ آں عزیز سے بلا درخواست بھی توقع ہے کہ مقامات مقدسہ اور ساعات اجابت میں اپنے صالح دعوات میں اس بدکار کو فراموش نہیں فرمائیں گے تاہم پھر بھی بالحاح گزارش ہے کہ اس ناکارہ کے لیے خصوصا اس کے خاتمہ بالخیر والایمان کے لیے پوری توجہ کے ساتھ دعائیں فرماتے رہیں اور روضہ اقدس پر اس سگ اور نالائق ترین غلام کی طرف سے ہدیہ صلاۃ وسلام پیش فرمائیں۔ حضرت باباجی صاحب بھی ان شاء اللہ تعالیٰ حج وزیارت کی سعادت امسال حاصل کریں گے، ضیاع وقت کے بغیر ممکنہ استفادہ کی کوشش بہتر ہوگی۔"

یوں تو استاذ محترم رحمہ اللہ کے تمام خطوط پند و نصائح سے مزین گنجینہ علوم و معارف ہیں، تاہم بعض اہم چیدہ چیدہ ہدایات افادۂ عام کی خاطر پیش خدمت ہیں۔ نفعنا اللہ تعالی و جمیع المسلمین بہ

منتخب افادات از مکتوبات حضرت الاستاذ

(۱)..... وقت کی قدر و قیمت:

وقت کی قدر و قیمت پر تنبیہ فرماتے ہوئے ایک خط میں رقم طراز ہیں:

''میرے عزیز! میری ہمیشہ سے تمنا رہی ہے کہ احباب کے لمحات زندگی ضائع نہ ہوں، وقت کی گاڑی اجل مسمّی تک چلتی رہے گی، اس کا روکنا مخلوق کی بس میں نہیں اس لئے وقت کی قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ یہ وہ دُر نایاب ہے کہ ہاتھ سے چھوٹے تو دنیا بھر کی خزائن صرف کر کے اسے لوٹایا نہیں جاسکتا اور کامل صحت وفراغت کا تصور میں بھی اس کلدۂ احزان و بلدۂ ھموم میں نہیں ہوسکتا، بس جو بس میں ہے اسے کام میں لایا جائے''

(۲)..... تدریس کے اصول:

بندہ نے درس و تدریس میں درپیش مشکلات کا ذکر کیا، جس پر محقق مربی کا درج جواب موصول ہوا:

''درس و تدریس کے سلسلہ میں پیش آمدہ مشکلات سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔

اولاً: قلبی اذعان و اعتقاد کے ساتھ'' سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم '' کا استحضار کر کے درس میں جانا چاہیے، مضامین کے ساتھ ساتھ الفاظ و تعبیرات تک کو فیضان الٰہی کا نتیجہ سمجھئے۔

ثانیاً: اسباب کے درجہ میں مطالعہ کے بغیر سبق پڑھانا تو درکنار اس کا تصور تک نہ کیا جائے، جتنا پڑھانا ہے اور جو کچھ بتلانا ہے پہلے خود اس کو خوب ضبط کرلیں، قابو یافتہ معلومات کا افادہ اسہل بھی ہوتا ہے اور انفع بھی، خود شرح صدر نہ ہو اور مضمون ضبط نہ ہو تو قدرتی طور پر سامعین نہ محظوظ ہوتے ہیں اور نہ مستفید، مزید برآں اس راہ کے نو وارد کے لئے کتاب کے ایک حاشیہ یا شرح پر اکتفاء زیادہ مفید ہوتا ہے۔ ہاں جہاں اس حاشیہ یا شرح سے متن حل نہ ہو، یا کسی شبہ کا جواب نہ ملے تو وقتی طور پر دیگر شروح کی طرف مراجعت کی جائے، متعدد شروح کے مطالعہ سے فکری انتشار پیدا ہوتا ہے، نتیجتاً درس کے دوران تقریر مربوط نہیں رہتی۔

ثالثاً: ہر فرض نماز کے بعد اپنا دائیں ہاتھ سر پر رکھ کر سات مرتبہ یا گیارہ مرتبہ ''یاقوی'' پڑھ کر اسی ہاتھ پر دم کر کے سر پر ہاتھ پھیر لیا کریں اور درس میں جاتے وقت قلب پر بطریق مذکور ہاتھ رکھ کر یہی عمل عمل میں لائیں، تین مرتبہ سورۂ کوثر پڑھ کر ہاتھوں پر دم کر کے سینہ پر ملنا بھی بہترین نتائج کے حصول کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔''

(۳)..... احساس اصلاح کی اہمیت:

ایک اور اصلاحی مکتوب میں اصلاح نفس کے احساس کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دینی امور میں تساہل وکمزوری یقیناً خسارہ ہے چاہے فرائض ہوں یا واجبات وسنن ومندوبات، لیکن یہ بھی حق تعالیٰ کا احسان ہے کہ انسان کو اپنے خسارہ وزیاں کا احساس ہو، آج تو مجھ جیسے بے شمار سیاہ روایسے بھی ہیں جو کہ احساس زیاں سے بھی محروم ہیں، پھر اس انحطاط وزیاں کے ایام میں اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے جتنی تھوڑی بہت اپنی اطاعت کی توفیق عطا فرماتے ہیں وہ بھی لاکھوں لاکھ بار شکر کی متقاضی ہے، بڑے بڑے علم وعمل کے دعویدار اندر سے دہری نظر آتے ہیں، شاید دہری بھی اتنا اعتماد مادہ پر نہیں رکھتے ہیں، اپنی موجودہ حالت پر قانع تو نہیں رہنا چاہیے تاہم شاکر رہنا ضروری ہے۔ لئن شکرتم لازیدنکم کے کریمانہ وعدہ پر ہمہ وقت نظر رہے۔''

(۴)......فتن اور مسائل خلافیہ میں عالم دین کا فرض منصبی

ذیل کے مکتوب میں فتن اور مسائل خلافیہ میں ایک عالم کے درست رجحانات کی نشاندہی کی ہے اور انہیں پورے اعتدال سے برتنے کی تلقین فرمائی ہے، کاش! اہل علم اسے اپنا نصب العین بنالیں۔

''بحیثیت ایک عالم دین ہونے کے آپ حضرات کا منصبی فرض ہے کہ شریعت مقدسہ کی حفاظت کے لیے ہر وقت چوکنے رہیں اور حریم شریعت کو جہاں سے خطرہ لاحق ہو اس کی طرف متوجہ رہیں، ہمیشہ سے دین کو دو فتنوں کا سامنا ہے: غیر دین کو دین بنانے کی کوشش، دین کے بعض اجزاء کو غیر دین ثابت کرنے کی جسارت۔ مفرطین ومفرطین کی کوششوں کا یہی حاصل ہے، ہمیں سنت کے جادۂ قدیمہ پر اعتدال کے ساتھ قائم رہ کر دونوں فتنوں کا مقابلہ کرنا ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ کم ازکم سرحد کے ماحول میں دین کے کسی جزء کو غیر دین ثابت کرنے کی کوشش میں کامیابی از حد دشوار ہے اور غیر دین کو دین سمجھنے سمجھانے کی وبا بہت عام ہے اور سریع الاثر ہے، اس لئے دین کی سچی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس فتنہ کی طرف زیادہ توجہ دیں اور یہ بھی عرض کردوں کہ میرے نزدیک توحید واتباع سنت کے باب میں غلو اور تشدد جو اپنی جگہ مذموم ضرور ہے شرکیات اور بدعات کے عموم اور شیوع کا ردعمل ہے، اگر شرک وبدعت کا قلع قمع ہوجائے تو میرا خیال ہے ان عناصر میں اعتدال آجائے گا، پھر ایک اور چیز کا اہتمام زیادہ فرمایا کریں کہ حکم شرعی کو اس کے متعینہ حدود میں رکھیں جس طرح شخصیات میں فرق مراتب کو نظر انداز کرنا خطرناک بلکہ بسا اوقات الحاد وزندقہ میں مبتلا کر کے چھوڑ دیتا ہے اسی طرح احکام شرعیہ میں تفاوت کو ملحوظ نہ رکھنا گمراہیوں کا بہت بڑا دروازہ ہے، حفظ مراتب اعتدال کے لیے شرط اول ہے۔ مجھے تو افسوس ہوتا ہے جب اہل علم کو دیکھتا ہوں کہ توسل بالذوات، دعاء بعد السنن جیسے مسائل کو کفر وایمان کے معیار کے طور پر پیش کرتے ہیں، مانا توسل احادیث وآثار سے ثابت ہے لیکن

شریعت نے دعا میں توسل کو ایسی اہمیت تو نہیں دی کہ اس کی تبلیغ ضروری ہو، قرآن کریم واحادیث صحیحہ میں بمشکل ایک فی ہزار کی نسبت سے دعا میں توسل کا ذکر ہوگا، اکثر منصوص و ماثور دعائیں اس کے ذکر سے خالی ہیں اور اسی طرح سنن ونوافل کے بعد دعا میں جب التزام نہ ہو، ترک پر ملامت نہ ہو تو بحیثیت مع العبادۃ آ خر اس میں کیا فساد ہے کہ اکثر مرتکب پر خواہ مخواہ مبتدع کا فتویٰ داغ دینے کی ضرورت ہو، سماع وعدم سماع دونو ں قول جب سلف سے منقول ہیں تو اس مسئلہ کو کیوں تفرق وتحزب کا ذریعہ بنانے جائے جب کہ سلف کی خیرت پر سب متفق الرائی ہیں بہر حال دیوبند کے مسلک اعتدال پر قائم رہتے ہوئے اور ادب واحترام کا دامن تھامے ہوئے ان لایعنی باتوں سے پرہیز کریں۔''

(۵)......دین ہی واحد محافظ ہے:

ایک اصلاحی مکتوب میں دین کے محافظ ہونے کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''دین ہی وہ واحد حصن حصین ہے جو شخص، خاندان، قوم، معاشرہ کو تحفظ فراہم کرتا ہے، دینی حدود سے بے اعتنائی دنیوی واخروی رسوائی کا موجب بنتی ہے۔''

(۶)......موحد حقیقی کون؟

ایک مکتوب میں نفس وطبیعت کے تقاضوں کو شریعت پر غالب رکھنے کی ترغیب دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''غنی عن العالمین کے قوانین اور اصول فطرت ناقابل تغیر ہیں، ان فطری قوانین کے فطری نتائج ہیں جسے کسی صورت ٹالا نہیں جاسکتا۔ جس قومی اور طبعی خواہشات اور جذبات کو پامال کرتے ہوئے شریعت غراء کے تقاضوں کو پورا کر کے اپنے ''مؤمن باللہ'' اور ''عبداللہ'' ہونے کا ثبوت دیتا ہے، قومیت اور نفسانیت کے لات ومنات کو ٹکرا کر موحد حقیقی کا کردار ادا کرتا ہے۔''

(۷)......مقامات صبر:

والد صاحب کی بیماری پر دعائیہ خط میں اپنے شیخ مکرم کے حوالے سے مقامات صبر کی دل نشین تشریح بیان فرماتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''حضرت اقدس شیخنا المکرم حضرت گڑھی باباجی متعنا اللہ تعالی بفیوضھم کی خدمت میں حاضری نصیب ہوئی، حضرت ممدوح نے ایک بات کی مناسبت سے ارشاد فرمایا کہ حدیث شریف میں آتا ہے "اذا احب اللہ تعالی عبدا ابتلاہ فان صبر اجتباہ وان رضی اصطفاہ" پھر تشریحاً فرمایا کہ حق تعالی کی محبت اور تعلق کی پہلی علامت یہ ہے کہ آدمی کو تنگ دستی وخواری، یا تکلیف وبیماری، یا قید وگرفتاری میں مبتلا کر دیتا ہے، اگر وہ صابر رہا، حرف شکایت زبان پر نہ آنے دیا تو اسے مقام اجتباء پر فائز کر دیتا ہے۔ مقام اجتبا محفوظیت کا مقام ہے

یعنی تازیست حق تعالی اس بندہ کو نفس وشیطان کے حوالے نہیں فرمائیں گے، اگر وہ صبر سے بھی آگے بڑھ کر ان بلایا ومصائب پر خوش ہوتا رہا اور لطف اندوز ہوتا رہا تو مقام مصطفی اسے نصیب کردیتے ہیں یہاں تک تشریح فرما چکے تھے کہ ایک مشہور عالم دین'' برتھانہ مولانا صاحب'' تشریف لے آئے اور یہ پر لطف گفتگو منقطع ہوئی۔ بہر حال حضرت والد صاحب کے ساتھ حق جل مجدہ کا معاملہ سنت قدیمہ کے مطابق ہے۔ تاہم ہم جیسے ضعفا جو تفویض وتسلیم کے منزل سے بھی کوسوں دور ہیں، شکر ورضا کا تو ذکر کیا! یقیناً اپنے لئے بھی اور اپنے بزرگوں کے لیے بھی صحت وعافیت کی دعا مجبور بھی ہیں اور مامور بھی۔

(۸) نری کتابیں پڑھنا کافی نہیں:

حضرت والد صاحبؒ کی خدمت اور ان کے اخلاق حسنہ سے سیکھنے کی تلقین فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' حضرت والد صاحب کی خدمت کو غنیمت جانئے اور نری کتابیں پڑھنے سے کچھ نہیں بنتا، ان کے ذوق عبادت اور شوق وصل سے دیدۂ عبرت بے انتہا فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ دعوات خیر میں یاد فرماتے رہیں مجھ سے مراسلت کے بارے میں شکوہ نہ فرمایا کریں جہاں تک یاد رکھنے کا تعلق ہے تو اتنا لکھنا کافی ہوگا کہ ہاشمی تخم ہو، افغانی پودا ہو، قبائلی زمین ہو، کوہستانی آب وہوا ہو تو محسنوں کو بھولنے کا امکان کیا رہ سکتا ہے۔''

(۹)..... ابتلا علامت ایمان وقبولیت:

ایک خط میں مصائب وبلایا پر صبر کی تلقین کے ساتھ باریک نکتہ بتلاتے ہیں:

'' ابتلا اور پریشانی وہاں کچھ مرتبہ رکھنے اور وہاں سے کچھ حاصل ہوجانے کی دلیل ہے، اس سے پریشان ہونا نہیں چاہیے، بحیثیت مؤمن بلایا اور مصائب سے ہمیشہ محفوظ رہنا پریشانی کی بات ہے۔ ہمارے حضرت دامت برکاتہم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ بیعت ہوجانے کے بعد اگر آزمائش پیش آئے بیماری کی صورت میں یا گرفتاری کی صورت میں یا ناداری کی صورت میں، تو سمجھ لینا چاہیے کہ قبول ہوا اور اگر کسی قسم کی پریشانی لاحق نہ ہو جائے تو ایسا شخص سالک اور ولی تو کیا مرید اور طالب کہلانے کا مستحق بھی نہیں۔''

(۱۰)..... تقدیر پر پختہ اعتقاد کی ضرورت:

تقدیر پر پختہ اعتقاد کی ضرورت بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

'' انسان ہر لحاظ سے ضعیف واقع ہوا ہے، تقدیر پر پختہ اعتقاد ہو اور اعتقاد کا استحضار ہو تو کسی سے شکایت نہیں ہونی چاہیے، ازل سے بنے ہوئے نقشوں میں رنگ بھرا جارہا ہے، ترتیب شدہ پروگرام کی تکمیل ہورہی ہے، جبار وقہار حکمران کا حکمت ورحمت پر مبنی نظام پوری باقاعدگی کے ساتھ چل رہا ہے، ضعیف انسان کیا بڑے بڑے اجرام کو مجال نہیں کہ آگے پیچھے ادھر ادھر ہوجائیں، ذلک تقدیر العزیز العلیم۔ موہوم سے اختیار نے

تکلیف کا بوجھ اا وذ اا ا ہے اور غفلت و جہالت کی وادیوں میں چھوڑ رکھا ہے۔ ھذالی وھذالی، وھو ومافی ید ہ کلہ للہ، ولا حول ولا قوۃ الا باللہ۔"

تلک عشرۃ کاملۃ

حضرت استاذ محترم رحمہ اللہ نے بندہ کے نام اپنے ایک خط میں دنیا کی ناپائیداری کا نقشہ ذکر فرما کر دعائیہ جملے لکھے، میں انہی کلمات کو اس مضمون کا خاتمہ بناتا ہوں۔ استاذ محترم کے بابرکت کلمات کی چاشنی آپ خود محسوس کریں گے۔ رب العالمین سے اس دعا کی قبولیت کی درخواست وتمنا ہے:

''احباب کی یادستاتی رہتی ہے مگر دنیا میں ہر اجتماع کا مآل افتراق ہی ہوتا ہے، جسم وروح میں سب سے زیادہ اور قوی تعلق ہوتا ہے مگر بالآخر ان دونوں میں بھی جدائی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے مہمان خانے میں ہم سب کو دائمی صحبت اور لازوال رفاقت سے نوازے اور اس بابرکت مجلس میں جگہ دے جس کے میر مجلس سید ولد آدم صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے، جہاں قلوب صاف ہوں گے، کوئی خادع کوئی منافق نہیں ہوگا آپس کی کدورتیں کافور ہوں گی' ونزعنا مافی صدورھم من غل اخوانا علی سرر متقابلین " کی کیفیت اور منظر کیسا کیف آور ہوگا چشم تصور سے دیکھ کر بھی روح رقص کرنے لگتی ہے۔''

بہت روئیں گے کر کے یاد، اہل مے کدہ مجھ کو
شراب درد دل پی کر ہمارے جام ومینا سے
جان کر منجملہ خاصان میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام وپیمانہ مجھے

فاطر السمٰوات والارض انت ولیی فی الدنیا والآخرۃ توفنی مسلما والحقنی بالصالحین۔

آفتاب علم کی ضیاء پاشیاں

مولانا محمد رفیق، سوات

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دین اسلام کامل ومکمل شکل میں امت کے لئے چھوڑ گئے ہیں۔آپ کے بعد کسی نبی و رسول نے مبعوث نہیں ہونا۔ختم نبوت کے صدقے دین متین کے تحفظ واحیا اور نشر وتبلیغ کی ذمہ داری علمائے کرام پر آپڑی جو کہ وارثان نبوت ہیں۔جس دور میں دین متین کو جس نوع کی خدمت درکار ہوئی۔اللہ تعالیٰ نے اپنے تکوینی نظام کے تحت اس دور میں ویسے ہی رجال کھڑے کیے ہیں۔جنہوں نے بخوبی اس کام کی تکمیل کی ہے،اسلام کی چودہ سوسالہ تاریخ میں''مجددین'' کی تاریخ اس بات کا کھلا ثبوت ہے۔

تاریخ اسلام میں بعض ایسی محیرالعقول، نادر اور جامع شخصیات ملتی ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ نے علوم وفنون، دعوت وتبلیغ، جہاد وسیاست، خدمت خلق اور تقویٰ وتدوین کی جملہ جہات پوری جامعیت کے ساتھ رکھ دی تھیں۔وہ ان میں سے ہر شعبہ کے اندر کمال درجہ کی صلاحیت رکھتے تھے اور اپنی استعداد سے انہوں نے تمام شعبہ جات میں بڑی اہم خدمات سرانجام دی ہیں۔ایسی جامع شخصیات میں سے ایک ہمارے استاذ گرامی حضرت مولانا محمد امین اورکزئی رحمہ اللہ بھی تھے۔انسانی ذہن کی بساط تک ایک امتی میں جس درجہ کمالات کا تصور ہوسکتا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ نے حضرت اقدس میں جمع فرمادی تھیں،علم وعمل میں کمال انتہا پر تھا۔پھر کسی مخصوص علم وفن تک مہارت خاص نہ تھی، بلکہ صفائے باطن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمام علوم کے در آپ پر ایسے وا کردیئے تھے کہ جس علم وفن پر گفتگو فرماتے اس کے بحر ذخار معلوم ہوتے۔ہم نے اپنے اکابر میں حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے جو حالات سنے اور پڑھے ہیں علمی حوالے سے ہمیں حضرت ان کا پرتو محسوس ہوتے تھے۔تقویٰ وطہارت، جہاد وسیاست اور خدمت خلق میں آپ کی مساعی دیکھ کر ان واقعات کی یاد تازہ ہوتی جو ہم نے حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے بارے میں پڑھے ہیں۔اخلاص، تڑپ اور دین کا درد دیکھتے تو مولانا الیاسؒ کی یاد تازہ ہوجاتی۔تصنیف وتالیف، سرعت مطالعہ اور ذوق

وشوق دیکھ کر حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا کی آپ بیتی یاد آجاتی۔ حکمت وتدبر اور معاملہ فہمی میں جو کچھ حضرت مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کے بارے میں پڑھا تھا وہی شان بعینہٖ یہاں نظر آتی، منطق وفلسفہ آپ کے سامنے موم تھے، حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کی عبقات اور حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کی آب حیات کے مضامین ایسے آسانی اور سرعت کے ساتھ سمجھ لیتے اور پھر ایسے سہل پیرایوں میں بیان کرتے کہ بندہ حیرت سے انگشت بدنداں رہ جاتا۔

بندہ کو ایک عرصہ دراز حضرت کی صحبت میں کسب فیض کا موقع ملا، اپنی کوتاہ فہمی اور نااہلی کے باعث بندہ تو ویسے کا ویسا ہی رہا اور اس چشمۂ صافی سے کچھ بھی نہ پا سکا۔ تاہم آپ کی صحبت میں گزرے ایام ایک سعادت ضرور ہیں، کیونکہ اہل اللہ کی صحبت کامل جانا اس دور میں نعمت عظمٰی ہے۔

بندہ کو تقریباً سات سال جامعہ یوسفیہ میں حضرت کو بالکل قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ بلا مبالغہ زندگی میں ایسی شخصیت نہیں دیکھی۔ آپ کی ہر ادا، ہر عمل، ہر قول اتنا نرالا اور انوکھا تھا کہ جو ایک بار زیارت وملاقات اور توجہات سے بہرہ ور ہوتا، ساری عمر کے لئے اسیر ہو جاتا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت کی نگرانی میں تخصص فی الحدیث کا موقع بھی عنایت فرمایا۔ ہمارے ساتھ ایک ساتھی مولانا ابراہیم گمبیا افریقہ کے تھے، جو خاص حضرت سے استفادہ کے لئے اتنے دور سے آئے تھے۔ ان کی ایک عجیب خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہمارے ساتھ حضرت کے درس شرح النقایۃ میں شریک ہوتے۔ حضرت پشتو میں درس دیتے، انہیں حضرت کے تمام افادات ازبر ہوتے اور وہ عربی میں انہیں سنا بھی دیتے۔ ہمیں حیرت تھی کہ یہ کیسے ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف حضرت پر مروت کا اتنا غلبہ تھا کہ اگر ان کے نہ سمجھنے کا انہیں شائبہ تک بھی ہوتا تو ان کو علیحدہ سے عربی میں پڑھاتے، لیکن حضرت بھی اس حوالے سے کچھ نہیں کہتے تھے۔ بلکہ ایک بار حضرت سے عرض کیا گیا کہ یہ صاحب پورا گھنٹہ تقریر سنتے ہیں انہیں کیا فائدہ ہوتا ہوگا، لہٰذا ان کی رعایت رکھ کر پشتو میں نہ پڑھائیں۔ لیکن حضرت نے یہ مختصر جواب دیا کہ یہ سمجھ لیتے ہیں۔ اب وہ پشتو کیسے سمجھتے تھے یہ عقدہ آج تک نہ کھلا کیونکہ افریقہ میں پشتو سیکھنے کا تو امکان نہ تھا اور ہمارے ملک میں وہ پہلی بار آئے تھے۔

حضرت الاستاذ رحمہ اللہ نے تخصص فی الحدیث میں ہم سے مخصوص کتب کا مطالعہ کروایا۔ جس کی تفصیل اس نمبر میں نصابات سے متعلقہ مضامین میں دستیاب ہوگی، ان شاء اللہ۔ اس کے ساتھ ساتھ رواۃ سے متعلقہ اہم مباحث، اشکالات اور ان کا حل، احادیث سے متعلقہ نادر مباحث اور بعض اہم تشریحات دوران مطالعہ لکھنے کا بھی معمول تھا۔ حضرت الاستاذ ہمارے ان منتخبات کو دیکھتے اور اصلاح بھی فرماتے۔ اس دوران بندہ اور مولانا ابراہیم افریقی مدظلہ نے حضرت کی ہدایت پر فتاویٰ محمودیہ کا اشاریہ بھی بنایا تھا۔

حضرت کی ہمارے اوپر جو شفقتیں تھیں، وہ بے حد وحساب تھیں، جب بھی سوات تشریف لاتے، زیارت و ملاقات کا موقع عنایت فرماتے، اگر بہت مختصر وقت ہوتا تب بھی زیارت وملاقات سے محروم نہ رکھتے۔ ایک بار بڑی جلدی میں تشریف لائے۔ فرمایا: ارادہ تھا کہ مولانا فاروق کے پاس ٹھہر کر آپ کو بلالیں گے اور ایک کلو پھل بھی منگوالیں گے۔ ہمارے الحمد للہ شفتالو اور سیبوں کے باغات تھے۔ ان دنوں سیبوں کی فصل کٹ رہی تھی۔ لیکن جب میں نے اصرار کیا تو حضرت باوجود جلدی کے ہمارے ہاں بھی تھوڑی دیر کے لئے تشریف لے گئے۔ اس وقت سیبوں کے دو ہی پیٹیاں موجود تھیں وہ پیش کیں۔ پھر ایک مرتبہ حضرت اپنے استاذ حضرت مولانا عبداللہ صاحب رحمہ اللہ سمیت ہمارے گھر تشریف لائے اور تین دن قیام فرمایا۔ بندہ کو آپ نے یہ جو شرف عالی بخشا اس کا شکر تادم مرگ بھی ادا نہ ہو سکے گا۔ اپنی قسمت پر ناز کروں تو اس کے لئے الفاظ نہیں۔ تین دن تک محبوب کی محبتوں وشفقتوں سے مسلسل فیض یاب ہونے کی لذت وہی جانیں جو کبھی دل کا سودا کر کے عشق کی وادی میں اتریں ہوں۔

ہم جب بھی مدرسہ حاضر ہوتے حضرت کرایہ ضرور عنایت فرماتے۔ ایک بار ہم نے کھانا بھی راستہ میں کھایا۔ مولانا فاروق سواتی مدظلہ نے مزاحاً کہا کہ آج استاد صاحب سے عرض کریں گے کہ حضرت صرف کرایہ سے کام نہیں چلے گا۔ ہم نے کھانا بھی راستے میں کھایا ہے۔ لہٰذا زیادہ پیسے دیں یہ تو ایک تفریحی بات تھی ہوگئی اور اڑ گئی لیکن حیرت کی انتہا نہ رہی جب حضرت نے رخصت کرتے وقت ۵۰۰ روپے کھانے کے عنایت فرمائے۔ یہ شفقتیں آپ کی ہر شاگرد کے ساتھ تھیں۔

ایک بار سوات تشریف آوری کے موقع پر فرمایا کہ آپ لوگ آتے نہیں؟ کیا وجہ ہے کرایہ نہیں ہوتا؟ مولانا فاروق مدظلہ نے عرض کیا کہ حضرت کرایہ کی کیا بات ہے، کرایہ تو ویسے بھی ہمیں آپ عنایت فرمادیتے ہیں۔ فرمایا: پھر کیا بات ہے؟ عرض کیا: حضرت بس جانے کے مشورے تو کرتے رہتے ہیں لیکن وجود نہیں ملتا۔ فرمایا: آپ لوگ استخارہ نہیں کرتے، اس لئے کام میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ میں تو اگر ہنگو سے کوہاٹ تک بھی جاؤں تو بحمد اللہ استخارہ کر کے جاتا ہوں، اس لئے آنا جانا آسان رہتا ہے۔

حضرت الاستاذ کو بندہ نے سفر وحضر میں معمولات کا پابند پایا۔ ایک بار ایک اہم قومی مسئلہ پر اورکزئی ایجنسی کے اقوام کا جرگہ تھا، بندہ بھی آپ کے ساتھ حاضر ہوا۔ یقین جانیے ان پہاڑی راستوں اور مسلسل تھکا دینے والے مصروف دورے نے ہمارا انگ انگ ہلا کر رکھ دیا تھا۔ جس دن ہم رات کو دیر سے مدرسہ پہنچے تو ایسے بے حال چارپائیوں پر گرے کہ پتہ ہی نہیں چلا، لیکن فجر کی اذانوں پر اٹھے تو استاد گرامی کو مصلّی پر پایا، گویا اس تھکاوٹ اور جسم توڑ سفر کے باوجود تہجد اور ذکر و معمولات کا ناغہ نہ ہوا۔ ایک ہم تھے کہ دو تین دن تک وہ تھکاوٹ بدن کو شل کیے ہوئی تھی اور ایک

حضرت کہ پیرانہ سالی میں پورے نشاط سے تمام معمولات انجام دے رہے تھے، یقیناً اہل اللہ جسمانی نہیں روحانی قویٰ کی وجہ سے یہ سارے کام انجام دیتے ہیں، بس ہماری حقیقت ناشناس نگاہیں ان کا ادراک نہیں کرسکتیں۔

حضرت الاستاذ کو بندہ نے دیگر فرق یا شاذ افکار کے حاملین پر فتویٰ یا حکم لگانے میں انتہائی محتاط دیکھا، ایک بار بندہ حضرت مولانا معتز الحق صاحب رحمہ اللہ (شیخ الحدیث دارالعلوم ٹل و تلمیذ رشید حضرت مدنیؒ) کی خدمت میں حاضر تھا، حضرت نے فرمایا کہ مولانا امین صاحب 'تنظیم فکر ولی اللہی' کی تکفیر کے بارے میں ہماری موافقت نہیں کرتے۔ بندہ نے یہ بات حضرت الاستاذ سے نقل کی تو حضرت نے فرمایا کہ شاذ افکار کا علاج فتویٰ نہیں، اس سے یہ فتنہ مزید ترقی کرے گا۔ اگر اس کو اہمیت نہ دی جائے تو یہ خود بخود دب جائے گا۔ باقی حضرت الاستاذ کی فکر ولی اللہی سے متعلق رائے برادر محترم مولانا محمد فاروق مدظلہ کے نام ایک مکتوب میں حضرت نے تفصیلاً لکھی تھی وہ مکتوب اس نمبر میں شامل ہے۔

بندہ جن اہل علم کی خدمت میں حاضر ہوا ہے، انہیں حضرت الاستاذ کے علم وتقویٰ کا معترف پایا ہے۔ ۱۹۹۴ء میں بندہ حضرت کی اجازت سے مولانا نصر اللہ خان صاحبؒ کے ہاں صرف ونحو کے دورہ کے لئے حاضر ہوا۔ مولانا نصر اللہ خان صاحب کو جب حضرت کا سفارشی مکتوب دیا، تو خط پڑھتے ہی فرمایا کہ اگر کسی نے نور ولایت کا مشاہدہ کرنا ہو تو وہ مولانا محمد امین صاحب کے چہرے کو دیکھ لے۔ پھر بندہ سے پوچھا کہ حضرت بیمار رہتے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ نزلہ اور گردوں کی دائمی تکلیف ہے۔ فرمایا: یہ بیماری نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے مقربین کی معمولی لغزشوں کو دنیا ہی میں مٹانے کے لئے ایک امتحان ہوتا ہے، جو قریباً تمام اولیاء اللہ کو پیش آتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی دائمی تکلیف میں رہتے ہیں۔

شرح النقایۃ کے درس میں حضرت بعض اوقات بڑی نادر اور عجیب باتیں بیان فرمایا کرتے تھے۔ ہمارے کئی احباب نے شرح النقایہ کی تقاریر پر محفوظ کی ہے۔ بندہ کو حضرت کی بعض دل چسپ باتیں یاد رہ گئی ہیں جو قارئین کے تسکین ذوق کے لئے پیش خدمت ہیں۔

ایک بار نجاست مغلظہ کے ممنوعہ مقدار سے متعلق روایات پر بحث کرتے ہوئے فرمایا کہ بعض روایات میں اس کی مقدار ہتھیلی کے برابر بتلائی گئی ہے، جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں حضرت عمرؓ نے اسے اپنے ناخن کی مقدار جتنا فرمایا ہے۔ شرح النقایۃ والے نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ھذا غریب جدا [ ]۔

حضرت الاستاذ نے اس موقع پر بڑا دلچسپ واقعہ سنایا، فرمایا: ۱۹۵۹ء کی بات ہے۔ میں دارالعلوم ٹل میں پڑھتا تھا۔ وہاں ایک پہلوان آئے، اتنے لحیم وشحیم، قد آور اور تندومند تھے۔ کہ جس حجرہ میں ٹھہرے ہوئے تھے وہاں کی

بڑی سے بڑی چارپائی ان کے سونے کے لئے ناکافی تھی، آدھا بدن ان کا باہر رہ جاتا تھا۔ اس لئے ان کے واسطے دو چارپائیاں برابر رکھی گئیں اور ان پر لیٹے۔ ان کے جوتے اتنے بڑے تھے کہ بلا مبالغہ بکری کا بچہ ان میں سے گزر سکتا تھا، پورا محلہ ان کو دیکھنے کے لئے حجرہ میں جمع تھا۔ اس دوران حجرہ کے پاس سے بارکش اونٹوں کا ایک قافلہ گزرا، ایک اونٹ کا بار اتنا بھاری تھا کہ وہ تھک کر وہاں بیٹھ گیا تھا اور اٹھ نہیں رہا تھا۔ شتربان نے بڑی کوشش کی، لیکن اونٹ کو اٹھانے میں کامیاب نہ ہو، اس پر یہ پہلوان اٹھے اور اونٹ کے اوپر سے دونوں ہاتھوں کی چپی بھر کر اسے سیدھا بار سمیت اٹھالیا، یہ واقعہ ان کی جسامت سے بھی زیادہ حیرت انگیز تھا۔ حضرت فرماتے تھے کہ اس کا ایک ایک ناخن ہماری ہتھیلی کے بقدر تھا۔

پھر اس واقعہ کے ساتھ اپنا ایک خواب سنایا کہ میں نے ایک دفعہ خواب دیکھا کہ کھلا میدان ہے اور اس میں زرد چادر اوڑھے ایک نورانی شخصیت بیٹھی ہے۔ جس کے انگوٹھے سے نور کی شعاعیں نکل رہی ہیں۔ میں نے پوچھا: یہ کون ہے؟ تو بتایا گیا کہ یہ سرکار دو عالم حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، آپ کے دائیں جانب ایک چست لیکن کمزور بدن آدمی کھڑے تھے، اس کے بارے میں بتایا گیا کہ یہ سیدنا حضرت ابوبکر صدیق ؓ ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بائیں جانب انتہائی قدآور، لحیم وشحیم اور تومند پہلوان کھڑے تھے، پوچھنے پر بتایا کہ سیدنا حضرت عمرؓ ہیں۔ استاد صاحب فرمانے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حضرت عمرؓ کی جس مضبوط اور تندومند جسامت سے زیارت کروائی، بعید نہیں کہ ان کا ناخن ایک عام کمزور آدمی کے ہتھیلی کے برابر ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ایک بار نمازوں کے ''پشتو'' ناموں کی تحقیق فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ یہ سارے نام فارسی سے ماخوذ ہیں۔ پشتو میں ظہر کی نماز کے لئے 'ماپخین' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ یہ دراصل فارسی لفظ 'نماز پیشین' سے ماخوذ ہے۔ اس طرح عصر کے لئے 'مازیگر' کا لفظ استعمال ہوتا ہے، یہ بھی فارسی لفظ 'نماز دگر' سے ماخوذ ہے۔ مغرب کے لئے پشتو میں 'ماخام' یا 'ماشام' کا لفظ آتا ہے، یہ فارسی لفظ 'نماز شام' سے بنا ہے۔ اسی طرح عشا کے لئے پشتو لفظ 'ماختن' آتا ہے، یہ فارسی لفظ 'نماز خفتن' سے ماخوذ ہے۔

ایک بار فرمایا کہ ہمارے انتہائی معزز دوست مولانا شبیر احمد افریقی مدظلہ تشریف لائے اور کہا کہ شیخ حضرت مولانا سراج الیوم (المعروف گڑھی باباجی) کی زیارت کے لئے جانا ہے۔ میں نے کہا کہ وہ پشتو بولتے ہیں، آپ کے لئے ان سے استفادہ مشکل ہوگا لیکن وہ مصر تھے کہ صرف زیارت ہی ہوجائے، یہ بھی میرے لئے غنیمت ہے۔ استاذ صاحب نے فرمایا کہ میں مولانا کو لے کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، وہاں مولانا نے مجھ سے کہا کہ حضرت سے شریعت، طریقت اور حقیقت کی شرح پوچھ لیں، بندہ نے حضرت سے گزارش کی کہ یہ مہمان ان چیزوں

کی تفصیل پوچھ رہے ہیں۔ حضرت بابا جیؒ کچھ دیر کے لئے مراقب ہوئے اور پھر فرمایا کہ ان کی طرف سورۃ آل عمران کی آخری آیات "اصبروا وصابروا ورابطوا" میں اشارہ موجود ہے۔ ''اصبروا'' میں ابتدائے بندگی کی طرف اشارہ ہے۔ ''صبر'' ایک تلخ پودا ہے۔ اس مرحلے پر بندگی بجالانے میں مجاہدہ اور بوجھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اور یہی مقام شریعت ہے۔ ''صابروا'' اس حالت کی طرف اشارہ ہے کہ انسان بندگی بجالاتے لاتے اس مقام پر پہنچ جائے کہ شریعت طبیعت بن جائے اور اس میں کسی قسم کا بوجھ محسوس نہ کرے بلکہ سہولت سے بے تکلف ادا ہو یہ مقام طریقت ہے اور ''رابطوا'' میں اس طرف اشارہ ہے کہ بندگی میں بندہ اس مقام تک رسائی پالے کہ باعث لذت بن جائے، بندہ اس کا منتظر رہے کہ کب نماز کا وقت آئے کہ میں رب سے ہم کلام ہوں، اگر خدانخواستہ کوئی عارض ایسا پیش آنے کہ عبادت کی ادائیگی میں خلل پڑ جائے یا فوت ہوجائے تو سخت مضطرب و پریشان ہو، یہ مقام حقیقت ہے۔ حضرت الاستاذ فرماتے تھے کہ شریعت، طریقت اور حقیقت کے مقامات کی اس قدر بہترین تشریح پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔

شرح النقایۃ کے درس میں اوقات ثلاثہ (طلوع، عین زوال وغروب) کے وقت نماز کی ممانعت سے ماتن کے استثناء ''الاعصر یومہ'' پر بحث فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ یہ مسئلہ احناف پر اشکال کا باعث بنا ہے اور احادیث پر غور کرنے سے واقعی اشکال پیدا ہوتا ہے۔

احناف کے ہاں مشہور یہی ہے کہ اسی دن کی نماز عصر غروب آفتاب کے وقت جائز ہے کہ لأن ادی کما وجب۔ امام طحاویؒ اس کے قائل ہیں کہ اوقات ثلاثہ میں نماز کی ممانعت کی وجہ سے جائز نہیں۔ استاذ صاحب فرماتے تھے کہ میرا ذاتی میلان امام طحاویؒ کے قول کی طرف ہے اور موطا امام محمدؒ کی عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عین غروب آفتاب کے وقت نماز جائز نہیں۔

موطا امام محمدؒ کے الفاظ یہ ہے: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الصلاة فيها... عين تطلع الشمس حتى ترتفع... الا عصر يومه فانه يصليها وان احمرت الشمس قبل ان تغرب وهو قول ابى حنيفه رحمه الله تعالى۔ (موطا امام محمدص ۱۲۸)

باقی احادیث میں جو یہ آیا ہے کہ "من ادرک رکعة من الصبح قبل ان تطلع الشمس فقد ادرک الصبح ومن ادرک رکعة من العصر قبل ان تغرب الشمس فقد ادرک العصر"۔ تو اس حدیث سے یہ مراد لینا'' کہ جس نے طلوع آفتاب یا غروب آفتاب سے قبل نماز شروع کی تو نماز طلوع وغروب کے بعد بھی درست ہے'' صحیح نہیں بلکہ معنی یہ ہے کہ "من ادرک رکعة من الصبح ببلوغ او باسلام فقد ادرک وجوب الصلوٰة الصبح۔ الخ" یعنی جو

بقدر رکعت وقت باقی ہونے کے بالغ ہوا یا مسلمان ہوا تو اس پر اس نماز کی قضا لازم ہوئی اور جو حاکم کی روایت میں آیا ہے، کہ "من صلى ركعة من الصبح قبل طلوع الشمس فليصل الصبح" تو اس حدیث میں لفظ "من صلی" غریب ہے، حاکم سے پہلے ائمہ نے اسے "من ادرک" روایت کیا ہے۔ یہ لفظ حاکم کے مشائخ میں سے کسی نے اپنے فہم کے مطابق "من ادرک" کے مفہوم کے طور پر "من صلی" روایت کیا ہے، لہٰذا احناف کا درست مذہب یہی ہے جو کہ امام طحاویؒ نے ذکر فرمایا ہے۔ اس صورت میں قیاس کی بھی ضرورت نہیں پڑتی اور احادیث کے درمیان تعارض بھی باقی نہیں رہتا۔ فرمایا: ہمارے استاذ مولانا ادریس میرٹھیؒ فرمایا کرتے تھے کہ سارے دنیا والے دھوکہ کھا گئے اور انہوں نے موطا امام محمدؒ پر غور نہیں کیا۔ مسلم شریف پڑھاتے وقت ان مقامات پر بغل میں طحاوی اور موطا امام محمد لے کر درسگاہ میں تشریف لاتے اور پوری وضاحت سے تشریح فرماتے۔ حضرت الاستاذ فرماتے کہ اس مسئلہ کے بارے میں میرا یہ ذوق ہے باقی میں کسی کو دعوت نہیں دیتا کہ آپ بھی ضرور یہی مؤقف رکھیں۔

فرمایا: امام صاحبؒ نے اہل السنۃ کی علامت کے طور پر ذکر فرمایا: نختار الشیخین ونحب الختانین ونری المسح علی الخفین۔ اس کو "نختار ابی بکر وعمر ونحب عثمان وعلی رضی اللہ عنہم" بھی کہہ سکتے تھے۔ لیکن اسماء کے بجائے اوصاف سے تعبیر کرنے میں ایک نکتہ ہے اور وہ یہ کہ جس طرح سیدنا ابوبکرؓ کا مرتبہ سیدنا عمرؓ پر بڑھا ہوا ہے۔ اس طرح سیدنا عثمانؓ کا مرتبہ سیدنا علیؓ سے بڑھا ہوا ہے۔ کیونکہ بلاغت کے قاعدے کے مطابق "شیخین" کی تعبیر میں وصف شیخوخت جس میں بڑھی ہوئی ہو وہ افضل ہوگا اور حضرت ابوبکرؓ بلحاظ عمر ومرتبہ شیخوخت میں بڑھے ہوئے ہیں، اس لئے وہ افضل ہوں گے۔ اسی طرح "ختانین" میں "ختان" کا وصف حضرت عثمانؓ میں بڑھا ہوا ہے۔ کیونکہ ان کے نکاح میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیاں رہیں، وہ ذوالنورین ہیں۔ لہٰذا حضرت عثمانؓ کا حضرت علیؓ سے افضل ہونا ظاہر کر دیا۔

ایک بار فرمایا کہ یہ بات کہ "ہر مجتہد اپنے اجتہاد میں مصیب ہے" اس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ معتزلہ کا مذہب ہے لیکن یہ درست نہیں۔ بلکہ کشف الاسرار میں اس کی پوری تفصیل مذکور ہے، ہر مذہب کو مع دلائل کے ذکر کیا گیا ہے۔ یہ مذہب اہل السنۃ میں موالک واحناف کا بھی ہے۔ پھر فرمایا کہ کاش اس بات کو مسلمان بہت پہلے تسلیم کر لیتے تو مشاجرات صحابہؓ کے ذکر میں بعض غیر معتدل حضرات سوء ادب کے مرتکب نہ ہوتے۔ ائمہ فقہاء کو ایک طرف رکھیں جب صحابہ کرام کے اجتہادی آرا میں حق وناحق ثابت کرنے کے لئے لوگ میدان میں اترتے ہیں تو بہت کم سوء ادب سے اپنا دامن بچا پاتے ہیں۔ الا من عصم ربی۔

جو شخص حضرت علی کرم اللہ وجہہ، حضرت طلحہ وزبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہما، حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت

عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مشاجرات میں حق وناحق کا فیصلہ سنانے بیٹھے گا یہ ممکن نہیں کہ راہ اعتدال پر قائم رہ سکے، اس لئے محفوظ راستہ یہی ہے کہ ہر مجتہد کو مصیب سمجھا جائے۔ حضرت فرماتے کہ چھوٹا منہ بڑی بات لیکن میری اپنی رائے بھی یہی ہے کہ مشاجرات صحابہؓ میں ہر صحابیؓ مصیب تھا۔ اور جو حدیث پاک میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر مجتہد حق تک پہنچا تو اس کے لئے دو اجر ہیں اور اگر خطا ہوا تو ایک اجر۔ تو وہاں مجتہد سے مراد اصطلاحی مجتہد نہیں جو مسائل شرعیہ میں اجتہاد کرتا ہے، بلکہ لغوی مجتہد مراد ہے۔

ایک بار فرمایا کہ فقہ حنفی میں ایک سہل الفہم اور معتمد متن کی ضرورت ہے لیکن اب ایسے علماء نہیں جو یہ کام کر سکیں، آج کل القابات کا تو زور ہوتا ہے لیکن ذوق علم وتحقیق ناپید ہے۔ ہاں! اگر چند با استعداد حضرات کی کمیٹی بن جائے تو وہ یہ کام کر سکتی ہے۔ پھر چند کتابوں کے نام لئے کہ ان کی روشنی میں ایک جامع ومعتمد کتاب مرتب کرنی چاہیے جن میں سے مبسوط سرخسی، اعلاء السنن، آثار السنن اور شرح النقایہ کے نام مجھے یاد رہ گئے ہیں۔ شرح النقایہ کے بارے میں فرماتے تھے کہ اس پر کافی کام کی ضرورت ہے۔ ملا علی قاریؒ کا حدیثی ذوق تو اچھا ہے لیکن تفقہ اس پایے کا نہیں۔

نبیذ تمر کے معرکۃ الآراء مسئلے میں آپ نے یہ تحقیق بتلائی تھی کہ امام صاحبؒ نے جس نبیذ کو پینے اور اس سے وضو کرنے کی اجازت دی ہے، وہ عرفی نبیذ ہے اصطلاحی نہیں۔ کیونکہ ریگستانی علاقوں کے کھارے پانی میں قدرے مٹھاس پیدا کرنے کے لئے لوگ رات کے وقت اس میں کھجور ڈال دیتے تھے۔ ان کا اثر محض اتنا ہوتا کہ پانی کے ذائقے کو معتدل کر دیتے۔ باقی پانی کی طبیعت پر اثر انداز نہیں ہوتے تھے۔ دراصل وہ پانی ہی ہوتا لیکن کھجور کے باعث کھارے پن کے خاتمے کی وجہ سے عرف میں نبیذ مشہور تھا، واللہ اعلم۔

بہر حال یہاں حضرت الاستاذ کی آراء وافکار کو جمع کرنا مقصود نہیں، نہ ہی میرے جیسے طالب علم کے لئے ممکن ہے، یہ چند باتیں جو محفوظ رہ گئیں تھیں سپرد قلم کر دیں۔

حضرت الاستاذ کے حوالے سے تاریخی کارنامہ سرانجام دینے پر مولانا محمد طفیل، مولانا محمد یوسف اور ان کے معاونین کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ یہ سارے حضرات ہمارے محسن ہیں، ہم سب کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں کہ ہمارے علاقوں میں جہاں لکھنے لکھانے کا کوئی رواج یا حوصلہ افزائی نہیں، انہوں نے ہمت سے کام لے کر اتنا ذخیرہ جمع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کے مساعی جمیلہ کو قبول فرمائے اور حضرت استاذ محترم رحمہ اللہ کے افادات کو اس مجموعے کے ذریعے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم

ماہتاب علم وتحقیق کی تابانیاں

مولانا محمد سجاد الحجابی، مردان

تاریخ اپنے صفحات پر صرف بڑے لوگوں کو جگہ دیتی ہے۔ اگر ہر کسی کا تذکرہ تاریخ کی کتابوں میں لکھا جاتا تو غالباً آج تاریخ الاسلام للذہبی ۳۴ اور تاریخ مدینہ دمشق لابن عساکر ۸۰ جلدوں کی بجائے ہزار جلدوں میں ہوتیں۔ یہ بھی امر واقع ہے کہ تاریخ صرف بعض عظما رجال ہی کے حالات محفوظ کر پاتی ہے اور ان میں سے کئی ایک جہابذہ کا تذکرہ سینہ قرطاس پر آنے سے رہ جاتا ہے۔ امام صلاح الدین صفدی رحمہ اللہ نے " الوافی بالوفیات" کی ۳۰ ضخیم جلدوں میں چودہ ہزار علما، محدثین، امرا اور دانشوروں کا تذکرہ کیا ہے۔ کیا اس میں تمام حضرات کا استیعاب ہو سکا ہے؟ یقیناً نہیں! بلکہ چودہ ہزار سے زیادہ تو زیر قلم آئے ہی نہیں ہوں گے، البتہ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فضل اور ہماری خوش قسمتی ہے کہ مصر و شام، فلسطین، اُردن، اندلس اور جزیرۃ العرب کے علماء سلف کے خاطر خواہ تذکرے لکھے جا چکے ہیں۔ لیکن یہ امر افسوس ناک ہے کہ محرومیت کا یہ سہرا علماء ماوراء النہر کے سر بہت کم سجا ہے اور ان کے تذکرے بہت ہی خال خال ملتے ہیں۔ ماوراء النہر کے مشہور مرکز علم " سمرقند" کے متعلق امام نسفی کی کتاب "القند فی ذکر علماء سمرقند" بہت پہلے چھپ چکی ہے، جس میں بہت کم علماء کا تذکرہ ہے۔ اندازہ لگا ئیں کہ امام ابوالحسن اشعری رحمہ اللہ اور امام ابومنصور ماتریدی رحمہ اللہ دونوں معاصر ہیں، لیکن تاریخ وتراجم کی کتب میں امام اشعری کے حالات تفصیل سے ملتے ہیں۔ طبقات الشافعیۃ الکبری للسبکی، سیر اعلام النبلاء و تاریخ الاسلام للذہبی وغیرہ اٹھایئے اور ان کی زندگی کے کافی حالات مل جاتے ہیں، بلکہ امام ابن عساکر جیسے مایہ ناز محدث نے تو مستقل سوانح بنام "تبیین کذب المفتری فیما نسب الی الامام ابی الحسن الاشعری" لکھی، اور امام اشعری کی حیات طیبہ کے تابناک پہلو تا قیامت روشن کر دیئے۔ دوسری جانب ماوراء النہر کی عبقری شخصیت امام الہدیٰ ابومنصور ماتریدی رحمہ اللہ کے حالات کتب تاریخ میں مشکل ہی سے ملیں گے اور اگر کہیں مل بھی جائیں تو بہت

مجمل۔

کچھ یہی صورت حال برصغیر پاک وہند کے علما کی بھی ہے۔ ہندوستانی تاریخ پر تو کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، لیکن علماء کرام کے تفصیلی تراجم پر مستقل کتاب علامہ عبد الحیٔ حسنی کی 'نزهة الخواطر وبهجة المسامع والنواظر' (۸ جلد) ہی واحد مصدر ہے، (جو حال ہی میں "الاعلام بمن في تاريخ الهند من الاعلام" کے نام سے تین جلدوں میں دار ابن حزم سے چھپ گئی ہے) اس سے اندازہ لگائیے کہ کتنے علما کے حالات رہ گئے ہوں گے۔

ان جیسی عظیم شخصیات میں سے حضرت الاستاذ، محدث کبیر ولی کامل شیخ مولانا امین اورکزئی رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ بھی ہے جو علمی حلقوں میں 'استاذ صاحب' کے نام سے جانے جاتے تھے۔ استاذ صاحب تو ویسے بھی اپنے آپ کو گوشہ گمنامی میں رکھنا پسند کرتے تھے، شہادت کے بعد بھی یہی کیفیت تھی۔ اللہ جل جلالہ جزائے خیر عطا فرمائے منتظمین سہ ماہی ''المظاہر'' کو کہ انہوں نے استاذ صاحب کے تذکرہ مبارکہ پر مشتمل نمبر نکالنے کی ٹھان لی۔ بالخصوص حضرت مولانا محمد طفیل صاحب دامت برکاتہم نے تو دن رات ایک کر کے حضرت کے متعلقین، تلامذہ، معاصرین سے دور دور جا کر ملاقاتیں کی۔ انٹرویوز لیں اور یوں شاندار تذکرہ کا گلدستہ ترتیب دیا۔

استاذ صاحبؒ سے پہلی ملاقات:

حضرت مولانا محمد امین شہید رحمہ اللہ تعالیٰ کا نام نامی میں نے طالب علمی میں سنا۔ ہم مادر علمی جامعہ فاروقیہ کراچی میں پڑھتے تھے، راقم فارغ اوقات میں اکثر اساتذۂ کرام کی مجالس میں بیٹھنے کی کوشش کرتا، جامعہ کے اساتذۂ کرام استاذ صاحب کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کیا کرتے تھے اور ان کو ایک قابل قدر محدث اور ولی کامل کے حوالے سے یاد کیا کرتے تھے۔ ایک دن تخصص کے کچھ طلبہ استاذ محترم مولانا ولی خان المظفر دامت برکاتہم کی مجلس میں آئے، میں بھی خدمت میں حاضر تھا۔ ان طلبہ نے استاذ جی سے عرض کیا کہ حضرت مولانا امین صاحب مدظلہم کراچی تشریف لائے ہوئے ہیں۔ ہم ان کی ملاقات کے لیے جانا چاہتے ہیں۔ استاذ جی نے اس مجلس میں مولانا امین صاحب کی بہت تعریف کی اور مجھ سمیت ساتھیوں کو کہا کہ تم سب زیارت کے لئے چلے جاؤ۔ چنانچہ ہم چند ساتھی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نورانی چہرہ ہے جیسا کہ چاند اس کے چہرے میں سمٹ گیا ہو، سفید خوبصورت ریش، سرخ رخسار، چہرہ پر معصومانہ مسکراہٹ کے ساتھ، سر پر بے تکلف سفید پگڑی، درمیانہ قد، پر وقار لہجہ اور پیغمبری اخلاق حسنہ سے مزین شخصیت سامنے تھی۔ پر تپاک انداز سے ہم غریب طلبہ سے بغل گیر ہوئے اور حال احوال پوچھنے لگے۔ مجھے یوں مخاطب کیا جیسا کہ برسوں سے مجھے جانتے ہوں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جامعہ

فاروقیہ کے تخصص کے نصاب کے متعلق پوچھا تو ساتھی نے کہا کہ ہمیں اصول الکرخی بھی پڑھائی جاتی ہے۔استاذ صاحب نے برجستہ فرمایا: اصول الکرخی کی بنسبت امام ابوزید دبوسی کی تاسیس النظر بہت اچھی کتاب ہے،اسے داخل نصاب کرنا چاہیے۔اس کے علاوہ بھی مختلف باتیں ہوئیں اور یوں وہ مجلس تمام ہوگئی۔یہ استاذ صاحب سے میری پہلی ملاقات تھی۔غالباً میں درجہ خامسہ کا طالب علم تھا اور سن ۲۰۰۱ء تھا۔کچھ عرصے بعد راقم معقولات،کلام اور فلسفہ کی اونچی کتابیں پڑھنے کے لیے وادی سوات چلا گیا اور حضرت الشیخ جامع المعقول والمنقول مولانا رشید احمد سواتی (حال استاذ الحدیث والمعقولات جامعہ دارالعلوم حقانیہ،اکوڑہ خٹک) کے پاس تکملہ پڑھنے لگا۔

وادی سوات میں آمد

دوسری بار زیارت کا شرف ۲۰۰۳ء میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب حفظہ اللہ کے جامعہ قاسمیہ سوات میں حاصل ہوا۔استاذ صاحب رحمہ اللہ جس طرح علومِ ظاہرہ کے شہسوار تھے اسی طرح علومِ باطنہ وتزکیہ نفس میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ان کو اونچا مقام بخشا تھا۔مولانا رشید احمد صاحب کا اصلاحی تعلق حضرت صندل باباجی رحمۃ اللہ علیہ سے تھا اور وہ حضرت سنڈاکی بابا رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ اجل تھے۔استاذ صاحب رحمہ اللہ کا روحانی سلسلہ بھی سنڈاکی بابا سے ملتا تھا۔مولانا رشید احمد صاحب کی دعوت پر صندل باباجی جامعہ قاسمیہ سوات تشریف لائے اور ایک ہفتہ قیام فرمایا،اس عرصہ میں ہم نے انہیں بہت قریب سے دیکھا۔وہ انتہائی متبع سنت اور بدعات سے نفرت کرنے والے بزرگ تھے۔ایک دن حضرت مولانا رشید احمد صاحب نے دوران درس فرمایا کہ ہنگو کے مولانا امین صاحب اور ان کے عمر رسیدہ استاذ مولانا عبداللہ صاحب صندل باباجی کی زیارت کے لیے تشریف لا رہے ہیں۔بس پھر کیا تھا ہم انتظار میں راستہ تکنے لگے،تقریباً ظہر کے وقت ان کی گاڑی جامعہ میں داخل ہوئی،ادھر ہمارا حمداللہ سندیلوی شرح سلم العلوم کا گھنٹہ ختم ہوگیا۔کیا دیکھتے ہیں کہ کار سے دو انتہائی نورانی چہروں کے بزرگ اترے اور صندل باباجی سے بغل گیر ہوگئے۔میں بزرگوں کے اس طرح ملاقات کا پہلی مرتبہ قریب سے مشاہدہ کر رہا تھا،عجیب کیفیت طاری تھی،استاذ صاحب اور صندل باباجی دونوں ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر آنسو بہا رہے تھے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے راز و نیاز کر رہے تھے اور فیض پہنچا رہے تھے۔بلا ہم نالائق اس زبان کو کہاں سمجھ سکتے تھے،جامعہ کے ماحول میں ان حضرات کے وجود مسعود کی وجہ سے ایک پرسکون روحانی کیفیت طاری تھی۔کچھ دیر بعد یہ حضرات واپس تشریف لے گئے۔یہ میری ان سے دوسری ملاقات تھی۔

درس نظامی سے فراغت کے بعد ملاقاتیں

۲۰۰۴ء میں جامعہ فاروقیہ کے آغوش میں کئی سال بتا کر استاذ المحدثین، شارح بخاری حضرت مولانا سلیم اللہ خان اطال اللہ بقاء ہم سے بخیر و عافیت دورۂ حدیث شریف مکمل کر کے میں اپنے شہر مردان آگیا اور اسی سال تدریس بھی شروع ہوئی، دوسرے سال مجھے دورۂ حدیث میں مسلم شریف (جلد ثانی) اور طحاوی شریف کی تدریس سپرد ہوئی۔ شروع میں کتابیں مشکل تھیں اور مجھ جیسے طالب علم سے کافی جستجو اور محنت چاہ رہی تھیں، خاص کر طحاوی شریف میں خاص ذوق سے پڑھانا چاہتا تھا، کیونکہ یہ سادات حنفیہ کے ذخیرۂ احادیث کی قدیم تر اور مستند مرجع و مصدر کی حیثیت رکھتی ہے۔ نخب الافکار شرح معانی الآثار للامام بدر الدین العینی اور حضرت جی مولانا یوسف کاندھلوی کی امالی الاحبار کا اہتمام سے مطالعہ کرتا تھا، لیکن پھر بھی تشنگی باقی رہتی تھی۔ استاذ صاحب کی شرح "نثر الازھار علی شرح معانی الآثار" کی ان دنوں دو جلدیں شائع ہوگئی تھیں لیکن کتب خانوں میں اس کا وجود عنقا تھا، اسی اثنا ایک رفیق بنکو جا رہے تھے، ان سے عرض کیا کہ جامعہ یوسفیہ سے "نثر الازھار علی شرح معانی الآثار" کا نسخہ ساتھ لیتے آئیں۔ وہاں جا کر استاذ صاحب سے ملاقات ہوئی اور انہیں میرا کا حوالہ دے کر شرح کا ذکر کیا۔ استاذ صاحب نے شفقتاً ایک نسخہ بھیج دیا۔ اس کے بعد نثر الازھار کا مطالعہ کرنے لگا، جب کوئی نئی علمی نکتہ ملتا تو استاذ صاحب کو بہت دعائیں دیتا اور دوران درس طلبہ سے بھی ذکر کرتا تھا۔

میں اکثر پشاور میں کتابوں کی مشہور مارکیٹ محلہ جنگی جایا کرتا ہوں، اس زمانے میں کئی بار استاذ صاحب سے وہاں ملاقات ہوجاتی تھی۔ استاذ صاحب کتابوں کے انتہائی دلدادہ اور عاشق تھے۔ اکثر مہنگی اور نایاب کتب مکتبات سے اٹھا لیتے تھے۔ ان دنوں امام ابوبکر بن العربی المالکی کی مؤطا کی نایاب شرح "المسالک علی مؤطا مالک" دار الغرب، تیونس، سے بہت خوبصورت چھپ کر آئی تھی، لیکن قیمت بہت زیادہ تھی۔ میں اس کے لیے رقم جمع کرنے لگا، جب کتاب لینے کے لیے دار الکتاب پشاور پہنچا تو کتاب ندارد، میں نے پوچھا: کتاب کہاں ہے؟ صاحب المکتبہ حاجی خلیل صاحب کہنے لگے کہ وہ کتاب تو مولانا امین اورکزئی لے گئے ہیں اور میں کف افسوس ملتا رہ گیا۔

پشاور کے اس مشہور کتب میلہ میں آپ کو ہر دکاندار خوب جانتا تھا اور ہر کسی کو معلوم تھا کہ آپ فنی اور حدیثی کتابوں کے شناسا اور عاشق ہیں، پچھلے دنوں کی بات ہے کہ ایک مالک مکتبہ کے ساتھ استاذ صاحب کا ذکر خیر ہوا، وہ استاذ صاحب کے کتابی ذوق کے متعلق مزے لے لے کر واقعات بیان کرنے لگا، کہنے لگے کہ حرم شریف میں استاذ صاحب سے ملاقات ہوئی ان کے ہاتھوں میں کئی کتابیں تھیں، میں مزاحاً ہنس کر کہنے لگا کہ ارے حضرت! کتابوں کی عادت یہاں بھی نہیں چھوٹتی؟ تو مسکرا کر جواب دیا کہ ہاں بھئی اس روگ کا مجھے بھی علاج معلوم نہیں ہے۔

ایک مرتبہ دار الکتاب، پشاور میں استاذ صاحب سے ملاقات ہوئی، بہت پرتپاک انداز سے ملے۔ اتفاق سے میرے پاس میری کتاب "دراسات فی معرب القرآن الکریم" کا نسخہ تھا، غنیمت جانتے ہوئے میں نے خدمت اقدس میں پیش کیا۔ استاذ صاحب تصفح کرنے لگے اور فرمایا: یہ آپ نے لکھا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ اللہ نے یہ کام لیا ہے۔ بہت ہی خوش ہوئے اور دعائیں دیں۔

علمی اشکالات کے حل کے لیے ہنگو کا سفر

جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں کہ طحاوی شریف پڑھاتے ہوئے کئی اشکالات جمع ہوجاتے تھے، میں نے ان کے حل کے لیے ہنگو جانے کی ٹھان لی۔ ایک، دو رفقا کو ساتھ لے کر ہنگو پہنچا۔ طویل سفر کر کے جب ہم جامعہ یوسفیہ داخل ہوئے تو استاذ صاحب نے عجیب نرالے انداز میں استقبال کیا۔ میں نے جو مسکراہٹ اور چہرے کی کھلکھلاہٹ استاذ پر دیکھی تو سوچ رہا تھا کہ یہ معاملہ صرف ہمارے ساتھ ہوگا، لیکن فی الواقع استاذ صاحب اخلاق نبوی کے پیکر تھے۔ وہ ہر کسی سے اسی طرح ملتے تھے۔ میں نے اکابر میں سے شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کی متعدد سوانح میں ان کے اخلاق نبوی کے حوالے سے پڑھا تھا، لیکن اس کی عملی تصویر استاذ صاحب کی ذات میں دیکھی۔ بہت اہتمام سے کھانا کھلانے کے بعد میں اپنے مقصود کی طرف متوجہ ہوا اور ان کی طبیعت میں نشاط دیکھ کر ایک ایک اشکال پیش کرتا، استاذ صاحب میرے اشکال کی تقریر بہت اہتمام سے سنتے اور پھر مسکرا کر بارعب لہجہ میں بہت سلیقہ سے اس کا جواب مرحمت فرماتے۔ یوں ایک ایک اشکال کافور ہوجاتا۔

ایک راوی کے متعلق تحقیق:

ابوعصمہ نوح الجامع رحمہ اللہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگرد تھے۔ کئی علوم میں مہارت کی وجہ سے ان کا لقب ''الجامع'' پڑگیا۔ اصحاب الرائے میں ہونے کی وجہ سے محدثین نے ان پر کافی نقد وجرح کی ہے۔ تفسیر کشاف وغیرہ بعض تفاسیر میں ہر سورت کے آخر میں اسی سورت کی فضیلت کے متعلق ایک روایت درج ہوتی ہے، ان میں بیشتر روایات موضوع اور من گھڑت ہیں اور اس کے موضوعیت کا الزام نوح الجامع کے سر تھوپا گیا ہے، لیکن حقیقت کچھ اور ہے کہ ان روایات کا مرکزی راوی ''میسرہ بن عبدربہ'' ہے جس نے ان روایات کو اپنی طرف سے مشہور کیا ہے۔ نوح الجامع کی صداقت وعدالت فی الروایۃ کے متعلق پہلی قیمتی بحث تو ظفر الامانی فی شرح مختصر الجرجانی للامام اللکنوی کے آخر میں بطور تتمہ ہمارے شیوخ کے شیخ علامہ عبدالفتاح ابوغدہ حلبی رحمہ اللہ نے بہت عمدہ انداز میں کی ہے۔ اور دوسری بحث علامہ محدث ناقد مولانا عبدالرشید نعمانی کی وہ دفاعی تحریر ہے جو ان کی کتاب '' تبصرہ بر مدخل

نیسابوری'' کے اندر درج ہے اور دونوں اکابر نے نوح الجامع کا مکمل دفاع کیا ہے۔ بہر حال یہ سب باتیں تو اپنی جگہ درست ہے، لیکن امام بیہقی کی نفیس تالیف "کتاب الاسماء و الصفات" کے حاشیہ پر امام زاہد الکوثری رحمہ اللہ نے نوح الجامع کو مجسم لکھا ہے۔ (دیکھئے: کتاب الاسماء والصفات، ص: ۴۲۸، حاشیہ الکوثری، ناشر: دار احیاء التراث العربی، بیروت) مجھے یہ بات بہت عجیب لگی کہ ایک طرف تو نوح الجامع کا اتنا دفاع کیا جاتا ہے، دوسری طرف وہ تجسیم کے انتہائی کمزور و مرذول عقیدے کا قائل ہے۔

میں نے یہ اشکال استاذ صاحب کے سامنے پیش کیا۔ استاذ صاحب میرا اشکال سن کر خود بھی بہت حیران ہوئے، لیکن انہیں چین نہیں آیا اور فرمانے لگے کہ کتاب آپ کے پاس ہے، میں نے عرض کیا کہ گھر پر ہے، تو اپنے کتب خانہ کی طرف اٹھے اور مجھے ساتھ چلنے کو فرمایا، جب ہم مکتبہ کے ہال میں داخل ہوئے تو ہزاروں کی تعداد میں ایک بڑا کمرہ کتابوں سے لدا پڑا تھا۔ اب ہم کتاب ڈھونڈنے لگے، بہت سا وقت گزرنے اور کافی آنکھ ماری کے بعد بھی کتاب ندارد۔ میں بہت تھک گیا تھا، ظاہر ہے استاذ صاحب مجھ سے زیادہ تھک گئے تھے۔ میں نے ڈرڈر کے عرض کیا کہ حضرت پھر کسی وقت دیکھ لیں گے۔ لیکن فرمانے لگے: آجائیں، دوسرے کتب خانہ میں دیکھتے ہیں۔ ہم سیڑھیوں سے اتر کر ایک دوسرے کتب خانہ میں داخل ہوگئے۔ وہ بھی کتابوں سے بھرا پڑا تھا، لیکن تلاش بسیار کے بعد وہاں بھی کتاب الاسماء والصفات نہیں ملی۔ اب مجھے استاذ صاحب پر ترس آنے لگا اور ادب کے دائرے میں بہت تاکید سے عرض کیا کہ حضرت پھر سہی، ابھی چھوڑ دیجئے، لیکن وہ عزم کے مصمم تھے، تندی باد مخالف میں اڑنا خوب جانتے تھے۔ فرمانے لگے کہ مولانا صاحب! کتاب موجود ہے تو ابھی یہ حوالہ نکالنا ضروری ہے، اس لیے کہ مجھے بھی نوح الجامع کے عقیدہ تجسیم نے الجھنے میں ڈال دیا ہے۔ اب دوبارہ سیڑھیوں پر چڑھ کر سابقہ کتب خانہ میں داخل ہوئے۔ اس دوران استاذ صاحب کے قابل قدر بیٹے اور ہمارے محترم دوست جناب مولانا یوسف صاحب حفظہ اللہ بھی کتب خانہ تشریف لائے، جیسے ہی وہ داخل ہوئے تو استاذ صاحب کی نظر بارع کتاب پر پڑگئی جو ایک کونے میں رکھی ہوئی تھی۔ مسکرا کر فرمانے لگے: ''یہ یوسف کی کرامت ہے۔''

راقم نے ''الاسماء والصفات'' کا صفحہ ۴۲۸ کھول دیا۔ استاذ صاحب بہت غور سے امام کوثری کا حاشیہ پڑھنے لگے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نعیم بن حماد میں تجسیم کی بیماری تھی اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس کی والدہ نے نوح الجامع سے نکاح کر لیا تھا اور نوح الجامع اگرچہ امام اعظم کے شاگرد اور ان کی زندگی ہی میں قضا کے رتبے پر فائز ہوگئے تھے، لیکن وہ مشہور زمانہ رئیس المجسمہ مقاتل بن سلیمان کا سوتیلا بیٹا تھا کہ نوح کی والدہ مقاتل کی نکاح میں آگئی تھی اور سوتیلے باپ نے ان کو عقیدہ کے حوالے سے بگاڑنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

استاذ صاحب بار بار غور سے اس حاشیہ کو پڑھ رہے تھے۔ کچھ لمحے بعد میری طرف متوجہ ہوئے کہ میں بھی یہ تحقیق پہلی مرتبہ ملاحظہ کر رہا ہوں اور کہا کہ امام زاہد الکوثری چھوٹے آدمی نہیں تھے، بہت بڑے علم کے مالک تھے۔ انہوں نے درست ہی کہا ہوگا اور پھر یوں تطبیق دے کر فرمانے لگے کہ اصل میں شیخ ابوغدہ اور مولانا نعمانی رحمہا اللہ نے نوح الجامع کا دفاع صرف باعتبار صداقت فی الروایۃ کیا ہے، باعتبار عقیدہ نہیں، اور یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ بہت سارے راوی عقیدہ کے لحاظ سے بدعتی ہوتے ہیں، لیکن صداقت کی وجہ سے محدثین اہل السنۃ ان سے روایت لے لیتے ہیں۔ دیکھئے بخاری شریف کے اندر امام بخاری کے متعدد اساتذہ اور رواۃ عقیدۃً بدعتی ہیں، جیسے عباد بن یعقوب الاسدی شیعہ تھے، امام بخاری، مسلم، ترمذی، ابن ماجہ ان سب جلیل القدر محدثین نے عباد سے روایتیں لی ہیں۔ یا جیسے کہ عبید اللہ بن موسیٰ جس سے امام بخاری نے جامع کی کتاب الایمان ہی میں روایت لی ہے، چنانچہ امام ابوداؤد نے ان کے بارے میں یہاں تک لکھ دیا ہے: "**عبید اللہ کان شیعیا محترقا، جاز حدیثہ**"۔ اسی طرح سینکڑوں راویوں سے محدثین ان کے صداقت فی الروایہ کی وجہ سے روایت لیتے ہیں اگرچہ وہ عقیدۃً بدعتی ہوتے ہیں، بشرطیکہ وہ اپنی بدعت کی طرف داعی نہ ہو اور وہ بدعت مستلزم للکفر نہ ہو۔ استاذ صاحب نے فرمایا کہ نوح الجامع کی بھی کچھ یہی صورت حال ہے کہ عقیدہ میں تو قائل تجسیم ہیں، لیکن اکابر نے روایت کے لحاظ سے ان کا دفاع فرمایا ہے۔ یہاں آکر میرا اشکال کافور ہوگیا، وللہ الحمد۔

اجازت دینے میں بوجہ احتیاط کے سختی

استاذ صاحب کے اساتذۂ حدیث بہت بلند تھے لیکن ان کی عمدہ سند ان کے شیخ و مربی، عالم اسلام کے عظیم سپوت، محدث العصر حضرت مولانا یوسف بنوری رحمہ اللہ کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ راقم نے اپنے اپنے وقت کے تین بڑے ایسے اساتذہ کے شاگردوں کا شرف زیارت حاصل کیا ہے کہ جب بھی ان قابل قدر شاگردوں سے ان کے اساتذہ کے حالات کے متعلق استفسار کیا تو استاذ کی محبت میں بچوں کی طرح رونا شروع کر دیتے، یا کم از کم ان کی آنکھیں اشکبار ہو جاتیں۔ ان میں ایک شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی کے شاگرد، دوسرے امام المنطق و الفلسفۃ و مجتہد فی الکلام مولانا خان بہادر المعروف بمارتونگ بابا رحمہ اللہ اور تیسرے حضرت علامہ بنوریؒ کے شاگرد۔ استاذ صاحب سے جب بھی راقم نے حضرت بنوریؒ کے متعلق پوچھا تو دوران تذکرہ اپنے استاذ کے عشق میں آنسو ٹپکنے لگتے۔ آپ اس محبت کا اندازہ بخوبی اس سے لگا سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنے لخت جگر اور بیٹے کا نام "یوسف" اور مدرسے کا نام بھی جامعہ یوسفیہ رکھا، ظاہر ہے حضرت بنوریؒ ہی کی وجہ سے یہ نام رکھے ہیں۔

استاذ صاحب پر تقویٰ کا انتہائی غلبہ تھا، دینی امور میں حتی الوسع افراط وتفریط سے بچتے تھے، خاص کر حدیث و روایت حدیث میں نہایت محتاط واقع ہوئے تھے۔ قارئین جانتے ہیں کہ سلف صالحین روایت حدیث میں کس قدر احتیاط کرتے تھے۔ دور نہ جایئے قاضی عیاض یحصبی کی کتاب "ترتیب المدارک وتقریب المسالک لمعرفة اعلام مذهب مالک" اٹھا کر امام مالک رحمہ اللہ کی وہ غایت احتیاط روایت اور ادب حدیث ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ میں نے اس باب میں استاذ صاحب کو امام مالک رحمہ اللہ کے نقش قدم پر پایا۔ استاذ صاحب آخری عمر میں حدیث کی منتہی کتابوں میں مشکاۃ المصابیح کا درس اہتمام سے دیا کرتے تھے، لیکن ادب وخوف کا اتنا غلبہ تھا کہ حدیث پڑھتے ہوئے اکثر آنسو ٹپکنے شروع ہوجاتے۔ اگر کوئی مشورہ دیتا کہ آپ بخاری شریف کا درس دیا کریں تو برجستہ استغفار شروع کردیتے اور فرماتے کہ میں اس قابل نہیں کہ یہ عظیم الشان کتاب پڑھانے لگوں۔

قارئین کی ظرافت طبع کے لیے ایک لطیفہ عرض کردیتا ہوں، ایک مرتبہ میں استاذ محترم مولانا ابن الحسن عباسی دامت برکاتہم کے ساتھ ٹہلنے نکلا تھا۔ باتوں باتوں میں استاذ صاحب کا ذکر خیر آگیا۔ عباسی صاحب نے فرمایا: ''یار مولانا سجاد صاحب! یہ حضرت مولانا امین صاحب بھی عجیب شخصیت ہے۔ یہ تو ہر کسی کو معلوم ہے کہ درس بخاری کا صحیح حق برصغیر میں استاذ صاحب ہی ادا کر سکتے ہیں اور ان کے درس بخاری سے ملت اسلامیہ کو بہت فائدہ ہوگا، لیکن ان کے سامنے جب بخاری کی تدریس کا نام بھی لو تو آنکھیں اشکبار ہوجاتی ہے اور انکار کردیتے ہیں۔ یار! حد سے زیادہ صوفی ہونا بھی امت مسلمہ کے فائدہ میں نہیں ہے۔'' ظاہر ہے عباسی صاحب نے یہ جملہ مزاحاً فرمایا تھا۔

جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کی تاریخ میں یہ واقعہ بہت یاد کیا جاتا ہے کہ عالم اسلام کے عظیم محقق، شیخ بشار عواد معروف جن کے قلم سے ڈیڑھ لاکھ صفحات نکل چکے ہیں اور اسلام کی بڑی بڑی قدآور کتابوں جیسے تاریخ الاسلام للذهبی، تهذیب الکمال للمزی، تاریخ مدینة السلام للخطیب البغدادی پر ان کی شاندار تحقیقات درج ہیں۔ موصوف جب بنوری ٹاؤن تشریف لائے تو استاذ صاحب بھی تشریف رکھتے تھے، بس شیخ بشار عواد استاذ صاحب سے اجازتِ حدیث طلب کرنے لگے، استاذ صاحب نے اپنے روایتی انداز میں انتہائی لجاجت وانکساری سے تاکیداً انکار کیا کہ میں اس قابل نہیں، لیکن شیخ بشار کہاں چھوڑنے والے تھے۔ آخر اجازتِ حدیث لے کر ہی دم لیا، استاذ صاحب کی طبیعت بعد میں تقریباً ایک ہفتہ تک سنبھل نہ سکی اور مسلسل خراب تھی۔

میرا قصہ بھی کچھ ایسا ہی ہے جب میں نے استاذ صاحب سے ان کی اجازات طلب کیں تو فرمانے لگے: اجازت حدیث تو مشکل ہے کہ میں اس قابل نہیں ہوں، البتہ ''الحزب الاعظم'' کی اجازت دے دیتا ہوں کہ علامہ بنوریؒ نے ہمیں اس کی اجازت دینے کا فرمایا تھا اور فوراً الحزب الاعظم کا نسخہ منگوا کر اس کے اوپر اپنے پختہ اور خوبصورت

کتابت کے ساتھ الفاظِ اجازت نقش فرمائے اور اس مناسبت سے ایک واقعہ بھی ذکر کیا۔ فرمانے لگے کہ میں اور حضرت مولانا حبیب اللہ مختار شہید رحمہ اللہ، علامہ بنوری رحمہ اللہ کی خدمت اقدس میں حاضر تھے، اس دوران افریقہ سے بذریعہ ڈاک "الحزب الاعظم" کے نسخے پہنچ گئے جو بہت ہی خوبصورت صفحات، ڈھائی دار جلد، اعلیٰ کتابت کے ساتھ چھپے تھے۔ علامہ بنوریؒ کا چہرہ کھل اٹھا، اس لیے کہ وہ کتاب کے متعلق نہایت نفیس مزاج واقع ہوئے تھے اور دو نسخے اٹھا کر مجھے اور مولانا مختار شہید کو اجازۃً دے دیئے اور آگے اجازت دینے کا بھی فرمایا۔

بہرحال مجھے الحزب الاعظم کی اجازت تو آسانی سے مل گئی، لیکن میں نے ٹھان لی تھی کہ سلسلہ حدیث میں استاذ صاحب کے ساتھ ضرور منسلک ہونا ہے، چنانچہ ان کے قابل قدر بیٹے مولانا یوسف صاحب نے سفارش کی، آخر مان ہی گئے اور اپنی تمام روایات وکتب حدیث کی اہتمام سے اجازت مرحمت فرمائی، بعد میں مولانا یوسف صاحب نے فرمایا کہ میں حیران ہوں کہ استاذ صاحب کس طرح جلدی رضامند ہوئے۔

استاذ صاحب کا علمی مقام

استاذ صاحب کی آرا بہت وزنی اور جچی تلی ہوتی تھیں، جب میں ان کے ہاں حاضر خدمت ہوتا تو ان کے ایک ایک لفظ کو غور سے سنتا۔ کسی حدیثی تحقیق یا عام تحقیق پر میں تب ہی اعتماد کرتا جب استاذ صاحب کی مہر ثبت ہوجاتی۔ میرے بعض رفقا نے صفات باری تعالیٰ کے نازک مسئلے میں میرے کچھ محاضرات قلمبند کیے، ان میں ٹھیٹھ قسم کے حدیث وعلوم حدیث کے مباحث بھی در آئے تھے، اس میں مسلم شریف کی حدیث الجاریہ پر بھی تفصیلی بحث تھی۔ میں نے وہ مقالہ استاذ صاحب کو تعارف کر کے دے دیا اور یہ بھی کہا کہ حضرت کوئی غلطی ہو تو تنبیہ فرمائیے، اصلاح کردوں گا۔ استاذ صاحب بہت اہتمام سے اسی مجلس میں مقالہ کے مطالعہ میں منہمک ہوگئے۔ تیس صفحات کا یہ مقالہ مکمل پڑھ لیا اور آخر میں بہت دعائیں دے کر مکمل اطمینان کا اظہار فرمایا۔ مجھ جیسے طالب علم کے لیے اطمینان کا اظہار بہت اہمیت رکھتا تھا، مجھے ان کی اس خوبصورت انداز سے ڈھارس ملی اور آگے کے لیے مہمیز ثابت ہوئی۔

اگلی ملاقات میں میں نے اپنی ایک اور تحریر بنام 'شرح العقیدۃ الطحاویہ پر ایک تحقیقی نظر' کے عنوان سے لکھی تھی۔ وہ پڑھنے کے لیے استاذ صاحب کی خدمت میں پیش کی، چنانچہ سابق کی طرح اسی مجلس میں مکمل پڑھ لی اور آخر میں دعائیں دے کر فرمایا کہ آپ کے نقد کا انداز مجھے پسند آیا، ادب کو ملحوظ رکھ کر مخالفین پر نقد کرنا بہت اچھی بات ہے۔

ایک مرتبہ ایک مشہور اعتقادی بدعتی کے متعلق استفسار کیا کہ وہ اپنی کتابوں میں جرح وتعدیل کے مصادر کے بہت حوالے دیتے ہیں۔ جواباً فرمانے لگے: مولوی صاحب! جرح وتعدیل کے مراجع کا حوالہ دینے سے کوئی محدث

یا ماہر اصول الحدیث نہیں بنتا۔

استاذ صاحب کا کتابی ذوق اوران کا شاندار کتب خانہ

دراصل استاذ صاحب کتابی دنیا کے شہسوار تھے۔ مطالعہ کے خوگر، کتاب کے عاشق اور نادر کتابوں کا جمع کرنا ان کا بہترین مشغلہ تھا، اس ذوق کو برقرار رکھنا ان کی کرامت سے کم نہیں، ورنہ پٹھانوں کے درمیان رہ کر اپنی علمی حیثیت کو اس طرح قائم رکھنا کارے دارد، اس لیے کہ اکثر اوقات تو جرگوں، مصالحت اور تعزیت میں شرکت وتقاریر ہی میں خرچ ہوجاتی ہیں۔ وہ بعض کتابوں کے متعلق اپنی منفرد آرا رکھتے تھے۔ تحریر کرچکا ہوں کہ نصاب تخصص میں تاسیس النظر للدبوسی کے بہت قائل تھے۔ اپنے جامعہ میں درجہ ثانیہ میں ہدایۃ النحو کی جگہ شرح شذور الذہب لابن ہشام، اور درجہ ثالثہ کے اندر کنز الدقائق کی جگہ فقہ میں صدر الشریعہ کی متنِ متین ''مختصر الوقایہ'' کی مفید شرح ''فتح باب العنایہ بشرح النقایہ'' لملاعلی القاری رحمہ اللہ کو داخل نصاب کیا تھا اور اہتمام سے پڑھاتے تھے، جبکہ جلالین کی جگہ مدارک اور بیضاوی کی جگہ تفسیر ابی السعود، عقائد وکلام میں قصیدہ بدء الامالی اسی طرح الفیہ لابن مالک کی ایک معنبوط شرح اوضح المسالک لابن ہشام النحوی کو نصاب میں ترجیح دیتے تھے۔ ایک مرتبہ میں ان کے ساتھ کتب خانہ میں تھا تو گیارویں صدی کے مایہ ناز ماتریدی محقق کی کتاب ''اشارات المرام عن عبارات الامام'' اٹھا کر فرمانے لگے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ اس کتاب کو داخل درس کرکے پڑھاؤں۔

مطالعہ انتہائی انہماک سے کرتے تھے اور ہمیشہ کوشش تھی کہ نایاب چیزوں کو مطالعہ کریں، اس لیے ان کا کتب خانہ شاندار کتابوں سے مزین تھا، ایک محتاط اندازے کے مطابق کتب خانہ میں بارہ ہزار کتابیں موجود ہیں۔ استاذ صاحب کتاب کو اول سے آخر تک پڑھنے کے قائل تھے۔ میرے ایک رفیق اصول حدیث کا مطالعہ ان کے پاس ان ہی کی نگرانی میں کرتے تھے تو دوسرے کتابوں کے ساتھ تہذیب الکمال ۳۷ جلدوں کا مطالعہ بالاستیعاب کروایا، استاذ صاحب کے مطالعے کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ دوران مطالعہ مفید باتوں کے حوالہ کو ابتدائی صفحات میں درج کردیتے تھے اور جب کوئی حاشیہ یا استدراک بڑھانا ہوتا تو درمیان کتاب میں کوئی خالی صفحہ چمٹا کر اپنا مفید حاشیہ تحریر فرمادیتے۔ گاہ بگاہ درمیان کتاب میں مفید حواشی بھی تحریر فرماتے۔ استاذ صاحب کے مکتبہ میں بیشتر کتابوں کے افتتاحی صفحات تحقیقی حوالوں کی وجہ سے بالکل سیاہ پڑ جاتے تھے۔ میں نے ان کے کتب خانہ میں امام ابن ابی خیثمہ کی نادر کتاب ''التاریخ الکبیر'' جو عرصہ قریب میں مخطوط سے چھپ چکی ہے، خود دیکھی کہ استاذ صاحب نے اس سے مفید حوالے نکال نکال کر ابتدائی صفحات سیاہ کردیئے تھے۔ ان میں سے بعض حوالے میں نے

اپنے نسخے پر بھی نقل کردیئے تھے۔

اس زمانے میں تاریخ الاسلام للذہبی ۵۲ جلدوں میں ڈاکٹر عبدالسلام تدمری کی تحقیق کے ساتھ آئی تھی، اگرچہ یہ نسخہ کچھ زیادہ اچھا نہ تھا، بعد میں جب شیخ بشار عواد معروف کی تحقیق سے تاریخ الاسلام چھپی تو سابقہ نسخے کی ہزاروں تعداد میں غلطیوں کی اصلاح فرمادی، لیکن اس وقت یہی نسخہ دستیاب تھا۔ آپ یقین جانئے استاذ صاحب نے اس عظیم کتاب کی ۵۲ جلدیں ایسی بالاستیعاب مطالعہ کیں جیسے کہ اسے گھونٹ گھونٹ پی گئے ہوں، اکثر جلدوں میں سے حوالے نکال نکال کر ابتدائی صفحات سیاہ کردیئے تھے۔

امام ابن ابی الدنیا رحمہ اللہ جو مشہور صوفی اور بزرگ گزرے ہیں، ان کا انسائیکلو پیڈیا ۷ جلدوں میں شائع ہوگیا تھا، جس میں ان کے ۵۷ رسائل ہیں اور اکثر زہد و تقوی و امور آخرت سے متعلق ہیں۔ شہادت سے تھوڑا عرصہ پہلے ان تمام رسائل کا نہایت اہتمام سے مطالعہ کیا اور ہر جلد کے ابتدائی صفحات حوالوں کی وجہ سے بالکل سیاہ ہوگئے تھے، جس میں مزید ایک سطر لکھنے کی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔

ان کے سانحہ شہادت سے تقریباً دو ہفتہ پہلے پشاور کے کتب خانوں میں مشہور قصیدہ کلامی "بدء الامالی" کی ایک مفید شرح "جامع اللالی شرح بدء الامالی" للقاضی احمد کنعان کی دار البشائر بیروت سے شائع ہوکر آگئی تھی۔ ایک ساتھی ہنگو جا رہا تھا، میں نے ان سے کہا کہ یہ کتاب استاذ صاحب کے لیے لیتے جائیں۔ شہادت سے ایک ہفتہ بعد جب میں مرقد مبارک پر حاضر ہوا اور مکتبہ کی ایک عمارت میں منتقلی کی وجہ سے نظام تتر بتر ہوگیا تھا، میں مکتبہ دیکھنے گیا، اتفاق سے جامع اللالی کا وہ نسخہ میرے ہاتھ لگ گیا، کیا دیکھتا ہوں کہ اس کا ہر صفحہ حوالوں کی تخریج سے پُر ہے۔ کچھ ایسا ہی حال مصابیح السنہ کی ایک نادر شرح "المیسر شرح المصابیح للعلامۃ توربشتی" کا بھی تھا۔

میں جب ہنگو جاتا تو جامعہ یوسفیہ پہنچنے کے بعد اور استاذ صاحب سے ملاقات کے بعد کتب خانہ کا رخ کرتا اور ہر دفعہ عالم عرب کی نئی نئی مطبوعات اور پرانی نادر کتابیں باصرہ نواز ہوتیں۔ مجھے کافی عرصہ سے علامہ عبدالحئی لکھنوی کی تین کتابوں کی تلاش تھی جو اردو زبان میں کسی زمانے میں ہندوستان سے شائع ہوگئی تھیں، لیکن نایاب تھیں، وہ کتابیں یہ ہیں:

۱۔ السعی المشکور فی رد المذہب المأثور، اردو زبان میں یہ رسالہ دراصل غیر مقلد عالم مولانا بشیر سہسوانی صاحب کے رسالہ المذہب المأثور فی زیارۃ سید القبور کا کامیاب رد ہے اور استحباب زیارۃ قبر الرسول صلی اللہ علیہ وسلم پر دلائل کا بیان ہے۔

۲۔ الکلام المبرم فی نقض القول المحقق المحکم، یہ بھی سہسوانی صاحب پر نقد ہے۔

۳۔ الکلام المبرور فی رد القول المنصور، یہ رسالہ بھی اردو زبان میں سبحوانی صاحب پر نقد ہے۔

یہ تینوں نادر رسائل مجھے استاذ صاحب ہی کے مکتبہ میں بطور نعمتِ غیر مترقبہ کے مل گئے تھے۔ ان کتابوں کے ملنے پر میری خوشی قابل دید تھی۔ میں نے استاذ صاحب کی اجازت سے ان کی فوٹو کاپی تیار کروائی اور اب اسلام آباد میں ایک ساتھی نے ان پر تحقیق بھی مکمل کر لی ہے اور عنقریب شائع بھی ہو جائیں گے۔

تصنیفی ذوق:

استاذ صاحب کا تصنیفی ذوق بہت عمدہ تھا، ان کی کتابت نہایت خوشخط تھی، اردو اور عربی بہت شائستہ اور منجھے ادیب کی طرح لکھتے تھے۔ ان کی مختصر تصانیف ان کی جودت پر بیّن دلیل ہے۔ نثر الازہار شرح معانی الآثار کا مسودہ مکمل ہو چکا ہے، لیکن تا ہنوز صرف ۲ جلد ہی چھپی ہیں۔ ان کی ایک اور کتاب جس میں حضرت خضر وموسیٰ علیہما السلام کے واقعہ سے متعلم، عالم اور علم کے آداب مستنبط کیے ہیں اور ان آداب کی تعداد ۲۸۹ تک پہنچائی ہے۔ اردو زبان میں ایک ایسی تصنیف ہے کہ اردو تو اردو، متداول عربی لیٹریچر میں بھی ایسی کتاب دستیاب نہیں۔ میں نے ایک ساتھی مولوی عمر فاروق پشاوری سے اس کا عربی ترجمہ بھی کروایا اور مقدمہ بھی لکھا وہ کتاب ۱۱۴ صفحات بیروت، لبنان کے معیاری ادارہ دارالنوادر سے بہت جلد چھپ کر آ جائے گی۔

استاذ صاحب کا مقالہ ''مسانید الامام الاعظم ابی حنیفۃ'' بھی خاصے تحقیق کا گلدستہ ہے اور دیکھنے کی چیز ہے، اسے حضرت بنوری نے مصر سے طبع کرایا تھا۔ شرح النقایہ پر ان کے مختصر تعلیقات بھی موجود ہیں جو ابھی تک طبع نہیں ہوئیں، ایک اور کتاب ''آثار الصحابۃ فی الکتب الستۃ'' بھی غیر مطبوع ہے۔ ان کے مکتوبات کا خاطر خواہ ذخیرہ ہمارے محترم دوست اور استاذ صاحب کے قابل قدر بیٹے مولانا یوسف صاحب کے پاس محفوظ ہے۔ انہیں الگ شائع کر لینا چاہیے۔

استاذ صاحب اپنی زندگی کے ترسیٹھ بہاریں دیکھ کر اس حیات مستعار کو خیر باد کہہ کر شہادت کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہو گئے، ان کی شہادت دشمنانِ اسلام کی طرف سے ایک گہری سازش کے تحت ہوئی، حقیقت یہ ہے کہ استاذ صاحب اس دنیا میں علم، دانش، امن اور بھائی چارے کے علم بردار تھے، لیکن دنیا نے ان کی قدر نہیں کی اور انہیں بڑے ظلم سے شہید کر لیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو درجات عالیہ عطا فرمائیں، ان کے فیض ومشن کو ان کی حقیقی اور روحانی اولاد کے ذریعے زندہ رکھے۔ آمین۔